[illegible]

[illegible]

... احمد عامری

... ہماری تعلیم ... [illegible]

... [illegible] ... معاشرے ... [illegible]

... [illegible] ... وہ کبھی ... [illegible]

[illegible]

[illegible]

قارئِ محترم

"اشراق" ایک تحریک ہے، علمی تحریک:

- علم کو قرآن و سنّت کی کسوٹی پر پرکھنے کی تحریک،
- عمل کو قرآن و سنّت کے مطابق کرنے کی تحریک،
- دل و دماغ کو قرآن و سنّت کے تابع کرنے کی تحریک،
- فکر و نظر کو قرآن و سنّت کی میزان میں تولنے کی تحریک

—— اس "تحریک" کو دست و بازو درکار ہیں، جو اسے پھیلا سکیں، جو اس کو آگے بڑھا سکیں۔

—— آپ یہ دست و بازو مہیا کر سکتے ہیں؛ اس کے لیے نئے خریدار پیدا کر کے، اسے زیادہ سے زیادہ تعداد میں خرید کر، اس میں اپنے کاروبار کا اشتہار دے کر اور اسے نئے افراد تک پہنچا کر۔ امید ہے آپ اپنا دست تعاون بڑھائیں گے۔

ادارہ

اشراق

جلد ۶ شمارہ ۱
جنوری ۱۹۹۴ء
رجب ۱۴۱۴ھ

فی شمارہ: ۸ روپے
سالانہ: ۸۰ روپے
بیرون ملک:
ہوائی ڈاک: ۴۵۰ روپے
بحری ڈاک: ۲۵۰ روپے

المورد

۴۶ احمد بلاک، گارڈن ٹاؤن، لاہور ۵۴۶۰۰ فون: ۵۸۶۴۴۳۱

مدیر مسئول: جاوید احمد غامدی طابع: قومی پریس لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

البروج — الطارق

[٨٥ — ٨٦]

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ ان میں خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن روئے سخن، اگر غور کیجیے، تو قریش کے سرداروں ہی کی طرف ہے اور ان کے مضمون سے واضح ہے کہ پچھلی سورتوں کی طرح، یہ بھی ام القریٰ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ان کو انذار عام کے مرحلہ ہی میں نازل ہوئی ہیں۔

پہلی سورہ — البروج — میں، اس عالم پر خدا کی نگرانی، آفاق کے آثار و شواہد اور خود قیامت ہی کے وجود سے قیامت کا اثبات، اس میں قریش کے ان ظالموں کے لیے، جنھوں نے اہل ایمان پر صرف اس لیے ظلم ڈھائے کہ وہ اللہ، پروردگار عالم پر ایمان لے آئے تھے، جہنم کی وعید، خدا کی صفات جلال و جمال کے حوالے سے اس کی پکڑ کی بے پناہی اور وہ اگر توبہ کریں،

آ... کی رحمت و مغفرت کا بیان ہے۔ اس کے بعد ... کی شہادت ... کے ... [illegible]

کی ... کے ... میں جنت کی بشارت اور ... [illegible]

... قرآن ... [illegible] ... ایک حقیقت ... قرآن ...

کوئی شاعری ... نہیں بلکہ ایک بزرگ و برتر کتاب ہے ... [illegible]

دوسری سورہ — الطارق — میں بھی ... [illegible] ... اس

... قیامت کے ... کا اثبات ... [illegible]

... آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے اس حقیقت کا بیان ہے کہ ... [illegible]

... [illegible]

... [illegible] ... کا ... ہے ...

... کا وقت بالکل قریب ہے۔

۱

اللہ کے نام سے جو سراپا رحمت ہے جس کی شفقت ابدی ہے

یہ برجوں والا آسمان ... [illegible]

... [illegible]

... [illegible]

... [illegible]

اُس پر بیٹھ گئے تھے، اِس طرح کہ جو کچھ (اِس دنیا میں) وہ اِن اہلِ ایمان کے ساتھ کرتے رہے ہے، (اُس کا نتیجہ اب اپنی آنکھوں سے) دیکھ رہے ہیں۔ ۱-۷

اور (واقعہ یہ ہے کہ) یہ محض اِس لیے اِن کے دشمن ہوئے کہ اِنھوں نے اللہ کو مان لیا جو زبردست، ستودہ صفات، وہی جو آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا مالک ہے، اور (یہ بھی جان لیں اور اہلِ ایمان بھی کہ) اللہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔ ۸-۹

یہ لوگ جنھوں نے ان مومن مردوں اور عورتوں کو ستایا اور پھر نہیں پلٹے، اِن کے لیے دوزخ کی سزا ہے اور اِن کے لیے جلنے کا عذاب ہے۔ (اِن کے اِس ظلم کے باوجود)، یہ لوگ جو اپنے ایمان پر قائم رہے، اور جنھوں نے نیک عمل کیے، اِن کے لیے بہشت کے باغ ہیں، جن میں نہریں بہتی ہوں گی۔ یہی درحقیقت، بڑی کامیابی ہے۔ ۱۰-۱۱

تیرے پروردگار کی پکڑ بڑی سخت ہے، (اے پیغمبر، اس لیے یہ کسی غلط فہمی میں نہ رہیں)۔ وہی ابتدا کرتا ہے اور (جب یہ حقیقت ہے، تو) لاریب وہی لوٹائے گا۔ اور وہ بخشنے والا ہے، (یہ اگر پلٹیں)، بڑی محبت کرنے والا، عرش کا مالک، بزرگ و برتر، جو چاہے کر ڈالنے والا ہے۔ ۱۲-۱۶

تمھیں اُن لشکروں کی خبر پہنچی ہے، (جو اِسی طرح سرکش ہوتے)، فرعون اور ثمود کے لشکروں کی؟ (پھر کیا یہ کوئی جھٹلانے کی چیز ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں)، بلکہ اِن کافروں نے فیصلہ کر لیا کہ یہ جھٹلاتے ہی رہیں گے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اللہ اِنھیں آگے اور پیچھے سے گھیرے ہوئے ہے۔ (یہ کوئی جھٹلانے کی چیز نہیں)، بلکہ یہ بلند پایہ قرآن ہے، (ہر شیطان کی دراندازی سے بالاتر)۔ یہ لوحِ محفوظ میں ہے۔ ۱۷-۲۲

۲

اللہ کے نام سے جو سراپا رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ آسمان (کہ جو ہر طرف سے تمھیں گھیرے ہوئے ہے)، اور رات میں آنے والے بھی (کہ جن کی نگاہیں ہر وقت تم پر لگی ہوئی ہیں)، اور تم کیا سمجھے کہ کیا ہیں، رات میں آنے والے یہ چمکتے تارے، یہ گواہی دیتے ہیں کہ کوئی جان نہیں کہ اُس پر نگہبان نہیں۔ ۱-۴

(اِس پر بھی یہ کہتے ہیں کہ اِن کا پروردگار انھیں لوٹا نہ سکے گا)، تو یہ انسان ذرا دیکھے کہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ اچھلتے پانی سے، جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔ (یہ دیکھے کہ اِس کا پروردگار اِس طرح پیدا کر سکتا ہے، تو) اِسے یقیناً وہ لوٹا بھی سکتا ہے۔ ۵-۸

اُس دن جب دلوں کے بھید پرکھے جائیں گے۔ پھر اِس کے پاس نہ کوئی زور ہو گا اور نہ کوئی مدد کرنے والا۔ ۹-۱۰

اور یہ آسمان جو برستا ہے، یہ بھی گواہی دیتا، اور یہ زمین جو پھٹ جاتی (اور اِس طرح سبزہ اگاتی ہے)، یہ بھی گواہی دیتی ہے کہ (قیامت میں اِسی طرح زمین سے جی اٹھنے کی یہ خبر) یہ ایک قول فیصل ہے۔ یہ کوئی ہنسی مسخری نہیں ہے۔ ۱۱-۱۴

(اِن کے بارے میں، اے پیغمبر)، یہ ایک چال چل رہے ہیں (کہ اپنی باتوں سے لوگوں کو احمق بناتے رہیں) اور میں بھی ایک چال چل رہا ہوں (کہ انھیں اس طرح پکڑ لوں کہ اِن کے پاس کوئی عذر نہ ہو)۔ اِس لیے اِن کافروں کو چھوڑ دو، (اے پیغمبر)، انھیں بس ذرا دیر کے لیے چھوڑ دو۔ ۱۵-۱۷

البیان

شذرات

جاوید احمد غامدی

"المورد" ملتِ اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں اس ادارہ کا قیام اس حقیقت کا کھلا اظہار ہے کہ عصرِ حاضر میں دینِ حق کی دعوت اور اس کے غلبہ کے لیے کرنے کا اہم ترین کام یہی ہے کہ علومِ اسلامی کی بنیادیں ایک مرتبہ پھر ان کے اصل ماخذوں، یعنی قرآن و سنت پر استوار کر دی جائیں۔

یہ ادارہ اس احساس کی بنا پر وجود میں آیا ہے کہ 'تفقہ فی الدین' کا عمل اس ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ قرآنِ مجید، جو اس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ و تلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ مذہبی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآنِ مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ سنتِ نبوی، جو اس دین کا دوسرا ماخذ ہے، قرآنِ مجید سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتبِ فکر کے اصول و فروع کی تحصیل اور دوسروں کے مقابلے میں ان کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

"المورد" نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے یہ بات سمجھ لی ہے کہ یہ نہج قرآنِ مجید کے نصوص کے بالکل خلاف اور علم و عقل کی رو سے بالکل غلط ہے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ملت کے ذہین عناصر کی دین سے بے تعلقی اور مسلمانوں کے زوال کا اصل سبب یہی نہجِ علم و تحقیق ہے۔

اس ادارہ کی بنا جس اصول پر قائم ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ دین کا تنہا ماخذ اب اس زمین پر صرف اللہ کے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذاتِ والا صفات ہے۔ یہ صرف انھی کی ہستی ہے کہ جس سے قیامت تک بنی آدم کو پروردگارِ عالم کی ہدایت میسر ہو سکتی، اور یہ صرف انھی کا مقام ہے کہ اپنے قول و فعل اور تقریر و تصویب سے وہ جس چیز کو دین قرار دیں، وہی اب رہتی دنیا تک دینِ حق قرار پائے۔

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ "اور جو کچھ رسول تمھیں دے، وہ لے لو

وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ	اور جس سے روکے، اس سے رک جاؤ، اور
وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ	اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک، اللہ کی سزا
شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۔ (الحشر ۵۹: ۷)	سخت ہے۔

اس کی تفصیل ہم اس طرح کرتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دین ہمیں تین صورتوں میں ملا ہے:

۱۔ قرآنِ مجید،

۲۔ سنتِ ثابتہ،

۳۔ حدیث۔

قرآنِ مجید کے متعلق ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ دین میں وہ اس زمین پر اللہ کی اتاری ہوئی میزان اور حق و باطل کے لیے فرقان ہے۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ ہر چیز کے رد و قبول کا فیصلہ اس کی آیاتِ بینات ہی کی روشنی میں کیا جائے۔ ایمان و عقیدہ کی ہر بحث اس سے شروع ہو، اور اسی پر ختم کر دی جائے۔ ہر وحی، ہر الہام، ہر القا، ہر تحقیق اور ہر رائے کو اس کے تابع قرار دیا جائے اور اس کے بارے میں یہ حقیقت تسلیم کی جائے کہ ابوحنیفہ و شافعی، بخاری و مسلم، اشعری و ماتریدی اور جنید و شبلی، سب پر اسی کی حکومت قائم ہے اور اس کے خلاف ان میں سے کسی کی کوئی بات بھی قبول نہیں کی جا سکتی۔

سنتِ ثابتہ سے ہماری مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ عملِ متواتر ہے جو صحابہ کے اجماع یا ان کے تواترِ عملی کے ذریعے سے، بحیثیتِ دین، اس امت کو منتقل ہوا ہے۔ اس کے متعلق ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے، اس میں اور قرآنِ مجید میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ جس طرح قولی تواتر سے ثابت ہوا ہے، یہ اسی طرح عملی تواتر سے ثابت ہے۔ چنانچہ اس کے بارے میں اب کسی بحث و نزاع کے لیے کوئی گنجایش نہیں ہے۔

حدیث، ہمارے نزدیک، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کی وہ روایت ہے جو زیادہ تر اخبارِ آحاد کے طریقے سے ہم کو ملی ہے۔ اس کے متعلق ہماری رائے یہ ہے کہ یہ اگر قرآنِ مجید، سنتِ ثابتہ اور عقل و فطرت کی اساس پر قائم ہو اور کسی پہلو سے ان کے منافی نہ ہو، اور قابلِ اعتماد ذرائع سے ہم تک پہنچے، تو اس کی حجیت بھی ایک مسلم حقیقت ہے، جس کا انکار

نہیں کیا جا سکتا۔

○

یہ ادارہ حسبِ ذیل تین شعبوں پر مشتمل ہے :

۱۔ شعبۂ تصنیف و تالیف

۲۔ شعبۂ تعلیم و تربیت

۳۔ شعبۂ اصلاح و دعوت

شعبۂ تصنیف و تالیف

علومِ اسلامی میں تحقیق و اجتہاد کے جس کام کی ابتدا قرنِ اوّل میں ہمارے اسلاف نے کی تھی اور جسے "دبستانِ شبلی" کے اکابر، بالخصوص، امام حمید الدین فراہی اور استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس زمانے میں ایک مرتبہ پھر پوری شان کے ساتھ زندہ کیا ہے، یہ شعبہ اسی کو برقرار رکھنے کی ایک کوشش ہے۔ اس کے پروگرام میں اصل اہمیت قرآن و حدیث کی شرح، حیاتِ بشری کے تمام اہم مسائل کے بارے میں صحیح دینی نقطۂ نظر کی وضاحت، دین سے متعلق تاریخ و سیر کی تحقیق، اور معارفِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کو حاصل ہے۔

شعبہ کے پیشِ نظر اہم تصنیفی منصوبے یہ ہیں :

۱۔ نظمِ قرآن کی رعایت سے عربی زبان میں قرآنِ مجید کی تفسیر،

۲۔ اسی رعایت سے قرآن کا سادہ اردو ترجمہ،

۳۔ دین کے فلسفہ و حکمت، اسلامی قانون اور تزکیۂ نفس کے اصول و مبادی کی شرح و وضاحت میں ایک جامع کتاب،

۴۔ "الاسلام" کے نام سے اسی کتاب کا ایک مختصر،

۵۔ قرآنِ مجید کی روشنی میں روایاتِ حدیث کی تنقید، صحیح روایات پر مشتمل ایک مجموعہ کی ترتیب اور عربی اور اردو میں اس کی شرح،

۶۔ اسی اصول کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور قرنِ اوّل کی تاریخ،

۷۔ فقہِ اسلامی کی تدوینِ جدید،
۸۔ دین کی شرح و وضاحت کے لیے مختلف موضوعات پر لٹریچر کی تیاری،
۹۔ دورِ حاضر میں خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے قیام کے لیے ایک مفصل منشور کی ترتیب،
۱۰۔ امام فراہی اور استاذ امام امین احسن اصلاحی کی نامکمل تصنیفات کی تکمیل اور ان کی کتابوں کے تراجم۔

شعبۂ تعلیم و تربیت

یہ شعبہ ان طلبہ کے لیے خاص ہے جو دین کے جید عالم بننا چاہتے اور اس طرح اپنی زندگی دینِ حق کی شرح و وضاحت اور اس کی دعوت ہی کے لیے وقف کر دینا چاہتے ہوں۔

اس میں داخلہ کے لیے کم سے کم تعلیمی قابلیت ایف۔ اے یا ایف ایس سی، عمر کی حد، زیادہ سے زیادہ، ۲۵ سال اور مدتِ تدریس ۵ سال ہے۔

اس کا نصاب ہم نے اس طرح ترتیب دیا ہے کہ اس میں قرآنِ مجید کو وہی حیثیت حاصل ہے جو دین میں اس کو، فی الواقع، حاصل ہے۔ چنانچہ ہمارے اس نصاب میں مرکز و محور وہی ہے۔ ہم ہر چیز کی ابتدا اس سے کرتے اور اس کی انتہا بھی وہی قرار پاتا ہے۔ علم و فن کی ہر وادی میں طلبہ اسے ہاتھ میں لے کر نکلتے اور ہر منزل اسی کی رہنمائی میں طے کرتے ہیں۔ جو کچھ پڑھایا جاتا، اسی کو سمجھنے اور اسی کے مدعا کو پانے کے لیے پڑھایا جاتا ہے۔ نحو و ادب، فلسفہ و کلام اور فقہ و حدیث کے لیے اسے معیار مانا جاتا اور ہر چیز کے ردّ و قبول کا فیصلہ اس کی آیاتِ بیّنات ہی کی روشنی میں ہوتا ہے۔

اس کے ساتھ اس نصاب میں اصل اہمیت نحو، ادبِ جاہلی، حدیث، اصولِ فقہ اور فقہِ اسلامی کی تدریس کو دی جاتی ہے۔ قدیم منطق و فلسفہ کی تعلیم بس اتنی ہوتی ہے کہ طلبہ ان فنون کی اصطلاحات سے، فی الجملہ، واقف ہو جائیں تاکہ اُن علمی کتابوں کے مطالعہ میں انھیں کوئی دقت نہ ہو، جن کے لکھنے والوں نے اپنا مدعا، بالعموم، ان فنون ہی کی زبان میں بیان کیا ہے۔ نئے علوم میں سے فلسفہ، نفسیات، علم الاقتصاد، طبیعیات اور علم السیاسۃ کے اہم مسائل کا مطالعہ

طلبہ کو اس طرح کرایا جاتا ہے کہ وہ ان کی حقیقت اور طریقۂ استدلال کو پوری طرح سمجھ کر ان کے مقابلے میں قرآن و سنت کا نقطۂ نظر واضح کر سکیں۔ عالمی ادب کا ایک مختصر انتخاب بھی اس نصاب میں شامل ہے تاکہ طلبہ اسالیبِ ادب سے اتنی مناسبت پیدا کر لیں کہ قرآنِ مجید کے بے مثال ادبی اسلوب کی لطافتوں سے وہ کچھ بہرہ یاب ہو سکیں۔ اسی طرح موجودہ قانون کے اصول و مبادی سے واقفیت کے لیے بھی ایک جامع کتاب شاملِ نصاب ہے۔ فقہِ اسلامی کے کسی ایک مذہب کے بجائے تمام اہم مذاہب کی تعلیم دی جاتی اور اس طرح دی جاتی ہے کہ طلبہ اس حقیقت کو سمجھیں کہ سارا فقہی ذخیرہ ان کی اپنی میراث ہے اور اس معاملے میں کسی رائے اور شخص کے ساتھ تعصب کے لیے علم کی دنیا میں کوئی گنجایش نہیں ہے۔ چنانچہ اس ذخیرے میں سے صرف وہی چیز قبول کرنی چاہیے جو اللہ کی کتاب قرآنِ مجید اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق ہے اور اس کے خلاف ہر چیز، بغیر کسی تردد کے، رد کر دینی چاہیے۔

طلبہ کو محض کتابیں ہی نہیں پڑھائی جاتیں، اس کے ساتھ ان کی تربیت کے لیے بھی خاص اہتمام ہے اور اس مقصد کے لیے انھیں ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ اپنا کچھ وقت، لازماً، صالح علما کی صحبت میں گزاریں اور قرآن و حدیث کے اُن ارشادات میں خاص طور پر دھیان لگائیں جو تزکیۂ نفس اور تربیتِ اخلاق سے متعلق ہیں۔ اس کے ساتھ دین کی نصرت کا جذبہ بھی ان کے اندر پیدا کیا جاتا اور انھیں بتایا جاتا ہے کہ 'تفقہ فی الدین' کی اس نعمت سے بہرہ یاب ہونے کے بعد اپنی قوم اور اس کے اربابِ اقتدار کو دینِ حق کی پیروی کے لیے دعوت و انذار بھی، بہر حال، اُن کی ذمہ داری ہے۔

یہ شعبہ تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ و سیر اور معیشت کے مضامین میں تخصص کا اہتمام بھی کرتا ہے۔

ایف۔ اے، ایف ایس۔ سی تک عام تعلیم کے مدارس، اگر ادارہ کے رفقا یا اس کے متاثرین کسی جگہ قائم کریں، تو ان کا الحاق بھی اسی شعبہ سے کیا جاتا ہے۔

شعبۂ اصلاح و دعوت

اہلِ علم کے لیے دعوت و انذار کی جس ذمہ داری کا ذکر اوپر ہوا ہے، یہ شعبہ اسی کو پورا کرنے کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ اس کے ذریعے سے جو دعوت ہم اس امت میں برپا کرنا چاہتے ہیں، اس کی اساس قرآنِ مجید کا وہ حکم ہے جو سورۂ توبہ کی آیت 'فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ' میں بیان ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے کہ سب مسلمانوں کے لیے تو یہ ممکن نہیں ہے، لیکن ان کی ہر جماعت میں سے کچھ لوگوں کو، بہرحال، اس مقصد کے لیے نکلنا چاہیے کہ وہ دین کا علم حاصل کریں، اور پھر اپنی قوم کے لیے نذیر بن کر اسے آخرت کے عذاب سے بچانے کی کوشش کریں۔ ارشادِ خداوندی ہے:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ۚ	"یہ تو نہ تھا کہ سب ہی مسلمان اٹھتے، لیکن
فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ	ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے کچھ
لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا	لوگ نکل کر آتے تاکہ دین میں بصیرت حاصل کرتے
قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ	اور اپنی قوم کے لوگوں کو آگاہ کرتے، جب ان
يَحْذَرُوْنَ ۔ (۹ : ۱۲۲)	کی طرف لوٹتے۔ اس لیے کہ وہ بھی بچتے۔"

ہماری اس دعوت کے لیے، جیسا کہ بیان ہوا، قرآنِ مجید نے چونکہ "انذار" کی تعبیر اختیار کی ہے، اس وجہ سے ان چند مستثنیات کے سوا جو منصبِ رسالت ہی کے ساتھ خاص ہیں، اس کے لائحۂ عمل کی اساسات بالکل وہی ہیں، جو قرآنِ مجید میں پیغمبرانہ انذار کے لیے بیان ہوئی ہیں، تاہم اپنے حالات کے لحاظ سے اس شعبہ کے تحت جو پروگرام ہم نے اس وقت ترتیب دیا ہے، اس کے اہم نکات حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ حلقہ ہائے درسِ قرآن و حدیث کا قیام،

۲۔ دین کی شرح و وضاحت کے لیے مختلف موضوعات پر محاضرات کا انعقاد،

۳۔ اردو، عربی اور انگریزی میں رسائل و جرائد اور اخبارات کا اجرا،

۴۔ مختلف زبانوں میں اعلیٰ علمی اور دعوتی لٹریچر کی اشاعت،

۵۔ اسی نوعیت کی تقریروں اور خطبات پر مشتمل آڈیو اور ویڈیو کیسٹ کی تیاری اور اُن کو لوگوں تک پہنچانے کا اہتمام،

۶۔ تزکیۂ نفس اور تطہیرِ فکر و عمل کے لیے تعلیمی مجالس اور تربیت گاہوں کا انعقاد اور جمعہ مدارس کا قیام۔

○

ہماری خواہش ہے کہ علم و تحقیق، تعلیم و تربیت اور اصلاح و دعوت کے لیے جو سہولتیں بھی ہمارے لیے ممکن ہوں، وہ ہم اس ادارہ میں کام کرنے والوں کے لیے مہیا کریں، تاکہ معارفِ اسلامی کی تشکیلِ جدید، دین کی شرح و وضاحت اور اس کے لیے دعوت و اصلاح کا جو کام ہمارے پیشِ نظر ہے، وہ اس ادارہ میں اعلیٰ ترین سطح پر انجام پا سکے۔

ہماری تمنا ہے کہ تشنگانِ علم و ہدایت کے لیے یہ ادارہ ہر لحاظ سے "المورد" قرار پائے۔ اور وہ اپنی پیاس بجھانے کے لیے اقصائے عالم سے اس کی طرف رجوع کریں۔

ہم نہ کسی زعم میں مبتلا ہیں اور نہ کوئی دعویٰ لے کر اس کام کے لیے اٹھے ہیں۔ یہ محض احساسِ ذمہ داری ہے جس کے تحت ہم نے اس ادارہ کو منظم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ اس کی رضامندی کی طلب اور اس کے دین کی نصرت کے سوا کوئی دوسرا جذبہ ہمارے اس کام کا محرک نہیں ہوا۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس امت کی تاریخ میں جو لوگ اِس سے پہلے اس کام کے لیے اٹھے، ان کے علم و عمل کی رفعتیں اس قدر بے پایاں ہیں کہ ان کے سامنے ہماری کوئی حیثیت ہی نہیں۔ تاہم متاعِ ہنر نہ سہی، متاعِ درد تو، بہرحال، رکھتے ہی ہیں۔ یہ عمرِ عزیز اگر اسی کو بانٹتے بسر ہو جائے تو ___ ایں سعادت بزورِ بازو نیست۔

ہے گراں سیر غمِ راحلہ و زاد سے تو
کوہ و دریا سے گزر سکتے ہیں مانندِ نسیم

[اگست ۱۹۹۳ء]

خورشید احمد ندیم

غلبۂ دین کی حکمتِ عملی

پاکستان کی تاریخ پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نصف صدی پر محیط اس عرصے میں، ایک دن بھی ایسا طلوع نہیں ہوا، جب اس سرزمین پر اہلِ خیر نے غلبۂ دین کے لیے کوئی آواز نہ اٹھائی ہو۔ اہلِ اقتدار کا قہر اور حالات کا جبر، کوئی چیز بھی انھیں، اس بات کے لیے آمادہ نہ کر سکی کہ اظہارِ دین کی جدوجہد کو ترک کر دیں اور کسی گوشۂ عافیت میں پناہ لے لیں۔ اس اعتراف کے ساتھ، یہ بھی امرِ واقعہ ہے کہ پاکستان میں اسلامی انقلاب کی منزل سر نہیں کی جا سکی۔ اہلِ حق کی دعاؤں اور دواؤں کے باوجود، اللہ کی اس زمین پر اللہ کے قانون کو عملاً حاکم تسلیم نہیں کیا گیا۔ یہاں اقتدار کی دیوی انھی گروہوں پر مہربان رہی ہے، جو اکثر و بیشتر خوفِ خدا کی بجائے مادیت کے اسیر ہیں۔

اس ناکامی میں تندیِ بادِ مخالف کا کردار اپنی جگہ ہے۔ اہلِ اقتدار میں بالخصوص اور دیگر شعبہ ہائے حیات میں بالعموم، ایسے لوگوں کی کمی نہیں رہی، جو اس ریاست کی نظریاتی شناخت کو ختم کرنے اور اس کے لادینی تشخص کو نمایاں کرنے کے لیے سرگرم رہے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ بڑا دخل اس حکمتِ عملی کا بھی ہے، جو اسلامی انقلاب کے لیے اختیار کی جاتی رہی ہے۔ مذہبی جماعتوں کی تشکیل، ان کے پروگرام اور لائحۂ عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے اُن امور کی نشان دہی کر دی ہے، جو اس راستے میں بطورِ موانع موجود ہیں۔ اس کے بعد لازم ہے کہ اس حکمتِ عملی کے خدوخال، مثبت طور پر نمایاں کیے جائیں، جو اس ملک میں اسلامی انقلاب کے لیے، ہماری دانست میں، اختیار کی جانی چاہیے۔

حکمتِ عملی کے باب میں، سب سے پہلے، دو باتیں بطورِ اصول جان لینی چاہییں:
ایک تو یہ کہ اسلامی انقلاب کی یہ جدوجہد، اپنی حقیقت میں محض "دعوت" ہے۔ اگر یہ دنیاوی اعتبار سے کسی کامیابی پر منتج ہوتی ہے، تو داعیوں کو اپنے رب کے حضور میں، ہدیۂ تشکر پیش کرنا چاہیے،

جس طرح کے اللہ تعالیٰ کے نیک بندے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام اپنے خالق کے شکر گزار ہوئے تھے۔ قرآن مجید یہ بیان کرتا ہے کہ جب اللہ نے انھیں دنیا میں اقتدار دیا اور علم و حکمت سے نوازا تو ان کا طرزِ عمل ایسے بندوں کا تھا، جس پر اللہ نے انعام کیا ہو، اور وہ اس کے حضور میں سرِ بسجود ہو جائیں:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (النمل ۲۷: ۱۵)	"اور ہم نے داؤد اور سلیمان کو (دین و دنیا کا) علم عطا کیا اور انھوں نے کہا: شکر ہے، اللہ کا جس نے ہمیں اپنے بہت سے ایمان والے بندوں پر فضیلت دی۔"

اگر یہ دعوت دنیا میں کسی نتیجہ خیزی سے محروم رہتی ہے، تو پھر یہ اللہ کے حضور میں ہماری معذرت ہوگی۔ اس صورت میں، ہمارا رویّہ بنی اسرائیل کے اس گروہ کا ہونا چاہیے، جو دعوت و نصیحت سے محض اس وجہ سے باز نہیں آتا کہ دنیا میں اس کا کوئی نتیجہ دکھائی نہیں دیتا۔ قرآن اس گروہ کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے:

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَاۨ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ۔ (الاعراف ۷: ۱۶۴)	"اور جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو اللہ ہلاک کرنے والا یا سخت عذاب دینے والا ہے، تو انھوں نے کہا: ہم یہ سب کچھ تمھارے رب کے حضور معذرت پیش کرنے کے لیے کرتے ہیں، اور اس لیے بھی کہ شاید یہ لوگ نافرمانی سے باز آجائیں۔"

حکمتِ عملی کے ضمن میں دوسری بات، جسے ایک اصول کی حیثیت حاصل ہے، یہ ہے کہ حکمتِ عملی کوئی منصوص معاملہ نہیں، بلکہ یہ زمان و مکان کے تابع ہے۔ ہر عہد اور ہر خطے میں ایک داعی اپنے اجتہاد سے اس بات کا تعین کرے گا کہ غلبۂ دین کے لیے کیا لائحۂ عمل اختیار کرنا چاہیے، اور مجتہد کا معاملہ یہ ہے کہ وہ غلطی بھی کر سکتا ہے اور صحیح فیصلے تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ تاہم، ہر دو صورت میں اس کا اجر اس کے رب کے پاس محفوظ ہوگا جیسا کہ اللہ کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ،

اذا حکم الحاکم فاجتھد ثم اصاب فلہ اجران واذا حکم اجتھد ثم اخطأ فلہ اجر۔

"جب کوئی حاکم فیصلہ دینے میں صحیح اجتہاد کرے تو اس کے لیے دو اجر ہیں، اور اگر اس نے اجتہاد میں غلطی کی، تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔"

(بخاری، مسلم)

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ غلبۂ دین کی جدوجہد اپنی اصل کے اعتبار سے محض دعوت ہے، تو یہ جملہ قدرے وضاحت کا محتاج ہے۔ ہم اس وقت جس ملک میں رہ رہے ہیں، اس میں مسلمانوں کا ایک منظم معاشرہ آباد ہے۔ آئینی سطح پر اسلام کی بالادستی کو قبول کیا گیا ہے۔ حکمران مسلمان ہیں اور اس منصب تک پہنچنے کے لیے عامۃ الناس کی تائید و حمایت کے محتاج ہیں۔ اہلِ سیاست کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ حکومت پر سرِعام تنقید کریں۔ علما بھی اپنی بات پوری آزادی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔ عام مسلمانوں کو اپنی مذہبی رسوم ادا کرنے کے لیے کسی جبر کا سامنا نہیں۔ یہاں جو مسئلہ درپیش ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمان حکمران ان ذمہ داریوں کو ادا نہیں کر رہے، جو ایک اسلامی ریاست کے اربابِ حل و عقد پر عائد ہوتی ہیں۔ عامۃ الناس اُن فرائض کو ادا نہیں کر رہے، جن کے لیے اسلام انھیں پابند کرتا ہے۔ اہلِ دین، بالعموم، جس دین کے علم بردار ہیں، وہ اصولاً اُس دین سے مختلف ہے، جو قرآنِ مجید میں بیان ہوا ہے۔ یہ صورتِ حال، ظاہر ہے کہ اصلاح کی متقاضی ہے۔ اہلِ دین کا پیش کردہ دین، اگر قرآن و سنت کی بجائے عجمی تعبیرات سے آلودہ ہے، تو اس کا حل یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی انقلابی حکمتِ عملی کے تحت انھیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے، بلکہ اس کا صحیح لائحۂ عمل یہ ہوگا کہ دین کو اپنی اصل صورت میں اہلِ علم کے سامنے پیش کیا جائے۔ اسی طرح عامۃ الناس کو عمل پر آمادہ کرنے کے لیے تبلیغ و ترغیب کا طریقہ ہی اختیار کیا جائے۔ اس بات کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ سیاست اور اہلِ سیاست کی اصلاح کے لیے بھی، اصولاً، وہی لائحۂ عمل اختیار کیا جائے، جسے ہم اہلِ دین اور عامۃ الناس کے معاملے میں درست سمجھتے ہیں۔ اگر ہم سیاست کی اصلاح کے لیے کسی دوسرے لائحۂ عمل کو درست سمجھتے ہیں، تو عقلی تقاضا ہے کہ اس کی کوئی دلیل ہونی چاہیے۔

ہمارے اربابِ اختیار نے کبھی اس بات سے انکار نہیں کیا کہ وہ ریاست کے اسلامی تشخص کو نہیں مانتے، بلکہ وہ ہمیشہ نفاذِ اسلام کو اپنی ترجیحات میں شامل کرتے ہیں۔ ملک کی تمام قابلِ ذکر سیاسی قوتیں، اپنے منشور میں اسلام کا تذکرہ، لازماً، کرتی ہیں، بلکہ وہ اس سے بڑھ کر اس بات کے بھی علم بردار ہیں کہ وہ اسلام کو نافذ کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ کبھی جمعہ کی چھٹی کا اعلان

کر دیتے ہیں، کبھی اسمبلی سے شریعت بل نام کا مسودۂ قانون منظور کرا دیتے ہیں، کبھی بیت المال کے نام سے کوئی ادارہ قائم کر دیتے ہیں، مزاروں پر چادریں بھی اہتمام کے ساتھ چڑھاتے رہتے ہیں، لیکن، جاننے والے جانتے ہیں کہ اہلِ اقتدار کے ان اقدامات کا نفاذِ اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اب اس کی دو ہی وجوہات ہوسکتی ہیں: یا تو وہ اُن ذمہ داریوں سے بے خبر ہیں، جو اسلامی ریاست کے اہلِ اقتدار پر عائد ہوتی ہیں، یا پھر وہ دانستہ گریز کی راہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اگر پہلی صورت ہے، اور انھیں یہ معلوم ہی نہیں کہ ایک اسلامی ریاست کے حکمرانوں پر کیا لازم ہے اور خلافتِ راشدہ میں اس کی کیا شکل ہمارے سامنے آتی ہے، تو اس کا علاج یہی ہے کہ انھیں اُن فرائض سے آگاہ کیا جائے جن کے لیے اسلام اُن کو پابند کرتا ہے، اور انھیں اس بات پر آمادہ کرنے کی سعی کی جائے کہ وہ اپنی ذمہ داریاں قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق ادا کریں۔ اور اگر معاملے کی نوعیت دوسری ہے کہ وہ نفاذِ اسلام کے لیے مخلص نہیں اور ان کا یہ گریز دانستہ ہے، تو ایسی صورت میں قیادت کی تبدیلی کے لیے بھی جدوجہد کی جاسکتی ہے، لیکن اس طرح کے معاملات میں بھی کوئی ایسی تدبیر یا حکمتِ عملی اختیار نہیں کی جانی چاہیے، جو ملک کے آئین سے متصادم ہو اور اپنی حقیقت میں 'دعوت' اور 'انذار' سے متجاوز ہو۔ چنانچہ یہ امر واقعہ ہے کہ غلبۂ دین کے وہ داعی، جنھیں اللہ نے 'تفقہ فی الدین' یعنی دین میں بصیرت کی صلاحیت بخشی ہے، اور جو اس کام کی ناگزیر ضرورت ہے، وہ ملکی آئین یا معروف کے خلاف کسی اقدام کو کبھی جائز نہیں سمجھتے۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ جنھیں اس ملک میں نفاذِ اسلام کی کوششوں کے ضمن میں یقیناً امام کا درجہ حاصل ہے، فرماتے ہیں:

> "..... ایک آئینی اور جمہوری نظام میں رہتے ہوئے تبدیلیِ قیادت کے لیے کوئی غیر آئینی راستہ اختیار کرنا شرعاً آپ کے لیے جائز نہیں ہے اور اس بنا پر آپ کی جماعت کے دستور نے آپ کو اس امر کا پابند کیا ہے کہ آپ اپنے پیشِ نظر اصلاح و انقلاب کے لیے آئینی و جمہوری طریقوں ہی سے کام کریں۔" (تحریکِ اسلامی کا آئندہ لائحۂ عمل، ابو الاعلیٰ مودودی، ص ۲۰۵)

جماعتِ اسلامی کے دستور کی جس شق کا مولانا حوالہ دے رہے ہیں، اس میں درج ہے:

> "اپنے مقصد اور نصب العین کے حصول کے لیے جماعت کبھی ایسے ذرائع اور طریقوں کو استعمال نہیں کرے گی جو صداقت اور دیانت کے خلاف ہوں یا جن سے فساد فی الارض رونما ہو۔
>
> جماعت اپنے پیشِ نظر اصلاح اور انقلاب کے لیے جمہوری اور آئینی طریقوں سے کام کرے گی، یعنی یہ کہ تبلیغ و تلقین اور اشاعتِ افکار کے ذریعے سے ذہنوں اور سیرتوں کی اصلاح

کی جائے اور رائے عامہ کو ان تغیرات کے لیے ہموار کیا جائے جو جماعت کے پیش نظر ہیں۔

جماعت اپنے نصب العین کے حصول کی جدوجہد خفیہ تحریکوں کے طرز پر نہیں کرے گی، بلکہ کھلم کھلا اور علانیہ کرے گی۔ (دفعہ ۵ ذیلی شق ۲، ۳، ۴)"

مولانا مودودی اس بات کے ہمیشہ قائل رہے ہیں کہ ملک میں تبدیلی کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ رائے عامہ کو ہم نوا بنایا جائے اور اس کے لیے جمہوری طریقے سے جدوجہد کی جائے۔ وہ اپنی بات کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

"اسلامی نظام جسے برپا کرنے کے لیے ہم اُٹھے ہیں، جمہوری طریقوں کے سوا کسی دوسری صورت سے برپا نہیں ہو سکتا اور اگر کسی دوسرے طریقے سے برپا کیا بھی جاسکے تو وہ دیرپا نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ غیر جمہوری طریقوں کے مقابلے میں جب جمہوری طریقوں کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ نظام زندگی میں جو تبدیلی بھی لانا اور ایک نظام کی جگہ جو نظام بھی قائم کرنا مطلوب ہو، اُسے زور زبردستی سے لوگوں پر مسلط نہ کیا جائے بلکہ عامۃ الناس کو سمجھا کر اور اچھی طرح مطمئن کر کے انھیں ہم خیال بنایا جائے اور ان کی تائید سے اپنا مطلوبہ نظام قائم کیا جائے۔" (ماہنامہ 'ترجمان القرآن' جنوری ۱۹۹۳ء، ص ۳۴-۳۵)

مسلمان حکمران، اگر سر عام اسلامی شعائر کی توہین کرنا شروع کر دیں، تارکِ نماز ہوں، یا اُن کی حکومت کی بنا جبر پر ہو تو اُن کے خلاف بغاوت ہو سکتی ہے۔ بغاوت یا خروج کن حالات میں جائز ہے اور اس کی کیا شرائط ہیں، ہمارے فقہا نے اس باب میں تفصیلات بیان کر دی ہیں۔ اس بارے میں اسلام کا جو رویہ سامنے آتا ہے، وہ یہ ہے کہ اربابِ اقتدار کے انحراف کو تو کسی حد تک گوارا کیا جا سکتا ہے لیکن فساد فی الارض کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اس امت کے صاحبانِ علم کا جو رویہ ہم دیکھتے ہیں، اُس کی نوعیت بھی یہی ہے کہ وہ، بالعموم، ایسی تحریکوں سے دُور رہے ہیں، جن کے نتیجے میں کسی تبدیلی کے، بظاہر، آثار نہ ہوں، اور محض چند نیک افراد کی زندگیوں کو خطرات لاحق ہوں۔ خروج کے لیے یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ اہلِ خروج کو وسیع عوامی تائید حاصل ہو۔ اور ان کی کامیابی کے امکانات بہت واضح ہوں۔ اس امت میں پہلا خروج حضرت حسین ابن علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے سامنے آیا۔ اور اس بارے میں تاریخ کی کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ انھیں اس اقدام سے گریز کا مشورہ دیا گیا۔ مثال کے طور پر آپ کے بھائی محمد بن حنفیہ نے آپ سے کہا:

"اے جانِ برادر! آپ دنیا میں مجھے سب سے بڑھ کر عزیز ہیں۔ آپ سے زیادہ اور کوئی

نہیں، جس کے لیے خیر خواہی بجا کر رکھوں۔ میری گزارش ہے کہ آپ جا تو رہے ہیں مگر ایک دم سے کسی شہر کا ارادہ مت کیجیے، بلکہ شہروں سے دور رہتے ہوئے اپنے آدمی مختلف علاقوں میں بھیجیے اور اپنی بیعت کی دعوت دیجیے۔ اگر لوگ قبول کرلیں، تو اللہ کا شکر ادا کیجیے اور آپ کی بجائے کسی دوسرے پر اتفاق کرلیں، تو اس سے نہ آپ کے دین کو کوئی بٹہ لگے گا، نہ عقل کو اور نہ آپ کی شان و منزلت میں کوئی فرق آئے گا . . . . ؛

(واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر، عتیق الرحمٰن سنبھلی، بحوالہ طبری، ج ۶، ص ۱۹۰ - ۱۹۱)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے متعلق روایت ہے کہ انھوں نے کہا:

"اپنی جان کے بارے میں اللہ سے ڈریے۔ اپنے گھر میں رہیے اور اپنے امام پر خروج مت کیجیے۔"

(واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر، بحوالہ البدایہ والنہایہ، ج ۸، ص ۱۶۳)

چنانچہ سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر بعد میں، جب یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ ان کے اس اقدام کو وہ عوامی تائید حاصل نہیں جو ضروری ہے، تو انھوں نے وہ تین متبادل حل پیش کیے، جن کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے، یعنی یہ کہ میں اس جگہ لوٹ جاؤں جہاں سے آیا ہوں، یا یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دوں اور وہ میرے اور اپنے معاملے میں فیصلہ کرے، یا مسلمانوں کے کسی سرحدی مقام پر چلا جاؤں۔

اسی طرح کے مسئلے میں اس امت کے ایک جلیل القدر عالمِ دین اور فقیہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا رویہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ ان کی زندگی میں جو خروج ہوئے، انھوں نے اس سے گریز کی راہ اختیار کی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ مسلمان حکمرانوں کے رویے سے مطمئن تھے۔ بنوامیہ اور بنو عباس کے ادوارِ حکومت میں انھوں نے جس طرح ہر قسم کے حکومتی منصب سے اپنا دامن بچایا اور اس انکار پر ذہنی اور جسمانی اذیتیں برداشت کیں، وہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ان حکمرانوں کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ وہ امت کی قیادت کریں۔ اس معاملے میں ان کا حال یہ تھا کہ انھوں نے بغداد میں دفن ہونا پسند نہیں کیا، کیونکہ اس کی زمین ان کے نزدیک حکمرانوں نے ناجائز طریقوں سے حاصل کی تھی۔ جبھی خلیفہ منصور کو جب اس کی خبر ہوئی تو اس نے کہا:

"ابوحنیفہ، زندگی اور موت میں تیری پکڑ سے مجھے کون بچائے گا۔"

(حضرت امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، مناظر احسن گیلانی، ص ۲۷۶)

کسی خروج کا ساتھ نہ دینے کی یہ وجہ بھی نہیں تھی کہ انھیں اہلِ خروج کے کردار پر کوئی شبہ تھا بلکہ

روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسے افراد کے حسنِ کردار کے مداح تھے۔ ابراہیم صائغ جنھوں نے ابومسلم خراسانی کے مظالم کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا، اُن کے بارے میں عبداللہ بن مبارک کی روایت کے مطابق، ابوحنیفہ نے فرمایا:

کان شدید الورع، شدید البذل لنفسہ فی طاعۃ اللہ۔	"وہ بڑے سخت پرہیزگار اور اللہ کی اطاعت پر جان چھڑکنے والوں میں سے تھے:"

یہی ابراہیم، جب امام ابوحنیفہ کے پاس آئے اور انھیں اُن خطرات سے آگاہ کیا، جو ابومسلم خراسانی کے وجود سے امت کو لاحق تھے، تو امام نے ان سے اتفاق کیا اور بعض روایات کے مطابق اس بات کی تائید کی کہ مسلمانوں کو اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہونا چاہیے۔ اس پر ابراہیم نے کہا کہ میں اس امر کے لیے آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں، لیکن ابوحنیفہ اس کے لیے آمادہ نہ ہوتے اور اس کے جواب انھوں نے جو کچھ کہا، وہ اس مسئلے میں اُن کے موقف کا ترجمان ہے۔ امام نے کہا:

"میں نے بیعت لینے سے انکار کیا اور کہا کہ اس حق کو ادا کرنے کے لیے ایک دو آدمی اگر کھڑے ہوں تو قتل کر دیے جائیں گے اور مخلوقِ خدا کے لیے کام کی کوئی بات انجام نہ دے سکیں گے۔"

امام ابوحنیفہ نے مزید کہا:

ھذا الامر لا یصلح لواحد ما اطاقہ الانبیاء، حتی عقدت علیہ من السماء۔	"یہ تنہا کسی آدمی کے بس کی بات نہیں، پیغمبروں کے لیے بھی یہ صورتِ حال اُسی وقت موزوں ہوئی جب آسمان پر ان کے لیے عہد باندھا گیا۔"

(حضرت امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، مناظر احسن گیلانی، ص ۲۵۰)

ابراہیم، جو خود بھی دین کے جید عالم تھے، ان کا طرزِ عمل بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد انھوں نے کوئی مسلح بغاوت منظم نہیں کی۔ چونکہ ابومسلم خراسانی سے ان کے تعلقات رہے تھے، اس لیے وہ دو تین بار اس کے ہاں گئے، اور ابنِ سعد کے مطابق: "ابراہیم، ابومسلم کے پاس آتے اور اسے نصیحت کی:"

اس نصیحت میں انھوں نے تیز و تند لہجہ بھی اختیار کیا، اور اس کے نتیجے میں ابومسلم نے انھیں قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اپنے قتل سے پہلے، انھوں نے جو الفاظ ادا کیے، وہ اس طرح نقل ہوئے ہیں:

ولاجاھدنک بلسانی لیس لی	"میں تجھ سے اپنی جان سے جہاد کروں گا،"

قوة بيدي ولكن يراني الله وانا بغضك فيه.	کیونکہ میرے ہاتھ میں اقتدار نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ میرا مالک مجھے اس حال میں دیکھے کہ میں محض اللہ کے لیے تجھ سے بغض رکھتا ہوں۔"
(حضرت امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، مناظر احسن گیلانی، ص ۲۵۹)	

اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم بھی یہ جائز نہیں سمجھتے تھے کہ مطلوبہ قوت اور تائید کے بغیر وہ ابوسلم کے خلاف اقدام کریں۔ اور اس ضمن میں، انھیں امام ابوحنیفہ کی رائے سے اتفاق تھا۔ تاہم، وہ اِسے عزیمت کی راہ سمجھتے تھے کہ وہ اللہ کے حضور اس حال میں پیش ہوں کہ حق کی شہادت میں انھوں نے اپنی جان دی ہو۔ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے اپنی کتاب "امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی" میں یہ واقعہ نقل کرتے ہوئے، حاشیے میں بڑی مفید باتیں لکھی ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

"'ہدایہ' کے متن کا مسئلہ ہے کہ 'الامر بالمعروف باليد الى الامراء وباللسان الى غيرهم' جس کا مطلب یہی ہے کہ جو اقتدار رکھتے ہیں، انھی سے اس حکم کا تعلق ہے کہ بزور لوگوں کو حق پر قائم کرنے اور باطل سے ہٹانے کی کوشش کریں، لیکن ایک عام آدمی جو حکومت کے اقتدار سے محروم ہے، اس پر صرف زبان سے معروف کا امر اور منکر کی نہی واجب ہے، یہاں تک کہ اس بنیاد پر، امام ابوحنیفہ کا فتویٰ ہے کہ گانے بجانے کے آلات جو ممنوعاتِ شرعیہ میں سے ہیں، اگر کسی مسلمان کے پاس ہوں، اور دوسرا مسلمان اُن کو غیر شرعی قرار دیتے ہوئے توڑ دے گا، تو اس کا تاوان ادا کرنا پڑے گا، کیونکہ اس نے ان حدود میں تصرف کیا ہے، جو اس کے فرائض کے دائرے سے خارج تھے۔ قریب قریب مختلف الفاظ میں مالکی اور شافعی علما کی کتابوں میں بھی یہی لکھا ہے، یعنی مارنے پیٹنے پر یا قتل و قتال پر آمادہ ہو جانا یہ عام لوگوں کا کام نہیں ہے . . . ."

چنانچہ، قرآن و سنت کے محکم دلائل کی بنیاد پر، ہم یہ رائے رکھتے ہیں کہ اقتدار کے بغیر دعوت و اصلاح کا جو کام ہوگا، وہ محض 'دعوت' ہے۔ سامت کے جلیل القدر افراد کے طرزِ عمل سے، جیسا کہ ہم نے بیان کیا، یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں، جب کبھی ایسا مرحلہ آیا کہ مسلمان حکمران اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہوئے، تو انھوں نے اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق، دعوت و انذار ہی کی حکمتِ عملی اپنائی، اور اس امر سے گریز کیا کہ حکمرانوں سے کوئی مسلح تصادم ہو۔ اگر کسی نے اس ارادے کا اظہار کیا، تو انھوں نے ایسے افراد کو یہی تلقین کی کہ وہ دیگر شرائط کے علاوہ مطلوبہ عوامی تائید حاصل کریں، جس سے انتقالِ اقتدار ممکن ہو، ورنہ اس کا نتیجہ سوائے فساد کے کچھ نہیں ہوگا۔ اسلاف کے اس طرزِ عمل میں ہمیں کہیں 'اقدام'

یا 'ہجرت' کی نوعیت کی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی، بلکہ ان کی زندگی سرتاسر 'محض دعوت' ہے۔

اسی طرح حکمتِ عملی کے باب میں، جب ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ کوئی منصوص معاملہ نہیں تو اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے اس ضمن میں جو راہنمائی میسر ہے، وہ چند اصولوں پر مبنی ہے۔ رہی یہ بات کہ اس کی کسی خاص معاشرے میں متعین صورت کیا ہوگی، تو اس معاملے میں حالات و زمانہ کی رعایت ملحوظ رکھی جائے گی۔ ایک داعی جس معاشرے میں رہ رہا ہے اور جس عہد میں جی رہا ہے، اس کی نوعیت پیشِ نظر ہوگی۔ جو حکمتِ عملی آج پاکستان کے حالات میں اپنائی جائے گی، وہ اُس سے مختلف ہوگی جو غلبۂ دین کے لیے دنیا کے کسی دوسرے حصے میں اختیار کی جائے گی۔

اسی طرح، دنیا میں اس جدوجہد کے نتائج کبھی مثبت ہو سکتے ہیں، اور کبھی منفی۔ یہ لازم نہیں کہ غلبۂ دین کی ہر جدوجہد کامیابی سے ہمکنار ہو۔ ہمارے ہاں، عام طور پر، یہ سمجھا جا رہا ہے کہ دین کی ہر دعوت کو 'لازماً' کامیابی حاصل ہونی چاہیے، اور اگر ایسا نہیں ہوتا، تو یہ دعوت یا داعی میں کسی کمی کے باعث ہے۔ چنانچہ، اس ضمن میں، قرآنِ مجید کی بعض آیات کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے، حالانکہ یہ آیات اللہ کے اس قانون سے متعلق ہیں، جو اس کے رسولوں کے لیے خاص ہے۔ اللہ کے رسولوں کے بارے میں اس کا قانون یہی ہے کہ وہ لازماً غالب رہتے ہیں۔ یہ غلبہ، رسول کی زندگی میں بھی حاصل ہو سکتا ہے اور اس کی وفات کے بعد اس کے انصار کے ذریعے بھی۔ اُن کی مخاطب قوم یا تو اُن پر ایمان لے آتی ہے یا صفحۂ ہستی سے مٹا دی جاتی ہے۔ قرآنِ مجید کا اعلان ہے:

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ۔ "اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول، بہرحال، غالب رہیں گے۔" (المجادلہ ۵۸: ۲۱)

اللہ کے اس قانون کا اطلاق کسی غیر رسول داعی پر نہیں ہوتا۔ ایک غیر نبی تو ایک طرف، خود اُن انبیا کے بارے میں، جو منصبِ رسالت پر فائز نہیں، اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ کبھی غالب رہتے ہیں اور کبھی مغلوب۔ استاذِ محترم جاوید احمد صاحب غامدی اپنی کتاب 'قانونِ دعوت' میں لکھتے ہیں:

> "قرآنِ مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ حق کے عام داعی تو ایک طرف، یہ مرحلہ ان نبیوں کی دعوت میں بھی نہیں آیا، جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت ملی، لیکن وہ رسالت کے منصب پر فائز نہیں ہوئے۔ بنی اسرائیل کے نبیوں میں سے حنانی اور میکایاہ جیل بھیج دیے گئے۔ الیاس کو جزیرہ نمائے سینا کے پہاڑوں میں پناہ لینا پڑی۔ زکریا ہیکلِ سلیمانی میں 'مقدس' اور 'قربان گاہ' کے درمیان سنگسار ہوئے۔ یرمیاہ پیٹے گئے، قید ہوئے اور رسی سے باندھ کر کیچڑ بھرے حوض میں لٹکا

> دیے گئے۔ عاموس جلا وطن ہوئے اور یحییٰ کا سر ایک رقاصہ کی فرمایش پر قلم کر کے، ایک تھال میں رکھ کر اس کی نذر کر دیا گیا، لیکن ان میں سے کسی کی دعوت میں بھی ہجرت و براءت کا وہ مرحلہ نہیں آیا، جو ان نبیوں کی دعوت میں، لازماً، آیا جو رسالت کے منصب پر فائز ہوئے اور اس طرح خدا کی حجت بن کر اس زمین پر آئے۔" (ص ۳۲، ۳۳)

پھر حکمتِ عملی کے باب میں، جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اس کا تعین زمان و مکان کی رعایت سے کیا جائے گا، تو یہ بات انسانی فطرت کے بھی عین مطابق ہے۔ انسانی تہذیب و تمدن، ارتقا کے جن مراحل سے گزرے ہیں اور آج بھی جیسے یہ عمل جاری ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جاہلیت، ہر عہد میں، ایک نئے روپ میں سامنے آتی ہے، اور اسے ہم زمانے کے چیلنج کا نام دیتے ہیں۔ غلبۂ دین کی کوئی تحریک، اس چیلنج سے نبرد آزما ہوئے بغیر، معاشرے میں اپنی ساکھ نہیں بنا سکتی۔ جاہلیت، جس پہلو سے وار کرتی ہے، عقل کا تقاضا یہی ہے کہ اسے اسی حوالے سے جواب دیا جائے۔ حالات کے تفاوت سے حکمتِ عملی میں جو تغیر واقع ہوتا ہے، اس کا اندازہ انبیا و رسل کی سیرتوں کے مطالعے سے بھی ہوتا ہے اور مصلحینِ امت کے کام سے بھی۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام، بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے جدوجہد کرتے رہے ہیں، کیونکہ یہ اُن کے زمانے کا بڑا چیلنج تھا۔ سیدنا مسیح علیہ السلام مواعظ و خطبات سے، تمثیلی اسلوب میں، اللہ کے دین کی طرف بلاتے رہے ہیں۔ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے مراحل انبیائے سبق سے مختلف ہیں۔ یہ سب اس بات کی شہادت ہے کہ آپ جس عہد میں جی رہے ہیں، سب سے پہلے، اس کا شعور حاصل کریں، اور پھر پوری تیاری کے ساتھ درپیش چیلنج کا مقابلہ کریں۔ اس امت کی تاریخ پر نظر ڈالیے، اور تجدید و احیائے دین کی مساعی کا جائزہ لیجیے، تو معلوم ہوتا ہے کہ کبھی حدیث کے عنوان سے دین میں موضوع چیزیں داخل کی جا رہی ہیں، کبھی تاریخ سازی کے حوالے سے اسلامی تاریخ کے زریں عہد سے متعلق شکوک و شبہات پیدا کیے جا رہے ہیں، کبھی تصوف کے نام پر دین کو قرآن و سنت کی بجائے کشف و الہام سے مربوط کیا جا رہا ہے، اور ماضی قریب میں مغربی تہذیب کے اثرات سے اس امت کے مجموعی تشخص کو متاثر کیا جا رہا ہے۔ دوسری طرف تجدید و احیائے دین کے قافلے پر نظر ڈالیے، تو کہیں امام بخاری و امام مسلم ہیں، جو وضعِ حدیث کے محرکات کا سراغ لگا رہے ہیں، کہیں ابنِ خلدون ہیں، جو تاریخ نگاری کے فن کو مستحکم کر رہے ہیں، کہیں ابنِ تیمیہ ہیں جو تصوف کی ضلالتیں رفع کر رہے ہیں اور کہیں اقبال و مودودی ہیں، جو مغربی تہذیب کے اصل روپ کو بے نقاب کر کے اسلامی

تہذیب کے اصول و مبادی نمایاں کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ یہ تو محض چند نام ہیں، ورنہ اس امت میں ایسے جلیل القدر لوگوں کی کمی نہیں رہی، جو اپنے اپنے دور میں یہ خدمت سرانجام دیتے رہے ہیں۔ ان خدمات کے بارے میں یہ واضح رہنا چاہیے کہ یہ انسانی کاوشیں ہیں اور انھیں حرفِ آخر قرار دیا جا سکتا، اور نہ غلطیوں سے مبرا کہا جا سکتا، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس امت میں بڑا مقام انھی لوگوں کا ہے، جنھوں نے اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق، اپنے عہد کے چیلنج کو سمجھا اور پھر اس کی بنیاد پر دین کی خدمت کے لیے میدانِ عمل کا انتخاب کیا۔ اور غور کیجیے تو یہ انھی اہلِ خیر کی مساعی کا نتیجہ ہے کہ دین اپنی اصل صورت میں محفوظ و مامون ہے۔

اگر کوئی یہ اعتراض اٹھائے کہ یہ انفرادی علمی خدمات ہیں، جن کا غلبۂ دین سے کوئی تعلق نہیں تو یہ محض ایک مغالطہ ہو گا۔ تجدید و احیائے دین کے لیے کی جانے والی یہ کوششیں، بالعموم، اس عہد سے متعلق ہیں، جب مسلمانوں کا ایک اجتماعی نظم موجود تھا۔ اس میں، اگرچہ خرابیاں موجود تھیں، لیکن اس کے باوجود، دین کو ریاست کی سطح پر یہ مقام حاصل تھا کہ اہلِ اقتدار کے لیے، اس سے کھلم کھلا انحراف ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ، اگر وہ کبھی سیاسی اغراض یا خواہشاتِ نفسانی کے تحت کوئی اقدام کرنا چاہتے، تو انھیں اس کے لیے، بہرحال، دین ہی سے جواز تلاش کرنا ہوتا تھا، لیکن، ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جب حکمرانوں نے ایسا کوئی قدم اٹھانا چاہا، تو یہی صاحبانِ علم و تفقہ، صاحبانِ عزیمت بن کر میدان میں نکل آتے اور ان کے غلط اقدام کی دینی تعبیر کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔ بنو عباس اپنے اقتدار کے لیے، جو بیعت لیتے تھے، اس میں یہ شامل تھا کہ اگر کسی نے اس بیعت سے انحراف کیا، تو بیعت منقطع کرنے والے اور اس کی بیوی کے مابین طلاق واقع ہو جائے گی۔ امام مالک سے جب اس معاملے میں استفسار کیا گیا تو انھوں نے جبری طلاق کے عدمِ وقوع کا فتویٰ دیا۔ اس فتوے کی پاداش میں انھیں جو اذیتیں سہنا پڑیں، وہ ہماری تاریخ کا ایک المناک باب ہے۔ ان کی مشکیں اس زور سے کسی گئیں کہ ان کے بازو شانوں سے اکھڑ گئے۔ ان کے جسم پر ستر کوڑوں کی ضربیں لگائی گئیں اور سر بازار رسوا کرنے کے لیے اونٹ پر سوار کرایا گیا تو وہیں سے گویا ہوتے:

"جو مجھ کو جانتا ہے، وہ تو جانتا ہی ہے اور جو نہیں جانتا تو جان لے کہ میں ہوں مالک، انس کا بیٹا اور اعلان کرتا ہوں کہ طلاقِ مکرہ کوئی چیز نہیں۔"

اور پھر اسی بنو عباس کے عہد میں انھیں پیش کش کی گئی کہ وہ رضامند ہوں تو موطا کو ملک کا سرکاری قانون قرار دے دیا جائے، لیکن انھوں نے اس بات کو بھی پسند نہیں کیا۔ یہی معاملہ امام

ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ کا ہے۔ امام اپنے عہد کی سیاسی کشمکش میں کبھی براہِ راست شریک نہیں ہوئے، لیکن مسلمانوں پر ان کے علمی اثرات کا یہ عالم تھا کہ مامون کے ایک پسندیدہ وزیر فضل بن سہل کو کسی نے مشورہ دیا کہ عدالتوں کو امام ابوحنیفہ کی آرا پر فیصلہ کرنے سے روک دیا جاتے۔ اس نے رائے کے لیے اہلِ علم و دانش کو جمع کیا اور سب نے یہ کہا:

"اس بات کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، بلکہ سارا ملک آپ (عباسی حکمرانوں) پر ٹوٹ پڑے گا۔ (اور حکومت کا نظام درہم برہم ہو جائے گا)۔" (امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، مناظر احسن گیلانی، ص ۴۸۲)

فضل سے لوگوں نے یہ بھی کہا:

"جس نے آپ کو یہ رائے دی ہے، وہ کوئی ناقص العقل ہے۔"

(امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، مناظر احسن گیلانی، ص ۴۸۲)

یہ اس دور کا واقعہ ہے، جب امام کو دنیا سے رخصت ہوئے نصف صدی ہونے کو تھی۔ لیکن عالمِ اسلام پر یہ اُن کے غیر معمولی اثرات تھے کہ حکمرانوں کے لیے ان کی رائے سے اعراض ممکن نہیں رہا تھا۔ غور کیجیے تو یہ محض اُن کے علمی کام کے اثرات تھے۔ یہ علمی کام انفرادی سطح پر ہوا، لیکن یہ اس کا نتیجہ تھا کہ ریاست کی سطح پر دین کی برتری کا انکار ممکن نہ ہو سکا۔ ان واقعات سے دو باتیں اور بھی ثابت ہیں: ایک یہ کہ دین کی خدمت کے لیے حکمرانوں سے براہِ راست تصادم ضروری نہیں، اور اگر کبھی ایسا مرحلہ درپیش ہو کہ حکمران، اہلِ دین کو اپنے لیے خطرہ سمجھنے لگیں، تو بہترین حکمتِ عملی صبر اور استقامت ہے۔ دوسرے یہ کہ حکمتِ عملی کا تعین، بہرحال، اپنے حالات کے مطالعے اور اپنے اجتہاد کے بعد ہی کیا جائے گا۔

جو لوگ حکمتِ عملی کو ایک منصوص معاملہ قرار دیتے ہیں، اور اس کا استنباط رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ سے کرتے ہیں، وہ دیگر امور کے علاوہ قیامِ جماعت کو بھی لازم بتاتے ہیں۔ اُن کے نزدیک، ہر فرد کے لیے لازم ہے کہ وہ جماعت کے ساتھ رہے۔ وہ اس ضمن میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات پیش کرتے ہیں جن میں "الجماعت" سے الگ رہنے والوں کے لیے سخت وعید سنائی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ محض نقصِ فہم ہے۔ احادیث میں مسلمانوں کو جس جماعت سے الگ ہونے سے روکا گیا ہے، اُس سے مراد مسلمانوں کا 'نظمِ اجتماعی'، یا دوسرے لفظوں میں اُن کا 'ریاستی نظام' ہے۔ ان احادیث کا کسی خاص گروہ یا صالحین کی کسی جماعت سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسری حدیث میں "السلطان" کا لفظ بیان

کرکے اس رائے کے لیے کوئی گنجایش باقی نہیں رہنے دی۔ آپ نے فرمایا:

من کرہ من امیرہ شیئاً	"جسے اپنے امیر کی کوئی بات ناگوار گزرے،
فلیصبر، فانہ من خرج	اسے چاہیے کہ وہ صبر کرے، کیونکہ جو ایک
من السلطان شبراً مات	بالشت کے برابر بھی، اقتدار کی اطاعت سے
میتۃ جاھلیۃ۔	نکلا، اور اسی حالت میں مرگیا، اس کی موت
(بخاری۔ کتاب الفتن)	جاہلیت پر ہوئی۔"

اب دوسری روایت دیکھیے، جس میں رسول اللہ سے "الجماعت" کا لفظ منسوب ہے:

من رایٰ من امیرہ شیئاً یکرھہ	"جس نے اپنے امیر کی طرف سے کوئی ناپسندیدہ
فلیصبر علیہ فانہ من فارق	بات دیکھی، اُسے چاہیے کہ وہ صبر کرے، کیونکہ
الجماعۃ شبراً فمات الامات	جو ایک بالشت کے برابر بھی جماعت سے الگ
میتۃ جاھلیۃ۔	ہوا اور اسی حالت میں مرگیا، اس کی موت
(بخاری۔ کتاب الفتن)	جاہلیت پر ہوئی۔"

استاذِ گرامی جاوید احمد غامدی ان روایات کی شرح میں لکھتے ہیں:

"ان روایات میں دیکھ لیجیے۔ 'الجماعۃ' اور 'السلطان' بالکل ایک دوسرے کے مترادف کی حیثیت سے استعمال ہوتے ہیں۔ اس سے 'بالبداہت' واضح ہے کہ 'الجماعۃ' درحقیقت 'السلطان' یعنی سیاسی اقتدار ہی ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کا اطلاق مسلمانوں کی کسی ایسی جماعت ہی پر کیا جا سکتا ہے، جو کسی سرزمین میں سیاسی خود مختاری رکھتی اور جس کے اندر نظام امارت قائم ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اسی کے التزام کی ہدایت فرمائی ہے، اور اس سے نکلنے کو اسلام سے نکلنے کے مترادف قرار دیا ہے۔ سیاسی اقتدار سے محروم کسی دینی جماعت یا تنظیم کے ساتھ اس حکم کا کوئی تعلق نہیں۔" (قانونِ دعوت، ص ۳۰)

اسی بنیاد پر ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک ایسی سرزمین پر جہاں مسلمانوں کا ایک اجتماعی نظم موجود ہے، جیسا کہ پاکستان میں ہے، کسی جماعت کے قیام یا اس میں شمولیت کو دین کا تقاضا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہاں جو بات زیادہ سے زیادہ کہی جا سکتی ہے، وہ یہی ہے کہ "الجماعت" تو موجود ہے، لیکن اس میں خرابیاں ہیں، اور ان کی اصلاح ہونی چاہیے۔

ہمیں اس بات سے پورا اتفاق ہے کہ ہمارا سیاسی ڈھانچہ اور نظام اصلاح کا شدید متقاضی

ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس اصلاح کے لیے کیا لائحۂ عمل ہونا چاہیے۔ حکمتِ عملی کے باب میں اصولی گفتگو کے بعد اب ہم اسی سوال کا قدرے تفصیل سے جواب تلاش کرنے کی سعی کریں گے۔

ایک ایسے معاشرے میں، جہاں حکمران طبقہ دین کے نفاذ میں مخلص نہ ہو اور اس کی تمام سعی کامروان کی اپنی تمنائیں ہوں؛ ایک ایسے سماج میں، جہاں علما کا گروہ جدید رجحانات اور زمانے کی علمی ترقی سے بے نیاز فرقہ وارانہ جھگڑوں اور فروعی مسائل میں الجھا ہوا ہو؛ ایک ایسی سوسائٹی، جہاں صاحبانِ دعوت و اصلاح ایسا خانقاہی نظام ترتیب دے رہے ہوں، جہاں تصرف کے نام پر ایک نیا دین سکھایا جاتا ہو، اور اہلِ خانقاہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے، لوگوں کی سادگی و جہالت کا سودا کرتے ہوں، ایسے ماحول میں یہ ناگزیر ہے کہ غلبۂ دین کی جدوجہد بھرپور اور سہ جہتی ہو۔ یعنی نظمِ اجتماعی کی اصلاح، علمی و فکری کام اور دینِ خالص پر عمل کی ترغیب۔ ایک طرف یہ جدوجہد کی جائے کہ ہمارے اربابِ حل و عقد اپنی اصلاح کر لیں اور اُن ذمہ داریوں کو نبھانے کے لیے آمادہ ہو جائیں، جو ایک اسلامی ریاست کے حکمران کی حیثیت سے اُن پر عائد ہوتی ہے۔ اگر وہ اس کے لیے تیار نہ ہوں، تو ایسے افراد کو مسندِ اقتدار تک پہنچانے کی سعی کی جائے، جن کے اندر وہ اوصاف موجود ہوں، جو اسلامی ریاست کے حکمرانوں کے لیے بنیادی ضرورت ہیں۔ دوسری طرف، وہ علمی و فکری کام سامنے آئے، جو مذہب، سیاست، معیشت، معاشرت اور دیگر شعبہ ہائے حیات میں موجود عصری افکار اور نظاموں کے مطالعے پر مبنی ہو، اور دینِ اسلام کی روشنی میں اُن مسائل کا حل پیش کرے، جس سے آج انسانیت دوچار ہے۔ اس کام کو جہاں پورے علمی وقار کے ساتھ سرانجام دینا چاہیے، وہاں عصری اسلوب کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے، تاکہ معاشرے کی ذہانت اُس احساسِ کمتری سے باہر آ سکے، جس میں دنیا کی غالب فکر نے اُسے مبتلا کر دیا ہے۔ اسی طرح اس معاشرے میں دعوت و اصلاح کے عنوان سے بھی کام کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ قرآن و سنت کی بنیاد پر لوگوں کو شعوری عمل کے لیے آمادہ کیا جائے۔

ان تینوں کاموں کے بارے میں یہ اصولی بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ یہ ایک فرد کے بس کی بات نہیں کہ وہ سیاسی انقلاب کی جدوجہد، علمی کام اور اصلاح و دعوت کی سعی، بیک وقت، کر سکے۔ اسی طرح یہ بھی آسان ہے کہ ان تینوں کاموں کو ایک نظام کے تحت جمع کیا جا سکے، اس لیے کہ اگر کوئی آدمی دین کے فکری و علمی غلبے کے لیے کوئی کام کرنا چاہتا ہے، تو یہ کم و بیش ایک ہمہ وقتی کام ہے۔ دین کا اعلیٰ علم، عصری نظاموں اور افکار پر گہری نظر اور اس سلسلے میں تحریر یا تقریر کی خدمت،

یہ سب چیزیں اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتیں، جب تک کوئی فرد، دیگر مشاغل سے آزاد ہو کر، محض اسی کام کا ہو کر نہ رہ جائے۔ یہی معاملہ سیاسی جدوجہد کا ہے۔ لوگوں سے رابطہ، ملک گیر دورے، جلسوں سے خطاب، سیاسی و اجتماعی مسائل کا حل، کیا اس سرگرمیوں کی موجودگی میں یہ ممکن ہے کہ کوئی آدمی کچھ دوسرا کام ڈھنگ کے ساتھ کر سکے؟ اگر کوئی شخص یہ سب کام، بیک وقت کرنے کی کوشش کرے گا، تو یہ ممکن ہے کہ اس کی کوئی عملی شکل سامنے آجائے، لیکن یہ ایسا ہی کام ہو گا جس کے اثرات محدود ہوں گے، اور وہ معاشرے کی عمومی فضا میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکے گا چنانچہ، دیکھیے کہ اسلام کی پوری تاریخ کسی ایسی مثال سے خالی ہے کہ کسی فردِ واحد نے علمی و فکری کام، دعوتی و سیاسی کام، بیک وقت کیا ہو۔ اسلامی تاریخ میں ابوحنیفہ جیسے فقیہ ملیں گے، سعدی و رومی جیسے مصلحین ملیں گے، عمر بن عبدالعزیز جیسے حکمران دکھائی دیں گے، صلاح الدین جیسے مردِ میدان بھی نظر آئیں گے، لیکن کوئی ایسا شخص ملنا محال ہے جس میں بیک وقت، یہ سب خوبیاں ہوں یعنی وہ دین کی فکری و علمی برتری قائم کرنے کے ساتھ اسے معاشرہ کا زندہ دین بھی بنا سکے۔ غلبۂ دین یا تجدید و احیائے دین کسی فردِ واحد کے بس کا کام نہیں، بلکہ ضروری ہے کہ مختلف افراد الگ الگ شعبوں کا تعین کریں، اور پھر اسے اپنا ہمہ وقتی یا اصل کام قرار دیں۔ اس کے بعد یہ ممکن ہے کہ ان کی اجتماعی مساعی سے اللہ کا دین غالب آجائے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ان کاموں کو اپنے الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں:

> "اپنے عہد میں جاہلیت کے حملے کی صحیح تشخیص اور اپنی حدود کے تحت اصلاح کی تجویز، ذہنی انقلاب کی کوشش کے ساتھ عملی اصلاح کرنا، تمدنی حالات کے تحت اجتہاد فی الدین، اسلام کو مٹانے والی سیاسی قوت کا مقابلہ، جاہلیت کے ہاتھ سے اقتدار کی کنجیاں چھین لینا اور پھر ایک عالمگیر اسلامی انقلاب جس کے نتیجے میں اسلام ساری دنیا پر چھا جائے۔" (تجدید و احیائے دین، ص ۴۹)

مولانا نے "تجدید و احیائے دین" میں کارِ تجدید کے یہ مختلف شعبے گنوائے ہیں اور ان کے خیال میں "کامل مجدد صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جو ان شعبوں میں پورا کام انجام دے کر وراثتِ نبوت کا حق ادا کرے" (تجدید و احیائے دین، ص ۴۹)

ہمارے نزدیک ایسا ہونا ممکن نہیں ہے کہ کوئی فردِ واحد یہ سب کام سرانجام دے سکے۔ تاریخ میں تو آج تک کوئی ایسا "مجددِ کامل" پیدا نہیں ہو سکا۔ خود مولانا مودودی، مذکورہ کتاب کے اسی صفحہ پر لکھتے ہیں:

> "تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک کوئی مجددِ کامل پیدا نہیں ہوا۔ قریب تھا

کہ عمر بن عبدالعزیز اس منصب پر فائز ہو جاتے، مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کے بعد جتنے مجدد پیدا ہوئے ان میں سے ہر ایک نے کسی خاص شعبے یا چند شعبوں ہی میں کام کیا۔ مجدد کامل کا مقام ابھی تک خالی ہے، مگر عقل چاہتی ہے، فطرت مطالبہ کرتی ہے، اور دنیا کے حالات کی رفتار متقاضی ہے کہ ایسا لیڈر پیدا ہو، خواہ وہ اس دور میں پیدا ہو یا زمانے کی ہزاروں گردشوں کے بعد پیدا ہو۔۔۔۔"

ہمارے نزدیک، البتہ، ایسا ہونا ممکن دکھائی نہیں دیتا کہ اس طرح کا کوئی مجددِ کامل پیدا ہو۔ تاہم یہ ہو سکتا ہے کہ اگر ایک عہد میں ابوحنیفہ، عمر بن عبدالعزیز، سعدی اور صلاح الدین جیسے لوگ جمع ہو جائیں، تو پھر ایک عالمگیر اسلامی انقلاب کی امید کی جا سکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں مختلف شعبہ جات میں اعلیٰ سطح کے لوگ موجود ہوں اور ان کی مشترک مساعی سے کوئی تبدیلی آئے۔ اسی طرح مختلف امور کے اختلاط سے جو عملی مسائل جنم لیتے ہیں، وہ بھی کچھ کم اہم نہیں۔ مثال کے طور پر، ایک علمی کام میں عام طور پر نظری مباحث ہی پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ اس کا تعلق اہلِ فکر کی دنیا سے ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ممکن ہے کہ ایسے افراد کی آرا پر تنقید کرنا پڑے، جو معاشرے میں غیر معمولی اثر و رسوخ رکھتے ہوں۔ یہ بات علمی دنیا میں تو گوارا ہے، لیکن اگر وہ جلسہ عام کا موضوع بن جائے، تو اس سے ایسا انتشار وجود میں آ سکتا ہے جو نظمِ اجتماعی کے لیے خطرہ بن جائے۔ تحریکِ پاکستان کو بطورِ مثال سامنے رکھیے۔ وہ ایک سیاسی تحریک تھی اور قائدِ اعظم ایک سیاسی قائد تھے۔ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے اجتماعی مسائل کا ایک حل پیش کرتے اور اس کے لیے لوگوں کو جمع کرتے تھے۔ لیکن اس دور میں جو بحثیں مسلمان اہلِ علم میں برپا تھیں، قائدِ اعظم، اگر انھیں اپنی تقریروں کا موضوع بنا لیتے، تو کیا یہ ممکن تھا کہ وہ شیعہ، سنی، دیوبندی، بریلوی، اہلِ حدیث وغیرہم، سب کے متفقہ قائد بن جاتے؟ محمد علی جناح، اگر مسلمانوں کے 'قائدِ اعظم' قرار پائے، تو اس کی وجہ یہی تھی کہ بطورِ سیاسی رہنما، انھوں نے مسلمان قوم کی اکثریت کو ان کے اجتماعی مسئلے کے ایک حل پر جمع کر دیا۔ اگر وہ اس کے ساتھ کوئی عالمِ دین بھی ہوتے اور اپنے مذہبی نظریات سے ہم نوائی کو شرط ٹھہراتے، تو شاید انھیں یہ مقام حاصل نہ ہوتا۔

انسان کے فطری رجحانات پر اگر غور کیجیے، تو معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کا فیصلہ بھی تقسیمِ کار ہی کے حق میں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر فرد کسی خاص میلان کے ساتھ دنیا میں آتا ہے۔ طبائع کا ایک فرق ہے جو کچھ افراد کو بعض شعبوں کے لیے مفید اور بعض کے لیے غیر مفید ٹھہرا دیتا ہے۔ مثلاً بعض لوگ اپنے

اندر جسمانی کام کا داعیہ رکھتے ہیں۔ اب اگر ذہنی مشقت کا کوئی کام اُن کے سپرد کر دیا جائے، تو وہ ایک مشکل میں پڑ جاتے ہیں۔ اسی طرح علمی و ذہنی کام کے لیے موزوں فرد جسمانی محنت کے اکثر امور کے لیے غیر موزوں ثابت ہوتا ہے۔ اب اس حقیقت کا اطلاق ایک اسلامی تحریک کے کام پر کیجیے۔ جو افراد علمی کام کا رجحان رکھتے ہیں، یہ بات پہلے اُن کی ضرورت اور پھر مزاج کا حصہ بن جاتی ہے کہ وہ خلوت میں رہیں اور ان کے سماجی روابط محدود ہوں۔ اسی طرح جس آدمی کی افتادِ طبع سیاسی کام کی طرف مائل ہے، وہ لوگوں میں گھرا رہتا ہے اور اس کے سماجی روابط و تعلقات محدود نہیں ہوتے۔ پھر جب دُنیا کا یہ نظام تقسیم کار کی بنیاد پر قائم ہے، اور مختلف شعبوں میں لوگوں کی اجتماعی مساعی سے جو معاشرہ تشکیل پاتا ہے، وہ ایک متوازن معاشرہ ہوتا ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک اسلامی تحریک کے کام میں اس اصول کو قبول نہ کیا جائے۔

تقسیمِ کار کے اصول کو درست مان لینے کے بعد، سب سے اہم سوال یہ ہے کہ پاکستان میں سیاسی انقلاب، جس کے لیے 'اسلامی انقلاب' کی اصطلاح 'بالعموم' استعمال کی جاتی ہے، اس کی حکمتِ عملی کیا ہونی چاہیے۔ ہمارے نزدیک اسلام کے سیاسی انقلاب کے لیے ضروری ہے کہ ایک ایسا قومی محاذ تشکیل دیا جائے، جو ہر طرح کے فرقہ وارانہ تعصب سے آزاد ہو اور جس کی قیادت ایسے افراد کے ہاتھ میں ہو جو صالحیت تو خیر رکھتے ہی ہوں، افتادِ طبع کے اعتبار سے بھی وہ سیاسی کام کے لیے موزوں ہوں۔ اسی طرح اس محاذ کا پروگرام ایک ایسا منشور ہو، جو سیاست، معاشرت، معیشت، تعلیم، غرض کہ ہر اہم مسئلے پر واضح اور دو ٹوک موقف کا حامل ہو۔ سیاسی نظام کن خطوط پر استوار ہو، معاشرے کی اصلاح کیسے کی جائے، معیشت کو کس طرح اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ کیا جائے، ہر موضوع پر کوئی بات مبہم نہ ہو، بلکہ دو اور دو چار کی طرح متعین ہو۔ اس محاذ کی رکنیت پر کوئی اضافی پابندی نہ ہو، بلکہ ہر مسلمان جو اس ملک کا شہری ہے، اس کا رکن بن سکتا ہو۔ تاہم تنظیم کے اندر ایسا تربیتی نظام موجود ہو جس کے تحت قیادت تک، بہر حال، وہی لوگ پہنچ سکیں، جو ذاتی کردار کے علاوہ علمی و سیاسی شعور کے اعتبار سے ملک اور قوم کی راہنمائی کر سکیں۔ تنظیمی نظام مشاورت کے اصول پر قائم ہو اور سیاسی جدوجہد کا اصل محور کسی فرد کی شخصیت کے بجائے 'منشورِ انقلاب' ہو۔ تاہم، قیادت کا کردار چونکہ بنیادی ہے اور لوگ، بالعموم، قیادت ہی سے وابستہ ہوتے ہیں، اس لیے ایسے فطری راستے کھلے رہنے چاہییں، جو کسی اہل فرد کو قیادت کے منصب تک لے جائیں۔

ہمارے ملک میں، بدقسمتی سے، ابھی تک ایسا محاذ وجود میں نہیں آسکا جو اسلامی انقلاب

کے لیے قوم کی امنگوں کا ترجمان ہو، جس طرح 'مسلم لیگ' تحریک پاکستان کے لیے ایک اجتماعی پلیٹ فارم قرار پا گئی تھی، یا پھر پاکستانی سیاست میں سیکولر قوتوں کے لیے 'پیپلز پارٹی' نے، ایک وقت میں، یہ حیثیت حاصل کر لی تھی۔ یہاں مذہب کے نام پر جو سیاسی جماعتیں وجود میں آئیں وہ 'اصلاً' مذہبی فرقوں کے سیاسی گروہ ہیں، جنھوں نے مذہب کے نام پر قوم کو تقسیم تو کیا، اسے جمع نہیں کر سکیں۔ اس وجہ سے قوم نے مذہبی معاملات میں اُن کی رائے کا احترام کیا، لیکن ان کی سیاسی قیادت کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ 'جماعت اسلامی' اگرچہ اس مذہبی گروہ بندی سے آزاد تھی، لیکن محدود رکنیت کے اصول کو اپنا کر اس نے ملک کی آبادی کے ایک بڑے حصے سے اپنے آپ کو 'عملاً' غیر متعلق کر لیا، جن کی تائید کے بغیر کسی جمہوری معاشرے میں کسی تبدیلی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

بعض لوگ تقسیم کار کے اس فلسفے کو صحیح نہیں سمجھتے اور، ان کی طرف سے، اس پر کچھ اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ ایک خیال یہ ہے کہ اللہ کا دین ایک اکائی ہے اور اسے مختلف خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے نزدیک یہ اعتراض، ہمارے نقطۂ نظر کو، پوری طرح نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ تقسیم کار سے دین کی تقسیم لازم نہیں آتی۔ اگر ایک شخص دین کے کسی خاص شعبے میں کوئی خدمت سرانجام دیتا ہے، تو اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ وہ دین کے دوسرے شعبوں کی نفی کر رہا ہے۔ آخر انسانی جسم کے مختلف اعضا کے ماہرین موجود ہیں۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ آنکھ کے امراض کا ماہر ہو، یا کان کا، ان ماہرین کی موجودگی، بہر حال، انسانی جسم کی صحت کی ضمانت ہے۔ کوئی آدمی یہ اعتراض نہیں اٹھا سکتا کہ آنکھ کا ماہر، انسان کے دیگر جسم کی نفی کر رہا ہے، اور اس سے کسی کو انکار نہیں کہ انسانی جسم ایک اکائی ہی ہے۔ اسی طرح حکومت کا معاملہ لیجیے: ہم کہتے ہیں کہ ملک کی معاشی پالیسی ایسا شخص تشکیل دے، جو معیشت کا ماہر ہو، وزیر قانون ایسا شخص ہونا چاہیے، جو قانون کے اسرار و رموز سے واقف ہو، لیکن اس کے ساتھ ہم یہ مانتے ہیں کہ حکومت اصل میں ایک اکائی ہے اور مختلف شعبوں کے ماہر جب مل کر کوئی پالیسی تشکیل دیتے ہیں تو وہ بہتر قرار پاتی ہے۔ اس وقت ہم مغربی حکومتوں کی کارکردگی کا جائزہ لیں تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ مختلف شعبوں کے ماہرین اپنے اپنے علم اور مہارت کو استعمال میں لا کر بحیثیت مجموعی حکومتی نظام تشکیل دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ انسانی جسم کے مختلف اعضا کی تقسیم اور حکومت میں شعبوں کی تخصیص سے اگر ان کی وحدت متاثر نہیں ہوتی، تو یہ کیسے درست ہو سکتا ہے کہ دین میں، اگر شعبہ جاتی تقسیم کی جائے، تو اس سے اس کی وحدت میں فرق آئے گا۔

اعتراض کا ایک پہلو یہ ہے کہ مختلف شعبوں میں کیے جانے والا کام، اثرات کے اعتبار

سے، مجتمع کیسے ہوگا۔ اصل میں جب اجتماعی نظم کی اصلاح کے لیے ایک قومی محاذ وجود میں آئے گا، تو وہی محاذ معاشرے میں ہونے والے علمی و دعوتی کام کے اثرات کو سمیٹنے کا باعث بنے گا۔ اس محاذ پر معاشرے کی ساری ذہانتیں جمع ہوں گی، جو محاذ کے منشور کی تشکیل اور اس کی شرح و وضاحت کا کام کریں گی۔ اسی طرح دعوت و اصلاح کے میدان میں ہونے والا کام اس کی طاقت بنے گا۔ ہماری اپنی تاریخ میں، تحریکِ پاکستان کی صورت میں، اس کی مثال موجود ہے۔ 'مسلم لیگ' جب ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک قومی محاذ بنی، تو علامہ اقبال جیسے مفکر، مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد انصاری جیسے علما، مولانا اشرف علی تھانوی جیسے صوفی، غرض کہ معاشرے کا اکثر علمی و اصلاحی ذہن اس محاذ پر جمع ہو گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہمیں معلوم ہے کہ علامہ اقبال کا فکری کام اپنی جگہ جاری رہا۔ مولانا عثمانی کی علمی سرگرمیاں اپنی سطح پر معاشرے کو متاثر کرتی رہیں اور اسی طرح خانقاہیں بھی اپنے اپنے مقام پر آباد رہیں۔ ان لوگوں کی علمی ساکھ اور معاشرے میں ان کی حیثیت، سب اسی ایک محاذ کی تقویت کا باعث بنیں۔ ایسے محاذ کی یہ بنیادی خوبی ہوتی ہے کہ وہ معاشرے کے علمی و اصلاحی کام کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے کی اہلیت رکھتا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف اگر کسی جماعت میں ایک بند ماحول ہو اور سمع و طاعت کے اصول پر لوگوں کو شرکت کی دعوت دی جاتی، تو معاشرے کی ذہانت تو درکنار، عامۃ الناس کو بھی قائل کرنا ممکن نہیں رہتا۔ غور کیجیے! اگر علامہ اقبال کو یہ دعوت دی جاتی کہ وہ محمد علی جناح کی بیعت کریں یا مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی سے کہا جاتا کہ وہ اس بات کا حلف اُٹھائیں کہ قائدِ اعظم کے ہر حکم کو سنیں اور مانیں گے، تو یہ سب لوگ اسی طرح ان سے لاتعلق رہتے، جس طرح آج سمع و طاعت کا مطالبہ کرنے والوں سے ہمارے معاشرے کے بیشتر لوگ بے نیاز ہیں۔

اس حکمتِ عملی پر ایک اور اعتراض یہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں تقسیمِ کار کے اس فلسفے کی کوئی نظیر موجود نہیں۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں، اس سے قبل، جو کام ہوا ہے، وہ اسی تقسیمِ کار کے اصول پر ہوا ہے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بھی بعض لوگ میدانِ جنگ میں ممتاز تھے، بعض لوگ اپنے علمی ذوق کی وجہ سے علومِ قرآنی میں ماہر تھے، بعض حکومت و ریاست کے معاملات میں گہری بصیرت رکھتے تھے۔ آخر عبداللہ بن مسعود اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہما میں فرق کی وجہ کیا ہے؟ ہمیں معلوم ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی دینی بصیرت انھیں اپنے عہد کی خواتین و حضرات میں ممتاز کرتی تھی اور اکابر صحابہ تک ان سے علمی استفادہ کرتے

تھے۔ لیکن اس وقت ظاہر ہے کہ تمدنی نظام اتنی واضح شکل نہیں اختیار کر پایا تھا کہ ان کی تشکیل اس طرز پر ہوتی، جیسی تہذیبی ارتقا کے بعد آج ممکن ہے۔ چنانچہ جوں جوں، اسلامی ریاست کا نظام مستحکم ہوتا چلا گیا، یہ شعبہ جاتی تقسیم بھی نمایاں ہوتی گئی۔ ہمیں معلوم ہے کہ اسلامی ریاست کا نظام رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ادوار میں ان خطوط پر استوار نہیں ہوا تھا جیسا کہ بعد میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں نظر آتا ہے۔ شاہ ولی اللہ 'ازالۃ الخفا' میں لکھتے ہیں:

"کوفہ، بصرہ اور دوسرے شہروں میں حضرت عمر حاکم جدا، قاضی جدا اور بیت المال کا تحویلدار جدا مقرر فرماتے تھے' اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جس کا ثبوت حضرت عمر فاروق سے پہلے نہیں ملتا۔"

خلافتِ راشدہ کے بعد یہ شعبہ جاتی تقسیم اور زیادہ واضح ہو گئی، یہاں تک کہ دینی علوم میں اختصاص کی وجہ سے اس امت میں محدثین اور فقہا کے گروہ پیدا ہوئے۔ یوں صاحبانِ علم بھی ہوتے اور صاحبانِ سیف بھی نظر آتے۔ یہ سب شعبہ جاتی تقسیم ہی تو ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں، اگر کوئی چیز اجنبی رہی ہے، تو جماعت کا یہ تصور اجنبی رہا ہے، جس کے تحت ہر کام ایک ہی فرد اور ایک ہی نظم کے تحت کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اسلامی تاریخ اس بات کے نظائر سے بھری پڑی ہے کہ لوگ مختلف شعبہ ہائے حیات میں ممتاز ہوں، لیکن ایسی کوئی مثال موجود نہیں کہ کسی فردِ واحد نے ایک جماعت تشکیل دے کر سب کام ایک ساتھ کیا ہو۔

جہاں تک جہاد کا معاملہ ہے، تو اس کی حیثیت ایک ہنگامی حالت کی ہے۔ اور عام حالات میں حکمتِ عملی طے کرتے وقت کسی اضطراری یا ہنگامی صورتِ حال کو پیشِ نظر نہیں رکھا جاتا۔ اب بھی، اگر حکومتِ وقت کی طرف سے جہاد کے لیے نفیرِ عام ہو تو ریاست کے ہر شہری پر چاہے وہ عالم ہو یا اَن پڑھ، سیاست دان ہو یا داعی، یہ لازم ہوگا کہ وہ اس آواز پر لبیک کہے، اِلّا یہ کہ کوئی شرعی عذر مانع ہو۔ موجودہ عہد میں پیشہ ور افواج کی موجودگی میں اس کی نوبت کم ہی آتی ہے۔ پھر اگر عامۃ الناس سے جہاد میں شرکت کے لیے کہا جاتا ہے، تو مراد جزوی شرکت ہی ہوتی ہے جس کا محاذِ جنگ سے براہِ راست تعلق نہیں ہوتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی، جب جہاد میں شرکت کے لیے اعلانِ عام کیا تو سب صحابہ اس پر لبیک کہتے ہوئے شریک ہوتے، لیکن اس ہنگامی حالت کے علاوہ عام زندگی میں ہمیں عہدِ رسالت میں تقسیمِ کار ہی کا اصول کارفرما نظر آتا ہے۔ چنانچہ، سیرت کی کتابوں میں، ہمیں اس کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر دفتری نظام کو دیکھیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی ایک سیکرٹیریٹ قائم تھا۔ ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں:

"..... اہم ترین انتظامات میں سے چند کاتبوں پر مشتمل ایک دفتری نظام (سیکریٹریٹ) تھا۔ چنانچہ مسعودی اور دیگر مؤرخوں نے بتایا ہے کہ ان کاتبوں کے فرائض مختلف تھے۔ کچھ لوگ نازل ہونے والی وحی لکھا کرتے تھے، کچھ لوگ زکوٰۃ کے اندراجات کرتے یعنی رقم کس سے وصول ہوئی اور کس پر خرچ کی گئی۔ جنگوں میں جو مالِ غنیمت حاصل ہوتا، اس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا کہ سب کو جمع کر کے، اس میں سے سارے فوجیوں کو برابر حصہ دیا جاتے۔ لہٰذا ضروری تھا کہ مالِ غنیمت کی جمع و تقسیم کا حساب رکھا جائے۔ اس کے لیے بھی خصوصی کاتب مقرر تھے۔ اسی طرح کوئی دس بارہ مدوں کی تفصیل دی گئی ہے کہ ان کے لیے الگ الگ کاتب مقرر کیے گئے تھے۔" (اسلامی ریاست، ص ۲۶-۲۷)

جہاد میں شرکت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو حکمتِ عملی اختیار فرماتے، ڈاکٹر حمید اللہ اس کے بیان میں لکھتے ہیں:

"شروع میں، اسلامی حکومت کے پاس مال و دولت نہ تھی۔ اس کا حل خدائے حکیم نے یوں کر دیا کہ جہاد کو مسلمانوں کا ایک فریضہ قرار دیا گیا۔ ہر شخص پر واجب تھا کہ اسلام کے دفاع کے لیے اپنی جان اور اپنے مال کو قربان کرے۔ یہ نہیں کہ سو فی صد مسلمان جنگوں میں حصہ لیں، لیکن بوقتِ ضرورت، ہر شخص کا فرض ہے کہ اپنے آپ کو پیش کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مطلوبہ تعداد میں لوگوں کو چن لیتے تھے اور انھیں مہم پر روانہ کر دیتے تھے۔" (اسلامی ریاست، ص ۲۸)

اس وضاحت کو ذہن میں رکھیے تو جہاد میں عمومی شرکت سے تقسیمِ کار کے اصول کی نفی نہیں ہوتی۔ جہاد، بہرحال، ایک ہنگامی حالت ہے اور اس میں عام قوانین معطل ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح، جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی ایک خاص شعبے ہی میں کوئی خدمت سرانجام دے، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ دیگر شعبہ ہائے حیات سے کوئی سروکار نہ رکھے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس کی سعی و جہد کا اصل میدان تو ایک ہی ہو، لیکن، جزوی طور پر، دیگر شعبہ جات میں، اگر وہ کوئی مفید کام کر سکتا ہے، تو یہ تخصیص کار اس میں مانع نہیں ہے۔ مثال کے طور پر آنکھ کی امراض کے ماہر کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ دیگر اعضا کے بارے میں کوئی علم نہ رکھے، یا قرآنِ مجید کا مفسر، حدیث سے لاتعلق رہے۔ دیگر شعبہ جات سے نہ صرف تعلق رکھا جا سکتا ہے، بلکہ بعض حالات میں ایک خاص حد تک، اس کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ لیکن کسی شعبے سے ایک محدود تعلق اور اس میں اختصاص، دونوں میں فرق ہے۔ انسان کی صلاحیتوں اور عمر کی محدودیت میں عمومی معلومات تو بہت

سے معاملات میں رکھی جا سکتی ہیں، لیکن اختصاص کسی خاص شعبے ہی میں ممکن ہے۔

غلبۂ دین کے باب میں اسلامی تحریک کے مختلف حلقوں نے دنیا بھر میں جو کام کیا ہے، اسے تحسین کی نظر سے دیکھا جانا چاہیے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ فرقہ وارانہ رجحانات، سامراجی تسلط اور اس طرح کی دیگر مزاحمتوں کا انھوں نے بہت خندہ پیشانی سے سامنا کیا ہے۔ آج دنیا میں اگر احیائے اسلام کا جذبہ موجود ہے، تو یہ انھی تحریکوں کی مساعی کا صلہ ہے لیکن زندہ تحریکوں کے لیے لازم ہے کہ وہ ہر لحظہ اپنے عمل کا احتساب کرتی رہیں۔ پاکستان میں بھی تحریکِ اسلامی نے بہت قابلِ قدر کام کیا ہے۔ لیکن ان کی جدوجہد کے جائزے سے اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ حکمتِ عملی پر از سرِ نو غور کیا جائے، اور اسے ان خطوط پر منظم کیا جائے، جن کا اس مضمون کی سطورِ بالا میں ذکر کیا گیا ہے۔ تاہم، یہ ہماری رائے ہے جس میں غلطی اور صواب، دونوں کا امکان موجود ہے۔ حکمتِ عملی کے باب میں اگر کوئی دوسرا نقطۂ نظر سامنے آتا ہے تو اس پر بھی غور کر لینا چاہیے۔ اگر ہم یہ رویہ اپنا سکیں اور ہر بات کو خندہ پیشانی سے سننے کے علاوہ، اس کے رد و قبول کا فیصلہ کسی تعصب کی بجائے دلیل پر کریں، تو ہم یقیناً ایسی تحریک اٹھا سکتے ہیں، جو نہ صرف پاکستان میں اسلامی انقلاب کی نوید بنے، بلکہ عالمِ اسلام کے لیے بھی رہنما قرار پائے۔

تعارف

مصعب پبلک اسکول

"امتِ مسلمہ کے احیا کے لیے مروجہ نظامِ تعلیم کی اصلاح ایک بنیادی کام ہے، جسے انجام دینے کے لیے، وسیع پیمانے پر اعلیٰ درجے کی درس گاہوں کا قیام ناگزیر ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لیے چند رفقا نے ایک مثالی سکول کا اجرا جنوری ۱۹۹۴ء سے کر دیا ہے ہم اپنے قارئین کو اس منصوبے سے آگاہ کرنے کے لیے اس کا تعارف پیش کر رہے ہیں۔" ادارہ

نئے اسکول کی ضرورت کیوں؟

ہمارے نزدیک کسی بھی تعلیمی ادارہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ تعمیرِ ملت کے لیے، اس کے نونہالوں کو حقیقی علم سے آراستہ کرے۔ ان کی اس طریقے پر تربیت کرے کہ پھر ان کا کوئی ثانی نہ ہو۔ ان میں اعلیٰ سیرت و کردار پیدا کرے، تاکہ وہ مصافِ زندگی میں جرأت و اعتماد، حق گوئی و بے باکی کے ساتھ اتریں اور کامران ٹھہریں۔ انھیں معلوم ہو کہ آنے والا کل انھی کے ہاتھوں سے تعمیر ہوگا۔ اگر آج وہ کمزور ہو گئے تو کل وہ بحیثیتِ قوم کمزور ہو جائیں گے۔ ایسی نسلوں کی تعمیر ہی تعلیمی اداروں کی ذمہ داری ہے، مگر بدقسمتی سے ہمارا نظامِ تعلیم اپنی یہ ذمہ داری ادا نہیں کر رہا۔ اس کے کئی وجوہ ہیں:

پہلی وجہ

اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہمارے نظامِ تعلیم کی کوئی منزل نہیں ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ نئی نسلوں کو کہاں لے جانا ہے۔ وہ بے مقصدیت کا شکار ہے۔ یہاں اب ابوحنیفہ و شافعی، شبلی و فراہی اور اقبال و جناح پیدا کرنے کے لیے تعلیم نہیں دی جاتی، بلکہ کچھ اور ہی چیز پیشِ نظر ہے

ہماری بدقسمتی ہے کہ انگریز کے چلے جانے کے نصف صدی بعد بھی، ہم یہی متعین نہیں کر سکے کہ ہماری منزل کیا ہے۔ یہ کیا نئی نسلوں کو انگریزی اور اردو کے چند الفاظ سکھا دینا اور سائنس، طب اور ہندسہ کے چند حقائق سے آشنا کر دینا نظامِ تعلیم کا مقصد ہے، یا ادیب، سائنسدان اور جید علما پیدا کرنا۔ ہمیں پہلے دن ہی یہ چاہیے تھا کہ ہم اپنی منزل متعین کرتے اور علم کے اس قافلے کو اپنی راہ پر ڈال دیتے، کیونکہ جب تک منزل متعین نہ ہو، نہ راستے دکھائی دیتے اور نہ قافلے ان پر جادہ پیما ہوا کرتے ہیں۔

دوسری وجہ

دوسرے یہ کہ ہمارا نظامِ تعلیم تین نظاموں میں تقسیم ہے۔ اور ان تینوں سے تین طرح کے لوگ پیدا ہو رہے ہیں۔ دینی درسگاہوں میں وہ لوگ تیار ہوتے ہیں، جن کے لیے نہ دین کا کوئی راستہ کھلتا ہے اور نہ دنیا کا۔ یہاں سے پڑھنے والا ایک ایسی مخلوق بن جاتا ہے، جو زمانے کے تقاضوں سے بالکل بے خبر ہوتا ہے۔ اسے نہیں معلوم ہوتا کہ وہ جو زبان بول رہا ہے، آج کی دنیا اس کو نہیں سمجھتی۔ وہ جو دلائل دے رہا ہے، وہ فرسودہ ہو چکے اور وہ علم و دانش کی جن اساسات پر کھڑا ہے، وہ منہدم ہو چکی ہیں۔

دوسری طرف، انگریزی طرز کے جدید اسکولوں میں، ایک اور ہی قوم تیار ہو رہی ہے جو مغرب، اس کی روایات، اس کی اقدار اور اس کے نظریات سے تو خوب آگاہ ہوتی ہے، مگر اپنے علوم و معارف سے ناواقفِ محض ہوتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو دنیا کا مہا عالم سمجھتے، مگر اپنے ہی گھر سے بے خبر ہوتے ہیں۔ وہ جس سرزمین میں رہ رہے ہوتے اس کے نظریات اس کے طرزِ حیات اور اس کے تصورات سے بالکل جاہل ہوتے ہیں۔

سرکاری اسکولوں میں، ایک تیسری ہی قوم پروان چڑھ رہی ہے۔ ان اسکولوں میں وہ لوگ تیار ہوتے ہیں، جو نہ تو علومِ اسلامیہ میں دینی مدارس کے طلبہ کے مقابلے میں کوئی حیثیت رکھتے ہیں، اور نہ علومِ جدیدہ میں انگریزی طرز کے اسکولوں سے پڑھے ہوئے لوگوں کے مقابلے میں۔ چنانچہ، صلاحیتوں کے باوجود، ایک کھیپ کی کھیپ ایسے لوگوں کی تیار ہو جاتی ہے، جو صرف "کلرکی" ہی کر سکتی ہے اور یہی منصب ان کا مقدر بن کے رہ جاتا ہے۔

چنانچہ معاش کی طبقاتی تقسیم کے ساتھ ساتھ، ہماری تعلیم بھی معاشرے کو طبقات میں بانٹنے کا باعث بن رہی ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ یہ طبقاتی ناہمواریاں کسی صالح معاشرے کو وجود میں نہیں لا سکتیں، کیونکہ جس قوم میں وحدت نہ ہو، اور جس کے افراد بٹے ہوئے ہوں، وہ کبھی ایک مضبوط قوم نہیں بن سکتی، اور نہ ان میں اجتماعی سوچ ہی پیدا ہو سکتی ہے۔

تیسری وجہ

تیسرے یہ کہ ہمارے تعلیمی ادارے اب خدمت اور تعمیر ملت کے جذبہ کے تحت قائم نہیں ہوتے، بلکہ یہ بھی حصولِ زر کا ذریعہ بن گئے ہیں۔ تعلیم اب کوئی مشن نہیں، کاروبار ہے۔ اب سرمایہ دار ہی خدمت کا لبادہ اوڑھ کر اسکول اور مدرسے تعمیر کرتا اور ان کے ذریعے سے اپنی تجوریوں میں بلا ٹیکس آمدنی کے انبار لگا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے سے اچھے اداروں میں اسلام تو کیا، انسانی اقدار سے بھی مکمل بے اعتنائی برتی جاتی ہے کیونکہ ان کا مقصد تعمیر ملت نہیں حصولِ زر ہے، چنانچہ ان درس گاہوں کی فیسیں آسمان سے باتیں کرتیں، اساتذہ کے انتخاب میں نہ ان کا کردار پیش نظر ہوتا اور نہ علم و دانش، صرف انگریزی بولنے کی استطاعت ہی کو معیار بنایا جاتا ہے اور یہی چیز طلبہ میں بھی پیدا کی جاتی ہے۔ ان کی اخلاقی اور علمی تربیت کو مکمل طور پر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ملک و ملت اور دین و مذہب سے وفاداری کے بجائے، ذاتی مفاد اور مادہ پرستی کی روح پیدا کی جاتی۔ اور ہنرمندی اور قابلیت کے بجائے اچھی نوکریاں پالینا اور حصولِ زر کے لیے اچھے سے اچھا منصب ہی ان کا مطمحِ نظر بنایا جاتا ہے اور یہی ان کے نزدیک اصل کامیابی ہے۔

اس سب کچھ کے نتیجے میں ہماری نئی نسل ایک طرف اخلاقی انحطاط کا شکار ہوئی ہے اور دوسری طرف احساس کمتری میں مبتلا ہے۔ یہ ایک ایسا مرض ہے جو قوم کے وجود کو گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے جس کے بعد ان کا وجود مصائب و حوادث کے سامنے ٹھہرنے کی سکت نہیں رکھتا اور بالآخر اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔

نئے اسکول کا مجوزہ نقشہ

یہ ان خامیوں میں سے چند ایک ہیں، جو ہمارے موجودہ نظامِ تعلیم میں پائی جاتی ہیں، جن کی وجہ سے مسلمان آزادی کے بعد اقوامِ عالم میں سربلند نہیں ہو سکے۔ چنانچہ، ہم چاہتے ہیں کہ ایک ایسی مثالی درس گاہ قائم کریں، جو ان خامیوں سے پاک اور ایک نئے تعلیمی نظام کے لیے ایک مثال بن جائے، جو قوم کی قسمت کے ستاروں کو دنیا کے آسمان پر اس شان سے طلوع کرے کہ دنیا میں ایک مرتبہ پھر یہ ملت اپنے کھوئے ہوئے مقام پر آ کھڑی ہو۔ اس کی چکا چوند سے تیرہ و تار فضاؤں میں اجالا ہو جائے۔ 'مصعب پبلک اسکول' اسی ضرورت کے پیشِ نظر قائم کیا جا رہا ہے۔ اس درس گاہ میں ہم نے ان انقلابی اصلاحات کو پیشِ نظر رکھا ہے:

۱۔ اچھا مسلمان اور اچھا پاکستانی پیدا کرنا ہمارا مقصد ہوگا۔ اس کے لیے ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ ایسے اساتذہ کا انتخاب کیا جائے، جو اپنے مضمون میں مہارت کے ساتھ سیرت و کردار میں نہ صرف اچھے انسان ہوں، بلکہ دین و ملت کا درد بھی اپنے دل میں رکھتے ہوں۔ نئی نسلوں کی تربیت ان کا مشن اور نصب العین ہو۔ اور ملک و ملت کے لیے مثالی لوگ پیدا کرنا، اپنی منصبی ذمہ داری سمجھتے ہوں۔

چونکہ، اس دور میں، اس طرح کے اساتذہ کا ملنا دشوار ہے، اس وجہ سے اسکول کے باقاعدہ آغاز سے پہلے اساتذہ کی مکمل تربیت کا ایک پروگرام ہمارے پیشِ نظر ہے۔

۲۔ ملت کو 'وحدت' کے اصول پر اٹھانے کے لیے، طالب علموں کو اردو، انگریزی اور عربی زبان کی تعلیم کے علاوہ اسلام اور جدید علوم کی اعلیٰ تعلیم بھی دی جائے۔ دوسرے الفاظ میں، یہ کہیے کہ جدید تعلیم اور دینی تعلیم کو یکجا کر دیا جائے، تاکہ طبقاتی تفاوت وجود میں نہ آئے۔ اور نظامِ تعلیم میں مذہبی و غیر مذہبی اور اردو و انگریزی کی غیر فطری تفریق بالکل ختم ہو جائے۔ اس درس گاہ سے جو لوگ ڈاکٹر یا انجینیر بننے کے لیے نکلیں، وہ اچھے ڈاکٹر یا انجینیر ہونے کے ساتھ ساتھ دین سے بھی پوری طرح واقف ہوں۔

۳۔ اوپر بیان کردہ مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ایسا نہیں ہوگا کہ بچوں کے نازک و ناتواں کندھوں پر کتابوں کا ڈھیر تو لاد دیا جائے، مگر ان میں سے کچھ سیکھنا تو درکنار، ان کے بوجھ تلے سے نکلنا بھی ان

کے لیے دشوار ہو جائے، جیسے کہ اس وقت اکثر اسکولوں کا حال ہے۔ بچوں کو کتابوں کے اس بوجھ سے بچانے کے لیے ہم نے ایک منفرد نصاب ترتیب دیا ہے۔ چونکہ ہم بچوں کو تین زبانیں (عربی، اردو اور انگریزی)، اور جدید و قدیم علوم ایک ساتھ سکھانے کا عزم رکھتے ہیں، اور بچوں پر کتابوں کا بوجھ بھی ڈالنا نہیں چاہتے، اس وجہ سے نصاب کی ترتیب میں درج ذیل اصولوں کو ملحوظ رکھا جا رہا ہے:

ابتدائی مرحلہ: آٹھویں جماعت تک

ابتدائی مرحلے میں صرف قرآنِ مجید، اردو اور انگریزی زبان، حساب اور خطاطی کی تعلیم دی جائے۔ اس کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا جائے گا:

- قرآنِ مجید ناظرہ پڑھایا جائے۔
- قرآنِ مجید کا آخری زمرہ (الملک سے الناس تک) حفظ کرایا جائے۔
- عربی زبان سے کچھ واقفیت کے بعد مطالبِ قرآن کی تعلیم شروع کی جائے اور دینیات کی تعلیم، عربی زبان ہی میں دی جائے، تاکہ طالبِ علم دینی تعلیم کے ساتھ ہی عربی زبان سیکھ لیں۔
- سائنس اور دوسرے علوم (مثلاً معاشرتی علوم) کی تعلیم انگریزی اور اردو میں دی جائے، تاکہ انگریزی اور اردو کے ساتھ ہی طالبِ علم علومِ جدیدہ، ابتدائی طور پر سیکھ لیں۔
- بچوں میں زبان کا ذوق پیدا کرنے کے لیے دلچسپ کہانیاں اور نظمیں بھی ہر زبان کی کتاب میں شامل کی جائیں۔

ثانوی مرحلہ: نویں جماعت سے بارہویں تک

ثانوی درجے میں تعلیم نیم اختصاصی صورت اختیار کرلے۔ جس میں:

- قرآنِ مجید اور زبانوں کی تعلیم مسلسل جاری رہے۔
- اس مرحلے پر، نصاب میں اختصاصی مضامین کا اضافہ بھی کیا جائے۔ مثلاً جو طالبِ علم سائنس پڑھنا چاہیں، ان کے نصاب میں سائنس کے اختصاصی مضامین (طبیعات، کیمیا اور ریاضی وغیرہ) کا اضافہ کیا جائے۔

○ دینیات کے نصاب میں ادبِ جاہلی، اور نحو و بلاغت کے مضامین پڑھائے جائیں۔

۴۔ یہ درس گاہ ایک مشن کے تحت قائم کی جا رہی ہے حصولِ زر اس کے پیشِ نظر نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ہم یہ عزم رکھتے ہیں کہ:

○ وہ تمام تعلیمی سہولتیں مہیا کی جائیں، جو اس وقت کے بہترین اسکولوں میں طالب علموں کو میسر ہیں۔

○ ان سہولتوں کی فراہمی کے باوجود فیس اتنی ہی رکھی جائے جو متوسط طبقہ کے لیے بوجھ نہ ہو۔ اور فیس میں تین سال میں ۱۵ فیصد سے زیادہ اضافہ نہ ہو۔

○ اسکول کی تمام ترآمدنی اسکول ہی کی توسیع، تحقیقاتی کام اور طلبہ و طالبات کو جدید سہولتیں مہیا کرنے پر صرف کی جائے۔ اور بعد ازاں، مفت تعلیم کا ایک جال ملک بھر میں بچھا دیا جائے، جس میں اوپر بیان کردہ اصولوں کے مطابق تعلیم دی جائے۔ اساتذہ اور طلبہ کی اخلاقی اور دینی تربیت کا نظام وضع کیا جائے۔

۵۔ یہ کوشش کی جائے کہ طالب علم اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے، اسی علمی میدان کا انتخاب کرے جس کے لیے اسے عالم کے پروردگار نے پیدا کیا ہے۔

۶۔ ٹیوشن طالب علموں کے لیے زہرِ قاتل ہے۔ ہم اس کی حوصلہ شکنی کے لیے یہ ارادہ رکھتے ہیں کہ کمزور بچوں پر مزید توجہ دینے کے لیے اسکول کے اوقات عام اسکولوں کے مقابلے میں زیادہ رکھیں، تاکہ انھیں گھروں میں ٹیوشن نہ پڑھنی پڑے۔

۷۔ بچوں کو گھر میں کرنے کے لیے کام نہ دیا جائے، تاکہ وہ سکول میں کسی خوف اور بوجھ کے بغیر آتے رہیں اور انھیں گھر میں کھیل اور دوسری سرگرمیوں کا موقع ملے، جس کے نتیجے میں وہ ایک صحت مند شہری کی حیثیت سے پروان چڑھ سکیں۔

اس ضمن میں، ہم یہ ارادہ رکھتے ہیں کہ ناظرہ قرآن بھی اسکول میں پڑھانے کا انتظام کیا جائے، تاکہ گھر میں جانے کے بعد یہ بوجھ بھی ان پر نہ پڑے، اور طلبہ میں عمومی مطالعہ کا شوق پیدا کیا جائے، تاکہ کھیل کود اور دوسرے کاموں کے بعد وہ اپنی دلچسپی کی کتابیں پڑھیں، جس سے ان کے علم اور معلومات میں اضافہ ہو۔

۸۔ طلبہ کے لیے علمی اور معلوماتی کتابوں پر مشتمل ایک لائبریری قائم کی جائے تاکہ طلبہ اس میں غیر نصابی مطالعہ کر سکیں۔

وجہ تسمیہ

ہم نے اس درس گاہ کا نام مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے نام پر رکھا ہے۔ مصعب بن عمیر وہ پہلے صحابی ہیں، جو اس غرض سے مدینہ آئے تھے کہ وہاں کے لوگوں کو اسلام کی تعلیم دیں۔ انھی کے کام سے مدینہ میں اسلام کی نشأۃ اولیٰ کا شجر طیبہ پروان چڑھا۔ اور وہ اسلامی دور شروع ہوا جسے ہم اسلام کا زریں دور کہتے ہیں۔ ہمارا یہ ادارہ بھی، ان شاء اللہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے، وہ پہلا تعلیمی ادارہ ہوگا، جس سے اس نئے دور میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی بنیادیں فراہم ہوں گی۔

ہم اللہ رب العزت سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اس طرز پر اس ادارے کو قائم کرنے اور قائم رکھنے کی توفیق عطا فرمائے ـــــ وما توکلنا الا علیہ۔

مکاتیب

جاوید احمد غامدی

چند متفرق خطوط

محترمی و مکرمی حافظ انوارالحق صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

عنایت نامہ ملا۔ آدمی ذہین ہو تو بعض اوقات حالات کے مطالعے سے مستقبل کے بارے میں ایک رائے قائم کرتا اور وہ درست ثابت ہو جاتی ہے۔ تصوف کے حلقوں میں، بدقسمتی سے، یہی چیزیں مکاشفہ، الہام اور القا بن جاتی ہیں۔ ورنہ یہ بات بالکل قطعی ہے کہ ختم نبوت کے بعد اس نوعیت کی چیزوں میں سے، سچے خواب کے سوا، اب کوئی چیز باقی نہیں رہی۔

ہاروت و ماروت کو جو علم دیا گیا، اس کے باقیات اب بھی موجود ہیں، لیکن اس کا تعین کیسے کیا جائے کہ ان میں کتنا حق ہے، اور کتنا باطل ہ اس وجہ سے آدمی کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ اس طرح کی چیزوں کے درپے نہ ہو، اور مصیبتوں اور مشکلات میں، اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہمیشہ صبر اور نماز ہی کے ذریعے سے اس کی مدد چاہے۔

—— جاوید

(۲)

محترمی و مکرمی صبغت اللہ صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

عنایت نامہ ملا۔ عبادات کے معاملے میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں کسی کمی بیشی کو میں جائز نہیں سمجھتا۔ لہٰذا جنازہ کے بعد دعا بھی میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔

نقد اور ادھار کی قیمت میں فرق، یقیناً، سود ہے۔ ہمارے علما میں سے جو لوگ اس کے قائل ہوتے ہیں، اُن کے دلائل نہایت کمزور ہیں۔ اس وجہ سے ہر صاحب ایمان کو اس سے بچنا چاہیے۔

انسان کی بنیادی ضروریات سے متعلق اشیا کے سوا اگر کوئی چیز نرخ بڑھنے کے انتظار میں

روک رکھی جائے تو یہ وہ احتکار نہیں ہے، جسے شریعت میں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

——— جاوید

(۳)

محترمی و مکرمی اللہ محمد صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

زکوٰۃ، میری تحقیق کے مطابق، ہر چیز میں ہے۔ اس سے مستثنیٰ صرف تین چیزیں ہیں: ایک عوامل پیداوار، دوسرے ذاتی استعمال کی چیزیں، اور تیسرے نصاب سے کم سرمایہ۔ یہ ہر حال، ہر نوعیت کے مواشی اور ہر پیداوار پر عائد ہوگی، الاّیہ کہ ریاست کسی ضرورت کے تحت کسی چیز کو اس سے مستثنیٰ قرار دے۔

——— جاوید

(۴)

محترمی و مکرمی ضیاء اللہ صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کے سوالوں کے جوابات مختصراً عرض کیے دیتا ہوں:

سنت موکدہ کے بارے میں، جو رائے آپ نے نقل کی ہے، احناف کا مذہب ہے۔ میں جہاں تک تحقیق کر سکا ہوں، اس کے حق میں کوئی دلیل قرآن و سنت کے پورے ذخیرے میں مجھے نہیں مل سکی، بلکہ احادیث سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اس کا ترک قابل مواخذہ نہیں ہے، اس وجہ سے میں اس رائے کو صحیح نہیں سمجھتا۔

دین حق کی دعوت اور اس کے غلبہ کی جدوجہد کے لیے آپ کی زیادہ سے زیادہ ذمہ داری یہ ہے کہ اپنے پیشہ ورانہ فرائض انجام دیتے ہوئے، اپنے ماحول میں، جہاں موقع ملے، دوسروں کو حق اور حق پر ثابت قدمی کی نصیحت اور اس مقصد کے لیے کام کرنے والے علما میں سے جنھیں آپ صحیح راستے پر سمجھیں اُن کی مدد کرتے رہیں۔ رہا جہاد و قتال تو یہ حکومت کی ذمہ داری ہے۔ وہ اگر تمام مسلمانوں کو کسی وقت اس کے لیے بلائے تو بے شک، آپ کا فرض ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر حاضر ہو جائیں۔

——— جاوید

تبصرۂ کتب

نعیم بلوچ

'علامہ اقبال اور مولانا محمد علی'

مصنف : ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

ضخامت : ۱۲۸ صفحات، مجلد

قیمت : درج نہیں

ناشر : مکتبۂ شاہد، ۱/۹ علی گڑھ کالونی، کراچی ۷۵۸۰۰

علامہ اقبال، تاریخ کی ان چند شخصیتوں میں سے ایک ہیں، جنھیں اُن کی زندگی ہی میں ایک عالم نے شہرتِ دوام سے سرفراز کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں اقبال ہی وہ جلیل القدر شاعر تھے، جن کا موضوعِ سخن عشقِ مجازی کی روایتی واردات کے بجائے' وہ فکر و فلسفہ تھا، جس کا تانا بانا اسلام سے 'بنا گیا تھا۔ ان کی مقبولیت کی دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ وہ قومی سیاست میں بالواسطہ اور بلاواسطہ، دونوں طرح سے شریک رہے تھے۔ اپنی شخصیت کی انھی دو جہتوں کی وجہ سے' بسا اوقات، ان کے مداح عجیب کیفیت کا شکار ہوتے رہے ہیں۔ ان کی شاعری میں موجزن ایمانی جذبے اور ولولے کے اسیر بعض لوگ انھیں سیاسی میدان میں جوش و جنون کے اس مقام پر فروتر پاتے ہیں، جس کا حامل اقبال کو' ان کے نزدیک، ہونا چاہیے تھا۔ سیاست اور شاعری کے تقاضوں کو الگ الگ نہ مان کر اقبال پر تنقید کرنے والوں میں ایک اہم نام مولانا محمد علی جوہر کا ہے۔ مولانا موصوف علامہ اقبال کی شاعری سے والہانہ لگاؤ رکھتے تھے، لیکن میدانِ سیاست میں چند مقام ایسے آئے، جہاں پر انھیں اقبال سے شدید اختلاف ہو گیا۔ مولانا محمد علی ایک طرف تو نہایت جارحانہ مزاج رکھتے' اور دوسری طرف قلم کی بے پناہ طاقت بھی ان کے ہاتھ میں تھی، چنانچہ انھوں نے اپنے اختلافات کا بھرپور اظہار کیا۔ مولانا موصوف نے اپنے جذبات کا اظہار ان پانچ مضامین میں کیا جو اگست ۱۹۲۷ء

میں روزنامہ "ہمدرد" میں شائع ہوئے۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں ان پانچوں مضامین کو نہ صرف یکجا کر دیا گیا ہے، بلکہ فاضل مؤلف ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری نے ان مضامین کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے۔

پہلا مضمون "مولانا محمد علی بحیثیتِ نقاد و ماہرِ اقبالیات" کے عنوان سے ہے۔ فاضل مؤلف نے بڑے استدلال کے ساتھ اس حقیقت کی وضاحت کی ہے کہ مولانا محمد علی کو علامہ اقبال کی شاعری سے اس وقت تک لگاؤ رہا، جب تک علامہ ان کے سیاسی افکار کے چوکھٹے میں فٹ بیٹھتے رہے، مگر جونہی اقبال انھیں "راہِ راست" سے ہٹتے دکھائی دیے، وہ اپنے قلم کی لٹھیا لے کر ان پر پل پڑے۔ فاضل مؤلف محمد علی کی تنقید کو غیر ادبی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اقبال پر محمد علی کی یہ تنقید صحافیانہ ہے یا سیاسی۔ اس تنقید میں ہم ان کی باریک بینی، نکتہ رسی، گہری نظر اور معانی آفرینی کی خواہ کتنی ہی داد دیں، اس کی بنیاد پر، ہم انھیں ادبی نقاد نہیں کہہ سکتے۔ ان کا مقصد بھی ان کے کلام کے خصائص کی تلاش و تفہیم نہ تھا، بلکہ ان کے سامنے ایک سیاسی مقصد تھا اور ان کے کلام کی تشریح کی غایت بھی، اس کے سوا، کچھ اور نہ تھی کہ دیکھو فلاں موقع پر تم نے یہ کہا تھا، فلاں نظم میں تم نے اس خیال کا اظہار کیا تھا، اور اس کے برعکس تمھارا اپنا عمل یہ ہے۔ بعض مقامات پر انھوں نے اقبال کے اشعار کی تعریف بھی کی ہے، لیکن یہ تعریف محض تحسین ہے، نہ کہ تنقید۔۔۔۔۔

میرے نزدیک، ان کی تنقید ادبی تنقید کہلانے کی مستحق قرار نہیں دی جا سکتی۔ ادبی تنقید کا مقصد خصائص کی تلاش و تفہیم اور اس سے لطف اندوزی، حصولِ مسرت اور قارئین کو اس تلاش و تفہیم اور لطف و مسرت میں شریک کر لینا ہوتا ہے۔ اس کے لیے خاص زبان اور اسلوب کی ضرورت ہوتی ہے۔ سیاسی مقصد، صحافیانہ انداز اور جارحانہ اسلوب، جو محمد علی کے اس سلسلۂ مضمون کی سب سے بڑی خوبی ہے، وہ اسے ادبی تنقید کے دائرے سے نکال کر بہت دور لے جاتی ہے۔" (ص ۱۸-۱۹)

مولانا محمد علی نے اپنے مضامین میں اقبال کو "مرحوم اقبال" اور "انگریز پرور شاعر" کے خطاب دیے اور پنجاب کونسل میں ان کی تقریر کو "بکواس" بھی قرار دیا۔ اس پر فاضل مؤلف نے لکھا ہے:

"اقبال محمد علی کے محبوب تھے، شاعرِ اسلام تھے، اسلام کا سبق، انھوں نے کسی مولوی کے بجائے اقبال سے لیا تھا۔ پس ایسے مقدس اور محترم رشتے کے باوجود ان کے خیالات کو "بکواس" کہنا داعیہ و آدابِ عشق کے منافی معلوم ہوتا ہے کہ عاشق (محمد علی) طنز و تعریض سے

محبوب کو اپنی طرف مائل کرنا نہیں چاہتا، بلکہ اس سے انتقام لے رہا ہے۔ اگر محمد علی اقبال کی شاگردی سے انکار بھی کر دیں، تو یہ انداز بیان اخلاق و تہذیب کے عام اصول کے خلاف قرار پائے گا، ان کی صحتِ دماغی پر شبہ کیا جائے گا اور کچھ نہ سہی، تو یہی کہا جا سکتا ہے :

اے شیخ گفتگو تو شریفانہ چاہیے" (ص ۲۱)

علامہ اقبال اور مولانا محمد علی کے زیرِ عنوان فاضل مؤلف نے جو طویل مقالہ کتاب کا حصہ بنایا ہے، اس میں تفصیلاً، ان اختلافات کا ذکر ہے جو مولانا محمد علی کو علامہ اقبال سے تھے۔ ان تمام واقعات کا تجزیہ کر کے وہ قاری کو اس نتیجے پر پہنچاتے ہیں کہ اختلاف کی اصل وجہ خود مولانا کی تنک مزاجی تھی، جو عمر کے آخری حصے میں بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ مثلاً جب مولانا محمد علی مسئلہ خلافت کے تصفیے کے نتائج سے اربابِ حکومتِ برطانیہ کو آگاہ کرنے اور اتمامِ حجت کے لیے وفد لے کر انگلستان جا رہے تھے، تو علامہ اقبال نے اس سارے عمل کو ملی غیرت اور اسلامی حمیت کے خلاف سمجھتے ہوئے "دریوزۂ خلافت" کے عنوان سے ایک قطعہ لکھا :

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے	تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا؟	خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے	مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی

مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی

دونوں بزرگوں کے درمیان اس مسئلے میں جو اختلاف واقع ہوا، اس کے متعلق فاضل مصنف لکھتے ہیں :

"محمد علی نے (اقبال کی اس تنقید کو) ان کی ملی غیرت کا آئینہ دار سمجھا اور خوشی یا ناخوشی سے ان کے طعنہ ہائے دریوزہ گری و گداگری برداشت کر لیے۔ اس وقت تک، ان کی مزاجی کیفیت ایسی تھی کہ وہ اختلاف کو برداشت کر لیتے تھے۔ بعد میں، جیسا کہ قاضی عبدالغفار حسن، مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور ان کے دوسرے سیرت نگاروں کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ جسمانی امراض، اعصابی عوارض اور ذہنی صدمات کی بنا پر، وہ ذرا سے اختلاف سے بھی مشتعل ہو جاتے تھے۔ چنانچہ اس کے بعد کے حالات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اقبال ہی کے تعلق سے انھوں نے بعض چھوٹی چھوٹی باتوں کا شدید اثر لیا۔" (ص ۴۵)

شاعری کے حوالے سے، فاضل مقالہ نگار نے، بڑی تفصیل سے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ محمد علی کلامِ اقبال سے حد درجہ متاثر تھے۔ وہ سیاست میں اختلاف کے باوجود، افکار و احساسات میں اقبال ہی کے خوشہ چیں تھے اور مولانا محمد علی کا شمار بھی انھی لوگوں میں ہوتا ہے جو اپنی تحریر و تقریر کو اثر انگیز اور سحر آفریں بنانے کے لیے کلامِ اقبال سے مدد لیتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں :

> "محمد علی نے اقبال کے کلام کو اپنے افکار کی تائید میں اور خیالات کو موثر بنانے کے لیے صرف نقل ہی نہیں کر دیا ہے، بلکہ ان کے اسلوب پر بھی اقبال کے کلام کا اثر پڑا ہے۔ انھوں نے اکثر موقعوں پر اقبال کے الفاظ، تراکیب، تشبیہات، استعارات وغیرہ استعمال کیے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی نثر میں سادگی کے ساتھ رنگینی اور دل فریبی پیدا ہو گئی ہے۔" (ص ۷۸، ۷۹)

مثال کے طور پر، فاضل مؤلف نے محمد علی کے مضامین کے کئی اقتباسات دیے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

> "میں تو آج بھی اقبال، اپنے محبوب اقبال سے کہتا ہوں کہ ساقیا! تو آتش بجام آکر تو دیکھ، کچھ شعلہ آشام اب بھی باقی ہیں۔ تو بادِ بہاری کا پیغام تو بھیج، یہ خزاں دیدہ چمن پھر ایک بہار دکھا دے گا۔ مانا کہ آخرِ شب بسمل کی تڑپ دید کے قابل تھی، مگر تو پھر بالائے بام آکر تو دیکھ، ابھی تیرے سامنے تڑپنے کے لیے بہت بسمل باقی ہیں۔ ابھی تک شعلہ نہیں بجھا ہے، مگر وہ سودائی کہاں ہے جو سوزِ تمام کا سودائی ہو۔ پھول ہرگز بے پروا نہیں، تو گرم نوا تو ہو، یقیناً کارواں گم کردہ راہ ہے، اور کارواں والے اس قدر نیند کے ماتے ہیں کہ اس خارزار میں پڑے سو رہے ہیں، لیکن آوازِ درا بھی تو آج کسی کو سنائی نہیں پڑتی۔"
>
> ان سطروں میں ساقیا، آتش بجام، شعلہ آشام، بادِ بہاری کا پیام، آخرِ شب، بسمل کی تڑپ، دید کے قابل، بالائے بام، شعلہ کا بجھنا، سودائی، سوزِ تمام، پھول کا بے پروا ہونا، گرم نوائی، کارواں کا گم کردہ راہ ہونا، آوازِ درا وغیرہ الفاظ و تراکیب، اقبال کے کلام سے مستعار اور "شمع و شاعر" کے چند اشعار سے مستفاد ہیں۔ (ص ۸۰ - ۸۱)

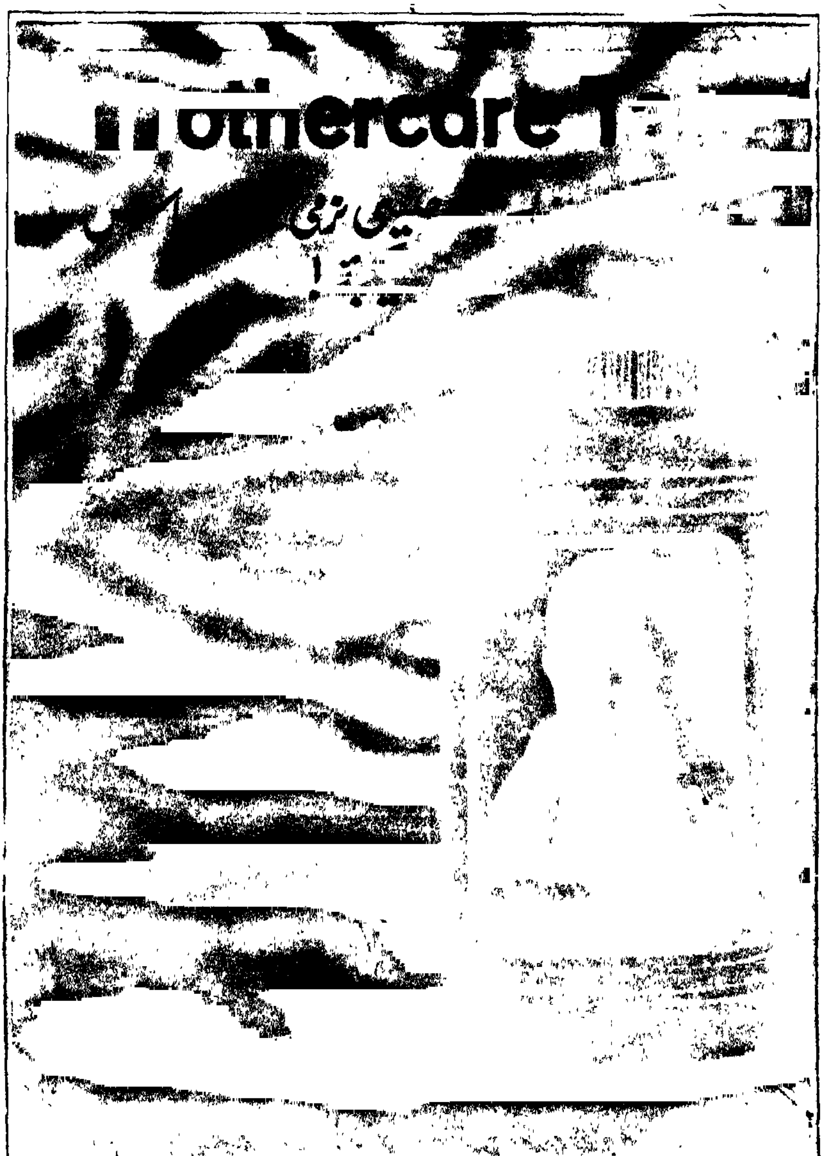
کتاب کے آخر میں ضمیمہ کے طور پر، پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں علامہ اقبال کی ان دو تقریروں کا مکمل متن بھی دیا گیا ہے جو مولانا محمد علی کے ان مضامین کا محرک بنی تھیں جو اس کتاب میں شامل ہیں۔ ان تقریروں سے علامہ مرحوم کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہوا ہے۔

ہماری تاریخ کی دو بزرگ شخصیتوں پر یہ ایک اہم کتاب ہے۔ اس کا مطالعہ ضرور، پر لطف بھی ہو

گا اور معلومات افزا بھی۔ فاضل مصنف، یقیناً، اس بیش قیمت کاوش پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔
کتاب اگرچہ مجلد ہے، لیکن اس کی طباعت بہت معیاری نہیں۔

OUR THANKS TO

SNOW WHITE DRY CLEANING INDUSTRIES
SH. WILAYAT AHMAD & SONS
CONTINENTAL ART
FEROZE TEXTILE INDUSTRIES
IMAGE COMMUNICATIONS
TIP TOP DRY CLEANERS
F. RABBI & CO. (PVT) LTD
K.B. SARKAR & CO.
PARAMOUNT DISTRIBUTORS (PVT) LTD



مدرکیئر اور آپ ـ حسن کی نگہداشت

دینِ حق کی دعوت

ہمارے پروگرام

مقرر: جاوید احمد غامدی

درس قرآن و حدیث

سورۂ حجر

کتاب الصوم (مشکوٰۃ المصابیح)

ہر جمعہ شام بعد نمازِ مغرب

جامع مسجد، ای بلاک، ماڈل ٹاؤن لاہور

دین و دانش

سلسلہ محاضرات ۳۰

حدود و تعزیرات،

ہفتہ، یکم جنوری ۱۹۹۴، بعد نماز مغرب

فنانس اینڈ ٹریڈ سنٹر آڈیٹوریم، شاہراہ فیصل کراچی۔

خواتین کے لیے شرکت کا اہتمام ہے

المورد

شعبۂ اصلاح و دعوت

مرکزی دفتر: ۹۸ (۲) ای، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون: ۸۵۸۴۰۶، ۸۵۶۴۱۸

رابطہ دفتر: ۲۸۵، اے، سنو وہائٹ سنٹر، عبداللہ ہارون روڈ، کراچی

فون: ۶-۵۶۸۵۱۲۴

اطلاع

لاہور

ہال حاصل نہ ہونے کی وجہ سے جنوری ۹۴ء کا اجتماع منعقد نہ ہو سکے گا۔ البتہ، ان شاء اللہ فروری کا اجتماع حسب معمول بروز جمعرات ۳ فروری ۹۴ کو ہو گا۔ جس میں ایمان بالآخرت کے موضوع پر جاوید احمد صاحب غامدی تقریر کریں گے۔

ماہنامہ

اشراق

جلد ۶ شمارہ ۲
فروری ۱۹۹۴ء
رمضان ۱۴۱۴ھ

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر : منیر احمد

مدیر انتظامی : شکیل الرحمن

معاون مدیر : قدیر شہزاد

فی شمارہ : ۸ روپے
سالانہ : ۸۰ روپے
بیرون ملک :
ہوائی ڈاک : ۴۵۰ روپے
بحری ڈاک : ۲۵۰ روپے

المورد

۶۶ احمد بلاک، گارڈن ٹاؤن، لاہور ۵۴۶۰۰ فون : ۵۸۶۴۴۳۱

مدیر مسئول : جاوید احمد غامدی
طابع : قومی پریس لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

المطففین ـــــ الانشقاق

[۸۳-۸۴]

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ ان میں خطاب قریش کے مترفین اور سرداروں سے ہے، اور ان کے مضمون سے واضح ہے کہ پچھلی سورتوں کی طرح یہ بھی ام القریٰ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اُن کو انذارِ عام کے مرحلہ ہی میں نازل ہوئی ہیں۔

پہلی سورہ ـــــ المطففین ـــــ میں انسان کی اس فطرت سے کہ وہ اپنے اندر خیر و شر کا ایک واضح شعور رکھتا ہے، روزِ جزا کا اثبات، اسی خیر و شر کی بنیاد پر لوگوں کے لیے الگ الگ انجام کا بیان، اور اُس انقلاب کی تصویر ہے، جو ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کی حالت میں اُس دن واقع ہو جائے گا۔

دوسری سورہ ـــــ الانشقاق ـــــ میں بھی اسی بنیاد پر لوگوں کے الگ الگ انجام کا بیان، نہ ماننے والوں کو انذار، ماننے والوں کے لیے بشارت اور آفاق کے آثار و شواہد سے اس حقیقت کا اثبات ہے کہ اس دنیا میں انسان کو جو مہلت ملی ہے، وہ اس کے لیے کسی غلط فہمی کا باعث نہ ہونی چاہیے۔ شام کے وقت سے لے کر سپیدۂ سحر کے نمودار ہونے تک جس طرح رات کے

نجوم و کواکب اور مہ تاباں بتدریج اپنی منزل تک پہنچتے ہیں، اسی طرح یہ انسان بھی ایک دن کشاں کشاں اپنے پروردگار کے حضور میں حاضر ہو جائے گا۔

ا

اللہ کے نام سے جو سراپا رحمت ہے جس کی شفقت ابدی ہے۔

تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں کے لیے، یہ جو دوسروں سے لیتے، تو لپورا لیتے، اور جب اُن کے لیے ناپتے یا تولتے تو اس میں ڈنڈی مارتے ہیں۔ کیا یہ گمان نہیں رکھتے کہ ایک دن اٹھائے جائیں گے، ایک بڑے دن کی حاضری کے لیے۔ اُس دن جب خداوندِ عالم کے حضور میں پیشی کے لیے اٹھیں گے۔ ۱—۶

(انھیں دیکھو، ناپ تول میں ان کا یہ رویہ گواہی دیتا ہے کہ یہ خیر و شر کو برابر نہیں سمجھتے، لیکن پھر بھی کہتے ہیں کہ انجام میں سب برابر ہوں گے)۔ ہرگز نہیں، اِن نافرمانوں کا نامۂ اعمال لاریب، سجّین میں ہوگا۔ اور تم کیا سمجھے کہ یہ سجّین کیا ہے، ایک دفتر ہے لکھا ہوا۔ تباہی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔ یہ جو بدلے کے دن کو جھٹلا رہے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اُس کو وہی جھٹلاتا ہے، جو حد سے بڑھنے والا، حق تلفی کرنے والا ہے۔ اُسے جب ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو اگلوں کے افسانے ہیں۔ ہرگز نہیں، بلکہ اِن کے دلوں پر اِن کے عمل کا زنگ بیٹھ گیا ہے۔ (یہ سمجھتے ہیں کہ قیامت اگر ہوئی، تو جس طرح یہاں یہ نعمتوں میں ہیں، اسی طرح وہاں بھی یہی مقرب ہوں گے)۔ ہرگز نہیں، اُس دن تو، لاریب، یہ اپنے پروردگار سے روک دیے جائیں گے۔ پھر جہنم میں جا پڑیں گے۔ تب کہا جائے گا: یہ وہی چیز ہے، جس کو تم جھٹلاتے رہے ہو۔ ۷—۱۷

(یہ کبھی برابر نہ ہوں گے)۔ ہرگز نہیں، فرماں برداروں کا نامۂ اعمال، بے شک علّیین میں ہوگا۔ اور تم کیا سمجھے کہ یہ علّیین کیا ہے یہ ایک دفتر ہے لکھا ہوا۔ مقرب فرشتوں کی نگرانی میں۔ یہ فرماں بردار، یہ لاریب، وہاں عیش میں ہوں گے۔ تختوں پر بیٹھے سیر دیکھتے۔ اِس عیش کی تازگی تم اِن کے چہروں پر دیکھو گے۔ اِنھیں سربند شراب خالص پلائی جائے گی جس پر مشک کی مہر لگی ہوگی۔ یہ چیز ہے کہ چاہنے والوں کو جس کی چاہت میں سرگرم ہونا چاہیے —— اور اس میں تسنیم کی ملونی ہوگی۔ ایک خاص چشمہ، جس کے کنارے بیٹھ کر خدا کے یہ مقرب بندے پئیں گے۔ ۱۸—۲۸

(وہ بھی دن تھے کہ) یہ جو مجرم رہے، یہ اِن اہلِ ایمان پر ہنستے تھے، اور جب اِن کے پاس سے گزرتے، تو آنکھوں سے اشارے کرتے، اور جب اپنے لوگوں میں پلٹتے، تو مزے لیتے ہوئے پلٹتے، اور جب اِن کو دیکھتے، تو کہتے کہ یہ بالکل بہکے ہوئے لوگ ہیں اور یہ اُن پر کوئی نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ لیکن آج دیکھو کہ اہلِ ایمان اِن کافروں پر ہنس رہے ہیں۔ تختوں پر بیٹھے (اِن کا انجام) دیکھتے —— کیوں، پا لیا اِن کافروں نے اپنے کیے کا بدلہ؟ ۲۹—۳۶

۲

اللہ کے نام سے جو سراپا رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

وہ دن، (اے لوگو)، جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے پروردگار کے حکم کی تعمیل کرے گا، اور اُسے یہی زیبا ہے۔ اور وہ دن جب زمین تان دی جائے گی، اور جو کچھ اُس کے اندر ہے اُسے باہر پھینک کر خالی ہو جائے گی اور اپنے پروردگار کے حکم کی تعمیل کرے گی، اور اُسے یہی چاہیے۔ (وہ دن، تمھارے پروردگار سے ملاقات کا دن ہوگا)۔ ۱—۵

(اسی دن کے لیے) اے انسان، تو بھی کشاں کشاں اپنے پروردگار کی طرف جا رہا ہے، اور اُس سے ملنے والا ہے۔ پھر جس کا نامۂ اعمال، (وہاں) اُس کے دہنے ہاتھ میں دیا جائے گا، اُس کا حساب تو نہایت ہلکا ہو گا، اور وہ خوش خوش اپنے لوگوں کی طرف پلٹ آئے گا۔ اور جس کا نامۂ اعمال اُس کے پیچھے ہی سے، (اُس کے بندھے ہوئے ہاتھوں میں) پکڑا دیا جائے گا، وہ موت کی دہائی دے گا اور دوزخ میں جا پڑے گا۔ یہ اپنے لوگوں میں مگن رہا۔ اِس کا خیال تھا کہ اِسے ہرگز کہیں پلٹ کر نہیں جانا ہے۔ ہاں کیوں نہیں، (اپنے اِن کرتوتوں کے ساتھ یہ کیوں چھوڑ دیا جاتا) یہ اِس کا پروردگار تو اِسے دیکھ رہا تھا۔ ۶—۱۵

اِس لیے، یہ بات نہیں، (اے لوگو، کہ تمھیں اِس دنیا میں ڈھیل ملی ہے، تو اب تم یہیں رہ جاؤ گے)۔ میں شفق کو گواہی میں پیش کرتا ہوں، (جس سے رات شروع ہوتی) اور جو کچھ (اپنے نجوم و کواکب) وہ (صبح دم) سمیٹ لیتی ہے، اُن کو گواہی میں پیش کرتا ہوں اور چاند کو، جب وہ پورا ہو جاتا ہے کہ (جس طرح یہ ابتدا سے انتہا تک پہنچے ہیں، اسی طرح) تم بھی درجہ بدرجہ، لازماً، (اپنی منزل کے لیے اوپر) چڑھو گے۔ ۱۶—۱۹

(یہ حقیقت ہے، اور لاریب، حقیقت ہے)، تو اِنھیں کیا ہو گیا ہے کہ نہیں مانتے، اور جب اِن کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو سجدہ ریز نہیں ہو جاتے، بلکہ (تعجب ہے کہ) یہ کافر تو اُلٹا جھٹلا رہے ہیں، درآں حالیکہ اللہ، (اِن کا پروردگار) خوب جانتا ہے، جو کچھ (اِس دنیا میں)، یہ (اُس دنیا کے لیے)، جمع کر رہے ہیں۔ اِس لیے، (اے پیغمبر)، اِنھیں ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔ ہاں، اُن لوگوں کے لیے، البتہ، (وہاں) ایک دائمی اجر ہے، جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہیں۔ ۲۰—۲۵

شذرات

جاوید احمد غامدی

ایمان بالغیب

ایمان بالغیب کے معنی یہ ہیں کہ وہ حقائق جو آنکھوں سے دیکھے نہیں جا سکتے، انہیں انسان محض عقلی دلائل کی بنا پر مان لے. ذاتِ خداوندی کو ہم دیکھ نہیں سکتے. قیامت ابھی ہماری آنکھوں سے چھپی ہوئی ہے. نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جبریلِ امین کو وحی کرتے ہم نے نہیں دیکھا. لیکن، اس کے باوجود، ہم ان سب باتوں کو مانتے ہیں. اس کی وجہ یہ ہے کہ انفس و آفاق میں، اور خود اس کلام میں جو اللہ کے پیغمبر نے پیش کیا، ان حقائق کے ماننے کے لیے، وہ دلائل موجود ہیں، جن کا انکار کوئی صاحبِ عقل انسان نہیں کر سکتا.

یہ دنیا اس عالم کے پروردگار نے آزمایش کے لیے بنائی ہے. اس نے ہمیں عقل کی نعمت سے بہرہ یاب کیا اور اس بات کا مکلف ٹھہرایا ہے کہ ہم اس کائنات میں، اور خود اپنی ذات کے اندر، ان حقائق کے جو آثار و شواہد پاتے ہیں، وحیِ الٰہی کی رہنمائی میں، محض انھی کے ذریعے سے ان حقائق تک پہنچیں. چنانچہ ہم انہیں بے سوچے سمجھے نہیں مانتے، بن دیکھے مانتے ہیں. وہ چیز جو دیکھی نہیں جا سکتی، لیکن عقل کے ذریعے سے سمجھی جا سکتی ہے، اسے دیکھنے کا تقاضا کرنا ہی سب سے بڑی بے عقلی ہے. کتنی حقیقتیں اس زمانے میں سائنس نے دریافت کی ہیں، جنھیں ہم اپنے حواس کی گرفت میں نہیں لے سکتے، لیکن، اس کے باوجود، اسی طرح مانتے ہیں، جس طرح دوپہر چڑھے، کھلے آسمان کے نیچے، اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ سورج چمک رہا ہے اور اس کی

دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔

قرآنِ مجید نے جو حقائق پیش کیے ہیں، اُن پر ہمارے ایمان کی بنیاد بھی یہی ہے۔ وہ، بے شک، حواس سے ماورا ہیں، لیکن عقل سے ماورا نہیں ہیں۔ ہم نے انھیں عقل کی میزان میں تولا ہے، اور ان میں رتی بھر کمی نہیں پائی۔ چنانچہ ہم ان پر ایمان بالغیب رکھتے ہیں۔ اس کے معنی، بالبداہت، یہی ہیں کہ ہم خوب سوچ سمجھ کر، عقل و فطرت کے قطعی دلائل کی بنا پر انھیں بن دیکھے مانتے ہیں۔

عقل اور دین

ہمارے ہاں لوگ بالعموم کہتے ہیں کہ دین کا عقل سے کیا تعلق؟ یہ تو بس مان لینے کی چیز ہے۔ چنانچہ اس باب میں علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ دین کے احکام اگر عقل پر مبنی ہوتے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پاؤں کے اوپر مسح کرنے کا حکم نہ دیتے۔ عقل کا تقاضا یہی تھا کہ پاؤں چونکہ زیادہ تر نیچے سے گندے ہوتے ہیں، اس لیے مسح بھی وہیں کیا جاتا۔

ہمارے نزدیک یہ نقطۂ نظر کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ قرآنِ مجید بالصراحت کہتا ہے کہ سارا دین عقل پر مبنی ہے۔ وہ اپنے تمام احکام و عقائد اسی بنیاد پر انسانوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس نے جو بات بھی کہی ہے، اس کے لیے ہر جگہ عقلی دلائل ہی پیش کیے ہیں۔ وہ ان دلائل سے گریز کی راہ اختیار کرنے والوں کو تنبیہ کرتا ہے کہ وہ اپنی عقل سے کیوں کام نہیں لیتے۔ قرآنِ مجید کا مطالعہ اگر تدبر کے ساتھ کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ انسان اس دین کو ماننے اور اس کی ہدایات پر عمل کرنے کا مکلف ہی اس لیے ٹھیرایا گیا ہے کہ اس کے پروردگار نے اسے عقل کی نعمت عطا فرمائی ہے۔ چنانچہ ایک بھلا چنگا آدمی، جس کے کسی عضو میں کوئی نقص نہیں ہوتا، محض عقل سے محروم ہو جانے کی وجہ سے، اس دین میں تمام ذمہ داریوں سے بری قرار دیا جاتا ہے۔ وہ باقی ہر لحاظ سے صحیح سالم ہونے کے باوجود، قرآن و حدیث کی رو سے، نہ روزہ و نماز کا مکلف

ہوتا ہے، اور نہ اسے کسی جرم کے ارتکاب پر کوئی سزا دی جا سکتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہماری عقل بہت سے دینی حقائق کو خود دریافت نہیں کر سکتی، لیکن اللہ کے نبیوں کی طرف سے ان کی وضاحت کے بعد، وہ انھیں سمجھنے کی صلاحیت، بے شک رکھتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انھیں ماننے کا تقاضا بھی اللہ تعالیٰ نے اسی سے کیا ہے۔

آئن اسٹائن کا نظریۂ اضافیت، ہماری جامعات میں سائنس کے طلبہ نے دریافت نہیں کیا۔ وہ شاید اسے دریافت کر بھی نہیں سکتے تھے۔ لیکن اب وہ ہر روز اسے سمجھتے اور چونکہ اپنی عقل کے مطابق پاتے ہیں، اس لیے بغیر کسی تردد کے مانتے ہیں۔ سائنس کا استاد، جب یہ نظریہ انھیں سمجھاتا ہے تو ان کی عقل ہی کو خطاب کرتا اور اسی سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اسے مانے۔

دین بھی انسان کی عقل ہی کو خطاب کرتا ہے۔ چنانچہ وہ عقل سے ماورا کوئی ہدایت عقل کو نہیں دیتا۔ اس کے سارے احکام و ہدایات بالکل عقل کے مطابق ہیں۔

ہم نہیں سمجھتے کہ علی رضی اللہ عنہ جیسے عاقل انسان نے مسح کے بارے میں وہ بات کہی ہو گی، جو اوپر بیان ہوئی۔ ہم بادنیٰ تامل سمجھ سکتے ہیں کہ جرابوں پر مسح اُن کی غلاظت دُور کرنے کے لیے نہیں کیا جاتا۔ اس کی حیثیت تیمم کی طرح محض ایک علامت کی ہے، جس سے ہم ایک طرح کی ذہنی پاکیزگی حاصل کرتے ہیں۔ ہم پورے اطمینان کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ چیز، اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی میں، محض پاؤں کے اوپر ہی ہاتھ پھیر لینے سے حاصل ہو جاتی ہے۔ اسے کسی طرح خلاف عقل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

عقل اور وحی

عقل خدا کی نعمت ہے۔ ہمارے وجود میں یہ کوئی فالتو چیز نہیں ہے کہ ہم اسے حقارت کی نظر سے دیکھیں۔ یہ ہمارے لیے چراغِ راہ ہے۔ ہم زندگی کا سفر اسی کی روشنی میں کرتے ہیں۔ ہمارے پروردگار نے یہ نعمت اسی لیے عطا کی ہے کہ ہم کسی معاملے میں اس کی رہنمائی کو نظر انداز نہ کریں۔ اس

کے فیصلوں کے سامنے سر جھکا دینا ہی ہمارے لیے باعثِ شرف ہے۔ اس کے مقابلے میں ضد اور ہٹ دھرمی کا رویہ کسی طرح ہمارے شایانِ شان نہیں ہے۔

عقل کا مقام، بے شک، یہی ہے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ انسان کی رہنمائی کے لیے اپنی غیر معمولی اہلیت کے باوجود اس کی بعض حدود بھی ہیں اور اس کے ساتھ بعض آفات بھی لگی ہوئی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اس کا ذریعۂ معلومات ہمارے حواس اور ہمارا وجدان ہی ہے۔ چنانچہ اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اپنے فیصلوں کے لیے انھی دو ذرائع پر اعتماد کرے۔ پھر ہمیں معلوم ہے کہ یہ دونوں ذرائع اپنا ایک محدود دائرۂ عمل رکھتے ہیں۔ عقل جب تک انھی پر منحصر ہے، وہ کبھی اس دائرے سے باہر نہیں نکل سکتی۔ پھر اس دائرے کے اندر وہ اگرچہ بہت سے حقائق خود دریافت کر لیتی ہے، لیکن بعض ایسی حقیقتیں بھی ہوتی ہیں، جو اگر سامنے آ جائیں تو وہ انھیں سمجھ سکتی ہے، لیکن انھیں خود دریافت کر لینا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ اسی طرح جو حقائق ہر لحاظ سے اس کی رسائی میں ہیں، اُن کے بارے میں بھی کوئی فیصلہ کرتے وقت بعض اوقات جذبات اس پر غالب آ جاتے، تعصبات حاوی ہو جاتے اور حالات اسے متاثر کر لیتے ہیں۔

اپنی ان حدود، اور اپنے ساتھ لگی ہوئی ان آفات ہی کی بنا پر عقل مجبور ہے کہ اپنے لیے کوئی رہنما تلاش کرے، جو اسے اُن حقائق تک پہنچائے جو اس کے ذرائع کی پہنچ سے باہر ہیں، وہ حقائق بتائے، جنھیں وہ خود دریافت نہیں کر سکتی اور اس کی اس طرح تربیت کرے کہ جذبات و تعصبات اور حالات کے اثر سے بالا تر ہو کر فیصلے کرنا اس کے لیے ممکن ہو جائے۔

عقل کے اندر اس تلاش کے لیے ابتدا ہی سے بڑا قوی تقاضا رہا ہے۔ عالم کے پروردگار نے اپنی وحی اسی تقاضے کو پورا کرنے کے لیے نازل کی ہے۔ چنانچہ جس طرح انسان کی رہنما عقل ہے، اسی طرح عقل کی رہنما وحیِ الٰہی ہے۔ انسان اگر عقل کی رہنمائی سے محروم ہو جائے تو ہم اسے پاگل کہتے ہیں، اسی طرح عقل اگر وحی کی رہنمائی سے محروم ہو جائے تو وہ بھی ایک خاص دائرے میں بالکل

باؤلی ہو جاتی ہے۔

عقل اور وحی کا یہی تعلق ہے جس کی وجہ سے وحی کوئی ایسا حکم نہیں دیتی، جسے سمجھنا عقل کے لیے ممکن نہ ہو، اور عقل اگر ہٹ دھرمی پر نہ اتر آئے تو اس کا کوئی فیصلہ کبھی وحی کے خلاف نہیں ہوتا۔ یہ اس تعلق کا لازمی تقاضا ہے، اس لیے کہ پیاس اور پانی کبھی ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں ہوتے۔

ساجد حمید

التزام جماعت کا صحیح مفہوم

عن ابن عباس قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من رای من امیرہ شیئا یکرھہ فلیصبر، فانہ من فارق الجماعۃ شبرا، فمات (علیہ الامات[۱]) میتۃ جاھلیۃ۔

(بخاری، کتاب الفتن، کتاب الاحکام)

(۱) اخرجہ البخاری فی کتاب الفتن، والمسلم فی کتاب الامارہ۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اپنے امیر کی کوئی ناپسندیدہ بات[۱] دیکھی، اسے چاہیے کہ صبر سے کام لے[۲]، کیونکہ جو بالشت برابر[۳] بھی، جماعت[۴] (نظم اجتماعی) سے الگ ہوا[۵]، اور اسی حالت میں مر گیا[۶]، اس کی موت جاہلیت پر ہوئی[۷]۔

---

[۱] اس سے دین اور دنیا کا ہر ناپسندیدہ عمل مراد ہے۔ روایت کے الفاظ میں کوئی قرینہ ایسا نہیں ہے، جس کی بنا پر ہم اس ناپسندیدگی کو دین یا دنیا میں سے کسی ایک کے ساتھ خاص کر سکیں۔ دوسرے مواقع پر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ بات واضح فرما دی ہے کہ ان ناپسندیدہ امور کا تعلق دین اور دنیا دونوں سے ہے، اور اس کی حد بھی متعین فرما دی کہ یہ بے پروائی، بڑھتے بڑھتے صریح کفر تک نہیں پہنچنی چاہیے۔ مثلاً، عاصم بن عبد اللہ کی روایت میں آپ نے فرمایا:

انھا ستکون من بعدی امراء	میرے بعد ایسے امرا ہوں گے، جو وقت
یصلون الصلاۃ لوقتھا و	بے وقت نماز پڑھیں گے۔ تم ان کے ساتھ
یوخرونھا عن وقتھا فصلوھا	نماز پڑھتے رہو۔ اگر وہ وقت پر نماز پڑھیں گے

معهم فان صلوها لوقتها و صليتموها معهم لكم ولهم، وان اخروها عن وقتها فصليتموها معهم فلكم و عليهم من فارق الجماعة مات ميتة جاهلية ومن نكث العهد و مات ناكثا للعهد جاء يوم القيامة لا حجة له۔

(احمد بن حنبل)

تو انھیں اور تمھیں اس کا ثواب مل جائے گا، اور اگر وہ تاخیر کریں گے، تو تمھیں ثواب مل جائے گا، اور ان کے لیے اس کا وبال ہو گا۔ یہ اس لیے کہ جو نظم ریاست سے الگ ہوا، اور اسی حالت میں مر گیا، وہ جاہلیت کی موت مرا، اور جس نے عہد توڑا، اور عہد توڑ کر مرا، وہ قیامت کے دن اس طرح آئے گا کہ اپنے جرم کے حق میں، پیش کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی حجت نہ ہو گی۔"

دینی امور کی طرح، دنیوی امور کے بارے میں آپ نے فرمایا:

عن عبادة بن الصامت فقال دعانا رسول الله صلى الله عليه وسلم فكان فيما اخذ علينا ان بايعنا على السمع والطاعة في منشطنا ومكرهنا وعسرنا ويسرنا واثرة علينا وان لا ننازع الامر اهله الا ان تروا كفرا بواحا عندكم من الله فيه برهان۔

(البخاری، کتاب الفتن)

"عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بلایا، اور اس لیے بلایا کہ سمع و طاعت کی بیعت کریں (کہ ہم ہر طرح کے حالات میں اپنے حکمران کی اطاعت کریں گے) خوش دلی اور ناراضی کے باوجود، تنگی و آسانی میں، اور جب ہم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے تب بھی۔ اور اس پر بھی بیعت کریں کہ ہم اپنے امیر سے نہ جھگڑیں۔ آپ نے فرمایا: سوائے اس صورت کے کہ تم اس کی طرف سے کسی کھلے کفر کا ارتکاب ہوتا دیکھ لو، اور کفر بھی ایسا کہ جس کے بارے میں واضح دلیل ہو (محض اپنے کسی خیال پر ایسا نہیں کیا جا سکتا)۔"

ناپسندیدہ حکمران کی اطاعت کے بارے میں بھی آپ نے یہی فرمایا:

عن انس بن مالک رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله

"انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سمع و طاعت

علیہ وسلم اسمعوا واطیعوا وان	پر قائم رہو، خواہ تمھارے اوپر ایک حبشی غلام
استعمل علیکم عبد حبشی کان راسہ	جس کا سر منقے کی طرح چھوٹا سا ہو، حکمران
زبیبۃ۔ (بخاری، کتاب الاحکام)	بنا دیا جائے۔"

ان روایات کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ 'شیئا یکرھہ' (ناپسندیدہ باتوں) سے کوئی بھی ناپسندیدہ اور مکروہ چیز مراد ہے۔

۲؎ 'صبر' کا مطلب' لوگ' عام طور پر 'عجز و مسکنت' سمجھتے ہیں یعنی یہ کہ مصیبت کو' بہرحال' برداشت کرنا' جو بے بسوں اور درماندوں کا شیوہ ہے۔ لیکن' لغتِ عرب اور استعمالاتِ قرآن میں اس کا یہ اصل مفہوم یہ نہیں ہے۔[1] صبر' عجز و تذلل قسم کی کوئی چیز نہیں ہے' بلکہ یہ' درحقیقت' تمام عزم اور قوت کی وہ بنیاد ہے جس سے انسان کے اندر ثابت قدمی اور اپنے موقف پر استحکام کے ساتھ جمے رہنے کا وصف پیدا ہوتا ہے۔ اس حدیث میں بھی یہ لفظ اپنے اس حقیقی مفہوم یعنی' اپنے موقف پر ڈٹے رہنے کے لیے استعمال ہوا ہے۔

'صبر' سے مراد حکمران کی اطاعت اور' الجماعۃ' سے التزام رکھنا ہے یعنی حاشیہ ایک کی مذکورہ تینوں صورتوں میں' ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے حکمران کی اطاعت کرتا رہے' تاکہ وہ الجماعۃ (ریاستِ اسلامیہ) کے ساتھ وابستہ رہے' اور یہ اطاعت اس پر' اس وقت تک لازم ہے' جب تک حکمران شریعت کی بالادستی تسلیم کرتے رہیں۔ عبادہ بن صامت کی مذکورہ روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان: "الا ان تروا کفرا بواحا" اسی شرط کو بیان کرتا ہے۔ کفرِ بواح کے ارتکاب سے پہلے' بہرحال میں' حکمران کی اطاعت کا یہ حکم نصِ قرآنی پر مبنی ہے۔

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی	"اے ایمان والو' اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت
الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ	کرو' اور ان لوگوں کی جو تم (مسلمانوں) میں سے
فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ	صاحبِ امر ہوں' پھر اگر کسی معاملے میں' اختلاف
وَالرَّسُوْلِ۔	رائے ہو' تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی
(النساء ۴: ۵۹)	طرف پھیر دو۔"

یہ آیت حکمران کو بھی ہمارا مطاع قرار دیتی ہے' اور اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جس

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے: 'لفظِ صبر کی تحقیق': تدبرِ قرآن' ج ۱' ص ۱۸۸' امین احسن اصلاحی۔

طرح اللہ اور اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، بغیر کسی شرط کے مطاع ہیں، حکمران اس طرح، بلا شرط مطاع نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ یہ شرط لگا دی گئی کہ جب تک وہ قرآن و سنت پر عامل ہے، اور شریعت اسلامیہ کو قانونِ بالا (SUPREME LAW) تسلیم کرتا ہے، اس وقت تک، اس کی اطاعت کی جائے۔ چنانچہ اس حقیقت کی طرف 'اولی الامر منکم' میں 'منکم' کے اضافے سے اشارہ فرمایا گیا ہے۔ یہ اگرچہ، بیانِ واقعہ کا اسلوب ہے، لیکن اس سے، اس حکم پر ایک شرط عائد ہو گئی ہے کہ 'وہ جب تک تم میں سے، یعنی مسلمانوں میں سے ہے، اس وقت تک واجب الاطاعت ہے۔ اور 'تم میں سے ہونے' کا مطلب یہ ہے کہ وہ 'اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول' کے حکم پر عامل ہو، یعنی جب تک وہ اللہ اور اس کے رسول کی بالادستی کو تسلیم کرتا ہو۔

بالادستی سے مراد یہ ہے کہ فصلِ نزاعات اور قانون سازی میں، اللہ کی دی ہوئی شریعت کی پابندی کی جائے۔ یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ کفر صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی اسلام کے عقائد کا انکار کر دے، بلکہ حکمرانوں کے معاملے میں، یہ بھی کفر ہے کہ وہ فصلِ نزاعات اور قانون سازی میں اللہ کی دی ہوئی شریعت کے خلاف ورزی کریں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ أَنزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ	"اور جو لوگ اس قانون کے مطابق فیصلہ کریں،
هُمُ الْكَافِرُونَ۔ هُمُ الظَّالِمُونَ۔ هُمُ	جسے اللہ نے نازل کیا ہے، وہی کافر ہیں۔ وہی
الْفَاسِقُونَ۔ (المائدہ ۵: ۴۴، ۴۵، ۴۷)	ظالم ہیں۔ وہی فاسق ہیں۔"

اسی آیت کی بنیاد پر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ 'فلیصبر' یعنی 'تو اسے چاہیے کہ حکمران کی اطاعت پر ثابت قدم رہے۔ ہم اوپر بھی اشارہ کر آئے ہیں کہ حکمران کی اطاعت کا یہ حکم التزامِ جماعت کے لیے دیا گیا ہے۔ التزامِ جماعت کے بارے میں، ہم آگے چل کر، حاشیہ ۴ میں واضح کریں گے۔

۳ 'بالشت برابر': حدیث میں، اس کے لیے 'شبرا' کا لفظ آیا ہے۔ یہ عربی زبان کا ایک معروف لفظ ہے، جس کے معنی بالشت کے ہیں، 'شبرا' جب اس طرح بولا جاتا ہے، تو اسی معنی میں مستعمل ہے، جس میں مثلاً: 'مثقال ذرہ' یا 'حبۃ خردل' وغیرہ استعمال ہوتے ہیں۔ یہ سب تراکیب و الفاظ 'قلت و تفریط میں مبالغے' پر دلالت کرتے ہیں۔ چنانچہ، یہاں اس سے مراد 'نہایت ادنیٰ درجے میں الجماعۃ' سے روگردانی' ہے۔ اس اسلوب سے اس جرم کی یہ سنگینی واضح ہوتی کہ اس کی ادنیٰ سے ادنیٰ صورت بھی، آدمی کو اسلام کی اطاعت سے نکال کر، جاہلیت کے دائرہ میں لے جا سکتی ہے۔

۱۰؎ 'الجماعۃ' سے مراد سیاسی نظم کی پابند قوم یا گروہ ہے۔ اس کا مفہوم بالکل وہی ہے جس کے لیے جدید اصطلاح میں 'سٹیٹ' کا لفظ بولا جاتا ہے۔ جب ملتِ اسلامیہ اپنی سرزمین میں خود مختار ہو اور اسی کا کوئی فرد اس پر حکمران ہو، تو ان کے اس عمل سے جو ریاست یا 'نظمِ سیاسی' وجود میں آئے گا، وہ 'الجماعۃ' کہلائے گا۔ اس میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ پوری دنیا کے مسلمان ایک ہی نظمِ اجتماعی سے وابستہ ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر 'الجماعۃ' کے بجائے 'السلطان' کا لفظ استعمال فرمایا ہے:

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من کرہ من امیرہ شیئا فلیصبر علیہ فانہ لیس احد من الناس یخرج من السلطان شبرا فمات علیہ الامات میتۃ جاھلیۃ۔ (بخاری، کتاب الفتن، مسلم، کتاب الامارہ)	"آپ نے فرمایا: جسے اپنے امیر (حکمران) کی کوئی بات ناگوار گزرے، اسے چاہیے کہ وہ صبر کرے، کیونکہ جو ایک بالشت کے برابر بھی اقتدار کی اطاعت سے نکلا، اور اسی حالت میں مرگیا، اس کی موت جاہلیت پر ہوئی۔"

ان دونوں روایتوں میں 'الجماعۃ' اور 'السلطان' ایک دوسرے کے مترادف کی حیثیت سے استعمال ہوئے ہیں، جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ 'الجماعۃ' درحقیقت 'السلطان' یعنی 'سیاسی اقتدار' کے معنی اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ چنانچہ اس لفظ کا اطلاق کسی ایسی جماعت ہی پر کیا جا سکتا ہے، جو کسی سرزمین میں سیاسی طور پر، خود مختار قوم کی حیثیت سے رہتی ہو اور اس میں نظامِ امارت بھی قائم ہو، اس لیے سیاسی اقتدار سے محروم، کسی دینی جماعت یا تنظیم پر اس لفظ کا اطلاق صحیح نہیں ہے۔

یہ لفظ مقتدر جماعت ہی کے معنی میں عربی زبان میں مستعمل تھا۔ چنانچہ آثارِ صحابہ میں بھی، یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جو اس بات پر، مزید مہرِ تصدیق ثبت کرتے ہیں کہ اس لفظ کا مفہوم یہی ہے:

"ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے، جب خلافت کی ذمہ داری قبول کر لی، تو سب لوگوں نے ان کے ہاتھ پر، سمع وطاعت کی بیعت کی، مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کچھ عرصے تک بیعت نہیں کی۔ چنانچہ، ایک دن جب، انھوں نے حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر، ان کی خلافت کو تسلیم کرتے ہوئے، بیعت کر لی، تو ظہر کی نماز کے بعد، حضرت ابوبکر نے ان کی بیعت کا اعلان، ان الفاظ میں کیا کہ "آج علی 'الجماعۃ' میں شامل ہو گئے ہیں۔" (تاریخ الامم والملوک، طبری ج ۲ ص ۱۹۱)

جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے، اپنے والد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے معاہدہ کر لیا اور ملتِ اسلامیہ ایک خلافت کے تحت جمع ہو گئی، تو صحابہ نے، اس مناسبت سے، اس سال کا نام 'عام الجماعۃ' رکھ دیا تھا، یعنی وہ سال جس میں مسلمان

ایک نظامِ اجتماعی کے تحت جمع ہوئے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ صحابۂ کرام، حکومت وریاست کے ساتھ ساتھ وحدتِ امت (وحدتِ ریاست) کا مفہوم بھی 'الجماعۃ' میں شامل سمجھتے تھے۔

اسی طرح یزید بن معاویہ کی بیعت کے موقع پر، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے حسین بن علی اور عبداللہ بن زبیر رضوان اللہ علیہم کو حکومت کے ساتھ وفاداری اور بیعت کا مشورہ دیتے ہوئے یہی الفاظ استعمال کیے تھے کہ 'اتقیا اللہ ولا تفرقا جماعۃ المسلمین'۔* —— (طبری، ج ۶، ص ۱۹۱)

*خدا کے بندو، اللہ سے ڈرو، اور مسلمانوں کے 'نظمِ اجتماعی' کے انتشار کا باعث نہ ہو۔

اس لیے، اس مفہوم کی روایات کی بنیاد پر بعض لوگوں کا یہ تصور صحیح نہیں ہے کہ کسی بھی ایسی تنظیم یا جماعت سے منسلک رہنا ضروری ہے، جو غلبۂ اسلام کے لیے کوشاں ہو۔ حدیث کے اس مطلب کی روشنی میں، جس کو ہم نے اوپر واضح کیا ہے، یہ حکم ہمارے ملک میں حکومتِ پاکستان کے ساتھ وفادار رہنے اور اس کے قوانین کی پابندی کرنے سے پورا ہو جاتا ہے۔ اور ہم 'علی وجہ البصیرت'، یہ سمجھتے ہیں کہ حکومتِ پاکستان ہی اس سرزمین کے مسلمانوں کے لیے 'الجماعۃ' ہے۔

ریاستِ اسلامیہ کے ساتھ التزام اور وفاداری کا یہ حکم بھی قرآنِ مجید کی نص پر مبنی ہے۔ اللہ رب العزت کا فرمان ہے:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا
وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ
أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ
بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا
حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا
كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ آيَاتِهِ
لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ۔ وَلْتَكُنْ
مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى
الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ
يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ
الْمُفْلِحُونَ۔
(آلِ عمران ۳: ۱۰۳-۱۰۴)

"اللہ کی رسی کو مضبوطی سے مل کر تھامے رہو،
اور تفرقے میں نہ پڑو، اللہ کے اس فضل کو یاد رکھو
کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، تو اللہ نے
تمھارے دلوں کو جوڑ دیا۔ اور تم آپس میں بھائی
بھائی بن گئے۔ اور تم آگ کے ایک گڑھے پر
کھڑے تھے، تو اللہ نے تمھیں اس سے بچا لیا۔
اسی طرح اللہ تمھارے لیے، اپنی ہدایات کو واضح
کرتا ہے، تاکہ تم میں سے ایک گروہ اس اختیار
کے ساتھ قائم ہو، کہ وہ نیکی کی دعوت دے،
معروف کا حکم دے، اور منکر سے روک دے
اور اس گروہ کو قائم کرنے والے ہی فلاح
پائیں گے۔"

اس باب کی تمام روایات ہمارے نزدیک، اسی آیت پر مبنی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت ہی کے ایک پہلو کی توضیح کرتے ہوئے یہ احکام دیے ہیں۔ اگر اس آیت پر تدبر کی نگاہ ڈالی جائے، تو یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ ہم 'اعتصام بحبل اللہ' پر قائم رہنے اور تفرقے سے بچنے کے لیے، اپنے اندر ایک نظم اجتماعی قائم کریں۔ چنانچہ 'ولتکن منکم امۃ' کا یہی مطلب ہے۔ پھر جب کسی چیز کے بنانے یا قائم کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، تو بننے کے بعد اس کو قائم رکھنے کے لیے، اس کے ساتھ تعاون کرنا اور اس کے خلاف اقدامات نہ کرنا، اس حکم میں خود بخود شامل ہے۔ یہی چیز، در اصل، 'التزام جماعت' ہے۔

۵ 'الگ ہونے' سے مراد ریاستِ اسلامیہ یا نظمِ اجتماعی کو چھوڑ کر الگ ہونا ہے، جس کی ایک صورت حکومت کی اطاعت ترک کرنا یا اس کے خلاف بغاوت کرنا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ 'فارق الجماعۃ' کی شرح میں لکھتے ہیں: 'وھی کنایہ عن معصیۃ السلطان ومحاربتہ': 'یہ حکومت کی نافرمانی اور اس سے محاربہ سے کنایہ ہے۔' (فتح الباری، ج ۱۳، ص ۷) یعنی، اس کی ادنیٰ حالت، حاکم کی اطاعت سے محض ہاتھ کھینچ لینا ہے، اور اس کی انتہائی صورت بغاوت (محاربہ) ہے۔

۶ یعنی، اس نے اپنے اس اقدام سے رجوع نہ کیا اور توبہ کرنے سے پہلے ہی وفات پا گیا۔

۷ یعنی، جو شخص حکومتِ اسلامیہ کی اطاعت اس حالت میں ترک کر دے کہ صاحبِ اقتدار کی طرف سے 'کفر بواح' (کھلا کفر) بظاہر نہ ہوا ہو، تو ایسا شخص اگر اسی حالت میں مر جائے، تو اس کا مرنا ایسا ہی ہے، جیسا کہ اسلام قبول کیے بغیر مر جانا۔ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بھی بیان فرمایا ہے:

من فارق الجماعۃ شبرا فکانما خلع ربقۃ الاسلام من عنقہ (احمد بن حنبل، من حارث الاشعری)	"جو نظامِ ریاست سے الگ ہوا تو گویا اس نے اسلام کا قلادہ گردن سے اتار پھینکا۔"

چنانچہ، اس جرم پر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے 'من شذ شذ فی النار' کے الفاظ میں، دوزخ کی سزا کی وعید بھی سنائی ہے کہ جو 'الجماعۃ' سے الگ ہوا، اسے دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مسلمانانِ عرب کو قریش کی قیادت پر مجتمع دیکھا، تو ان کے لیے اپنے بعد، انتقالِ اقتدار کا فیصلہ سناتے ہوئے فرمایا:

لا یعادیھم احد الا کبہ اللہ فی النار علی وجھہ ما اقاموا الدین۔	"جب تک وہ دین پر قائم ہیں، اس وقت تک جس نے ان کی مخالفت کی، اللہ اسے دوزخ میں

اللہ سے ملو جو حکم دیں گے:　　　(بخاری، کتاب الاحکام)

یعنی، اس جرم کا ارتکاب کسی شخص کو اس سزا کا مستحق بھی بنا سکتا ہے۔

معز امجد

باب المیاہ[1]

اس دنیا میں انسان کی ناگزیر ضرورتوں میں سے ایک' پانی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ نعمت انسان کی پیاس بجھانے کے ساتھ ساتھ اس کے جسم' کپڑوں اور دیگر اشیا پر لگی ہوئی آلودگیوں کو صاف کرنے اور انھیں دھونے کے لیے بھی ہمیشہ سے' استعمال ہوتی آئی ہے۔ چنانچہ' جس طرح یہ بات ایک مسلمہ ہے کہ پانی پیاس بجھانے کا ذریعہ ہے' اسی طرح پانی کا انسان کے لیے پاکیزگی اور طہارت حاصل کرنے کا ذریعہ ہونا' بھی محتاج دلیل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید نے بھی پانی کے پیاس بجھانے کے ساتھ ساتھ اس کی صفتِ پاکیزگی کو بھی ایک مانی ہوئی حقیقت کے طور پر' اور اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی قدرت کی ایک دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

أَلَمْ تَرَ إِلَىٰ رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ	"کیا تم نے اپنے رب کی اس قدرت کی طرف
الظِّلَّ وَلَوْ شَاءَ لَجَعَلَهُ سَاكِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا	نگاہ نہیں کی کہ کس طرح وہ سایہ پھیلا دیتا ہے
الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيلًا، ثُمَّ قَبَضْنَاهُ	اور اگر وہ چاہتا تو وہ اس کو اسی طرح ساکن چھوڑ
إِلَيْنَا قَبْضًا يَسِيرًا، وَهُوَ الَّذِي	دیتا' پھر ہم سورج کو اس پر ایک دلیلِ راہ بناتے
جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِبَاسًا وَالنَّوْمَ	ہیں' پھر ہم اس کو آہستہ آہستہ اپنی طرف سمیٹ
سُبَاتًا وَجَعَلَ النَّهَارَ نُشُورًا، وَهُوَ	لیتے ہیں۔ اور وہی ہے جس نے تمھارے لیے
الَّذِي أَرْسَلَ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ	شب کو پردہ پوش اور نیند کو دافعِ کلفت بنایا
رَحْمَتِهِ وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ	اور دن کو وقتِ نشور بنایا۔ اور وہی ہے جو اپنے
مَاءً طَهُورًا، لِنُحْيِيَ بِهِ بَلْدَةً مَيْتًا	بارانِ رحمت سے پہلے ہواؤں کو خوش خبری

[1] پانی کا باب

وَنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِیَّ كَثِيْرًا۔ (الفرقان ۲۵:۴۵-۴۹)

بنا کر بھیجتا ہے، اور ہم آسمان سے پاکیزہ پانی اتارتے ہیں کہ اس سے مردہ زمین کو، از سرِ نو، زندہ کر دیں اور اسے پلائیں اپنی مخلوقات میں سے بہت سے چوپایوں اور انسانوں کو۔"

ان آیات پر غور کیجیے، تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ ان میں انسان کے مشاہدات اور اس کی مانی ہوئی حقیقتوں کو اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت اور اس کی توحید کے دلائل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ غرض کہ پانی کی صفتِ طہور[1]، انسان کی فطرت اور اس کے شعور میں شروع ہی سے موجود ہے، اور اس کے ثبوت کے لیے، خارج سے، کوئی دلیل لانے کی، ہرگز، ضرورت نہیں ہے۔

چنانچہ، اللہ تعالیٰ نے نماز کے لیے وضو کا حکم دیتے ہوئے، جب یہ فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ۔ (المائدہ ۵:۶)

"اے ایمان والو، جب تم نماز کی تیاری کے لیے اٹھو تو اپنے چہرے اور اپنے ہاتھ کہنیوں تک دھوو اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھوو۔"

اور حالتِ جنابت کے بارے میں جب یہ حکم دیا:

وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا۔ (المائدہ ۵:۶)

"اور اگر تم حالتِ جنابت میں ہو تو غسل کر لو۔"

تو انسان اس بات کو بہت اچھی طرح جانتا تھا، اور اس کے لیے کسی دلیل کی، ہرگز، ضرورت نہیں تھی کہ وضو میں چہرہ، ہاتھ اور پاؤں دھونے کے لیے یا غسل میں پورا جسم دھونے کے لیے اللہ تعالیٰ کی جو نعمت استعمال کی جانی چاہیے، وہ پانی ہی ہے۔ چنانچہ اس آیت کے اگلے حصے میں، اس بات کی طرف اشارہ بھی فرما دیا:

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا

"اور اگر تم مریض ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی جائے ضرورت سے آیا ہو یا عورتوں سے ملاقات کی ہو پھر پانی نہ پاؤ، تو پاک جگہ دیکھ کر

---

[1] یعنی یہ کہ پانی پاک ہے اور پاکیزگی کا ذریعہ ہے۔

فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ: (المائدہ ۵: ۶)
اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں پر اس سے مسح کر لو۔

آیۂ مبارکہ کے اس حصے میں اس بات کی تصریح بھی فرمادی کہ اگر پانی نہ ہو، تو وضو اور غسل کے بجائے تیمم کر لینا ہی کافی ہے۔ ظاہر ہے، اس کے یہی معنی ہوئے کہ وضو یا غسل کرنے کے لیے پانی ہی استعمال کیا جانا چاہیے۔

اس ساری بحث سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ وضو یا غسل کے لیے انسان ہر وہ چیز استعمال کر سکتا ہے، جس پر لفظ 'ماء' یا 'پانی' کا اطلاق ہوتا ہو۔ اس کے برعکس جس چیز پر 'ماء' کے لفظ کا اطلاق نہیں ہوتا، اس سے وضو یا غسل کرنا، کسی حال میں بھی، جائز نہیں ہے۔ پانی کے باب میں اتنی ہی بات شریعت یا قانون سے متعلق ہے۔ لیکن یہ معاملہ چونکہ عبادات سے تعلق رکھتا ہے، اس وجہ سے اس بات کا امکان ہے کہ لوگ اس میں افراط و تفریط اور غلو کا شکار ہو جائیں۔ لہٰذا، اسی بات کے پیشِ نظر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چند اصولی باتوں سے متعلق لوگوں کی رہنمائی فرمادی، تاکہ وہ اس معاملے میں بھی اعتدال ہی کی راہ پر قائم رہیں۔ بالفاظِ دیگر اس معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو رہنمائی ہمیں ملتی ہے، اس کا مقصد شریعت کے حدود و قیود متعین کرنا نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ ہم آگے چل کر، ان شاء اللہ، واضح کریں گے، اس رہنمائی کا مقصد سرتا سر لوگوں کو ان کی فطرت اور اعتدال کی راہ پر قائم رکھنا اور انھیں افراط و تفریط سے بچانا ہے۔

دو بنیادی اصول

اس معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے ہمیں جو رہنمائی ملتی ہے، اس پر بحث کا آغاز کرنے سے پہلے ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس مسئلے سے متعلق دو بنیادی اصول واضح کر دیں، جن کا، ہر حال میں، خیال رکھا جانا چاہیے۔

ایک یہ کہ پانی کے معاملے میں بھی شریعت کا یہ اصول ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ جب تک یہ یقین نہ ہو جائے کہ وہ نجس ہے، اسے پاک ہی سمجھا جائے گا، اور اس سے وضو یا غسل کرنا، ہر حال میں، جائز ہو گا۔ ابنِ عبد البر رحمہ اللہ نے اپنی کتاب 'التمہید' میں یہی بات اس طرح بیان کی ہے:

الاصل فی ثوب المسلم، وفی ارضه وفی جسمه
مسلمان کے کپڑوں، اس کی زمین اور اس کے جسم کے بارے میں یہی سمجھا جائے گا کہ وہ

الطهارة، حتى يتيقين بالنجاسة فاذا تيقنت وجب غسلها وكذلك الماء اصله انه محمول على الطهارة حتى يتيقن حلول النجاسة فيه۔ (ج ۱، ص ۲۶۵)

پاک ہے، جب تک اس بات کا یقین نہ ہو جائے کہ وہ ناپاک ہے۔ پھر جب یہ یقین ہو جائے کہ وہ نجس ہے، تو یہ لازم ہے کہ اسے دھویا جائے۔ یہی معاملہ پانی کا بھی ہے۔ اسے ہمیشہ پاک ہی سمجھا جائے گا، الا یہ کہ اس میں نجاست مل جانے کا یقین ہو جائے۔"

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ آدمی کو، بلاوجہ، اس شک میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ اس نے جس پانی سے وضو یا غسل کیا ہے، وہ پاک تھا بھی یا نہیں۔ مزید یہ کہ اگر پانی کے معاملے میں غالب گمان یہی ہے کہ وہ پاک ہے تو خواہ مخواہ، اس تحقیق میں نہیں پڑ جانا چاہیے کہ اس کی پاکیزگی حتمی طور پر ثابت ہو جائے۔ اس طرح کے رویے لوگوں کے لیے تنگی اور بالآخر دین سے متنفر ہو جانے کا باعث بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین میں جو وسعت رکھی ہے، ایک فقیہ کو اسے کم و کاست، اسی وسعت کے ساتھ اسے لوگوں تک پہنچانا چاہیے، اور اس معاملے میں، ان کے لیے صحیح طریقہ یہی ہے کہ نہ وہ خود افراط و تفریط اور غلو کا شکار ہوں اور نہ دوسروں ہی کو یہ راستہ دکھائیں۔

پانی کے معاملے میں، دوسرا بنیادی اصول یہ ہے کہ کسی علاقے یا تمدن کے لوگ جس پانی سے، عام طور پر، منہ ہاتھ دھوتے یا نہاتے ہوں، وہی پانی وضو یا، طہارت کی غرض سے کیے جانے والے، غسل میں بھی استعمال کیا جائے گا۔ اس کے برعکس، کسی علاقے یا تمدن کے لوگ جس پانی سے، عام طور پر، منہ ہاتھ دھونا یا غسل کرنا پسند نہ کرتے ہوں، انھیں یہ پانی، وضو یا، شریعت کے مقرر کردہ، غسل میں بھی استعمال کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ ابن رشد رحمہ اللہ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب 'بدایۃ المجتہد' میں اسی بات کو یوں بیان کیا ہے:

حد الکراهیة عندی هو ما تعافه النفس و تری انه ماء خبیث۔ (ج ۱، ص ۱۹)

"میرے نزدیک (پانی کے معاملے میں) کراہت کا معیار یہ ہے کہ دل اس سے بچنا چاہے اور اسے یہ محسوس ہو کہ پانی گندا ہے۔"

اس سے یہ لازم آئے گا کہ پانی کے معاملے میں کوئی مستقل شریعت یا قانون موجود نہیں ہے، بلکہ اسے تمدن اور عرف ہی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ چنانچہ، اگر کسی گاؤں میں رہنے والے لوگ جوہڑ کے پانی سے منہ ہاتھ دھو لیتے ہیں، تو ان کو اسی پانی سے وضو یا غسل بھی کرنا چاہیے، جبکہ، اس کے برعکس، کوئی شہری، چونکہ اپنے رہن سہن کے طریقوں اور تمدنی حالات کی وجہ سے اس پانی سے عام طور

پر، اکراہت محسوس کرتا ہے، لہذا اسے اس پانی سے وضو کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ ظاہر ہے، وضو کر کے آدمی کو نماز ادا کرنی اور اللہ کے حضور میں پیش ہونا ہے، اور جب اس پانی سے اس کی طبیعت ہی اِبا محسوس کرتی ہے، تو اس سے وضو کر کے آخر اس میں پاکیزگی کا احساس کیسے پیدا ہو گا۔

ان دو اصولوں کو جان لینے کے بعد اب ہم دیکھتے ہیں کہ پانی کے معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیں کیا رہنمائی ملتی ہے۔

سمندر کا پانی

سمندر کا کھارا پانی، چونکہ انسان پی نہیں سکتا، اس وجہ سے، اس کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اسے طہارت کے لیے استعمال کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ اس معاملے میں، اصل بات وہی ہے جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ جس چیز پر لفظ 'ماء' کا اطلاق ہو گا، اس سے وضو یا غسل کرنا، ہر حال میں، جائز ہو گا۔ ظاہر ہے، سمندر کے پانی پر 'ماء' یا 'پانی' کے لفظ ہی کا اطلاق ہو گا، اور اس وجہ سے، اس سے وضو یا غسل کرنا جائز ہو گا۔ چنانچہ، جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں دریافت کیا گیا، تو انھوں نے بھی یہی جواب دیا۔ دارمی کی روایت ہے:

عن ابی هريرة قال: اتی رجل من بنی مدلج الی النبی صلی الله عليه وسلم فقال: يارسول الله انا اصحاب هذا البحر نعالج الصيد علی رمث فنعزب فيه الليلة والليلتين والثلاث والاربع، ونحمل معنا من العذب لشفاهنا، فان نحن توضانا به خشينا علی انفسنا وان نحن آثرنا بانفسنا وتوضانا من البحر وجدنا فی انفسنا من ذلك فخشينا ان لا يكون طهورا به فقال رسول الله

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بنو مدلج کے ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر عرض کی: یا رسول اللہ، ہم لوگ شکار کی تلاش میں، لکڑی کے تختوں پر بیٹھ کر سمندر میں نکل جاتے ہیں اور کبھی مرتبہ تین چار راتیں سمندر ہی میں رہتے ہیں۔ ہمارے ساتھ بس اتنا ہی پانی ہوتا ہے جو ہمارے ہونٹوں کو تر رکھ سکے، اس وجہ سے اگر ہم اسے وضو کرنے میں استعمال کریں تو یہ ڈر ہوتا ہے کہ ہم پیاس سے مر جائیں اور اگر ہم اس بات کے پیش نظر سمندر کے پانی سے وضو کریں تو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ پانی ناپاک نہ ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بات

صلی اللہ علیہ وسلم: توضوا منہ فانہ الطاھر ماءہ الحلال میتتہ (کتاب الطہارۃ)

سن کر فرمایا: سمندر ہی کے پانی سے وضو کرو، کیونکہ اس کا پانی پاک اور اس کی مری ہوئی چیزیں حلال ہیں۔"

پانی میں نجاست مل جانا

اگر پانی میں معمولی سی نجاست گر جائے تو، عام طور پر آدمی اسے نظر انداز کر کے اس پانی کو استعمال کر لیتا ہے۔ یہ رویہ، خاص طور پر، ان علاقوں میں ضرور اپنایا جاتا ہے، جہاں پانی کی فراہمی آسان نہ ہو اور اس کا بندوبست کرنے کے لیے بہت مشقت اٹھانی پڑتی ہو۔ لیکن، جب معاملہ وضو یا غسل جنابت کرنے کا ہو، تو یہ ہو سکتا ہے کہ غیر معمولی احتیاط کے پیش نظر آدمی ایسا پانی استعمال کرنے سے احتراز کرے اور اس کے لیے ہر مشقت برداشت کر کے دوسرے پانی کا بندوبست کرنے کے لیے نکل کھڑا ہو۔ ہمارے دین میں یہ رویہ ہرگز مطلوب نہیں ہے، کیونکہ اس طرح آدمی اپنے اور دوسروں کے لیے دین کی وسعتوں کو تنگ کرتا اور دین کے ساتھ کشتی لڑنے کی کوشش کرتا ہے، جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلتا ہے کہ وہ خود بفرض محال، ان تمام تنگیوں اور مشکلات کو کسی نہ کسی طرح برداشت کر بھی لے، دوسروں کو لامحالہ دین سے متنفر ہی کرنے کا باعث بنتا ہے۔ چنانچہ، جیسا کہ ہم پہلے بھی واضح کر چکے ہیں، وضو یا شریعت کے مقرر کردہ غسل کے لیے آدمی کو وہ پانی، بہرحال، استعمال کرنا چاہیے جسے وہ عام طور پر استعمال کرتا ہے۔ یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ ترمذی کی روایت ہے:

عن ابی سعید الخدری انہ قیل لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتوضا من بئر بضاعۃ۔ وھی بئر یطرح فیھا الحیض ولحم الکلاب والنتن۔ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: الماء طھور لا ینجسہ شیء۔

"ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: کیا ہم بضاعہ کے کنویں سے وضو کر سکتے ہیں، جبکہ یہ ایسا کنواں تھا جس میں عورتیں کپڑوں کے ایسے ٹکڑے پھینک دیا کرتی تھیں جن پر حیض کا خون لگا ہوتا تھا، اس کے ساتھ ساتھ مردہ کتے اور بدبودار چیزیں بھی اس میں پھینک دی جاتی تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پانی ہر حال میں پاک ہے، اسے کوئی

(ترمذی، ابواب الطہارۃ) چیز ناپاک نہیں کرتی۔"

غور کیجیے، تو اس روایت میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے، خاص طور پر یہ پوچھا گیا ہے کہ کیا اس کنوئیں کے پانی سے وضو کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس کنوئیں پر سے گزرتے ہوتے، عام ضروریات کے لیے تو اس کا پانی استعمال کر لیا کرتے تھے، مگر اس پانی سے وضو کرنے میں انھیں تردد تھا۔ چنانچہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا یہ تردد دور کر دیا اور بتا دیا کہ جو پانی، عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے، اس سے وضو بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن، بالبداہت، واضح ہے کہ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آدمی غیر محتاط رویہ اختیار کرتے ہوئے اپنی فطرت میں موجود پاکیزگی اور طہارت کی حس ہی کو ختم کر دے یا دبا دے۔ چنانچہ، اسی اعتدال کے رویے کو قائم رکھنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں اس کنوئیں کے پانی سے وضو کرنے کی اجازت دی، وہاں آپ نے غسل کرنے کے یہ آداب بھی سکھائے کہ:

لاتبل فی الماء الدائم الذی لا یجری ثم تغتسل منہ۔ (مسلم، کتاب الطہارۃ) "کھڑے پانی میں پیشاب کر کے اسی سے غسل نہ کر لیا کرو۔"

اسی طرح ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کے مطابق، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا یغتسل احدکم فی الماء الدائم وھو جنب۔ (مسلم، کتاب الطہارۃ) "کوئی شخص، جنابت کی حالت میں، کھڑے پانی میں داخل ہو کر غسل نہ کرے۔"

بالبداہت واضح ہے کہ ایک سلیم الطبع شخص پانی میں رفع حاجت کرنے سے احتراز ہی کرے گا اور غسل کرنے میں بھی طریقہ اختیار کرے گا کہ اپنے جسم پر لگی ہوئی نجاست کو پانی میں داخل ہونے سے پہلے دھو لے۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، یہ اور اس طرح کی دوسری ہدایات غسل یا وضو کے آداب میں سے ہیں۔ بلاشبہ، اس کے یہ معنی، ہرگز، نہیں ہیں کہ جنابت کی حالت میں اگر آدمی کا ہاتھ بھی پانی میں پڑ جائے تو اس سے پانی ناپاک ہو جائے گا۔ چنانچہ، ایک روایت کے مطابق، نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک برتن سے وضو کرنے لگے، تو امہات المومنین میں سے کسی نے فرمایا: میں نے جنابت کی حالت میں، اس میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا:

الماء لا یجنب۔ (المغنی، ج ۱، ص ۱۹) "پانی جنبی نہیں ہوتا۔"

مزید برآں، یہ بات بھی ظاہر ہے کہ جب کسی پانی میں اتنی زیادہ نجاست مل جائے جس سے اس کے رنگ، بو یا ذائقے میں تبدیلی آجائے، تو اس صورت میں، انسان کی فطرت اس سے ابا کرتی

ہے کہ وہ اسے کسی بھی مقصد کے لیے استعمال کرے۔ اس وجہ سے ایسے پانی سے وضو یا غسل بھی نہیں کرنا چاہیے۔ یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایات سے بھی معلوم ہوتی ہے، چنانچہ اس معاملے میں، بے جا احتیاط اور غلو سے بچنے کے لیے آپ نے یہ واضح معیار مقرر فرمادیا:

الماء طهور لا ينجسه شئ، الا ما غلب عليه، فغير طعمه او لونه او ريحه۔

"پانی پاک ہے اور پاکیزگی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی، الا یہ کہ وہ اس پر اتنی غالب آجائے کہ اس کا ذائقہ یا اس کا رنگ یا اس کی بو بدل دے"۔ (التمہید: ج۱، ص۳۳۲)

لیکن اس بات سے، ظاہر ہے کہ وہ تمام چیزیں مستثنیٰ ہوں گی جنھیں انسان خوشبو یا کسی اور مقصد سے پانی میں ملاتا ہے۔ مثال کے طور پر، عرقِ گلاب یا کوئی اور خوشبو ملا پانی پاک ہی ہو گا اور اس وجہ سے، اس سے وضو یا غسل کرنا جائز ہو گا۔

جانوروں کا جھوٹا پانی

ایسے پانی کے بارے میں بھی انسان شک میں مبتلا ہو سکتا ہے، جس میں سے جانوروں نے پیا ہو۔ یہ مسئلہ، خاص طور پر، ان جانوروں کے بارے میں پیدا ہوتا ہے جو، شریعت میں حرام ٹھہرائے گئے ہیں۔ اس معاملے میں، اصل بات یہ ہے کہ تمام جانور اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں، اور ان میں پایا جانے والا خبث، اس اعتبار سے نہیں ہے کہ ان کے چھو دینے سے کوئی چیز ناپاک ہو جاتی ہے۔ قرآنِ مجید اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں ان جانوروں سے متعلق جس چیز کو حرام قرار دیا گیا ہے، وہ ان کا گوشت کھانا ہے، اور اس حرمت کی علت بھی، خود قرآن و سنت میں یا عقل و فطرت میں، بالکل واضح ہے۔ اس وجہ سے، جانوروں کا جھوٹا پانی، ہمارے نزدیک، ناپاک نہیں ہے۔ چنانچہ، جو لوگ اس طرح کے پانی کو، عام طور پر، استعمال کرتے ہوں، ان کے لیے اسے وضو یا غسل میں استعمال کرنا بھی جائز ہے۔

یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایات سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ آپ سے ایسے جوہڑوں کے بارے میں پوچھا گیا، جن سے کتے اور دوسرے درندے اپنی پیاس بجھانے آتے تھے، کہ ان کے پانی سے وضو کیا جا سکتا ہے یا نہیں، آپ نے فرمایا:

لها ما حملت في بطونها ولكم ما غبر شرابا وطهورا۔

"جو وہ پی گئے، وہ ان کا ہے، اور جو باقی رہ گیا وہ تمھارا ہے۔ تم اسے پی بھی سکتے ہو اور اس

(بدایۃ المجتہد، ج ۱، ص ۲۱) سے طہارت بھی حاصل کر سکتے ہو۔"

تاہم، اس معاملے میں، یہ بات، بہرحال، ملحوظ رہنی چاہیے کہ اس طرح کے پانی سے وضو کرنا جائز ہے، اسے کسی بھی طرح ضروری قرار نہیں دیا جا سکتا اور نہ اسے ممنوع ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ، دورِ حاضر میں، تمدنی ترقی نے جن علاقوں میں صاف پانی کی فراہمی آسان بنا دی ہے، وہاں کے لوگ اگر اس طرح کا پانی استعمال کرنے میں کراہت محسوس کریں، تو ان کو اس پانی سے وضو یا غسل کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

استدراک

اس معاملے میں، البتہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایات میں، کتے کے بارے میں، جو ہدایات آئی ہیں، ان سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتے کا جھوٹا ناپاک ہے۔ ابوداؤد کی روایت ہے:

عن ابی هريرة ان رسول الله صلی الله عليه وسلم قال: اذا ولغ الكلب فی الاناء فاغسلوه سبع مرات والسابعة بالتراب۔ (کتاب الطہارۃ)	"ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کتا برتن میں منہ ڈال دے تو اسے سات مرتبہ دھوو، اور ساتویں مرتبہ مٹی لگا کر دھوو۔"

ہمارے نزدیک، کتے کے جھوٹے برتن کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت اس وجہ سے نہیں دی کہ کتے کا جھوٹا ناپاک ہے، بلکہ اس وجہ سے دی ہے کہ اگر کتا پاگل ہو تو اس کی یہ بیماری انسان کو لگ سکتی ہے۔ کتے کے پاگل پن (RABIES) کی بیماری، نہایت خطرناک ہے۔ جب اس بیماری کے جراثیم دماغ تک پہنچ جائیں، تو اس کے بعد مریض کا علاج، ناممکن ہو جاتا ہے۔

کتے کے جھوٹے سے متعلق ہماری، اس رائے کی وجہ یہ ہے کہ اگر معاملہ نجاست ہی کا ہوتا، تو، اس صورت میں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم برتن کو دھو لینے کی ہدایت فرماتے، جبکہ روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ، اس معاملے میں، آپ نے غیر معمولی احتیاط کی ہدایت فرماتے ہوئے برتن کو سات مرتبہ دھونے کا حکم دیا اور یہ بھی فرمایا کہ ساتویں مرتبہ اسے مٹی سے مانج کر دھویا جائے۔

ہو سکتا ہے، کسی کے ذہن میں، ہماری اس رائے کے خلاف، یہ سوال پیدا ہو کہ پاگل کتا تو پانی کے قریب بھی نہیں آتا، اس وجہ سے، پاگل کتے کے جھوٹے پانی کا مسئلہ پیدا ہی نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارے نزدیک، یہ بات بالکل صحیح ہے کہ پاگل کتا پانی کے نزدیک بھی نہیں پھٹکتا، مگر غور کیجیے، تو نبی

صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ روایت میں کتے کا جھوٹا پانی زیرِ بحث ہی نہیں ہے۔ اس روایت میں تو کتے کا جھوٹا برتن زیرِ بحث ہے، اور جہاں تک برتن میں منہ ڈالنے کا تعلق ہے، وہ، بہرحال، کوئی کتا اپنے پاگل پن کے باوجود بھی ڈال سکتا ہے۔

اس معاملے میں، البتہ، یہ اصولی سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کیا شریعت کے علاوہ، لوگوں کی عمومی تعلیم و تربیت کے لیے بھی ہدایات دیا کرتے تھے۔ ہمارے نزدیک، اس سوال کا جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک قانون دان اور شارع ہی نہیں تھے، بلکہ آپ کی حیثیت اس کے ساتھ ساتھ معاشرے کے بزرگ، ریاست کے حکمران، ایک مدبر اور حکیم کی بھی ہے۔ چنانچہ احادیث کے ذخیرے پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بہت سے مواقع پر لوگوں کی عمومی تعلیم و تربیت کے لیے ہدایات دی ہیں، جن کا شریعت اور قانون سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم یہاں، اختصار کے پیشِ نظر، اس طرح کی ہدایات کی دو مثالیں پیش کیے دیتے ہیں:

۱۔ عن ابن المغفل قال: امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم بقتل الکلاب (مسلم، کتاب الطہارۃ)	"ابن مغفل بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک مرتبہ) کتوں کو مارنے کا حکم دیا۔"

ظاہر ہے کہ کتوں کو مارنا کوئی شرعی حکم نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں کتوں کے باؤلے پن کی بیماری پھیلنے کی وجہ سے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا ہے۔ غالباً اسی زمانے میں آپ نے کتوں کے جھوٹے برتن کو سات یا آٹھ مرتبہ دھونے اور مٹی سے مانجھنے کا مذکورہ حکم دیا تھا۔

۲۔ عن عبد اللہ بن سرجس: ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یبولن احدکم فی الجحر واذا نمتم فاطفؤا السراج فان الفارۃ تاخذ الفتیلۃ فتحرق اھل البیت واوکؤا الاسقیۃ وخمروا الشراب وغلقوا الابواب باللیل۔ (احمد بن حنبل: ج ۵، ص ۸۲)	"عبد اللہ بن سرجس بیان کرتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے کوئی کسی بل میں پیشاب نہ کرے۔ اور جب تم سونے لگو تو اپنے چراغ بجھا لو، کیونکہ اگر چوہیا چراغ کی بتی پکڑ لے تو اس سے آگ لگ جائے گی اور گھر والے جل جائیں گے۔ اور سوتے وقت پانی کی مشک باندھ دیا کرو اور پینے کا پانی ڈھانپ دیا کرو اور رات کے وقت دروازے بند رکھا کرو۔"

ان تمام احکام پر غور کیجیے، تو بالبداہت واضح ہے کہ یہ عام زندگی سے متعلق حکیمانہ ہدایات ہیں اور ان کا کوئی تعلق شریعت سے نہیں ہے۔

کسی کے بچے ہوئے پانی سے وضو یا غسل کرنا

پانی کم ہونے کی وجہ سے ایک آدمی کو مجبوراً کسی دوسرے کے بچے ہوئے پانی سے غسل کرنے کی ضرورت پڑسکتی ہے۔ عام طور پر کسی کے بچے ہوئے پانی کو استعمال کرنے میں آدمی کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا۔ البتہ، جب معاملہ وضو یا غسل کا ہو، تو اسے یہ گمان ہوسکتا ہے کہ یہ پانی پاک ہے بھی یا نہیں ہے چنانچہ، جیساکہ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں، وضو یا غسل کے لیے وہ پانی، بہر حال، استعمال کیا جاسکتا ہے جسے، عام طور پر، منہ ہاتھ دھونے یا نہانے کے لیے استعمال کرنے میں آدمی جھجک محسوس نہیں کرتا۔

اوپر ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ نقل کر چکے ہیں: 'الماء طهور لا ينجسه شئ' یعنی، 'پانی پاک ہے، اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی'، جن سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ کسی کے بچے ہوئے پانی کو استعمال کرنے میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ 'سنن ابو داؤد' میں ابن عباس سے روایت ہے:

اغتسل بعض ازواج النبي صلى الله عليه وسلم في جفنة فجاء النبي صلى الله عليه وسلم ليتوضاء منها۔ او يغتسل فقالت له يا رسول الله اني كنت جنبا فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الماء لا يجنب۔ (کتاب الطہارۃ)	"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات میں سے کسی نے غسل کیا، اس کے بعد آپ آئے اور بچے ہوئے پانی سے وضو یا غسل کرنے لگے تو انھوں نے کہا یا رسول اللہ میں جنابت سے تھی، اس پر آپ نے فرمایا کہ پانی جنبی نہیں ہوتا۔"

اسی طرح روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنابت کی حالت میں، ایک ہی برتن سے غسل کر لیا کرتے تھے:

مسلم کی روایت ہے:

كنت اغتسل انا و رسول الله صلى الله عليه وسلم من اناء بيني وبينه واحد فيبادرني حتى	"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک برتن سے غسل کر لیتے تھے، جو ہم دونوں کے درمیان پڑا ہوتا تھا، جب آپ جلدی جلدی پانی ڈالتے تو میں کہتی کہ میرے

اقول دع لی دع لی قالت وھما جنبان۔ (کتاب الطھارۃ)

وہ فرماتی ہیں کہ اس وقت ہم دونوں حالتِ جنابت میں ہوتے۔ [1]

شہری زندگی کے موجودہ حالات میں، جبکہ نل کے پانی TAP WATER کی سہولت ہر گھر میں موجود ہے، اگرچہ، عام طور پر، یہ مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کسی کے بچے ہوئے پانی سے وضو یا غسل کرنا پڑے، تاہم دیہاتی زندگی میں، اب بھی، بعض علاقوں میں پانی کی فراہمی ایک مشکل مسئلہ ہے۔ اس وجہ سے، کسی کے استعمال کے بعد، بچے ہوئے پانی کو وضو یا غسل میں استعمال کر لینا شریعت میں، بہر حال، جائز رکھا گیا ہے۔

پانی کے باب میں یہ وہ ہدایات ہیں، جو ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتی ہیں۔ ان ہدایات پر غور کرنے سے آدمی، بلا تامل، اسی نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ان ہدایات کا شریعت یا قانون کے حدود متعین کرنے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ ہدایات، جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، سرتاسر لوگوں کو اپنی فطرت اور اعتدال کی راہ پر قائم رکھنے اور، اس معاملے میں، انھیں افراط و تفریط اور غلو سے بچانے ہی کے لیے دی گئی ہیں۔ ھذا ما عندی والعلم عند اللہ۔

---

[1] اس روایت سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اگر کسی وجہ سے شوہر اور بیوی اکٹھے غسل کر لیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ قرآنِ مجید میں شوہر اور بیوی کے تعلق کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

ھُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّھُنَّ۔ (البقرہ ۲: ۱۸۷)

"تمھاری بیویاں تمھارے لیے بمنزلۂ لباس ہیں اور تم ان کے لیے بمنزلۂ لباس ہو۔"

قرآنِ مجید کے ان الفاظ سے جہاں اور بہت سی باتیں نکلتی ہیں، وہاں ایک اہم بات یہ بھی نکلتی ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت جب نکاح کے رشتے میں بندھ جاتے ہیں، تو ان کے درمیان کسی قسم کا حجاب باقی نہیں رہتا۔

طالب محسن

روزہ

لغت کے اعتبار سے 'الصوم' کا مطلب 'رک جانا' ہے اور شریعت کی رو سے اس سے مراد وہ عبادت ہے جس میں آدمی اللہ کی خوشنودی کے لیے طلوع فجر سے غروب آفتاب تک کھانے اور پینے اور ازدواجی تعلق سے رکا رہتا ہے۔ رمضان کے روزے دو ہجری کو شعبان کے مہینے میں فرض ہوئے تھے۔

امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے روزے اسی طرح فرض کیے ہیں، جس طرح پہلی امتوں پر فرض کیے تھے۔ ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ۔ (البقرہ ۲: ۱۸۳)

"اے اہل ایمان، تم پر اسی طرح روزے فرض کیے گئے ہیں، جس طرح تم سے پہلے فرض کیے گئے تھے، تاکہ تم تقویٰ اختیار کر سکو۔"

اب ہم ان احادیث پر ایک نگاہ ڈالیں گے، جن میں روزوں کی فضیلتیں بیان ہوئی ہیں:

الصيام جنة من النار كجنة احدكم من القتال۔ (احمد بن حنبل)

"روزہ جہنم سے تمھاری اسی طرح ڈھال ہے، جس طرح تمھاری یہ ڈھال تمھیں قتال میں بچاتی ہے۔"

من صام يوما في سبيل الله عزوجل زحزح اللموجهه عن النار بذلك اليوم سبعين خريفا۔ (متفق علیہ)

"جس نے اللہ کی خاطر ایک دن کا روزہ رکھا، اللہ تعالیٰ اس ایک دن کی وجہ سے اس کا چہرہ آگ سے ستر سال کے لیے دور کر دیں گے۔"

ان للصائم عند فطره دعوة لاترد۔ (ابن ماجہ، حاکم)

"لاریب، افطاری کا وقت ایک ایسا موقع ہے جب روزے دار کی دعا ٹالی نہیں جاتی۔"

إن فی الجنة بابا یقال له الریان، یدخل منه الصائمون یوم القیامة لا یدخل منه احد غیرهم، یقال این الصائمون، فیقومون لا یدخل منه احد غیرهم، فاذا دخلوا اغلق فلم یدخل منه احد۔ (متفق علیہ)	"جنت کا ایک دروازہ ہے، جسے ریان (سیرابی) کا نام دیا گیا ہے۔ روزِ قیامت اس دروازے سے جنت میں صرف وہی جائیں گے، جو دنیا میں روزے رکھا کرتے تھے اور اس دروازے سے کوئی دوسرا جنت میں داخل نہ ہو سکے گا۔ آواز دی جائے گی روزہ دار کہاں ہیں، وہ کھڑے ہوں گے اور وہی اس دروازے میں داخل ہوں گے۔ پھر جب وہ اندر چلے جائیں گے تو دروازہ بند کر دیا جائے گا۔ پھر کوئی داخل نہ ہو سکے گا۔"

پسندیدہ روزے

۱۔ غیر حاجی کے لیے نو ذی الحجہ کا روزہ۔
۲۔ محرم کی نو اور دس کے روزے۔
۳۔ شوال کے چھ روزے۔
۴۔ شعبان کے نصف اوّل میں روزے رکھنا۔
۵۔ ذوالحجہ کے پہلے عشرے میں روزے رکھنا۔
۶۔ ایام بیض کے روزے (ہر قمری ماہ کی تیرہ، چودہ اور پندرہ تاریخ)۔

ناپسندیدہ روزے

۱۔ حاجی کے لیے نو ذی الحجہ کا روزہ۔
۲۔ صرف جمعے کے دن کا روزہ (روزوں کے تسلسل میں اگر جمعہ آجائے تو حرج نہیں)۔
۳۔ صرف ہفتے کے دن کا روزہ (اگر تسلسل میں ہفتہ آجائے، تو حرج نہیں)۔
۴۔ شعبان کے نصف آخر میں روزے رکھنا۔

قطعی ناپسندیدہ روزے

۱۔ بغیر افطار کے دو دن کا مسلسل روزہ۔
۲۔ رمضان کے شک میں ۳۰ شعبان کا روزہ۔

۳۔ مسلسل روزے رکھنا۔

۴۔ عورت کا شوہر سے پوچھے بغیر نفل روزہ رکھنا، جبکہ وہ موجود ہو۔

قطعی ممنوع روزے

۱۔ عیدالفطر کا روزہ

۲۔ عیدالاضحیٰ کے تین دنوں میں روزہ۔

۳۔ ایامِ حیض و نفاس میں روزہ۔

۴۔ ایسے مریض کا روزہ رکھنا، جس کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہو۔

واجب روزے

قرآن و سنت کی رُو سے رمضان کے روزے فرض ہیں۔ قرآنِ مجید میں ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیٓ أُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ۔ (البقرہ ۲: ۱۸۵)

"یہ رمضان کا مہینہ ہے، جس میں قرآن مجید نازل کیا گیا ہے، جو لوگوں کے لیے ہدایت ہے۔ اور جس میں ہدایت اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کے کھلے دلائل ہیں۔ چنانچہ تم میں سے جو بھی یہ مہینہ پائے، اس کے روزے رکھے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

بنی الاسلام علی خمس: شھادۃ ان لا الٰہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ واقامۃ الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ، وحج البیت وصوم رمضان۔ (متفق علیہ)

"اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے۔ اس بات کا اعلان کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں، نماز کی اقامت، زکوٰۃ کی ادائیگی، خانہ کعبہ کا حج اور رمضان کے روزے۔"

رمضان کی فضیلت

رمضان کے مہینے میں بڑی برکتیں اور بہت سی فضیلتیں ہیں۔ کوئی دوسرا مہینہ یہ شان نہیں رکھتا۔ متعدد احادیث میں اس کی برکات و فضائل کا ذکر ہوا ہے۔ انہی میں سے چند حدیثیں درج ذیل ہیں:

الصلوات الخمس والجمعة الی الجمعة ورمضان الی رمضان مکفرات لما بینهن، ان اجتنبت الکبائر۔

(مسلم)

"پانچ نمازوں کے مابین، دو جمعوں کے مابین اور دو رمضانوں کے مابین ہونے والے گناہوں کو روزے اور نمازیں مٹا دیتی ہیں بشرطیکہ آدمی اس دوران میں کبیرہ گناہوں سے مجتنب رہے۔"

من صام رمضان ایمانا واحتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه۔

(متفق علیه)

"جس نے ایمان کے تقاضے اور اپنے احتساب کی غرض سے رمضان کے روزے رکھے، اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے گئے۔"

رأیت رجلا من امتی یلهث عطشا کلما ورد حوضا منع منه فجاء صیام رمضان فسقاه رواه۔

(الطبرانی)

"میں نے اپنی امت کے ایک آدمی کو دیکھا کہ پیاس سے سخت بے تاب ہے۔ جب جب حوض پر آتا ہے، روک دیا جاتا ہے تب اس کے پاس رمضان کے روزے آتے ہیں، اور اسے پلاتے اور سیراب کر دیتے ہیں۔"

اذا کان اول لیلة من رمضان صفدت الشیاطین ومردة الجان وغلقت ابواب النار فلم یفتح منها باب وفتحت ابواب الجنة فلم یغلق منها باب ونادی مناد، یا باغی الخیر اقبل، ویا باغی الشر اقصر، ولله عتقاء من النار

"جب رمضان کی پہلی رات آتی ہے، شیطانوں اور سرکش جنوں کو زنجیریں ڈال دی جاتی ہیں۔ جہنم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں، یہاں تک کہ اس کا کوئی دروازہ کھلا ہوا نہیں رہتا۔ جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، یہاں تک کہ اس کا کوئی دروازہ بند نہیں رہتا۔ پھر ایک پکارنے والا آواز دیتا ہے، بھلائی کے چاہنے والے قدم بڑھاؤ۔ پھر کہتا ہے، برائی کے چاہنے والا رک جاؤ۔ (آگاہ رہو) وہ لوگ جو آگ سے

وذلك كل ليلة۔ (ترمذی)	بچائے جائیں گے۔ ان کا معاملہ صرف اللہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اور ہر رات اسی طرح ہوتا ہے۔

رمضان میں نیکی اور خوب کاری

یہ رمضان ہی کی ایک فضیلت ہے کہ اس میں ہونے والے نیکی کے کاموں اور صبر و احسان کی نوعیت کے اعمال بھی خصوصی فضیلت کے حامل ہو جاتے ہیں۔ انھی میں سے چند اعمال کا ذکر یہاں بطورِ خاص کیا جاتا ہے۔

خیرات

آپ نے فرمایا:

أفضل الصدقة صدقة في رمضان۔ (ترمذی)	"بہترین خیرات، رمضان میں کی گئی خیرات ہے۔"
من فطر صائما فله اجره من غير ان ينقص من اجر الصائم شيء۔ (احمد بن حنبل، ترمذی)	"جس نے کسی روزہ دار کا روزہ افطار کرایا، اسے روزے دار کا ثواب ملے گا لیکن روزہ دار کے اجر میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔"
من فطر صائما على طعام او شراب من حلال صلت عليه الملائكة في ساعات شهر رمضان وصلى عليه جبريل ليلة القدر۔ (طبرانی)	"جو آدمی کسی روزہ دار کا روزہ حلال کھانے یا حلال مشروب سے افطار کرائے، رمضان کی گھڑیوں میں فرشتے اس کے لیے دعائیں کرتے ہیں اور لیلۃ القدر میں جبریل علیہ السلام اس کے لیے دعا کرتے ہیں۔"
وكان اجود الناس بالخير، وكان اجود ما يكون في رمضان حين يلقاه جبريل۔ (بخاری)	"آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھلائی کے کاموں میں لوگوں میں سے سب سے بہترین تھے اور رمضان میں جو کچھ ہوتا ہے اس میں بھی آپ سب سے بڑھ جاتے بطورِ خاص، جب جبریل آپ سے ملنے آتے۔"

قیامِ لیل (تہجد)

آپ نے فرمایا:

من قام رمضان ایمانا واحتسابا غفرله ما تقدم من ذنبه۔ (متفق علیہ)

"جس نے رمضان کے مہینے میں ایمان کے تقاضے اور احتساب کی غرض سے تہجد کا اہتمام کیا۔ اس کے سابقہ گناہ معاف کر دیے گئے:"

وکان یحیی لیالی رمضان واذا کان العشر الاواخر ایقظ اهله وکل صغیر وکبیر یطیق الصلاۃ۔ (مسلم)

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کی راتوں کو زندہ رکھتے تھے اور جب آخری عشرہ آتا، تو آپ گھر والوں اور ہراس چھوٹے بڑے کو جگاتے جو نماز پڑھ سکتا تھا:"

تلاوتِ قرآن مجید

نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں نہ صرف خود تلاوتِ قرآن مجید معمول سے بہت بڑھا دیتے تھے بلکہ جبریل علیہ السلام بھی آپ کو قرآن مجید پڑھانے کے لیے تشریف لاتے تھے (بخاری) آپ اس مہینے میں قیام کس قدر طویل کر دیتے تھے، اس کا اندازہ اس ایک واقعے سے کیا جا سکتا ہے۔ ایک رات حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے آپ کے ساتھ نماز پڑھی۔ آپ نے نماز میں پہلے سورۂ بقرہ، پھر آلِ عمران اور پھر نساء پڑھی اور یہ سورتیں اس اہتمام سے پڑھیں کہ ہر اس آیت پر رکے جس میں ڈرایا گیا تھا اور ابھی دو رکعت ہی پڑھی تھیں کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ آ گئے اور بتایا کہ نماز (فجر) کا وقت ہو گیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے:

الصیام والقیام یشفعان للعبد یوم القیامة۔ یقول الصوم، رب منعته الطعام والشراب فی النهار ویقول القرآن، رب منعته النوم باللیل فشفعنا به۔ (احمد بن حنبل، نسائی)

"روزہ اور تہجد دونوں، روزِ قیامت بندے کی شفاعت کریں گے۔ روزہ کہے گا، اے رب! میں نے اسے دن میں کھانے پینے سے روکے رکھا، قرآن مجید کہے گا، اے میرے آقا! میں نے اسے رات نیند سے روکا۔ اس طرح ان کے ذریعے سے ہماری شفاعت ہوگی:"

اعتکاف

اعتکاف، درحقیقت، مسجد کے ساتھ اپنے آپ کو خاص کر لینا ہے، تاکہ اللہ تعالیٰ کا قرب

حاصل ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتکاف فرمایا اور زندگی کے آخری سال تک رمضان کے آخری عشرے کا اعتکاف کرتے رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

المسجد بیت کل تقی و تکفل الله لمن کان المسجد بیته بالروح والرحمة والجواز علی الصراط الی رضوان الله الی الجنة۔ (الطبرانی، البزاز)	"مسجد ہر اس شخص کا گھر ہے، جسے تقویٰ کی نعمت حاصل ہے اور اللہ تعالیٰ اس شخص کی اپنی رحمت اور امدادِ غیبی سے مدد کرتے ہیں اور اس طرح مدد کرتے ہیں کہ وہ صراطِ مستقیم پر چلتا ہوا اللہ کی رضا یعنی جنت تک پہنچ جاتا ہے۔"

عمرہ

عمرہ، دراصل، بیت اللہ کی زیارت اور طواف وسعی کا نام ہے۔ رمضان میں عمرے کی خصوصی حیثیت ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

عمرة فی رمضان تعدل حجة معی۔ (متفق علیہ)	"رمضان میں عمرے کا وہی اجر ہوگا جو میرے ساتھ حج کرنے کا ہے۔"

ارکان روزہ

۱۔ نیت: نیت سے مراد، درحقیقت، کسی عملِ صالح کے لیے دل کا پختہ ارادہ ہے جس میں بندۂ مومن کا مقصود اپنے رب کے حکم کی تعمیل اور اس کے قرب کا حصول ہوتا ہے۔

۲۔ امساک: اس سے مراد ان چیزوں سے رک جانا ہے، جن سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ جیسے کھانا، پینا اور صنفی تعلق۔

۳۔ وقت: اس سے مراد دن ہے، یعنی طلوعِ فجر سے لے کر غروبِ آفتاب تک۔

روزے میں حضور کے عمل کے بعض اہم پہلو

۱۔ افطاری میں جلدی

جلدی سے مراد سورج کے غروب ہوتے ہی روزہ افطار کر لینا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

لا یزال الناس بخیر۔ ما عجلوا الفطر۔ (متفق علیہ)	"لوگ اس وقت تک خیر پر رہیں گے، جب تک روزہ افطار کرنے میں جلدی کریں گے۔"

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم یکن لیصلی المغرب حتی یفطر ولو علی شربة ماء۔ (ترمذی)

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ افطار کیے بغیر مغرب کی نماز پڑھی ہو، خواہ افطار ایک گھونٹ پانی ہی سے کیا ہو"

۲۔ سادگی سے افطار

آپ صلی اللہ علیہ وسلم محض کھجور، چھوارہ یا پانی سے افطار کر لیا کرتے تھے۔ واضح رہے کہ کھجور عرب میں کوئی اہتمام کا کھانا نہ تھا۔ انس بن مالک سے روایت ہے:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یفطر علی رطبات قبل ان یصلی فان لم تکن فعلی تمرات، فان لم تکن حسا حسوات من ماء۔

"رسول صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے پہلے اگر میسر ہوتا تو تازہ کھجور سے، ورنہ چھوارے سے اور یہ بھی نہ ہوتا تو پانی کے گھونٹ سے روزہ کھول لیا کرتے تھے"

۳۔ افطار کے وقت کی دعا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب افطار کرتے تو یہ دعا پڑھتے تھے:

اللھم لک صمنا وعلی رزقک أفطرنا فتقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

"اے اللہ ہم نے تیرے لیے روزہ رکھا۔ تیرے ہی دیے ہوتے رزق سے افطار کیا۔ اسے قبول فرما۔ بے شک تو سمیع وعلیم ہے"

ابن عمر یہ دعا کرتے تھے:

اللھم انی أسالک برحمتک التی وسعت کل شیئ أن تغفر ذنوبی۔

"اے اللہ، میں تجھ سے تیری رحمت کے حوالے سے، جو ہر چیز پر پھیلی ہوئی ہے، اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہوں"

۴۔ سحری

اس سے مراد روزہ رکھنے کی نیت سے رات کے آخری حصے میں کھانا اور پینا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إن فصل ما بین صیامنا وصیام اھل الکتاب اکلة السحر۔

"ہمارے اور اہل کتاب کے روزے میں فرق کرنے والی چیز سحری کا کھانا ہے"

۵۔ سحری میں تاخیر

آپ کا ارشاد ہے:

لا تزال امتی بخیر ما عجلوا الفطر و	"میری امت اس وقت تک خیر پر رہے گی،
أخروا السحور۔	جب تک افطاری میں عجلت اور سحری میں تاخیر
(احمد بن حنبل)	کرتی رہے گی"۔

واضح رہے کہ سحری کے وقت کا آغاز رات کے نصفِ آخر سے ہوتا ہے اور اس کا اختتام طلوعِ فجر پر ہوتا ہے۔

روزے میں ناپسندیدہ عمل

۱۔ کلی اور ناک میں پانی ڈالنے میں غلو۔ آپ کا ارشاد ہے:

بالغ فی الاستنشاق الا أن	"وضو میں، ناک میں صفائی کرنے کے لیے پانی
تکون صائما۔ (اصحاب السنن)	اچھی طرح ڈالو الایہ کہ تم روزے سے ہو"۔

۲۔ شہوت انگیز حرکات اور خیالات۔

۳۔ ہنڈیا یا کھانا چکھنا۔

۴۔ کسی ضرورت یا وضو کے علاوہ کلی کرنا۔

۵۔ جسم کے کسی حصے سے اتنا خون نکالنا یا ایسا آپریشن کرانا کہ روزہ کھول لینے کا اندیشہ پیدا ہو جائے۔

جن چیزوں سے روزہ باطل ہو جاتا ہے

۱۔ کلی یا ناک صاف کرتے ہوئے پانی کا پیٹ تک چلے جانا۔

۲۔ خیال یا خواہش کے غلبے سے شہوت پوری ہو جانا۔

۳۔ عمداً قے کرنا۔

۴۔ کسی جبر کے نتیجے میں کھانا، پینا یا جنسی تعلق قائم کرنا۔

۵۔ اس خیال سے کہ ابھی طلوعِ فجر نہیں ہوا کچھ کھا پی لینا، جبکہ فجر طلوع ہو چکی ہو۔

۶۔ اس گمان میں کچھ کھا پی لینا کہ سورج ڈوب گیا ہے، حالانکہ ابھی نہ ڈوبا ہو۔ ان تمام صورتوں میں قضا واجب ہو گی، جبکہ درج ذیل دو صورتوں میں کفارہ ادا کرنا ہو گا:

۱۔ اپنی مرضی سے بغیر کسی جبر کے جماع کر بیٹھنا۔ ابوہریرہ سے روایت ہے:

جاء رجل الی النبی	"ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس
صلی اللہ علیہ وسلم فقال:	آیا اور کہا: میں ہلاک ہو گیا یا رسول اللہ۔ آپ

هلكت يا رسول. قال ما أهلكك؟ قال وقعت على امرأتي في رمضان. فقال هل تجد ما تعتق رقبة. قال: لا. قال: فهل تستطيع أن تصوم شهرين متتابعين؟ قال: لا. قال: فهل تجد ما تطعم ستين مسكينا؟ قال: لا. ثم جلس فأتي النبي بعرق فيه تمر. فقال: خذ تصدق بهذا. قال: فهل على أفقر منا؟ فضحك النبي صلى الله عليه وسلم حتى بدت نواجذه. وقال اذهب فأطعمه أهلك. (متفق علیہ)

نے پوچھا، کس چیز نے تجھے ہلاکت میں ڈال دیا۔ اس نے کہا: میں رمضان میں اپنی بیوی سے ملاقات کر بیٹھا ہوں۔ آپ نے پوچھا: تمہارے پاس غلام آزاد کرنے کی گنجائش ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ آپ نے پوچھا: دو ماہ کے روزے رکھ سکتے ہو؟ اس نے کہا: نہیں۔ آپ نے پوچھا: ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکتے ہو؟ اس نے کہا: نہیں۔ پھر بیٹھ گیا۔ (کچھ دیر میں) آپ کے پاس کھجوروں کا ایک ٹوکرا آیا۔ آپ نے اس سے کہا: یہ لے لو اور اسے خیرات کر دو۔ اس نے پوچھا: اپنے سے کسی زیادہ غریب کو دوں؟ آپ ہنس پڑے یہاں تک کہ پچھلے دانت نظر آنے لگے اور کہا: جاؤ اور اپنے اہل کو کھلاؤ۔

۲- بغیر کسی صحیح عذر کے کھا پی لینا۔ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے:

جاء رجل إلى النبي صلى الله عليه وسلم فقال: أفطرت يوماً في رمضان متعمداً. فقال صلى الله عليه وسلم: أعتق رقبة [illegible] أو صم شهرين متتابعين [illegible]

ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے رمضان میں ایک دن عمداً [illegible] آپ نے فرمایا: غلام آزاد [illegible]

[illegible]

روزے دار کے لیے سنتیں [illegible]

۱- مسواک کرنا [illegible]

۲- [illegible]

۳- [illegible]

۴- سفر اختیار کرنا (خواہ یہ اندیشہ ہی کیوں نہ ہو کر روزہ افطار کرنا پڑے گا)۔
۵- جسم پر کوئی دوا لگانا۔
۶- بچے کے لیے کھانا چبانا (بشرطیکہ پیٹ میں کچھ جانے نہ دیا جائے)۔
۷- خوشبو لگانا، دھونی (خوشبودار) لینا۔

جن چیزوں پر کوئی مواخذہ نہیں۔

۱- اپنا تھوک نگلنا خواہ کتنی ہی دفعہ نگلا جائے۔
۲- قے یا جی متلانا (بشرطیکہ کوئی شے واپس نہ نگل لی جائے)۔
۳- مکھی کا منہ میں گرنا اور نگل لینا۔
۴- غبار اور دھوئیں کا سانس کے ذریعے اندر داخل ہونا۔
۵- حالتِ جنابت میں صبح ہو جانا۔
۶- احتلام ہونا۔
۷- بھول چوک میں کھا پی لینا۔

حدیث میں ہے:

من نسی وھو صائم فأکل أو شرب فلیتم صومہ فانما أطعمہ اللہ وسقاہ۔ (متفق علیہ)	"جو بھول گیا، حالانکہ وہ روزے سے تھا اور اس نے کھا پی لیا، تو اسے چاہیے کہ روزہ پورا کرے۔ یہ تو اسے اللہ نے کھلایا پلایا ہے"۔

ایک دوسری حدیث ہے:

من افطر فی رمضان ناسیا فلا قضاء علیہ ولا کفارۃ۔ (دارقطنی)	"جس نے بھول کر رمضان میں روزہ کھول لیا، اس پر کوئی قضا نہیں اور نہ کوئی کفارہ ہے"۔

کفارہ

کفارہ وہ چیز ہے، جو گناہ کو مٹا دے۔ گناہ سے مراد وہ گناہ ہے جو شارع کے حکم سے انحراف کے نتیجے میں ہوتا ہے۔ چنانچہ جس نے شارع کے حکم کی مخالفت کرتے ہوئے بالارادہ رمضان میں کچھ کھایا، پیا یا بیوی کے پاس گیا، تو اس پر واجب ہو گیا کہ وہ تین میں سے ایک کام کرے: ایک غلام آزاد کرے، یا دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے، یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

کفارے کی حکمت

کفارے کی حکمت یہ ہے کہ شریعت کے ساتھ کھیل نہ کھیلا جا سکے اور اس کی حرمت کی پوری طرح حفاظت ہو۔ اس طرح انسان کا نفس ان برائیوں کے آثار سے بالکل محفوظ ہو جاتا ہے جو بغیر کسی عذر کے ہوئی ہوں۔ اس وجہ سے یہ ضروری ہے کہ کفارے کے ادا کرنے میں نہ مقدار میں کوئی کمی رہے نہ کیفیت ہی میں کچھ نقص ہو، تاکہ گناہ کے ازالے کا معاملہ کما حقہ پورا ہو جائے اور نفس آلایش سے پوری طرح دھل جائے۔ کفارے کے پیچھے کارفرما یہ اصول ایک دوسری جگہ قرآن مجید میں اس طرح بیان ہوا ہے:

إِنَّ الحَسَنَاتِ يُذهِبنَ السَّيِّئَاتِ۔ (ہود ۱۱: ۱۱۴)

"لاریب، نیکی کے کام برائیوں کا ازالہ کر دیتے ہیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

إتق الله حيثما كنت واتبع السيئة الحسنة تمحها وخالق الناس بخلق حسن۔ (ترمذی)

"تم جہاں اور جیسے کچھ بھی ہو، اللہ سے ڈرو، برائی ہو جائے تو ایسی نیکی کرو، جو اس کا ازالہ کر دے۔ لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے معاملہ کرو۔"

[ماخوذ]

اطلاع

ماہِ رمضان المبارک کے دوران میں

تمام دروس و اجتماعات منعقد نہیں ہوں گے

چند متفرق خطوط

محترمہ ام عبد الرب صاحبہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ عنایت نامہ ملا۔ میں اپنی تحریروں میں بارہا وضاحت کر چکا کہ دین کا تنہا ماخذ، میرے نزدیک، اب اس زمین پر صرف اللہ کے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذاتِ والا صفات ہے۔ یہ صرف انھی کی ہستی ہے کہ جس سے قیامت تک بنی آدم کو پروردگارِ عالم کی ہدایت میسر ہو سکتی اور یہ صرف انھی کا مقام ہے کہ اپنے قول و فعل اور تقریر و تصویب سے، وہ جس چیز کو دین قرار دیں، وہی اب رہتی دنیا تک دینِ حق قرار پائے۔

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوۡلُ فَخُذُوۡهُ	"اور جو کچھ رسول تمھیں دے، وہ لے
وَمَا نَهٰىكُمۡ عَنۡهُ فَانۡتَهُوۡا وَاتَّقُوا	لو اور جس چیز سے روکے، اس سے رک
اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ۔	جاؤ، اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک
(الحشر ۵۹: ۷)	اللہ کی سزا سخت ہے۔"

اس کی تفصیل میں اس طرح کرتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دین ہمیں تین ذرائع سے ملا ہے:

۱۔ قرآنِ مجید
۲۔ سنتِ ثابتہ
۳۔ حدیث

قرآنِ مجید کے متعلق میرا عقیدہ یہ ہے کہ دین میں وہ اس زمین پر اللہ کی اتاری ہوئی میزان اور حق و باطل کے لیے فرقان ہے۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ ہر چیز کے رد و قبول کا فیصلہ اس کی آیاتِ بینات ہی کی روشنی میں کیا جائے۔ ایمان و عقیدہ کی ہر بحث اس سے شروع ہو اور اسی پر ختم کر دی جائے، اور اس کے بارے میں یہ حیثیت تسلیم کی جائے کہ ابو حنیفہ و شافعی،

بخاری و مسلم، اشعری و ماتریدی اور جنید و شبلی، سب پر اسی کی حکومت قائم ہے اور اس کے خلاف ان میں سے کسی کی کوئی چیز بھی قبول نہیں کی جا سکتی۔

سنتِ ثابتہ سے میری مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ عمل متواتر ہے جو صحابہ کے اجماع یا ان کے تواترِ عملی کے ذریعے سے، بحیثیتِ دین، اس امت کو منتقل ہوا ہے۔ اس کے متعلق میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے، اس میں اور قرآنِ مجید میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ جس طرح قولی تواتر سے ثابت ہوا، یہ اسی طرح عملی تواتر سے ثابت ہے۔ چنانچہ اس کے بارے میں اب کسی بحث و نزاع کے لیے کوئی گنجایش نہیں ہے۔

حدیث، میرے نزدیک، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کی وہ روایت ہے جو زیادہ تر اخبارِ آحاد کے طریقے سے ہم کو ملی ہے۔ اس کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ یہ اگر قرآنِ مجید، سنتِ ثابتہ، یا عقل و فطرت کی اساس پر قائم اور کسی پہلو سے ان کے منافی نہ ہو اور قابلِ اعتماد ذرائع سے ہم تک پہنچے تو اس کی حجیت بھی ایک مسلّم حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ماخذِ دین کے بارے میں یہ میرا نقطۂ نظر ہے۔ اس کے بعد میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے متعلق کسی اضطراب کے لیے کوئی گنجایش باقی رہ جاتی ہے۔

والسلام

جاوید

شعبۂ تصنیف و تالیف

المورد لاہور

محترمی و مکرمی سلطان احمد صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے ہمارے مضمون[1] کا اتنی دقتِ نظر سے مطالعہ فرمایا ہے۔

آپ کے سوالوں کے جواب حسبِ ذیل ہیں:

[1] "کتاب الطلاق" - ۱ ستمبر ۱۹۹۳ء

۱۔ عدت کے احکام کے تحت، مرد کے رجوع کا حق بیان کرتے ہوئے، ہم نے لکھا ہے:

"اگر مرد، عدت کے دوران میں، رجوع کا حق استعمال نہیں کرتا، تو عدت کے ختم ہونے پر عورت آزاد ہو جائے گی۔ اس کے بعد اگر دونوں ساتھ رہنے کا ارادہ کریں، تو انھیں اب از سرِ نو نکاح کرنا پڑے گا۔ عدت کے ختم ہونے کے بعد، مرد کو اس بات کا کوئی حق نہیں ہے کہ وہ عورت کی رضا کے بغیر اسے لوٹائے، یا اس سے نکاح کرے۔"

- مزید برآں، طلاق دینے کا طریقہ بیان کرتے ہوئے، ہم نے لکھا ہے:

"جب مرد اپنی بیوی کو طلاق دینے کا فیصلہ کر لے، تو اسے چاہیے کہ ایک طلاق دے کر اپنی بیوی کو عدت گزارنے کے لیے چھوڑ دے، نہ اسے ایک ساتھ دو، تین یا ہزار، دو ہزار طلاقیں دے دینی چاہییں، اور نہ عدت کے اس عرصے میں، اسے کوئی اور طلاق دینی چاہیے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کی جو عدت بیان فرمائی ہے، مرد کو چاہیے کہ اس عرصے کے حساب سے انھیں طلاق دے۔"

ان دونوں اقتباسات سے یہ واضح ہے کہ طلاق دینے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی ایک طلاق دے کر اپنی بیوی کو عدت گزارنے کے لیے چھوڑ دے، عدت کے اختتام پر، میاں بیوی کا تعلق ختم ہو جائے گا۔ اب مرد کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی بیوی سے رجوع کرے۔ البتہ، مرد و عورت کی باہمی رضامندی کے ساتھ نکاح، اب بھی ہو سکتا ہے، اور یہ نکاح اسی طرح ہوگا، جس طرح کسی بھی عورت کے ساتھ ایک مرد کا نکاح ہوتا ہے۔ یہاں، یہ بات واضح رہے کہ اس بات پر فقہا کا اتفاق ہے کہ طلاق دینے کا صحیح طریقہ یہی ہے۔

۲۔ عدت، اسی وقت سے شروع ہو جاتی ہے جب شوہر اپنی بیوی کو طلاق دے گا۔ اس کے بعد تین حیض تک انتظار کرنا ہوگا۔ تیسرا حیض شروع ہوتے ہی، میاں بیوی کا تعلق ختم ہو جائے گا۔

۳۔ شریعت میں تین طلاقیں دینے کا کوئی طریقہ نہیں ہے اور نہ تین طلاقیں دینے کی کبھی ضرورت ہی پیش آتی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے جدا ہونا چاہتا ہے، تو اسے چاہیے کہ وہ اپنی بیوی کو ایک طلاق دے کر عدت گزرنے دے، عدت کے اختتام پر اس کی بیوی اس سے جدا ہو جائے گی۔ اس صورتِ حال میں آخر ایسی کیا ضرورت ہے کہ وہ اسے ضرور تین طلاقیں ہی دے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں تین طلاقوں کا ذکر، صرف اس وجہ سے کیا ہے کہ جس حد تک ممکن ہو، ایک گھر کو ٹوٹنے سے بچایا جائے۔ چنانچہ دیکھیے، قرآنِ مجید میں بیان کردہ قانون کے مطابق، جب کوئی شخص طلاق

دے، تو اسے ایک طلاق دے کر اپنی بیوی کے تین حیض تک انتظار کرنا چاہیے۔ اگر عدت کے آخر تک اس کا، طلاق دینے کا، یہ فیصلہ برقرار رہتا ہے، تو اس وقت اس کی بیوی آزاد ہو جائے گی۔ اب، اگر زندگی میں کسی موقع پر، یہ مرد و عورت، دوبارہ شوہر اور بیوی کی حیثیت سے رہنا چاہیں، تو شریعت نے اس کا دروازہ کھلا رکھا ہے، وہ دونوں باہمی رضامندی سے، جب چاہیں، نکاح کر سکتے ہیں۔

اس کے برعکس، اگر طلاق دینے کے بعد، عدت کے دوران میں، شوہر یہ محسوس کرے کہ اختلافات رفع کیے جا سکتے ہیں، تو شریعت میں اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی بیوی سے رجوع کر لے۔ اس صورت میں اسے دوبارہ نکاح کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس طرح رجوع کر لینے کے بعد، اب اگر زندگی میں کسی وقت، دوبارہ شوہر اور بیوی میں ناچاقی ہو جائے اور شوہر ایک مرتبہ پھر طلاق دینے کا فیصلہ کرے، تو اسے، پھر سے ایک طلاق دے کر اپنی بیوی کو عدت گزارنے کے لیے چھوڑ دینا چاہیے۔ اس عدت کے دوران میں، اگر شوہر چاہے، تو دوبارہ رجوع کر سکتا ہے، اور اگر وہ عدت کے دوران میں رجوع کرنے کا فیصلہ نہیں کرتا، تو عدت کے اختتام پر اس کی بیوی اس سے جدا ہو جائے گی۔ اگر کسی موقع پر، یہ مرد و عورت، دوبارہ شوہر اور بیوی کی حیثیت سے رہنا چاہیں، تو شریعت نے اس کا دروازہ اب بھی کھلا رکھا ہے، وہ دونوں باہمی رضامندی سے جب چاہیں نکاح کر سکتے ہیں۔

اگر دوسری مرتبہ طلاق دینے کے بعد بھی، مرد، عدت کے دوران میں، عورت سے رجوع کر لے، اور زندگی میں پھر کسی موقع پر، تیسری مرتبہ بھی طلاق دے دے، تو اب اسلام کے قانون کے مطابق، یہ دونوں مرد و عورت ایک دوسرے پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو جائیں گے۔ اب نہ تو مرد، عدت کے دوران میں، عورت سے رجوع کر سکتا ہے اور نہ عدت کے ختم ہونے کے بعد، اس سے دوبارہ نکاح ہی کر سکتا ہے۔

یہی وہ تین طلاقیں ہیں، جن کا قرآنِ مجید میں ذکر ہوا ہے۔ اور غور کیجیے، تو دو مرتبہ شوہر کو رجوع کا حق دینے کی وجہ، سراسر یہی ہے کہ اگر اصلاحِ احوال کی کوئی صورت ہو، تو شوہر رجوع کر لے، اور اس طرح، ایک گھر ٹوٹنے سے بچ جائے۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص اکٹھی تین طلاقیں دے دیتا ہے، تو وہ قرآنِ مجید میں بیان کردہ قانون کی حکمت اور فلسفے کو بالکل پامال کر دیتا ہے۔

۴۔ اگر کوئی شخص اسلامی شریعت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے، اپنی بیوی کو اکٹھی تین طلاقیں دے دیتا ہے، تو یہ، در اصل، اسلامی شریعت سے انحراف کی ایک صورت ہے۔ بالفاظِ دیگر، یہ شریعت کا مسئلہ نہیں، بلکہ قضا کا مسئلہ ہے۔ اس سلسلہ میں، آپ ہماری تحریر "کتاب الطلاق" اشراق نومبر ۹۳ء میں ملاحظہ فرمالیں۔ ان شاء اللہ آپ کے سوال کا جواب اس میں مل جائے گا۔

مذکورہ بالا توضیحات کے بعد بھی، اگر کوئی مسئلہ غیر واضح ہو، تو اس کو میرے ہی بیان کی کوتاہی پر محمول کیجیے اور مجھے ضرور لکھیے۔ بہت خوشی ہوگی۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ۔[۱]

مخلص

معز امجد

شعبۂ تصنیف و تالیف،

المورد لاہور

محترمی و مکرمی آصف مسعود صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

علمِ نفسیات اور قرآن کے بارے میں، آپ کے سوال کے جواب میں، عرض ہے کہ علمِ نفسیات، انسانی رویے، اس کے پیچھے موجود محرکات، انسانی ذہن، اس کی کارکردگی اور اس کی قوتوں کے مطالعے کا نام ہے، جبکہ قرآن کا موضوع یہ نہیں ہے۔ اس کا موضوع ہدایت ہے۔ وہ نفسِ انسانی کی کارکردگی پر بحث نہیں کرتا، وہ اس پر بحث کرتا ہے کہ اس نفس کو بگڑنے سے کیسے بچایا جا سکتا ہے۔ بگڑ جائے تو اس کی اصلاح کیسے کی جا سکتی ہے۔ وہ یہ بحث نہیں کرتا کہ انسانی ذہن کن اصولوں پر کام کرتا ہے۔ اس کی دل چسپی اس سے ہے کہ وہ ذہن کو وہ زاویۂ نگاہ بخش دے کہ اس کی سوچ فطری ہو جائے، وہ اوہام و وساوس کے زنداں سے نکل کر، حقیقت اور یقین کی آزاد فضاؤں میں پروان چڑھے، اس کی نگاہ بلند ہو، وہ راستی اور صلاح پر قائم رہے، وہ حدود آشنا ہو جائے، اس کو وہ مقصدِ حیات مل جائے، جو اس کے رویوں میں سلامتی، عدل، وقار، حلم، صبر، اور اعلیٰ ظرفی پیدا کر دے۔

---

[۱] اے اللہ، ہمیں توفیق دے کہ ہم صحیح بات ہی کو صحیح سمجھیں اور اسی کی پیروی کریں، اور غلط بات کی غلطی جان لیں اور اس سے بچ سکیں۔

یہ نفسیات نہیں، تزکیۂ نفس ہے۔ یہی قرآن کا موضوع ہے۔ ہمارے ہاں، البتہ آج کل، یہ نقطۂ نظر، بدقسمتی سے، عام ہو گیا ہے کہ قرآن تمام علوم SCIENCES پر بحث کرتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر غلط ہی نہیں، قرآن مجید کی توہین بھی ہے بلکہ یہ قرآن کے مقصدِ نزول کے خلاف ہے۔ قرآن مختلف علوم و فنون کی نہیں، سنن اور شرائعِ الٰہی کی کتاب ہے۔ اور یہی موضوع اس کو زیب دیتا ہے، کیونکہ یہ بادشاہِ عالم کے دربار سے آنے والا آئین و دستور ہے، کسی ریسرچ سیل سے نکلا ہوا مقالہ نہیں ہے۔

اتنی بات، البتہ، درست ہے کہ قرآنِ مجید اپنے مقدمات پر استدلال کے لیے بعض مظاہرِ فطرت کا ذکر کرتا ہے، جن میں چند وہ بھی ہیں، جو سائنس کا موضوع ہو سکتے ہیں، لیکن وہ سائنسی طریقے کے مطابق نہ بیان ہوتے ہیں، اور نہ اس حیثیت سے زیرِ بحث ہی آتے ہیں۔ ان کی حیثیت کلام میں وہی ہوتی ہے، جو ضرب الامثال، تماثیل یا تاریخی واقعات کی ہوتی ہے، اور یہ بیانات، بلاشبہ، ہمارے علم میں، سائنس سے کہیں بڑھ کر، سچی اور ناقابلِ تردید معلومات کا اضافہ کرتے ہیں۔

والسلام

ساجد حمید

اشراق دستیاب ہے

لاہور

- المورد ـــــ ۹۸ (۲)، ای ماڈل ٹاؤن
- آصف نیوز ایجنسی، اخبار مارکیٹ
- الائیڈ کارنر، ٹولنٹن مارکیٹ
- دار التذکیر، حمید سنٹر ۹۔رائل پارک
- کلاسیک، ریگل چوک
- کاشانۂ ادب، کچہری روڈ انارکلی
- جی ٹی ایس بک سٹال، ریلوے اسٹیشن
- بک سٹالز، پلیٹ فارمز ریلوے اسٹیشن
- ظہور بک سٹال (شبستان ہوٹل) ریلوے اسٹیشن
- بک ہاؤس، لبرٹی مارکیٹ
- بک وے، شادمان مارکیٹ
- بک سٹال، الحمرا ہال نمبر ۳، بعد ماہانہ لیکچر

کراچی

- المورد ـــــ سنو وائیٹ چیمبرز بہادر آباد، چورنگی
- بک سٹال، فنانس اینڈ ٹریڈ سنٹر ہال، بعد ماہانہ لیکچر

راولپنڈی

- ورائٹی بک سٹال، بنک روڈ، صدر
- سٹوڈنٹ بک سٹال، بنک روڈ، صدر
- بک سنٹر، حیدر روڈ، صدر
- سعید نیوز ایجنسی، نزد ناز سینما، مری روڈ
- بکس اینڈ بکس، کمرشل مارکیٹ، سیٹلائٹ ٹاؤن
- دار الکتب، کالج روڈ

۶۶ احمد بلاک، گارڈن ٹاؤن، لاہور ۵۴۶۰۰

فون : 5864431

OUR THANKS TO

SNOW WHITE DRY CLEANING INDUSTRIES
SH. WILAYAT AHMAD & SONS
CONTINENTAL ART
FEROZE TEXTILE INDUSTRIES
IMAGE COMMUNICATIONS
TIP TOP DRY CLEANERS
F.RABBI & CO. (PVT) LTD
K.B. SARKAR & CO.
PARAMOUNT DISTRIBUTORS (PVT) LTD



نرمی
کیجئے!
مدرکیئر اور آپ ۔ حسن کی بہترنگہداشت

ماہنامہ

اشراق

جلد ۶	شمارہ ۳
مارچ	۱۹۹۴ء
شوال	۱۴۱۴ھ

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

مدیر : منیر احمد

مدیر انتظامی : شکیل الرحمن

فی شمارہ : ۸ روپے

سالانہ : ۸۰ روپے

بیرون ملک :

ہوائی ڈاک : ۴۵۰ روپے

بحری ڈاک : ۲۵۰ روپے

المورد

۶۶ احمد بلاک، گارڈن ٹاؤن، لاہور ۵۴۶۰۰ فون : ۵۸۶۴۴۳۱

مدیر مسئول : جاوید احمد غامدی طابع : قومی پریس لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۂ نوح

[۷۱]

اللہ کے نام سے جو سراپا رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

ہم نے نوح کو، (تمھاری طرح، اے پیغمبر)، اُس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا، (اِس ہدایت کے ساتھ) کہ اپنی قوم کو خبردار کرو، اِس سے پہلے کہ ایک دردناک عذاب اِس (قوم) پر آجائے۔ اُس نے کہا: اے میری قوم کے لوگو، میں تمھارے لیے ایک صاف صاف خبردار کر دینے والا ہوں۔ (میں تم کو دعوت دیتا ہوں) کہ اللہ کی عبادت کرو اور اُس کی حدود کے پابند رہو اور میری بات مانو۔ (میں تم کو بتاتا ہوں کہ اس کے نتیجے میں) اللہ تمھارے وہ گناہ معاف فرمائے گا (جو اِس سے پہلے تم سے ہوئے)، اور تمھیں ایک مقرر وقت تک مہلت دے گا۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت جب آجاتا تو پھر ٹالا نہیں جاتا۔ اے کاش، تم اِس کو سمجھتے۔

(وہ یہی دعوت دیتا رہا، مگر وہ لوگ نہیں مانے، یہاں تک کہ) اُس نے کہا: اے میرے پروردگار، میں نے اپنی اِس قوم کو شب و روز پکارا، لیکن میری پکار سے یہ اور زیادہ بھاگتے ہی رہے۔ اور میں نے جب بھی اِنھیں بلایا (کہ یہ توبہ کریں)، اس لیے کہ تو اِن کو معاف فرمائے، تو اِنھوں نے اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں، اور اپنی چادریں لپیٹ لیں، اور اپنی ضد پر اَڑ گئے، اور بڑے غرور میں اکڑ بیٹھے۔ پھر میں

نے اِن کو کھلم کھلا پکارا۔ پھر ظاہر اور پوشیدہ، ہر طرح سمجھایا۔ میں نے کہا: اپنے رب سے معافی مانگ لو۔ بے شک، وہ بڑا معاف کر دینے والا ہے۔ (اِس کے نتیجے میں) وہ تم پر چھاجوں مینہ برسائے گا، اور مال و اولاد سے تم کو برکت دے گا، اور تمھارے لیے باغ اگائے گا اور نہریں بہا دے گا۔

تمھیں کیا ہو گیا ہے، تم اللہ کے لیے کسی شان کی توقع نہیں رکھتے، دراں حالیکہ اُس نے تم کو طرح طرح سے درجہ بہ درجہ بنایا۔ (ہم نے کہا): کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کس طرح تہ برتہ سات آسمان بنائے، اور اُن میں چاند کو روشنی اور سورج کو چراغ بنایا، اور اللہ ہی نے اِس اہتمام کے ساتھ تمھیں زمین سے اگایا۔ پھر وہ اِسی میں تم کو لوٹاتا، اور اِسی سے یکایک تم کو نکال کھڑا کرے گا۔ اور اللہ ہی نے زمین کو تمھارے لیے ایک بچھونے کی طرح بچھایا کہ تم (پہاڑوں کے درمیان) اِس کے کھلے دروں میں چلتے رہو۔

نوح نے کہا: اے مالک، اِنھوں نے میری بات نہیں مانی اور (اپنے) اُنھی (رہنماؤں) کے پیچھے چلے جن کے مال و اولاد نے اُن کی نامرادی میں اضافہ ہی کیا ہے، اور جنھوں نے بڑی بڑی چالیں چلیں اور کہا کہ اپنے اِن معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑو اور نہ (اِس) وَدّ اور سُواع کو چھوڑو، اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو چھوڑو۔ اور (اِس طرح) بہتوں کو گمراہ کر ڈالا۔ اور (اب) تو بھی، (اے مالک)، اِن ظالموں کی گمراہی میں اضافہ ہی کر۔ اپنے اِنھی گناہوں کی پاداش میں وہ پانی میں غرق کیے گئے، پھر آگ میں ڈال دیے گئے۔ پھر اللہ کے مقابل میں اُنھوں نے اپنے لیے کوئی مددگار نہیں پاتے۔

اور نوح نے کہا: اے مالک، اِن کافروں میں سے تو اب کسی کو اِس زمین پر نہ چھوڑ، اِس لیے کہ تو اگر اِن کو چھوڑے گا تو یہ، لاریب، تیرے بندوں کو بہکائیں گے اور (جب تک جییں گے، تیرے) نافرمان اور منکر ہی جنیں گے۔ میرے مالک، تو مجھے معاف فرما دے۔ میرے ماں باپ کو معاف فرما دے۔ اُن سب کو معاف فرما دے جو میرے گھر میں مومن ہو کر داخل ہو جائیں، اور سب اہلِ ایمان، مَردوں اور عورتوں کو معاف فرما دے، (اے مالک)، اور اِن ظالموں کے لیے بس (اِن کی) بربادی ہی میں اضافہ کر۔

شذرات

"اشراق" میں اب تک اس چیز کو غالب عنصر کی حیثیت حاصل رہی ہے کہ اس میں جناب جاوید احمد صاحب غامدی اور ان کے شاگردوں کے علمی مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ اب تک دوسرے اہلِ علم کی بھی زیادہ تر وہی تحریریں شاملِ اشاعت ہوئی ہیں، جن میں کوئی فنی یا تحقیقی موضوع اختیار کیا گیا ہو۔

گزشتہ کچھ عرصے سے یہ ضرورت بڑی شدت کے ساتھ سامنے آرہی تھی کہ یہ افکار سادہ اور عام فہم انداز میں بھی پیش کیے جائیں، تاکہ ایک عام پڑھا لکھا آدمی انھیں سمجھ سکے اور ان سے آگاہ ہو سکے لہٰذا یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ "اشراق" کو چند شعبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اور ایک شعبہ بطورِ خاص، اس دوسری نوع کے مضامین کے لیے مختص رہے۔

"اشراق" کا یہ شمارہ، اسی تجویز کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے۔ اس تجویز کے تحت پانچ چیزیں "اشراق" کا اہم ترین جزو ہوں گی، جنھیں انھی شعبوں سے متعلق المورد کے احباب مرتب کریں گے۔ 'قرآنیات' قرآنِ مجید سے متعلق مضامین پر مشتمل شعبہ ہو گا۔ اسے ہمارے رفیق جناب شہزاد سلیم مرتب کریں گے۔ شہزاد سلیم انگریزی میں قرآنِ مجید کی تفسیر لکھنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ 'حدیث و سنت' کا شعبہ احادیث کی شرح و وضاحت اور انھی سے متعلق مضامین پر مشتمل ہو گا۔ المورد کے شعبۂ تصنیف و تالیف میں احادیث پر تحقیقی کام کرنے والے ہمارے رفیق جناب ساجد حمید اس شعبے کے مرتب ہوں گے۔ 'فقہیات' کا شعبہ فقہی مضامین پر مبنی ہو گا۔ المورد کے تصنیفی شعبے میں جناب معز امجد فقہ پر کام کر رہے ہیں، وہی اس شعبے کے مرتب ہوں گے۔ 'اصلاح و دعوت' کے شعبے میں ایسے مضامین شائع کیے جائیں گے، جو آسان اور سادہ انداز میں لکھے گئے ہوں۔ اس شعبے کی ترتیب و ادارت کی ذمہ داری جناب منظور الحسن ادا کریں گے۔ منظور الحسن قبل ازیں ماہنامہ 'تذکیر' کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے تھے اور اس میں اسی نوع کے مضامین شائع ہوتے

تھے۔اس تبدیلی کے بعد اب اس پہلو سے "تذکیر" نکالنے کی ضرورت نہیں رہی۔ 'فکر و نظر' کے شعبے میں ایسی تحریریں شامل کی جائیں گی، جو کسی خاص علمی اور فکری نکتے کی توضیح پر مبنی ہوں گی۔اس شعبے کی ادارت جناب طالب محسن کے سپرد کی گئی ہے۔ 'میزان' کے زیرِ عنوان، البتہ، جناب جاوید احمد صاحب غامدی کے تحقیقی مضامین حسبِ سابق شائع ہوتے رہیں گے۔

'مکاتیب'، 'تبصرۂ کتب'، 'نقطۂ نظر'، 'یسئلون' اور 'آغاز من البیان' اور 'شذرات' کے عنوانات کے تحت چھپنے والی تحریریں، حسبِ معمول شائع ہوتی رہیں گی۔

امید ہے، قارئین، اس نئی تجویز کی روشنی میں مرتب کیے گئے پرچے کو زیادہ مفید اور ہمہ جہت پائیں گے۔

—— منیر احمد

ہماری تاریخ بڑی تابناک ہے۔ہمارا نقطۂ آغاز خلافتِ راشدہ جیسی سیاسی حکومت تھی۔اس حکومت نے عدل، مساوات، احترامِ حقوق، آزادیِ اظہار اور ضرورتوں کی فراہمی جیسے معاشرتی اور سیاسی آئیڈیل اس طرح واقعات میں متشکل کر دیے کہ انسانی تاریخ اس کی مثال لانے سے قاصر ہے۔

پھر ہم نے ایک ہزار سال تک دنیا کے ایک بڑے حصے پر حکومت کی ہے۔جو حیثیت آج امریکہ کو دنیا کے وسائل اور مسائل میں حاصل ہے، وہی ہمیں حاصل رہی۔اور اس میں ایک بہت غیر معمولی فرق یہ بھی تھا کہ مسلمان حکمران ہمیشہ اخلاقی طور پر برتر رہے اور انھوں نے کبھی مغربی استعمار کی طرح سازش اور دورخی پالیسی کا طریقہ اختیار نہیں کیا۔

اسلامی افواج نے غیر معمولی سپہ سالار پیدا کیے۔ان کے جنگی کارنامے، حکمتِ عملی اور پیشہ ورانہ مہارت میں علوِ شان کا مطالعہ آج بھی ہمارے دل کی دھڑکن کو تیز اور ہمیں فخر و انبساط کے جذبات سے سرشار کر دیتا ہے۔

آج زمانہ جن سائنسی ترقیوں پر فخر کر رہا ہے، ان کی نیو مسلمان علما نے اٹھائی اور نسلِ انسانی کو کائنات کی تسخیر کا حوصلہ دیا۔البیرونی، الہیان، ابنِ رشد اور ابنِ سینا جیسے دسیوں لوگ پیدا ہوئے اور انھوں نے معلوم تاریخ میں پہلی مرتبہ فطرت کی تسخیر کی راہ کھولی۔قانون، معیشت، معاشرت، منطق اور فلسفہ جیسے علوم میں مسلمانوں نے غیر معمولی دریافتیں کیں اور بعض چیزوں میں یورپ کی موجودہ علمی دریافتیں بھی کوئی اضافہ نہیں کر سکیں۔

یہ ہمارے ماضی کے علو و شان کی ایک جھلک ہے۔ آج ہم پس ماندہ ہیں۔ دنیا کے نقشے پر بڑے بڑے خطے اسلامی ممالک کہلاتے ہیں، لیکن ان کا زمانے کے الٹ پھیر میں کوئی قابلِ ذکر کردار نہیں۔ وہ ہر جگہ 'یدِ علیا' سے محروم ہیں اور کاسۂ گدائی سے مزین 'یدِ سفلیٰ' پھیلائے پھرتے ہیں۔

ہم جب اپنی تاریخ کے ان درخشاں ابواب کی جھلکیاں تاریخ کے اوراق میں دیکھتے ہیں، تو ہماری آنکھیں فخر سے چمک اٹھتی ہیں، چہرہ انبساط سے روشن ہو جاتا ہے، سینہ شان و شوکت کے احساس سے پھیل جاتا ہے اور ہمیں اپنا قد بہت بڑا محسوس ہونے لگتا ہے۔ پھر ہماری نظریں نیچے اپنے ننگے پاؤں پر پڑتی ہیں اور اپنی رسوائیوں کا احساس اپنی تمام شدتوں کے ساتھ ہم پر طاری ہو جاتا ہے۔

تجزیے کی نگاہ کم ہی کھلتی ہے، لیکن اگر کھلے بھی تو اس زوال کے اسباب ہمیں خارج ہی میں نظر آتے ہیں۔ صیہونی سازشیں، امریکہ کے مفادات، مغرب کا استیلا، غرض مختلف ناموں سے ہم اپنے دشمنوں کو موسوم کرتے ہیں اور جب ان سے مقابلے میں بے بسی محسوس کرتے ہیں تو کبھی اس خیال کو مسائل کا حل سمجھ لیتے ہیں کہ ہمیں ان کا آلۂ کار بن جانا چاہیے اور کبھی اس جذبے کا اظہار کرنے لگتے ہیں کہ ہمیں اپنے دشمنوں کو نیست و نابود کر دینا چاہیے۔

ہماری نگاہ صرف ظاہر میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ہم اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا ادراک کریں اور پھر انھیں دور کرنے کی سعی کر ڈالیں۔ ہم تاریخ کے اوراق میں قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں پڑھیں اور ان سے اپنے زوال سے نپٹنے کی راہ سمجھیں اور اسے اختیار کریں۔

پھر ہمارے پاس صحیفۂ خداوندی ہے۔ وہ صحیفہ جو خدا کے اپنے الفاظ میں خدا کی رہنمائی دیتا ہے۔ ہم اسے کھولیں اور جاننے کی کوشش کریں کہ ہم پچھڑے ہوئے کیوں ہیں؟ درماندگی نے ہمارا احاطہ کیوں کر لیا ہے؟ بے کسی صرف ہمارا مقدر ہی کیوں ٹھہری ہے اور آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم کاسہ اٹھانے پر مجبور کر دیے گئے ہیں؟

پھر ہمارا یہ روشن ماضی الفاق سے ہماری جھولی میں نہیں آ گیا تھا۔ کچھ اسباب تھے جن کے نتیجے میں قیصر و کسریٰ کی عظیم سلطنتیں خاک میں مل گئی تھیں اور اسلامی پرچم مشرق و مغرب میں سرحدیں عبور کرتا چلا گیا تھا۔ پھر ہمارے ہزار سال تک دنیا میں غلبے کے پیچھے بھی کچھ عوامل تھے کہ دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں ہمیشہ سرنگوں رہیں اور طویل عرصے تک اسلامی دنیا اپنے دشمنوں کو، جب بھی انھوں نے سر اٹھایا، ہزیمت دیتی رہی۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ تاریخ کا مطالعہ ہمارے لیے فخر کا سامان نہیں، منزل کا نشان بنے۔

اسلاف کی عظمت وشان ہماری انا کی تسکین نہ کرے، ان کی زندگیاں ہمارے لیے نمونہ اور مثال بنیں۔

قرآن مجید نے اس مسئلے کے حل کو حضرت نوح علیہ السلام کی زبان سے نہایت مختصر الفاظ میں واضح کیا ہے۔ سورۂ نوح میں ہے:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ إِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا۔ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا۔ وَّيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا۔ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا۔ (۷۱: ۱۰-۱۳)	"میں نے کہا: اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو۔ بے شک وہ بڑا ہی بخشنے والا ہے۔ وہ تم پر اپنے ابر رحمت کے دونگڑے برسائے گا۔ اور مال و اولاد سے تمھیں فروغ بخشے گا۔ اور تمھارے واسطے باغ پیدا کرے گا اور نہریں جاری کرے گا۔ تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی عظمت کے ظہور کی توقع نہیں رکھتے۔"

یہی بات تورات میں بڑی تصریح سے آئی ہے:

"—— خداوند تجھ کو اس ملک میں ضرور برکت بخشے گا، جسے خود خداوند تیرا خدا میراث کے طور پر تجھ کو قبضہ کرنے کو دیتا ہے۔ بشرطیکہ تو خداوند اپنے خدا کی بات مان کر ان سب احکام پر چلنے کی احتیاط رکھے، جو آج میں تم کو دیتا ہوں، کیونکہ خداوند تیرا خدا جیسا اس نے تجھ سے وعدہ کیا ہے، تجھ کو برکت بخشے گا اور تو بہت سی قوموں کو قرض دے گا، پر تجھ کو ان سے قرض لینا نہ پڑے گا اور تو بہت سی قوموں پر حکمرانی کرے گا، پر وہ تجھ پر حکمرانی کرنے نہ پائیں گی۔"

(کتاب استثنا، باب ۱۵، آیات ۴-۶)

ہماری اصل کوتاہی یہ ہے کہ ہم خدا کے احکام کی امت کی حیثیت میں تکمیل نہیں کر رہے ہیں۔ ہم دین سے، علی العموم، منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے ساری خدائی ہم پر غلبہ پائے ہوئے ہے۔ ہم قوم یونس کی طرح آگے بڑھیں اور خدا کے حضور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جھک جائیں۔ سابقہ گناہوں کی معافی مانگیں تو چشم زدن میں صورت حال بدل جائے گی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے جس کی دلیل آج قرآن ہے اور اس سے پہلے تورات رہی ہے۔

—— طالب محسن

OUR THANKS TO

SNOW WHITE DRY CLEANING INDUSTRIES
SH. WILAYAT AHMAD & SONS
CONTINENTAL ART
FEROZE TEXTILE INDUSTRIES
IMAGE COMMUNICATIONS
TIP TOP DRY CLEANERS
F. RABBI & CO. (PVT) LTD
K.B. SARKAR & CO.
PARAMOUNT DISTRIBUTORS (PVT) LTD

ترتیب شہزاد سلیم

"اس آیت میں ہمارے زمانے کے ان لوگوں کو بھی تنبیہ ہے جو اسلام کی خدمت کے دعوے کے ساتھ اس کے اقدار کو مسخ اور اس کے قوانین کی تحریف کر رہے ہیں۔ ان کا گمان یہ ہے کہ اللہ اور رسول نے جس شکل میں اسلام دیا ہے، اس شکل میں وہ اِس دور میں نہیں چل سکتا، ضروری ہے کہ زمانہ کے تقاضوں کے مطابق اس کی اصلاح کی جائے۔ چنانچہ وہ شریعت کے احکام میں اپنی رائے کے مطابق ترمیم کر رہے ہیں۔"

قرآنیات

امین احسن اصلاحی

سورۃ الحجرات

(۱)

سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ — الفتح — کا ضمیمہ و تتمہ ہے۔ سورۂ فتح کی آخری آیت میں، تورات کے حوالے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی یہ صفت جو وارد ہوئی ہے کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (محمد اللہ کے رسول اور جو ان کے ساتھ ہیں کفار کے لیے سخت اور باہم دگر نہایت مہربان ہوں گے) یہ پوری سورہ اسی ٹکڑے کی، گویا، تفسیر ہے۔ اس کی اہمیت مقتضی ہوئی کہ اس کے وہ مضمرات یہاں وضاحت سے بیان کر دیے جائیں جن کا بیان کیا جانا اس وقت مسلمانوں کے معاشرے کی اصلاح کے لیے نہایت ضروری تھا۔ قرآن مجید میں احکام و ہدایات کا نزول حالات کے تقاضوں کے تحت ہوا ہے تاکہ لوگوں پر ان کی صحیح قدر و قیمت واضح ہو سکے۔ چنانچہ یہ سورہ بھی ایسے حالات میں نازل ہوئی ہے جب نئے نئے اسلام میں داخل ہونے والوں کی طرف سے بعض باتیں ایسی سامنے آئیں جن سے ظاہر ہوا کہ یہ لوگ نہ تو رسول کے اصلی مرتبہ و مقام ہی سے اچھی طرح واقف ہیں اور نہ اسلامی معاشرہ کے اندر اپنی ذمہ داریوں ہی سے۔ چنانچہ اس ضمیمہ میں ضروری ہدایات دے دی گئیں جو اس وقت کے حالات کے اندر ضروری تھیں۔ ان احکامات و ہدایات کا تعلق تمام تر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے باہمی حقوق ہی سے ہے۔ کفار کا معاملہ اس میں زیر بحث نہیں آیا۔ ان کے ساتھ مسلمانوں کو جو رویہ اختیار کرنا چاہیے، اس کی وضاحت پچھلی سورتوں میں ہو چکی ہے۔

سورتوں کے تیسرے گروپ میں جس نوعیت کا تعلق سورۂ نور کا سورۂ مومنون کے ساتھ ہے، اسی نوعیت کا تعلق اس سورہ کا سورۂ فتح کے ساتھ ہے۔ دونوں کا مزاج باہم دگر بالکل ملتا جلتا ہے۔

سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(آیات: ۱ - ۵) مسلمانوں کو یہ تنبیہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی رائے کو رسول کی رائے یا آپ کے حکم پر مقدم کرنے کی کوشش کرے، یا گفتگو میں اپنی آواز کو آپ کی آواز پر بلند کرے، یا آپ کو اس طرح پکارے جس طرح اپنے کسی مساوی درجہ کے آدمی کو پکارتا ہے۔ تقویٰ کی افزایش اللہ تعالیٰ انھی لوگوں کے دلوں کے اندر کرتا ہے جو اس کے رسول کے ادب و احترام کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو اللہ کے رسول اور اسلام کا محسن سمجھتے ہیں اور رسول کے سامنے خطاب و کلام میں اپنے تفوق کا اظہار کرتے ہیں، انھیں ڈرنا چاہیے کہ اس طرح کی حرکت سے، غیر شعوری طور پر، وہ اپنے اعمال ہی نہ گنوا بیٹھیں۔

(آیات: ۶ - ۱۰) مسلمانوں کا معاملہ مسلمانوں کے ساتھ اخوت کی بنیاد پر ہونا چاہیے، نہ کہ پارٹی اور گروہی عصبیت کی بنیاد پر۔ یہ جائز نہیں ہے کہ کسی فاسق کی روایت پر اعتماد کر کے مسلمان، مسلمانوں کی کسی جماعت کے خلاف اقدام کر ڈالیں، جس پر، بالآخر، انھیں پچھتانا پڑے۔ تمام اہم معاملات میں رسول کی صوابدید اور اس کی ہدایت پر عمل کرنا چاہیے۔ کسی پارٹی کو، رسول کی حمایت اپنے حق میں حاصل کرنے کے لیے، اس پر غلط قسم کا دباؤ ڈالنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ یہ چیز اس فضل و انعام کی ناقدری ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے ایمان کی شکل میں اہل ایمان کو نوازا ہے۔ ایمان کا مزا چکھ لینے کے بعد کوئی ایسی بات کرنا جو اس کے منافی ہے، کفر و عصیان کی طرف رجعت ہے جس سے لوگوں کو بچانے ہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایمان کو دلوں میں رچانے اور کفر کو مبغوض بنانے کے لیے سارے اہتمام کیے ہیں۔ اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دوسرے مسلمانوں کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ، گروہی رجحانات کی بنا پر، ان میں سے کسی گروہ کے ساتھی بن جائیں، بلکہ انھیں معاملہ کو حق و انصاف کی نگاہ سے دیکھنا اور ان کے درمیان اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے۔ حق و عدل کا پہلو متعین ہو جانے کے بعد اگر ان میں سے کوئی گروہ اس حق کے آگے جھکنے پر تیار نہ ہو تو اس کو بزور اس کے آگے جھکنے پر مجبور کرنا چاہیے۔

(آیات: ۱۱ - ۱۳) ان باتوں سے بچنے کی ہدایت جو دلوں میں نفرت کی تخم ریزی اور معاشرے میں فساد کی آگ بھڑکانے والی ہیں۔ کسی کے لیے بھی جائز نہیں ہے کہ وہ دوسرے کی تحقیر کرے یا اس کا مذاق اڑائے یا اس کو عیب لگائے یا اس پر پھبتیاں چست کرے یا اس کے خلاف بدگمانیاں پیدا کرے یا

اس کی غیبت کرے یا اس کے عیوب کی ٹوہ میں لگے۔ حسب و نسب اور خاندان و قبیلہ کا غرور جاہلیت کی یادگار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب کو ایک ہی آدم و حوا سے پیدا کیا ہے۔ خاندانوں اور قبیلوں کی تقسیم محض تعارف کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں عزت کا معیار صرف تقویٰ ہے، نہ کہ نسب اور خاندان۔

آیات: ۱۴-۱۸ (خاتمۂ سورہ) جس میں اس بات کی مزید وضاحت کر دی گئی ہے جو سورہ کی تمہید میں اشارات کی شکل میں فرمائی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ابتدائی آیات میں جن لوگوں کا رویہ زیر بحث آیا ہے، یہ اطراف مدینہ کے وہ اہل بدو تھے جو اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت سے مرعوب ہو کر اسلام میں داخل تو ہو گئے تھے لیکن ایمان ان کے دلوں میں اچھی طرح اترا نہیں تھا۔ اس وجہ سے وہ اس پندار میں مبتلا تھے کہ اسلام لا کر انھوں نے اسلام اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک احسان کیا ہے۔ ان کے اس پندار کا اظہار بعض اوقات، اس طرح کی حرکتوں سے ہو جاتا تھا جن سے ابتدائی آیات میں، مسلمانوں کو روکا گیا ہے۔ اب یہ آخر میں ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلوایا گیا ہے کہ ان کو بتا دو کہ وہ اپنے ایمان و اسلام کا احسان نہ جتائیں۔ اللہ ان کے ظاہر و باطن سے اچھی طرح واقف ہے۔ انھوں نے اطاعت تو ضرور کر لی ہے، لیکن ابھی ایمان نے ان کے اندر جڑ نہیں پکڑی ہے۔ یہ ان کا احسان نہیں ہے کہ وہ پیغمبر پر ایمان لائے، بلکہ یہ اللہ کا فضل و احسان ہے کہ اس نے ان کو ایمان کی توفیق بخشی۔ اگر وہ اس کا حق ادا کریں گے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا بھرپور صلہ پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کے سارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیت کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۱)

"اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، اللہ اور رسول کے سامنے اپنی رائے مقدم نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔"

خطاب، اگرچہ، عام مسلمانوں سے ہے، لیکن جن لوگوں کا رویہ اس سورہ میں زیر بحث آیا ہے وہ، جیسا کہ آگے کی آیات سے بالتدریج واضح ہوتا جائے گا، اطراف مدینہ کے بدوی قبائل کے وہ لوگ ہیں جو اسلام کی ابھرتی ہوئی طاقت سے متاثر ہو کر مسلمانوں میں شامل تو ہو گئے تھے لیکن ابھی ایمان ان کے دلوں میں اچھی طرح رچا بسا نہیں تھا۔ اس کی وجہ اول تو یہ تھی کہ یہ لوگ اسلام کو سمجھ کر نہیں، بلکہ اس سے

مرعوب ہو کر اس میں داخل ہوئے۔ ثانیاً، مرکز سے بے تعلق رہنے کے سبب سے ان کی تربیت بھی اچھی طرح نہیں ہوئی تھی۔ ان کے اندر ایک غلط قسم کا پندار بھی تھا کہ انھوں نے کسی جنگ کے بغیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کر لی، جو آپ پر ان کا ایک احسان ہے۔ اس پندار کا اثر یہ تھا کہ ان کے سردار جب مدینہ آتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس انداز سے بات کرتے، گویا وہ اسلام کے بڑے مربی و محسن ہیں۔ بغیر اس کے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی معاملے میں ان کی رائے دریافت کریں، آگے بڑھ بڑھ کر اپنی رائیں پیش کرتے اور مشورے دینے کی کوشش کرتے۔ بات کرتے ہوئے حضور کی آواز پر اپنی آواز، تفوق کے اظہار کے لیے بلند رکھتے۔ جب کبھی آتے تو ان کی خواہش یہ ہوتی کہ حضور، بلا تاخیر، سارے کام چھوڑ کر، ان سے ملاقات کریں اور اگر ذرا تاخیر ہو جاتی تو بے ڈھنگ آپ کو حجروں کے باہر سے اس طرح آواز دینا شروع کر دیتے جس طرح ایک عام آدمی کو آواز دی جاتی ہے۔ آپس میں ان کے درمیان جو جاہلی رقابتیں زمانۂ جاہلیت سے چلی آ رہی تھیں، ان میں ہر ایک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کرتا اور اس غرض کے لیے وہ اپنے حریفوں سے متعلق، بعض اوقات، ایسی خبریں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچاتے جو غلط فہمی پیدا کرنے والی ہوتیں۔ ان کی بنا پر مدینہ کے مسلمان اگر کوئی اقدام کر گزرتے تو یہ چیز مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے لیے نہایت مضر ہوتی۔

یہ حالات تھے جن میں یہ سورہ نازل ہوئی۔ اس میں رویہ تو زیر بحث، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ایک مخصوص گروہ ہی کا ہے، لیکن قرآن نے خطاب عام ہی رکھا ہے، تاکہ اس کا زیادہ فضیحتا بھی نہ ہو اور وہ رخنے بند بھی ہو جائیں جن سے شیطان کو معاشرہ کے اندر فتنہ انگیزی کی راہ مل سکتی ہے۔

یہ امر واضح رہے کہ یہاں ممانعت اللہ کے رسول کے سامنے اپنی رائے پیش کرنے میں پہل کرنے یا اپنی رائے کو اللہ اور رسول کے حکم پر مقدم کرنے کی ہے، نہ کہ رسول کے سامنے مجرد اپنی کوئی رائے پیش کرنے کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم امور مصلحت میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے ان کی رائیں معلوم بھی فرماتے اور صحابۂ کرام اپنی رائے پیش بھی کرتے۔ اسی طرح صحابہ بعض اوقات، عام امور مصلحت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ بھی عرض کرتے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فلاں اقدام وحی الٰہی پر مبنی نہ ہو تو اس کی جگہ فلاں تدبیر زیادہ قرین مصلحت رہے گی، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات، ان کی رائیں قبول بھی فرما لیتے۔ اس آیت میں اس طرح کی باتوں کی نہی نہیں ہے۔ حضور نے خود اپنے طرز عمل سے اس کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضور سب سے زیادہ لوگوں سے مشورہ لینے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی، جیسا کہ آیت 'وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ' (آل عمران ۳: ۱۵۹) سے واضح ہے، آپ کو

لوگوں سے مشورہ کرتے رہنے کی ہدایت فرمائی گئی تھی۔

یہاں ممانعت اسی بات کی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ کوئی شخص اللہ کے رسول کو ایک عام آدمی یا مجرد ایک لیڈر سمجھ کر اور اپنے آپ کو ان سے زیادہ مدبر خیال کر کے، بغیر اس کے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے کسی معاملہ میں اس کی رائے دریافت کریں، حضور کو اپنی رائے سے متاثر کرنے اور اپنی رائے کو حضور کی بات پر مقدم کرنے کی کوشش کرے۔ اگر کوئی شخص ایسا کرے تو اس کا رویہ دلیل ہے کہ وہ رسول کے اصلی مرتبہ ومقام سے بالکل بے خبر ہے۔ اللہ کا رسول اللہ تعالیٰ کا نمائندہ ہوتا ہے اور وہ جو کچھ کہتا یا کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت کرتا، یا کہتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کی بات پر اپنی بات کو مقدم کرنے کی جسارت کرتا ہے تو دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ اپنی رائے کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر مقدم کرنا چاہتا ہے، درآنحالیکہ یہ چیز اس کے تمام ایمان وعمل کو ڈھا دینے والی ہے، اگرچہ اس کو اس کا شعور نہ ہو۔

بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ (اللہ اور اس کے رسول کے سامنے) کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ و رسول کا معاملہ الگ الگ نہیں ہے۔ اللہ کا رسول، اللہ کا سفیر و نمائندہ ہوتا ہے۔ اس کو بن پوچھے مشورہ دینا خود اللہ تعالیٰ کو مشورہ دینا ہے، اس کی بات پر اپنی بات کو مقدم کرنا، اللہ کی بات پر اپنی بات کو مقدم کرنا ہے اور اس سے بڑھ کر اپنے کو مدبر سمجھنا، خود خدائے علیم وحکیم سے بڑھ کر اپنے کو مدبر وحکیم سمجھنا ہے۔ یہ آدمی کے اس رویہ کے لازمی نتائج ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کسی شخص کو اس کی بلادت کے سبب سے ان نتائج کا احساس نہ ہو، لیکن ان کے لازمی نتائج سے انکار ناممکن ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰہَ، اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے) یہ ان لوگوں کو تنبیہ ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ اور رسول سے زیادہ دانش مند اور مدبر ہونے کے خبط میں مبتلا نہ ہو۔ اللہ سمیع وعلیم ہے۔ وہ تمھاری ساری باتوں کو سن بھی رہا ہے اور ان کے پیچھے جو محرکات کام کر رہے ہیں، ان سے بھی اچھی طرح واقف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے تو اس کا مکافاتِ عمل کا قانون، لازماً، ظہور میں آئے گا۔ اس قانون کا ذکر آگے والی آیت میں آرہا ہے۔

اس آیت میں ہمارے زمانے کے ان لوگوں کو بھی تنبیہ ہے جو اسلام کی خدمت کے دعوے کے ساتھ اس کے اقدار کو مسخ اور اس کے قوانین کی تحریف کر رہے ہیں۔ ان کا گمان یہ ہے کہ اللہ اور

رسول نے جس شکل میں اسلام دیا ہے، اس شکل میں وہ اس دور میں نہیں چل سکتا۔ ضروری ہے کہ زمانہ کے تقاضوں کے مطابق اس کی اصلاح کی جائے۔ چنانچہ وہ شریعت کے احکام میں اپنی رائے کے مطابق ترمیم کر رہے ہیں۔ بس یہ فرق ہے کہ آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو پہلے ہی سے سبقت کر کے چاہتے تھے کہ اللہ و رسول کے آگے اپنے مشورے پیش کر دیں، اس زمانے کے مدعیانِ اسلام کو یہ موقع نہ مل سکا۔ اس وجہ سے وہ اب ان غلطیوں کی اصلاح کر رہے ہیں جو، ان کے نزدیک، اللہ و رسول سے العیاذ باللہ دین کے معاملے میں ہوگئی ہیں۔

"محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بائیبل کی نظر میں"

عالمِ اسلام کے عظیم مفکر پروفیسر ڈاکٹر احمد دیدات کی انگریزی کتاب "محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بائیبل کی نظر میں" عیسائی اور یہودی لٹریچر کی تنقید کا مدلّل جواب ہے۔

انگریزی زبان میں ہونے کی وجہ سے بہت تھوڑے لوگ اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اس بات کے پیشِ نظر اس کا اردو ترجمہ شائع کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ کتاب کا اُردو ترجمہ ہو رہا ہے۔ ان شاء اللہ، پہلا ایڈیشن رمضان اور دوسرا اپریل کے آخر میں آجائے گا۔

کتاب بلامعاوضہ فی سبیل اللہ، تقسیم کی جائے گی، جب کہ ایک ہزار کتاب کی اشاعت پر کل خرچ تقریباً پندرہ ہزار روپے ہوگا۔

مسلمانانِ عالم سے درخواست ہے کہ مالی تعاون کے ذریعے سے ہمارے ساتھ اس قلمی جہاد میں شامل ہوں، تاکہ اس کی اشاعت زیادہ سے زیادہ ہو سکے اور لادینی قوتوں کا منہ توڑ جواب دینے کے لیے اسے دنیا کے کونے کونے تک مفت پہنچایا جا سکے۔

زرِ تعاون کے لیے پتا:
طارق محمود چغتائی، مینیجر چغتائی یونانی فارمیسی (رجسٹرڈ)
چونیاں ضلع قصور
بنک اکاؤنٹ نمبر ۲۳۵۰، مسلم کمرشل بنک، چونیاں

نیکی اور بدی کی راہیں

اس دنیا کی زندگی میں نیکی اور بدی، دونوں کا امتیاز تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیا ہے، لیکن، ساتھ ہی اس امتحان میں یہ بھی ڈال دیا ہے کہ بدی کی لذتیں تو عاجل رکھی ہیں اور تلخیاں اس کی، آخرت میں سامنے آئیں گی۔ برعکس اس کے، نیکی کی شکلیں نقد ہیں، اور نفع اس کا نسیہ (یعنی ادھار) ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان نیکی کی راہ اختیار کرتا ہے، تو اس میں قدم قدم پر اس کو نفس کی مزاحمت کے سبب سے چڑھائیاں چڑھنی اور گھاٹیاں پار کرنی پڑتی ہیں۔ اور بدی کی راہ اختیار کرے، تو اس کی لذت تو اس کو نقد نقد ملتی ہے، اور اس کے انجام بد کا معاملہ، اس کے نزدیک، موہوم ہوتا ہے۔ اس کشش کے سبب سے اکثریت اسی راہ کو اختیار کر لیتی ہے۔ نیکی کی راہ اختیار کرنے کا حوصلہ صرف وہی کرتے ہیں، جن کے اندر صبر اور عزیمت ہو، اور اس وصف کو پیدا کرنے کے لیے آدمی کو ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف حضرت مسیح علیہ السلام نے یوں اشارہ فرمایا ہے کہ: بدی کی راہ فراخ، اور اس پر چلنے والے بہت ہیں، اور نیکی کی راہ تنگ، اور اس پر چلنے والے تھوڑے ہیں۔ سورۂ بلد میں اس کا ذکر، اس طرح ہوا ہے:

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۝ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝

(البلد ۹۰: ۱۰-۱۷)

"اور ہم نے انسان کو نیکی اور بدی دونوں کی راہیں سجھا دیں۔ پس اس نے گھاٹی پار کرنے کا حوصلہ نہ کیا، اور تم کیا سمجھے کہ گھاٹی کیا ہے! غلام کی گردن چھڑانا، یا بھوک کے زمانے میں، کسی قرابت مند یتیم، یا کسی خاک نشین مسکین کو کھلانا۔ مزید براں، یہ کہ وہ بنے ان لوگوں میں سے جو ایمان لائے اور جنھوں نے ایک دوسرے کو صبر اور مرحمت کی تلقین کی!"

قرآن نے آخرت کی فوز و فلاح کا حق دار صرف انھی کو ٹھہرایا ہے، جو دنیا میں نیکی کی راہ کے عقبات کو پار کرنے کا حوصلہ کریں گے۔ جو یہاں، ان کو پار کرنے کی ہمت نہیں کریں گے، ان کو دوزخ کے عقبات سے سابقہ پیش آئے گا، جن کو پار کرنے پر وہ مجبور کیے جائیں گے، لیکن وہ ان کو پار نہ کر سکیں گے۔

[تدبرِ قرآن از امین احسن اصلاحی]

ترتیب ساجد حمید

"اسلام کا حکم یہ ہے کہ شریعتِ اسلامیہ کی طرح ریاست کے قانون کی پیروی بھی کی جائے، خواہ وہ قانون کیسا ہی ہو۔ ملک کے ساتھ وفاداری سے لے کر گلی اور سڑک پر چلنے کے لیے بنے ہوئے ضابطے تک کی پیروی اس حکم میں شامل ہے۔"

حدیث وسنت

ساجد حمید

حکمران کی اطاعت اور کفرِ صریح

عن عبادة بن الصامت، فقال، دعانا رسول الله صلى الله عليه وسلم، فكان فيما اخذ علينا ان بايعنا على السمع والطاعة فى منشطنا ومكرهنا وعسرنا ويسرنا واثرة علينا. ان لا ننازع الامر اهله، قال: إلا ان تروا كفرا بواحا، عندكم من الله فيه برهان. (بخاری، کتاب الفتن، مسلم، کتاب الامارہ)

عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بلایا، تاکہ ہم ہر حالت کے لیے سمع وطاعت کی بیعت کریں[1] کہ نرمی وجبر، تنگی وفراخی اور اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیے جانے (کے باوجود بھی حکمران کی اطاعت سے نہیں نکلیں گے)، اور نہ ان سے جھگڑا کریں گے فرمایا کہ صرف (اس صورت میں تم حکمران کی اطاعت سے نکل سکتے ہو) کہ تم کوئی صریح کفر[2] اس کی طرف سے دیکھو، جس کے بارے میں تمھارے پاس اللہ کی واضح حجت ہو[3]۔

[1] یہ روایت قرآنِ مجید کے حکم 'اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ' (النساء ۴: ۵۹) "اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور امیر کی جب تک وہ تم میں سے ہو" کی شرح میں بیان کی گئی ہے۔ اس حکم کے مطابق حکمران کی اطاعت ہم پر واجب ہے۔

یہاں رسول اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کے مقتضیات بیان کرتے ہوتے' یہ فرمایا ہے کہ حکمران کی اطاعت ہم پر واجب ہے' خواہ وہ ہمیں تنگی میں ڈالے، ہم پر جبر کرے اور دوسروں کو ہمارے اوپر ترجیح دے۔ دوسرے مواقع پر آپ نے دینی امور میں بے پروائی کرنے والے اور کسی ناپسندیدہ حکمران کی اطاعت کا حکم دیا ہے:

انها ستكون من بعدی امراء يصلون الصلاة لوقتها و يوخرونها عن وقتها فصلوها معهم فان صلوها لوقتها و صليتموها معهم لكم ولهم، وان اخروها عن وقتها فصليتموها معهم فلكم و عليهم، من فارق الجماعة مات ميتة جاهلية ومن نكث العهد ومات ناكثا للعهد' جاء يوم القيامة لا حجة له۔ (احمد بن حنبل)	"میرے بعد ایسے امرا ہوں گے، جو وقت بے وقت نماز پڑھیں گے۔ تم ان کے ساتھ نماز پڑھتے رہو۔ اگر وہ وقت پر نماز پڑھیں گے تو انھیں اور تمھیں اس کا ثواب مل جائے گا۔ اور اگر وہ تاخیر کریں گے تو تمھیں ثواب مل جائے گا، اور ان کے لیے اس کا وبال ہوگا۔ یہ اس لیے کہ جو نظم ریاست سے الگ ہوا، اور اسی حالت میں مرگیا، وہ جاہلیت کی موت مرا۔ اور جس نے عہد توڑا، اور عہد توڑ کر مرا، وہ قیامت کے دن اس طرح آئے گا کہ اس بات کے جواز میں پیش کرنے کے لیے' اس کے پاس کوئی حجت نہ ہوگی۔"

ناپسندیدہ حکمران کی اطاعت کے بارے میں بھی آپ نے یہی فرمایا:

عن انس بن مالك رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله عليه وسلم اسمعوا واطيعوا ان استعمل عليكم عبد حبشی كان راسه زبيبة۔ (بخاری، کتاب الاحکام)	"انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سمع وطاعت پر قائم رہو، خواہ تم پر ایک حبشی غلام، جس کا سر منقے کی طرح چھوٹا سا ہو، حکمران بنا دیا جائے۔"

ان تمام حالتوں' میں حکمران کی اطاعت سے نکلا نہیں جاسکتا، یعنی نہ اس کی اطاعت ترک کی جاسکتی ہے' اور نہ اس کی حکومت الٹنے کے لیے اقدام کیا جاسکتا ہے۔ ایسی صورت میں کیا گیا اقدام گویا اسلام کا قلادہ گردن سے اتارنے کے مترادف ہے۔ آپ کا فرمان ہے:

من خرج من الجماعة قيد شبرة، فقد خلع ربقة الاسلام من عنقه۔ (احمد بن حنبل)	"جو الجماعۃ سے نکلا، خواہ اس کا نکلنا بالشت برابر ہو، تو یہ ایسا ہے کہ اس نے اسلام کا قلادہ اپنی گردن سے اتار دیا۔"

حکمران کی اطاعت، اصل میں، قانونِ ریاست کی اطاعت سے کنایہ ہے۔ اسلام کا حکم یہ ہے کہ شریعتِ اسلامیہ کی طرح ریاست کے قانون کی پیروی بھی کی جائے گی، خواہ وہ قانون کیسا ہی ہو۔ ملک کے ساتھ وفاداری سے لے کر گلی اور سڑک پر چلنے کے لیے بنے ہوئے ضابطے تک کی پیروی اس حکم میں شامل ہے۔

۲؎ مطلب یہ ہے کہ اولی الامر کی اطاعت ان کی طرف سے کفرِ بواح کے ارتکاب تک واجب ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی ان کی اطاعت سے نکل جائے، تو 'میتۃ جاھلیۃ'، کے حکم کی زد میں نہیں آتا، کیوں کہ 'اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُوْلِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ'، کے مطابق مسلمانوں پر صرف انھی اولی الامر کی اطاعت واجب ہے، جو اصل مرجع اطاعت کی حیثیت اللہ اور اس کے رسول ہی کو دیتے ہوں۔ اور ہر وہ معاملہ جس کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسول نے کتاب و سنت میں کر دیا ہو، اس کے بارے میں، اپنے لیے فیصلے کا کوئی حق نہ سمجھتے ہوں۔ یہ مفہوم اس آیت میں 'منکم'، کے اضافے سے پیدا ہوا ہے۔ یعنی حکمران اس وقت تک واجب الاطاعت ہے، جب تک وہ 'منکم'، کی ضمیرِ مجرور کا حصہ، یعنی مسلمان ہے۔ جب وہ مسلمانوں سے نکل جائے گا، اس کی اطاعت مسلمانوں پر واجب نہیں رہے گی۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکمران کھلے کفر کے ارتکاب کے بعد مسلمانوں کے اندر سے نکل جائے گا۔ اور کفر صرف یہی نہیں ہے کہ حکمران عقائدِ اسلامیہ کا انکار کر دے، بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ امورِ ریاست، فصلِ نزاعات اور قانون سازی میں قرآن و سنت کے خلاف فیصلہ پر اصرار کرے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: 'وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ'، (المائدہ ۵: ۴۴) چنانچہ اس طرح کی صورت میں شذوذ اختیار کیا جا سکتا ہے، اور اگر ممکن ہو تو انھیں اس منصب سے معزول کرنے کی جد و جہد بھی کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ خروج یا بغاوت کی اجازت ضرور دی گئی ہے، لیکن یہ نہ دین کے واجبات میں سے ہے، اور نہ دین نے کسی بھی حیثیت سے، اس کا حکم دیا ہے۔

۳؎ مطلب یہ ہے کہ ایسا کفر اولی الامر کی طرف سے سامنے آ جائے کہ جس کو کفر قرار دینے

کی بنیاد وہم وگمان یا منطقی موشگافیوں پر نہ ہو، بلکہ قرآن وسنت میں اس کے ثبوت کے لیے برہانِ قاطع موجود ہو۔ اسی شرط کے بیان کے لیے آپ نے 'وعندکم من اللہ فیہ برھان' کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں یعنی ایسا نہ ہو کہ محض اپنے گمان پر اس کے کفر کا فتویٰ جاری کر کے 'اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا جائے۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ حکمران کی تکفیر کرنے کے لیے رائے کی بنیاد، قرآنِ مجید کی صریح نصوص اور برہانِ قاطع پر رکھی جائے جس میں کسی قسم کی تاویل کی گنجایش نہ ہو۔

اعتذار

'اشراق'، فروری ۱۹۹۴ء، ص ۱۵ پر، حوالہ 'تاریخ الامم والملوک طبری'، ج ۶، ص ۱۹۱ لکھا گیا ہے، جبکہ درست حوالہ 'تاریخ الاسلام للذہبی'، ج ۳، ص ۱۴۴ ہے۔

اطّلاع

ماہِ رمضان المبارک کے دوران میں
تمام دروس واجتماعات منعقد نہیں ہوں گے

محمد رفیع مفتی

قرآن اور انفاق

عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال : قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : لا حسد الا اثنین رجل آتاہ اللہ القرآن ، وھو یقوم بہ اناء اللیل و اناء النھار ، و رجل آتاہ اللہ المال ، وھو ینفق منہ اناء اللیل و اناء النھار ۔

"ابن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، حسد صرف دو ہی آدمیوں سے رواہے : ایک وہ جسے قرآن ملا ہو اور وہ صبح و شام اس (کی تلاوت و تدبر) کا التزام رکھتا ہو، دوسرا وہ جسے اللہ نے صاحب ثروت کیا ہو اور وہ اپنے مال کو صبح و شام راہِ خدا میں لٹاتا رہتا ہو۔"

(مشکوٰۃ، کتاب فضائل القرآن)

یہ سیدنا عبداللہ بن عمر کی روایت ہے، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حسد صرف دو ہی آدمیوں سے اگر کیا جائے تو روا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ حسد بڑی ہی قبیح چیز ہے۔ اس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ آدمی دوسروں کے لیے مشکل کا باعث بنتا، بلکہ خود اپنی صلاحیتوں اور خوشیوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور اس کے اخلاق بالکل برباد ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اگر آدمی اس سے بلند ہو جائے تو اس میں شبہ نہیں کہ اس کے اخلاق بھی بلند ہوتے اور اس کے مراتب بھی اعلیٰ ہو جاتے ہیں۔ گناہوں میں اللہ تعالیٰ مہلت تو دیتے ہیں، مگر کچھ آزمانے اور کچھ جھنجھوڑنے کے بعد اس کی مہلتِ ہدایت چھین لیتے ہیں۔

بنی اسرائیل کے ساتھ بحیثیتِ قوم یہی معاملہ کیا گیا۔ انھوں نے امیوں میں اٹھنے والے نئے نبی کی نبوت کا صرف اسی حسد کی وجہ سے انکار کر دیا کہ یہ نبی ان کے خاندان سے کیوں نہیں آیا۔ یہی وہ بیماری ہے جس کو قرآن 'فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا' (البقرہ ۲: ۱۰) کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے، چنانچہ اس حسد کی

وجہ سے یہود نے اپنے کان اور آنکھیں اس ہدایت سے بند کرلیں، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے — اور، بالآخر توفیقِ ہدایت سے محروم کردیے گئے۔ شیطان بھی اسی حسد کا شکار ہوا، جس کی بنا پر راندۂ درگاہِ خداوندی ٹھہرا۔

غرض، حسد انسانی شخصیت کے لیے نہایت تباہ کن اثرات رکھتا ہے، اس سے اپنے آپ کو، لازماً، بلند رکھنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ تصوّف، ان کے نظریات سے ہزار اختلاف، مگر اس معاملے میں وہ ہمیشہ بہت محتاط رہے ہیں۔ مثلاً، امام غزالی کا قول ہے کہ اگر علما میں سے حسد اور ریا کو نکال دیا جائے تو ان کی ولایت میں کوئی شبہ نہیں ہے، کیونکہ وہ نماز روزے کے پابند تو ہوتے ہی ہیں، اگر ان چیزوں سے بھی اپنے آپ کو مبرا کرلیں تو بلاشبہ یہ درجۂ ولایت ہی ہے۔

علما کے اندر ان امراض کے پیدا ہونے کے مواقع بہت ہوتے ہیں، چنانچہ ہم عصر علما ایک دوسرے کی برتری کے اعتراف کے بجائے، اسی مرض کی وجہ سے باہم چشمک زنی کا رویہ اختیار کرلیتے ہیں، یا دوسروں پر اپنی مشیخت ثابت کرنے کے لیے ریاکاری کا شکار ہوجاتے ہیں۔ یہ امراض عامۃ الناس میں بھی ہوتے ہیں اور خواص میں بھی، اس لیے ان سے ہر حالت میں بچنا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ حسد نیکیوں کو اسی طرح کھا جاتا ہے، جیسے آگ لکڑیوں کو۔

ان نقائص سے اپنے آپ کو بلند کرنے سے سیرت و کردار کی تعمیر بھی ہوتی ہے، کیونکہ جب ایک برائی رخصت ہوتی ہے تو اس سے خالی نہیں ہوتی کہ ایک بھلائی اس کی جگہ لے لیتی ہے، قرآن کا فرمان ہے: 'اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ' (ہود ١١: ١١٤) کہ جب بھلائی آتی ہے تو وہ نہ صرف بندۂ مومن کے اعمال نامہ میں کسی ایک برائی کو دھو دیتی ہے، بلکہ اس کے نفس سے کسی نہ کسی برائی کا خاتمہ کرنے کا باعث بھی بنتی ہے۔ چنانچہ باقی برائیوں کی طرح حسد سے اجتناب اور اس سے مبرا ہونے کی سعی بھی نیک خصائص کے پیدا ہونے کا ذریعہ بنتی ہے۔

بہرحال، یہ حسد، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو آدمیوں سے ہوسکتا ہے۔ ایک وہ شخص جسے اللہ نے قرآن سے شغف بخشا ہو، وہ صبح شام اس میں غور و تدبر کرتا ہو، زندگی کے ہر موڑ پر اس سے رہنمائی لیتا اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش میں رہتا ہو۔ عامی بھی ہو تو اس کی تعلیمات سے آگاہی میں کوشاں رہتا ہو۔ صبح شام اس کی تلاوت کرتا اور علما سے اس کو سیکھنے میں لگا رہتا ہو۔ آپ نے اسی بات کو ان الفاظ میں بیان کیا کہ 'هو يقوم به اناء الليل و اناء النهار'۔

اور دوسرا وہ شخص ہے، جسے اللہ نے مال و دولت سے نوازا ہو۔ اور وہ اس مال کو سینت سینت کر رکھنے کے بجائے اس کو راہِ خدا میں بے دریغ خرچ کرتا ہو۔ اہلِ ثروت کی آزمایش یہی ہے کہ ان کا مال کے

معاملے میں کیا رویہ ہے، کیا وہ اس کی پائی پائی کو سینت کر رکھتے ہیں یا قرآن کی اس آیت کے مصداق کہ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا[1] ہمیشہ اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں، اپنے اوپر اسراف اور بخل سے بچ کر ہی خرچ کرتے ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ بچ رہتا ہے، اسے مستحق اور ضرورت مند لوگوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو شخص ہیں جو اس مرتبہ میں اتنے بلند ہیں کہ ان کے بارے میں حسد جیسی برائی پر بھی نیکی کا گمان ہونے لگتا ہے۔

یہ بات واضح رہے کہ اس انداز بیان سے، جواز حسد مقصود نہیں ہے، بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ تعلق بالقرآن اور انفاق فی سبیل کی ایسی توفیق کتنی بڑی نعمت ہے۔ یہ زبان کا ایک اسلوب ہے، جسے منفی چیز کے تعلق سے ایک چیز کی اہمیت کو بیان کرنے کے لیے اختیار کیا جا سکتا ہے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے کہا جائے کہ "علم کی تو چوری بھی جائز ہے۔" اس میں علم کے حصول کی ترغیب مقصود ہے نہ کہ چوری کا جواز پیش نظر ہے۔

(جاوید احمد صاحب غامدی کے درس سے ماخوذ)

---

[1] "وہ کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے اور نہ بخل سے کام لیتے اور اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں۔" (الفرقان ۲۵: ۶۷)

ترتیب معز امجد

"سنتِ ثابتہ سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ عملِ متواتر ہے جو صحابہ کے اجماع یا ان کے تواترِ عملی کے ذریعے سے بحیثیتِ دین، اس امت کو منتقل ہوا ہے. ظاہر ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآنِ مجید میں کوئی فرق نہیں ہے، جس طرح وہ قولی تواتر سے ثابت ہوا ہے، یہ اسی طرح عملی تواتر سے ثابت ہے۔"

فقہیات

نادر عقیل انصاری

اصولِ دین — ۱

دین کے مآخذ

دینِ اسلام کو سمجھنے کے لیے کوئی کوشش اس وقت تک بار آور نہیں ہو سکتی جب تک اس بات کا فیصلہ نہ ہو جائے کہ اس دین کی بنیاد کن ذرائع پر ہے، اس کے مآخذ کیا ہیں اور وہ کون سی کسوٹی ہے جس پر ہر نظریے اور ہر عمل کو پرکھنے کے بعد ہی یہ طے کیا جائے گا کہ وہ اسلام سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں۔ پھر یہ کہ محض ان مآخذِ دین کا شعور ہی کافی نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہمیں معلوم ہو کہ ان سے استفادے کا علمی طریقہ کیا ہے اور وہ کون سے قواعد و ضوابط ہیں، جن کی روشنی میں ان ماخذوں پر غور و فکر ہونا چاہیے۔ یعنی، یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ ان دینی مآخذ سے ہدایت حاصل کرنے کے کچھ اصول ہیں یا یہ کام یونہی الل ٹپ ہے کہ جو چاہے اسے اپنے طریقے سے انجام دے دے۔ اگر اس غرض کے لیے کچھ اصول موجود ہیں تو ازبس ضروری ہے کہ ماخذِ دین کو متعین کرنے کے ساتھ ساتھ ان پر تدبر کے اصول بھی سمجھے جائیں۔

اہلِ نظر کے لیے یہ بات سمجھنا مشکل نہیں کہ گزشتہ چودہ صدیوں کے دوران میں مسلمانوں کے درمیان جو مذہبی اختلافات ظاہر ہوئے ہیں اور جن کے نتیجے میں مذاکروں، مباحثوں، مناظروں اور جنگ و جدال تک نوبت پہنچ گئی ہے، صرف اسی صورت میں حل ہو سکتے ہیں اگر اسلام کے مآخذ متعین ہو جائیں اور ان پر تدبر کی راہیں واضح ہو جائیں۔

مآخذِ دین متعین ہونے سے اس سوال کا جواب بھی مل سکے گا کہ "اسلام" اور "مسلمان" کی تعریف کیا ہے۔ یہ بحث بھی مختلف ادوار میں سر اٹھاتی رہی ہے اور کوئی جامع و مانع تعریف طے نہ ہونے کی وجہ سے معترضین کو یہ کہنے کا موقع ملا ہے کہ یہ کیسا دین ہے جس کی تعریف پر دو عالم بھی متفق نہیں ہیں۔ "مسلمان" کی تعریف طے نہ ہونے ہی کی وجہ سے اس قدر اضطراب پھیلا ہے کہ ہر فرقہ اپنے علاوہ تمام فرقوں کو غیر مسلم گردانتا ہے اور عام مسلمان ایک عجیب بے یقینی اور حیرانی کے عالم میں گرفتار ہے۔ ہاں اگر اسلام کے مآخذ اور مسلمان کی تعریف، حتمی طور پر متعین ہو جائیں، تو پھر یہ ممکن نہیں رہے گا کہ کسی مسلمان کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دیا

جائے یا کسی کافر کو دائرۂ اسلام میں داخل کر دیا جائے۔ اس طرح ہمارے علما میں جاری کفر کے فتووں کی وہ ناگوار جنگ بھی ختم ہو جائے گی، جو امت کے لیے ایک کلنک کا ٹیکا بنی ہوئی ہے۔

اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ دینِ اسلام کے بنیادی مآخذ پر براہِ راست غور و فکر کی راہیں کھل جائیں گی اور یوں ہماری تعلیم یافتہ نسل بے علم مولوی کے "علمی استبداد" سے آزاد ہو سکے گی۔ اس وقت تو صورتِ حال یہ ہے کہ دین سے مراد وہ چیز بھی جاتی ہے، جسے مذہبی اور روحانی پیشوا دین کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ اس جماعت کو اس درجہ تقدس حاصل ہو چکا ہے کہ اگر ان کے کسی نقطۂ نظر پر انگلی اٹھائی جائے تو اسے لادینیت اور زندقہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، حالانکہ اگر دین کی حتمی تعبیر وہی ہے جو یہ افراد پیش کرتے ہیں تو خود اس میں ظاہر ہونے والے بے شمار اختلافات کے کیا معنی ہیں؟ اور اس کی کیا وجہ ہے کہ عقلِ عام ان کے بہت سے خیالات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی؟ اس کے بجائے اگر دین کے معروضی مآخذ طے کر لیے جائیں تو ایک تعلیم یافتہ شخص کے لیے آسان ہو جائے گا کہ وہ علما اور مشائخ کی باتوں کو ان مآخذ کے ترازو میں تول کر حق و باطل کا فیصلہ کرے، کیونکہ عام مسلمان اس بات سے واقف نہیں ہے کہ دین کا اصل اور بنیادی سرچشمہ کیا ہے، لہٰذا اس کے پاس دین میں، اور دین کے نام پر پیش کیے جانے والے بے شمار توہمات اور بے بنیاد فلسفوں میں تمیز کرنے کے لیے کوئی کسوٹی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ دین ہی کے نام پر دھوکا کھاتا اور اپنی زندگی کو اجیرن کرتا رہا ہے۔ اور جب کبھی اس کے توہمات پر تنقید کر کے اسلام کے بنیادی مآخذ کی روشنی میں حقیقت اس پر واضح کی جاتی ہے، تو حیرت کی تصویر ہو جاتا ہے۔

اصولِ دین کے بارے میں مروجہ نظریہ

چنانچہ، پہلے ہم اس سوال کو لیتے ہیں کہ دینِ اسلام کو کہاں سے حاصل کیا جائے۔ علما کے ہاں دین کے مآخذ کے لیے "اصولِ دین" کی اصطلاح رائج ہے۔ دین کے بنیادی مآخذ کے بارے میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ چار ہیں:

۱۔ قرآن

۲۔ سنت

۳۔ اجماع

۴۔ قیاس (جسے اجتہاد کی ایک شکل سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اجتہاد و قیاس کی کچھ اور صورتیں بھی ہیں، جو مختلف مسالک کے ہاں مقبول رہی ہیں، جیسے استحسان، مصالح مرسلہ وغیرہ۔)

اصولِ دین کے باب میں قرآنی فیصلہ

قرآن مجید اس باب میں بلا کسی اشتباہ کے یہ اعلان کرتا ہے کہ دین صرف دو چیزوں کا نام ہے۔ ایک تو قرآن اور دوسرے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت۔ اس کے علاوہ اور کوئی چیز دین قرار نہیں دی جاسکتی۔ وہ مسلمانوں کی بھلائی کی خاطر ان کے رسوم و رواج اور ان کی مشاورت پر مبنی کسی خاص عہد کے لیے ایک اچھا قانون تو ہوسکتا ہے، دین نہیں ہوسکتا اور اسے دین کی مانند آخرت تک کے لیے مسلمانوں کے لیے واجب الاطاعت یا واجب الایمان اور ناقابلِ تغیر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ بات کہ دین صرف قرآنِ مجید اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہی کا نام ہے، خود قرآن سے واضح ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَ	"اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو، رسول
أَطِيعُوا الرَّسُولَ وَ أُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ	کی اطاعت کرو اور اپنے اولوالامر کی۔ پھر اگر
فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى	کسی امر میں اختلافِ رائے واقع ہو تو اس کو
اللَّهِ وَ الرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ	اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ اور
بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ۔ (النساء ۴: ۵۹)	روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔"

اس آیت میں دین کے بنیادی اور مستقل بالذات مآخذ کے بارے میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ وہ صرف اللہ اور رسول کے احکام ہیں۔ اور دو ٹوک الفاظ میں بتا دیا گیا ہے کہ ہماری اطاعت کے حق دار صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس سلسلے میں اس آیت کے درج ذیل پہلو قابلِ غور ہیں:

(ا) اسلام میں امر و اطاعت کے مرکز تین ہیں: اللہ، رسول اور اولوالامر۔ ان میں سے پہلے دو مستقل اور بالذات مرکزِ اطاعت ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے ساتھ 'اطیعوا' کا فعل استعمال ہوا ہے۔ اولوالامر کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت کے تحت ہے، اس وجہ سے ان کے لیے یہ فعل الگ استعمال نہیں ہوا، بلکہ اس کو سابق پر عطف کر دیا گیا ہے۔

(ب) اولوالامر کا مطلب امیر المومنین نہیں ہے۔ یہ جمع کا صیغہ ہے۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو ریاست کی سربراہی کے منصب پر فائز کیے گئے ہیں۔ یعنی اربابِ حل و عقد، جس میں امیر المومنین، پارلیمان، شوریٰ یا ریاست کے اعیان و اکابر، غرض کہ وہ سب لوگ جو ریاست کا نظام چلا رہے ہیں، شامل ہیں۔

(ج) 'فان تنازعتم فی شیء' (پس اگر کسی معاملے میں تمھارا اختلاف ہو جائے) سے مراد یہ ہے کہ عوام کا اختلاف اپنے اولوالامر سے ہو جائے، یا اولوالامر کے اندر آپس میں اختلاف ہو جائے۔

(د) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس آیت میں استعمال ہونے والی اصطلاح "اولوالامر" کے سب سے پہلے مصداق خلفائے راشدین اور ارباب حل وعقد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ریاست کی سربراہی کے منصب پر یہی ہستیاں فائز ہوئیں۔ ہماری آج کی مسلمان حکومتیں یا اموی اور عباسی دور کی حکومتیں تو اس کی مصداق بعد میں بنی ہیں۔

(ہ) قرآن اس جماعت کے بارے میں کہتا ہے کہ اگر ان کا آپس میں تنازع ہو جائے اور اختلاف رائے کے سبب سے فیصلہ نہ ہو پا رہا ہو اور ایک صحابی کی رائے کچھ ہو اور دوسرے کی کچھ اور، تو مرجع و ماخذ کا مقام صرف قرآن اور سنت نبوی ہی کو حاصل ہے۔ غور طلب نکتہ یہ ہے کہ صحابۂ کرام کی جماعت انبیا کے بعد زمین پر سب سے محترم نفوس پر مشتمل ہے اور انھی کے ذریعے سے ہمیں قرآن اور سنت ملے ہیں، لیکن ان کے بارے میں بھی قرآن کا اعلان ہے کہ اگر ان کا آپس میں اختلاف ہو جائے تو معاملہ قرآن اور سنت ہی کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ جب ایسی عظیم ہستیوں کے معاملے میں بھی آخری فیصلہ قرآن و سنت پر موقوف ہے، جو آسمانِ امت کے مہر و ماہ ہیں، تو پھر ہما شما تو ظاہر ہے کہ کس شمار میں ہوں گے۔

چنانچہ یہ آیت اس معاملے میں بالکل صریح ہے کہ دین جس چیز کا نام ہے وہ صرف قرآن اور سنت ہی ہیں۔

قرآن بحیثیت ماخذِ دین

اس آیت کے علاوہ بھی قرآن میں، بارہا، اس کا اعادہ کیا گیا ہے کہ یہ قرآن حق وصداقت کی میزان اور فرقان بن کر آگیا ہے، للٰہذا اس کی پیروی کرو۔ اور قرآن میں اس نوعیت کے مضامین اس کثرت سے بیان ہوئے ہیں کہ اس میں کچھ ابہام باقی نہیں رہا کہ قرآن کا اتباع مسلمانوں پر لازم ہے۔ چنانچہ قرآن کے بارے میں ہمارا عقیدہ ہے کہ دین میں وہ اللہ کی میزان ہے اور حق و باطل کے لیے فرقان ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ہر چیز کے رد و قبول کا فیصلہ اس کی آیات ہی کی روشنی میں کیا جائے۔ ایمان وعقیدے کی ہر بحث اس سے شروع ہو اور اسی پر ختم کی جائے۔ ہر وحی، ہر الہام، ہر القا، ہر تحقیق اور ہر رائے کو اس کے تابع قرار دیا جائے اور اس کے بارے میں یہ حقیقت تسلیم کی جائے کہ تمام علما، فقہا، محدثین، متکلمین اور صوفیہ پر اس کی حکومت قائم ہے اور اس کے خلاف ان کی کوئی بات بھی قبول نہیں کی جا سکتی۔

سنت بحیثیت ماخذِ دین

اسی طرح اس آیت میں، صراحت کے ساتھ، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو بھی تمام معاملات میں

مرجع و ماخذ قرار دیا گیا ہے، لیکن سنت کے بارے میں قرآن نے ایک اور مقام پر اس کی غیر معمولی اہمیت کی مزید وضاحت کر دی ہے۔ یہ بات سورۂ حشر میں بیان ہوئی ہے۔

اس واقعے کا پس منظر یہ ہے کہ یہود کے قبیلے بنو نضیر نے اگرچہ مسلمانوں کے ساتھ امن و صلح کا معاہدہ کر رکھا تھا، لیکن بدر کے بعد انھوں نے ایک تو معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اسلام کے دشمنوں کے ساتھ ساز باز کی اور دوسرے یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی ایک ناکام سازش کے مرتکب بھی ہوئے۔ اس جرم کی پاداش میں آپ نے ان کو مدینے سے نکلنے کا حکم دیا۔ ان کے انکار کے نتیجے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر فوج کشی کی۔ اس محاصرے کے دوران میں مسلمانوں کو جنگی مصلحت سے کچھ درخت کاٹنے پڑے۔ اس پر یہود کو پروپیگنڈے کا موقع مل گیا اور انھوں نے کہنا شروع کر دیا کہ مسلمان دعویٰ تو اصلاح کا کرتے ہیں، لیکن ان کا حال یہ ہے کہ انھوں نے عمدہ پھل دار درخت کاٹ ڈالے ہیں، اور اس طرح یہ اصلاح کے بجائے افساد کے مرتکب ہوئے ہیں۔

دوسرا اعتراض منافقین کی جانب سے اٹھایا گیا۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ جب مسلمانوں کو بنو نضیر پر فتح حاصل ہو گئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متروکہ اموال کو مال غنیمت کی طرح فوجیوں میں تقسیم کرنے کی بجائے سرکاری خزانے میں جمع کرنے کا حکم فرمایا، تاکہ اس سے غربا و مساکین اور خاص طور سے مہاجرین کی مدد کی جائے۔ اس پر منافقین نے یہ اعتراض اٹھایا کہ ان اموال کو بھی اسی طرح فوجیوں میں تقسیم ہونا چاہیے تھا جیسے بدر کے بعد اموال غنیمت کو تقسیم کیا گیا تھا۔ یہود کے اعتراض پر قرآن نے اس طرح تبصرہ کیا:

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ۔

"کھجوروں کے جو درخت تم نے کاٹ ڈالے یا جو سلامت چھوڑ دیے تو یہ اللہ کے حکم سے ہوا۔"

(الحشر ۵۹: ۵)

یہ یہود کے اعتراض کا جواب تھا۔ یعنی یہ کہ اے مسلمانو، تم نے جو کچھ کیا، رسول کی موجودگی میں، اس کی ہدایت کے تحت کیا، جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ کام اللہ کے اذن سے ہوا ہے۔ اس آیت میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو اللہ کا حکم قرار دیا گیا ہے۔ پھر مزید بیان ہوا ہے کہ:

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۔ (الحشر ۵۹: ۷)

"اور رسول جو تمھیں دے، اس کو لو اور جس سے روکے، اس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ سخت پاداش والا ہے۔"

یہ منافقین کے اعتراض پر تبصرہ بھی ہے اور ان کو تنبیہ بھی. یعنی رسول جو کچھ دے، وہ لے لو اور جس چیز سے روکے، اس سے رک جاؤ. کسی بات کو اعتراض اور نکتہ چینی کا بہانہ نہ بناؤ. یہاں رسول کا جو درجہ واضح فرمایا گیا ہے، اگرچہ اس کا ایک خاص محل ہے، لیکن اس سے جو حکم مستنبط ہوتا ہے، وہ بالکل عام ہوگا. یہ ایسے ہی ہے کہ ٹریفک کے کسی قانون کی خلاف ورزی پر کوئی شخص یہ تنبیہ کرے کہ بھئی ٹریفک کے قانون کی پابندی کرو اور یاد رکھو کہ جو قانون بھی ملک میں بنایا جاتا ہے اس کی پابندی کرنی چاہیے. چنانچہ اس آیت میں بھی ایک خاص واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ واضح کر دیا ہے کہ اس خاص معاملے کی طرح، زندگی کے ہر معاملے میں رسول کے ہر حکم کی بے چون وچرا تعمیل کی جائے گی. چنانچہ فرمانِ الٰہی ہے کہ :

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۔ (النساء ۴ : ۶۴)	"اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا، اسی لیے بھیجا ہے کہ اذنِ خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے ."

اس سلسلے میں قرآن نے یہ تصریح بھی کر دی ہے کہ :

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ۔ (النحل : ۱۶ : ۴۴)	"اور ہم نے یہ ذکر تم پر نازل کیا ہے، تاکہ تم لوگوں کے سامنے اس (تعلیم) کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو ان کے لیے اتاری گئی ہے ."

یعنی قرآن کی وہی تعبیر اور شرح و وضاحت مستند ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو. پھر اہلِ ایمان کی نشانی بتاتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ :

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۔ (النساء ۴ : ۶۵)	"(اے نبی) تمھارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے، جب تک کہ یہ اپنے باہمی اختلافات میں تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو فیصلہ تم کرو، اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں، بلکہ سربسر تسلیم کریں ."

یعنی نبی کے فیصلے کو ایک عام حکمران کے فیصلے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، بلکہ قرآن اس پر دل میں تنگی محسوس کرنے والے کو بھی مومنوں کے زمرے میں شمار نہیں کرتا. اس سے مترشح ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ایک مستقل ماخذِ دین ہے.

مسلمان کی تعریف

ہمارے نزدیک مسلمان کی تعریف بھی یہی ہے کہ "مسلمان وہ ہے جو صرف قرآن اور سنت ہی کو دین کا ماخذ مانتا ہو" اور اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ تعریف کلمۂ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا قانونی زبان میں سادہ ترجمہ ہے۔ واضح رہے کہ صرف قرآن اور سنت "ہی" کو دین کا ماخذ مانتا ہو، بھی نہیں۔ یعنی قرآن کو دین کا ماخذ مانتا ہو، سنت کو ماخذ مانتا ہو اور اس کے علاوہ کسی اور چیز کو دین کا ماخذ نہ مانتا ہو۔ چنانچہ، اگر کوئی شخص سنت کو تو دین کا ماخذ مانتا ہو لیکن قرآن کو دین کا ماخذ نہ مانتا ہو تو دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ اگر قرآن کو مانتا ہو لیکن سنت کو دین کا ماخذ نہ مانتا ہو تو بھی دائرۂ اسلام سے خارج ہے، اور اگر قرآن اور سنت کے ساتھ کسی اور چیز کو بھی دین کا ماخذ مانتا ہو، تو بھی دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ چنانچہ جب پاکستان میں سلسلۂ احمدیہ کو ماننے والوں کے کفر و ایمان کے بارے میں فیصلہ کرنا پڑا تو انھیں دین کے دائرے سے باہر قرار دے دیا گیا کہ وہ قرآن اور سنت کے علاوہ ایک اور شخص کی وحی اور الہام کو بھی دین کا ماخذ مانتے تھے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص قرآن اور سنت ہی کو دین کا ماخذ مانتا ہو تو وہ مسلمان ہے، خواہ فروعات میں ہم سے کتنا ہی اختلاف رکھتا ہو۔ چنانچہ اس تعریف کے بعد کسی مسلمان کو کفر سے بلاوجہ متہم بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ ایک جامع اور مانع تعریف ہے جس کی روشنی میں قیامت تک ہر شخص اور فرقے کے بارے میں حتمی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ باعتبارِ عقیدہ مسلمان ہے یا نہیں۔

اجماع اور قیاس کی دینی حیثیت

یہاں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ پھر اجماع اور قیاس کی دینی حیثیت کیا ہے؟ ویسے تو ابھی ہم سورۂ نساء کی جس آیت کا حوالہ دے آئے ہیں (اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم ---- الی الآخر) اسی سے واضح ہے کہ دین کے مآخذ صرف قرآن اور سنت ہی ہیں، لیکن ہم آئندہ اگلی صفحات میں اس موضوع پر وضاحت سے کلام کریں گے کہ اجماع اور قیاس کی حقیقت کیا ہے اور دین میں انھیں کیا مقام حاصل ہے۔

سنت کیا ہے

دین اسلام کا پہلا ماخذ قرآن ہے۔ اس کے بارے میں کوئی بحث اور نزاع نہیں ہے کہ یہ کہاں سے

مل سکتا ہے اور اس کے مندرجات کیا ہیں۔ یہ کتاب 'الحمد' سے لے کر 'الناس' تک کی آیات پر مشتمل ہے، اور اس کی آیات، الفاظ، حروف اور حرکات کی تعداد تک معلوم ہے۔ پھر یہ عظیم الشان کتاب نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی ہوئی اس طرح ہمارے ہاتھوں میں پہنچی ہے کہ ایک ثابت شدہ تاریخی حقیقت بن گئی ہے۔

سنت کے بارے میں البتہ بہت کچھ غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ ان کو دور کرنا بے حد ضروری ہے۔ چنانچہ، سب سے پہلے، اس سلسلہ میں یہ جان لینا چاہیے کہ عہدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں صحابۂ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست احکام سن کر آپ کی اطاعت کرتے تھے۔ تاہم بعد کے لوگوں کے لیے یہ مسئلہ پیدا ہو گیا کہ یہ طے کیا جائے کہ کوئی خاص حکم خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے یا ان کی طرف غلط منسوب ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس معاملے میں تحقیق اور احتیاط کی ضرورت محسوس ہوئی۔ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ ہمیں قرآن کے علاوہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دین دو صورتوں میں ملا ہے:

۱۔ سنتِ ثابتہ

۲۔ احادیث

سنتِ ثابتہ سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ عمل متواتر ہے جو صحابہ کے اجماع یا ان کے تواترِ عملی کے ذریعے سے، بحیثیتِ دین، اس امت کو منتقل ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جس طرح وہ قولی تواتر سے ثابت ہوا ہے، اسی طرح یہ عملی تواتر سے ثابت ہے۔ چنانچہ اس کے بارے میں، اب کسی بحث اور نزاع کی گنجایش نہیں ہے۔

احادیث، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کی وہ روایات ہیں جو زیادہ تر اخبارِ احاد کے طریقے سے ہمیں ملی ہیں۔ ان کے متعلق صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ ان کو صرف اس صورت میں تسلیم کیا جائے گا، جب وہ قرآنِ مجید، سنتِ ثابتہ اور عقل و فطرت کی اساس پر قائم ہوں، اور کسی پہلو سے ان کے منافی نہ ہوں، اور قابلِ اعتماد ذرائع سے ہم تک پہنچیں۔ اس صورت میں ان احادیث کی حجیت بھی مسلم ہے اور ان کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

خلاصہ

ہمیں قرآنِ مجید نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا ہے اور حدیث و سنت کا سرچشمہ بھی انھی کی ذاتِ اقدس ہے۔ چنانچہ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ درحقیقت، دین کا تنہا ماخذ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے، جس سے ہمیں دین تین مختلف صورتوں میں ملا۔ یہ تین صورتیں قرآن، سنتِ ثابتہ اور حدیث ہیں۔

ہماری مطبوعات

جاوید احمد غامدی کے قلم سے

قانونِ دعوت

دعوتِ دین کے موضوع پر ایک جامع تصنیف

● اہم عنوانات :
دعوت کی صورتیں
اہداف و مقاصد
حدود و شرائط
سمع و طاعت
التزامِ جماعت
ہجرت و برأت
جہاد بالسیف
خروج
تکفیر
دعوت کا لائحۂ عمل
متوقع نتائج

ضخامت :
۹۴ صفحات

بُرھان

معاصر مذہبی فکر پر تنقیدی مضامین

○ تاویل کی غلطی
غلبۂ دین کی جدوجہد کا ماخذ ؟

● اہلِ 'بیعت' کی خدمت میں
سمع و طاعت کی بیعت کے بارے میں

○ اربابِ منہاج القرآن کی خدمت میں
سورۃ الضحیٰ کی تفسیر کے سلسلے میں

● غلطی ہائے مضامین
سورۃ الفیل کی تفسیر کے ضمن میں

○ پس چہ باید کرد
اہلِ اقتدار کے لیے نفاذِ دین کی حکمتِ عملی

ضخامت :
۱۱۰ صفحات

شعبۂ اصلاح و دعوت المورد
۹۸ (۲)، ای ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون۔ ۸۵۶۴۱۸۰
بک سٹال
ماہانہ لیکچر کے بعد

دار التذکیر (تقسیم کار)
حمید سنٹر، ۹ رائل پارک، لاہور
فون۔ ۶۳۶۳۵۴۲۰
دفتر 'اشراق'
۶۶۔ احمد بلاک گارڈن ٹاؤن، لاہور

شعبۂ اصلاح و دعوت المورد
سنو وائٹ چیمبرز، بہادر آباد چورنگی، کراچی
فون ۴۹۲۳۳۶۹۰
بک سٹال
ماہانہ لیکچر کے بعد

ترتیب طالب محسن

"تقویٰ میں اصل شے جس کا اہتمام مطلوب ہے، وہ زندگی کو دین کے سانچے میں ڈھال لینا ہے۔ کوئی شخص کتنی ہی عبادتیں کرے، اس وقت تک تقویٰ کا مقام حاصل نہیں کر سکتا، جب تک حلال و حرام میں امتیاز اور حقوق و فرائض ادا کرنے میں دین کی دی ہوئی ہدایات پر بھی، اسی سرگرمی سے عمل نہیں کرتا، جس سرگرمی کے ساتھ وہ عبادات میں مشغول رہتا ہے۔"

فکر و نظر

طالب محسن

تقویٰ کی حقیقت

خالقِ کائنات نے اپنی ہر مخلوق کو جہاں اپنی صلاحیتوں اور خوبیوں کے اظہار کا جذبہ دیا ہے، وہاں اُسے اپنی ذات کے تحفظ کا شعور بھی بخشا ہے۔ پہلی چیز اُسے عمل پر اُبھارتی ہے، وہ اقدام کرتا ہے، آگے بڑھتا ہے اور اِس طرح اُس منزل کی طرف رواں دواں رہتا ہے، جو نظامِ فطرت نے اُس کے لیے متعین کر رکھی ہے۔ دوسری چیز اُسے روکتی ہے، وہ گریز کرتا ہے، توقف اور تأمل سے کام لیتا ہے، اور یہ چیز اُسے حادثوں سے بچاتی، اور نقصان اور خطروں سے محفوظ رکھتی ہے۔ اِس طرح وہ صحت اور سلامتی کے ساتھ اپنا کام جاری رکھتا ہے۔

اگر ہم اپنے گرد پھیلی ہوئی کائنات پر نگاہ ڈالیں، تو ستارے اور سیارے ایک متعین نظام میں جکڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ فطرت نے اُنھیں ایک سفر پر روانہ کر دیا ہے۔ وہ اپنی منزل کی طرف بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ بظاہر یہ بے روک ٹوک محوِ سفر ہیں، لیکن، ہم جانتے ہیں کہ بگٹٹ نہیں ہیں۔ ایک مخفی ہاتھ ہے جو ان کو بے راہ ہونے سے روکے ہوئے ہے، اور اِنھیں اِس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ یہ کائنات کے اِس نظام میں کوئی خرابی یا اِس کارواں کے سفر میں کوئی رکاوٹ کھڑی کریں۔ اِس حقیقت کو اِس طرح بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ کائنات کی تمام چیزیں فطرت کی دی ہوئی رہنمائی سے سرِمو انحراف نہیں کرتیں۔ جو کام اور جو طریقہ ان کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے، وہ اُس پر بے چون وچرا عمل پیرا ہیں۔ چنانچہ یہی تعبیر قرآنِ مجید نے اختیار کی ہے۔ اس کے نزدیک، سورج کی معین مدار پر گردش خدائے علیم وعزیز کی منصوبہ بندی ہے۔ چاند اُسی کی ٹھیرائی ہوئی منزلیں طے کرتا ہے کہ ایک وقت پر کھجور کی سوکھی شاخ کی طرح ہو جاتا ہے، سورج اور چاند پوری طرح اپنی راہِ سفر اور اوقاتِ کار کے پابند ہیں۔ سورج کی مجال نہیں کہ چاند کو پا لے اور نہ رات کے لیے ممکن ہے کہ وہ دن پر سبقت لے جائے۔ غرض یہ کہ ہر شے کے لیے ایک الگ دائرۂ کار ہے جس میں وہ اپنا کام انجام دے رہی ہے (یٰسین ۳۶: ۳۸- ۴۰)۔ سمندر میں کھارے اور میٹھے پانی کے دریا

بہتے ہیں۔ یہ دونوں دریا ساتھ ساتھ ملتے ہوئے چلتے ہیں، لیکن ان کا پانی آپس میں مل نہیں سکتا۔ قرآن مجید کے الفاظ میں ان کے درمیان ایک پردہ حائل کر دیا گیا ہے اور یہ اس پردے کو نہیں پھاڑ سکتے (الرحمٰن ۵۵: ۱۹-۲۰)۔

ہمارے ماحول میں موجود جان دار بھی اپنے عمل سے یہی بات ظاہر کر رہے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ درندے، پرندے، چوپائے اور خشکی اور تری کے دوسرے جانور کس طرح اپنی زندگیاں ایک مخصوص طریقے پر بسر کرتے ہیں۔ ہر نوع اپنی جبلت کی رہنمائی کے تحت پروان چڑھتی اور اس سے کبھی انحراف نہیں کرتی۔ ہم انسان بھی اپنی فطرت میں ذات کی حفاظت اور ظہور و اقدام کے دونوں جذبے رکھتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ آسمان کے ستارے اور سیارے ہوں یا دوسرے جان دار، وہ ترک و اختیار کی صلاحیت نہیں رکھتے، جبکہ انسان اس کے باوجود کہ اپنے خیر اور اپنے شر اور اپنے نیک و بد اور اپنے نفع و ضرر سے خوب خوب واقف ہے، چاہتا ہے تو خیر اختیار کرتا ہے اور چاہتا ہے تو شر اپنا لیتا ہے۔ اس کی مرضی پر ہے کہ وہ نیک بنے اور اس کی مرضی پر ہے کہ وہ بدی کی راہ چلے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات کے ساتھ ایک ہی معاملہ کیا ہے، انھیں پیدا کیا، انھیں سجایا اور سنوارا، ان کے لیے زندگی بسر کرنے کی راہ متعین کی اور پھر اس کی ہدایت بھی بخشی (الاعلیٰ ۸۷: ۱-۳)۔ جن کو ترک و اختیار کی صلاحیت حاصل نہیں، وہ اپنے پروردگار کی ہدایت پر بے چون و چرا عمل پیرا ہیں اور انسان کے لیے ان میں مثال ہے کہ وہ بھی اپنے پروردگار کی رہنمائی سے سرمو انحراف نہ کرے۔ جب سورج اور چاند ایک حساب اور ایک قاعدے پر گردش کر رہے ہیں، شجر و حجر اپنے پروردگار کے حضور سربسجود ہیں، آسمان اسی کی ٹھہرائی ہوئی بلندی پر قائم ہے اور ایک اعتدال اور ایک توازن ہر جگہ موجود ہے، تو پھر انسان کے لیے بھی موزوں یہی ہے کہ وہ اس نظام کے ساز سے اپنی فطرت کے ساز کو ہم آہنگ کر لے اور اس میں کجی اور ٹیڑھ پیدا نہ کرے (الرحمٰن ۵۵: ۵-۸)۔

یہ سورج اور چاند کی قاعدے پر حرکت، شجر و حجر کا خدا کے حضور سجدہ و نیاز، یہ جانداروں کا اپنی جبلت پر ٹھیک ٹھیک عمل، یہ درحقیقت اپنے راستے پر نقصان اور بدی سے اپنا تحفظ کرتے ہوئے چلنا ہے۔ یہ ان کا تقویٰ ہے اور اگر انسان اپنی فطرت میں موجود خدا کی عطا کی ہوئی رہنمائی اور پھر خدا کے پیغمبروں کی لائی ہوئی ہدایت پر چلتا ہے، تو یہ اس کا تقویٰ ہے۔ خدا کی دی ہوئی فطرت اور اس کی دی ہوئی ہدایت یعنی شریعتِ الٰہی کوئی متضاد چیزیں نہیں ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ شریعت کوئی ایسا تقاضا نہیں کرتی، جو انسانی فطرت کے

موافق نہ ہو اور نہ کسی ایسی چیز کے صالح اظہار سے روکتی ہے، جس کا رجحان، جذبہ اور داعیہ انسانی فطرت میں موجود ہے۔

دوسری مخلوقات، جس جذبۂ تحفظ کے ساتھ راہِ صواب سے نہیں ہٹ پاتیں، اس کا تعلق جسم و جان سے ہے، لیکن انسان کا جذبۂ تحفظ صرف اس کے جسم و جان ہی سے متعلق نہیں ہے۔ اِن کا تحفظ تو وہ ہر حال میں کرتا ہے۔ اس سے آگے، اُس کے اِس جذبے کا تعلق، اس کی اپنی شخصیت کے تحفظ سے بھی ہے۔ اور اُس کا مسئلہ صرف دنیوی زندگی میں نقصان اور برائی سے بچنا نہیں، بلکہ آخرت کی ناکامی کا خطرہ اس سے بھی بڑا ہے، جس سے اُسے اپنا تحفظ کرنا ہے۔ شریعت یا دین میں، درحقیقت، اِسی کا طریقہ بیان ہوا ہے۔ اِس اعتبار سے دیکھیں تو یہ جذبۂ تحفظ یا تقویٰ اپنا ایک متعین ہدف رکھتا ہے۔ اور وہ ہدف، خدا کی گرفت سے تحفظ، اور آخرت کی ناکامی و نامرادی سے بچنے کا ہدف ہے۔ یہ ایک روش ہے، جسے انسان کو اپنانا چاہیے۔ اور یہ دل کی وہ حالت ہے، جو بندۂ مومن سے مطلوب ہے۔

قرآنِ مجید میں تقویٰ کا بیان

قرآنِ مجید میں لفظ 'تقویٰ'، اپنی مختلف صورتوں میں، بیسوں جگہ پر استعمال ہوا ہے۔ اِن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ چار معانی کا حامل ہے۔ اردو میں ہم یہ معانی بچاؤ، ڈر، خوفِ خدا اور پرہیزگاری کے الفاظ میں ادا کر سکتے ہیں، جبکہ اِن میں سے آخری مفہوم پہلے تین مفاہیم کا جامع ہے۔ یعنی، جب گناہوں سے بچنا، آخرت کے عذاب سے ڈرنا، اللہ تعالیٰ کی خشیت اور اس کا خوف، تقویٰ کے مفہوم میں جمع ہو جاتے ہیں، تو وہ جامع مفہوم وجود میں آتا ہے، جس کے لیے ہم نے پرہیزگاری کی تعبیر اختیار کی ہے، اور یہ تقویٰ کے اُس تصور کی اساس ہے، جو ہمارے دین میں مطلوب ہے۔

قرآنِ مجید نے تقویٰ کے لیے کوئی الگ اوراد و وظائف بیان نہیں کیے، بلکہ دین پر اس کے سارے تقاضے پورے کرتے ہوئے عمل کرنا ہی، اس کے نزدیک تقویٰ ہے۔ مثال کے طور پر حج، ارکانِ اسلام میں سے ایک ہے۔ عبادت اور رجوع الی اللہ کا پہلو اِس میں بہت نمایاں ہے۔ اِس کا حکم قرآنِ مجید میں بیان ہوا، تو ہدایت فرمائی کہ جب حج کے مہینوں میں حج کا ارادہ کر لو تو شہوت کی باتوں سے گریز کرو، فسق و فجور اور لڑائی جھگڑوں سے دور رہو، نیکی کے کام کرو، تو اللہ اُن سے

باعجرہے'اسی کو زادِ راہ بناؤ، اِس لیے کہ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے (البقرہ ۲: ۱۹۷) گویا' حج ادا کرتے ہوئے اپنے نفس کو شہوات سے' زبان کو گالی اور بدگوئی سے' ہاتھ پاؤں کو جنگ و جدال سے بچانا اور بھلائی کے کاموں میں لگے رہنا ہی وہ طرزِ عمل ہے' جسے قرآنِ مجید یہاں تقویٰ قرار دیتا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کر دیتا ہے کہ اگر کوئی حاجی سفر میں اور دورانِ حج میں فریضہ ادا کرتے ہوئے اپنے ساتھ یہ سامانِ سفر نہیں رکھتا' تو بہت ممکن ہے کہ وہ کسی موقع پر' اپنے سارے عمل ہی کو غارت کر بیٹھے۔

عدل' ایک اسلامی قدر ہے۔ بندۂ مومن سے ہر آن اور ہر معاملے میں' یہی مطلوب ہے کہ وہ عدل کا دامن تھامے رکھے۔ یہاں تک کہ دشمن کے ساتھ معاملہ کرنے میں بھی اِسے راہِ عدل سے نہیں ہٹنا چاہیے۔ اِس سطح پر عدل کی پاس داری بھی تقویٰ ہے۔ چنانچہ' دیکھیے' قرآنِ مجید میں عدل کا یہ معیار اور اس پر عمل 'أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ' (المائدہ ۵: ۸) قرار پاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حقوق و فرائض، حلال و حرام اور معیشت و معاشرت میں واضح حدود متعین کی ہیں۔ ان حدود سے تجاوز کو 'عدوان' یعنی سرکشی قرار دیا اور ان کی پاس داری اور زندگی کے شب و روز میں' خوفِ خدا کے ساتھ' معاملات انجام دینے کو تقویٰ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ بات اُس آیت میں بہت صراحت سے بیان ہوئی ہے' جس میں عدوان اور تقویٰ کے الفاظ تقابل کے اسلوب میں آتے ہیں:

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ	"اور تم نیکی اور تقویٰ میں تعاون
وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔	کرو اور گناہ اور تعدی میں تعاون
(المائدہ ۵: ۲)	نہ کرو۔"

یہی بات مسجدِ ضرار کے ساتھ مسجدِ نبوی کے تقابل سے واضح ہوتی ہے۔ مدینہ میں کچھ لوگوں نے اسلام کو نقصان پہنچانے' کفر کو تقویت دینے' اہلِ ایمان کے درمیان پھوٹ ڈالنے' اور ان لوگوں کو ایک اڈا فراہم کرنے کی غرض سے' ایک مسجد بنائی' جو دین کے خلاف برسرِ پیکار ہو گئے تھے۔ جب یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی تو یہ لوگ وضاحتیں پیش کرنے لگے کہ ہم بھلائی ہی کا ارادہ رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اِس مسجد کی اس حیثیت کو واضح کرتے ہوئے حضور کو اس میں نماز پڑھانے سے منع کر دیا اور کہا کہ وہ مسجد جس کی بنیاد' اوّل روز ہی سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے' اُسی کا حق ہے کہ تم اس میں نماز کے لیے قیام کرو (التوبہ ۹: ۱۰۷-۱۰۸) گویا' دین کے ساتھ وابستگی میں خلوص' اہلِ دین کے ساتھ خیر خواہی اور دین کے فروغ و استحکام کا جذبہ' یہ سب تقویٰ ہی کے مظاہر ہیں۔

حدیبیہ کے موقع پر کفارِ مکہ نے، صرف اپنی جاہلانہ حمیت کے باعث، مسلمانوں کو کعبہ میں حاضری کے لیے راستہ نہ دیا اور بہت ہی توہین آمیز اور اشتعال انگیز رویہ اختیار کیا۔ اُس وقت مسلمان ایک مضبوط گروہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اگر وہ جواب دینا چاہتے، تو انھیں اِس کی پوری قوت حاصل تھی لیکن، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت، اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور دین کے ساتھ اپنی وابستگی پر قائم رہے اور اس کا اظہار، 'میں راضی ہوں اللہ تعالیٰ کی آقائی سے، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت اور ایک دین کی حیثیت میں اسلام سے'، کے خوب صورت الفاظ میں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اِس اظہارِ ایمان واعتماد کو قرآنِ مجید میں کلمۂ تقوٰی سے تعبیر کیا ہے (فتح ۴۸: ۲۶)۔

سورۂ بقرہ میں بڑی تفصیل کے ساتھ یہود کے جرائم بیان ہوئے ہیں۔ اِن میں ہاروت ماروت کے آنے اور اس ضمن میں یہود کی فتنہ پسندی اور ایسے اعمال سیکھنے کی طرف رغبت کا ذکر ہوا ہے، جن کے ذریعے سے وہ خاندانوں میں منافرت ڈال سکیں، یا اس طرح کے دوسرے منفی فوائد حاصل کر سکتے ہوں۔ اس سلسلۂ بیان کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوا ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ۔ (البقرہ ۲: ۱۰۳)	'اور اگر وہ ایمان لاتے اور تقوٰی اختیار کرتے، تو اللہ کا ثواب ان کے لیے کہیں بہتر تھا۔'

یہاں تقوٰی اُن سفلی اعمال سے گریز کے لیے آیا ہے، جن کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے۔ قرآنِ مجید میں، عام طور پر، ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ کا ذکر ہوتا ہے لیکن اس آیت میں ایمان کے ساتھ تقوٰی کا ذکر ہوا ہے، جس سے، اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اعمالِ صالحہ اختیار کرنا یا تقوٰی کی روش اپنانا، ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔

قرآنِ مجید، حدودِ الٰہی کے قائم رکھنے اور ان پر قائم رہنے کے لیے، اسلامی سزاؤں کا نفاذ ضروری قرار دیتا ہے۔ مطلب یہ کہ یہ سزائیں صرف امن وامان کے قیام اور عدل وانصاف کے نفاذ ہی کا ذریعہ نہیں، بلکہ ان سے افراد کے تزکیہ اور تربیت میں بھی مدد ملتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآنِ مجید نے قصاص کا قانون بیان کرتے ہوئے اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ، جہاں یہ فرمایا کہ قصاص کے ذریعے سے تم اجتماعی زندگی کے تحفظ کا سامان کرو گے، وہاں یہ وضاحت بھی فرما دی کہ اس قانون کے نفاذ کا یہ نتیجہ بھی نکلے گا کہ تم حدودِ الٰہی کی پاس داری، یعنی تقوٰی کی روش پر چلنے والے بن جاؤ (البقرہ ۲: ۱۷۹)۔

روزہ' ایک اہم عبادت ہے۔ یہ انسان کی تربیت کرتا ہے کہ وہ اپنے جذبات اور خواہشات پر قابو پانا سیکھ لے۔ اور یہی تربیت 'اسے زندگی کے مختلف مراحل میں' حدود الٰہی کی حفاظت اور اللہ کی شریعت پر عمل کرنے میں' مدد دے سکے۔ قرآنِ مجید میں روزے کا یہی مقصد 'لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ' تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو' کے الفاظ میں بیان ہوا ہے (البقرہ ۲: ۱۸۳)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں اقتدار حاصل ہو گیا تو انھیں کفارِ مکہ کی زیادتیوں کا جواب برابر کی سطح پر دینے کی ہدایت کی گئی۔ لیکن اس میں یہ شرط بھی رکھ دی کہ وہ تقویٰ کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے (البقرہ ۲: ۱۹۴)۔ یہ بات واضح ہے کہ بدلہ لینے میں تقویٰ سے مراد اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ اپنے حق سے تجاوز نہ کیا جائے۔ اور کارروائی اسی حد تک محدود رہے' جس حد تک' فریق مخالف کی طرف سے زیادتی ہوئی ہے۔

سورۂ مائدہ میں حکم دیا گیا ہے کہ ان پاکیزہ چیزوں کو حرام نہ ٹھہراؤ' جو خدا نے تمھارے لیے جائز کی ہیں اور نہ اس کی قائم کردہ حدود سے تجاوز کرو' اس لیے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے۔ حلال و طیب چیزوں کو برتو اور ان سے فائدہ اٹھاؤ اور اس کا تقویٰ اختیار کرو' جس پر تمھارا ایمان ہے (۵: ۸۷۔ ۸۸)۔ ان آیات سے' واضح طور پر' شریعت کے حلال اور حرام اور ممنوع اور جائز امور میں شریعت کی پوری پوری اتباع 'تقویٰ' قرار پاتی ہے۔ یہی حقیقت' ان آیات سے بھی سامنے آتی ہے' جن میں طلاق کا قانون اور مطلقہ کے حقوق بیان ہوئے ہیں۔ یہاں بھی اس قانون پر عمل اور مطلوبہ حقوق پورے پورے ادا کرنے کے لیے 'تقویٰ' ہی کا لفظ اختیار کیا گیا ہے۔

قرآنِ مجید کے ان چند مقامات کے مطالعے سے یہ بات ایک متعین حقیقت کی حیثیت سے سامنے آتی ہے کہ اپنی زندگی خدا اور رسول کی دی ہوئی ہدایت کے مطابق بسر کرنا، دین کے احکام پر عمل کرنے میں پورے آداب کا خیال رکھنا' معیشت و معاشرت میں شریعت کی قائم کردہ حدود سے تجاوز نہ کرنا اور دین سے خلوص اور خیر خواہی کے ساتھ وابستہ رہنا، غرض یہ کہ تمام تقاضوں کے ساتھ مسلمان بن جانا' اسی کا نام تقویٰ ہے۔

اہلِ تقویٰ کی صفات

اس سے پہلے' ہمارے پیشِ نظر قرآنِ مجید کے وہ مقامات رہے' جن میں دین و شریعت کے مختلف احکام بیان کرتے ہوئے' صفتِ تقویٰ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ آئندہ سطور میں ہم ان آیات

کو بنیاد بنائیں گے، جن میں اہلِ تقویٰ کی صفات بیان ہوئی ہیں، تاکہ قرآنِ مجید کا مدعا پوری طرح واضح ہو جائے۔

سورۂ بقرہ میں یہودیوں کے ایک رجحان کا ذکر کرتے ہوئے جو، سرتاسر ظاہر پرستی پر مبنی تھا، سچی خدا پرستی، حقیقی نیکی اور وفاکیشی کی وضاحت کی گئی ہے۔ یہود یہ سمجھتے تھے کہ عبادت میں کسی خاص رُخ یا سمت کو اختیار کرنا بڑی اہمیت کی چیز ہے یہاں تک کہ دین، انبیا اور پروردگار کے ساتھ بندے کی تمام تر وفاداری اسی پر منحصر ہے۔ قرآنِ مجید نے واضح کیا کہ مشرق یا مغرب کی سمتوں میں دین داری نہیں۔ خدا کے مخلص بندے تو وہ ہیں جو اللہ پر حقیقی ایمان کی نعمت سے مالا مال، آخرت میں سچا یقین رکھتے اور فرشتوں، کتابوں اور نبیوں کو صدقِ دل سے مانتے ہیں۔ انھیں بھی مال و دولت اگرچہ عزیز تو ہوتی ہے، مگر یہ لوگ، اس کے باوجود اپنے عزیزوں یا رشتے داروں، یتیموں بے آسرا لوگوں مسافروں اور سائلوں کی مدد کرنے میں خرچ کرتے ہیں۔ قرآنِ مجید کے نزدیک، اس معاملے میں، وہ لوگ خاص مقام رکھتے ہیں جو مالی مشکلات، جسمانی تکالیف اور جنگ و جدال جیسی صورتوں میں دین پر استقامت کے ساتھ عمل کرتے ہیں۔ یہ عقائد و اعمال، یہ سیرت و کردار اور یہ عزم و استقامت، وہ اعلیٰ محاسن ہیں، جن سے ایک بندۂ مومن کی تصویر کے خدوخال نمایاں ہوتے ہیں (البقرہ ۲: ۱۷۷)۔

سورۂ آلِ عمران میں، اہلِ تقویٰ کی چند دوسری خصوصیات بیان ہوئی ہیں۔ اوپر سورۂ بقرہ کے پیشِ نظر حصے میں اہلِ تقویٰ کے وہ محاسن بیان ہوئے جو ذاتی زندگی سے متعلق ہیں۔ جبکہ سورۂ آلِ عمران میں اُن خوبیوں کا ذکر ہوا ہے، جو معاشرے کے ساتھ بندۂ مومن کے دینی تعلق کے حوالے سے سامنے آتی ہیں۔ مطلب یہ کہ اہلِ تقویٰ نہ صرف یہ کہ اللہ پر ایمان اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں، بلکہ وہ اپنے ماحول میں بھلائی کے کاموں کی ہدایت دیتے، بُرے اعمال سے روکتے اور اچھے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں (۳: ۱۱۴-۱۱۵)۔ اسی سورہ میں اہلِ ایمان سے فرمایا: اپنے رب کی بخشش اور وہ جنت پانے کی کوشش کرو، جس کی وسعت اس زمین اور ان آسمانوں کے برابر ہے، اور جو صرف اہلِ تقویٰ کو حاصل ہوگی، وہ اہلِ تقویٰ جو اچھے اور برے، ہر طرح کے حالات میں، خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے، اپنے غصے کو ضبط کرنے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں (۳: ۱۳۳-۱۳۴)۔ سورۂ قصص میں فرمایا: آخرت کا گھر اُن لوگوں کے لیے ہے، جو زمین میں تکبر اور فساد کے چاہنے والے نہیں ہیں۔ اور یہ اہلِ تقویٰ کا انجام ہے (۲۸: ۸۳)۔ سورۂ ذاریات میں فرمایا: جنت کے باغ اور چشمے اہلِ تقویٰ کے لیے ہیں۔ یہ ان میں اپنے رب کی بخششوں

سے لطف اندوز ہوں گے' اس لیے کہ یہ خوب کار تھے' راتوں کو کم ہی سوتے تھے' صبح دم استغفار کرنے والے' اور ان کے مالوں میں سائل اور محروم کا حق متعین تھا (۵۱: ۱۵-۱۹)۔

دیکھ لیجیے' یہاں بھی وہی دین اور اسی کے مختلف پہلو ہیں جن پر عمل اور جس کے تقاضے' کماحقہ' پورے کرنے والے' قرآن مجید کے نزدیک' اہل تقویٰ ہیں۔ کچھ خاص ورد اور وظیفے' رہن سہن میں ایک طرح کی مسکینی و بے چارگی' لباس میں بے توجہی اور طعام میں بے رغبتی یا پھر تجرد اور گوشہ نشینی کی زندگی' ان میں سے کوئی چیز بھی یہاں بیان نہیں ہوئی۔ گویا' یہ قرآن مجید میں بیان کیے گئے دین اور تصور تقویٰ میں کسی درجے میں بھی مطلوب نہیں۔

احادیث میں تقویٰ کا بیان

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر بڑی خوبی کے ساتھ اس کی وضاحت فرمائی کہ دین پر عمل کرنے میں صحیح رویہ کیا ہے اور دینی زندگی کس طرز عمل کا نام ہے۔ ہمارے دین میں کچھ چیزیں حرام' اور کچھ چیزیں حلال قرار دی گئی ہیں۔ باقی کے معاملے میں صراحت کا طریقہ اختیار نہیں کیا گیا۔ چنانچہ ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی متعین ہے اور ان کے درمیان کچھ چیزیں مشتبہ ہیں' جن کے بارے میں ہر آدمی یقین کے ساتھ کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ لہٰذا جس کے بارے میں شبہ ہو کہ یہ چیز حرام ہو سکتی ہے' اس سے بچو۔ یہ طریقہ اختیار کرنے والا اپنے دین اور اپنی آبرو کو بچا لیتا ہے' اور شبہات کا ارتکاب کرنے والا ایک لحاظ سے حرام کا مرتکب ہو جاتا ہے' اس لیے کہ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کسی دوسرے کی چراگاہ کے کنارے کنارے اپنے گلے کو چرانے لگے۔ زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ اس کا گلہ دوسرے کی چراگاہ کی حد میں داخل ہو جائے گا۔ یاد رکھو' ہر بادشاہ کی ایک اپنی چراگاہ ہوتی ہے' یاد رکھو' اللہ کی چراگاہ اس کی حرام کی ہوئی چیزیں ہیں (مسلم' کتاب المساقاۃ)۔ چراگاہ کی اس تمثیل سے آپ نے وہ حد متعین کر دی' جو ہمارے دین میں مطلوب ہے اور جسے قرآن مجید نے تقویٰ کے لفظ میں بیان کیا ہے۔ مطلب یہ کہ ایک صاحب تقویٰ صرف محرمات ہی سے نہیں بچتا' وہ ان چیزوں سے بھی گریز کرتا ہے جو' اگرچہ' بصراحت تو ممنوع قرار نہیں دی گئیں' لیکن اسے ان پر عمل کرنا ٹھیک معلوم نہیں ہوتا۔

ایک صحابی' وابصہ بن معبدان رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ نیکی اور گناہ کی حقیقت کیا ہے؟ آپ نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا: اپنے دل سے پوچھو' اپنے نفس سے سوال

کرو اور آپ نے یہ بات تین بار دہرائی۔ پھر فرمایا: نیکی وہ ہے جس پر تمھارے دل کو اطمینان اور تمھارے نفس کو طمانیت حاصل ہو۔ اور گناہ وہ ہے جس پر تمھارے نفس میں خلش اور سینے میں الجھن محسوس ہو، اگرچہ لوگوں نے اس کے جواز کا فتویٰ دے دیا ہو۔ آپ نے اپنی اس گفتگو میں بھی اسی حقیقت کو واضح کیا ہے، جو اوپر والی حدیث میں بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ حضور کے ایک دوسرے ارشاد کے مطابق، دراصل سچائی طمانیت بخشتی اور جھوٹ تردد میں ڈالتا ہے (ترمذی کتاب صفۃ القیامہ)۔ اس وجہ سے ایک بندۂ مومن اس باب میں، اس قدر حساس ہو جاتا ہے کہ وہ ان چیزوں کو بھی چھوڑ دیتا ہے جن میں بظاہر کوئی حرج نظر نہیں آتا لیکن، وہ محسوس کرتا ہے کہ اس چیز کا ارتکاب کہیں اسے معصیت کی طرف نہ لے جائے۔

غایتِ احتیاط کے تقاضے اور وسوسوں کا شکار ہونا دو مختلف رویے ہیں۔ احتیاط کا دامن اس توازن کے ساتھ تھامنا چاہیے کہ آدمی رہبانیت کی راہ نہ اختیار کر لے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک آدمی نے پوچھا کہ مجھے بعض کھانے الجھن میں ڈالتے ہیں۔ اسی طرح کی ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے نصاریٰ کے کھانوں کے بارے میں سوال کیا تھا (ترمذی، کتاب السیر)۔ بہر حال، آپ نے جواب میں فرمایا: تمھارے دل میں اس طرح کا کوئی خلجان نہیں ہونا چاہیے، جس کی نصرانیت (رہبانیت) کے ساتھ مشابہت ہو (سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمہ)۔ وہ متوازن راستہ جس پر ایک صاحبِ تقویٰ کو چلنا چاہیے، وہ یہی ہے کہ وہ معصیت سے بچے اور اس طرح بچے کہ ان چیزوں کو بھی چھوڑ دے، جن کے بارے میں اس کا گمان ہو کہ انھیں اختیار کرنا غلط ہو گا لیکن وسوسوں اور وہموں سے بھی بچے، اس لیے کہ احتیاط کے ساتھ جب وسوسہ مل جاتا ہے، تو رہبانیت وجود میں آجاتی ہے۔ جس طرح دین میں یہ پسندیدہ نہیں کہ آدمی حدودِ الٰہی کے معاملے میں غیر محتاط ہو، اسی طرح یہ بھی مطلوب نہیں کہ وہ راہبانہ رنگ اختیار کرے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غایتِ احتیاط کی تعلیم دی ہے، وہاں اس بات کی بھی پوری طرح تردید کی ہے کہ آدمی زندگی کے تقاضوں سے گریزاں ہو۔ ایک صحابی، عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے آپ سے خصی ہونے کی اجازت چاہی۔ آپ نے بہت سخت جواب دیا۔ فرمایا: وہ ہم میں سے نہیں جس نے خصی کیا یا خصی ہوا میری امت میں اس کی جگہ پر روزے ہیں۔ اس پر انھوں نے سیاحت یعنی اللہ کی طلب میں نکل جانے کی اجازت طلب کی۔ آپ نے فرمایا: میری امت کی سیاحت جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ انھوں نے ترکِ دنیا کی اجازت مانگی، تو آپ نے فرمایا کہ مسجد میں بیٹھ کر نماز کا انتظار کرنا میری امت کے لیے ترکِ دنیا ہے (مسند احمد، ج ۲ ص ۱۷۳)۔ دیکھیے، آپ نے کس خوبی کے ساتھ دین کا یہ پہلو نمایاں

کیا ہے کہ قرآن و سنت میں دیے گئے احکام اور انھی کے تقاضے پورے کرنے سے نیکی اور تقویٰ کا وہ معیار حاصل ہو جاتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔ ایک دفعہ آپ نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ تم دن میں روزے رکھتے اور رات کو قیام کرتے ہو۔ انھوں نے کہا کہ حضور معاملہ یہی ہے۔ آپ نے فرمایا: یوں نہ کرو۔ کبھی روزہ رکھو اور کبھی نہ رکھو۔ رات کو نماز تہجد پڑھو، لیکن سوؤ بھی، اس لیے کہ تمھاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے، تمھاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے اور تمھارے مہمان کا بھی تم پر حق ہے (بخاری، کتاب الصوم)۔ اس طرح، آپ نے اس رویے کی تردید کی کہ کوئی مسلمان زہد و عبادت کی طرف اس طرح راغب ہو جائے کہ اس کے نتیجے میں عام زندگی کے تقاضے مجروح ہو جائیں۔

بعض لوگوں کے نزدیک، یہ بات تقویٰ کے منافی ہے کہ وہ رخصت کے طریقے پر عمل کریں یا مباحات سے فائدہ اٹھائیں۔ مشکل راستہ اختیار کرنا ہی ان کی رائے میں شانِ تقویٰ کا تقاضا ہوتا ہے۔ ایک دفعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی کام کیا، لیکن بعد میں لوگوں کو اس میں رخصت دے دی۔ بعض لوگوں نے اس بات سے گریز کیا کہ وہ اس رخصت سے فائدہ اٹھائیں۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں یہ بات آئی، تو آپ نے خطاب فرمایا۔ حمد و ثنا کے بعد کہا، بعض لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اس کام سے احتراز کرتے ہیں، جسے میں کرتا ہوں۔ بخدا، میں ان سے زیادہ خدا کو جانتا اور ان سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں (بخاری، کتاب الادب)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم، بالعموم، یہ ہدایت فرمایا کرتے تھے: اپنے اوپر سختی مت کرو کہ اللہ بھی تم پر سختی کرنے لگے۔ ایک قوم نے اپنے اوپر سختی کی۔ یہ انھی کی یادگاریں ہیں، جو کلیساؤں اور گرجوں میں موجود ہیں۔ اس پر آپ نے یہ آیت بھی پڑھی: 'وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ' (الحدید ۵۷:۲۷) 'یہ رہبانیت ان کی خود ساختہ ہے۔ ہم نے اسے ان پر لازم نہیں کیا تھا۔' اصل میں، نہ مباحات سے فائدہ اٹھانے میں اور نہ رخصتوں پر عمل کرنے میں بے پروائی ہونی چاہیے، اور نہ یہ صورت پیدا ہو جانی چاہیے کہ آدمی مباحات سے احتراز کرنے لگے اور رخصت پر عمل کرنے کو معمولی سمجھنے لگے۔ پہلی چیز آدمی کو اس خطرے سے دوچار کر دیتی ہے کہ وہ معصیت میں مبتلا ہو اور اس سے گناہ کا ارتکاب ہو جائے۔ اور دوسری چیز، درحقیقت، دین کے ساتھ زور آزمائی ہے اور اس کا نتیجہ صرف یہی نکل سکتا ہے کہ آدمی پچھڑ جائے اور اس کی کمر ٹوٹ جائے۔ ازواجِ مطہرات علیہن السلام کے پاس کچھ لوگ، آپ کی عبادت کا حال پوچھنے کے لیے آئے۔ جب انھیں بتایا گیا، تو ان کا تاثر

کچھ ایسا تھا کہ گویا، حضور کچھ زیادہ عبادت نہیں کرتے۔ اور پھر یہ خیال ظاہر کیا کہ ہمارا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا مقابلہ، ان کے تو اگلے اور پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے گئے ہیں۔ چنانچہ ایک نے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ میں آئندہ رات بھر عبادت کیا کروں گا۔ دوسرا بولا: میں ہمیشہ روزے رکھوں گا اور تیسرے نے کہا کہ میں عورتوں سے کنارہ کشی اختیار کروں گا اور کبھی کسی خاتون کو بیاہ کر نہ لاؤں گا۔ اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ تم لوگ ہو جو اس طرح کے ارادے باندھ رہے تھے۔ بخدا، میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا اور تم سے زیادہ اس کا متقی بندہ ہوں لیکن، روزہ بھی رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا۔ (رات کو) نماز پڑھتا ہوں، لیکن سوتا بھی ہوں۔ اور شادی بھی کرتا ہوں، تو جس نے میرا طریقہ چھوڑا وہ میری امت میں شامل نہیں (بخاری، کتاب النکاح) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ اسی طرح آپ سے بنی اسرائیل کے دو لوگوں کے بارے میں سوال کیا گیا۔ ان میں سے ایک عالم دین تھا۔ فرض نماز پڑھتا، وعظ و ارشاد کے لیے بیٹھ جاتا اور لوگوں کو بھلائی کی تعلیم دیتا تھا اور دوسرا دن میں روزے رکھتا اور رات کو نماز پڑھتا تھا۔ آپ بتائیے کہ ان میں سے افضل کون ہے؟ آپ نے جواب میں فرمایا: جس طرح تمھارے کسی ادنیٰ آدمی پر مجھے فضیلت حاصل ہے، وہی فضیلت اُس آدمی کو جو فرض نماز پڑھ کر بھلائی کی تعلیم دیتا ہے، دوسرے پر حاصل ہے۔ آپ نے ہر موقع پر یہی حقیقت بیان کی کہ دینی زندگی یا دوسرے الفاظ میں تقویٰ کا تقاضا اس کے سوا کچھ نہیں کہ آدمی دینی اور دنیوی ذمہ داریاں ایک توازن کے ساتھ ادا کرے۔ کبھی آپ نے انفرادی اور معاشرتی حقوق و فرائض کی نشان دہی کی اور عبادت کے ساتھ ان کی پاس داری کو بھی ضروری قرار دیا، اور کبھی دوسری دینی ذمہ داریوں کی طرف اشارہ کر کے ان کی اہمیت کو واضح کیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رات کی ایک گھڑی میں علم کا مذاکرہ تمام رات کی عبادت سے بہتر ہے (سنن دارمی، مقدمہ)۔ اسی طرح عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آپ مسجد میں آئے تو دیکھا کہ دو ٹولیاں جمی ہوئی تھیں۔ آپ ان کے پاس سے گزرے تو فرمایا، دونوں بھلائی پر ہیں، لیکن ایک دوسری سے افضل ہے۔ یہ عبادت میں مصروف ہیں، اپنے پروردگار کو یاد کرتے، اس کی طلب میں لگے ہوئے ہیں، اور یہ دوسرے دین کا علم سیکھنے میں مصروف ہیں، اور انھیں جو اس سے واقف نہیں سکھا رہے ہیں۔ آپ نے انھیں افضل قرار دیا۔ یہ کہہ کر وہیں بیٹھ گئے کہ میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں (دارمی، مقدمہ)۔ مطلب یہ کہ دینی زندگی صرف زہد و عبادت ہی کا نام نہیں، دین سیکھنے اور سکھانے کا کام اس سے زیادہ افضل اور وقیع ہے۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک شخص

کی عبادت اور ذکرِ الٰہی میں سرگرمی اور دوسرے شخص کے حرام سے اجتناب اور مشتبہات سے گریز کا ذکر کیا گیا۔ آپ نے فرمایا: پرہیزگاری سے تقابل نہ کرو (ترمذی، کتاب صفۃ القیامہ)۔ گویا حضور کے نزدیک، زندگی کے شب و روز میں حرام و حلال میں امتیاز اور احتیاط کو عبادت میں اشتغال سے زیادہ اہمیت حاصل ہے (ترمذی، کتاب صفۃ القیامہ)۔ ایک شخص نے آپ کے سامنے بیان کیا کہ ایک بی بی بہت عبادت گزار ہے۔ اس کے روزے، نماز اور خیرات کی بڑی دھوم ہے لیکن وہ پڑوسیوں کے ساتھ بدزبانی کرتی ہے۔ حضور نے فرمایا: جہنم میں پڑے گی۔ اس نے کہا: حضور، فلاں نماز، روزے اور صدقات میں تو کم ہے، لیکن ہمسایوں کے ساتھ بدزبانی نہیں کرتی۔ آپ نے فرمایا: جنت میں داخل ہوگی (ترمذی، کتاب صفۃ القیامہ)۔ غرض یہ کہ اخلاقِ حسنہ کو، خدا کے ہاں اتنی اہمیت حاصل ہے کہ وہ عبادت کی کمی کو بھی پورا کر دیں گے، لیکن بداخلاقی اتنی قبیح چیز ہے کہ عبادت و ریاضت کی کثرت بھی پلڑے کو جھکا نہ سکے گی۔

درحقیقت، تقویٰ میں اصل شے جس کا اہتمام مطلوب ہے، وہ زندگی کو دین کے سانچے میں ڈھال لینا ہے۔ کوئی شخص کتنی ہی عبادتیں کرے، اس وقت تک تقویٰ کا مقام حاصل نہیں کرسکتا، جب تک حلال و حرام میں امتیاز اور حقوق و فرائض کے ادا کرنے میں دین کی دی ہوئی ہدایات پر بھی، اسی سرگرمی سے عمل نہیں کرتا، جس سرگرمی کے ساتھ وہ عبادات میں مشغول رہتا ہے۔ ہاتھ میں لٹکتی ہوئی تسبیح، ٹخنوں سے اونچا ازار، لمبی ڈاڑھی۔ ترشے ہوئے لب، صورت کی مسکینی، لب و لہجے کی عاجزی، قیام و قعود میں اظہارِ خشیت و نمایشِ تقویٰ، یہ سب بے معنی ہیں، اگر باقی زندگی حدودِ الٰہی کے احترام میں نہیں گزرتی۔

ایک شخص، اگر اپنے گھر کے ایک کونے میں چراغ رکھ دے، یہ تو ضرور ہے کہ وہ کونا بہت روشن نظر آئے گا، لیکن اس کا نتیجہ یہ بھی نکلے گا کہ باقی گھر کم روشن اور بعض کونے بالکل تاریک ہوں گے۔ لیکن، اگر یہی چراغ گھر کی مرکزی جگہ پر رکھ دیا جائے، تو جو کچھ بھی روشنی ہوگی، وہ سارے گھر کو منور کردے گی۔ تقویٰ کا چراغ دل میں رکھنے کی چیز ہے، اسے دل کے طاق سے اتار کر جسم کے کسی گوشے میں رکھ دینا، ظاہر ہے کہ منفی نتائج ہی پیدا کرے گا۔ اسی حقیقت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کرکے 'التقویٰ ھٰھنا'، 'تقویٰ یہاں ہے' کے الفاظ بار بار دہرا کر واضح کیا ہے۔

یہی تقویٰ ہے، جو قدموں کو جادۂ حق پر گامزن رکھتا، جو دل کو غلط نہیں سوچنے دیتا، جو آنکھوں کو وہی دیکھنے دیتا ہے، جو دیکھنا درست ہے، کانوں کو وہی سننے دیتا ہے، جو سننا درست ہے اور

زبان کو وہی بولنے دیتا ہے، جو بولنا درست ہے، جو ہاتھوں کو باندھتا اور پاؤں کی زنجیر بن جاتا ہے کہ غلط سمت میں اُٹھنے اور چلنے سے بچ جائیں، اور بطن و فرج پر پہرے بٹھا دیتا ہے کہ کسی حرام چیز کو حلال نہ کرلیں۔

قرآنِ مجید نے اسی تقویٰ کے لیے ایک جگہ لباس کی تعبیر اختیار کی ہے۔ لباس، سردی اور گرمی سے بچاتا اور زیب و زینت اور جمال بخشتا ہے۔ اسی طرح تقویٰ برائیوں سے بچاتا اور انسانی شخصیت کو وقار اور نکھار عطا کرتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تمھیں اللہ کے تقویٰ کی تلقین کرتا ہوں، اس لیے کہ یہ تمھارے سارے معاملات کو چمک اور روشنی بخشتا ہے (مسندِ احمد، ج ۲ ص ۲۲۵) یہی وہ تقویٰ ہے جو انسان کی جلوت اور خلوت میں نمایاں ہونا چاہیے۔ آپ کا ارشاد ہے، میں تمھیں جلوت اور خلوت میں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہوں (مسند احمد، ج ۵ ص ۱۸۱)۔

تقویٰ کی تعلیم

انبیا علیہم السلام جب اپنے زمانے کی فسق و فجور سے بھری ہوئی دنیا پر نظر ڈالتے اور انسان کی خدا سے بغاوت و سرکشی اور شہواتِ نفس کی پیروی میں آزاد روی پر غور کرتے ہیں، تو ان پر خدا کی رہنمائی میں یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ اس کے اسباب تین ہیں:

پہلا یہ کہ خدا اور اس کی صفات کے بارے میں تصورات غلط ہو گئے ہیں۔

دوسرا یہ کہ آخرت کی زندگی کے بارے میں یا تو کوئی واضح تصور موجود نہیں، اور اگر ہے، تو اس میں بہت کچھ غلط کی آمیزش ہے۔

تیسرا یہ کہ شریعت کا علم یا تو مٹ گیا ہے، یا اس کی صورت اور احکام میں بہت کچھ تبدیلیاں کر دی گئی ہیں جس کے نتیجے میں شریعت کی شکل و ہیئت بدل کر رہ گئی ہے۔

چنانچہ انبیا ان تینوں خرابیوں کی اصلاح پر کمربستہ ہو جاتے ہیں اور ساری سعی انھی کی درستی اور انھی کی تجدید میں صرف کرتے ہیں۔ ان کا یہ اصلاحِ فکر و عمل کا کام جس رفتار سے مؤثر ہوتا ہے، اسی رفتار سے معاشرے میں تقویٰ فروغ پاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ دنیا سے رخصت ہوتے ہیں، تو اپنے پیچھے متقیوں کا ایک ایسا گروہ چھوڑ جاتے ہیں، جو مدتوں تقویٰ کی حرارت لوگوں میں باقی رکھتا ہے۔

قرآنِ مجید نے بیشتر انبیا کی دعوت اور ان کے احوال کا ذکر کیا ہے۔ اس کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرات انبیا علیہم السلام کشتِ دل میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی صفات

کے صحیح شعور کی آب یاری کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ اس کائنات کا ایک ہی مالک، ایک ہی پروردگار، ایک ہی آقا اور ایک ہی خالق ہے۔ اسی کی تدبیر امور سے یہ کارخانۂ ہستی رواں دواں ہے۔ وہ سراپا عدل ہستی ہے۔ وہی سزاوارِ پرستش ہے۔ اسی کا حق ہے کہ اس کے لیے سرِ نیاز جھکایا جائے۔ یہ صرف وہی ذات ہے کہ انسان اس کے حضور اپنی پیشانی زمین پر ٹکا دے۔ اطاعت صرف اسی کی ہونی چاہیے۔ وہ جیسا کہے، ویسا کیا جائے۔ جس سے روک دے اس سے رک جانا چاہیے۔ اس کا کوئی ساجھی اور شریک نہیں، کسی کی مجال نہیں کہ اس کے فیصلوں میں کوئی تبدیلی کر سکے۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے، کرتا ہے۔ صرف اسی کی رضا اور اسی کی خوشنودی انسان کی زندگی کا مقصد ہونا چاہیے۔ ساری نمازیں، ساری قربانیاں، بلکہ جینا اور مرنا سب اسی کے لیے خاص ہونا چاہیے۔ سارے آداب، ساری نذریں، ساری دعائیں اور مناجاتیں اسی کے دربار میں پیش کی جائیں۔ معلوم رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ لطیف و خبیر ہے۔ وہ ڈھکے اور کھلے سے واقف ہے۔ وہ خلوت و جلوت سے آگاہ ہے۔ اس سے کوئی چیز چھپانی ممکن نہیں۔ وہ دلوں میں پیدا ہونے والے خیالات بھی جانتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اس نے انسان کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے شریعت اتاری ہے، جو زندگی کے شب و روز میں ہر ہر مرحلے کے لیے قاعدے اور ضابطے دیتی ہے۔ اور اسی کو حق حاصل ہے کہ وہ کوئی شریعت دے، اور یہ وہی ہے جس کی دی ہوئی شریعت پر بے چون و چرا عمل ہونا چاہیے۔

انبیا ذاتِ خداوندی کے بارے میں یہ ساری چیزیں بار بار واضح کرتے ہیں، تاکہ انسان جان لیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کیا ہیں اور ان کے تقاضے کیا ہیں۔ اسی طرح وہ عقیدۂ آخرت کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس کے بارے میں پیدا ہونے والے غلط عقائد کی تردید کرتے ہیں۔ وہ واضح کرتے ہیں کہ ایک ایسا دن آنے والا ہے، جب ساری نوعِ انسانی یکجا اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش ہوگی۔ ہر انسان کی زندگی کا ریکارڈ، جو ایک رجسٹر میں درج کیا جاتا ہے، اسے دے دیا جائے گا۔ ایک ایک آدمی کے اعمال جانچے جائیں گے۔ چنانچہ جس نے اپنی زندگی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایت کے مطابق گزاری ہوگی، اسے جنت میں جگہ دی جائے گی اور جس کی زندگی اس کے برعکس ہوگی، وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں پائے گا۔ وہ اس بات کی تردید کرتے ہیں کہ وہاں کوئی بے انصافی ہوگی یا سفارش اور رشوت سے فیصلے کو تبدیل یا نرم کرایا جا سکے گا۔ وہ واضح کر دیتے ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا پارسا، اور نبی اور رسول بھی وہاں اس پوزیشن میں نہیں ہوگا کہ اپنے کسی دوست اور کسی ساتھی کی ایسی سفارش کر سکے جو حق کو باطل اور باطل کو حق بنا دے۔ یہ صرف ہر فرد کا اپنا عمل ہے، جو اس کی زندگی بنائے گا اور یہ صرف

اس کے اپنے کرتوت ہیں جن کے نتیجے میں وہ ذلت و رسوائی کا سامنا کرے گا۔ اور عذاب کی ایسی زندگی سے دوچار ہوگا جس سے موت بہتر ہے اور موت قریب بھی نہیں آئے گی۔

عقیدے اور فکر کی تطہیر کے ساتھ ساتھ وہ لوگوں کو صحیح شریعت سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ٹھہرائی ہوئی حرمتیں اور حلتیں کیا ہیں۔ وہ سمجھاتے ہیں کہ پروردگار کا سکھلایا ہوا عبادت کا طریقہ کیا ہے۔ گھر میں، خاندان میں، محلے میں، شہر میں، ملک اور معاشرے میں، غرض زندگی کے ہر معاملے سے متعلق یہ تعلیم دیتے ہیں کہ اسے کس طرح انجام دیا جائے۔ ذاتی کاروبار ہو، یا ملک کی معیشت کا نظام، خاندان کے مسائل ہوں یا ریاست کا انتظام، تزکیۂ نفس پیشِ نظر ہو یا تطہیرِ معاشرہ ساری انسانی زندگی کو ذاتِ باری کے تابع فرمان بنا دیتے ہیں۔

جب یہ تینوں چیزیں صحیح بنیادوں پر استوار ہو جاتی ہیں تو انفرادی اور اجتماعی زندگی تقویٰ سے آراستہ ہو جاتی ہے۔ انسان اس جادۂ مستقیم پر گامزن ہو جاتا ہے جو پروردگار کا دیا ہوا ہے، جو ابدی فلاح کا ضامن ہے۔ یہی تقویٰ ہے جس کی دعوت تمام انبیا کی دعوت ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنی قوم سے کہا:

إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ۔ (الشعراء ۲۶: ۱۰۷-۱۰۸)

"میں تمھارے لیے رسولِ امین ہوں، اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔"

ترتیب منظور الحسن

"داعی کا مزاج تند و تیز نہیں، بلکہ محبت آمیز ہوتا ہے۔ بڑی سے بڑی قربانی پر بھی وہ معتدل رہتا اور امید کا دامن اپنے ہاتھ میں تھامے رکھتا ہے۔ اس کی زندگی کا ہر ہر لمحہ صبر و شکر سے عبارت ہوتا ہے۔ اپنی ناکامیوں اور راہ میں آنے والے مصائب سے آنکھیں چرانے کے بجائے وہ انھیں خندہ پیشانی سے جھیلتا ہے اور اللہ سے مدد کی دعا کرتا ہے۔ اپنی ناکامیوں اور کامرانیوں پر اظہارِ غرور و تکبر کے بجائے اس کا سر اللہ کے سامنے اظہارِ تشکر کے لیے جھک جاتا ہے۔"

اصلاح و دعوت

منظور الحسن

دِل کی میزان

صحابیِ رسول وابصہ بن معبد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ سے نیک روی اور گناہ گاری (بر و اثم) کے بارے میں دریافت کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا: اے وابصہ، کیا تم نیک روی اور گناہ گاری کی حقیقت پوچھنے آئے ہو؟ میں نے عرض کیا: ہاں، یارسول اللہ۔ آپ نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا: اپنے نفس سے پوچھو، اپنے دل سے سوال کرو، آپ نے یہ بات تین مرتبہ دہرائی۔ پھر آپ نے وضاحت فرماتے ہوئے کہا کہ نیک روی (بر) وہ ہے، جس پر تمھارا نفس مطمئن ہو، تمھارا دل اطمینان محسوس کرے۔ اور گناہ گاری (اثم) وہ ہے، جس پر تمھارے نفس میں خلش ہو اور تمھیں اپنے سینے میں الجھن محسوس ہو، اگرچہ، لوگوں نے اس کے جواز کا فتویٰ ہی دے دیا ہو۔ (مسند احمد بن حنبل)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر ایک میزان رکھ دی ہے۔ یہ میزان اس کا اپنا ضمیر ہے، اس کا اپنا دل ہے، اس کا اپنا نفس ہے۔ یہ میزان اتنی سچی ہے کہ اس کے فتوے کے بعد باہر سے کوئی فتویٰ حاصل کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ جو شخص اپنے قول و عمل اس ترازو میں تولتا رہتا ہے، اس کے لیے نیکی اور گناہ میں تمیز کرنا کچھ مشکل نہیں ہوتا، اور حق تو یہ ہے کہ جتنا کوئی شخص اس میزان سے کام لیتا ہے، گناہ اتنا ہی اس سے دُور ہوتا چلا جاتا ہے، اور جتنا اس سے صرفِ نظر کرتا ہے، اتنا ہی گناہ اس کے قریب چلا آتا ہے۔

گناہ کس سے نہیں ہوتے، لیکن اگر کوئی اپنے گناہ پر نادم ہوتا ہے، اپنے جرم پر شرمندہ ہوتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی میزان درست ہے، اس نے اپنے ضمیر کی عدالت کا دروازہ بند نہیں کیا، اپنے سازِ دل کی آواز کو منقطع نہیں ہونے دیا اور اپنے چراغِ نفس کی لَو کو بجھنے نہیں دیا۔ یہی وہ شخص ہے، نیکیاں جس کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہتی ہیں۔ ایسے شخص سے گناہ سرزد تو ہو

جاتے ہیں لیکن اپنے گناہوں پر وہ کبھی سرکش نہیں ہوتا، اپنی غلطیوں پر کبھی اکڑتا نہیں اور اپنی کوتاہیوں پر کبھی فخر نہیں کرتا۔

گناہ ہم سے قدم قدم پر سرزد ہوتے رہتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کوئی عمل کرنے سے پہلے اور کوئی بات کہنے سے پہلے، کبھی ہم نے اپنے دل سے اس کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں سوال کیا ہے؟ اپنے نفس کا اطمینان چاہا ہے؟ اگر ہم ایسا نہیں کرتے، تو کیا ہم مجرم نہیں؟

داعیانِ انقلاب کے لیے شرائط

اس ملک میں، اسلامی انقلاب کا مفہوم یہ ہے کہ اس کے پورے ریاستی نظام پر اللہ کا دین غالب ہو جائے یعنی اس ملک کی سیاست، معیشت، معاشرت، تعلیم و تعلم اور حدود و تعزیرات میں وہ تغیرات رونما ہو جائیں، جو قرآن و سنت کے 'منشا کے عین مطابق اور اس ملک کے شہریوں کی تمناؤں کے عکاس ہوں۔ ہر شخص اس انقلاب کی تڑپ اپنے اندر رکھتا اور اس کے لیے جدوجہد میں اپنی صلاحیتوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے ہر وقت تیار نظر آتا ہے لیکن انسانوں کے مزاج و طبائع میں تضاد اور ان کی صلاحیتوں اور ان کے حالات کا تفاوت اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ ہر شخص اس انقلاب کی تڑپ اپنے دل میں رکھنے کے باوجود اس کے لیے جدوجہد میں عملی طور پر شریک نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ جو لوگ بھی اس انقلاب کا عزم لے کر اٹھیں، انھیں، لازمی طور پر، ان چند مراحل سے گزرنا چاہیے:

ایک یہ کہ وہ اپنے آپ کو اپنی صلاحیتوں کی ترازو میں اچھی طرح تول کر دیکھ لیں کہ آیا وہ یہ کام کرنے کی اہلیت، رکھتے ہیں یا نہیں۔ ان کا ذوق، ان کا مزاج اور ان کے حالات، کیا اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ اپنے عزم کے تقاضوں کو نبھا سکیں گے اور اس انقلاب کی جدوجہد میں آنے والے تمام آلام و مصائب خندہ پیشانی سے جھیل سکیں گے۔

دوسرے یہ کہ اللہ کا دین اُن کی زندگیوں میں اس طرح جاری و ساری ہو جائے کہ وہ اس انقلاب کا عملی نمونہ بن کر کھڑے ہو جائیں جس کا نعرہ وہ لے کر اُٹھے ہیں۔ ان کے اخلاق، کردار اور سیرت کے بارے میں اُنھیں جاننے والا ہر فرد اس بات کی گواہی دے کہ اُن کے قول و عمل میں کوئی تضاد نہیں، وہ ہمیشہ حق بات کہتے اور حق ہی کی سربلندی کے لیے ہمہ وقت کوشاں نظر آتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ وہ ان انقلابی تغیرات کے بارے میں پوری بصیرت رکھتے ہوں جنھیں وہ اس ملک میں برپا کرنا چاہتے ہیں یعنی انھیں معلوم ہو کہ رسول اللہ کے بتائے ہوئے طریقے پر اگر خلافت قائم ہوئی تو اس میں قرآن وسنت کو کس طرح ریاست کے تمام نظام پر بالادستی حاصل ہو جائے گی، کس طرح ایسا ڈھانچہ وجود میں آئے گا کہ حکمران کی زندگی اور ایک عام آدمی کی زندگی میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا اور کس طرح عوام کی رائے پورے نظام کو چلانے میں بنیادی کردار ادا کرے گی۔

وہ اچھی طرح جانتے ہوں کہ سودی نظام کی لعنت کو اس کی جڑوں سے اکھاڑ کر کون سا متبادل معاشی نظام نافذ کیا جائے گا جس میں ریاست ہر شہری کو بنیادی ضروریات کی فراہمی کی ذمہ دار ہوگی اور زکوٰۃ کے علاوہ کوئی دوسرا ٹیکس عوام پر لگانے کی مجاز نہ ہوگی۔

وہ اس بات سے باخبر ہوں کہ معاشرت کے باب میں کیسے مغرب کی جاہلی تہذیب کے اثرات کا قلع قمع کیا جائے گا اور اس کی جگہ مشرقی اور اسلامی روایات کو کس طرح مستحکم کیا جائے گا جس کے نتیجے میں گھر منظم ہوں گے اور قومی لباس، قومی زبان اور قومی روایات مروّج ہوں گی۔

یہ بات بھی ان پر واضح ہو کہ کس طرح تعلیم کا ایک ہی نظام رائج کیا جائے گا۔ مذہبی اور غیر مذہبی اور اردو یا انگریزی ذریعۂ تعلیم کی ہر تفریق بالکل ختم کر دی جائے گی۔

انھیں یہ بھی معلوم ہو کہ اسلامی سزائیں، انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق، کن مراحل سے گزر کر نافذ ہوں گی جس کے نتیجے میں عدل لوگوں کے دروازوں پر دستک دے گا اور ہماری یہ سرزمین امن کا گہوارہ قرار پائے گی۔

خود آگاہی کے یہ مراحل طے کرنے کے بعد ہی، اسلامی انقلابی جدوجہد کے خواہش مند، اس کے اہل ہوں گے کہ وہ 'خلافت علیٰ منہاج النبوۃ' کے قیام کی جدوجہد کا آغاز کریں اور لوگوں کو اللہ کے دین کی مدد کے لیے پکاریں۔

دعوت: انقلاب کا واحد راستہ

ایسی تبدیلی جو اپنے وجود میں ہمہ گیر اور اپنی روح میں جاوداں ہو، اس وقت تک کسی معاشرے میں، اپنی پوری شان کے ساتھ نمودار نہیں ہوتی جب تک اس معاشرہ کے افراد کی اکثریت اپنے

دلوں کے دروازے اس پر کھول نہ دے۔ جب لوگ کسی تبدیلی کو دل سے قبول کرتے ہیں تو پھر روایات تبدیل ہوتیں اور عقائد میں انقلاب برپا ہوتا ہے، رسمیں ٹوٹتیں اور پرانی اقدار رائج ہو جاتی ہیں۔

انبیا اور رسل کی جدوجہد کا جائزہ لیں یا صالح نقیبانِ انقلاب کی زندگیوں کا مطالعہ کریں، یہ بات واضح ہوتی ہے کہ معاشرے میں ایسی تبدیلی برپا کرنے کا واحد طریقہ اور ایسے پائیدار انقلاب کا واحد راستہ 'دعوت' ہے۔ وہ دعوت جو دلوں کو تسخیر کر لیتی اور اذہان کو مفتوح کرتی ہے۔ اس دعوت میں داعی نہ تلوار اٹھاتا، نہ تشدد و احتجاج کی فرنگیانہ سیاست کے خباثت میں الجھتا ہے، بلکہ اس کے برعکس، اس طریقِ انقلاب میں داعی اپنا مدعا، اپنا پیغام، خالص دلیل و برہان کی بنیاد پر پیش کرتا ہے۔ وہ لوگوں کے جذبات مشتعل نہیں کرتا، انھیں ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کی دعوت دیتا ہے۔

اس طریق میں داعی احکامات جاری نہیں کرتا، بلکہ دردمندانہ تذکیر و نصیحت کا اسلوب اختیار کرتا ہے۔ دعوت کے مخاطبین کے ساتھ اس کا تعلق مرشد اور مریدوں کا سا نہیں، بلکہ بھائیوں کا سا ہوتا ہے۔ اسی اخوت و محبت کے تعلق سے داعی کو وہ قوت فراہم ہوتی ہے جس کی بدولت وہ معاشرے کی بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکرانے کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے۔

اس طریق میں داعی کا مزاج تند و تیز نہیں، بلکہ محبت آمیز ہوتا ہے۔ بڑی سے بڑی ناکامی پر بھی وہ معتدل رہتا اور امید کا دامن اپنے ہاتھ میں تھامے رکھتا ہے۔ اس کی زندگی کا ہر ہر لمحہ صبر و شکر سے عبارت ہوتا ہے۔ اپنی ناکامیوں اور راہ میں آنے والے مصائب سے آنکھیں چرانے کے بجائے وہ انھیں خندہ پیشانی سے جھیلتا ہے اور اللہ سے مدد کی دعا کرتا ہے۔ اپنی کامیابیوں اور کامرانیوں پر اظہارِ غرور و تکبر کے بجائے اس کا سر اللہ کے سامنے اظہارِ تشکر کے لیے جھک جاتا ہے۔ اس طریق میں داعی کا نصب العین جاہ و حشمت کا حصول یا کوئی دوسرا دنیوی مفاد نہیں ہوتا، بلکہ اس کا مقصد اس تبدیلی کے ذریعے سے محض اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کے پیشِ نظر دنیا کی کامیابی نہیں، بلکہ آخرت کی کامیابی ہوتی ہے۔

اس طریق میں داعی امن و آشتی کا نقیب اور صلح جوئی کا علم بردار ہوتا ہے، لہٰذا اس کی ساری داعیانہ زندگی منفی رویے، تشدد و احتجاج کے اقدامات اور جہاد و قتال کے نعروں سے خالی ہوتی ہے۔ اصلاحِ احوال کے لیے اس کی ساری کاوش، اپنی ابتدا سے انتہا تک، دردمندانہ نصیحت

اور آخرت کے انذار سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔

انقلاب کا کوئی علم بردار جب یہ طریق اختیار کرتا ہے تو اس کے وجود سے تحریکیں جنم لیتی ہیں۔ وہ دعوت کی اس راہ پر، اگر ثابت قدمی سے، گامزن رہتے تو اللہ کی رضا سے' بالآخر وہ وقت بھی آ جاتا ہے کہ اللہ کی بادشاہی اپنی پوری شان کے ساتھ زمین پر قائم ہو جاتی ہے اور لوگ صدیق و فاروق کو یاد ہی نہیں کرتے، انھیں اپنی آنکھوں کے سامنے چلتے پھرتے محسوس کرتے ہیں۔

کاش ایسا ہو!

وہ افکار جو وحی کی تعلیم سے خالی ہیں اور وہ نظریات جو اللہ کے دین کی رہنمائی سے محروم ہیں، آج روبہ زوال ہیں۔ اسی وجہ سے ان افکار و نظریات پر قائم دنیا کے مختلف نظاموں کی بنیادیں متزلزل ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ وہ عالم پیر آج مر رہا ہے جسے فرنگی مقامروں نے قمار خانہ بنا رکھا تھا۔

یہی وہ مقام ہے جس پر آج یہ دنیا جہانِ تازہ کی تخلیق کی منتظر نظر آتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ جہانِ تازہ کون پیدا کرے گا؟ کیا وہ قومیں جہانِ تازہ تخلیق کریں گی جن کے افکار کی نہایتِ کمال انسان کے جبلی جذبوں کی تسکین سے زیادہ اور کچھ نہیں؟ کیا وہ لوگ جہانِ تازہ پیدا کریں گے جو انسان کی علمی و فکری اور اخلاقی صلاحیتوں کو اجتماعی معیشت کے مقابر میں دفن کرنا چاہتے ہیں؟ کیا وہ خطے جہانِ تازہ کو جنم دیں گے جو انسانیت اور اخلاق کا ہر تقاضا بھلا کر سرمایہ دار کے خوں خوار پنجوں کو مضبوط بنا رہے ہیں؟ کیا اُن علاقوں میں جہانِ تازہ کی تعمیر ہو گی جہاں پتھر اور نجوم و کواکب مسجودِ انسانیت ہیں۔

یہ اقوام، یہ لوگ، یہ خطے، یہ علاقے بھلا کیسے جہانِ تازہ تخلیق کر سکتے ہیں، جب کہ ان کی رگوں میں دوڑنے والا خون اور ان کی مٹی کو سیراب کرنے والا پانی کہنہ افکار اور فرسودہ روایات سے مرکب ہے۔

ہاں، ایک ایسی قوم ہے جو اس عالم کی تشکیلِ نو کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ قوم ملتِ اسلامیہ ہے۔ اس قوم کے پاس قرآنِ مجید کی صورت میں وہ عالم گیر رہنمائی موجود ہے جس کے بغیر عقل و زر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو جاتی اور جذبات بے لگام ہو کر انسان کے اخلاقی اور روحانی وجود کو تباہ کر دیتے ہیں۔ اس کے پاس دنیا کے کامل ترین انسان کا اسوہ موجود ہے جس کی روشنی انسان

کی انفرادی و اجتماعی زندگی کو گہوارۂ امن بنا دیتی ہے۔ اس قوم کے پاس دنیا کے مرکزی خطے ہیں، اس کے پاس کثیر آبادی ہے، اس کے پاس زرخیز اذہان ہیں، اس کے پاس سرمایہ ہے۔ بے شمار انعام واکرام ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر کر رکھے ہیں۔

آج، یہ قوم اگر اٹھ کھڑی ہوتی ہے تو نہ صرف یہ اپنی عظمتِ رفتہ کو واپس لا سکتی ہے بلکہ پوری دنیا کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ زمانہ منتظر ہے کہ یہ جہانِ تازہ تخلیق کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اس تخلیق کے ہر مرحلے میں اپنی نصرت و امداد کا وعدہ کر رکھا ہے۔

اس سے پہلے کہ کوئی دوسری قوم کسی کہنہ نظامِ زندگی کو نئے قالب میں ڈھال کر پھر اٹھ کھڑی ہو، اس سے پہلے کہ انسانیت، انسانوں سے مایوس ہو کر خودکشی کر لے اور اس سے پہلے کہ عالم کا پروردگار اس زمین و آسمان کو میدانِ حشر میں تبدیل کر دے۔

کاش ایسا ہو! کہ ملتِ اسلامیہ کے سپاہی جہانِ تازہ کو وجود بخشنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔

اشراق دستیاب ہے

لاہور

- المورد ــــ ۹۸ (۲) ای ماڈل ٹاؤن
- آصف نیوز ایجنسی، اخبار مارکیٹ
- الائیڈ کارنر، ڈولنٹن مارکیٹ
- دار التذکیر، حمید سنٹر ۹۔رائل پارک
- کلاسیک ، ریگل چوک
- کاشانۂ ادب، کچہری روڈ انارکلی
- جی ٹی ایس بک سٹال، ریلوے اسٹیشن
- بک سٹالز، پلیٹ فارمز ریلوے سٹیشن
- ظہور بک سٹال (شبستان ہوٹل) ریلوے اسٹیشن
- بک ہاؤس، لبرٹی مارکیٹ
- بک وے، شادمان مارکیٹ
- بک سٹال، الحمرا ہال نمبر ۳، بعد ماہانہ لیکچر

کراچی

- المورد ــــ سنو وائیٹ چیمبرز بہادر آباد، چورنگی
- بک سٹال، فنانس اینڈ ٹریڈ سنٹر ہال، بعد ماہانہ لیکچر

راولپنڈی

- ورائٹی بک سٹال، بنک روڈ، صدر
- سٹوڈنٹ بک سٹال، بنک روڈ، صدر
- بک سنٹر، حیدر روڈ ، صدر
- سعید نیوز ایجنسی، نزد ناز سینما، مری روڈ
- بکس اینڈ بکس، کمرشل مارکیٹ سیٹلائٹ ٹاؤن
- دار الکتب، کالج روڈ

۶۶ احمد بلاک ، گارڈن ٹاؤن ، لاہور ۵۴۶۰۰

فون : ۵۸۶۴۴۳۱

"اشراق" کے خریدار بنیے اور دوسروں کو بنائیے

	زرتعاون	وی پی پی
سالانہ	۸۰ روپے	۹۰ روپے
دو سال کے لیے	۱۵۰ روپے	۱۶۰ روپے
تین سال کے لیے	۲۳۰ روپے	۲۴۰ روپے

بیرونِ ملک: ہوائی ڈاک ۴۵۰ روپے، بحری ڈاک ۲۵۰ روپے (سالانہ)

ازراہِ کرم، نقد، منی آرڈر، ڈرافٹ یا چیک بنام "اشراق" ارسال فرمائیں۔

دفتر ماہنامہ 'اشراق' ۶۶، احمد بلاک گارڈن ٹاؤن لاہور، فون: ۵۸۶۴۴۳۱

رابطہ: دارالتذکیر حمید سنٹر ۹۔ رائل پارک لاہور، فون: ۶۳۶۳۵۴۲

المورد — ۹۸(۲) ای، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: ۸۵۶۴۱۸



مدرکیئر اور آپ - حسن کی بہتر نگہداشت

ماہنامہ

اشراق

جلد ۶ شمارہ ۴
اپریل ۱۹۹۴ء
ذوالقعدہ ۱۴۱۴ھ

فی شمارہ : ۸ روپے
سالانہ : ۸۰ روپے
بیرون ملک :
ہوائی ڈاک : ۴۵۰ روپے
بحری ڈاک : ۲۵۰ روپے

المورد
۴۹ احمد بلاک، گارڈن ٹاؤن، لاہور ۵۴۶۰۰ فون : ۵۸۶۴۳۳۱

مدیر مسئول : جاوید احمد غامدی
طابع : قومی پریس لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الحدید

[۵۷]

اللہ ہی کی تسبیح کرتی ہیں وہ سب چیزیں، جو آسمانوں میں، اور زمین میں ہیں، اور وہ غالب ہے، بڑی حکمت والا ہے۔ زمین اور آسمانوں کی بادشاہی اسی کے لیے ہے۔ وہی جلاتا اور وہی مارتا ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (وہ تمھارے اِن زمان و مکاں سے بالاتر ہے، اِس طرح کہ) وہی اوّل ہے، (اُس سے پہلے کوئی چیز نہیں ہو سکتی،) اور وہی آخر ہے، (اُس کے بعد بھی کوئی چیز نہیں ہو سکتی،) اور وہی ظاہر ہے، (اُس کے اوپر کوئی چیز نہیں ہو سکتی،) اور وہی باطن ہے، (اُس کے نیچے بھی کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔) اور (اِس طرح) وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔

وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں، (جو اُس کے چھ دن ہیں،) پیدا کیا، پھر (اُن کی تدبیرِ امور کے لیے) عرشِ حکومت پہ جلوہ فرما ہوا۔ وہ جانتا ہے، ہر اُس چیز کو جو زمین میں جاتی اور جو اُس سے نکلتی ہے، اور جو آسمان سے اترتی، اور جو اُس میں چڑھتی ہے۔ اور وہ تمھارے ساتھ ہوتا ہے، جہاں کہیں تم ہوتے ہو۔ اور تم جو کچھ بھی کرتے ہو، اللہ سب کو دیکھتا ہے۔ زمین اور آسمانوں کی بادشاہی اُسی کے لیے ہے۔ اور تمام معاملات کا مرجع اللہ ہی ہے۔ وہی رات کو دن میں، اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ اور وہ جانتا ہے اُن سب چیزوں کو بھی، جو دلوں میں

چھپی ہوئی ہیں۔

(اِس لیے، اے لوگو، تم بھی اللہ ہی کی تسبیح کرو، اور اُس میں کسی کو اُس کا شریک نہ بناؤ۔)

(تم نے ایمان کا اقرار کیا، تو اب) فی الواقع، ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسول پر اور خرچ کرو اُس مال میں سے، جس میں اُس نے تم کو تصرف کا حق دیا ہے۔ چنانچہ جو لوگ تم میں سے (اِس طرح) ایمان لائیں اور خرچ کریں، (وہ اطمینان رکھیں کہ) اُن کے لیے (اُن کے پروردگار کے ہاں) بہت بڑا اجر ہے۔ اور (تم نے ایمان کا اقرار کیا، تو اب یہ) تمھیں کیا ہوا ہے کہ تم اللہ پر (اِس طرح) ایمان نہیں لاتے، دراں حالیکہ رسول تم کو تمھارے پروردگار پر ایمان کی دعوت دے رہا ہے، اور دراں حالیکہ وہ تم سے (سمع و طاعت کا) عہد لے چکا ہے۔ (تمھیں کیا ہوا)، اگر تم نے (فی الواقع) ایمان کا اقرار کیا ہے!

وہی ہے جو اپنے بندے پر یہ روشن آیتیں نازل کرتا ہے تاکہ تمھیں (نفس کی خواہشوں اور حبِ دنیا کی) اِن تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے، (روشنی جو اِس دنیا میں اور اِس کے بعد آخرت میں بھی تمھاری رہنمائی کرے گی۔) اور اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تمھارے حال پر سراپا شفقت اور تمھارے لیے اُس کی رحمت ابدی ہے۔ اور (تم نے ایمان کا اقرار کیا، تو اب یہ) تمھیں کیا ہوا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو، دراں حالیکہ آسمانوں اور زمین کی میراث (سب) اللہ ہی کے لیے ہے۔ (یہ بات یاد رکھو کہ) تم میں سے (جو لوگ اُم القریٰ کی فتح کے بعد انفاق کریں گے اور اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے،) وہ کبھی اُن لوگوں کے برابر نہ ہوں گے، جنھوں نے اِس فتح سے پہلے انفاق اور جہاد کیا۔ اُن کا درجہ اُن لوگوں سے (یقیناً) بڑا ہوگا جو اِس کے بعد انفاق کریں گے اور اِس کے بعد (اللہ کی راہ میں) جہاد کریں گے۔ اور (اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ) اللہ کا وعدہ اِن دونوں ہی سے اچھا ہے۔ اور (یاد رکھو کہ) تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ اُس سے خوب باخبر

ہے۔

(اب) کون اٹھتا ہے کہ اللہ کو قرض دے، اچھا قرض، تاکہ وہ اُس کے لیے اُسے کئی گنا بڑھائے، اور اُس کے لیے باعزت صلہ ہو، اُس دن جب کہ تم مومن مردوں اور عورتوں کو دیکھو گے کہ اُن کی روشنی اُن کے آگے اور ان کے داہنے چل رہی ہے ——— تم کو خوشخبری ہیں آج کے دن، یہ باغ، جن میں نہریں بہ رہی ہیں، ان میں ہمیشہ رہو گے۔ یہی درحقیقت بڑی کامیابی ہے۔ اُس دن جب کہ اہلِ ایمان کو پکاریں گے منافق مرد اور منافق عورتیں کہ ذرا ہم پر بھی عنایت فرمایئے کہ ہم تمھاری روشنی سے کچھ فائدہ اٹھالیں۔ (لیکن) اُن سے کہا جائے گا: پیچھے ہٹ جاؤ اور وہاں روشنی تلاش کرو۔ پھر اُن کے اور اہلِ ایمان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کردی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا اس کے اندر رحمت ہوگی اور باہر عذاب۔ یہ اُن سے فریاد کریں گے کہ کیا ہم (دنیا میں) تمھارے ساتھ نہ تھے؟ وہ جواب دیں گے کہ بے شک تم ساتھ تو تھے، مگر تم نے اپنے آپ کو فتنوں میں ڈالے رکھا، ہمارے لیے گردشوں کے انتظار میں رہے، شبہوں میں مبتلا رہے، اور تمھاری آرزوئیں تمھیں فریب دیتی رہیں، یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ ظاہر ہوگیا اور وہ بڑا دغاباز (وہ شیطان)، وہ تمھیں اللہ کے معاملے میں (اسی طرح) فریب دیتا رہا۔ اِس لیے آج نہ تم سے کوئی فدیہ قبول ہوگا، اور نہ اُن سے جنھوں نے کھلا کفر کیا۔ تم سب کا ٹھکانا جہنم ہے۔ وہی تمھارا مرجع ہے، اور (ذرا دیکھو کہ) وہ کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے!

یہ جن لوگوں نے اقرار کیا کہ یہ اب اہلِ ایمان میں شامل ہیں، کیا اِن کے لیے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ اِن کے دل اللہ کی یاد دہانی اور اُس حق کے آگے جھک جائیں جو (اللہ کی طرف سے) نازل ہوا ہے، اور یہ اُن کی طرح نہ ہوں، جن کو اِس سے پہلے کتاب دی گئی، پھر اُن پر لمبی مدت گزر گئی، یہاں تک کہ اُن کے دل پتھر ہوگئے اور (تم دیکھتے ہو کہ) اُن میں سے بہتیرے (اب) نافرمان بنے ہوئے ہیں۔

(تمھیں قیامت میں شبہ ہوا یا تم اس سرزمین پر دینِ حق کے مستقبل سے مایوس ہوتے؟) تم جان لو کہ اللہ زمین کو (بارہا) اُس کے مردہ ہو جانے کے بعد (بھی) زندہ کر دیتا ہے۔ (یہ) ہم نے اپنی آیتیں تمھارے لیے واضح بیان کر دی ہیں، تاکہ تم سمجھو۔

(تم سمجھتے ہو کہ تم اگر اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے تو یہ سب ضائع ہو جائے گا؟ تم جان لو کہ) بے شک اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے مرد اور عورتیں اور وہ لوگ جنھوں نے اللہ کو قرض دیا، اچھا قرض، اُن کا دیا ہوا، اُن کے لیے کئی گنا بڑھایا جائے گا، اور اُن کے لیے باعزت صلہ ہے، اور وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں پر، فی الواقع، ایمان لائے، وہی اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں، (اس لیے کہ انھوں نے دل سے پیغمبر کی تصدیق کی، اور اس لیے کہ وہ دوسروں کے لیے حق کی گواہی دینے والے بنے) اُن کے لیے ان کا صلہ بھی ہوگا اور ان کی روشنی بھی۔ اور وہ جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا، وہی اہلِ جہنم ہیں۔

تم جان لو کہ دنیا کی زندگی ——— یہ لہو و لعب، زیب و زینت اور مال و اولاد کے معاملے میں تمھارا آپس میں ایک دوسرے پر فخر جتانا اور ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی تگ و دو کرنا —— اس کی تمثیل تو بس اُس بارش کی سی ہے، جس کی اُگائی ہوئی فصل اِن کافروں کے دل لبھاتے، پھر زور پر آئے، اِس طرح کہ تم دیکھو کہ وہ زرد ہو گئی ہے، پھر (دیکھتے دیکھتے) وہ ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ (تم نے اسی کو مقصد بنا لیا، دراں حالیکہ اصل نصب العین تو بس آخرت ہی ہے) اور (تم جان لو کہ) آخرت میں سخت عذاب بھی ہے اور اللہ کی طرف سے مغفرت اور اُس کی رضامندی بھی، اور دنیا کی یہ زندگی تو متاعِ غرور کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

(اِس لیے) تم دوڑو اور ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی تگ و دو کرو، اپنے پروردگار کی مغفرت اور اُس جنت کی طرف، جس کی وسعت زمین و آسمان جیسی ہے۔ وہ اُن لوگوں کے لیے

تیار کی گئی ہے، جو اللہ اور اُس کے رسولوں پر، فی الواقع، ایمان رکھتے ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے، جس کو چاہے گا، عطا فرمائے گا۔ اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

(پھر یہ حقیقت بھی سامنے رہے کہ) ایسی کوئی مصیبت نہیں جو تمھیں اس زمین میں اور تمھارے وجود میں لاحق ہوتی ہو، اور ہم نے اُس کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب میں لکھ نہ دیا ہو۔ بے شک یہ اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔ (ہم نے یہ بات تم کو) اِس لیے (سمجھا دی) کہ تم اُس پر غم نہ کرو، جو ہاتھ سے جاتا رہا، اور نہ اُس پر اتراؤ جو اُس نے (تمھارے پروردگار نے) تم کو دیا۔ (بلکہ ہر نقصان پر صبر کرو، اور ہر نعمت کے لیے اپنے مالک کا شکر ادا کرو۔)، اور (یاد رکھو کہ) اللہ اُن لوگوں کو بالکل پسند نہیں کرتا جو اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے اور فخر جتاتے ہیں۔ یہ جو خود بھی بخل کرتے اور دوسروں کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں۔ اور جو (اِس یاد دہانی کے بعد بھی) اعراض کریں گے، تو (یاد رہے کہ) بے شک اللہ (اُن کی ہر چیز سے بالکل) بے نیاز ہے۔ (لیکن وہ چاہتا ہے کہ یہ خرچ کریں اور اس کے نتیجے میں وہ اپنی لازوال نعمتیں اِن کو عطا فرمائے۔ اس لیے کہ وہ) ستودہ صفات (بھی) ہے۔

(ہم نے تمھیں انفاق کی دعوت دی اور تمھیں جہاد کے لیے ابھارا، تو یہ اہلِ کتاب اِس پر معترض ہوئے کہ دینِ حق میں یہ خوں ریزی کس طرح جائز ہوئی؟ اِن سے کہہ دو،) بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو صاف اور واضح دلائل کے ساتھ بھیجا، اور اُن کے ساتھ اپنی کتاب یعنی (حق و باطل کے لیے) میزان نازل کی تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں، اور لوہا اتارا (کہ وہ قیامِ عدل کے لیے اُس سے جہاد کریں۔) اِس میں بڑی قوت ہے اور لوگوں کے لیے دوسرے فوائد بھی ہیں، اور اِس سے اللہ نے یہ بھی چاہا کہ وہ اُن لوگوں کو الگ کرے جو بِن دیکھے، اُس کی اور اُس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں۔ (یہ محض اُن کی آزمایش کے لیے، ورنہ) اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ بڑی

قوت والا ہے، (ہر چیز پر) غالب ہے۔

اور (اِسی مقصد سے) ہم نے نوح اور ابراہیم کو بھیجا، اور اُن کی اولاد میں نبوت جاری کی، اور اُنھیں اہلِ کتاب بنایا۔ پھر اُن میں سے کچھ ہدایت پانے والے بنے، اور زیادہ (اِس مقصد سے انحراف کی وجہ سے) اُن میں نافرمان نکلے۔ پھر انھی کے نقشِ قدم پر ہم نے اپنے اور رسول بھی بھیجے، اور (اِسی طرح) اُن کے پیچھے عیسیٰ ابنِ مریم کو بھیجا، اور اسے انجیل عنایت کی، اور وہ لوگ، جو اُس کے پیرو ہوتے، اُن کے دلوں میں، ہم نے رافت و رحمت ڈال دی، اور رہبانیت (جس کو وہ جہاد کی اِس دعوت پر اعتراض کے لیے دلیل بناتے ہیں) یہ اُنھوں نے خود ایجاد کی۔ ہم نے اسے اُن پر فرض نہیں کیا تھا۔ ہاں، جو چیز ہم نے اُن پر فرض کی، وہ صرف یہ تھی کہ وہ اللہ کی خوشنودی چاہیں۔ لیکن اُس کے حدود کی رعایت، جس طرح کہ اُس کا حق تھا، وہ اُنھوں نے نہیں کی۔ چنانچہ اُن میں سے جو لوگ ایمان پر قائم رہے، اُن کا اجر ہم نے اُن کو دیا، اور زیادہ (اِن بدعتوں کی وجہ سے) اُن میں (بھی) نافرمان ہی نکلے۔ (اس لیے) اے لوگو، جو (عیسیٰ ابنِ مریم پر) ایمان لائے ہو (تم اِن اعتراض کرنے والوں کی پروا نہ کرو،) اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، (جس کی بشارت کے لیے تم مامور ہوتے۔) وہ تم کو اپنی رحمت کا دُہرا حصہ عطا فرمائے گا، اور تمھارے لیے وہ روشنی مہیا کرے گا، جس کو لے کر تم (قیامت میں) چلوگے، اور تم کو معاف فرمائے گا، اور اللہ بڑا معاف کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔ (تم اُس کی رحمت کے لیے سبقت کرو، اور اِن یہود کو چھوڑو) کہ یہ کتاب کے حامل نہ جانیں کہ اللہ کے فضل پر اِن کا کوئی اجارہ نہیں، اور یہ فضل اُس کے اپنے ہی ہاتھ میں ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے، عطا فرماتا ہے۔ (اِن کو چھوڑو کہ اِسی جہالت میں مبتلا رہیں،) اور (کبھی نہ جانیں کہ) اللہ بڑے فضل والا ہے۔

معز امجد

منشور انقلاب

— ۱ —

جاوید احمد صاحب غامدی کے تجویز کیے ہوئے منشور کی مفصل شرح، جو ان صفحات میں، ان شاء اللہ، سلسلہ وار شائع ہو گی۔ (ادارہ)

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اسلام یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، نماز کا اہتمام کریں، رمضان کے روزے رکھیں، اگر استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج کریں، اپنے والدین کے ساتھ اچھے طریقے سے پیش آئیں، دین و دنیا میں کامیابی کے لیے اپنی اولاد کی صحیح طریقے پر تربیت کریں اور ان کی کوتاہیوں سے حتی الامکان درگزر کریں، اپنے مسلمان بھائیوں کی ضروریات کا خیال رکھیں، اپنے ہمسایے کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچائیں، امانتوں کی حفاظت کریں، رزق حلال کمائیں، زنا، چوری اور قتل جیسے گھناؤنے جرائم سے دور رہیں وغیرہ۔ غرض کہ اسلام کی تمام تر تعلیمات و ہدایات فرد ہی سے متعلق ہیں۔ چنانچہ، یہ کہنا درست ہو گا کہ دین ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے اور اس کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس بات سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان سب باتوں کا اسلام ہم سے مطالبہ کرتا اور ان پر قائم رہنے کی تلقین کرتا ہے، مگر غور طلب بات یہ ہے کہ کیا اسلام ہم سے صرف یہی مطالبات کرتا ہے؟ کیا قرآن مجید کا مخاطب صرف فرد ہی ہے؟ کیا سیاست کے بارے میں اسلام نے کوئی ضابطہ نہیں دیا؟ کیا سیاست، معاشرت اور معیشت کے باب میں اسلام نے کوئی قانون نہیں بنایا؟ اور کیا ایک معاشرے کو مجرموں کی دست درازی سے بچانے کے لیے اسلام کوئی سزائیں تجویز نہیں کرتا؟ ظاہر ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسلام ہماری سیاست، معاشرت، معیشت اور حدود و تعزیرات کے بارے میں بھی ضابطے بناتا اور ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہم اپنی اجتماعی زندگی میں ان تمام ضابطوں کی پابندی کریں۔ مثال کے طور پر، وہ یہ حکم دیتا ہے کہ مسلمانوں کا نظام ریاست ان کے باہمی مشورے سے چلنا چاہیے، ان کی معاشرت

میں حیا اور حجاب کے حدود کی پابندی ہونی چاہیے، ان کی معیشت میں ایسا کوئی نظام یا ایسی کوئی اسکیم نہیں ہونی چاہیے جس سے دولت چند ہاتھوں ہی میں سمٹ کر رہ جائے اور ان کے معاشرے میں جرائم پیشہ لوگوں کو عبرت ناک سزائیں دی جانی چاہییں۔ چنانچہ، یہ بات واضح ہے کہ اسلام اصلاحِ فرد کی طرح، معاشرے اور ریاست کی اصلاح کے احکام بھی جاری کرتا اور یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ریاست کی سطح پر ان احکام کو نافذ کیا جائے۔ لہٰذا کم از کم، دینِ اسلام کے بارے میں تو یہ بات، کسی صورت میں بھی، صحیح نہیں ہے کہ اس کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ قیامِ پاکستان سے پہلے، برِ صغیر کے مسلمانوں پر یہ ذمہ داری نہیں تھی کہ وہ اسلام کے ان احکام و قوانین کو جاری و نافذ کریں، جو معاشرے اور ریاست سے متعلق ہیں۔ مگر پاکستان کے معرضِ وجود میں آجانے اور ایک آزاد خطۂ ارض پر اقتدار حاصل کر لینے کے بعد، اب، بحیثیتِ قوم، ہم پر ان قوانین کے اجرا و نفاذ کا فرض بھی بالکل اسی طرح عائد ہوتا ہے، جس طرح ایک فرد پر نماز اور روزہ جیسی عبادات کی پابندی کا۔ بس فرق صرف اتنا ہے کہ عبادات کی ذمہ داری ہر فرد پر یکساں عائد ہوتی ہے جب کہ معاشرے اور ریاست میں اسلامی قوانین کے اجرا کی ذمہ داری ہر شخص پر اس کی معاشرتی حیثیت، اس کے تعلیمی پس منظر اور اس کے شعور کے مطابق، کم یا زیادہ ہو سکتی ہے۔ چنانچہ، یہ ذمہ داری جتنی ہمارے صدرِ مملکت، وزیرِ اعظم اور قومی و صوبائی اسمبلیوں کے ممبران پر عائد ہوتی ہے، اتنی ایک عام شہری پر عائد نہیں ہوتی۔ اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دین کے معاملے میں جس شخص پر جتنی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اسی حساب سے اسے اللہ کے ہاں مواخذے کا سامنا بھی کرنا ہوگا۔

چنانچہ، اسی بات کے پیشِ نظر، ہم میں سے ہر شخص کو اپنی حیثیت اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیتوں کے لحاظ سے یہ ذمہ داری، جو کچھ اس پر عائد ہوتی ہے، اسے نباہنے کی، اپنی طرف سے پوری کوشش کرنی چاہیے۔ ورنہ، اس بات کا شدید اندیشہ ہے کہ ہم پر بھی وہی جرم صادق آئے گا جو قرآنِ مجید نے یہود پر عائد کیا ہے کہ:

"کیا تم لوگ کتابِ الٰہی کے ایک حصے کو مانتے اور ایک کا انکار کرتے ہو، تو جو لوگ ایسا کرتے ہیں ان کی سزا یہی ہے کہ دنیا میں ان کی رسوائی ہو اور قیامت کے دن انھیں شدید عذاب میں ڈال دیا جائے۔" (البقرہ ۲: ۸۵)

اور ہم بھی اسی تنبیہ کی خلاف ورزی کے مجرم قرار پا جائیں، جس کی خلاف ورزی یہود و نصاریٰ نے کی، یعنی

"اور جو لوگ اس قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں، جسے اللہ نے نازل کیا ہے، وہی کافر ہیں۔ وہی ظالم ہیں۔ وہی فاسق ہیں۔" (المائدہ ۵: ۴۴، ۴۵، ۴۷)

اسی احساسِ ذمہ داری کے ساتھ، ہم نے ملک کے نظام ہائے سیاست، معاشرت، معیشت،

حدود و تعزیرات اور تعلیم و تعلم میں ایسی اصلاحات کا ایک مفصل منشور تجویز کیا ہے، جن کے بعد ہی کوئی ریاست، حقیقی معنوں میں، ایک اسلامی ریاست کہلانے کی حق دار ہو سکتی ہے۔

اس منشور میں ہمارے پیشِ نظر کوئی جزوی تبدیلیاں نہیں، بلکہ سیاست، معیشت، معاشرت، تعلیم و تعلم اور حدود و تعزیرات کی عمارتوں کو نئے سرے سے تعمیر کرنا ہے۔ ہم اپنے موجودہ نظام کا فقط لباس ہی بدلنا نہیں چاہتے، بلکہ اس کی جگہ دنیا کو اس نظام سے متعارف کرانا چاہتے ہیں، جو اس کے پروردگار کا دیا ہوا ہے، جس کی بنا آج سے چودہ سو سال پہلے محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے سرزمینِ عرب میں ڈالی تھی اور آپ کے بعد خلفائے راشدین نے ساری دنیا کو جس کی شان سے متعارف کرایا تھا۔ اس پہلو سے دیکھیے، تو ہمارا یہ منشور دورِ حاضر کے خلاف ایک اعلانِ جنگ ہے۔

اس منشور کے مطابق، ہم اپنے نظام میں جو تبدیلیاں لانا چاہتے ہیں، ان کی تفصیل اس طرح ہے:

سیاسی سطح پر مجوزہ تبدیلیاں

ریاست کا قانونِ اعلیٰ

اس بات سے ہم سب واقف ہیں کہ کسی بھی ریاست کے معاملات کو منظم کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ قوانین بنائے جائیں، اور اس کے شہریوں کو اس بات کا پابند کیا جائے کہ وہ ان قوانین کی پیروی کریں اور، کسی حال میں بھی، ان سے انحراف نہ کریں۔ چنانچہ، اگر ہم دنیا میں پھیلی ہوئی بے شمار ریاستوں کا ایک سرسری مطالعہ ہی کریں، تو ایسا کوئی استثنا تلاش نہیں کر سکتے کہ ریاست تو موجود ہو مگر اس کے قوانین نہ ہوں۔ ایسا ہونا نہ صرف ناممکن، بلکہ غیر فطری ہے۔

چنانچہ، جب یہ بات طے ہے کہ کسی بھی ریاست کا نظم چلانے، اس میں لوگوں کی فلاح و بہبود، ان کے جان و مال اور ان کی عزت و آبرو کی حفاظت، اندرونی و بیرونی خطرات سے امان وغیرہ کے لیے قانون سازی لازم ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قانون سازی کا حق کسے دیا جائے؟ کیا کسی ایک فرد کو یہ حیثیت دے دی جائے کہ وہ جو حکم جاری کر دے، اُسے ریاست کا قانون بنا دیا جائے؟ کیا قانون سازی کے لیے چند افراد کا گروہ بنا دیا جائے کہ وہ مل کر جو فیصلہ بھی کر دیں، اسے ریاست میں قانون کی حیثیت حاصل ہو جائے؟ آخر ریاست کے قوانین کا اصل منبع و ماخذ اور سرچشمہ کیا ہو گا؟

ہم یہ جانتے ہیں کہ دینِ اسلام، جہاں ایک فرد کی اصلاح اور اس کے تزکیہ کے لیے ہدایات دیتا ہے، وہاں ایک معاشرے اور ریاست کو صحیح نہج پر استوار کرنے اور پھر استوار رکھنے کے لیے بھی قوانین بناتا ہے، اور ظاہر ہے کہ وہ یہ قوانین اسی لیے بناتا ہے کہ ان پر عمل درآمد کیا جائے۔ اگر ان احکام و قوانین کی اطاعت

مطلوب نہیں، تو پھر یہ احکام جاری کرنے کا فائدہ ہی کیا ہے؟

ظاہر ہے کہ جس طرح مسلمان کی حیثیت سے ایک فرد کے لیے اسلام کی ہدایات پر قائم رہنا ضروری ہے اسی طرح ایک ریاست صرف اسی صورت میں 'مسلمان ریاست' کہلانے کی حق دار ہوتی ہے جب اس میں یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس میں جاری ہونے والے تمام قوانین کا اصل مرجع و ماخذ اور ان کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی شریعت ہی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اسلامی ریاست کو 'خدا کی بادشاہی' قرار دیا ہے۔ خدا کی بادشاہی کے معنی یہ ہیں کہ ایک ایسی ریاست قائم کی جائے جس میں اللہ تعالیٰ ہی کو حقیقی بادشاہ تسلیم کیا جائے، اور یہ مان لیا جائے کہ ایک بادشاہ کی طرح، اصلاً یہ اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے کہ وہ قوانین جاری کرے، اور یہ مطالبہ کرے کہ ان قوانین کی بے چون و چرا پابندی کی جائے۔

اگر کوئی شخص یا کوئی ریاست اللہ تعالیٰ کے اس حق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے اور اپنی انفرادی یا اجتماعی زندگی میں اس کی اطاعت سے گریزاں رہے، تو قرآنِ مجید کے نزدیک یہ کفر، ظلم اور فسق (نافرمانی) ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

"اور جو لوگ اس قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں جسے اللہ نے نازل کیا ہے، تو وہی کافر ہیں، وہی ظالم ہیں، وہی فاسق ہیں۔" (المائدہ ۵: ۴۴، ۴۵، ۴۷)

اللہ تعالیٰ کے احکام و قوانین کی اطاعت کی عملی شکل، درحقیقت، رسول کی اطاعت ہے، اس لیے کہ یہ رسول ہی ہے جو خدا کے احکام و قوانین سے باخبر کرتا اور انھیں نافذ کرتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید میں جہاں جہاں اللہ کی اطاعت کا حکم آیا ہے، ساتھ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"کہہ دو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی، پھر اگر یہ اس سے منہ موڑیں تو یاد رکھیں کہ اللہ ایسے کافروں کو بالکل پسند نہیں کرتا۔" (آلِ عمران ۳: ۳۲)

اللہ اور اس کے رسول کے اسی حق کے پیشِ نظر، قرآنِ مجید نے ایک اسلامی ریاست میں قوانین کے بنیادی ماخذوں کو اس طرح بیان کیا ہے:

"اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں۔ پھر اگر تمھارے درمیان کسی معاملے میں اختلافِ رائے ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو۔" (النساء ۴: ۵۹)

اس آیت سے پہلی بات یہ سامنے آتی ہے کہ مسلمانوں کے نظمِ اجتماعی میں اصل مرکز و محور اللہ

اور اس کے رسول کی فرماں برداری اور انھی کے ساتھ وفاداری ہے۔ دوسری تمام اطاعتیں اور وفاداریاں صرف اس صورت میں قبول کی جائیں گی اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے خلاف نہیں، بلکہ اس کے تابع ہوں۔ ایک اسلامی معاشرے کے شہریوں پر اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے خلاف کسی کی اطاعت کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اسی بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

"خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کے لیے اطاعت نہیں ہے۔"

اس آیت سے دوسری بات یہ سامنے آتی ہے کہ ایک اسلامی ریاست کے شہریوں پر ان لوگوں کی اطاعت بھی ضروری ہے جو 'صاحب امر' ہوں۔ 'صاحب امر' سے، ظاہر ہے کہ وہی لوگ مراد ہیں، جن کے ہاتھوں میں حکومت کا نظم و نسق ہو۔

غور کیجیے، تو اس آیت سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے برخلاف، صاحب امر کے احکام کے معاملے میں اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ اور اگر کبھی اس طرح کی صورت پیدا ہو جائے، تو اس اختلاف کو رفع کرنے کے لیے اللہ اور اس کے رسول ہی کی طرف رجوع کیا جانا چاہیے۔ مثال کے طور پر اگر کسی قانون کے معاملے میں، یہ اختلاف ہو جائے کہ ریاست میں اس کو نافذ کیا جانا چاہیے یا نہیں تو پھر یہ دیکھا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب، قرآن مجید اور اس کے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے اس معاملے میں ہمیں کیا رہنمائی ملتی ہے، اور پھر اس اختلاف میں فیصلہ کن چیز قرآن و سنت کی یہ رہنمائی ہی ہوگی، اور اس کے خلاف کسی بھی صاحب امر کی بات رد کر دی جائے گی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اس آیت سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں قانون سازی کے لیے اصل اور مستقل مرجع و ماخذ کی حیثیت صرف اللہ کی کتاب، قرآن مجید اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہی کو حاصل ہے۔

چنانچہ، اگر ہم اپنے ملک عزیز کو ایک اسلامی ریاست بنانا چاہتے ہیں، تو سب سے پہلے ہمیں اس کے دستور میں یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دینی ہوگی کہ ریاست کا قانون بالا صرف اللہ کی کتاب قرآن مجید اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہی ہوگی۔ آئین اور پارلیمان سب اس کتاب اور اس پیغمبر کے سامنے ہمیشہ سرنگوں رہیں گے۔

ترتیب : شہزاد سلیم

"یہ اسی تنبیہ کی مزید تاکید ہے کہ جب تمھارے اندر اللہ کا رسول موجود ہے تو تمھیں اپنی رایوں اور اپنے مشوروں کو اتنی اہمیت نہیں دینی چاہیے کہ رسول کو اپنے پیچھے چلانے کی کوشش کرو، بلکہ تمھیں ان کے پیچھے چلنا ہے۔ وہ جو قدم بھی اٹھاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں اٹھاتے ہیں۔ اس وجہ سے تمھاری دنیا اور آخرت کی فلاح ان کی پیروی میں ہے، نہ کہ اپنے جذبات کی پیروی میں۔ اگر تمھیں کوئی رائے پیش کرنی ہو، تو ادب سے اپنی رائے پیش کر کے، فیصلہ رسول کی صواب دید پر چھوڑ دو۔ یہ خواہش نہ کرو کہ تمھاری ہر رائے، لازماً، مان ہی لی جائے۔ اچھی طرح یاد رکھو کہ تمھاری بہت سی رائیں خام ہوتی ہیں، اللہ کا رسول ان سب کو اگر مان لیا کرے تو تم بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ وہ تمھاری انھی رایوں کو مانتے ہیں جو صائب ہوتی ہیں۔ ان کی بدولت تمھیں ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کی رہنمائی حاصل ہے، تو اس نعمت کی قدر کرو اور اپنے رب کے شکر گزار رہو۔"

قرآنیات

امین احسن اصلاحی

سورۃ الحجرات

(۲)

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (۲)

"اے ایمان لانے والو! تم اپنی آواز نبی کی آواز پر بلند نہ کرو اور نہ اس کو اس طرح آواز دے کر پکارو جس طرح آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔ مبادا تمھارے اعمال ڈھے جائیں اور تم کو احساس بھی نہ ہو۔"

یہ اسی اوپر والی بات کے ایک دوسرے پہلو کی طرف اشارہ ہے۔ جن لوگوں کے اندر یہ خناس سمایا ہوا ہو کہ وہ اللہ و رسول کو مشورہ دینے کی پوزیشن میں ہیں یا جن کو یہ زعم ہو کہ ان کا اسلام قبول کر لینا، اسلام اور پیغمبر پر ایک احسان ہے۔ ان کا طرزِ خطاب اور اندازِ کلام رسول کے آگے متواضعانہ و نیازمندانہ نہیں ہو سکتا تھا، بلکہ ان کے اس پندار کا اثر، ان کی گفتگو سے نمایاں ہونا ایک امر فطری تھا۔ چنانچہ یہ لوگ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرتے تو ان کے اندازِ کلام سے یہ واضح ہوتا کہ یہ اللہ کے رسول سے کچھ سیکھنے نہیں، بلکہ ان کو کچھ سکھانے اور بتانے آئے ہیں۔ چنانچہ جس طرح یہ اپنی رائیں پیش کرنے میں سبقت کرتے، اسی طرح ان کی کوشش یہ بھی ہوتی کہ ان کی آواز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر بلند و بالا رہے اور اگر آپ کو مخاطب کرتے تو ادب سے 'یا رسول اللہ' کہنے کے بجائے 'یا محمد' کہہ کر خطاب کرتے، جس طرح اپنے برابر کے ایک عام آدمی کو خطاب کیا جاتا ہے۔ یہاں ان کو اس غیر مہذب طریقۂ کلام و خطاب سے روکا گیا ہے، کیونکہ یہ چیز غمازی کر رہی تھی کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ رسول کا اصل مرتبہ و مقام نہیں پہچانا

ہے، بلکہ ان کے اندر اپنی برتری کا وہ زعم بھی چھپا ہوا ہے جو، بالآخر، اُن کے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دینے والا ہے۔

'اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ' میں 'ان' سے پہلے 'کراھۃ' یا 'مخافۃ' یا ان کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے۔ اس کو کھول دیجیے تو مطلب یہ ہوگا کہ اس بے ادبی سے تمھیں اس لیے روکا جا رہا ہے کہ مبادا تمھاری یہ حرکت اس بات کا سبب بن جائے کہ عند اللہ تمھارے سارے اعمال ڈھے جائیں۔

'وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ' یعنی تم تو اس پندار میں مبتلا ہو گے کہ تم نے اسلام کی بڑی خدمت کی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی رایوں سے مستفید کرنے کے لیے تمھاری بے چینی بھی خدمت دین ہی کے عشق میں ہے، لیکن ادھر تمھارے وہ سارے اعمال ڈھے جائیں گے جو اپنے زعم میں تم نے دین کی خاطر انجام دیے اور تمھیں اس بات کا شعور بھی نہ ہو گا۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ ایک شخص بہت سے کام، اپنی دانست میں دین کے کام سمجھ کر، دین ہی کی خدمت کے لیے کرتا ہے، لیکن اس کے اندر اگر یہ پندار سمایا ہوا ہو کہ وہ اللہ و رسول پر یا اللہ کے دین پر کوئی احسان کر رہا ہے اور اس زعم میں نہ وہ اللہ تعالیٰ کی یہ صحیح عظمت کو ملحوظ رکھے، نہ اس کے رسول کے اصلی مرتبہ و مقام کا احترام کرے تو اس کے سارے اعمال اکارت ہو کر رہ جائیں گے اور اس کو اپنی اس بے شعوری کا پتا آخرت میں چلے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی خدمت کے لیے کسی کا محتاج نہیں ہے کہ کوئی شخص اپنے آپ کو اللہ و رسول کا محسن سمجھ بیٹھے۔ اس کے ہاں قبولیت کا شرف صرف انھی لوگوں کے اعمال کو حاصل ہو گا جو اس کے دین کی خدمت صرف اس کی رضا کے لیے، ٹھیک ٹھیک اس کے مقرر کردہ شرائط کے مطابق، انجام دیں گے اور ساتھ ہی دل سے اس حقیقت کے معترف رہیں گے کہ یہ خدمت انجام دے کر انھوں نے اللہ و رسول پر کوئی احسان نہیں کیا ہے، بلکہ یہ اللہ کا فضل و احسان خود ان کے اوپر ہوا ہے کہ اس نے ان کو اپنے دین کی کسی خدمت کی توفیق بخشی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ (۳)

"یاد رکھو کہ جو لوگ نبی کے آگے اپنی آوازیں پست رکھتے ہیں، وہی ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کی افزایش کے لیے منتخب کیا ہے۔ ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم ہے۔"

یہ اس صحیح ادب کی تعلیم ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں ہر صاحب ایمان کو اختیار کرنا لازم ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ اللہ کے رسول کے آگے اپنی آوازیں پست رکھتے ہیں، درحقیقت،

وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کی افزایش کے لیے منتخب فرمایا ہے۔ لفظ 'اِمْتَحَنَ' یہاں 'اِصْطَفٰی' یا اس کے ہم معنی کسی لفظ پر متضمن ہے، جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر دل تقویٰ کی تخم ریزی اور اس کی افزایش کے لیے موزوں نہیں ہوتا، بلکہ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ امتحان کر کے دلوں کا انتخاب کرتا ہے اور اس انتخاب میں اصل چیز جو ترجیح دینے والی بنتی ہے، وہ یہ ہے کہ آدمی کے اندر اللہ و رسول کے لیے انقیاد و اطاعت کا سچا جذبہ اور ان کے آگے فروتنی کا صحیح شعور ہے یا نہیں۔ یہ چیز جس کے اندر جتنی ہی زیادہ ہوتی ہے، اس کو اتنی ہی زیادہ تقویٰ کی نعمت عطا ہوتی ہے، اور جو لوگ جس درجے میں اس شعور سے عاری ہوتے ہیں، وہ اتنے ہی تقویٰ سے بعید ہوتے ہیں۔ آواز بلند کرنے کا ذکر، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، انسان کے باطن کے ایک مخبر کی حیثیت سے ہوا ہے۔ جو شخص کسی کی آواز پر اپنی آواز بلند رکھنے کی کوشش کرتا ہے، اس کا یہ عمل شہادت دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس سے اونچا خیال کرتا ہے۔ یہ چیز اکتساب فیض کی راہ بالکل بند کر دیتی ہے۔ اگر استاد کے آگے کسی شاگرد کا یہ طرز عمل ہو تو وہ اس کے فیض سے محروم رہتا ہے۔ اسی طرح اگر اللہ کے رسول کے آگے کسی نے یہ روش اختیار کی تو وہ صرف رسول ہی کے فیض سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بھی محروم ہو جائے گا، اس لیے کہ رسول، اللہ تعالیٰ کا نمایندہ ہوتا ہے۔

یہی درجہ اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت کا ہے۔ اللہ تعالیٰ انھی لوگوں کو تقویٰ کے لیے منتخب فرماتا ہے جو اس کی کتاب اور رسول کی سنت کے سامنے فروتنی کی یہی روش اختیار کرتے ہیں جس کی ہدایت رسول کے معاملے میں ہوئی ہے۔ جس شخص کے اندر اللہ و رسول کی ہر بات کے آگے سر جھکا دینے کا سچا جذبہ ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے تقویٰ کی راہیں کھولتا ہے اور ہر قدم پر غیب سے اس کی رہنمائی ہوتی ہے اور اگر کوئی شخص اس خبط میں مبتلا ہے کہ وہ قرآن و حدیث کی اصلاح کرنے کی پوزیشن میں ہے تو اس کا یہ پندار اس کے سارے عمل کو غارت اور اس کی آخرت کو برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔

'لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ': اوپر والی آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر آواز بلند کرنے کا انجام یہ بتایا ہے کہ یہ روش اعمال کو برباد کر دینے والی روش ہے۔ اس کے مقابل میں یہ ان لوگوں کا صلہ بیان ہوا ہے جو اپنی آواز رسول کے آگے پست رکھیں گے۔ فرمایا کہ ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم ہے، یعنی ان کی لغزشیں اور کوتاہیاں اللہ تعالیٰ بخش دے گا، اس لیے کہ انھوں نے اللہ اور رسول کے آگے فروتنی کی روش اختیار کی، کسی گھمنڈ میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو اس سے بڑا سمجھنے کی جسارت نہیں کی۔ ان کی اس فروتنی کا انعام ان کو یہ ملا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو تقویٰ کی افزایش کے لیے منتخب

فرمایا جس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ (۴)

"بے شک جو لوگ تم کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر سمجھ رکھنے والے نہیں ہیں۔"

یہ لوگ جس طرح مجلس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کرنے میں غیر مہذب تھے، اسی طرح یہ حرکت بھی وہ کرتے کہ جب دیکھتے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجلس میں موجود نہیں ہیں تو آتے ہی ازواجِ مطہرات کے حجروں کے باہر ہی سے آپ کو چیخ چیخ کر پکارنا شروع کر دیتے۔ اس قسم کی حرکت بجائے خود بھی نہایت ناشائستہ ہے لیکن اس کا باطنی محرک اس کے ظاہر سے بھی زیادہ مکروہ تھا۔ یہ لوگ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا اور آگے اس کی پوری وضاحت آئے گی، اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ انھوں نے بغیر لڑے بھڑے جو اسلام قبول کر لیا تو یہ اسلام اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کا بہت بڑا احسان ہے، اس وجہ سے یہ اپنا حق سمجھتے تھے کہ جب یہ آئیں تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم، بلا تاخیر، ان کا خیر مقدم کریں۔ اگر کسی وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجلس میں تشریف فرما نہ ہوتے تو انتظار کی زحمت گوارا نہ کرتے، بلکہ فوراً ازواجِ مطہرات کے حجروں کا چکر لگاتا اور چیخ چیخ کر، نہایت بھونڈے طریقہ سے، آپ کا نام لے لے کر، پکارنا شروع کر دیتے۔ فرمایا کہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔ 'اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ' کے الفاظ میں ان لوگوں کی ناسمجھی پر ملامت بھی ہے اور لطیف انداز میں ان کی اس نادانی سے درگزر کرنے کا اشارہ بھی کہ ہرچند ہے تو ان کی یہ حرکت نہایت ناشائستہ، لیکن ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو نہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ و مقام سے آشنا ہیں اور نہ اپنی اس حرکت کے انجام سے، اس وجہ سے یہ تربیت کے محتاج اور درگزر کے لائق ہیں۔

'مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ' میں لفظ 'وَرَآءِ' جو آیا ہے اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ وہ حجروں کے پیچھے سے پکارتے تھے، اس وجہ سے ان کی یہ حرکت قابلِ اعتراض ٹھہری۔ لفظ 'وَرَآءِ' پیچھے یا پچھواڑے کے مفہوم کے لیے خاص نہیں ہے۔ عربی میں 'نادانی من وراء الدار' کا مفہوم صرف یہ ہوگا کہ اس نے گھر کے باہر سے مجھے پکارا، قطع نظر اس سے کہ مکان کے پیچھے سے پکارا یا مکان کے سامنے سے۔ قابلِ اعتراض ان کا اس بھونڈے طریقہ سے پکارنا تھا۔ یہ امر واضح رہے کہ ایک عام مسلمان کو بھی اس طرح پکارنا اسلامی تہذیب کے خلاف ہے، چہ جائیکہ اللہ کے رسول کو۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَیْهِمْ لَكَانَ خَیْرًا لَّهُمْ ۗ

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۵)

"اگر یہ لوگ صبر کے ساتھ اتنا انتظار کر لیتے کہ تم خود ان کے پاس نکل کے آ جاتے تو یہ بات ان کے حق میں بہتر ہوتی اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔"

یہ ان کو صحیح ادب کی ہدایت فرمائی گئی کہ اگر وہ صبر کے ساتھ تمھارے نکلنے تک انتظار کر لیتے تو یہ چیز ان کے لیے بڑے خیر و برکت کا موجب ہوتی۔ آیت کا اسلوب ان کی محرومی پر اظہار حسرت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جس چشمۂ فیض پر پہنچے تھے، اگر انھوں نے اس کی صحیح قدر پہچانی ہوتی تو اس سے سیراب ہو کر لوٹتے لیکن یہ ان کی محرومی ہے کہ وہاں سے کچھ پانا تو درکنار، اپنی نادانی و ناقدرشناسی کے باعث یہ کچھ کھو کے پلٹے۔

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ یہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی صفات غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ کی یاددہانی فرمائی ہے اور مقصود اس سے نہایت لطیف انداز میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ اگرچہ ان کی یہ حرکتیں نہایت ناگوار ہیں، لیکن یہ سمجھ رکھنے والے لوگ نہیں ہیں، اس وجہ سے ابھی ان کی اس طرح کی باتوں سے درگزر کرو، اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے اور یہی عفو و درگزر اس کے رسول کے بھی شایان شان ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْۤا اَنْ تُصِيْبُوْا
قَوْمًاۢ بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ (۶)

"اے ایمان لانے والو! اگر تمھارے پاس کوئی فاسق کوئی اہم خبر لائے تو اس کی اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو، مبادا کسی قوم پر نادانی سے جا پڑو، پھر تمھیں اپنے کیے پر پچھتانا پڑے۔"

یہ مرکز یعنی مدینہ کے مسلمانوں کو اس طرح کے لوگوں کی طرف سے ایک سیاسی خطرہ سے آگاہ فرمایا گیا ہے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ اطراف مدینہ کے بدوی قبائل کے بعض سرداروں کا رویہ بیان ہوا ہے۔ ان کے اندر تربیت سے محرومی کے باعث جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا صحیح شعور مفقود تھا، اسی طرح اسلامی اخوت کے صحیح احساس سے بھی یہ لوگ ابھی ناآشنا تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں ان کے اندر جو رقابتیں اور رنجشیں آپس میں تھیں، ان کے اثرات ہنوز باقی تھے۔ یہ لوگ مدینہ آتے تو ان میں سے بعض اپنے حریفوں کے خلاف غلط صحیح اطلاعات دے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بدگمان کرنے کی کوشش کرتے اور صحابہ میں سے بھی بعض پر ان کا اثر کارگر ہوتا، ان کو اپنے حق میں ہموار کرتے تاکہ مدینہ کی مرکزی طاقت کو اپنے حریفوں کے خلاف اپنے حق میں استعمال کر سکیں۔ یہ ایک نازک صورت حال تھی۔ مدینہ کی حکومت اول تو ابھی اچھی طرح مستحکم نہیں ہوئی تھی۔ ثانیاً، اس قسم کی بے بنیاد افواہ انگیزیوں کی

بنا پر اس کا کوئی اقدام، خاص طور پر مسلمانوں ہی کے کسی گروہ کے خلاف، عدل اور اجتماعی مصلحت، دونوں کے خلاف ہوتا۔ یہ صورت حال متقضی ہوئی کہ مرکز کے مسلمانوں کو یہ ہدایت کر دی جاتی کہ وہ اس طرح کے اہم معاملات میں فیصلہ کلیۃً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صوابدید پر چھوڑیں، غیر ثقہ لوگوں کی روایات پر اعتماد کر کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی رائے سے متاثر کرنے کی کوشش نہ کریں۔ چنانچہ ان کو ہدایت ہوئی کہ اگر کوئی فاسق شخص کسی اہم بات کی خبر دے تو نفس واقعہ کی اچھی طرح تحقیق کیے بغیر اس کی بات پر اعتماد کر کے کوئی اقدام نہ کر بیٹھو، مبادا کہ تم جوش و جذبہ سے مغلوب ہو کر کسی بے گناہ گروہ کے خلاف اقدام کر گزرو، جس پر تمھیں بعد میں پچھتانا پڑے۔

فاسق سے مراد شریعت کے حدود و قیود سے بے پروا لوگ ہیں۔ لفظ 'نبأ' سے مراد کوئی اہم خبر ہوتی ہے، جس کو باور کر لینے یا اس پر عمل کرنے سے دور رس نتائج کے پیدا ہونے کا امکان ہو۔ اس طرح کی اہم خبر اگر کوئی ایسا شخص دے جو دینی و اخلاقی اعتبار سے ناقابل اعتبار ہو تو عقل اور اخلاق، دونوں کا تقاضا یہی ہے کہ اس کی بات اس وقت تک باور نہ کی جائے جب تک خبر اور مخبر، دونوں کی اچھی طرح تحقیق نہ کر لی جائے۔ ہو سکتا ہے کہ خبر دینے والے نے فاسد محرکات کے تحت خبر دی ہو اور خبر یا تو بالکل جھوٹی ہو یا کسی بدنیتی سے اس میں ایسی کمی بیشی کر دی گئی ہو کہ سننے والوں کے جذبات میں اس سے جوش و اشتعال پیدا ہو۔ لفظ 'جہالت' یہاں اس جوش و ہیجان کے معنی میں ہے جس کے پس منظر میں عقل و ہوش کے بجائے نادانی ہو۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۭ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۷-۸)

"اور اچھی طرح جان رکھو کہ تمھارے اندر اللہ کا رسول موجود ہے۔ اگر بہت سے معاملات میں وہ تمھاری بات مان لیا کرے تو تم بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے، لیکن اللہ نے تمھارے سامنے ایمان کو محبوب بنایا اور اس کو تمھارے دلوں میں کھبایا اور کفر و فسق اور نافرمانی کو تمھاری نگاہوں میں مبغوض کیا۔ یہی لوگ ہیں جو اللہ کے فضل و کرم سے راہ راست پانے والے بنے، اور اللہ علیم و حکیم ہے۔"

یہ اسی تنبیہ کی مزید تاکید ہے کہ جب تمھارے اندر اللہ کا رسول موجود ہے تو تمھیں اپنی رائیں اور

اپنے مشوروں کو اتنی اہمیت نہیں دینی چاہیے کہ رسول کو اپنے پیچھے چلانے کی کوشش کرو بلکہ تمھیں ان کے پیچھے چلنا ہے۔ وہ جو قدم بھی اٹھاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں اٹھاتے ہیں۔ اس وجہ سے تمھاری دنیا اور آخرت کی فلاح ان کی پیروی میں ہے، نہ کہ اپنے جذبات کی پیروی میں۔ اگر تمھیں کوئی رائے پیش کرنی ہو تو ادب سے اپنی رائے پیش کر کے، فیصلہ رسول کی صوابدید پر چھوڑ دو۔ یہ خواہش نہ کرو کہ تمھاری ہر رائے 'لازماً' مان ہی لی جائے۔ اچھی طرح یاد رکھو کہ تمھاری بہت سی رائیں خام ہوتی ہیں، اللہ کا رسول ان سب کو اگر مان لیا کرے تو تم بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ وہ تمھاری انھی رایوں کو مانتے ہیں جو صائب ہوتی ہیں۔ ان کی بدولت تمھیں ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کی راہنمائی حاصل ہے تو اس نعمت کی قدر کرو اور اپنے رب کے شکر گزار رہو۔

'عنت' کے معنی زحمت اور مشقت کے ہیں۔ 'لَعَنِتُّمْ' یعنی تم بڑی مشقت و مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ اگر کوئی مریض طبیب کی صوابدید پر عمل کرنے کے بجائے، چاہے کہ طبیب اس کے مشوروں پر عمل پیرا ہو تو ایسے مریض کا خطرے میں پڑ جانا ایک امر بدیہی ہے۔

'وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ' یعنی اللہ تعالیٰ نے تمھیں اس زحمت و مشقت سے بچانے ہی کے لیے یہ اہتمام فرمایا کہ ایمان کو تمھاری نگاہوں میں محبوب بنایا اور اس کو تمھارے دلوں میں رچا بسا دیا اور کفر، فسق اور عصیان کو تمھاری نگاہوں میں مکروہ و مبغوض ٹھہرایا تو اس اہتمام کا حق یہ ہے کہ اب تمھارے اندر ایمان کی محبت و محبوبیت قائم و دائم رہے اور کبھی تمھارے کسی قول و فعل سے اس پر کفر و عصیان کا کوئی دھبا نہ پڑنے پائے۔

'حَبَّبَ' اور 'كَرَّهَ' کے بعد 'اِلٰى' کا صلہ اس اہتمام خاص کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی نگاہوں میں ایمان کو محبوب اور کفر و فسق کو مبغوض بنانے کے لیے اپنے رسول کے ذریعے سے فرمایا۔ دور جاہلیت کی تاریکی میں تمام اقدار بالکل تلپٹ ہو گئے تھے۔ شیطان نے ایمان کو لوگوں کی نگاہوں میں مکروہ و مبغوض اور کفر و فسق کو محبوب و مطلوب بنا دیا تھا۔ ایمان اس طرح تہ بہ تہ پردوں کے اندر محجوب و مستور ہو گیا تھا کہ ان کو چاک کر کے ایمان کے حقیقی حسن و جمال کو خلق کے لیے بے نقاب کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف بن گیا تھا۔ اسی طرح کفر کو شیطان نے مصنوعی غازوں سے اس طرح پرفریب بنا دیا تھا کہ اس کی اصل گھنونی شکل و صورت لوگوں کو دکھانا ہفت خواں طے کرنے کے برابر تھا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی عنایت ہوئی کہ اس نے اپنا رسول بھیجا جس نے ایک طویل جدوجہد اور جہاد کے بعد ایمان کو

اس کی اصلی محبوب شکل میں لوگوں کو دکھایا اور اس کے جمال کو ان کے دلوں میں لبایا۔ اسی طرح کفر کے چہرے کے مصنوعی غازہ کو اتار کر اس کی اصل مکروہ اور گھنونی شکل سے لوگوں کو آشنا اور اس سے بیزار کیا۔ اسی مضمون کو یہاں 'حَبَّبَ اِلَی' اور 'کَرَّہَ اِلَی' کے الفاظ سے ادا فرمایا ہے یعنی ایمان اور کفر، دونوں کو ان کی حقیقی شکل وصورت میں تمھارے آگے پیش کیا، جس سے تم ایمان کے دل دادہ بنے اور کفر سے بیزار ہوئے۔ گویا یہ دونوں فعل 'قَدَّمَ' کے مضمون پر متضمن ہیں اور حرف 'اِلَی' اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

یہاں 'حَبَّبَ' کے مفعول کی حیثیت سے توصرف 'ایمان' کا ذکر ہے لیکن 'کَرَّہَ' کے ساتھ کفر، فسق اور عصیان، تین چیزوں کا ذکر ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں جن لوگوں کے کردار پر تبصرہ ہو رہا ہے، وہ ابھی، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ان باتوں سے اچھی طرح آشنا نہیں تھے جو ایمان کی ضد ہیں۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ ان کو وضاحت سے یہ بات بتائی جائے کہ صرف کفر ہی ایمان کے منافی نہیں ہے، بلکہ فسق وعصیان کے قسم کی ساری باتیں بھی اسی شجرۂ ملعونہ کے برگ وبار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی مبغوض ٹھہرایا۔

لفظ 'فسق'، یوں تو قرآن میں کفر کی جگہ بھی استعمال ہوا ہے لیکن یہاں، چونکہ یہ کفر کے ساتھ آیا ہے، اس وجہ سے اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ حکم عدولی ہوگی جس کا ارتکاب کوئی شخص ایمان کا مدعی ہوتے ہوئے کرے۔ لفظ 'عصیان'، یہاں موقع ومحل اشارہ کر رہا ہے کہ رسول کی نافرمانی کے لیے آیا ہے۔ رسول کے خلفا وامرا کی نافرمانی بھی، چونکہ بالواسطہ رسول ہی کی نافرمانی ہے، اس وجہ سے یہ چیز بھی اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہے۔

'اُولٰٓئِکَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ہ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ط وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ'۔

فرمایا کہ یہی لوگ، جن کے دلوں میں ایمان کا جمال گھر کیے ہوتے ہے اور جو کفر، فسق اور عصیان کے ہر شائبہ سے بیزار ونفور ہیں، درحقیقت، اصل ہدایت پر ہیں اور یہ ہدایت ان کو اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کے انعام سے حاصل ہوئی ہے، اس وجہ سے ان کو اس پر اپنے رب ہی کا شکر گزار رہنا چاہیے، خام کاروں کی طرح اس وہم میں کسی کو نہیں مبتلا ہونا چاہیے کہ اس کو یہ چیز از خود مِل گئی ہے اور وہ خدا اور رسول کا کوئی محسن بن گیا ہے۔ 'عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ' کی صفات کا حوالہ اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فعل اس کے علم اور اس کی حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کی تعلیم کسی اندھے کی تعلیم نہیں ہے، وہ اپنے دین کی نعمت انھی کو دیتا ہے جن کو وہ اس کا اہل پاتا ہے۔

یہ آیت مدینہ کے مسلمانوں کی تعریف میں ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے برابر فیض یاب اور اللہ کے رنگ میں اچھی طرح رنگے ہوتے تھے اور سیاق و سباق دلیل ہے کہ اس میں ان خام کار مسلمانوں پر تعریض بھی ہے، جن کی خامیوں پر سورہ کی ابتدا ہی سے تبصرہ ہو رہا ہے اور جن کا تعلق اطراف مدینہ کے قبائل سے تھا۔

آیت ۶ کے تحت ہمارے مفسرین نے، اپنی عادت کے مطابق، ایک شانِ نزول کا بھی ذکر کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو تحصیلِ زکوٰۃ کے لیے بنی مصطلق کے پاس بھیجا۔ جب یہ وہاں پہنچے تو بنی مصطلق کے لوگ بشکل جلوس ان کے خیر مقدم کے لیے نکلے۔ ولید نے گمان کیا کہ یہ لوگ ان سے لڑنے کو نکلے ہیں۔ وہ ڈر کر فوراً وہاں سے واپس آ گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ وہ لوگ مرتد ہو گئے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرنے سے انھوں نے انکار کر دیا۔[1] یہ خبر سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم بنی مصطلق پر نہایت برہم ہوتے اور ان کی سرکوبی کے لیے آپ نے ایک دستہ بھیج دیا یا بھیجنے کا فیصلہ فرما لیا کہ اتنے میں بنی مصطلق والوں کو اطلاع ہو گئی اور ان کے سردار نے فوراً مدینہ حاضر ہو کر بقید قسم حضور کو اطمینان دلایا کہ ہم نے تو ولید کی شکل بھی نہیں دیکھی، زکوٰۃ روکنے کا کیا سوال! ان کی طرف سے صفائی کے بعد ان کا معاملہ تو رفع دفع ہو گیا، لیکن ہمارے مفسرین کے نزدیک ولید کی اسی روایت کی بنا پر یہ آیت اتری اور مسلمانوں کو یہ ہدایت فرمائی گئی کہ وہ کسی فاسق کی روایت پر اعتماد کر کے کوئی عاجلانہ قدم نہ اٹھایا کریں۔

ہمارے مفسرین کوئی نہ کوئی شانِ نزول تو تقریباً ہر آیت کے تحت درج کرتے ہیں، اوپر آیت 'اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَکَ ..... الآیۃ' کے تحت بھی انھوں نے ایک شانِ نزول کا حوالہ دیا ہے، لیکن اس سے ہم نے اس وجہ سے تعرض نہیں کیا کہ بعض ناقدین نے اس پر جرح بھی کر دی ہے۔ مگر اس شانِ نزول پر سب متفق ہیں، اس وجہ سے اس سے تعرض ناگزیر ہے۔

شانِ نزول سے متعلق یہ اصولی حقیقت ہمیشہ مستحضر رکھیے کہ سلف کسی آیت کے تحت اگر کسی واقعہ کا ذکر شانِ نزول کی حیثیت سے کرتے ہیں تو اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ بعینہٖ وہی واقعہ اس آیت کے نزول کا سبب ہوا ہے، بلکہ اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ آیت سے اس واقعہ کا حکم بھی

---

[1] بعض راویوں کا بیان ہے کہ ڈرے نہیں، بلکہ ان کے دل میں پہلے سے بنی مصطلق کے خلاف رنجش تھی، اسی وجہ سے ان سے ملے بغیر واپس آ گئے اور یہ بات بنائی کہ انھوں نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔

مستنبط ہوتا ہے۔ یہ رائے اصولِ تفسیر کے ماہرین کی ہے، اس وجہ سے میں نے اس کا حوالہ دیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ امر بھی معلوم ہے کہ شانِ نزول سے متعلق روایات بیشتر ضعیف بلکہ بے بنیاد ہیں، اس وجہ سے ان کو عقل و نقل کی کسوٹی پر پرکھے بغیر مان لینے سے اسی فتنہ میں پڑ جانے کا اندیشہ ہے، جس سے آیت زیرِ بحث میں اہلِ ایمان کو روکا گیا ہے۔

اس شانِ نزول کو درایت کی کسوٹی پر جانچیے تو معلوم ہوگا کہ اس کی کوئی کل بھی سیدھی نہیں ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ آیت میں فاسق کی روایت پر اعتماد کرنے سے روکا گیا ہے، جب کہ ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کے متعلق اس واقعے سے پہلے کوئی بات بھی ایسی لوگوں کے سامنے نہیں آئی تھی جس سے معلوم ہو سکتا کہ نعوذ باللہ، وہ فاسق ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ ان کے فسق کی کوئی شہادت موجود نہیں تھی، بلکہ ان کی ثقاہت و عدالت کا یہ مرتبہ تھا کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تحصیلِ زکوٰۃ کے ذمہ دارانہ منصب پر مامور فرمایا۔ اگر ان کے اندر اس قسم کا کوئی کھوٹ ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اس اہم خدمت کے لیے کس طرح منتخب فرماتے؟

دوسری بات یہ ہے کہ اس شانِ نزول کو باور کر لیجیے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ نعوذ باللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ سے اتنے ناواقف تھے کہ ایسے لوگوں کو ذمہ دارانہ مناصب پر مامور فرما دیتے تھے جو اپنی دروغ بافی سے حکومت اور رعایا، دونوں کو خطرے میں ڈال دیں۔ اس قسم کی بے بصیرتی ایک عام معقول آدمی سے بھی بعید از قیاس ہے، چہ جائیکہ اس کا صدور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر ولید رضی اللہ عنہ استقبال کرنے والی پارٹی کو جنگ جو پارٹی سمجھ کر اس سے ڈر کے واپس آ گئے تھے اور اپنا تاثر انھوں نے حضور کے سامنے یہ بیان کیا کہ بنی مصطلق نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا ہے تو ان کی یہ بات سادہ لوحی اور کمزوری تو قرار دی جا سکتی ہے، لیکن ازروے شریعت اس کو فسق نہیں کہا جا سکتا۔ پھر تو اس مضمون کی آیت اترنی تھی کہ مسلمانو، تم اپنے ذمہ دارانہ عہدے ایسے سادہ لوحوں کے سپرد نہ کیا کرو جو استقبال کرنے والوں اور لڑنے والوں کے درمیان امتیاز کرنے سے بھی قاصر ہوں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ حضرت ولید اتنے سادہ لوح ہوتے تو کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو ایسی اہم مالی اور سیاسی ذمہ داری سپرد کر دیتے؟ کیا کسی شخص کے اندر سادہ لوحی کوئی ناگہانی طور پر پیدا ہو جانے والی چیز ہے جو لوگوں سے مخفی رہے، یہاں تک کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا اندازہ نہ ہو سکے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ یہی حضرت ولید ہیں جن کو سیدنا عثمانِ غنی نے اپنے دورِ خلافت میں کوفہ کا گورنر بنایا۔ غور کیجیے کہ کیا حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ اس بات سے واقف نہیں تھے کہ یہ شخص ازروے نصِ

قرآن فاسق قرار پا چکا ہے اور گورنری تو درکنار، اسلامی قانون کی رُو سے یہ کسی روایت یا شہادت کا بھی اہل نہیں ہے۔ اگر ناواقف تھے تو یہ ماننا ہے کہ حضرت عثمان جیسے خلیفۂ راشد، جن کو جامع قرآن ہونے کا بھی شرف حاصل ہے، نعوذ باللہ، قرآن کا اتنا علم بھی نہیں رکھتے تھے جتنا علم شانِ نزول کی روایتیں کرنے والے ان راویوں کو تھا۔

میں نے اس شانِ نزول کے صرف چند پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے، ورنہ اضطراب اس کے ہر پہلو میں ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تادیبی دستہ روانہ کر دیا تھا، بعض میں ہے کہ روانہ کرنے کا فیصلہ فرما لیا تھا اور بنی مصطلق کو الٹی میٹم دے دیا تھا کہ اگر تم لوگ اپنی حرکت سے باز نہ آئے تو میں تمھاری سرکوبی کے لیے ایسے شخص کو بھیجوں گا جو 'عندی کنفسی' (جو میرے نزدیک میری اپنی ذات کی طرح ہے)۔ ساتھ ہی حضرت علی کے شانے پر تھپتھپاتے ہوئے ان کی حوصلہ افزائی بھی فرمائی کہ اس مہم کو یہ سر کریں گے۔ بعض روایات میں اس کے برخلاف یہ ہے کہ اس مہم پر آپ نے حضرت خالد کو بھیجا۔ غرض جتنے منہ، اتنی ہی باتیں ہیں، حالانکہ 'لَوۡ یُطِیۡعُکُمۡ فِیۡ کَثِیۡرٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ' سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس طرح کی کوئی بات آئی بھی تو آپ نے ٹال دی اور لوگوں کو تنبیہ کر دی گئی کہ وہ پیغمبر کو اپنی رایوں سے متاثر کرنے کی کوشش نہ کریں۔

میرے نزدیک یہ شانِ نزول روافض کی 'ایجادات' میں سے ہے، جس سے انھوں نے صرف حضرت ولید ہی کو بدنام کرنا نہیں چاہا ہے، بلکہ حضرت عثمان کو بھی مطعون کرنے کی کوشش کی ہے کہ انھوں نے یہ جانتے بوجھتے کہ یہ شخص فاسق ہے محض ازراہِ کنبہ پروری[1] اس کو کوفہ کا گورنر بنا دیا۔ پھر کوفہ کی گورنری کے دوران میں بھی ان ظالموں نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا، بلکہ ان کے فسق کے ایسے واقعات کی روایت کی ہے جن کو سن کر ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی۔ ہنسی ان ظالموں کی ذہانت پر آتی ہے اور رونا اپنے مفسرین کی سادگی پر کہ اس قسم کی بے سروپا روایتیں تفسیر کی کتابوں میں نقل کر دیتے ہیں، حالانکہ آیت کے الفاظ اور اس کے سیاق و سباق سے ان کو کوئی دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔

---

[1] یہ امر واضح رہے کہ حضرت ولید، سیدنا عثمان غنی کے رشتہ دار بھی تھے۔

ترتیب : ساجد حمید

" قرآن مجید نے یہ تلقین کی ہے کہ ہم دین پر صحیح طور سے اسی صورت میں قائم رہ سکتے ہیں، اور فرقہ بندی کے فتنوں سے اسی صورت میں بچ سکتے ہیں، جب ہم اپنے اندر کے صالح لوگوں (اصحاب حل وعقد) کے ایک گروہ کو اقتدار کی ذمہ داری سونپ دیں، اور وہ ہمارے اندر دعوت حق کی خدمت سرانجام دے۔ اس دعوت کے بعد بھی، اگر ضرورت پڑے، تو نیکی کو اختیار کرنے کا حکم دے۔ اور اگر نیکی کی دعوت اور اس کے فروغ کے باوجود برائی معاشرے میں سر اٹھائے، تو اس کو بزور روک دے، تاکہ نظام خیر پر چلتا رہے۔"

حدیث و سنت

ساجد حمید

التزام جماعت کی حکمت

عن ابی ذر، عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم، انه قال: اثنان خیر من واحد، و ثلاث من اثنین، و اربعة خیر من ثلاثة، فعلیکم بالجماعة۔

[احمد بن حنبل]

ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: دو ایک سے بہتر ہوتے ہیں، اور تین دو سے اور چار تین سے، اسی لیے تم پر نظم اجتماعی سے وابستگی واجب کی گئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معمول کی زندگی کے تجربات سے ایک دلیل دے کر التزام جماعت کی اہمیت بیان کی ہے کہ یہ سیدھا سا اصول ہے کہ اکیلا آدمی دو کے مقابلے میں کمزور ہے، اور اسی طرح دو تین کے مقابلے میں اور تین چار کے مقابلے میں۔ اسی لیے تم پر 'الجماعة' (نظم اجتماعی) سے وابستگی واجب کر دی گئی ہے، کیوں کہ ایک متحد منظم جماعت جس میں سیاسی نظم قائم ہو، اور لوگ ایک حکمران کی اطاعت میں زندگی گزار رہے ہوں، وہ ایک منتشر بھیڑ کے مقابلے میں بہتر ہے جس کا ہر فرد دوسرے سے الگ اور بے تعلق ہو۔

فتنوں سے بچنے اور دشمن کے مقابلے میں مضبوط و محکم رہنے کے لیے، ضروری ہے کہ قوم ایک مرکز سے وابستہ ہو۔ چنانچہ، جب تک، ملت اسلامیہ ایک مرکز سے وابستہ رہے گی، اس وقت تک، فتنوں سے محفوظ رہے گی۔ جس طرح اکیلا آدمی بھاری دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اسی طرح اکیلا مسلمان بھی

شیطان جیسے دشمن کا مقابلہ نہ کر سکے گا، اور انتشار کے باعث ملتِ اسلامیہ بھی دشمن کے مقابلے میں، زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے گی۔ آپ نے اسی بات کو ایک تمثیل میں واضح فرمایا ہے:

عن معاذ بن جبل ان النبی صلی اللہ علیہ و سلم قال ان الشیطان ذئب الانسان کذئب الغنم یاخذ الشاۃ القاصیۃ و الناحیۃ، فایاکم والشعاب و علیکم بالجماعۃ و العامۃ و المسجد۔

(احمد بن حنبل)

"معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شیطان انسان کے لیے ایسے ہی ہے، جیسے کہ بکریوں کے ریوڑ کے لیے بھیڑیا جو ریوڑ سے الگ اور اس سے گریزاں ہو کر چلنے والی بھیڑ کو کھا جاتا ہے۔ شیطان کے اس شر سے بچنے کے لیے تم پر واجب ہے کہ ہر ممکن انتشار سے بچو اور حکومت کی اطاعت پر کمربستہ رہو (اور سیاسی امور میں) اکثریت کی پیروی کرو۔ (اور ریوڑ کے ساتھ رہو، اس سے الگ ہو کر نہ چلو اور اسی مقصد کے لیے) مسجد سے بھی جڑے رہو کہ وہ اجتماعیت کا مرکز ہے۔"

ایک اور موقع پر، آپ نے اس تمثیل کو کھول کر بیان کیا ہے کہ میرے بعد، فتنے اٹھیں گے۔ پہلی امتوں میں، ان فتنوں کو کچلنے کے لیے، انبیا آتے تھے، مگر چونکہ اب کسی اور نبی کو نہیں آنا، اس لیے، تم ان فتنوں سے بچنے کے لیے اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھنا، حقوق العباد ادا کرتے رہنا، اور نظمِ اجتماعی سے وابستہ رہنا۔ ورنہ فتنوں کا یہ شیطانی بھیڑیا تمھیں بھی نگل جائے گا:

ایھا الناس انہ لم یکن نبی قبلی الا کان حقا علیہ ان یدل امتہ علی ما یعلمہ خیر لھم و ینذرھم ما یعلمہ شرا لھم الا و ان عافیۃ ھذہ الامۃ فی اولھا و سیصیب آخر

"اے لوگو، مجھ سے پہلے کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس پر یہ لازم نہ رہا ہو کہ وہ اپنی قوم کی راہنمائی ان کے بھلے کی طرف کرے اور ان کے برے سے انھیں متنبہ کر دے۔ (میں بھی تمھیں اچھے اور برے سے آگاہ کرنے آیا ہوں) تو آگاہ رہو کہ اس امت کا پہلا دور تو عافیت کا دور ہے۔ بعد کا دور فتنوں کا ہے، جس میں فتنے پے در پے اٹھیں گے۔ تو جب کوئی

ها بلاء وفتن يرقق بعضها	فتنہ اٹھے گا، تو بندۂ مومن کہے گا کہ یہ میری
بعضا تجیء الفتنة فيقول	ہلاکت ہے۔ پھر وہ فتنہ فرو ہو جائے گا،
المومنين هذه مهلكتي ثم	پھر ایک اور فتنہ اٹھے گا، تو وہ کہے گا کہ یہ
تنكشف ثم تجيء فيقول هذه	میری ہلاکت ہے۔ پھر وہ فتنہ بھی جاتا رہے
هذه، ثم تجيء فيقول هذه هذه	گا۔ تو جو چاہتا ہے کہ ان فتنوں کی وجہ سے
ثم تنكشف فمن احب ان	دوزخ میں پڑنے سے بچا کر جنت میں داخل
يزحزح عن النار ويدخل	کیا جائے، تو چاہیے کہ اسے، اس حالت میں
الجنة فلتدركه منيته وهو يؤمن	موت آئے کہ وہ اللہ اور آخرت کو مانتا ہو، اور
بالله واليوم الآخر و يأتي	لوگوں کے ساتھ ویسے ہی پیش آئے، جیسا
الى الناس مايحب ان يوتى	وہ چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ پیش آیا جائے
اليه ومن بايع اماما فاعطاه	اور جو کسی حکمران کے ہاتھ پر بیعت کرے اور
صفقة يده وثمرة قلبه	اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر دل سے
فليطعه ان استطاع۔	اطاعت کا عہد کرے تو اسے چاہیے کہ وہ
(نسائی، کتاب البیعہ)	حتی الامکان، اس کی اطاعت کرتا رہے۔

یعنی، ملت کے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کی سازشوں اور کارگزاریوں سے بچنے کے لیے یہ لازم کیا گیا ہے کہ ہم 'الجماعة' کے ساتھ وابستہ و پیوستہ رہیں۔

یہ حکم سورۂ آلِ عمران کی ایک آیت پر مبنی ہے۔ قرآنِ مجید نے یہ تلقین کی ہے کہ ہم دین پر، صحیح معنی میں، اسی صورت میں قائم رہ سکتے ہیں، اور فرقہ بندی کے فتنوں سے، اسی طرح بچ سکتے ہیں کہ ہم اپنے اندر کے صالح لوگوں یعنی اصحابِ حل وعقد کے ایک گروہ کو اقتدار کی ذمہ داری سونپ دیں، اور وہ ہمارے اندر دعوتِ حق کی خدمت سر انجام دیں۔ اس دعوت کے بعد بھی اگر ضرورت پڑے، تو نیکی کو اختیار کرنے کا حکم دیں۔ اور نیکی کی دعوت اور اس کے فروغ کے باوجود برائی معاشرے میں سر اٹھائے، تو اس کو بزور روک دیں، تاکہ نظامِ خیر پر چلتا رہے۔ چنانچہ قرآن کا فرمان ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا،	"اللہ کی رسی کو مضبوطی سے مل کر تھامے رہو،
وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ	اور تفرقے میں نہ پڑو اور اللہ کے اس فضل

اللہِ عَلَیۡکُمۡ اِذۡ کُنۡتُمۡ اَعۡدَآءً	کو یاد رکھو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے'
فَاَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِکُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ	تو اللہ نے تمھارے دلوں کو ایک دوسرے
بِنِعۡمَتِہٖۤ اِخۡوَانًا وَ کُنۡتُمۡ عَلٰی	کے ساتھ جوڑ دیا۔ اور تم ایک دوسرے کے
شَفَا حُفۡرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنۡقَذَ	بھائی بھائی بن گئے۔ اور تم آگ کے ایک
کُمۡ مِّنۡہَا ؕ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمۡ	گڑھے پر کھڑے تھے' تو اللہ نے تمھیں اس
اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمۡ تَہۡتَدُوۡنَ ۔ وَ	اس سے بچا لیا۔ اسی طرح اللہ تمھارے لیے
لۡتَکُنۡ مِّنۡکُمۡ اُمَّۃٌ یَّدۡعُوۡنَ اِلَی	اپنی ہدایات کو واضح کرتا ہے' تاکہ تم راہ یاب
الۡخَیۡرِ وَ یَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ	ہو۔ اور اس لیے چاہیے کہ تم میں سے ایک
وَ یَنۡہَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ ؕ وَ اُولٰٓئِکَ	(بااختیار) گروہ ہو' جو نیکی کی دعوت دے' معروف
ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ۔	کا حکم کرے' اور منکر سے روکے اور یہی لوگ
(آل عمران ۳: ۱۰۳، ۱۰۴)	فلاح پانے والے ہیں۔

اس باب کی تمام روایات' اسی آیت پر مبنی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت ہی کے مختلف پہلوؤں کی توضیح کرتے ہوئے' یہ احکام دیے ہیں۔ اگر اس آیت پر تدبر کی نگاہ ڈالی جائے' تو یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ ہم 'اعتصام بحبل اللہ' پر قائم رہنے اور تفرقے سے بچنے کے لیے' اپنے اندر ایک نظمِ اجتماعی قائم کریں۔ 'وَلۡتَکُنۡ مِّنۡکُمۡ اُمَّۃٌ' کا مطلب یہی ہے۔ چنانچہ جب کسی چیز کے بنانے یا قائم کرنے کا حکم دیا جاتا ہے' تو بننے کے بعد' اس کو قائم رکھنے کے لیے' اس کے ساتھ تعاون کرنا اور اس کے خلاف اقدامات نہ کرنا' اس حکم میں خود بخود شامل ہے۔ یہی چیز "علیکم بالجماعۃ" ہے۔

قرآنِ مجید میں' یہ حکم جس سیاق میں آیا ہے' اس پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ 'وَلۡتَکُنۡ مِّنۡکُمۡ اُمَّۃٌ' میں قیامِ ریاست کا' یہ حکم اس لیے دیا جا رہا ہے کہ ملت متحد رہ کر نیابتِ رسول کے لیے تیار رہے' اور رسول اللہ کی نیابت میں' 'شہادت علی الناس' کا فریضہ سرانجام دے سکے۔ اس منصبِ امامت پر قائم رہنے کے لیے' جس طرح شریعت اور نظامِ عدل پر قائم رہنا ضروری ہے' اسی طرح ایک مرکز اور نظمِ اجتماعی سے وابستگی بھی اس کے لیے' اشد ضروری ہے۔ چنانچہ 'التزامِ جماعت' کے حکم سے مقصود' اصل میں' یہی ہے کہ ملت وحدتِ ریاست پر قائم رہے' اس میں انتشار پیدا نہ ہو۔ انتشار اس کے لیے عذابِ الٰہی اور وحدت اس کے لیے رحمتِ خداوندی

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے یہ حکم اس قدر تاکید کے ساتھ دیا ہے کہ اگر اس موضوع کی تمام روایات کو جمع کر کے پڑھا جاتے، تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا توحید، معاد اور رسالت کے بعد، یہ اسلام کا سب سے بڑا حکم ہے۔ جس سے انحراف، اسی طرح، دوزخ کی سزا کا باعث ہے، جس طرح توحید، رسالت سے انحراف۔

اس حکم میں، پیش نظر ایک چیز اور بھی ہے، جس کو آپ نے اپنے دوسرے ارشادات میں واضح فرمایا ہے کہ ان فتنوں کا مقابلہ تائیدِ الٰہی کے بغیر ممکن نہیں ہے، اور تائیدِ الٰہی صرف اس صورت میں نازل ہوگی جب ہم اس کے حکم کے مطابق باہم دگر متحد رہیں۔ مسندِ احمد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو فرمان اس طرح نقل ہوتے ہیں:

ید الله علی الجماعة.	"الجماعۃ' کے قائم رہنے میں اللہ کی تائید و نصرت ہے۔"
الجماعة رحمة والفرقة عذاب.	"الجماعۃ' کا قائم رہنا اللہ کی رحمت ہے، اور اس کا منتشر ہونا عذابِ الٰہی ہے۔"

چنانچہ مذکورہ آیت کی روشنی میں 'علیکم بالجماعة' کا مطلب یہ ہے کہ ملت کو نیابتِ رسول میں منصبِ امامت پر برقرار رکھنے کے لیے، اسے قرآن و سنت پر قائم اور ایک پلیٹ فارم پر مجتمع رکھنے والی ریاست کے ساتھ اس غرض سے وابستہ رہا جائے کہ وہ انتشار کا شکار ہو کر منصبِ امامت سے معزول نہ ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے منحرف ہونے والے کی سزا دوزخ ہے، کیونکہ وہ انتشارِ ملت کا باعث بنتا ہے، خود قرآن نے بھی یہ کہا ہے 'أُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ' کہ حکومت کے بارے میں مذکورہ حکم کی تعمیل کرنے والے ہی فلاح پائیں گے، جس کا نقیض ظاہر ہے، خود بخود ثابت ہو جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بات کو 'میتة جاھلیة' سے تعبیر فرمایا ہے:

من رای من امیره شیئا یکرهه فلیصبر فانه من فارق السلطان شبرا مات میتة جاهلية. (مسلم، کتاب الامارۃ)	"جو شخص اپنے حکمران میں کوئی ناپسندیدہ بات دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ اس کی اطاعت پر جما رہے، کیونکہ جو بالشت برابر بھی اقتدار کی اطاعت سے نکلا، وہ جاہلیت کی موت مرا۔"

خلاصہ یہ کہ فتنوں سے بچنے اور دشمن کے مقابلے میں مضبوط و محکم رہنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق یہ ضروری ہے کہ اہلِ ایمان نظمِ اجتماعی سے جڑے رہیں جب

تک وہ ملتِ اسلامیہ کے اس مرکز سے وابستہ رہیں گے، اس وقت تک فتنوں سے محفوظ رہیں گے، کیونکہ ایک متحد گروہ ایک منتشر بھیڑ سے بہتر ہے۔ جس طرح اکیلا آدمی بھاری دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اسی طرح اکیلا مسلمان بھی شیطان، جیسے دشمن کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ اور انتشار کے باعث ملتِ اسلامیہ بھی دشمن کے مقابلے میں زیادہ دیر نہ ٹھیر سکے گی۔ اسی طرح کا حکم وہ بھی ہے، جس میں مسلمان کو دار الکفر میں رہنے سے روکا گیا ہے۔

محمد رفیع مفتی

تعلق بالقرآن

عن ابی موسی اشعری، قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، مثل المومن الذی یقراء القرآن مثل الاترجۃ ریحھا طیب وطعمھا طیب۔ ومثل المومن الذی لایقراء القرآن مثل التمرۃ لاریح لھا وطعمھا حلو۔ ومثل المنافق الذی لا یقراء کمثل الحنظلۃ لیس لھا ریح وطعمھا مر۔ ومثل المنافق الذی یقراء القرآن مثل الریحانۃ ریحھا طیب و طعمھا مر۔

(مشکوٰۃ، کتاب فضائل القرآن)

"ابوموسیٰ اشعری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس مومن کی مثال جو قرآن پڑھتا ہے، ترنج[1] کی سی ہے جس کی خوشبو بھی اچھی ہے اور ذائقہ بھی۔ اور قرآن نہ پڑھنے والے مومن کی مثال کھجور کی سی ہے، جس کی خوشبو تو نہیں ہوتی، مگر ذائقہ میٹھا ہوتا ہے۔ اور قرآن نہ پڑھنے والے منافق کی مثال اندرائن[2] کی سی ہے، جو ذائقہ میں کڑوا ہوتا ہے، اور اس میں خوشبو بھی نہیں ہوتی۔ اور قرآن مجید پڑھنے والے منافق کی مثال گل ریحان کی سی ہے، جس کی خوشبو تو اچھی ہوتی ہے، مگر ذائقہ بہت کڑوا ہوتا ہے۔"

یہ ابوموسیٰ اشعری کی روایت ہے۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تمثیل سے یہ سمجھایا ہے کہ قرآن مجید سے تعلق کی کیا کیا نوعیتیں ہیں۔ اور سب سے اچھا تعلق کیا ہے۔ چنانچہ پہلی دو مثالیں مومن خالص کے حوالے سے ہیں، اور دوسری دو مثالیں ان لوگوں کے بارے میں ہیں، جو اپنے ایمان میں سچے نہیں ہیں۔ پہلی مثال میں دیکھیے کہ آپ نے اس بندۂ مومن کی مثال دی ہے، جو نہ صرف اپنے ایمان میں سچا

---

[1] ترنج، چکوترے کی طرح سٹرس (CITRUS) قسم کا ایک صحرائی پھل۔

[2] اندرائن، حنظل، خربوزے کی طرح کا ایک پھل، جو دیکھنے میں خوبصورت اور ذائقہ میں کڑوا ہوتا ہے۔

ہے، بلکہ قرآن سے بھی شغف رکھتا ہے، وہ اسے پڑھتا ہے اور پڑھاتا بھی ہے۔ اس کی مثال ترنج کی سی ہے، یعنی وہ ترنج کی طرح اپنی ذات میں بھی خوب ہے، اور جو کچھ اس سے، قرآن کی صورت میں، لوگوں کو حاصل ہو رہا ہے، وہ بھی ترنج کی خوشبو کی طرح نہایت اچھا ہے۔ یعنی، قرآن کی صورت میں جو پیغامِ ربانی اس کے پاس ہے، وہ خوشبو بن کر عالم میں پھیل رہا ہے۔ سچا مومن ہونے کی وجہ سے اس کا وجود دوسروں کے لیے سراپا خیر ہے۔ یعنی، وہ خود بھی میٹھا ہے اور اس کی خوشبو بھی بہت عمدہ ہے۔

دوسری مثال اس بندۂ مومن کی ہے، جو قرآن سے اس طرح کا گہرا تعلق نہیں رکھتا۔ اس کی مثال کھجور کے پھل کی سی ہے، جس کا ذائقہ تو اچھا ہے، لیکن اس میں خوشبو نہیں ہوتی۔ یعنی، یہ شخص، مومن ہونے کی وجہ سے تو لوگوں کے لیے سراپا خیر ہے، لیکن قرآن کے ساتھ مطلوب تعلق نہ ہونے کی وجہ سے اس کے پاس جو دعوت ہے، وہ دوسروں تک پہنچ نہیں پاتی۔ گویا وہ خود تو میٹھا ہے، لیکن دعوتِ خیر اس کی ذات سے خوشبو کی طرح نہیں پھیلتی۔

تیسری مثال اس منافق کی ہے، جو قرآن کو پڑھتا پڑھاتا بھی نہیں ہے، اور سچا مومن بھی نہیں ہے، یعنی وہ اپنی ذات میں بھی اچھا نہیں ہے اور لوگوں کو دینے کے لیے بھی اس کے پاس قرآن جیسی اچھی دعوت نہیں ہے۔ گویا وہ اندرائن کی طرح کڑوا ہے۔ یعنی لوگوں کے ساتھ اس کا تعلق، خیر کا نہیں ہوگا۔ وہ نفاق اور بے یقینی پھیلانے کا باعث بنے گا۔ اس کی خوشبو نہیں ہے، یعنی اس سے کوئی خیر لوگوں کو میسر نہیں آئے گا۔ اس تشبیہ میں ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ اندرائن دیکھنے میں بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ اسے پہلی مرتبہ دیکھنے والا لذیذ اور اعلیٰ قسم کا پھل سمجھتا ہے، جب کہ وہ نہایت کڑوا ہوتا ہے۔ یہی حال منافق کا بھی ہوتا ہے کہ وہ بظاہر تو مومن ہوتا ہے، مگر اندر سے وہ منافقت کی تلخی سے بھرا ہوتا ہے۔

چوتھی مثال اس منافق کی ہے، جو اپنے نفاق کے ساتھ قرآنِ مجید کو پڑھتا پڑھاتا ہے۔ فرمایا کہ اس کی مثال ریحان کی طرح ہے، جو ذائقہ میں کڑوا، البتہ خوشبو میں نہایت خوشگوار ہوتا ہے۔ منافق، اپنی ذات میں برا ہے، یعنی ریحان کی طرح کڑوا ہے، لیکن قرآنِ مجید کے پڑھنے پڑھانے سے لوگ حق کی خوشبو اس سے پاتے رہتے ہیں۔

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنِ مجید کے ساتھ مختلف رویوں کی نشان دہی مثالوں کے ذریعے سے فرمائی ہے جس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ کون سا رویہ آپ کے نزدیک سب سے زیادہ اچھا ہے۔ اس روایت میں ایک خاص بات اس بے مثال پیغمبرانہ تکلم کی ایک جھلک ہے جس میں داعیانہ رنگ بھی ہے اور معلمانہ شان بھی۔

چنانچہ سب سے بہتر وہ آدمی ہے جو بندۂ مومن ہونے کے ساتھ ساتھ قرآن مجید پڑھتا پڑھاتا بھی ہو۔
اسی بات کو آپ نے ایک اور موقع پر اس طرح بیان فرمایا ہے:

خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ۔ "تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جس نے
(بخاری کتاب فضائل القرآن) قرآن سیکھا اور دوسروں کو سکھایا۔"

(جاوید احمد صاحب غامدی کے درس سے ماخوذ)

ترتیب : طالب محسن

"اخروی زندگی میں نجات اور اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ دنیا کی یہ زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق گزاری جائے۔ اس طرح نجاتِ اخروی کے حصول کی منطقی ترتیب یہ بنتی ہے کہ حصولِ نجات اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک دنیا کی زندگی اللہ کے احکام کے مطابق نہ گزاری جائے۔ اور دنیا کی زندگی اس وقت تک اللہ کے احکام کے مطابق نہیں گزاری جا سکتی، جب تک اللہ کی بھیجی ہوئی تعلیمات پر ایمان نہ لایا جائے۔ گویا، جو چیز نجات کی ضامن ہے، اسے مختصر الفاظ میں کہا جا سکتا ہے: اللہ کے احکام کے مطابق، ایمان اور عملِ صالح۔"

فکر و نظر

ڈاکٹر محمد امین

اسلام کا تصوّرِ نجات

۱

حال ہی میں، ایک نو مسلم صوفی اور معروف مغربی مصنف ابوبکر سراج الدین (مارٹن لنگز) کی ایک انگریزی تحریر "WITH ALL THY MIND" ہماری نظر سے گزری، جس میں مصنف نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ سارے سماوی ادیان سچے ہیں اور مسلمانوں سمیت کسی ایک دین کے پیروکاروں کو یہ تعصب زیب نہیں دیتا کہ وہ حق اور اخروی نجات کو صرف اپنے دین میں منحصر قرار دیں اور یہ کہیں کہ باقی سارے ادیان غلط ہیں اور ان کو ماننے والے جہنم کا ایندھن بنیں گے۔

ہماری رائے میں، یہ نقطۂ نظر نہ صرف یہ کہ قرآن و سنت کی بنیادی تعلیمات کے خلاف ہے، بلکہ دعوت، جہاد، غلبۂ دین اور امت کے مستقبل کے حوالے سے نہایت خطرناک بھی ہے۔ اس لیے اس کا تجزیہ ضروری ہے۔ آئیے، پہلے یہ دیکھیں کہ مصنف نے اپنی رائے کے حق میں کیا دلائل دیے ہیں۔ فاضل مصنف کا کہنا ہے کہ:

۱۔ قرآنی نصوص کی تفسیر مسلمان علما و مفسرین نے قدامت پسندانہ طریقے سے کی ہے۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآنِ حکیم کی تفسیر ترقی پسندانہ نقطۂ نظر سے اور عصرِ حاضر کے حالات کی روشنی میں کی جائے، تاکہ ہمارے زمانے کے لوگ قرآن کو بہتر انداز میں سمجھ سکیں۔

۲۔ قرآن میں آیا ہے: لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا، وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً ...[۱]؛ اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب لوگوں کو ایک دین پر جمع کرنے کا ارادہ ہی نہیں فرمایا۔ ویسے بھی یہ انصاف نہ ہوتا، اگر اللہ تعالیٰ اتنی مختلف اور وسیع دنیا کے لیے ایک ہی پیغام بھیجتا۔ لہٰذا اس نے، مختلف خطوں اور زمانوں کی ضرورتوں کے مطابق، مختلف ادیان بھیجے ہیں،

---

[۱] المائدہ ۵: ۴۸ (ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک ضابطہ اور ایک طریقہ ٹھہرایا، اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو ایک ہی امت بنا دیتا)

ورنہ اللہ تعالیٰ تو 'کن فیکون' پر قادر ہے۔ وہ جو حکم دیتا، ہو جاتا۔

۳۔ متعدد مذاہب کا وجود اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ہے۔ اگر اللہ کو ساری دنیا کے لیے ایک ہی مذہب رکھنا مطلوب ہوتا، تو وہ اتنا زبردست ہونا چاہیے تھا کہ کوئی اس کے سامنے ٹھہر نہ سکتا۔ اگر اللہ چاہتا تو کافروں کو اتنی طاقت اور اتنی اکثریت حاصل نہ کرنے دیتا کہ وہ صحیح مذہب کو جھٹلا دیتے۔ دنیا کی اکثریت اس وقت عیسائی ہے۔ اگر وہ گمراہ ہیں تو اس کا ذمہ دار (نعوذ باللہ) خود اللہ تعالیٰ ہے، جس نے انسانوں کی اکثریت کو گمراہ ہونے دیا، اور غلط مذہب کو پھلنے پھولنے دیا۔

۴۔ نصِ قرآنی 'هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ' [1] کی مسلمان علما نے ہمیشہ غیر مناسب تفسیر کی ہے۔ یہ آیت نہایت اہم اور گہرے غور و فکر کی متقاضی ہے۔ اس آیت میں مشرکین سے مراد، اہل کتاب نہیں، بلکہ بُت پرست ہیں۔ دین سے مراد صرف اس خطے کے ادیان ہیں، ساری دنیا کے ادیان نہیں۔ سارے صحیح ادیان 'اسلام' ہی ہیں کیونکہ قرآن نے حضرت نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) سب کے ادیان کو ایک ہی دین کہا ہے[2]۔ لہٰذا آیت کا مطلب ہے 'اسلام کو (یعنی سارے الہامی ادیان کو) شرک و بت پرستی پر مبنی ادیان پر غالب کرنا۔ جب اسلام عرب میں اُبھر رہا تھا، عیسائیوں نے انگلینڈ کو فتح کر کے بت پرستوں کا خاتمہ کر دیا۔ یہ 'لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ' کی ایک عملی مثال ہے، ورنہ اللہ کو کیا پڑی تھی کہ ایسے لوگوں کو بُت پرستوں پر غلبہ دیتا، جو بعد میں اس کے واحد سچے دین 'اسلام' (یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ دین) کی اتنی زبردست مخالفت کرنے والے تھے۔

۵۔ آیتِ قرآنی 'وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا...' [3] کی صدیوں تک مسلمان علما نے غلط تفسیر کی ہے کیونکہ ان کے ہاں عمومی علم اور دوسرے ادیان کے بارے میں معلومات کی کمی تھی۔ آیت کا اصل مطلب یہ ہے کہ عیسائیت اور بدھ مت کی طرح اسلام بھی ایک عالمی دین ہے اور ہندو مت یا یہودیت کی طرح کسی مخصوص قوم یا علاقے کا دین نہیں ہے۔

---

[1] التوبہ ۹: ۳۳، (وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے کہ اُس کو سارے دین پر غالب کر دے ان مشرکوں کے علی الرغم)

[2] الشوریٰ ۴۲: ۱۳

[3] سبا ۳۴: ۲۸ (اور ہم نے تم کو سب لوگوں کے واسطے بس بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے)

۶- یہ بات عقل میں آنے والی ہے ہی نہیں کہ کوئی آدمی اچھے اعمال کرے اور اسے ان کا اچھا بدلہ نہ ملے، خواہ اس کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو۔ یہ رویہ غلط ہے کہ ہر مذہب حق اور نجاتِ اخروی کو صرف اپنے ماننے والوں تک محدود سمجھتا ہے۔ نیکی، بہرحال، نیکی ہے، خواہ، وہ کوئی بھی کرے۔

۷- آیتِ قرآنی، اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصَّابِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ[1]، سے یہ پتا چلتا ہے کہ کسی خاص نبوت پر ایمان لانا ضروری نہیں، بلکہ جو کوئی بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے، وہ نجات پائے گا۔ (گویا، نجاتِ اخروی کے لیے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لانا ضروری نہیں، بلکہ اہل کتاب، اگر نیک عمل کریں، تو وہ بھی جنت میں جائیں گے)

۸- اسلام چونکہ دوسرے ادیان کے بعد آیا ہے، اس لیے اس سے یہ تقاضا بالکل فطری ہے کہ وہ دوسرے سماوی ادیان کے ساتھ نرمی، انصاف اور رواداری کا معاملہ کرے اور انھیں بھی سچا اور صحیح دین سمجھے۔ اور قرآن تو اس امر کا مؤید بھی ہے اور عیسائیوں اور یہودیوں کی عبادت گاہوں کو قائم رکھنے کا حکم دیتا ہے، لیکن مسلمان علما نے دین کی ایسی قدامت پسندانہ تفسیر کی ہے کہ اس میں تعصب در آیا ہے جو اسلام میں، دراصل، موجود نہیں۔

یہ وہ دلائل ہیں جو مصنف نے اپنے نقطۂ نظر کے حق میں دیے ہیں۔ اب ہم ان نکات کا جائزہ لیتے ہیں:

۱- بدقسمتی سے کئی مسلمان دانشوروں نے یہ طریقہ اختیار کر لیا ہے کہ مختلف اسباب و محرکات کی بنا پر، جو آرا انھوں نے قائم کر لی ہیں، ان کی سند ڈھونڈنے کے لیے، وہ قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں اور پھر اس موضوع سے متعلق جو آیات بھی انھیں ملتی ہیں، وہ ان کی ایسی تاویل کر لیتے ہیں، جو ان کے نقطۂ نظر کے موافق ہو۔ احادیث اور اسلاف کے نقطۂ نظر کو وہ، عموماً درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے، کیونکہ اس سے ان کے خود ساختہ نظریات کی نفی ہوتی ہے۔ نیز ان کی موجودگی میں قرآن کی من مانی تاویل نہیں کی جا سکتی، حالانکہ ایک مسلمان کے نزدیک غیر جانب داری اور معروضیت کا تقاضا یہ ہونا

---

[1] المائدہ ۵: ۶۹ (بے شک جو ایمان لائے، جو یہودی ہوئے اور صابی اور نصاریٰ، جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے تو ان کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے)

چاہیے کہ جب کوئی مسئلہ اس کے سامنے پیش ہو، تو وہ قرآن وسنت کی طرف رجوع کر کے دیکھے کہ وہ اس کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں کیا رہنمائی مہیا کرتے ہیں۔ اسلاف کی آرا، اگرچہ، قرآن و سنت کی طرح حجت نہیں، لیکن قرآن وسنت کو سمجھنے میں وہ، بہر حال، ہماری اعانت کرتی ہیں ۔

زیر بحث معاملے میں بھی اس چیز کی ضرورت تھی کہ قرآن وسنت سے رجوع کر کے یہ دیکھا جاتا کہ وہاں کامیابی اور نجات کا تصور کیا ہے اور اس کی شرائط کیا ہیں ؛ ایمان اور عمل کا باہمی رشتہ کیا ہے اور اسلام کے علاوہ، دیگر مذاہب کے بارے میں وہاں کیا رہنمائی ملتی ہے ؛ نیز، دیگر مذاہب کے ساتھ رواداری اور حسن سلوک کی حدود کیا ہیں ؛ لیکن محسوس ہوتا ہے کہ فاضل مصنف نے اس طرح غور وتفحص کرنے کے بجائے قرآن کی چند آیات کی غلط توجیہ کر کے اپنا موقف ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ان کے اٹھائے ہوئے سوالات کے بارے میں ہم اب کچھ عرض کرنے کی کوشش کریں گے ۔

۲۔ نجات کا قرآنی تصور یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زندگی گزارنے کے لیے تفصیلی اور مکمل لائحہ عمل عطا کیا ہے اور اسے یہ بتایا ہے کہ اخروی زندگی میں نجات اور اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ دنیا کی یہ زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق گزاری جائے۔ اس طرح نجاتِ اخروی کے حصول کی منطقی ترتیب یہ بنتی ہے کہ حصولِ نجات اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک دنیا کی زندگی اللہ کے احکام کے مطابق نہ گزاری جائے۔ اور دنیا کی زندگی اس وقت تک اللہ کے احکام کے مطابق نہیں گزاری جاسکتی، جب تک اللہ کی بھیجی ہوئی تعلیمات پر ایمان نہ لایا جائے۔ گویا، جو چیز نجات کی ضامن ہے، اسے مختصر الفاظ میں کہا جا سکتا ہے : 'ایمان اور عملِ صالح' اللہ کے احکام کے مطابق۔

قرآن یہ کہتا ہے کہ آدمی کو اس زمین پر شترِ بے مہار نہیں چھوڑا گیا کہ وہ جو چاہے کرتا رہے اور اس سے پوچھ گچھ نہ ہو :

اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰكُمۡ عَبَثًا وَّاَنَّكُمۡ اِلَيۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ۔ (المومنون ۲۳ : ۱۱۵)	"کیا تمھارا گمان ہے کہ ہم نے تمھیں بے مقصد پیدا کیا ہے، اور تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے ؟"

بلکہ ہر آدمی کو اس کے کیے کا بدلہ مل کر رہے گا :

كُلُّ نَفۡسٍۢ بِمَا كَسَبَتۡ رَهِيۡنَةٌ۔ (المدثر ۷۴ : ۳۸)	"ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں گروی (رہن) ہے۔"

لہٰذا کسی شخص کے اعمال بھی اکارت نہیں جائیں گے،

اَنِّی لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی۔ (آل عمران ۳: ۱۹۵)

"تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔"

بلکہ ہر آدمی کو اس کے اعمال کا بدلہ ضرور دیا جائے گا، خواہ وہ اچھے اعمال ہوں یا برے، تھوڑے ہوں یا زیادہ:

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ۔ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ۔ (الزلزال ۹۹: ۷-۸)

"جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی، وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بھی بدی کی، وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔"

لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں اعمال کی قبولیت یا عدم قبولیت کا گہرا تعلق ایمان سے ہے۔ اگر ایک آدمی ایمان لے آتا ہے اور اللہ کے احکام کے آگے سر تسلیم خم کر دینے کا اعلان کر دیتا ہے اور اس کے مطابق عمل کرنے کی بھی کوشش کرتا ہے، البتہ شیطان کے بہکاوے میں آکر، اپنی طبعی بشری کمزوری کی وجہ سے، اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کر بیٹھتا ہے، تو وہ نرم سلوک کا مستحق ہے، کیونکہ وہ باغی نہیں، بلکہ اصلاً مطیع اور فرماں بردار ہے۔ اس سے کچھ غلطیاں اور کوتاہیاں ہو گئی ہیں، چنانچہ ایسے آدمی کو اس کی غلطیوں کی سزا دے کر، بالآخر اللہ کی رحمت کا سزاوار ٹھہرایا جائے گا۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

یخرج من النار من قال لا الٰہ الا اللّٰہ وکان فی قلبہ من الخیر مایزن شعیرۃ ثم یخرج من النار من قال لا الٰہ الا اللّٰہ وکان فی قلبہ من الخیر مایزن برۃ ثم یخرج من النار من قال لا الٰہ الا اللّٰہ وکان فی قلبہ من الخیر مایزن ذرۃ۔ (متفق علیہ)

"دوزخ میں سے وہ لوگ نکال لیے جائیں گے، جنھوں نے 'لا الٰہ الا اللّٰہ' کہا اور ان کے دل میں جو کے دانے کے برابر بھی بھلائی تھی، پھر وہ لوگ بھی نکال لیے جائیں گے، جنھوں نے 'لا الٰہ الا اللّٰہ' کہا اور ان کے دل میں گیہوں کے دانے کے برابر بھی بھلائی تھی اور اس کے بعد وہ لوگ بھی نکال لیے جائیں گے جنھوں نے 'لا الٰہ الا اللّٰہ' کہا اور ان کے دل میں ذرہ برابر بھی بھلائی تھی۔"

لیکن جو آدمی ایمان نہیں لاتا، اللہ کے احکام کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرتا، وہ اللہ کا باغی ہے

اگر وہ اپنی فطری اچھائی کی بنیاد پر یا ماحول کے اچھے اثرات کی وجہ سے کچھ نیک اعمال اس وجہ سے کر بھی لیتا ہے کہ اللہ نے ہر آدمی کی فطرت میں اچھائی کا مادہ رکھا ہے[1]، تو وہ کسی صلے اور داد کا مستحق نہیں ہے، کیونکہ وہ 'اصلاً' مطیع نہیں، باغی ہے اور، چونکہ اس کا بنیادی رویہ بغاوت اور اللہ کے احکام سے انکار پر مبنی ہے، لہٰذا اس کے اچھے اعمال بھی اس کے کام نہیں آئیں گے اور وہ بغاوت کے جرم میں سزا کا مستحق ہوگا، نہ کہ رحمت و نجات کا۔ اس کے 'بنیادی طور پر' غلط رویے کی وجہ سے اس کے تھوڑے بہت ضمنی طور پر، وجود میں آنے والے اچھے اعمال بھی اپنا وزن کھو دیں گے۔

یہی بات ہے جو قرآن میں بار بار کھول کر بیان کی گئی ہے کہ نجات کا دارومدار ایمان پر ہے اور ایمان سے مراد صرف اللہ پر ایمان ہی نہیں، بلکہ ایمانیات کا وہ پورا ڈھانچہ ہے، جس پر اللہ نے ایمان لانے کا حکم دیا ہے یعنی اللہ کے رسولوں پر ایمان، اللہ کی کتابوں پر ایمان، اللہ کے فرشتوں پر ایمان اور اللہ کی طرف سے یوم حساب پر ایمان۔ چنانچہ، دیکھیے مندرجہ ذیل آیاتِ قرآنی:

ایمان کا بدلہ صرف اس وقت ملتا ہے، جب آدمی صاحبِ ایمان ہو

فَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهِ وَإِنَّا لَهُ كَاتِبُونَ۔
(الانبیاء ۲۱: ۹۴)

"جو نیک عمل کرے اور صاحبِ ایمان بھی ہو، اس کی سعی رائیگاں نہیں جائے گی اور ہم اس کے لیے اسے لکھ رکھنے والے ہیں۔"

ایمان کے بغیر بڑی سے بڑی نیکی قابلِ قبول نہیں

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَنْ يَعْمُرُوا مَسَاجِدَ اللَّهِ شَاهِدِينَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ۚ أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خَالِدُونَ۔ إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَ

"مشرکین کو یہ زیبا نہیں کہ وہ مساجد الٰہی کا انتظام کریں، جبکہ وہ خود اپنے کفر کے گواہ ہیں۔ ان کے اعمال غارت گئے اور وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ مساجد الٰہی کے انتظام کے لیے تو وہی مناسب ہیں جو اللہ

---

[1] وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا۔ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا۔ (الشمس ۹۱: ۷، ۸)
(اور نفس انسانی کی قسم جیسے اسے ہموار کیا، پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی)

اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ۔ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاۗجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔

(التوبہ ۹: ۱۷-۱۹)

اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہوں، نماز قائم کرتے ہوں، زکوٰۃ دیتے ہوں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے ہوں، یہ لوگ توقع ہے کہ ہدایت پائیں۔ کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجدِ حرام کے انتظام کو ان لوگوں کے عمل کے ہم رتبہ کر دیا ہے جو اللہ اور آخرت پر ایمان لاتے اور جنھوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، اللہ کے نزدیک یہ (دونوں) برابر نہیں ہوں گے، اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔"

شرک کی وجہ سے اعمال کا اجر نہیں ملتا

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۡ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔

(المائدہ ۵: ۵)

"اور جو ایمان کا انکار کرے گا، اس کا عمل اکارت جائے گا اور وہ آخرت میں نامرادوں میں ہو گا۔"

قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْۗنِّىْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ۔ وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَىِٕنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔

(الزمر ۳۹: ۶۴-۶۵)

"کہو اے جاہلو! کیا تم مجھے غیر اللہ کی عبادت کا حکم دیتے ہو، حالانکہ تمھاری طرف اور تم سے پہلے والوں کی طرف بھی یہ وحی بھیجی جا چکی ہے کہ اگر تم شرک کرو گے تو تمھارے اعمال اکارت جائیں گے اور تم نامرادوں میں سے ہو کر رہ جاؤ گے۔"

نجات کے لیے عملِ صالح ایمان کے ساتھ مشروط ہے

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰۗىِٕكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ۔

(النساء ۴: ۱۲۴)

"اور جو نیکی کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور وہ صاحبِ ایمان بھی ہو تو یہی لوگ ہیں جو جنت میں داخل ہوں گے۔"

مَنْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ۔ (التغابن ۶۴: ۹)

"جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے اللہ ان کے گناہوں کو ختم کر دے گا اور ان کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن میں نہریں بہہ رہی ہوں گی۔"

جو حالتِ کفر میں مرے اس کے نیک اعمال ضائع ہو جائیں گے اور اسے عذاب دیا جائے گا

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ۔ (آلِ عمران ۳: ۹۱)

"بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور اسی کفر کی حالت میں مر گئے، اگر وہ زمین بھر سونا بھی فدیہ میں دیں تو قبول نہیں کیا جائے گا۔ ان کے لیے دردناک عذاب ہے اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔"

جو ایمان نہ لائے اس کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا۔ (الکہف ۱۸: ۱۰۵)

"جن لوگوں نے اپنے رب کی آیات اور اس کی ملاقات کا انکار کیا، ان کے اعمال اکارت گئے اور قیامت کے دن ہم ان کو ذرا بھی وزن نہ دیں گے۔"

رسولوں کے جھٹلانے والے دوزخی ہیں

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔ (الاعراف ۷: ۳۵-۳۶)

"اے بنی آدم! اگر تمھارے پاس تمھیں میں سے رسول آئیں جو تمھیں میری آیات سنائیں تو جو ڈرا اور جس نے اصلاح کر لی، ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ غمگین ہوں گے اور جو لوگ میری آیات کو جھٹلائیں گے اور تکبر کر کے ان سے منہ موڑیں گے، تو وہی دوزخی ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔"

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ ذُو الْاَوْتَادِ۔ وَثَمُوْدُ وَقَوْمُ لُوْطٍ وَّاَصْحٰبُ لْئَيْكَةِ اُولٰٓئِكَ الْاَحْزَابُ۔ اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ۔ (ص ۳۸: ۱۲-۱۴)

"ان سے پہلے قوم نوح، عاد اور کثیر لشکروں والے فرعون نے تکذیب کی اور ثمود، قوم لوط اور ایکہ والوں نے بھی۔ یہ سب وہ ہیں جنھوں نے رسولوں کو جھٹلایا، تو میرا عذاب ان پر نازل ہو کر رہا۔"

اللہ کی کتابوں اور یوم آخرت کے منکرین کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (الاعراف ۷: ۱۴۷)

"جن لوگوں نے ہماری نشانیوں اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا، ان کے اعمال اکارت گئے اور وہ بدلے میں وہی پائیں گے، جو وہ کرتے رہے۔"

ایمان کے بغیر اعمال راکھ کی طرح بے وزن ہیں

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ، لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ۔ (ابراہیم ۱۴: ۱۸)

"ان لوگوں کے اعمال کی مثال، جنھوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا، یہ ہے کہ جیسے راکھ ہو، جس پر آندھی کے دن باد تند چل جائے۔ جو کچھ انھوں نے کمائی کی ہو گی، اس میں سے کچھ بھی ان کے پلے نہیں پڑے گی۔ یہی ہے صریح گمراہی۔"

ایمان کے بغیر اعمال سراب کی طرح دھوکہ ہیں

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا۔ (النور ۲۴: ۳۹)

"جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے دشت بے آب میں سراب کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے ہوئے تھا، مگر جب وہاں پہنچا تو کچھ نہ پایا۔"

یہاں ایک مغالطہ پیدا ہوتا ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو آدمی اللہ کے بعض احکام پر ایمان لاتا ہے اور بعض پر نہیں لاتا، وہ بھی 'دراصل' مطیع ہی ہے اور اس کے اچھے اعمال کا بدلہ اسے ملنا چاہیے۔ لیکن قرآن کا موقف یہ ہے کہ جو آدمی اللہ کے بعض احکام پر ایمان لاتا ہے اور بعض کا انکار کرتا ہے، 'وہ' 'درحقیقت' باغی ہی ہے نہ کہ مطیع، کیونکہ اللہ کے کسی ایک حکم کا انکار، دراصل، اس کے سارے احکام کے انکار کے مترادف ہے۔ لہٰذا اللہ کے احکام پر 'جزوی طور پر' ایمان لانے والا بھی، 'درحقیقت' باغی ہی ہے، مطیع نہیں۔ اس بات کو بھی قرآن نے کھول کر بیان کر دیا ہے کہ جو کسی بلکہ پیغمبر کو جھٹلاتا ہے وہ 'اصل میں' سب پیغمبروں کو جھٹلاتا ہے، اور جو پیغمبروں کو (یا کسی ایک پیغمبر کو) جھٹلاتا ہے 'وہ' 'درحقیقت' ان کے بھیجنے والے کو جھٹلاتا ہے، لہٰذا وہ ایمان لانے والا نہیں، بلکہ کافر اور مستحق عذاب ہے۔

رسولوں میں فرق کرنا اور ان پر مسلمانوں کی طرح، بلاتفریق ایمان نہ لانا گمراہی ہے

قُولُوٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۔ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ . . .

(البقرہ ۲: ۱۳۶-۱۳۷)

"کہو، ہم ایمان لائے اللہ پر، اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولادِ یعقوب (علیہم السلام) کی طرف نازل ہوئی تھی اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے تمام پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے مسلم ہیں۔ پھر اگر وہ اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو، تو وہ ہدایت پر ہیں اور اگر اس سے منہ پھیریں، تو کھلی بات ہے کہ) وہ ہٹ دھرمی میں پڑ گئے ہیں۔"

سب رسولوں پر بلاتفریق ایمان نہ لانے والے کافر اور مستحق عذاب ہیں

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر

وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا. اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا. وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا.

(النساء ۴: ۱۵۰-۱۵۲)

کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں، اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہ مانیں گے، اور کفر و ایمان کے بیچ میں ایک راہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں، وہ سب پکے کافر ہیں اور ایسے کافروں کے لیے ہم نے رسوا کن سزا تیار کر رکھی ہے۔ اور (اس کے برعکس) جو لوگ اللہ اور اس کے تمام رسولوں کو مانیں اور ان کے درمیان تفریق نہ کریں، ان کو ہم ضرور ان کے اجر عطا کریں گے اور اللہ بڑا درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔"

ایک پیغمبر کو جھٹلانا سب پیغمبروں کو جھٹلانے کے مترادف ہے

وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً وَّاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا.

(الفرقان ۲۵: ۳۷)

"اور قوم نوح، جب اس نے رسولوں کی تکذیب کی تو ہم نے ان کو غرق کر دیا اور لوگوں کے لیے ایک نشانِ عبرت بنا دیا اور ظالموں کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

كَذَّبَتْ عَادُ ِالْمُرْسَلِيْنَ. اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ. اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ.

(الشعراء ۲۶: ۱۲۳-۱۲۵)

"عاد نے رسولوں کو جھٹلایا جب ان کے بھائی ہود نے انھیں کہا: کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔"

نبوتِ محمدی پر ایمان اہلِ کتاب کے رحمتِ الٰہی کے سزاوار ہونے کی شرط ہے

قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ

"فرمایا (اللہ تعالیٰ نے) سزا تو میں جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں، مگر میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے اور اسے میں ان لوگوں کے حق میں لکھوں

وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ. اَلَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ۔ (الاعراف ۷: ۱۵۶۔۱۵۷)

گا، جو نافرمانی سے پرہیز کریں گے، زکوٰۃ دیں گے اور میری آیات پر ایمان لائیں گے، جو اس پیغمبر نبی امی کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر انھیں اپنے ہاں تورات و انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔"

نبوتِ محمدی کا منکر ہمیشہ دوزخ میں رہے گا

وَمَنْ يَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا۔ (الجن ۷۲: ۲۳)

"جو بھی اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات نہ مانے گا، اس کے لیے جہنم کی آگ ہے اور ایسے لوگ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

قرآن نے صرف یہی وضاحت نہیں کی کہ نجات کے لیے سب پیغمبروں پر ایمان لانا ضروری ہے، اور یہ کہ کسی ایک پیغمبر کا انکار سب پیغمبروں اور ان کے بھیجنے والے کے انکار کے مترادف ہے، اور یہ کہ جو اللہ کے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لاتے، وہ بھی جہنمی ہے، بلکہ اس کے جواز کے طور پر، یہ وضاحت بھی کر دی کہ اہلِ کتاب کے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانے کی اصل وجہ کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ اہلِ کتاب حضور کے نبی ہونے کو اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے، لیکن اس امر کے باوجود، انھوں نے آخری نبی کا انکار محض، ضد ہٹ دھرمی اور دنیوی و مادی مفادات کے تحفظ کے لیے کیا۔ لٰہذا، وہ عذابِ الٰہی کے مستحق ہیں، جب تک کہ باقی انبیا کے ساتھ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر بھی ایمان نہ لائیں، جس طرح کہ مسلمان حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لانے کے ساتھ باقی سارے انبیا پر بھی ایمان لاتے ہیں۔

اہلِ کتاب نبوتِ محمدی کو اپنے بیٹوں کی طرح پہچانتے تھے

اَلَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ... (الانعام ۶: ۲۰)

"جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی، وہ اسے (یعنی نبوتِ محمدی کو) اس طرح (بلا اشتباہ) پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو۔"

اہلِ کتاب نے نبوتِ محمدی کو سمجھنے کے بعد انکار کیا

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ۔

(البینۃ ۹۸: ۴)

"جن لوگوں کو کتاب دی گئی، ان میں تفرقہ برپا نہیں ہوا، مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس (راہِ راست کا) واضح بیان آچکا تھا۔"

اہلِ کتاب نے جان بوجھ کر حق کو چھپایا

... وَإِنَّ فَرِيقًا مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ۔ (البقرہ ۲: ۱۴۶)

"اور ان (اہلِ کتاب) میں سے ایک گروہ جانتے بوجھتے حق کو چھپا رہا ہے۔"

دین میں لوگوں کے اختلاف کا سبب (لاعلمی نہیں بلکہ) ضد، ہٹ دھرمی اور زیادتی ہے

وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ، وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ۔

(الشوریٰ ۴۲: ۱۴)

"لوگوں میں جو تفرقہ رونما ہوا، وہ اس کے بعد ہوا کہ ان کے پاس علم آچکا تھا اور اس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ اگر تیرا رب پہلے ہی یہ نہ فرما چکا ہوتا کہ ایک وقتِ مقررہ تک فیصلہ ملتوی رکھا جائے گا، تو ان کا قضیہ چکایا جا چکا ہوتا۔"

[باقی]

نعیم بلوچ

'قادیانیت ہماری نظر میں'

مرتب : محمد متین خالد
ضخامت : ۵۰۷ صفحات
قیمت : ۲۰۰ روپے
ناشر: عالمی مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت، حضوری باغ روڈ، ملتان

مذہبِ قادیانیت، تصوف کی اس وادیِ پُرپیچ کی سیاحی کا شاخسانہ ہے جسے دانا صوفی شجرِ ممنوعہ قرار دیتے رہے ہیں۔ چنانچہ، مرزا غلام احمد قادیانی نے جب 'انا الحق' کے بجائے 'انا النبی' کا نعرہ لگایا تو ملت اسلامیہ سے خارج قرار پائے۔ بات، اگر دعویِ کشف و الہام یا صدورِ ہفوات تک محدود رہتی تو ہو سکتا تھا کہ دیگر صوفیا کی طرح ان پر بھی مجذوبیت کا پردہ ڈال دیا جاتا، مگر وہ اپنی حماقت میں اس قدر آگے بڑھے کہ کوئی لگی لپٹی رکھے بنا دعویِ نبوت کر ڈالا اور اس پر مستزاد یہ کہ اس بے وقوفی کا ساتھ نہ دینے والوں کو کافر قرار دے دیا۔

مسلمانانِ برِصغیر کے لیے قابلِ نفرین بننے کے لیے مرزا غلام احمد کا یہی دعویِ نبوت ہی کافی تھا، مگر وہ گمراہی کے قعرِ مذلت میں اس قدر گرے کہ حکومتِ فرنگ کے قدموں میں جا گرے اور انگریز نے انھیں مسلمانوں میں تفرقے کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ مرزا صاحب پر ہر وہ بات وحی ہونے لگی جو انگریز حکومت کی مضبوطی کا باعث ہو سکتی تھی۔

مرزا صاحب کی تاخت کا سب سے بڑا ہدف قرآنِ مجید بنا۔ خاص طور پر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق آیات کی معنوی تحریف میں وہ اس قدر جری ہوئے کہ ان کا مصداق خود بن بیٹھے۔ غالباً یہ وہ مرحلہ تھا جب برِصغیر کے تمام مسلمانوں نے انھیں مسیلمۂ ہند قرار دے دیا اور دلیل و برہان سے آگے بڑھ کر ان کی

مخالفت جذباتی رنگ اختیار کر کے دینی حمیت و غیرت کا تقاضا بن گئی۔ مذہبِ قادیانیت کے علمبرداروں کو جب اس امر میں کوئی شبہ نہ رہا کہ وہ کبھی امت کا حصہ نہ بن سکیں گے تو انھوں نے باطنی گروہ کی تاریخ دہراتے ہوئے امتِ مسلمہ کو ختم کر کے صرف اور صرف اپنے ہی وجود کو قائم رکھنے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ قادیانیوں کے ان مکروہ عزائم سے باخبر اہلِ دانش مسلمان اس موقع پر آگے بڑھے اور انھوں نے قادیانیوں کے اصل چہرے سے پردہ اٹھانے اور ان کے خطرناک ارادوں کو عامۃ الناس کے سامنے لانے کے لیے تگ و دو شروع کر دی۔ یہ ایسے ہی بیدار مغز لوگوں کا کارنامہ ہے کہ آج امتِ مسلمہ علمی و فکری لحاظ سے اگر کسی ایک نکتے پر متفق ہے تو وہ یہی ہے کہ قادیانیت ایک باطل مذہب ہے اور اس نے ہمیشہ ملتِ اسلامیہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ جناب محمد متین خالد بھی انھی اہلِ دانش میں سے ایک ہیں جو فتنۂ قادیانیت کے کے ان مضر پہلوؤں سے خوب واقف ہیں اور اس آگہی کو عام مسلمانوں تک پہنچانے کے لیے انھوں نے زیرِ تبصرہ کتاب مرتب کی ہے۔

یہ کتاب ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں کمالِ عرق ریزی سے فتنۂ قادیانیت کے بارے میں ہر مکتبِ فکر اور ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے چودہ سو سے زائد افراد کی آرا جمع کر دی گئی ہیں۔ ان تمام افراد کو مرتب نے اٹھارہ گروپوں میں تقسیم کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ ہر گروہ کے تمام قابلِ ذکر اصحاب سے رائے لے لی جائے۔ بہت سی آرا مرتب نے ماضی کی شخصیات کی تصانیف، ان کے فرمودات اور ان کے ایسے بیانات سے لی ہیں جن کا دستاویزی ثبوت موجود ہے۔ سیاست دانوں، حکمرانوں اور دوسرے مقتدر طبقے کے افراد کے بیانات اخباری تراشوں سے لیے گئے ہیں۔ بیانات منسوب کرنے میں اس بات کی ممکن حد تک کوشش کی گئی ہے کہ کسی سے غلط بات منسوب نہ ہو اور یوں کتاب کی ثقاہت پر کوئی حرف آئے۔ مرتب کے پیشِ نظر چونکہ یہ رہا ہے کہ امتِ مسلمہ کے تمام مکتبۂ فکر کے لوگوں کی آرا سامنے آ جائیں، اس لیے انھوں نے اصل اہمیت کہنے والی شخصیت کو دی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ اس نے اپنی بات کا وزن کس کے پلڑے میں ڈالا ہے۔

قادیانیوں کے سائنٹیفک پروپیگنڈے کی وجہ سے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ برِصغیر پاک و ہند کے مسلمان قادیانیوں کے بارے میں دوسرے عالمِ اسلام کے مقابلے میں متعصبانہ رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں اور اس گروہ کے متعلق یہاں کے لوگوں کی رائے متشددانہ ہے۔ اس غلط تاثر کو زائل کرنے کے لیے غیر ملکی مسلم شخصیات کی آرا پر مشتمل باب، ہمارے خیال کے مطابق خاص اہمیت کا حامل ہے۔ کتاب کے ان صفحات میں عالمِ اسلام کے جید مشاہیر کے فتاویٰ اور آرا اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ قادیانیوں کے بارے میں

وہ بھی اسی نقطۂ نظر کو درست سمجھتے ہیں جسے برصغیر پاک و ہند کے خواص و عوام صائب مانتے ہیں۔

یہ کتاب، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے خاص مقام کے حامل لوگوں کی آرا پر مبنی ہے۔ اس لیے یہ قاری کو قادیانیوں کے بارے میں چشم کشا حقائق و انکشافات اور چونکا دینے والی دستاویزات مہیا کرتی ہے۔ ان میں وہ تاریخی قرارداد اور بل بھی شامل ہے جو ۱۹۷۴ء میں قومی اسمبلی اور سینٹ سے پاس ہو کر آئینِ پاکستان کا حصہ بنا اور قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کی تحریک بے شمار جانوں کا نذرانہ پیش کر کے قانونی فتح سے ہمکنار ہوئی۔

اسی طرح ملک کے نامور صحافیوں کی آرا کے ضمن میں معروف کالم نویس جناب نذیر ناجی کا انکشاف خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ نوائے وقت میں شائع ہونے والے اس کالم میں ایک تصویر بھی شامل ہے جو یروشلم پوسٹ" سے لی گئی ہے۔ اس تصویر میں اسرائیلی صدر کے سامنے دو افراد بیٹھے نظر آ رہے ہیں۔ ان میں ایک شیخ شریف احمد امینی قادیانی ہیں جو اپنے گروہ کے نئے سربراہ شیخ حمید کا پر کو اسرائیلی صدر سے متعارف کرا رہے ہیں اور قادیانیوں کو اسرائیل میں جو آزادیاں حاصل ہیں، ان پر اسرائیلی حکومت کا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔ نذیر ناجی کے اس چشم کشا کالم کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"جن لوگوں کو اسرائیل کی اصلیت معلوم ہے، اس کا اندازہ صرف وہی لگا سکتے ہیں کہ ایسے گروہ کے ساتھ وہاں کی حکومت کے اتنے قریبی اور گہرے تعلقات کا مطلب کیا ہو سکتا ہے جس کے رخصت ہونے والے سربراہ کو اسرائیل کا صدر ذاتی طور پر الوداع کہے اور آنے والے کا خیر مقدم کرے..... ایک ایسے دشمن ملک کی حکومت کے ساتھ اتنے قریبی، خوشگوار اور دوستانہ تعلقات رکھنے والا گروہ مسلمانوں کا دوست ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ نہیں کہ میں مرزائیوں پر شک کرتا ہوں، میں تو اسرائیلیوں پر یقین رکھتا ہوں۔ وہ اپنے مفاد کے سوا کسی پر مہربان نہیں ہوئے۔ یہ سوچنا مسلمانوں کا کام ہے کہ ان لوگوں سے اسرائیل کیا مفادات حاصل کر رہا ہوگا؟ .....

علمائے کرام تو مرزائیوں کو کلیدی عہدوں سے الگ کرنے کے مطالبات، عقائد کے حوالے سے کرتے ہیں، لیکن پاکستان کے دفاع کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ان لوگوں سے چوکس رہا جائے۔ یہ کچھ بھی نہ کرتے ہوں، تو بھی ان سے محتاط رہنے کی یہ وجہ کافی ہے کہ ان پر اسرائیل اور بھارت کی حکومتیں مہربان ہیں...." (ص ۳۸۵)

کتاب کا یہ باب اسی قسم کے ہوشربا انکشافات سے بھرا ہوا ہے جن سے بلاشبہ ہر باشعور پاکستانی کو آگاہ ہونا چاہیے۔

نہایت محنت سے مرتب کی ہوئی یہ کتاب، لاریب، اس دعویٰ کا دستاویزی ثبوت ہے کہ قادیانیت کوئی فروعی مسئلہ نہیں، بلکہ اس پر اجماعِ امت موجود ہے۔ اور یقیناً یہ ایک قابلِ قدر کارنامہ ہے جس پر مرتب بجا طور پر تحسین کے مستحق ہیں۔

کتاب سفید کاغذ پر خوبصورت کمپیوٹر کمپوزنگ میں شائع ہوئی ہے مضبوط جلد نے کتاب کو مزید جاذبِ نظر بنا دیا ہے۔ اس کتاب کو مسئلہ قادیانیت کے ضمن میں امتِ مسلمہ کے مشاہیر کا انسائیکلوپیڈیا قرار دیا جا سکتا ہے۔

ترتیب : منظور الحسن

"آدمی حق کا انکار کرنے کے لیے آج خوب صورت الفاظ پا لیتا ہے، مگر آخرت میں اس کو معلوم ہوگا کہ وہ اس کا ساتھ چھوڑ کر پیچھے رہ گئے۔
آدمی طاقت کے بل پر بے انصافی کرتا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ مظلوم اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا، مگر آخرت میں وہ دیکھے گا کہ اس کی طاقت پیچھے کی دنیا میں رہ گئی ہے، آخرت میں وہ اس کا ساتھ دینے کے لیے موجود نہیں ہے۔
آدمی کے ساز و سامان اس کو دھوکا دیتے ہیں اور وہ اپنے گھمنڈ کا مینار کھڑا کرتا ہے، مگر آخرت میں وہ پائے گا کہ اس کے وہ ساز و سامان اس سے بہت دور ہو چکے ہیں، جن کے اوپر وہ گھمنڈ کیا کرتا تھا۔
مومن اور غیر مومن کا فرق ایک لفظ میں یہ ہے کہ غیر مومن یہ سمجھ کر زندگی گزارتا ہے کہ اس کو اسی دنیا میں رہنا ہے اور مومن اس نفسیات کے ساتھ جیتا ہے کہ اس کو آخرت تک جانا ہے۔ نفسیات کا یہ فرق، دونوں کی زندگیوں میں اتنا زیادہ عملی فرق پیدا کر دیتا ہے کہ ایک جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے اور دوسرا جنت کا۔"

اصلاح و دعوت

وحید الدین خان

آخرت تک جانا

مولانا اشرف علی تھانوی ایک بار ٹرین سے سفر کر رہے تھے۔ ان کو اعظم گڑھ جانا تھا۔ ایک ریلوے گارڈ، جو ان کا معتقد تھا، اسٹیشن پر ان سے ملنے کے لیے آیا۔ اتنے میں ایک دیہاتی آدمی بھی آ گیا۔ اس نے گنے کا ایک گٹھا تحفے کے طور پر مولانا کو پیش کیا۔ مولانا نے قبول کر لیا اور اپنے ساتھی سے کہا کہ ان گنوں کا وزن کرا کے ان کو بک کر والو۔ گارڈ نے کہا: بک کروانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس ٹرین سے جو گارڈ جا رہا ہے میں اس سے کہہ دیتا ہوں، وہ خیال رکھے گا۔ مولانا نے کہا کہ تمھارا گارڈ تو اسی ٹرین تک ساتھ رہے گا اور مجھے آگے جانا ہے۔ گارڈ نے سمجھا کہ مولانا کو آگے کسی اسٹیشن پر یہ ٹرین بدل کر دوسری ٹرین پکڑنا ہے۔ اس نے کہا: کوئی حرج نہیں، میں گارڈ کو بتا دیتا ہوں، وہ آگے والے گارڈ سے بھی کہہ دے گا اور آپ کو کوئی زحمت نہ ہوگی۔ مولانا نے کہا: مجھے اس سے بھی آگے جانا ہے۔ گارڈ نے حیرت سے پوچھا: آخر آپ کہاں تک جائیں گے۔ ابھی تو آپ نے فرمایا تھا کہ آپ اعظم گڑھ جا رہے ہیں۔ مولانا نے کسی قدر خاموشی کے بعد کہا: مجھے آخرت تک جانا ہے، وہاں تک کون سا گارڈ میرے ساتھ جائے گا!

یہ معاملہ محض ریل کے سفر کا نہیں، بلکہ تمام معاملات کا ہے۔ آدمی کا ہر معاملہ آخرت کا معاملہ ہے۔ دنیا میں کوئی 'گارڈ' وقتی طور پر آپ کا ساتھ دے سکتا ہے۔ مگر آخرت کی منزل پر پہنچ کر کوئی گارڈ ساتھ دینے والا نہیں۔ جس کا ذہن یہ ہو کہ مجھے آخرت تک جانا ہے، وہ ہر اس چیز کو بے قیمت سمجھے گا جو آخرت میں بے قیمت ہو جانے والی ہو، خواہ آج وہ کتنی ہی قیمتی نظر آتے۔ اسی طرح وہ ہر اس چیز کو وزن دینے پر مجبور ہوتا ہے جو آخرت میں باوزن ثابت ہونے والی ہو، خواہ آج کی دنیا میں بظاہر وہ کتنی ہی بے وزن دکھائی دیتے۔

آدمی حق کا انکار کرنے کے لیے آج خوبصورت الفاظ پا لیتا ہے، مگر آخرت میں اس کو معلوم ہوگا کہ وہ اس کا ساتھ چھوڑ کر پیچھے رہ گئے۔ آدمی طاقت کے بل پر بے انصافی کرتا ہے اور خوش ہوتا ہے

کہ مظلوم اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا، مگر آخرت میں وہ دیکھے گا کہ اس کی طاقت پیچھے کی دنیا میں رہ گئی ہے، آخرت میں وہ اس کا ساتھ دینے کے لیے موجود نہیں ہے۔ آدمی کے ساز و سامان اس کو دھوکا دیتے ہیں اور وہ اپنے گھمنڈ کا مینار کھڑا کرتا ہے، مگر آخرت میں وہ پائے گا کہ اس کے وہ ساز و سامان اس سے بہت دُور ہو چکے ہیں جن کے اوپر وہ گھمنڈ کیا کرتا تھا۔

مومن اور غیر مومن کا فرق ایک لفظ میں یہ ہے کہ غیر مومن یہ سمجھ کر زندگی گزارتا ہے کہ اس کو اسی دنیا میں رہنا ہے۔ اور مومن اس نفسیات کے ساتھ جیتا ہے کہ اس کو آخرت تک جانا ہے۔ نفسیات کا یہ فرق دونوں کی زندگیوں میں اتنا زیادہ عملی فرق پیدا کر دیتا ہے کہ ایک جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے اور دوسرا جنت کا۔

منظور الحسن

باہمی گفتگو میں دین کا تقاضا

ہمیں اپنے گھر میں، گلی محلے میں، دفتر میں، بازار میں اور دوستوں کی محفل میں جس چیز کو سب سے زیادہ استعمال میں لانا پڑتا ہے، وہ ہماری زبان ہے۔ یہ زبان ہی ہے جس کی بدولت ہم دوسروں کی نظروں میں کبھی محترم ہوتے ہیں، اور کبھی کم تر ہو جاتے ہیں۔ یہ زبان ہی ہے جس کا ایک استعمال ہمیں معاشرے میں سرخ رو کر دیتا ہے، اور دوسرا استعمال اُسی معاشرے میں ہمیں بے وقعت بنا دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ہی ہمارے اخلاقی وجود کو متعین کرتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ طنز و تضحیک، طعن و تشنیع، گالی گلوچ اور دروغ گوئی و بدخوئی جیسی بُری عادات سے ہماری معاشرت تقریباً خالی تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جہاں شرم و حیا، ادب و احترام اور محبت و رواداری جیسی اعلیٰ اقدار پامال ہوئیں، وہاں ہماری گفتگو اور بات چیت کے انداز بھی بگڑ گئے۔ چنانچہ اس معاملے میں، تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ ہم دوسروں کا مذاق اُڑا کر لطف اٹھاتے ہیں، قدم قدم پر جھوٹ بولتے ہیں، گالی گلوچ ہمارا روزمرہ بن چکا ہے، بڑوں سے بے ادبی اور چھوٹوں کی تضحیک ہمارا وتیرہ بن گیا ہے، اور اگر کہیں ہم ان قباحتوں سے بچے ہوئے بھی ہوں، تو وہاں ایک دوسری قباحت موجود ہوتی ہے اور وہ ہے بے مقصد گفتگو، جس میں مشغول ہو کر اپنا قیمتی وقت ضائع کرنا بھی ہمارا معمول بن گیا ہے۔

گفتگو کے معاملے میں ہمارا دین، ہم سے جو تقاضے کرتا ہے وہ ان تقاضوں سے بالکل مختلف ہیں، جو آج ہماری معاشرت میں رائج ہو چکے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ ہم اپنی زبان سچ بولنے کے لیے استعمال کریں، اس کے ذریعے سے اپنے مخاطبین کو تذکیر و نصیحت کریں، علم و حکمت کی باتیں سنا کر اُن کے شعور کو پختہ کریں، اگر کوئی غمگین ہے تو اس کے غم پر ہمدردی کا اظہار کریں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنی زبان اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے لیے استعمال کریں۔ اگر کبھی ایسی باتوں کے مواقع میسر نہ ہوں، یا ہم ان باتوں کی جرأت و رغبت اپنے اندر نہ پاتے ہوں تو جھوٹ بولنے، غلط سلط زبان چلانے، بے مقصد اور بے فائدہ گفتگو کرنے اور دل دکھانے والے الفاظ منہ سے نکالنے سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہے کہ ہم خاموش رہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اُسے چاہیے کہ یا تو اچھی بات کرے یا پھر خاموش رہے۔ (مسلم)

شکر گزاری

آپ نے بعض پالتو جانوروں کو اپنے مالک کے قدموں میں لوٹتے دیکھا ہو گا۔ مالک کے اشاروں پر ناچتے اور اس کے ہر حکم کی بے چون و چرا تعمیل کرتے بارہا وہ آپ کو نظر آتے ہوں گے۔ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ یہ سوال اگر آپ سے پوچھا جائے تو بے ساختہ آپ کے منہ سے نکلے گا کہ یہ اُن کا اپنے مالک سے اظہارِ تشکر ہے، یہ اظہار ان کے مالک کی ان عنایات کا نتیجہ ہے، جو شب و روز وہ ان پر کرتا رہتا ہے۔

یعنی ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ فطری طور پر ہر عنایت، ہر نوازش شکر گزاری کا تقاضا کرتی ہے۔ اولاد کا اپنے والدین کا شکر گزار ہونا، شاگرد کی اپنے استاد کے لیے شکر گزاری، دوست کا دوست کے لیے اظہارِ تشکر، غرض کہ، ہر احسان مند کا اپنے محسن کے لیے شکر گزار ہونا ایک ایسی قدر ہے جس کے بغیر فطری طور پر انسان مطمئن ہی نہیں ہو سکتا۔

جب کوئی ہمارے احسان کو نظر انداز کرتا ہے تو ہم برملا، اسے احسان فراموش اور ناشکرا کہہ کر پکارتے ہیں یعنی ہم فطری طور پر، اس کی طرف سے اپنے لیے احسان مندی اور شکر گزاری کے اظہار کے طالب ہوتے ہیں۔ جب وہ یہ اظہار نہیں کرتا تو ہمیں اس کا یہ طرزِ عمل سراسر غیر منصفانہ اور

غیر اخلاقی محسوس ہوتا ہے۔ گویا شکر گزاری ہماری فطرت کی آواز ہے، جس پر لبیک کہے بغیر، ہمارے اخلاقی وجود کی تکمیل ممکن ہی نہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ فطرت کی یہ آواز ہم اس وقت نہیں سنتے جب اس کی سب سے بڑھ کر ضرورت ہوتی ہے۔

کبھی ہم نے غور کیا ہے کہ ایک ہستی ایسی ہے جو سب سے بڑھ کر شکر کی سزاوار ہے۔ وہ ہستی خالق کائنات اور خود ہماری ذات کو پیدا کرنے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا تو دنیا میں ہمارا وجود ہی نہ ہوتا، اس نے چاہا ہے تو ہم ایک وجود کے ساتھ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے اپنے معمولات انجام دیتے نظر آتے ہیں۔ وہ ہمارا خالق ہے، ہمارا مالک ہے۔ وہی ہے جس نے وجود بخشنے کے لیے اسباب پیدا کیے اور اب ہمارے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے لمحہ بہ لمحہ اسباب فراہم کرتا ہے۔

ہم اپنی ساری زندگی اس کے حضور سجدے میں گزار دیں، تو بھی یہ واقعہ ہے کہ ہم اس کی عنایتوں، اس کی نوازشوں کا شکر ادا نہیں کر سکتے۔ لیکن اپنے مالک کا شکر ادا کرنے کی جتنی سکت ہم رکھتے ہیں، اگر ہم اتنا بھی شکر ادا نہ کریں تو پھر ہم سے بڑا احسان فراموش اور ہم سے بڑا بے انصاف کون ہوگا۔ اس صورت میں تو وہ پالتو جانور ہی ہم سے بہتر ہو جائے گا جو اپنے مالک کے قدموں میں لوٹ کر اپنے شکر اور وابستگی کا اظہار کرتا ہے۔

دعوت میں ثابت قدمی

کسی اجنبی بات کو منوانے کے لیے، جتنا اس بات کا محکم اور مدلل ہونا ضروری ہے، اتنا ہی اس کے کہنے والوں کا اسے ثابت قدمی اور استقلال کے ساتھ کہتے رہنا بھی ضروری ہے۔ جس طرح پتھر پر گرنے والا معمولی پانی کا قطرہ، اگر لگاتار گرتا رہے، تو پتھر میں شگاف ڈال دیتا ہے، اسی طرح ایک بات جو مسلسل کہی جاتی رہے اور ایک کام جو تسلسل سے کیا جاتا رہے، آخر کار مطلوب نتائج پیدا کر لیتا ہے۔

دین کی دعوت کا بھی یہی معاملہ ہے۔ اگر ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کے ساتھ کسی معاشرے میں یہ دعوت دی جاتی رہے، تو ایک وقت آجاتا ہے جب آواز سے آواز اور قدم سے قدم ملنے لگتے ہیں اور معاشرہ کسی ایک تبدیلی یا انقلاب کے لیے پوری طرح تیار ہو جاتا ہے۔

ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام زندگی اس بات کی شاہد ہے کہ آپ نے کسی مرحلے پر بھی اپنے پائے صبر و استقلال میں کوئی لغزش نہ آنے دی۔ تیرہ سال تک مسلسل آپ اہلِ مکہ کے سامنے اللہ کا پیغام پہنچاتے رہے لیکن چند صالح نفوس کے سوا کسی نے بھی آپ کی بات پر کان نہ دھرا۔ کفارِ عرب نے ایک طرف آپ کے پیغام کی مخالفت کی اور آپ کی جد و جہد میں مزاحمت پیدا کی اور دوسری طرف آپ کو دولت و آسایش کے لالچ دیے گئے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سعی و جہد پر نہ نقصان کا کوئی اندیشہ غالب آسکا اور نہ کوئی دنیوی مفاد آپ کے پیغام کے دھارے کا رخ تبدیل کر سکا۔ نبی عربی کا یہی صبر و استقلال تھا جس نے بالآخر اللہ کے آخری دین کو قرآنِ مجید کی پیش گوئی کے عین مطابق سرزمینِ عرب کی غالب ترین قوت بنا دیا۔

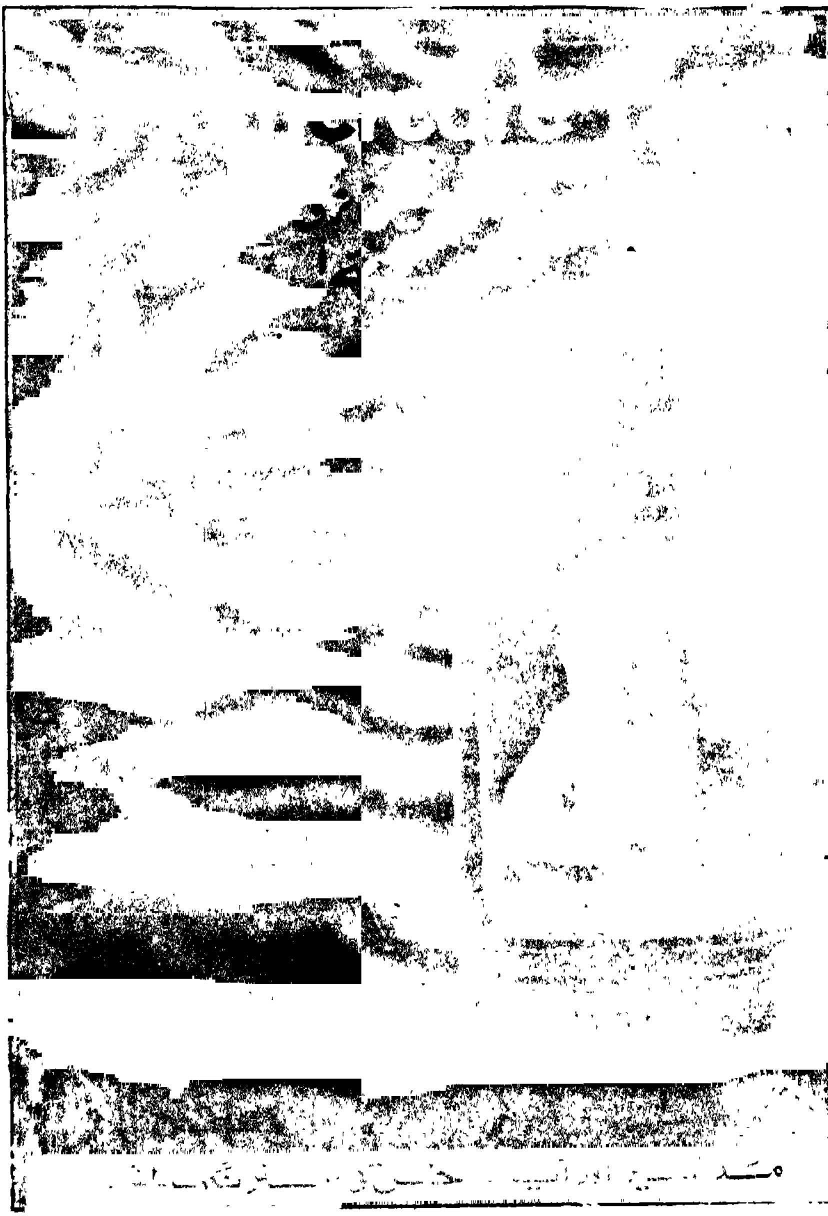
ہمارے اس معاشرے میں بھی، جو لوگ دینِ حق کے غلبہ کی جد و جہد کے لیے نکلیں، وہ جب تک ثابت قدمی و استقامت کو اپنی جد و جہد کا جزوِ لازم نہ بنالیں، ان کے لیے کامیابی کے در وا نہیں ہو سکتے۔ یہی وہ چیز ہے جو داعی کو نتائج دیکھنے کی خواہش سے بالاتر کر دیتی ہے اور اسی وجہ سے راستے کے آلام و مصائب داعی کے عزم میں کوئی تغیر پیدا نہیں کر سکتے۔ جناب جاوید احمد صاحب غامدی نے اپنی کتاب "قانونِ دعوت" میں ثابت قدمی اور استقامت کو دعوت کی سب سے اہم شرط قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "یہ اس دعوت کی سب سے اہم شرط ہے اور قرآنِ مجید نے اس کام کے لیے جگہ جگہ اس کی اہمیت واضح کی ہے۔ وہ لوگ جو اس کام کے لیے اٹھیں، انھیں یہ حقیقت پہلے قدم ہی پر سمجھ لینی چاہیے کہ یہ راہ عزیمت ہے اور اس میں امتحان و آزمایش کے بعض ایسے مراحل بھی آتے ہیں، جب مال لٹتا، باغات اجڑتے، مصائب امڈتے، دست و بازو قلم ہوتے، سر جاتا اور جان جانِ آفریں کے سپرد کرنا پڑتی ہے۔ اس میں بعض ایسے مواقع بھی آتے ہیں جب ترغیب و ترہیب کے سب حربوں کا رخ تنہا داعیِ حق کے سینے کی طرف ہو جاتا، اور خوف و طمع کے سارے انداز تنہا اسی کو اس راہ سے ہٹانے کے لیے وقف ہو جاتے ہیں۔ اس میں وہ مقامات بھی آتے ہیں جب اس کو حوالۂ زنداں کیا جاتا، اس کی پیٹھ پر تازیانے برستے، اس کے جوڑ بند الگ کر دیے جاتے، اسے کیچڑ بھرے حوض میں لٹکا دیا جاتا، اسے عینِ 'مقدس' اور 'قربان گاہ' کے درمیان سنگ سار کر دیا جاتا، اور اس کا سر قلم کر کے رقاصاؤں کے حضور میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ یہ سب منازل اس راہ میں آتی ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس کے قانونِ ابتلا کی رو سے کسی نہ کسی صورت میں 'لازماً' آتی ہیں، لیکن

داعیِ حق سے اس دعوت کا مطالبہ یہی ہے کہ وہ پوری ثابت قدمی کے ساتھ اپنے موقف پر جما رہے اور اس طرح کے سب مواقع پر یہی پکارے کہ "انا للہ وانا الیہ راجعون"۔

ارشادِ خداوندی ہے :

"اے ایمان والو صبر اور نماز سے مدد چاہو۔ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں، انھیں مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم اس کا شعور نہیں رکھتے۔ اور ہم ضرور تمھیں کسی قدر خوف اور بھوک اور مال و جان اور (تمھارے باغوں کے) پھلوں میں کمی سے آزمائیں گے۔ اور ان صبر کرنے والوں کو خوش خبری دو جن پر جب کوئی مصیبت آپڑے تو کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور ہمیں اسی کی طرف لوٹنا ہے"۔ (البقرہ ۲: ۱۵۳-۱۵۶)



ماھنامہ

اشراق

جلد ۶ شمارہ ۵
مئی ۱۹۹۴ء
ذوالحجہ ۱۴۱۴ھ

زیرِ سرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر : منیر احمد

مدیرِ انتظامی : شکیل الرحمن

معاون مدیر : قدیر شہزاد

فی شمارہ : ۸ روپے
سالانہ : ۸۰ روپے
بیرونِ ملک :
ہوائی ڈاک : ۴۵۰ روپے
بحری ڈاک : ۲۵۰ روپے

البیان

شذرات

حدیث وسنت

فکرونظر

تبصرۂ کتب

اصلاح ودعوت

المورد

۶۶ احمد بلاک، گارڈن ٹاؤن، لاہور ۵۴۶۰۰ فون : ۵۸۶۴۴۳۱

مدیر مسئول : جاوید احمد غامدی طابع : قومی پریس لاہور

البیان
جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

المجادلہ

[۵۸]

اللہ کے نام سے، جو سراپا رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

اللہ نے سن لی اُس عورت کی بات جو تم سے اپنے شوہر کے معاملے میں جھگڑ رہی تھی، اور اللہ سے فریاد کیے جاتی تھی۔ اور اللہ تم دونوں کی یہ باتیں سن رہا تھا۔ بے شک اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں کو ماں کہہ بیٹھیں، وہ اُن کی مائیں نہیں بن جاتی ہیں۔ ان کی مائیں تو وہی ہیں، جنھوں نے اُن کو جنا ہے۔ اس طرح کے لوگ، البتہ، بڑی ناگوار اور بڑی غلط بات کہتے ہیں۔ اور (یہ اگر اپنی غلطی محسوس کریں تو) بے شک، اللہ معاف کرنے والا، بہت درگزر کر دینے والا ہے۔ اور (انھیں بتاؤ کہ اِن کے لیے حکم یہ ہے کہ) جو لوگ اپنی بیویوں سے (اس طرح) ظہار کر بیٹھیں، پھر اسی طرف لوٹیں، جس کو حرام کہا، تو اس سے پہلے کہ وہ ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں، انھیں ایک بردہ چھوڑنا ہو گا۔ یہ وہ بات ہے، جس کی تمھیں نصیحت کی جاتی ہے اور (تم اگر اس معاملے میں خیانت کرو گے، تو جان لو کہ) جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس سے باخبر رہتا ہے۔ پھر جس کے پاس بردہ نہ ہو، اُسے لگاتار دو ماہ کے روزے رکھنا ہوں گے، ہاتھ لگانے سے پہلے، اور جس میں یہ ہمت بھی نہ ہو، وہ (اس سے پہلے) ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے گا۔ (ہم نے) یہ (حکم تم کو) اس لیے (دیا) کہ (تم یہ شفقت اٹھاؤ، اور) اِس کے نتیجے میں، اللہ اور اُس کے رسول پر تمھارا ایمان قائم ہو۔ اور (جان لو کہ) یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں۔ (انھیں صرف کافر ہی توڑتے ہیں۔) اور

کافروں کے لیے بڑی الم ناک سزا ہے ۔

(یہ تو اللہ کی اِس بندی کا رویّہ ہوا۔ چنانچہ اِس پر عنایت ہوئی۔ لیکن اِس کے برخلاف) یہ لوگ جو اللہ اور اُس کے رسول سے دشمنی کر رہے ہیں، یہ ذلیل ہوں گے، جس طرح اِن کے پہلے ہم مشرب ذلیل ہوئے۔ اور (اِس کی) بہت واضح دلیلیں ہم نے (اِس قرآن میں) اتار دی ہیں۔ اور (اللہ اور اُس کے رسول کے دشمن) اِن کافروں کے لیے بڑی ذلّت کی مار ہے۔ یہ اُس دن کو یاد رکھیں، جب اللہ اِن سب کو اٹھائے گا۔ پھر ان کا ہر عمل اِن کو بتائے گا۔ وہ بھول گئے، مگر اللہ نے اُس کو گن رکھا ہے۔ اور ہر شے اللہ کے سامنے ہے۔

تم سمجھتے نہیں کہ اللہ اُن سب چیزوں سے واقف ہے جو آسمانوں میں ہیں، اور زمین میں ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ تین سرگوشی کریں، اور اُن میں چوتھا اللہ نہ ہو۔ اور پانچ سرگوشی کریں اور اُن میں چھٹا اللہ نہ ہو۔ اور اِس سے کم کریں یا زیادہ، وہ جہاں بھی ہوں، اللہ اُن کے ساتھ ہوتا ہے۔ پھر قیامت کے دن وہ اُنھیں بتا دے گا، اُن کا سب کیا دھرا۔ بے شک اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔

تم نے دیکھے نہیں یہ لوگ جو سرگوشیوں سے روکے گئے، پھر وہی کرتے ہیں جس سے روکے گئے۔ اور (اِن کی یہ سرگوشی کبھی خیر کے لیے نہیں ہوتی۔ یہ جب کرتے ہیں،) آپس میں گناہ اور زیادتی اور پیغمبر کی نافرمانی کی سرگوشی کرتے ہیں۔ اور تمھارے پاس آتے ہیں تو تمھیں اُس طرح سلام کرتے ہیں جس طرح اللہ نے تم پر سلام نہیں کیا اور اپنے دل میں کہتے ہیں کہ ہماری اِن باتوں پر اللہ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا۔ اِن کے لیے دوزخ ہی کافی ہے۔ یہ اُس میں پڑیں گے، اور وہ بڑا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔

اے ایمان والو، تم جب سرگوشی کرو، تو گناہ اور زیادتی اور پیغمبر کی نافرمانی کی سرگوشی نہ کرو، بلکہ خیر و تقویٰ کی سرگوشی کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، جس کے حضور میں تم سب جمع کیے جاؤ گے۔

یہ سرگوشی (جو حق کے یہ دشمن کرتے ہیں، یہ سب) شیطان کی طرف سے ہے۔ اس لیے کہ وہ اہلِ ایمان کو دل گیر کرے، دراں حالیکہ اللہ کی اجازت نہ ہو، تو وہ ان کو ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا

سکتا۔ اور اہلِ ایمان کو تو بس اللہ ہی پر بھروسا رکھنا چاہیے۔

(یہ پیغمبر کی مجلس میں بھی اسی لیے جتھے بنا کر بیٹھتے ہیں، تو) ایمان والو، (ان کی اس شرارت سے بچنے کے لیے،) جب تم سے کہا جائے کہ ان مجلسوں میں کھل کر بیٹھو تو کھل جاؤ۔ اللہ تمھارے لیے وسعت پیدا کرے گا۔ اور جب کہا جائے کہ اٹھ جاؤ، تو اٹھ جاؤ۔ اللہ تم میں سے اُن لوگوں کے درجے اونچے کرے گا جو ایمان لائے، اور جن کو علم عطا ہوا ہے۔ اور (مطمئن رہو کہ اس مقصد کے لیے) تم جو کچھ بھی کرو گے، (اس کا صلہ تم کو ملے گا، اس لیے کہ) اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔

اے ایمان والو، (اب یہ پابندی ہے کہ) تم جب پیغمبر سے رازدارانہ کوئی بات کرو تو اس سے پہلے کچھ صدقہ کرو۔ یہ تمھارے لیے بہتر اور پاکیزہ تر ہے۔ البتہ، اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو اللہ بخشنے والا، رحم فرمانے والا ہے۔

کیا تمھیں اندیشہ ہوا (کہ یہ تمھاری کسی خطا کی سزا ہے) کہ اپنی رازدارانہ باتوں سے پہلے تمھیں (اللہ کی راہ میں) صدقے پیش کرنا ہوں گے؟ —— (ہرگز نہیں، یہ تو اس لیے ہوا کہ یہ مجرم تمھارے سامنے تو کچھ نہ کہیں گے، مگر اپنی صفائی کے لیے تنہائی میں آ آکر پیغمبر کو ضرور پریشان کریں گے۔) —— (لیکن تمھیں اندیشہ ہوا۔) اس لیے جب تم نے (پھر اس طرح) بات ہی نہیں کی۔ (تو یہ پابندی ختم ہوئی، اس لیے کہ مقصد پورا ہوا) اور اللہ نے تم پر رحم فرمایا۔ چنانچہ (اب) نماز کا اہتمام رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور (یہ بات ہمیشہ پیشِ نظر رکھو کہ) اللہ تمھارے ہر عمل سے پوری طرح واقف ہے۔

تم نے دیکھے نہیں (یہ مجرم) جو اُس قوم کے دوست ہوئے —— (قومِ یہود کے) —— جس پر اللہ کا غضب ہوا ہے۔ (وہ تمھیں یقین دلاتے ہیں کہ وہ تمھارے ساتھ ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ) وہ نہ تم میں ہیں نہ اُن میں، اور جانتے بوجھتے اپنی اس جھوٹی بات پر قسمیں کھاتے ہیں۔ اللہ نے اُن کے لیے ایک سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔ بے شک، بہت بُرا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں۔

انھوں نے اپنی (اِن) قسموں کو ڈھال بنایا اور اِس طرح اللہ کی راہ سے رک گئے۔ پس اُن کے لیے بڑی ذلّت کا عذاب ہے۔

(یہ مال و اولاد کی محبّت میں اندھے ہوئے، مگر) اللہ (کے اس عذاب) سے بچانے کے لیے نہ اِن کے مال کچھ کام آئیں گے نہ اِن کی اولاد۔ یہ اہلِ جہنّم ہیں۔ یہ ہمیشہ اُسی میں رہیں گے۔ اُس دن جب اللہ اِن سب کو اٹھائے گا تو اُس کے سامنے بھی اِسی طرح قسمیں کھائیں گے جس طرح تمھارے سامنے کھاتے ہیں اور خیال کریں گے کہ وہ ایک بنیاد پر قائم ہیں۔ سنو، (اِن کے بارے میں تمھیں غلط فہمی نہ ہو۔) اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہی جھوٹے ہیں۔ اِن پر شیطان نے غلبہ پالیا ہے۔ پھر اِن کو اللہ کی یاد بھلادی ہے۔ یہ شیطان کا جتھا ہیں۔ سنو، اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ شیطان کا جتھا ہی نامراد ہونے والا ہے۔

بے شک، (یہ شیطان کا جتھا،) یہ لوگ جو اللہ اور اُس کے رسول سے دشمنی کر رہے ہیں، یہ سب سے ذلیل لوگوں میں ہوں گے۔ اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول غالب ہو کر رہیں گے۔ بے شک، اللہ بڑے زور والا، بڑا زبردست ہے۔

تم یہ کبھی نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ پر اور آخرت کے دن پر یقین رکھتے ہیں، وہ اُن لوگوں سے دوستی رکھیں جو اللہ اور اُس کے رسول کے دشمن ہوئے، اگرچہ وہ اُن کے باپ ہوں یا بیٹے یا اُن کے بھائی یا اُن کے اہلِ خاندان۔ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت فرمادیا اور اپنے ایک فیضِ روحانی سے اُن کی مدد کی اور (یہی لوگ ہیں) جنھیں وہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن میں نہریں بہتی ہوں گی۔ اُن میں (وہ) ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ اُن سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہ اللہ کی جماعت ہیں۔ سنو، اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ کی جماعت ہی فلاح پانے والی ہے۔

—— البشریٰ ——

شـــذرات

معز امجد

منشورِ انقلاب

(۲)

ریاست کی سطح پر قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح کی ذمہ داری

جب ریاست کی سطح پر یہ بات اصولی طور پر تسلیم کر لی جائے کہ اس میں اللہ کی کتاب، قرآنِ مجید اور اس کے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو بالاتر قانون کی حیثیت حاصل ہو گی، اور ریاست کے ہر ایسے قانون کو، جو قرآن وسنت کے منشا و مدعا کے خلاف ہو، کالعدم قرار دے دیا جائے گا، تو اب اگلا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن وسنت کی کون سی تعبیر کو، ریاست کی سطح پر، قانون کی حیثیت حاصل ہونی چاہیے؟ کیا امام ابوحنیفہ کی تعبیر ریاست کا قانون بن جائے گی، امام مالک کی آرا نافذ العمل بھی جائیں گی، فقہ جعفریہ کا نفاذ کر دیا جائے گا یا یہ حق امام شافعی یا امام احمد بن حنبل میں سے کسی کی آرا کو حاصل ہو گا؟

ہم یہ بات پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ہمارے دین کے اصل ماخذ قرآنِ مجید اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہی ہیں۔ انھی میں اصل اور مکمل دین موجود ہے۔ چنانچہ امام ابوحنیفہ ہوں یا امام مالک، امام احمد بن حنبل ہوں یا امام شافعی، ان سب نے قرآن وسنت ہی کی روشنی میں دین کی شرح و وضاحت کی سعی کی ہے۔ یہ سب حضرات ہمارے جلیل القدر بزرگ اور ہمارے آئمہ ہیں۔ ہم ان کے علم اور دین کے معاملے میں، ان کی خدمات پر فخر کرتے ہیں۔ ان کی کاوشیں ہمارا علمی سرمایہ اور ہمارے لیے ہدایت و رہنمائی کا سرچشمہ ہیں۔ مگر اس سب کچھ کے باوجود ان میں سے کسی ایک کو بھی دین میں حتمی حجت کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ دین میں آخری حجت کی حیثیت صرف قرآن وسنت کو حاصل ہے، اور دین کے یہ دونوں ماخذ جس طرح ابوحنیفہ و شافعی، مالک و احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے پاس موجود تھے، بالکل اسی طرح ہمارے پاس بھی موجود ہیں۔ اس وجہ سے، ہمارے نزدیک، یہ بات بالکل غلط ہے کہ ہم اپنے آپ کو کسی ایک امام یا ان تمام آئمہ کی آرا ہی کا پابند کر کے، قرآن وسنت سے آنکھیں بند کر لیں۔

اگر کوئی شخص اس کام کے لیے علمی قابلیت و استطاعت بہم پہنچا کر اپنے اندر اجتہادی بصیرت پیدا کرے، تو قرآن و سنت یا عقل و فطرت سے ایسی کوئی دلیل پیش نہیں کی جا سکتی، جو اس کے ان دونوں ماخذوں پر براہِ راست غور کرنے میں رکاوٹ ہو۔ مگر، اس سے یہ بات نکال لینا بھی ایک بہت بڑی حماقت ہوگی کہ ہر شخص، خواہ اس کام کی قابلیت و صلاحیت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، قرآن و سنت پر براہِ راست غور کرنے کا پیدائشی حق رکھتا ہے۔

جس طرح ملک کے آئین اور دیگر قوانین کو تیار کرنے، ان کی شرح و وضاحت کرنے، ان کے مجملات کی تفصیل کرنے اور ان کے اطلاقات کو بیان کرنے کے لیے تربیت یافتہ قانون دانوں کی ضرورت ہوتی ہے، اور جس طرح ہمیں اپنی انفرادی زندگی میں بھی مختلف شعبہ ہائے زندگی کے ماہرین کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے، اسی طرح اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے، زندگی کے مختلف انفرادی و اجتماعی معاملات میں دین کے احکام کی شرح و وضاحت اور قرآن و سنت کے مدعا کو بیان کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ دین کے اہلِ علم اور ماہرین ہی کی طرف رجوع کیا جائے۔ چنانچہ، ایک اسلامی ریاست میں، جب یہ اصول تسلیم کر لیا جائے کہ اس کے تمام قوانین قرآن و سنت ہی کی روشنی میں بنائے جائیں گے، تو پھر ذیل میں درج دو صورتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا لازم ہوگا۔

۱۔ قانون ساز اسمبلی کے تمام ارکان دین کے جید عالم اور اس معاملے میں، اجتہادی بصیرت کے حامل ہوں، یا

۲۔ دین کی شرح و وضاحت اور اس کے قوانین کی حکمت اور فلسفہ اور اس کے اطلاقات بیان کرنے کے لیے دین کے اہلِ علم کی کوئی ایسی کمیٹی یا مجلس تشکیل دی جائے، جس کی طرف قانون سازی کے وقت پارلیمان کے ارکان رجوع کر سکیں۔

پہلی صورت اختیار کرنے کا مطلب یہ نکلے گا کہ صرف دین کے اہلِ علم اور محقق ہی قانون ساز اسمبلیوں کے ممبر بننے کی اہلیت رکھیں گے۔ ہمارے نزدیک، یہ بات کئی وجوہ سے ناقابلِ عمل ہے، جن میں سب سے زیادہ نمایاں وجہ یہ ہے کہ تحقیق و تالیف اور سیاست میں سے کوئی بھی جز وقتی نوعیت کا کام نہیں ہے۔ دونوں کاموں کے الگ الگ تقاضے ہیں اور دونوں کو ایک ساتھ لے کر چلنا، کم و بیش، ناممکن ہے۔ یہ تو گویا اس طرح کی بات ہوگی کہ قانون ساز اسمبلی کے ہر رکن کو سائنس دان یا علمِ ہندسہ یا طبیعات کا ماہر ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات ناقابلِ عمل ہے۔ اس کے برعکس، ہم دیکھتے ہیں کہ دوسری صورت، نہ صرف پوری طرح قابلِ عمل ہے، بلکہ اسے ہمارے اس زمانے میں بارہا اختیار بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً قومی و صوبائی اسمبلیوں

کی سطح پر کسی منصوبے کے تکنیکی پہلوؤں پر غور کرنے کے لیے تکنیکی ماہرین کی ایک کمیٹی بنا کر ان کی سفارشات لی جاتی ہیں، معاشی پہلوؤں پر غور کرنے کے لیے ماہرین معیشت سے مدد لی جاتی ہے اور اسی طرح ماحولیات، مارکیٹنگ، فنانس اور دیگر شعبوں کے ماہرین کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ چنانچہ، اسی نہج پر، دین کے معاملے میں مجتہدانہ بصیرت رکھنے والے محققین اور اہلِ علم کی ایک کمیٹی بنائی جا سکتی ہے جس سے قانون ساز اسمبلیاں دین کے معاملے میں رہنمائی حاصل کریں اور قرآن و سنت کی مختلف دفعات کی شرح و وضاحت اور ان کے قوانین کی حکمت اور فلسفے کی تبیین کے لیے جس کی طرف رجوع کر سکیں۔

تاہم، اہلِ علم کی اس کمیٹی سے متعلق، قواعد و ضوابط میں درج ذیل ضوابط کا، خاص طور پر لحاظ کیا جانا چاہیے:

ا۔ مجلس کی تشکیل

اس معاملے میں پہلا ضابطہ یہ ہے کہ اہلِ علم کی اس مجلس کے ارکان کا انتخاب، ارکانِ پارلیمان ہی کے ووٹوں سے کیا جائے گا۔ ایک اسلامی ریاست میں کوئی فرد یہ حیثیت نہیں رکھتا کہ اس کی آرا اور تصورات کو مسلمانوں پر زبردستی نافذ کر دیا جائے۔ مسلمانوں کے تمام اجتماعی معاملات، ان کے باہمی مشورے ہی پر مبنی ہونے چاہییں۔ چنانچہ، اس مجلس کے ارکان کا انتخاب بھی مسلمانوں کے ان نمائندوں ہی کے باہمی مشورے سے کیا جائے گا۔

ب۔ ارکانِ مجلس کے انتخاب کا معیار

اس معاملے میں، دوسرا ضابطہ یہ ہے کہ اس مجلس کی رکنیت کے لیے صرف انھی لوگوں کو اہل سمجھا جائے گا، جو اپنے قول و عمل سے اس بات کو مانتے ہوں کہ دین صرف وہی ہے، جس کی سند قرآنِ مجید یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث و سنت میں موجود ہے' اور یہ کہ دین کے صرف یہ دو ہی مآخذ ہیں، اور ان کی سند کے بغیر کسی بڑے سے بڑے عالم، محقق، مجتہد یا امام کی رائے یا قول کو کسی صورت میں بھی دین کی حیثیت حاصل نہیں ہوتی۔ اس ضابطے سے، آپ سے آپ، یہ نتیجہ نکلے گا کہ اس مجلس کے ارکان دینِ اسلام کے حقیقی اہلِ علم اور محقق ہوں گے، جن کی دلچسپی اس بات سے نہیں ہو گی کہ اپنے اپنے فرقے کا دفاع کریں، بلکہ جذبات اور تعصبات سے پاک ہو کر اللہ کے نازل کردہ دین کو سمجھنا اور اسی کو پیش کرنا ان کا اصل مطمحِ نظر ہو گا۔

ج۔ مجلس کا اختیار

اس معاملے میں تیسرا ضابطہ یہ ہے کہ یہ مجلس اسلامی ریاست کے شہریوں کی حیاتِ اجتماعی سے متعلق تمام معاملات کے بارے میں صرف قرآن و سنت کا منشا متعین کرے گی، ریاست میں قانون سازی کے

لیے بنیادی اصول وضع کرے گی، اور وہ حدود متعین کرے گی جن سے کوئی شخص، ایک مسلمان کی حیثیت سے کبھی باہر نہیں نکل سکتا۔ اس کے بعد، قرآن وسنت کے اس منشا اور ان اصول وحدود کے مطابق، قانون سازی کا کام ملک کی پارلیمان ہی انجام دے گی۔

د۔ مجلس میں اختلافِ رائے

اس معاملے میں چوتھا ضابطہ یہ ہے کہ اگر کسی مسئلے میں ارکانِ مجلس کے درمیان اختلافِ رائے ہو جائے، تو اس کا فیصلہ کثرتِ رائے سے کیا جائے گا۔ مجلس کے فیصلے کی حیثیت سے وہی رائے پیش کی جائے گی، جس کو اکثریت کی حمایت حاصل ہو گی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اکثریت کی رائے ہمیشہ صحیح ہوتی ہے۔ یہ صرف فصلِ نزاعات کا ایک ضابطہ ہے، جسے عقل تسلیم کرتی اور قرآن جس کی تعلیم دیتا ہے۔

اس معاملے میں قرآنِ مجید نے یہ اصولی ہدایت دی ہے:

"ان (مسلمانوں) کے معاملات ان کے باہمی مشورے پر مبنی ہوتے ہیں۔" (الشوریٰ ۴۲: ۳۸)

سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر "تفہیم القرآن" میں اس آیت کے تحت، اجتماعی معاملات میں مشاورت کے چند اصول واضح کیے ہیں۔ ان میں سے ایک اصول کی وضاحت میں وہ لکھتے ہیں:

> "پنجم یہ کہ جو مشورہ اہلِ شوریٰ کے اجماع (اتفاقِ رائے) سے دیا جائے، یا جسے ان کے جمہور (اکثریت) کی تائید حاصل ہو، اسے تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ اگر ایک شخص یا ایک ٹولہ سب کی سننے کے بعد اپنی من مانی کرنے کا مختار ہو، تو مشاورت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہا کہ "ان کے معاملات میں ان سے مشورہ لیا جاتا ہے" بلکہ یہ فرما رہا ہے کہ "ان کے معاملات آپس کے مشورے سے چلتے ہیں۔" اس ارشاد کی تعمیل محض مشورہ لے لینے سے نہیں ہو جاتی، بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ مشاورت میں اجماع یا اکثریت کے ساتھ جو بات طے ہو، اسی کے مطابق معاملات چلیں۔" (ج ۴، ص ۵۱۰)

اس اصول کے تحت، وہ تمام امور، جن میں ارکانِ مجلس میں اختلافِ رائے ہو جائے، ان میں اکثریت کی رائے کو مجلس کا فیصلہ سمجھا جائے گا۔ مجلس کے اندر یا باہر کوئی شخص، اگر اس فیصلے سے اختلاف رکھتا ہو، تو وہ اپنا یہ اختلاف، علمی دلائل کے ساتھ، تحریر و تقریر کے ذریعے سے، جہاں چاہے، بیان کر سکتا اور لوگوں کو اپنی رائے کا قائل کرنے کی سعی کر سکتا ہے۔ تاہم، مجلس کے فیصلے کے خلاف احتجاج، اس سے انحراف یا اس کی خلاف ورزی، ہر حال میں، ریاست کے خلاف جرم قرار پائے گی۔

عید الاضحیٰ کی قربانی

چند روایات

- رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قربانی کے دن اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ محبوب عمل (قربانی کا) خون گرانا ہے۔ اور قربانی کا جانور قیامت کے دن اپنے سینگوں، اور اپنے بالوں اور اپنے کھروں سمیت آئے گا۔ (یعنی، سچے جذبۂ قربانی کے باعث، ایسی بےکار اشیا بھی خدا کی بارگاہ میں اس طرح قبول ہوتی ہیں کہ) قربانی کا خون زمین پر گرنے سے قبل ہی اللہ تعالیٰ کے ہاں درجۂ قبولیت پالیتا ہے۔ چنانچہ پوری خوش دلی کے ساتھ یہ عبادت انجام دیا کرو۔

(ترمذی، ابن ماجہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا)

- صحابۂ کرام علیہم الرضوان نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار فرمایا کہ یہ قربانیاں، کیا ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا: یہ تمھارے جدِ امجد ابراہیم (علیہ السلام) کی سنت ہے۔ پھر صحابہ نے پوچھا: ہمارے لیے اس میں کیا ہے؟ ارشاد فرمایا: ہر بال کے بدلے میں ایک نیکی۔ انھوں نے دریافت کیا: یارسول اللہ، تو اُون کا کیا حکم ہے؟ فرمایا: اس کے بھی ہر رُوئیں کے بدلے ایک نیکی۔

(مسندِ احمد، ابنِ ماجہ عن زید بن ارقم رضی اللہ عنہ)

- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص استطاعت رکھتا ہو، اور پھر قربانی نہ کرے تو وہ ہماری عید گاہ کے قریب بھی نہ آئے۔ (مسندِ احمد، ابنِ ماجہ عن ابوہریرہ رضی اللہ عنہ)

- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دس سال مدینہ طیبہ میں قیام کیا، اور ہر سال قربانی کرتے رہے۔ (ترمذی)

- حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بقر عید کی نماز پڑھی۔ جب آپ فارغ ہوتے، تو آپ کے پاس ایک مینڈھا لایا گیا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ذبح کرتے ہوتے پڑھا: بسم اللہ واللہ اکبر، اے اللہ! یہ قربانی میری طرف سے اور میری اُمت کے اُن افراد کی طرف سے، جنھوں نے قربانی نہیں کی۔"

(مسندِ احمد، ابوداؤد، ترمذی)

ترتیب : ساجد حمید

"سنتِ ثابتہ سے ہماری مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ عملِ متواتر ہے جو صحابہ کے اجماع یا ان کے تواترِ عملی کے ذریعے سے بحیثیتِ دین اس امت کو منتقل ہوا ہے۔ اس کے متعلق ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ جس طرح قولی تواتر سے ثابت ہوا ہے، یہ اسی طرح عملی تواتر سے ثابت ہے۔ چنانچہ، اس کے بارے میں، اب کسی بحث و نزاع کی گنجایش نہیں ہے۔

حدیث، ہمارے نزدیک، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کی وہ روایت ہے جو زیادہ تر اخبارِ آحاد کے طریقے سے ہم کو ملی ہے۔ اس کے متعلق ہماری رائے یہ ہے کہ یہ، اگر قرآنِ مجید، سنتِ ثابتہ اور عقل و فطرت کی اساس پر قائم اور کسی پہلو سے ان کے منافی نہ ہو، اور قابلِ اعتماد ذرائع سے ہم تک پہنچے، تو اس کی حجیت بھی ایک مسلّم حقیقت ہے، جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔"

حدیث و سنت

ساجد حمید

حدیث اور سنت میں فرق

'محدّث' کے جواب میں

اگست ۱۹۸۹ء کے 'اشراق' میں حدیث و سنت سے متعلق مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کے لیکچر پر مبنی ایک مضمون چھپا تھا۔ اس مضمون پر چند نکات پر مبنی' ایک تنقیدی مضمون' جنوری ۱۹۹۴ء کے 'محدّث' میں 'حدیث و سنت میں اختلاف کی اختراع' کے عنوان سے چھپا ہے' جسے شیخ الحدیث حافظ عبد المنان صاحب مدظلہ العالی نے لکھا ہے۔ ہم حافظ صاحب کے تہِ دل سے شکرگزار ہیں کہ انھوں نے ان باتوں کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے' جن کو وہ حق سمجھتے ہیں۔ ہم نے پوری دیانت داری کے ساتھ ان کی باتوں کا جائزہ لیا ہے۔ ان میں سے کچھ تو محض الزامات اور طعنہ زنی پر مبنی ہیں' جن سے مصنف کی بزرگی کے پیش نظر ہم طالب علموں کو اعراض ہی کرنا چاہیے۔ تاہم' ان میں جتنا بھی' بظاہر' استدلال موجود ہے' اس کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر ہم یہاں بیان کیے دیتے ہیں۔

ہمارے نزدیک حدیث و سنت میں فرق ایک بدیہی چیز ہے۔ چنانچہ ہم دین کے مآخذ میں' اسے ایک الگ مقام دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک:

"دین کا تنہا ماخذ اب اس زمین پر صرف اللہ کے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ والاصفات ہے۔ یہ صرف انھی کی ہستی ہے کہ جس سے قیامت تک بنی آدم کو پروردگارِ عالم کی ہدایت میسر ہو سکتی' اور یہ صرف انھی کا مقام ہے کہ اپنے قول و فعل اور تقریر و تصویب سے وہ جس چیز کو دین قرار دیں' وہی اب رہتی دنیا تک دینِ حق قرار پائے۔

وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ

"اور جو کچھ رسول تمھیں دے' وہ لے لو اور جس سے روکے' اس سے رک جاؤ' اور

شَدِيْدُ الْعِقَابِ۔ (الحشر ۵۹:۷) اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ کی سزا سخت ہے۔"

اس کی تفصیل ہم اس طرح کرتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دین ہمیں تین صورتوں میں ملا ہے:

۱۔ قرآنِ مجید

۲۔ سنتِ ثابتہ

۳۔ حدیث

سنتِ ثابتہ سے ہماری مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ عمل متواتر ہے جو صحابہ کے اجماع یا ان کے تواترِ عملی کے ذریعے سے بحیثیتِ دین، اس امت کو منتقل ہوا ہے۔ اس کے متعلق ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے، اس میں اور قرآنِ مجید میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ جس طرح قولی تواتر سے ثابت ہوا ہے، یہ اسی طرح عملی تواتر سے ثابت ہے۔ چنانچہ اس کے بارے میں اب کسی بحث و نزاع کی گنجایش نہیں ہے۔

حدیث، ہمارے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کی وہ روایت ہے جو زیادہ تر اخبارِ آحاد کے طریقے سے ہم کو ملی ہے۔ اس کے متعلق ہماری رائے یہ ہے کہ یہ اگر قرآنِ مجید، سنتِ ثابتہ اور عقل و فطرت کی اساس پر قائم اور کسی پہلو سے ان کے منافی نہ ہو، اور قابلِ اعتماد ذرائع سے ہم تک پہنچے، تو اس کی حجیت بھی ایک مسلم حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

(تعارف، المورد، جاوید احمد غامدی، ص ۴-۵)

یہی وہ فرق ہے، جس کے بارے میں مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے یہ لکھا تھا کہ:

"حدیث و سنت کو لوگ، عام طور پر، بالکل ہم معنی سمجھتے ہیں، یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ حدیث و سنت میں زمین و آسمان کا فرق، اور دین میں دونوں کا مقام و مرتبہ الگ الگ ہے۔ ان کو ہم معنی سمجھنے سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ فہمِ دین کے نقطۂ نظر سے دونوں کے فرق کو واضح طور پر سمجھنا ضروری ہے۔"

یہ فرق کوئی اختراع نہیں ہے، بلکہ ایک بدیہی حقیقت کا بیان ہے، جس سے انکار ممکن ہی نہیں ہے۔ سنت وہ عمل متواتر ہے، جو صحابہ رضوان اللہ علیہم کے اجماع سے ہم تک پہنچا ہے، جبکہ حدیث میں آپ کی سنت کی روایت کے علاوہ تقریر و تصویب، آثارِ صحابہ، سیر و مغازی، قصصِ انبیا،

تفسیرِ قرآن، شانِ نزول، ایمانیات، تاریخ، مناقب و فضائل وغیرہ ایسی چیزیں بھی شامل ہیں کہ جنھیں سنت کا نام دیا ہی نہیں جاسکتا۔ چنانچہ یہ ماننا پڑتا ہے کہ حدیث سنت سے الگ ایک چیز ہے۔

دوسرے یہ کہ حدیث و سنت کے ہم تک پہنچنے میں بھی فرق ہے۔ سنت ہم تک عملی تواتر کے ذریعے سے ایسے ہی پہنچی ہے جس طرح قرآن ہمیں قولی تواتر سے ملا ہے۔ اس وجہ سے ان دونوں کے بارے میں بحث و نزاع کی کوئی گنجایش نہیں ہے جبکہ حدیث خبرِ واحد کے راستے سے ہم تک پہنچی ہے، جس کی دلالت ظنی ہے۔

حدیث و سنت کے اسی فرق کی وجہ سے، اس امت کے اکابر نے ہمیشہ حدیث کو سنتِ متواترہ کے بعد تیسرا بڑا ماخذ مانا ہے، اور اسے ہمیشہ سنتِ متواترہ سے الگ سمجھا ہے۔ ہم آئمۂ کبار کے کچھ اقوال یہاں نقل کریں گے، جس سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اس مسئلے میں ہم نے اسلاف ہی کی راہ اختیار کی ہے، کسی اختراع کے مرتکب نہیں ہوئے۔ لیکن اس سے پہلے کہ آئمۂ کبار کی آرا کا جائزہ لیا جائے، یہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ حافظ صاحب نے حدیث و سنت کے فرق سے انکار کے لیے، جو استدلال اختیار کیا ہے، اس کا جائزہ لے لیا جائے۔ وہ فرماتے ہیں:

"علماے حدیث کی اصطلاح کے مطابق حدیث و سنت میں کوئی فرق نہیں ہے، اور دونوں لفظ ہم معنی ہیں۔ اصولِ حدیث یا متنِ حدیث کی کتب میں ان الفاظ کو مترادف استعمال کیا گیا ہے۔"

مولانا عبدالمنان صاحب کا مطلب یہ ہے کہ علما و محدثین حدیث اور سنت کے الفاظ مترادفات کی حیثیت سے استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے خیال میں، اسلاف حدیث و سنت کو ایک ہی سمجھتے ہیں۔

الفاظ کا ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر استعمال ہو جانا زبان کے قواعد کے مطابق ہے۔ سنت کا لفظ حدیث کے لیے اس لیے بول لیا جاتا ہے کہ حدیث کا زیادہ تر حصہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مطہرہ کی روایت پر مشتمل ہے۔ اس لیے سنت کا لفظ، علیٰ سبیل التغلیب، حدیث پر بھی بول لیا جاتا ہے۔ لیکن زبان میں جب بھی دو لفظ ایک دوسرے کے مترادف کی حیثیت سے استعمال ہوتے ہیں، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جن چیزوں پر وہ لفظ بولے جا رہے ہیں، وہ بھی اب ایک ہو گئی ہیں اور ان میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ مثلاً، رسول اور نبی کے الفاظ ایک دوسرے کے مترادف ہی کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اب نبی اور رسول میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پوری کی پوری امت اس فرق کی قائل ہونے کے باوجود ان دونوں الفاظ کو مترادفات کے طور پر

استعمال کر رہی ہے۔ حتیٰ کہ قرآن نے بھی بعض مقامات پر انھیں مترادف کی حیثیت سے استعمال کیا ہے۔ چنانچہ اگر ہم یہ کہیں کہ چونکہ قرآن نے ان لفظوں کو مترادف کی حیثیت سے بھی استعمال کر لیا ہے، اس لیے اب نبی اور رسول میں کوئی فرق نہیں، تو یہ زبان سے ناواقفیت ہے۔

پھر یہ بات واضح رہے کہ حدیث و سنت اس طرح مترادف استعمال ہوتے بھی نہیں، جیسا کہ حافظ صاحب کا خیال ہے۔ مثلاً، کوئی عالم و فقیہ یہ نہیں کہتا کہ 'نکاح کرنا حدیث ہے'۔ سب یہی کہتے ہیں کہ 'یہ سنت ہے'۔ حتیٰ کہ کوئی یہ بھی نہیں کہتا کہ 'یہ نکاح حدیث کے مطابق کیا گیا'، سب یہی کہتے ہیں کہ 'نکاح سنت کے مطابق ہوا'۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی فرمایا ہے کہ 'النکاح سنتی'، یہ نہیں فرمایا کہ 'النکاح حدیثی'۔ اگر حدیث و سنت دونوں ایک ہی چیز ہیں، تو پھر 'النکاح حدیثی' کا جملہ بے معنی نہ ہوتا۔ ایک اور مثال دیکھیے: جب یہ کہا جاتا ہے کہ حدیث میں یہ آیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بیوی کو اپنی بہن کی حیثیت سے بادشاہ کے پاس بھیجا، تو صاف ظاہر ہے کہ سیدنا ابراہیم کے اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے یوں نہیں کہا جا سکتا کہ 'سنت میں آیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے یوں کیا تھا'۔ ان مثالوں سے صاف واضح ہو رہا ہے کہ ان دونوں میں ایک واضح فرق موجود ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سنت اور حدیث کا یہ فرق بدیہیات میں سے ہے، اس کے ثبوت کے لیے کسی استدلال کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

حدیث کو حدیث کہنا نہ کوئی اختراع ہے اور نہ نعوذ باللہ، اس سے اس کی شان میں کوئی کمی واقع ہوتی ہے۔ حدیث کو حدیث کا یہ نام دینے کے قصوروار ہم نہیں، پوری ملت اور اس کے اکابر ہیں، جنھوں نے اسے یہ نام دیا ہے، اور ظاہر ہے، ان میں کوئی فرق تھا تو مختلف نام رکھے گئے ہیں، ورنہ ان دونوں کو ایک ہی نام سے یاد کر لیا جاتا۔

چنانچہ، قواعد زبان کی رو سے 'حدیث و سنت' بلاشبہ بعض اوقات 'علی سبیل التغلیب' مترادف کی حیثیت سے استعمال ہو جاتے ہیں، لیکن اس سے حدیث و سنت کا باہمی امتیاز ختم نہیں ہوتا۔ آئمہ کبار بھی ان لفظوں کو ہم معنی استعمال کرنے کے باوجود ان دونوں کے فرق کے قائل ہیں۔

امام مالک کی رائے

ابن رشد "بدایۃ المجتہد و نہایۃ المقتصد" میں 'رفع یدین' کے بارے میں امام مالک کی رائے اس طرح بیان کرتے ہیں:

فمنهم من اقتصر به على الاحرام فقط، ترجيحا لحديث عبدالله بن مسعود، وحديث البراء بن عازب وهو مذهب مالك لموافقة العمل به۔

(ج ۱، ص ۹۷)

"فقہا میں سے وہ بھی ہیں، جنھوں نے رفعِ یدین کو صرف تکبیرِ تحریمہ کے ساتھ، عبداللہ ابن مسعود اور براء ابن عازب کی روایت کو ترجیح دینے کی بنا پر، خاص کر دیا ہے۔ یہی رائے امام مالک کی ہے، اس لیے کہ ان کے نزدیک 'العمل' (سنت) سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔"

اب دیکھ لیجیے کہ رفع یدین کی جن روایتوں کو حافظ صاحب نے خبرِ متواتر لکھا ہے، اس کے بارے میں امام مالک نے 'العمل' یعنی سنت پر پرکھ کر اسے تکبیرِ تحریمہ کے ساتھ خاص کر دیا ہے۔ اسی بحث میں ابنِ رشد نے آغاز ہی میں یہ جملہ بھی لکھا ہے:

والسبب فى هذا الاختلاف كله اختلاف الآثار الواردة فى ذلك ومخالفة العمل بالمدينة لبعضها۔ (ج ۱، ص ۹۶)

"اس اختلاف کی تمام تر وجہ اس باب میں وارد آثار کا باہمی اختلاف اور بعض کا عملِ اہلِ مدینہ کے ساتھ اختلاف ہے۔"

یہاں بھی 'عملِ اہلِ مدینہ' سے روایتوں کے متعارض ہونے کی بنا پر، رفعِ یدین سے اختلاف امام مالک ہی کی رائے ہے۔ اور عملِ اہلِ مدینہ سے، امام مالک کے نزدیک، وہ عمل یا سنت مراد ہے، جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ مدینہ کو چھوڑا، اور وہ اس پر کاربند چلے آرہے تھے۔ اور جسے آں حضرت نے بعض روایتوں میں 'ما انا علیہ واصحابی' اور 'سنتی' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

امام شافعی کی رائے

امام شافعی اپنی کتاب "الرسالۃ" کے صفحہ ۲، ۳ پر لکھتے ہیں:

تختلف الاحادیث، فآخذ بعضها استدلالا بكتاب او سنة او اجماع او قياس۔

"احادیث باہم مختلف بھی ہوتی ہیں، تو میں ان میں سے قرآن، مجمع علیہ سنت، اجماع یا قیاس سے استدلال کر کے کچھ کو ترجیح دے لیتا ہوں۔"

اگر امام شافعی کے نزدیک حدیث و سنت ایک ہی چیز ہوتی، تو وہ ایک حدیث کو دوسری

پر ترجیح دینے کے لیے سنت پر نہ پرکھتے۔ ان کے نزدیک سنت کسی بھی قسم کے شائبے سے پاک ہے اس کی دلالت یقینی ہے اور حدیث کی دلالت یقینی نہیں ہے کیونکہ اس میں غلطی و سقم کا احتمال ہے چنانچہ وہ 'اجماع' اور 'قیاس' کی بحث میں لکھتے ہیں:

یحکم بالکتاب والسنة المجتمع علیها الذی لا اختلاف فیها، فنقول لهذا حکمنا بالحق فی الظاهر والباطن، ویحکم بالسنة قد رویت من طریق الانفراد لا یجتمع الناس علیها، فنقول حکمنا بالحق فی الظاهر لانه قد یمکن الغلط فیمن روی الحدیث۔	"اجماع و قیاس کے معاملے میں، قرآنِ مجید اور ایسی مجمع علیہ سنت سے جس میں اختلاف نہیں پایا جاتا، سے استدلال کیا جائے گا اس اجماع و قیاس کو یہ کہیں گے کہ ہم نے اس حق سے استدلال کیا ہے، جو ظاہر و باطن میں حق ہے اور اس سنت سے بھی استدلال کیا جاتا ہے جو خبرِ آحاد کے طور پر آئی ہے اور وہ مجمع علیہ نہیں ہے۔ اس کو ہم یہ کہیں گے کہ ہم نے ظاہری طور پر حق ہی سے حجت پکڑی ہے۔ کیونکہ جس نے روایت کی ہے اس میں نقص ہو سکتا ہے":

اب یہ دیکھ لیجیے کہ جس حدیث کو امام شافعی سنت کہہ رہے ہیں اسے انھوں نے سنت سے الگ ایک حیثیت دی ہے اور دونوں کا نام بھی ایک نہیں رکھا۔ ایک کو انھوں نے 'السنة المجتمع علیها' کہا ہے اور دوسری کو 'السنه قد رویت من طریق الانفراد' کہا ہے۔ چنانچہ یہ بات واضح ہوتی کہ امام شافعی بھی حدیث و سنت کے فرق کے قائل ہیں۔

حنبلی مکتبِ فکر کا مسلک

قاضی ابو یعلیٰ محمد بن الحسین الفرا پانچویں صدی ہجری کے جلیل القدر علما میں شمار ہوتے ہیں۔ مسلکاً حنبلی ہیں۔ حال ہی میں فقہ حنبلی کے اصول پر ان کی ایک کتاب "العدة فی اصول الفقہ" چھپ کر آئی ہے۔ اس میں انھوں نے کسی حدیث کے قبول نہ کرنے کے سلسلے میں سند اور رجال کے علاوہ، پانچ اصول دیے ہیں، اور یہ وہی اصول ہیں، جو آئمہ اہلِ سنت کے ہاں مجمع علیہ ہیں۔ چنانچہ وہ دوسرا اصول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ان يخالف نص كتاب الله اوسنة متواترة۔ (ج ۳، ص ۹۶۴)

"(وہ حدیث بھی رد کر دی جائے گی) جو کتاب اللہ کی کسی نص یا سنتِ متواترہ کے خلاف ہوگی۔"

چنانچہ ان کے نزدیک بھی سنت اور حدیث دو مختلف چیزوں کے نام ہیں، جن میں سے ایک دوسرے پر پرکھی جا سکتی ہے۔

صاحبِ "الکفایۃ" کی رائے

حافظ عبدالمنان صاحب نے سب سے زیادہ مطالبہ یہ کیا ہے کہ "حدیث وسنت میں مزعوم فرق کو ثابت کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ان کتابوں سے یا صاحبِ "الکفایۃ فی علم الروایۃ" سے کوئی حوالہ نقل کیا جاتا۔ اپنے مضمون کے آغاز میں وہ لکھتے ہیں: "اصولِ حدیث میں خطیب بغدادی کی مستند کتاب "الکفایۃ فی علم الروایۃ" کے پہلے دو ابواب ہی اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ محدثین کے ہاں حدیث وسنت ہم معنی ہیں۔"

صاحبِ "الکفایۃ" اپنی کتاب کے تیسرے باب 'الکلام فی الاخبار وتقسیمھا' کے تحت روایتوں کی صحت وعدمِ صحت کے لحاظ سے تقسیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وقد يستدل ايضا على صحته بأن يكون خبرا عن امر اقتضاه القرآن او السنة المتواترة او اجتمعت الامة على تصديقه۔ (ص: ۱۷)

"روایت کی صحت تک اس طرح بھی پہنچا جا سکتا ہے کہ حدیث کسی ایسے معاملے کی اطلاع دے، جو اقتضائے قرآن یا اقتضائے سنتِ متواترہ ہو، یا امت اس کی تصدیق پر جمع ہو گئی ہو وغیرہ۔"

جو شخص حدیث اور سنت میں فرق نہ کرتا ہو، وہ یہ جملہ اپنی کتاب میں نہیں لکھ سکتا کہ حدیث وہی صحیح ہے، جو اقتضائے سنت کی خبر ہو، بلکہ خطیب کے اس جملے: "اجتمعت الامة على تصديقه" سے ان کا یہ نقطۂ نظر بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ امور جن پر ملت مجتمع ہو، اس کے خلاف بھی حدیث قبول نہیں کی جائے گی۔ کیا یہ بات سنتِ متواترہ کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے؟ سنتِ متواترہ کے بارے میں یہ رائے رکھنا کیا کفر نہیں ہوگا؟

کتاب کے آخر میں انھوں نے 'ذکر ما یقبل فیہ خبر الواحد وما لا یقبل فیہ' کے نام

سے ایک باب باندھا ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں:

ولا یقبل خبر الواحد فی منافات حکم	"وہ حدیث قبول نہیں کی جائے گی جو عقل،
العقل وحکم القرآن والسنة المعلومة	قرآن، معروف سنت اور بحیثیتِ سنت جاری
والفعل الجاری مجری السنة وکل	کسی عمل، یا کسی دلیلِ قطعی کے منافی ہو۔"
دلیل مقطوع بہ۔ (ص: ۴۳۲)	

یہ ہمارے اسلاف کا مسلک ہے اور ہم بھی اسی کے قائل ہیں۔ وہ بھی ان دونوں لفظوں کو ہم معنی استعمال کر لینے کے باوجود ان دونوں میں امتیاز کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث اپنے مندرجات، اپنے ثبوت اور ہم تک پہنچنے کے طریقے، گویا ہر اعتبار سے سنت سے مختلف ہے۔ علماے سلف کے نقطۂ نظر کو جان لینے کے بعد اب ذرا موجودہ دور کے علماے اہلِ حدیث میں سے ایک جید عالمِ دین کے نقطۂ نظر کو بھی دیکھ لیجیے، جس سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ اسلاف کی طرح، آج بھی، حدیث اور سنت کو اسی نظر سے دیکھا جاتا، اور ان دونوں میں موجود فرق کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

مولانا اسماعیل سلفی کا مسلک

مولانا اسماعیل رحمہ اللہ اپنی کتاب "حجیتِ حدیث" میں لکھتے ہیں:

"قرآنِ عزیز کے الفاظ جس تواتر اور قطعیت سے ہم تک پہنچے ہیں، سنت کو وہ مقام حاصل نہیں ہوا۔ سنت کا گو بہت بڑا ذخیرہ متواتر ہے، لیکن تمام مروی متون کو قطعیت اور تواتر کا یہ شرف حاصل نہیں ہوا۔ عبادات اور اعمال کا کثیر سرمایہ متواتر ہے۔ نماز، اس کے فرائض، سنن، اذکار تنوع کے باوجود بحیثیتِ مجموعی متواتر ہیں، مگر معاملات، مغازی اور سیرت کا بہت سا ذخیرہ اخبارِ آحاد ہیں۔ علم الاسناد کے مباحث اور رجال میں جرح و تعدیل کی وجہ سے آحاد کے ذخیرہ میں وہ قطعیت نہیں رہتی۔ عبادات کے بعض گوشے آحاد ہی کے مرہونِ منت ہیں، لیکن ان آحاد کا مقام بھی اخباری روایات سے کہیں ارفع ہے۔ محدثین کی تنقید اور نقل، اخبار اور تاریخ سے مختلف اور بہت زیادہ موثق ہے، بلکہ علما نے صحیح اخبارِ آحاد کے قبول اور ان پر عمل کے وجوب پر اتفاق فرمایا ہے۔ ان سے جو علم حاصل ہوتا ہے، گو وہ متواتر کے برابر نہیں ہوتا، لیکن بذاتِ خود وہ قابلِ استناد ہے۔" (ص ۱۷)

مولانا اسماعیل کے یہ الفاظ اپنے مدعا میں بہت واضح ہیں، انھوں نے، بلاشبہ، حدیث کو

سنت میں شامل کیا ہے، لیکن ان کے یہ الفاظ ببانگِ دہل یہ بتا رہے ہیں کہ سنت اور حدیث کئی اعتبارات سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

۱۔ پہلا فرق انھوں نے یہ کیا ہے کہ دونوں کو الگ الگ نام دیے ہیں جس کو ہم سنتِ متواترہ کہتے ہیں، اسے انھوں نے بھی سنتِ متواترہ کہا ہے۔ لکھتے ہیں: "سنت کا گو بڑا ذخیرہ متواتر ہے۔" حدیث کے لیے انھوں نے دو نام لیے ہیں: 'مروی متون' اور 'اخبارِ آحاد'۔ ہم نہیں جانتے انھوں نے 'مروی متون' کے بجائے حدیث کا عام فہم اور مروج لفظ کیوں اختیار نہیں کیا۔

۲۔ ان دونوں کے درجے میں بھی فرق ہے۔ سنتِ متواترہ حجیت کے اعتبار سے اخبارِ آحاد سے ارفع ہے، مولانا لکھتے ہیں: "ان (اخبارِ آحاد) سے جو علم حاصل ہوتا ہے، گو وہ متواتر کے برابر نہیں ہوتا، لیکن بذاتِ خود وہ قابلِ استناد ہے۔"

۳۔ سنتِ متواترہ اور حدیث (مروی متون) "شرفِ تواتر وقطعیت میں" یکساں نہیں ہیں۔ یہ ان کے نزدیک حدیث وسنت میں تیسرا فرق ہوا۔ چنانچہ ان کے یہ الفاظ کہ "سنت کا گو بڑا ذخیرہ متواتر ہے"۔ اور یہ الفاظ کہ "علم الاسناد کے مباحث اور رجال میں جرح وتعدیل کی وجہ سے آحاد کے ذخیرہ میں وہ قطعیت نہیں رہتی"؛ اس فرق کی واضح دلیل ہیں۔

۴۔ سنتِ متواترہ کے 'مشمولات' انھوں نے عبادات اور اعمال کو قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں: "عبادات اور اعمال کا کثیر سرمایہ متواتر ہے۔" اور اس کے برعکس معاملات، مغازی، اور سیرت سے متعلق روایات کو خبرِ آحاد سے متعلق کیا ہے، جسے عرفِ عام میں حدیث ہی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان کے الفاظ ہیں: "مگر معاملات، مغازی اور سیرت کا بہت سا ذخیرہ اخبارِ آحاد ہیں۔"

۵۔ ان کے نزدیک سنتِ متواترہ کا تواتر اور قطعیت 'علم الاسناد اور رجال میں جرح وتعدیل سے مجروح نہیں ہوتے' جبکہ اخبارِ آحاد کے معاملے میں ان کے نزدیک: "علم الاسناد کے مباحث اور رجال میں جرح وتعدیل کی وجہ سے آحاد کے ذخیرہ میں قطعیت نہیں رہتی۔"

۶۔ ان کی رائے میں سنتِ متواترہ واجب العمل ہونے میں کسی دلیل وبرہان کی محتاج نہیں ہے، جبکہ صحیح اخبارِ آحاد ان کے نزدیک بھی علما کے اتفاق کی محتاج ہیں، وہ لکھتے ہیں: "علما نے صحیح اخبارِ آحاد کے قبول اور ان پر عمل کے وجوب پر اتفاق فرمایا ہے۔"

حدیث وسنت کے یہ چھ واضح امتیازی پہلو ہیں، جو ان کی تحریر سے 'بالبداہت' نمایاں ہیں۔ چنانچہ، ہماری نظر میں مولانا اسماعیل صاحب سلفی رحمہ اللہ بھی حدیث وسنت کا الگ الگ تصور

اپنے ذہن میں رکھتے تھے۔ ہمارے نزدیک انھوں نے اس تحریر میں ان امتیازی پہلوؤں کی نشاندہی 'علی وجہ البصیرت' کی ہے۔ ان جیسے بڑے عالم کے بارے میں یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اپنی بات کہنے میں وہ عاجز رہ گئے ہوں گے۔ اس لیے مولانا محمد اسماعیل سلفی صاحب کے اس نقطۂ نظر کے بعد، ہم پورے اطمینان کے ساتھ' یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ اہلِ حدیث سمیت اہلِ سنت کے تمام مکاتبِ فکر حدیث و سنت کے اس فرق کے قائل ہیں۔

حافظ صاحب کا ایک اعتراض یہ ہے کہ "مولانا امین احسن اصلاحی کے نزدیک، حدیث قول، فعل اور تقریر ہے لیکن سنت قول و عمل سے متعلق ہے' اور تقریر سنت کے دائرہ سے خارج ہے' حالانکہ محدثینِ کرام رسول اللہ کے قول، فعل اور تقریر کو جس طرح حدیث کہتے ہیں، اسی طرح ان تینوں پر سنت کا اطلاق بھی کرتے ہیں۔"

ہم یہ عرض کر چکے ہیں کہ حدیث کے لیے سنت کا لفظ 'علی سبیل التغلیب' بول لیا جاتا ہے۔ اسی طرح تقریر کے لیے بھی یہ لفظ، اس کی مشروعیت کی وجہ سے' استعمال ہو جاتا ہے۔ اس سے سنت اور تقریر کا امتیاز ختم نہیں ہو گا۔ اوپر ہم نے اسلاف کے اقوال سے ثابت کر دیا ہے کہ وہ حدیث کو سنت کا نام دینے کے باوجود، دونوں کے فرق کے بھی قائل ہیں، بعینہٖ یہی معاملہ تقریر کا ہے۔ اس کو سنت کہہ دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ سنتِ متواترہ کے درجے کو پہنچ گیا ہے' اس لیے کہ تقریر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہوتا ہی نہیں، اور بالعموم' اسے سنتِ متواترہ کا سا تواتر بھی حاصل نہیں ہوتا، جو اسے سنت کے درجے تک پہنچا سکے۔

ہماری اس بات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے قدرے تفصیل سے دیکھا جائے۔ تقریر کا مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی صحابی کی بات یا عمل پر خاموش رہیں، اس پر نکیر نہ کریں، دوسرے یہ کہ آپ اس کی تصویب کر دیں، یا یہ کہ آپ اس کی تحسین بھی کر دیں کہ یہ بہت اچھا عمل ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا تقریر، تصویب' اور تحسین سنت ہو سکتے ہیں؟ ہمارے نزدیک آپ کی تقریر یا تصویب سے ایک چیز مشروع، یقیناً، ہو جاتی ہے، لیکن اس کا سنت ہو جانا ضروری نہیں ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھیے: نماز، تکبیرِ تحریمہ سے لے کر سلام پھیرنے تک' اس کی ایک ایک چیز مسنون ہے۔ اس پر پوری امت کا اتفاق ہے' اور اس پر بھی پوری امت مجتمع ہے کہ ان میں سے اگر ایک چیز بھی، عمداً، ترک کر دی جائے تو نماز نہیں ہو گی۔ حتیٰ کہ اگر کوئی رکوع کے بعد' 'سمع اللہ لمن حمدہ ربنا و لک الحمد' کا جملہ کہنے سے انکار کر دے تو اس کی نماز نہیں ہو گی۔

لیکن اب تقریر کا معاملہ دیکھیے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھا رہے تھے کہ جب آپ 'سمع اللہ لمن حمدہ' کہہ کر رکوع سے اٹھے تو ایک صحابی نے اس کا جواب یوں دیا: 'ربنا ولک الحمد، حمدا کثیرا طیبا مبارکا فیہ' (النسائی)۔ نماز کے بعد آپ نے اس اضافے کی بہت تحسین فرمائی۔ یہ تقریر اعلیٰ درجے کی تقریر ہے، جس کی تحسین بھی کی گئی ہے، لیکن آج ہم میں سے اگر کوئی آدمی اس تقریر کو نماز میں شامل نہ کرے، تو کیا 'سمع اللہ لمن حمدہ' نہ کہنے والے کی طرح اس کی نماز بھی نہیں ہوگی؟ بہ ظاہر ہے کہ دین سے واقف ہر شخص اس کا جواب یہی ہوگا کہ اس کی نماز ہو جائے گی۔ اس لیے کہ اس تقریر سے پہلے بھی اور بعد میں بھی، آپ نے اس کے بغیر نماز پڑھی ہے اور وہی نماز مکمل ہے۔ چنانچہ یہ تقریر سنت نہیں ہو سکتی، تاہم یہ ایک نہایت پسندیدہ بات ہے۔

اس تقریر سے ہمیں صرف اتنا معلوم ہوا کہ نماز میں یہ جملہ بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص اپنی نماز میں اس جملے کا اضافہ کرے، تو اس سے نماز میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ نہیں یہ تقریر سنت ہے اور اسے بھی نماز کے باقی اجزا کی طرح کا مقام حاصل ہے، اب اس تقریر کو نماز کا حصہ سمجھنا چاہیے، اس کے بغیر نماز مکمل نہیں ہوتی تو ایسا کہنے والا شخص، بلاشبہ، دین میں اضافے کا مرتکب ہوگا۔

تقریر کی ایک اور مثال دیکھیے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو کسی مسجد میں امامت کی ذمہ داری سونپی، اور وہ وہاں نماز پڑھانے لگے۔ کچھ عرصے بعد، ان کے بارے میں یہ شکایت آپ تک پہنچی کہ وہ ہر نماز میں سورۂ اخلاص ضرور پڑھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ان کو بلا کر اس کی وجہ پوچھنی چاہیے۔ جب وہ آئے، تو آپ نے ان سے اس کی وجہ پوچھی۔ انھوں نے جواب میں عرض کی کہ مجھے سورۂ اخلاص میں توحید کا بیان بہت پسند ہے، اس لیے ایسا کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: تو نے اللہ کی وحدانیت کو پسند کیا، تو اللہ نے تجھے پسند کیا (مشکوٰۃ، کتاب فضائل القرآن)۔ اب یہ بھی ایک تقریر ہے، اور اس میں ہر نماز میں سورۂ اخلاص پڑھنے کی تحسین کی گئی ہے، چنانچہ اسے اگر حافظ عبدالمنان صاحب کے اصول کے مطابق، سنت مان لیا جائے، تو اس کے دو نہایت خطرناک نتائج نکلتے ہیں:

ایک تو یہ کہ آج تک ہم نے جو نمازیں، سورۂ اخلاص کے بغیر پڑھی ہیں، وہ سب سنت کے خلاف پڑھی ہیں، اس لیے وہ ضائع ہو گئیں، کیونکہ سنت تو یہ ہے کہ ہر نماز میں سورۂ اخلاص پڑھی جائے۔ حتیٰ کہ صحابہ کی نمازیں بھی معرضِ خطر میں پڑ جائیں گی، کیونکہ ان کے بارے میں روایات

میں آتا ہے کہ وہ فجر میں اتنی لمبی لمبی سورتیں پڑھتے تھے کہ نماز کے دوران ہی میں سورج طلوع ہو جاتا تھا۔
اور دوسرا نتیجہ یہ نکلے گا کہ آئندہ کے لیے یہ لازم ہو جائے گا کہ ہر نماز میں سورۂ اخلاص پڑھی جائے۔ چنانچہ 'لاصلاۃ الابفاتحۃ الکتاب' کی طرح، حافظ صاحب کے طریقے پر یہ بھی لازم ہے کہ آج سے 'لاصلاۃ الا بسورۃ الاخلاص' بھی اصول بنا لیا جائے، کیونکہ اس تقریر میں اسے ہر نماز کے لیے ضروری قرار دے دیا گیا ہے۔ اور تقریر حافظ صاحب کے بقول، چونکہ سنت ہوتی ہے، چنانچہ ضروری ہے کہ اس پر عمل کیا جائے، اس لیے کہ سنت پر عمل کا حکم قرآن نے دیا ہے:
'اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول' اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔'
آخر میں حافظ صاحب سے گزارش ہے کہ ہم نے یہ مضمون کسی نقطۂ نظر کے ساتھ تعصب کی بنا پر نہیں لکھا، اور نہ اس سے کوئی مناظرانہ شکست و فتح پیشِ نظر ہے۔ اس سے مقصود تلاشِ حق اور احقاقِ حق کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اگر ہمارے کسی جملے سے مناظرانہ طرزِ استدلال کی بو آتی ہو تو یہ محض قلم کی لغزش ہے۔ ہم نے وہ اسلوب جان بوجھ کر اختیار نہیں کیا۔ البتہ، اس میں اگر آپ کہیں خلافِ حق بات پائیں، تو اس کے بارے میں آپ کے ارشادات کے ہم منتظر رہیں گے، اور اللہ سے دعا گو ہیں کہ: اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ ارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ۔

وحیدالدین خاں

تعلیم

علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک علم وہ ہے جو قرآن و حدیث کی صورت میں مرتب ہو کر ہمارے پاس موجود ہے۔ دوسرا علم وہ ہے جس کو انسان اپنی تلاش اور محنت سے بناتا ہے۔ پہلا علم آدمی کو اس کے خدا کی پہچان کراتا ہے، اور یہ بتاتا ہے کہ مرنے کے بعد جب آدمی آخرت کی مستقل دنیا میں پہنچے گا، تو وہاں اس کو کس قسم کے معاملات سے سابقہ پیش آئے گا اور ان معاملات کے اعتبار سے اس کو اپنی موجودہ زندگی میں کس قسم کی تیاری کرنی چاہیے۔ دوسرا علم یہ بتاتا ہے کہ دنیا میں ہمارے جو مادی اور معاشی مسائل ہیں، ان کو کس طرح حل کیا جائے۔

مسلمان کو یہ دونوں علم سیکھنا ہیں۔ اس کو علمِ دین بھی جاننا چاہیے اور علمِ دنیا بھی۔ البتہ، دونوں کا درجہ الگ الگ ہے۔ قرآن و حدیث کا علم حاصل کرنا مسلمان کی زندگی کا مقصد ہے اور دوسرے علوم کو سیکھنا مسلمان کی دنیوی ضرورت۔ قرآن و حدیث کی باتوں کو جانے بغیر کوئی شخص صحیح معنوں میں مسلمان نہیں ہو سکتا۔ وہ اس سے باخبر نہیں ہو سکتا کہ آخرت کی کامیابی کے لیے اس کو موجودہ زندگی میں کیا کرنا چاہیے۔ مگر دنیوی علوم کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ دنیا میں پیش آنے والے مادی معاملات میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ مثلاً کھیتوں سے اچھی فصل کس طرح اگائی جائے۔ کارخانوں سے ضروریاتِ زندگی کے سامان کس طرح بنائے جائیں۔ شہروں کی تعمیر میں کن قواعد کا لحاظ کیا جائے وغیرہ۔ قرآن و حدیث کا علم آدمی کو آخرت کی ابدی زندگی کی تعمیر کی راہ بتاتا ہے اور دوسرے علوم دنیا کی موجودہ زندگی کی تعمیر کی راہوں سے باخبر کرتے ہیں۔

مختلف قسم کے علوم کو سیکھنا مسلمان کے لیے بھی اتنا ہی ضروری ہے، جتنا غیر مسلمان کے لیے۔ البتہ مسلمان مقصد اور ضرورت میں فرق کرتا ہے۔ قرآن و حدیث کا علم حاصل کرنے میں اس کا جذبہ دوسرا ہوتا ہے، اور دوسرے دنیوی علوم کو حاصل کرنے میں دوسرا۔

ترتیب : طالب محسن

"اس فریق کا کہنا یہ ہے کہ اسلامی انقلاب کا راستہ دعوت و تربیت کا راستہ ہے، یعنی لوگوں کے دل و دماغ کو بدل کر ان کی فکری تطہیر کی جائے، پھر انھیں منظم کیا جائے اور پھر ان کی قوت سے معاشرے کو بدل ڈالا جائے۔ یہ نظریہ بھی اپنی اصل میں غلط نہیں، اور ۱۹۴۱ء میں جب مولانا مودودی نے جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی، تو انھی تین نکات کو اپنے لائحۂ عمل میں مرکزی حیثیت دی، لیکن یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ قیام پاکستان کے بعد جماعت نے اس پالیسی کو تبدیل کر دیا اور معاشرے کو دعوت و تربیت کی بنیاد پر بدلنے اور اسی بنیاد پر سیاسی انقلاب لانے کا مشن ترک کر کے براہ راست سیاسی جدوجہد کرنے اور انتخابی میدان میں فتح حاصل کر کے معاشرے کی ریاستی اقتدار کے ذریعے اصلاح کرنے کا طریقہ اپنا لیا، لیکن مختلف عوامل کی بنا پر (جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں) وہ اس میں ناکام رہی۔ اگر جماعت نے قیام پاکستان کے بعد سے سچ مچ دعوت و تربیت کے کام کو اہمیت دی ہوتی، تو یقیناً آج نتائج بہت مختلف ہوتے۔"

فکر و نظر

طالب محسن

حج اور اس کی اہمیت

اسلامی عبادات میں حج بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک مشہور حدیث میں بیان ہوا ہے کہ جب حضرت جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اسلام کیا ہے، تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا: "یہ کہ تم علی الاعلان کہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں، پانچ وقت کی نماز ادا کرو، زکوٰۃ دیتے رہو، رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ کا حج کرو۔ اسلام انھی امور کا اہتمام کرنا ہے۔"

ایک دوسری حدیث میں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پانچ بنیادی چیزوں میں سے ایک قرار دیا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

بنی الاسلام علی خمس	"اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے
شھادۃ ان لا الٰہ الا اللہ	اس بات کی گواہی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود
و ان محمد رسول اللہ و	نہیں اور اس بات کی گواہی کہ محمد صلی اللہ
اقام الصلٰوۃ و ایتاء الزکٰوۃ و	علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا
صوم رمضان و حج البیت۔	زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان کے مہینے کے روزے
(متفق علیہ)	رکھنا اور بیت اللہ کا حج کرنا۔"

حج کی یہ عبادت بہت زیادہ اجر و ثواب کی حامل ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

سئل النبی صلی اللہ علیہ و	"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا،
سلم ای العمل افضل؟	کون سا عمل افضل ہے؟ آپ نے فرمایا:
قال ایمان باللہ و رسولہ۔	اللہ اور اس کے رسول پر ایمان۔ پوچھا گیا،

قیل: ثم ماذا؟ قال الجهاد فی سبیل اللہ۔ قیل: ثم ماذا؟ قال: حج مبرور۔

(متفق علیہ)

اس کے بعد؟ آپ نے فرمایا: اللہ کے راستے میں جہاد۔ پوچھا گیا: اس کے بعد؟ آپ نے فرمایا: وہ حج جسے ادا کرتے ہوئے اس کے سارے تقاضے پورے کیے گئے ہیں:

آپ نے ایک دفعہ لوگوں سے کہا:

ایھا الناس، قد فرض اللہ علیکم الحج، فحجوا۔ من حج للہ فلم یرفث ولم یفسق، خرج من ذنوبہ کیوم ولدتہ امہ۔ والعمرہ الی العمرہ کفارة لما بینھما۔ والحج المبرور لیس لہ جزاء الا الجنہ۔

(متفق علیہ)

"اے لوگو، اللہ نے تمھارے اُوپر حج فرض کیا ہے۔ لہٰذا، حج کرو۔ جو شخص اللہ کے لیے حج کرے، پھر نہ کوئی فحش بات کرے اور نہ کوئی گناہ کرے، تو وہ اپنے گناہوں سے اس طرح نکل آئے گا جیسے وہ اس روز (گناہوں سے پاک تھا) جب اس کی ماں نے اسے جنم دیا تھا۔ اور ایک عمرے کے بعد دوسرا عمرہ، درمیان کے گناہوں کا کفارہ ہے اور وہ حج جسے ادا کرنے میں سارے تقاضے پورے کیے گئے ہوں، اس کا بدلہ لازماً جنت ہے۔"

قرآنِ مجید نے ملتِ ابراہیمی کی اس عبادت کو اس کے صحیح طریقے پر پھر سے استوار کیا ہے۔ یہودیوں نے ملتِ ابراہیمی کے مرکز، خانۂ کعبہ، حج اور بنی اسماعیل کی تاریخ مسخ کرنے کے لیے اپنی کتاب میں اس کے تمام شواہد بگاڑ دیے یا ان میں تحریف کر دی تھی۔ قرآنِ مجید نے ان کی اس حرکت پر انھیں تنبیہ کی اور اس کے بعد فرمایا:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ۔

(آلِ عمران ۳: ۹۷)

"اور اللہ کی خاطر، لوگوں پر، اگر وہ اس کی استطاعت رکھتے ہوں، بیت اللہ کا حج فرض ہے۔ اور جس نے کفر کیا تو (جان رکھو) اللہ عالم والوں سے بالکل بے پروا ہے۔"

اس آیت کا یہ پہلو اس حدیث میں بھی نمایاں ہوا ہے جس میں آپ نے ان لوگوں کو تنبیہ کی ہے جو حج نہیں کرتے، درآنحالیکہ اس کی راہ میں کوئی قابلِ لحاظ چیز حائل نہیں ہے :

عن ابی امامہ، قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من لم یمنعہ من الحج حاجۃ ظاهرۃ، او سلطان جائر او مرض حابس، فمات، ولم یحجج، فلیمت ان شاء یهودیا وان شاء نصرانیا (دارمی)	"حضرت ابو امامہ سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جسے حج سے کسی بڑی ضرورت، کسی ظالم حکمران، اور کسی بے بس کر دینے والے مرض نے نہیں روکا اور وہ حج کیے بغیر مر گیا، تو (خدا کو اس کی پروا نہیں کہ) وہ مرے خواہ یہودی ہو کر، خواہ نصرانی ہو کر۔"

یہ حدیث، قرآنِ مجید کی روشنی میں دیکھیں، تو اہلِ اسلام کی طرف سے حج اور شعائرِ حج سے بے اعتنائی کو یہودیوں اور نصرانیوں کا رویہ قرار دیتی ہے، جسے ایک مسلمان، غیر شعوری طور پر اختیار کر لیتا ہے۔

حج کی حقیقت

قرآنِ مجید کی روشنی میں دین پر غور کریں، تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ دین کا بنیادی مقصد تزکیۂ نفس ہے۔ نفس کے چار پہلو ہیں۔ ایک پہلو نفس کا حیوانی وجود ہے، دوسرا پہلو عقلی وجود، تیسرا روحانی اور چوتھا پہلو اس کا اخلاقی وجود ہے[1]۔ حج کی یہ عبادت نفس کے روحانی وجود کے تزکیے کا ذریعہ ہے۔

نفسِ انسانی کے اللہ تعالیٰ سے تعلق کی چار اساسات ہیں۔ پہلی اساس ذکر ہے۔ یعنی، اللہ تعالیٰ کی یاد سے اپنا دل آباد رکھنا۔ دوسری اساس وفا ہے۔ یعنی یومِ الست اس کی بندگی اور اطاعت کا جو عہد اس کے ساتھ کیا گیا تھا، اسے نبھانا اور اللہ کے احکام کے مطابق اپنی زندگی ڈھال لینا۔ قرآنِ مجید نے اسے ایک دوسرے مقام پر لفظ 'بِر' سے بھی تعبیر کیا ہے۔ تیسری اساس تقویٰ ہے۔ اس کے لیے، قرآنِ مجید میں 'خشیت'، 'اخبات' اور 'قنوت' کے الفاظ بھی آتے ہیں۔

---

[1] اس سلسلہ میں ملاحظہ فرمائیے: سلسلۂ مضامین، 'تزکیۂ نفس ۱۔ ۴'، طالب محسن۔

اس سے مراد یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی گرفت اور اس کی ناراضی سے ڈرے اور اس انجام سے بچنے کی سعی کرے، جو قرآنِ مجید میں ان لوگوں کا بیان ہوا ہے، جن پر خدا غضب ناک ہوگا۔ اور چوتھی اساس محبت ہے۔ یہی وہ اساس ہے، جو بندۂ مومن کو دین کی نصرت و حمایت پر آمادہ کرتی، اور اسے دین کے معاملے میں غیرت مند بناتی ہے۔ اسے اس جذبے سے سرشار کرتی ہے کہ وہ اللہ کے کلمے کو بلند رکھنے اور اس غرض کے لیے اسے جان بھی دینا پڑے، تو دے دے۔

ذکر اور یاد کے لیے نماز فرض کی گئی ہے، تاکہ بندۂ مومن اپنے شب و روز میں، زمین اور آسمان میں رونما ہونے والی ہر اہم تبدیلی پر مسجد میں حاضر ہو اور اپنے پروردگار کے سامنے اپنا سرِ نیاز جھکا کر ہر دفعہ دین اور خدا کے ساتھ اپنی وابستگی تازہ کر لے۔

وفا کی علامت کی حیثیت زکوٰۃ کو حاصل ہے۔ مطلب یہ کہ بندۂ مومن اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہے اور اس طرح خرچ کرتا ہے کہ اپنی متاعِ عزیز بھی خدا کی رضا اور خوشنودی کے لیے، دوسروں کو دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور یہ رویہ صرف ایک باوفا شخص ہی اختیار کر سکتا ہے۔

تقویٰ کی آب یاری کے لیے سال میں ایک مرتبہ ایک مہینے کے روزے فرض کیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ نفلی روزے بھی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی سال کے مختلف اوقات میں نفلی روزے رکھنے کا اہتمام کیا ہے اور مسلمانوں کو بھی اس کی تلقین کی ہے۔ روزہ نفسِ انسانی کو پرہیزگاری کی تربیت دیتا ہے، اور یہی چیز تقویٰ کی اساس ہے۔

محبت کا مظہرِ اتم جہاد ہے، جس میں ایک بندۂ مومن اپنے رب کے دین کے لیے برسرِ پیکار ہونے کے لیے تیار ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ اسے، اگر اللہ کی خاطر اپنی جان بھی قربان کرنی پڑے، تو دریغ نہیں کرتا۔

حج، ان تمام عبادتوں کا مجموعہ ہے۔ جس نے تمام عبادات کی اصل اساسات اپنے اندر جمع کر لی ہیں۔ خانہ کعبہ ہماری نمازوں کا مرکز ہے۔ وہ سب سے پہلی مسجد ہے، جو اسی مقصد کے لیے بنائی گئی۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: میں نے ابراہیم اور ان کی ذریت کو مکہ میں اسی لیے بسایا تھا کہ وہ میرا یہ گھر طواف، قیام اور رکوع کرنے والوں کے لیے پاک رکھیں۔ حج کے لیے، اسی گھر کا قصد کیا جاتا ہے۔ نماز کا مقصد قرآنِ مجید میں اللہ کی یاد بیان ہوا ہے اور طواف اسی نماز کی وہ صورت ہے، جو صرف خانہ کعبہ کی حاضری ہی میں ادا کی جاتی ہے۔ اس نماز میں شمع و پروانہ کی حکایت کو دہرایا جاتا ہے۔ خدا کے بندے اپنے پروردگار کو پکارتے ہوئے، اس کے گھر کے گرد پروانوں کی طرح

گھومتے ہیں۔ زکوٰۃ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی عبادت ہے۔ حج کا اہتمام اور اس کے زادِ راہ کے انتظام میں آدمی جو کچھ خرچ کرتا ہے، وہ اسی جذبے کی تسکین ہے۔ بلکہ، عام آدمی تو اپنے روزمرہ کے اخراجات کم کر کے ہی حج کے مصارف پورے کرنے کا متحمل ہو پاتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کا جذبۂ انفاق اور بھی زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ روزے کا مقصد تقویٰ کی آب یاری ہے۔ یہ اللہ کی طرف بڑھنے، دنیوی خواہشات ترک کرنے اور اللہ کے ساتھ لو لگانے کی عبادت ہے۔ حج، یہ غرض بھی بتمام و کمال پوری کرتا ہے۔ آدمی اپنی ضروریات روک کر حج کے اخراجات کا بندوبست کرتا اور اپنے معاملات و علائق چھوڑ کر اللہ کے گھر کے لیے عازمِ سفر ہوتا ہے۔ اسی طرح ہجرت و جہاد کی عبادت بھی معصیت کی زندگی سے نکلنے اور خدا کی راہ میں سرگرم ہو جانے کے جذبے کا نام ہے۔ حج میں بھی آدمی اپنے پروردگار کے لیے گھر بار چھوڑتا اور حج کے دنوں میں ایک مجاہد کی طرح کبھی پڑاؤ اور کبھی سفر کے مراحل سے گزرتا ہے، اور ان میں پیش آنے والی صعوبتیں برداشت کرتا ہے۔

اگر ہم حج کے مشمولات پر نگاہ ڈالیں، تو یہ حقیقت مشہود ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ حج ایک جامع عبادت ہے۔ احرام باندھنا، اس بات کی علامت ہے کہ ہم نے دنیا سے اپنا تعلق منقطع کر لیا اور دنیا کے معاملات چھوڑ دیے ہیں۔ احرام کے اَن سلے لباس سے بھی یہی چیز ظاہر ہوتی ہے کہ ہم زیب و زینت کی زندگی ترک کر کے، وہ لباس پہن کر خدا کے حضور میں حاضر ہو گئے ہیں، جس لباس میں مردہ قبر میں اتارا جاتا ہے۔ پھر ہماری زبان پر، وہ ترانہ جاری ہو جاتا ہے، جس سے ہمارے خدا کے حضور حاضری کے والہانہ جذبے کا اظہار ہوتا ہے، اور جس میں ہم اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں:

لبیك، اللّٰھم لبیك، لا	"حاضر ہوں، اے اللہ، حاضر ہوں تیرا کوئی
شریك لك لبیك، ان	شریک نہیں، لاریب، شکر تیرا ہے نعمتیں
الحمد و النعمة لك و	تجھ سے ہیں، اقتدار تیرا ہے تیرا کوئی
الملك، لا شریك لك۔	شریک نہیں۔"

یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ شکر کا جذبہ خدا کے ساتھ تعلق کے سارے پہلوؤں میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ احرام باندھتے ہی گویا رونے کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ صنفی تعلق ممنوع ہو جاتا ہے۔ شیطان جن تین راستوں سے، بالعموم، نفسِ انسانی پر اثر انداز ہوتا

ہے، ان کا سدِ باب کر دیا جاتا ہے۔ قرآنِ مجید نے جہاں آدابِ حج بیان کیے، وہاں اسی چیز کو موضوع بنایا ہے۔ ارشاد ہے:

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِیْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ یَّعْلَمْهُ اللّٰهُ وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی وَاتَّقُوْنِ یٰاُولِی الْاَلْبَابِ۔ (البقرہ ۲: ۱۹۷)

"حج کے متعین مہینے ہیں، چنانچہ جس نے حج کا عزم کر لیا، اس کے لیے لازم ہے کہ وہ نہ کوئی فحش بات کرے، نہ گناہ کی اور نہ لڑائی جھگڑا کرے۔ جو نیک کام تم کرو گے، اللہ اس سے باخبر ہے۔ (تقویٰ کا) زادِ راہ لو، بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔ اور اے عقل والو، مجھی سے ڈرو۔"

خدا کی نافرمانی، شہوانی باتیں اور لڑائی جھگڑا وہ ذرائع ہیں، جن سے شیطان انسان کو غلط راستے پر ڈال دینے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ یہی تین چیزیں ہیں، جن کی شیطان ترغیب دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حاجیوں کو ان سے روک کر شیطان کی دراندازی کے سارے راستے بند کر دیے ہیں۔ روزہ رکھ کر جو کیفیت ایک بندے پر طاری ہوتی ہے، وہی کیفیت ایک حاجی کی احرام باندھنے کے بعد ہوتی ہے۔ جس طرح اس پر یہ احساس طاری رہتا ہے کہ وہ روزے سے ہے، لہٰذا اسے شہوت کی باتوں سے بچنا ہے، کھانے پینے کے قریب بھی نہیں جانا، اور گناہوں سے گریزاں رہنا ہے، اسی طرح احرام بھی حاجی کو اس احساس سے سرشار رکھتا ہے کہ وہ حج کر رہا ہے اور اسے برائیوں کے قریب بھی نہیں جانا چاہیے۔ اور جس طرح، روزہ دار اگر روزے کے آداب کا خیال نہ رکھے، تو اسے بھوک پیاس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، اسی طرح ایک حاجی بھی اپنی ساری مساعی کو گناہ کی باتوں کے باعث غارت کر سکتا ہے۔

حجرِ اسود کو علامت کے طور پر اللہ کا ہاتھ قرار دیا گیا ہے۔ طواف کا آغاز اسے چوم کر یا اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر کیا جاتا ہے۔ ہاتھ چومنا یا ہاتھ پر ہاتھ رکھنا عہد معاہدے کی توثیق کا ایک طریقہ ہے۔ حاجی طواف کے آغاز میں یہ عمل کر کے، 'بسم اللہ، اللہ اکبر' کہہ کر وہ دعا پڑھتا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے ہوئے عہدِ وفا کی تجدید کی جاتی ہے:

اللھم ایمانا بك وتصدیقا بکتابك ووفاء بعھدك واتباعا بسنة

"اے اللہ، (میں حاضر ہوں) آپ پر ایمان کی خاطر، آپ کی کتاب کی تصدیق کے لیے،

نبیك محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ (بیہقی، طبرانی)	آپ کا عہد پورا کرنے اور آپ کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع کیجیے۔

سعی، نصرتِ دین کے جذبے کی علامت ہے۔ اس کا پیکرِ اتم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت ہے۔ جب وہ اپنے بیٹے کو قربان کرنے کے لیے قربان گاہ لے گئے، تو صفا اور مروہ کے درمیان قربانی کو پھیرے دلائے۔ ان کا یہی عمل ہے، جو سعی کی صورت میں حج کا حصہ بن گیا ہے۔

سر منڈانا پرانے زمانے میں غلام بننے کی علامت تھی۔ جب کوئی شخص کسی کا غلام بن جاتا، تو اس کا سر مونڈ دیا جاتا تھا۔ حاجی اپنا سر منڈا کر غلامیِ رب کا نشان سجا لیتا ہے۔

پھر، عرفات کا وقوف، درحقیقت، اپنے آپ کو خدا کے حضور میں کھڑا کر دینا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں یہ سنت قائم کی کہ خطبے اور دوپہر کی نمازوں کے بعد مغرب کی طرف رخ کر کے کھڑے ہوتے اور اس وقت تک کھڑے دعا فرماتے رہتے جب تک سورج ڈوب نہیں گیا۔ اس دوران میں بندۂ مومن اپنے گناہوں کو یاد کرتا، استغفار کرتا اور دعائیں مانگتا ہے۔

مزدلفہ میں، اگرچہ وقوف تو عرفات کے مقابلے میں مختصر ہوتا ہے، لیکن عرفات و مزدلفہ کے مابین یہ سفر معنوی طور پر جہاد کے سفر کی علامت بن جاتا ہے۔ ایک مقام پر رُکے، پڑاؤ کیا، پھر اگلی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس دوران میں نمازیں بھی جہاد سے مشابہت ہی کی وجہ سے قصر پڑھی جاتی ہیں۔

جمرات کو کنکر مارنا، خدا کے دشمنوں کے ساتھ مقابلے کی علامت ہے۔ اس طریقے سے بندۂ مومن خدا کے دشمنوں کے خلاف جہاد کے جذبے کا اظہار کرتا ہے۔

قربانی جہاد کا آخری پہلو ہے، اس طرح کہ جہاد میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کو حج میں قربانی کی صورت میں علامتی طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ بندۂ مومن قربانی اس جذبے کے ساتھ کرتا ہے کہ جس طرح اس نے خدا کی خوشنودی کے لیے جانور قربان کیا ہے، اسی طرح، اگر اس کے دین کو ضرورت پڑی، تو وہ اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کر دے گا۔

چند احتیاطیں

ایک حاجی کا حج سے اصل مقصود اپنے خدا کی رضا اور خوشنودی ہونا چاہیے۔ قرآنِ مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ۔ "اور حج اور عمرہ صرف اللہ کے لیے کرو۔" (البقرہ ۲: ۱۹۶)

قریش نے حج کے اصل مرکز خانہ کعبہ کو شرک و بت پرستی کا اڈا بنا لیا تھا۔ خانہ کعبہ کے اندر بت رکھ دیے تھے۔ اسی طرح صفا اور مروہ کی پہاڑیوں پر بھی بت آویزاں کر دیے تھے۔ پھر انھوں نے حج کو اپنے تجارتی مفادات کا ذریعہ بھی بنا لیا اور اس کے لیے 'نسی' کا طریقہ ایجاد کر کے حج ہمیشہ سازگار موسم میں لانے کا بندوبست بھی کر لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مسلمانوں کو تاکید کی ہے کہ ان کا مقصود نہ خدا کے علاوہ دوسری ہستیوں کی خوشنودی ہونا چاہیے اور نہ ان کے پیش نظر اس سفر سے محض تجارتی فوائد اٹھانا ہو۔ ان کی غرض صرف اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی رضا ہونی چاہیے۔

دوسری چیز شہوات سے گریز ہے۔ حج میں، چونکہ پردے کی معمول کی پابندیاں نہیں ہوتیں، اس لیے اس کا اندیشہ رہتا ہے کہ آدمی کی نگاہ بھٹک جائے۔ پھر، جس چیز پر پابندی لگ جائے، اس کے لیے اکساہٹ بڑھ جاتی ہے اور شیطان انسان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ حاجی اس پختہ عزم کے ساتھ گھر سے نکلے کہ اسے ہر چھوٹی بڑی برائی سے، بہر حال، بچنا ہے۔ اس معاملے میں عورتیں خاص احتیاط کریں اور حاضری کے لیے ایسے اوقات کا انتخاب کریں، جس میں مردوں سے مڈبھیڑ کا اندیشہ کم سے کم ہو۔

حدودِ الٰہی کے احترام کے ساتھ ساتھ، حرم کی تعظیم کا بھی خصوصی لحاظ رکھنا چاہیے۔ حدودِ حرم میں لڑائی جھگڑا کرنا، تھوکنے یا ناک صاف کرنے میں حرم کی حرمت پیش نظر نہ رکھنا، اسی طرح حوائج ضروری سے فراغت کے لیے پردے اور اوٹ کا ضروری اہتمام نہ کرنا، پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ مردوں اور عورتوں کا آبِ زمزم پیتے اور استعمال کرتے ہوئے ستر پوشی کا خیال نہ رکھنا، یہ تمام وہ باتیں ہیں جو سراسر حرم کی تعظیم کے منافی ہیں اور ایک مسلمان کو اس سے، ہر حال میں بچنا چاہیے۔

اور آخری چیز جسے ہر حاجی کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے، وہ مناسکِ حج کی وہ حکمت اور فلسفہ ہے، جس کا اجمالی ذکر ہم اوپر کی سطور میں کر چکے ہیں۔ اگر حج کے مناسک ادا کرتے ہوتے، ان کی روح ختم ہو جائے، تو وہ محض رسم کا ادا کر دینا ہے۔ اور ایسے حج سے، وہ تزکیہ حاصل نہیں ہو سکتا، جو اس سے مقصود ہے۔

چند اصلاح طلب باتیں

حج کے مناسک سے متعلق کچھ غلط چیزیں رائج ہوگئی ہیں۔ ان میں سے بعض بدعات کا درجہ رکھتی ہیں، لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے قاری کو ان کے بارے میں متنبہ کر دیں، تاکہ حج سنت کے مطابق ادا کیا جا سکے۔

لوگ حج پر جانے کے بعد، بالعموم، ایک سے زیادہ عمرے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ چیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق نہیں ہے۔ آپ جب حج کے لیے مکہ آئے، تو کافی عرصہ مقیم رہے، لیکن، اس کے باوجود، آپ نے عمرہ صرف ایک ہی کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حاجی کے لیے مسنون طریقہ یہی ہے کہ وہ ایک ہی عمرہ کرے۔ قرآن مجید سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ ان حاجیوں کو جو دوسرے علاقوں سے حج کے لیے آتے ہیں، انھیں یہ رخصت دی گئی ہے کہ وہ حج اور عمرے کو اکٹھا کر لیں۔ انھیں عمرے اور حج کے لیے الگ الگ دو سفر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس رخصت سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک قربانی کفارے کے طور پر کریں۔ اس سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے کہ عمرہ صرف ایک ہی ہونا چاہیے۔

ایک اور بات، جو غلط طور پر رائج ہوگئی ہے، وہ طواف کے ہر پھیرے کے لیے الگ دعا کا پڑھنا ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ مسنون دعا صرف وہی ہے جو طواف کے آغاز میں 'بسم اللہ، اللہ اکبر' کہتے ہوئے، حجرِ اسود کی طرف ہاتھ اٹھا کر یا اسے چوم کر پڑھی جاتی ہے[1]، یا پھر وہ دعا مسنون ہے، جو رکنِ یمانی کے پاس پڑھی جاتی ہے۔ یہ دعا ان الفاظ میں روایت ہوئی ہے:

اللھم انی اسئلك العفو والعافیة فی الدنیا و الآخرة، ربنا اتنا فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنة و قنا عذاب النار۔ (ابن ماجہ)	"اے اللہ، میں آپ سے دنیا و آخرت کی مغفرت اور عافیت کا طلب گار ہوں۔ اے ہمارے پروردگار، ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی، اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔"

طواف کے دوران میں، حاجی جو دعا چاہے، مانگ سکتا ہے۔ اس کے لیے کوئی مخصوص

---

[1] یہ دعا ہم اوپر درج کر چکے ہیں۔

دعا نہیں ہے۔ اسی طرح سعی کے آغاز میں بھی وہی دعا پڑھنی چاہیے، جو حضور نے سکھائی ہے۔ دعا کے یہ الفاظ صفا پہاڑی پر چڑھنے کے بعد قبلہ رو کھڑے ہو کر ادا کیے جاتے ہیں:

لا اله الا الله و الله اكبر	"اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ بہت بڑا ہے۔
لا اله الا الله وحده لا شريك	اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ وہ یکتا ہے۔
له، له الملك وله الحمد و	اس کا کوئی شریک نہیں۔ تمام باگ ڈور اسی
هو على كل شيئ قدير۔	کے ہاتھ میں ہے۔ وہی سزاوار حمد ہے۔ اور
لا اله الا الله وحده انجز	اسے ہر چیز پر قدرت حاصل ہے۔ اللہ کے
وعده ونصر عبده وهزم	سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ یکتا ہے۔ اس نے اپنا
الاحزاب وحده۔	وعدہ فرمایا اور اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم)
(مسلم)	کی مدد فرمائی اور تنہا سب لشکروں کو شکست دی۔"

یہ الفاظ ادا کر کے، جو دعا مانگنی ہو مانگی جائے اور اسی طرح یہ عمل تین مرتبہ دہرایا جائے گا۔ اسی طریقے سے یہ دعا مروہ پر بھی پڑھی جائے گی۔ اس کے علاوہ کوئی خاص دعا نہیں ہے سعی کے دوران میں حاجی جو دعا چاہے، مانگ سکتا ہے۔

عرفات میں بعض لوگ قصر نماز نہیں پڑھتے۔ چونکہ سنت کے مطابق، وہاں قصر نماز ہی پڑھائی جاتی ہے۔ لہٰذا، جو لوگ قصر نہیں کرنا چاہتے، وہ اپنی الگ نماز پڑھ لیتے ہیں۔ یہ بات بالکل غلط ہے اور اس کے بارے میں یہ استدلال بھی صحیح نہیں کہ یہاں سفر کی علت پر نماز قصر پڑھی جاتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ حج کا یہ حصہ جہاد کے ساتھ مشابہ ہے اور جہاد کے ساتھ تشابہ ہی کی وجہ سے یہاں نمازیں قصر ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا، یہ ضروری ہے کہ حاجی امام کے ساتھ قصر نماز پڑھیں۔ اسی طرح مزدلفہ میں بھی نماز قصر ہی پڑھی جائے گی۔ مزدلفہ کی رات کے بارے میں یہ بات بھی غلط رائج ہو گئی ہے کہ اس میں جاگ کر زیادہ سے زیادہ عبادت کرنی چاہیے۔ اس کے بالکل برعکس نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہاں مغرب و عشا پڑھ کر سو گئے اور صبح اٹھ کر فجر کی نماز پڑھی تھی۔ حضور آخر شب روزانہ تہجد پڑھا کرتے تھے، لیکن اس رات آپ نے یہ نماز بھی نہیں پڑھی۔

منیٰ میں، عام طور پر لوگ دو دن قیام کر کے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ، یہ رخصت دی گئی ہے، لیکن بہتر یہی ہے کہ تین دن قیام کیا جائے۔ سب نہیں، تو کچھ لوگوں کو ضرور اس سنت کا اہتمام کرنا چاہیے، جبکہ اجر کے لحاظ سے تین دن کے قیام کی بڑی اہمیت ہے۔

مسجدِ نبوی میں چالیس نمازوں کی تاکید بھی بالکل بے بنیاد ہے۔ مدینے میں قیام کے لیے عرصے کی کوئی شرط نہیں اور نہ نمازوں ہی کی کوئی تعداد معین ہے۔ البتہ مسجدِ قبا میں دو رکعت نفل نماز کے اہتمام کی بڑی فضیلت ہے۔ اسی طرح مسجدِ نبوی میں عبادت کی اپنی فضیلت ہے لیکن اس کا حج کے ساتھ براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔

ڈاکٹر محمد امین

اسلام کا تصوّرِ نجات

(۲)

[ربطِ مضمون کے لیے پچھلا شمارہ ملاحظہ فرمائیں]

۲۔ قرآن کے جس فلسفۂ نجات کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی، جو قرآن کے اوّلین اور گویا 'سرکاری' شارح ہیں، اس کو مزید واضح کیا ہے۔ آپ نے فرمایا:

اہلِ کتاب نبوتِ محمدی پر ایمان نہ لائیں تو مستحقِ عذاب ہوں گے

عن ابی هريرة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال والذی نفس محمد بيده لا يسمع بی احد من هذه الامة يهودی ونصرانی ثم يموت ولم يؤمن بالذی ارسلت به الا كان من اصحاب النار۔ (مسلم)

"حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) روایت کرتے ہیں کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: اس ذات کی قسم، جس کے قبضۂ قدرت میں محمد کی جان ہے، اس امت (دعوت) کا جو کوئی بھی یہودی یا نصرانی میری خبر سن لے اور پھر وہ میرے لائے ہوئے دین پر ایمان لائے بغیر مر جائے تو وہ دوزخیوں میں سے ہوگا۔"

اپنی کتابوں پر عامل اہلِ کتاب بھی اس انکار کی وجہ سے جہنمی ہیں

عن عبد الله بن مسعود قال جاء رجل الى النبی (صلى الله عليه وسلم) فقال يا رسول الله ارأيت رجلا من

"حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا کہ ایک

النصاریٰ متمسکا بالانجیل ورجلا
من الیهود متمسکا بالتوراة یومن
بالله ورسوله ثم لم یتبعك
قال رسول الله (صلی الله علیه وسلم)
من سمع بی من یهودی او نصرانی ثم لم
یتبعنی فھو فی النار۔

(دارقطنی)

عیسائی انجیل کے مطابق عمل کرتا ہے اور ایک
یہودی تورات کے مطابق عمل کرتا ہے۔ وہ
اللہ اور اس کے رسول پر ایمان بھی رکھتا ہے،
مگر آپ کی اطاعت نہیں کرتا، تو اس کا کیا حکم
ہے؟) آپ نے فرمایا" جس یہودی یا نصرانی
نے میرے متعلق سن لیا، اور میری پیروی نہیں
کی، وہ دوزخی ہے"۔

حضور کا جس نے انکار کیا، وہ ہلاک ہوا

عن ابی موسی الاشعری عن النبی
صلی الله علیه وسلم قال انما مثلی
ومثل ما بعثنی الله به کمثل رجل
اتی قوما فقال یاقوم انی رایت
الجیش بعینی وانی انا النذیر
العریان فالنجاء، فاطاعه طائفة
من قومه فادلجوا فانطلقوا علی
مهلهم فنجوا وکذبت طائفة
منهم فاصبحوا مکانهم فصبحهم
الجیش فاهلکهم واجتاحهم
فذلك مثل من اطاعنی فاتبع ما
جئت به ومثل من عصانی وکذب بما
جئت به من الحق۔

(بخاری، کتاب الاعتصام)

"حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ روایت
کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،
میری اور میرے پیغام کی حیثیت اس شخص کی
سی ہے جو ایک قوم کے پاس گیا اور کہنے لگا،
میں نے دشمن کا لشکر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے
اور نذیر عریاں بن کر تمھیں ڈرانے آیا ہوں، تو
اپنے آپ کو بچا لو۔ کچھ لوگوں نے اس کی بات
مان لی، سحر سے رات ہی کو چل دیے اور بچ
گئے۔ اور کچھ لوگوں نے اس کا انکار کر دیا،
صبح تک اپنے ٹھکانوں ہی میں پڑے رہے
پھر صبح دم (دشمن کے) لشکر نے انھیں آ لیا اور
انھیں ہلاک و برباد کر ڈالا۔ پس یہی مثال ہے،
ان لوگوں کی، جنھوں نے مجھ پر یقین کیا اور میری
بات مانی یا پھر میرا انکار کیا اور مجھے جھٹلایا"۔

اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو وہ بھی حضور ہی کی پیروی کرتے

عن جابر ان عمر بن خطاب اتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنسخة من التوراة فسکت۔ فجعل یقرأ۔ و وجہ رسول اللہ یتغیر۔ فقال ابوبکر، ثکلتك الثواکل، ماتری مالوجه رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ فنظر عمر الی وجه رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ فقال، اعوذ بالله من غضب الله و غضب رسوله، رضینا بالله ربا وبالاسلام دینا و بمحمد نبیا۔ فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم والذی نفس محمد بیده لوبدا لکم موسی فاتبعتموه وترکتمونی لضللتم عن سواء السبیل۔ ولوکان حیا وادرك نبوتی لاتبعنی۔ (مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

"حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تورات کا ایک نسخہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے تو آپ خاموش رہے۔ حضرت عمر نے اسے پڑھنا شروع کر دیا تو آپ کا رنگ متغیر ہونے لگا۔ حضرت ابوبکر نے حضرت عمر سے کہا: ارے کم بخت حضور کے چہرے کو تو دیکھو۔ انھوں نے حضور کے چہرے کو دیکھا تو کہنے لگے: میں اللہ اور اس کے رسول کے غضب سے پناہ مانگتا ہوں۔ میں اللہ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر اور آپ کے نبی ہونے پر راضی ہوں۔ آپ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے آج اگر موسیٰ (علیہ السلام) بھی ہوں اور تم مجھے چھوڑ کر ان کی پیروی کرو تو گمراہ ہو جاؤ گے۔ آج اگر موسیٰ بھی زندہ ہوتے اور میری نبوت کا زمانہ پاتے تو میری ہی اتباع کرتے۔"

یہودی بچہ بھی ایمان لائے بغیر جہنم سے نہیں بچ سکتا

عن انس ان غلاما یهودیا کان یضع للنبی صلی الله علیه وسلم وضوءه ویناوله نعلیه۔ فمرض۔ فاتاه النبی صلی الله علیه وسلم۔ فدخل علیه۔ و ابوه قاعد عنه رأسه فقال النبی صلی الله علیه وسلم، یا فلان، قل لا اله الا الله

"حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک یہودی لڑکا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو کرواتا اور آپ کے جوتے سنبھالتا تھا۔ وہ بیمار ہو گیا، تو آپ اس کی عیادت کرنے گئے۔ اس کا باپ اس کے سرہانے بیٹھا تھا۔ آپ نے لڑکے سے کہا کہ کہو لا الہ الا اللہ، اس

فنظر الی ابیه۔ فسکت ابوہ۔ فاعاد علیہ النبی	نے اپنے باپ کی طرف دیکھا تو وہ خاموش رہا'
صلی اللہ علیہ وسلم۔ فنظر الی ابیہ۔ فقال ابوہ،	آپ نے پھر وہی بات فرمائی تو اس نے اپنے
اطع ابا القاسم۔ فقال الغلام، اشھد ان لا	باپ کی طرف دیکھا۔ اس کے باپ نے کہا:
الہ الا اللہ وانک رسول اللہ۔ فخرج	ابوالقاسم کی اطاعت کرو' تو لڑکے نے کلمۂ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم،	شہادت پڑھ کر اللہ کے رب اور حضور کے نبی
وھو یقول، الحمد للہ الذی	ہونے کا اقرار کیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ
اخرجہ بی من النار۔	کہتے ہوئے اٹھے کہ اللہ کا شکر ہے
(مسند احمد بروایت انس بن مالک)	جس نے' میری وجہ سے اس کو آگ سے نکال لیا"

۲۔ زیر بحث موضوع سے متعلق جو آیات و احادیث ہم نے پیش کی ہیں' وہ اپنے مدعا میں نہایت واضح ہیں اور شرعی حجت کے لیے کفایت کرتی ہیں۔ تاہم یہ دیکھنے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ ہمارے اسلاف میں ثقہ اور قابلِ اعتماد مفسرین نے ان آیات کا کیا مطلب سمجھا ہے۔

امام طبری (۳۱۰ھ)

امام طبری اپنی قابلِ قدر تفسیر 'جامع البیان فی تفسیر القرآن' میں سورۂ انبیا آیت ۹۴ کی تفسیر میں کہتے ہیں:

نیک اعمال کا ثواب صرف مومنوں کے لیے ہے

"جن لوگوں نے دین میں اختلاف کیا' ان میں سے وہ لوگ جنھوں نے اللہ پر ایمان رکھتے ہوئے اور شرک سے اجتناب کرتے ہوئے' اس کے احکام کے مطابق زندگی گزاری' نیک اعمال کیے اور اللہ کے اوامر و نواہی پر عمل کیا' ان کے اعمال ضائع نہ جائیں گے۔ نیز فرمایا کہ جو شخص ایمان لائے اور اطاعت کرے تو اللہ اسے آخرت میں ثواب ضرور دے گا' جیسا کہ اس نے اپنے مطیع بندوں سے وعدہ کر رکھا ہے اور ایسا نہیں ہو گا کہ اس کے حسنات کا انکار کر دیا جائے اور اس کے نیک اعمال کا بدلا اسے نہ دیا جائے (بشرطیکہ وہ مومن ہو)۔" (ج ۹' ص ۶۸)

امام رازی (۶۰۶ھ)

امام رازی 'تفسیر کبیر' میں سورۂ نسا آیات ۱۵۰' ۱۵۱ کی تفسیر کرتے ہوتے کہتے ہیں:

نبیوں میں فرق کرنا کفر ہے

"اللہ تعالیٰ نے منافقین کے ذکر کے بعد یہود و نصاریٰ کے تضادات کا ذکر یہاں کیا ہے اور فرمایا ہے کہ ان کا باطل رویہ یہ ہے کہ وہ بعض نبیوں کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں۔ جیسے یہودی حضرت موسیٰ اور تورات کو مانتے ہیں، لیکن حضرت عیسیٰ اور انجیل کا انکار کرتے ہیں۔ اور عیسائی حضرت عیسیٰ اور انجیل پر تو ایمان لاتے ہیں، لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور قرآن کا انکار کرتے ہیں اور اس طرح 'ایمان باللہ' اور 'ایمان بالرسل' میں فرق کرتے ہیں، حالانکہ کسی ایک نبی کا انکار بھی سب انبیا کے انکار کے مترادف ہے" (اور کسی ایک نبی کا انکار بھی اس کے بھیجنے والے کے انکار کے مترادف ہے)۔ (ج ۱۱، ص ۹۲)

سورۂ توبہ کی آیات ۱۷۔۱۹ کی تشریح کرتے ہوئے امام رازی کہتے ہیں:

ایمان کے بغیر نیک اعمال بے وزن ہیں

"اگر کافروں سے نیک اعمال بھی سرزد ہوں جیسے والدین کا اکرام، سراؤں کی تعمیر، بھوکوں کو کھانا کھلانا اور مہمانوں کی تکریم کرنا، تو یہ سب بے معنی ہیں، کیونکہ ان کے کفر کا وزن ان کی نیکیوں کے وزن سے کہیں بڑھ کر ہے، چنانچہ اپنے کفر کے سبب سے وہ کسی اجر کے مستحق نہیں۔" (جلد ۸ صفحہ ۹)

پھر وہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت بیان کرتے ہیں:

تجب عباسؓ کے دوسرے قیدیوں کے ساتھ پکڑے گئے، تو لوگوں نے انھیں عار دلاتے ہوئے کہا کہ حضور کے اتنے قریبی عزیز ہونے کے باوجود کفر اور مخالفت پر ڈٹے ہوتے ہو۔ تم سے کبھی کوئی بھلا کام بھی ہوا ہے ؟ تو انھوں نے کہا کہ ہاں ہم کعبے کے متولی ہیں، حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں اور غلاموں، قیدیوں کو آزاد کرواتے ہیں، قرآن نے یہاں اس بات کا جواب دیا ہے کہ کعبے کی تولیت صرف اس وقت موجب فضیلت ہے، جب یہ ایمان کے ساتھ ہو۔ اگر کوئی کافر اسے نیکی کا کام سمجھ کر کرے تو (ایمان کی عدم موجودگی کی وجہ سے) اسے اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔"

(ج ۸، ص ۸، ۱۴)

امام قرطبی (۶۷۱ھ)

سورۂ نساء کی آیات ۱۵۰۔۱۵۲ کی تفسیر میں امام قرطبی اپنی تفسیر 'الجامع لاحکام القرآن' میں کہتے ہیں:

اہل کتاب بھی کافر ہیں اور کسی اجر کے مستحق نہیں

"اللہ تعالیٰ نے یہاں مشرکین اور منافقین کے بعد اہل کتاب کے کفر کا ذکر کیا ہے کیونکہ انھوں نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انکار کیا تھا اور اس طرح یہ واضح کر دیا کہ حضور کا انکار سارے انبیا کے انکار کے مترادف ہے کیونکہ کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے اپنے متبعین کو سارے انبیا پر ایمان لانے کو اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لانے کو نہ کہا ہو۔"

(ج ۲ ص ۵)

"چونکہ اہل کتاب بعض انبیا پر ایمان لاتے ہیں اور بعض پر نہیں، تو یہ چیز انھیں نفع نہیں پہنچا سکتی، کیونکہ جب وہ اللہ کے ایک نبی کا اقرار کرتے ہیں تو در حقیقت اللہ کا انکار کرتے ہیں اور اس (انجام) کی بشارت دینے والے ہر نبی کا انکار کرتے ہیں، تو پھر ان اہل کتاب کے کافر ہونے میں کیا شک باقی رہ جاتا ہے . . . اور پورا اجر تو صرف انھی کے لیے ہے جو سارے انبیا پر بلا تفریق ایمان لاتے ہیں، جیسے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ کے امتی۔" (ج ۲ ص ۶)

حافظ ابن کثیر (۷۷۴ھ)

حافظ ابن کثیر سورۂ اعراف آیت ۱۴۷ کی تفسیر کرتے ہوئے اپنی کتاب 'تفسیر القرآن العظیم' میں کہتے ہیں:

ایمان کے بغیر نیک اعمال ضائع ہو جاتے ہیں

"وہ لوگ جنھیں ہماری آیتوں سے انکار ہے اور روز قیامت ہم سے سامنا ہونے کا یقین نہیں رکھتے اور مرتے دم تک اپنے خیال پر قائم رہے، تو ایمان کی معیت میں نیک عمل نہ ہونے کے سبب یہ سارے نیک اعمال بھی ضائع ہو جائیں گے اور سلب کر لیے جائیں گے۔ ارشاد ہے کہ ان کے اعمال کی یہی جزا ہے، ہم ان کے حسب اعمال جزا دیتے ہیں، اگر وہ ایمان کے ساتھ نیکی کرتے تو نیک جزا دیتے ہیں اور برائی تو برائی ہی ہے، جیسا عمل ویسا بدلہ۔" (تفسیر ابن کثیر (مع اردو ترجمہ)، ج ۲ ص ۲۳۲/۱۴۴)

نیکی کرنے والے مشرک بھی مستحقِ عذاب ہیں

نیز سورۂ آلِ عمران کی آیت ۹۱ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"(اللہ تعالیٰ) فرماتا ہے کہ کفر پر مرنے والوں کی کوئی نیکی قبول نہ ہوگی، گو اس نے زمین بھر سونا اللہ کی راہ میں خرچ کیا ہو۔ نبیِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھا گیا کہ عبد اللہ بن جدعان جو بڑا مہمان نواز، غلام آزاد کرنے والا اور کھانا کھلانے والا شخص تھا، کیا اس کی یہ نیکیاں اس کے کام آئیں گی؟ تو آپ نے فرمایا: جس نے ساری عمر میں ایک دفعہ بھی توبہ نہیں کی، اس کی خیرات نامقبول ہے" جیسے ایک اور جگہ لکھا ہے "وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ"[1] پس ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کفار کو کوئی چیز نہیں چھڑا سکتی، گو وہ بڑے نیک اور نہایت سخی ہوں، گو زمین بھر سونا اللہ کی راہ میں لٹائیں۔" (ج ۱ ص ۴۵۲، ۴۵۳)

[باقی]

---

[1] البقرہ ۲: ۱۲۳ (اور نہ اس کو کوئی شفاعت نفع پہنچائے گی)

پروفیسر رضی صدیقی

'جماعت اسلامی' کا بحران

اسباب اور علاج

اپنے موضوع پر ایک متوازن نقطۂ نظر کی حامل
اس تحریر کو 'نوائے وقت' کے شکریے کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے

جماعت اسلامی، پاکستان کی ایک بڑی اور منظم دینی سیاسی قوت ہے اور آج کل بحران سے دوچار ہے۔ یہ بحران، اگرچہ، داخلی ہے، لیکن یہ جو صورت بھی اختیار کرے گا، چونکہ ملک و ملّت پر اس کے اثرات لازماً پڑیں گے، اس لیے اس بحران کا تجزیہ ضروری ہے۔

جماعت میں اس وقت دو نقطہ ہائے نظر کھل کر ایک دوسرے کے سامنے آ گئے ہیں۔ سہولتِ بیان کی خاطر ایک کو ہم جدید نقطۂ نظر اور دوسرے کو روایتی نقطۂ نظر کہہ سکتے ہیں۔ پہلے نقطۂ نظر کے حاملین کے سربراہ قاضی حسین احمد ہیں، جبکہ دوسرے نقطۂ نظر کے حامل میاں طفیل محمد، مولانا نعیم صدیقی اور ان کے رفقا ہیں۔ جدید نقطۂ نظر کے حامل گروہ کا خیال ہے کہ جماعتِ اسلامی اپنے روایتی طریقِ کار سے ملک کے اندر کوئی سیاسی تبدیلی نہیں لا سکی، لہٰذا اب جدوجہد کے نئے زاویے تلاش کرنا ضروری ہیں۔ چنانچہ، پہلے تو اس گروہ نے جماعت کے پروگرام کو اندر سے تبدیل کرنے کی کوشش کی، اور جب اس میں مزاحمت ہوئی، تو اس نے پہلے 'پاسبان' کے نام سے سماجی دائرے میں اور پھر 'پاکستان اسلامی فرنٹ' کے نام سے سیاسی دائرے میں الگ تنظیمیں کھڑی کر لیں۔ بدقسمتی سے ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں 'پاکستان اسلامی فرنٹ' کو بہت بری سیاسی شکست ہوئی اور خود جماعت کے روایتی ووٹ بنک نے فرنٹ کو ووٹ نہیں دیے (جس کا برملا اعتراف قاضی حسین احمد صاحب کو بھی کرنا پڑا)۔ اس پر جماعت کے روایتی فکر رکھنے والے بزرگ متحرک ہو گئے اور انھوں نے فریقِ اوّل کو نہ صرف اس ناکامی کا ذمہ دار ٹھہرایا، بلکہ اس پر جماعت کی فکر اور دینی روایات سے انحراف اور دستورِ جماعت کی خلاف ورزی کا صریح الزام بھی کھلم کھلا لگایا اور کہا کہ فریقِ اوّل جماعت کے پالیسی ساز ادارے مجلسِ شوریٰ کو نظر انداز کر کے آمرانہ انداز میں

جماعت کو اپنی مرضی سے چلا رہا ہے۔ جب کشمکش بڑھی تو قاضی حسین احمد نے فریقِ ثانی کو خود موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے جماعت سے استعفیٰ دے دیا، مگر ارکان نے انھیں دوبارہ منتخب کر لیا۔

جہاں تک فریقِ اوّل کے اس موقف کا تعلق ہے کہ چونکہ جماعت اب تک کی کارکردگی اور طے کردہ لائحۂ عمل کے ذریعے سے معاشرے میں دینی اور سیاسی انقلاب نہیں لا سکی، اس لیے سابقہ پالیسی پر نظر ثانی کرنا اور جدوجہد کے نئے زاویے تلاش کرنا ضروری ہے، اس میں بہت وزن ہے خواہ کسی کو ان نتائج سے اختلاف ہی کیوں نہ ہو جن تک فریقِ اوّل پہنچا ہے کیونکہ کھڑا پانی بُو دینے لگتا ہے اور پالیسیوں کا جمود کسی بھی تحریک یا ادارے کی افادیت اور وجود کو ختم کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔ فریقِ اوّل اس نتیجے پر پہنچا محسوس ہوتا ہے کہ جماعت کا آئندہ لائحۂ عمل 'تقسیمِ کار' کی بنیاد پر مبنی ہونا چاہیے، جس کا مفاد یہ ہے کہ جماعت کا ایک سیاسی بازو ہو جو بڑی حد تک خود مختارانہ کام کرے۔ فریقِ اوّل کا یہ موقف ہماری رائے میں غلط نہیں ہے اور صحیح حکمت عملی یہی محسوس ہوتی ہے کہ سیاست اور دعوت و تربیت کے کاموں کو الگ الگ منظم کیا جائے لیکن فریقِ اوّل اس اصول کو صرف اتنا ہی ماننا چاہتا ہے، جتنا یہ اس کے مفاد میں ہے۔ مثلاً وہ سیاسی کام کو الگ رکھنے میں تو بہت دل چسپی رکھتا ہے، لیکن دعوت و تربیت کے کام کو الگ منظم کرنے میں اس نے کبھی دل چسپی نہیں دکھائی۔ اسی طرح تقسیمِ کار کے تقاضے کے مطابق سیاسی تنظیم الگ بنالی جائے، تو اسے جماعت سے الگ، لیکن اس کے زیرِ سایہ خود مختارانہ حیثیت دی جانی چاہیے۔ اور اسی طرح سیاسی محاذ اور دعوتی تنظیم کی قیادتیں الگ ہونی چاہییں، لیکن قاضی حسین احمد سیاسی محاذ کی قیادت پر قناعت کرنے پر بالکل تیار نہیں۔ اس بات کا تعلق محض نظریے سے نہیں، بلکہ مفادات سے بھی ہے۔ وہ فرنٹ کے ساتھ ساتھ جماعت کی امارت بھی اپنے پاس رکھنے پر مصر ہیں، تاکہ ملک اور بیرونِ ملک جماعت کی جو دینی ساکھ قائم ہے اور افرادی اور مالی وسائل جو اس کے ذریعے ملتے ہیں، وہ جماعت کو چھوڑ دینے کے بعد کسی ذیلی تنظیم کی سربراہی سے شاید نہ ملیں۔

فریقِ اوّل کا رویہ ادھورے سچ پر مبنی نہیں۔ جماعت کی آج تک کی ناکامیوں کی جو توجیہ فریقِ دوم کرتا ہے، وہ بھی مجموعۂ اضداد ہے۔ اس فریق کا کہنا یہ ہے کہ اسلامی انقلاب کا راستہ دعوت و تربیت کا راستہ ہے، یعنی لوگوں کے دل و دماغ کو بدل کر ان کی فکری تطہیر کی جائے، پھر انھیں منظم کیا جائے اور پھر ان کی قوت سے معاشرے کو بدل ڈالا جائے۔ یہ نظریہ بھی اپنی اصل میں غلط

نہیں، اور ۱۹۴۱ء میں جب مولانا مودودی نے جماعتِ اسلامی کی بنیاد رکھی، تو انھی تین نکات کو اپنے لائحۂ عمل میں مرکزی حیثیت دی، لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد جماعت نے اس پالیسی کو تبدیل کر دیا اور معاشرے کو دعوت وتربیت کی بنیاد پر بدلنے اور اسی بنیاد پر سیاسی انقلاب لانے کا مشن ترک کر کے براہِ راست سیاسی جدوجہد کرنے اور انتخابی میدان میں فتح حاصل کر کے معاشرے کی ریاستی اقتدار کے ذریعے اصلاح کرنے کا طریقہ اپنا لیا، لیکن مختلف عوامل کی بنا پر (جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں) وہ اس میں ناکام رہی۔ اگر جماعت نے قیامِ پاکستان کے بعد سے پیچ مچ دعوت وتربیت کے کام کو مرکزی اہمیت دی ہوتی، تو یقیناً آج نتائج بہت مختلف ہوتے اور لطف کی بات یہ ہے کہ دعوت وتربیت سے انحراف کی اس پالیسی کے بنانے اور چلانے والے خود میاں طفیل محمد اور نعیم صدیقی ہیں (قاضی حسین احمد تو اس وقت کالج کے طالب علم تھے)۔ آج نعیم صدیقی کہتے ہیں کہ ۱۹۷۰ء کے بعد سے دعوت کا کام صحیح طریقے سے نہیں ہوا۔ اب ان سے کون کہے کہ اگر آپ نے ۲۳ سال پیچھے چھلانگ لگائی ہے، تو تھوڑی سی ہمت کر کے ۱۳ سال اور پیچھے چلے جائیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبد الغفار حسن، مولانا عبد الجبار غازی اور دوسرے اکابرینِ جماعت ۱۹۵۷ء میں یہی تو کہتے تھے۔ اس وقت آپ کو ان لوگوں کی بات سمجھ میں نہ آئی۔ آپ نے ان کا ہاتھ جھٹکا اور اپنی گاڑی آگے بڑھا دی۔ آج آپ کہتے ہیں کہ ۱۹۷۰ء کے بعد سے دعوت کا کام نہیں ہوا۔ آخر اس کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا اس وقت پالیسی بنانے اور چلانے والے آپ نہیں تھے؟ حقیقت یہ ہے کہ جماعت کی ناکامی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اس نے دعوت وتربیت کا کام چھوڑ دیا، یعنی افراد کو دین کی دعوت دینے اور ان کی دینی تربیت کرنے کا کام اس کا مرکزی اور بنیادی کام نہ رہا اور یہ پالیسی انھی لوگوں کی وضع کردہ تھی۔ ۱۹۵۷ء میں ان کو مولانا امین احسن اصلاحی وغیرہ کی بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اسی طرح، آج قاضی حسین احمد اور ان کے رفقا کو ان کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ آج تاریخ اپنے آپ کو دُہرا رہی ہے۔

یہی وہ پس منظر ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ قاضی حسین احمد اور ان کے رفقا منحرفین میں سے نہیں ہیں۔ (اگرچہ بعض لوگ اس خدشے کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ جماعت کی قیادت میں خفیہ ایجنسیوں کے بعض نمائندے موجود ہیں، جنھوں نے صورتِ حال کو بگاڑنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، اور کر رہے ہیں)۔ وہ تو اس فکر کی پیداوار ہیں، جس کی بنیاد میاں طفیل محمد اور نعیم صدیقی صاحب نے رکھی تھی۔ یہ

جماعت کا فطری ارتقا ہے اور اسی ابتدا کی انتہا ہے جس کا آغاز میاں صاحب اور نعیم صاحب نے کیا تھا۔ برتن ویسا ہی بنتا ہے جیسا کمہار اسے بنانا چاہتا ہے۔ قاضی صاحب اور ان کے رفقا جو اس وقت جماعت کی قیادت پر فائز ہیں، ان کی اکثریت جماعت کے طلبہ ونگ میں رہی ہے، اور یہ لوگ ویسے ہی بنے ہیں، جیسے جماعت کی فکری اور عملی قیادت نے انھیں بنانا چاہا تھا۔ لہٰذا اب کیسا گلہ اور کس سے گلہ؟ گیا وقت واپس نہیں آسکتا اور تاریخ کا پہیہ واپس نہیں مڑ سکتا۔ اب سوائے صبر اور استغفار کے کیا چارہ ہے؟

مذکورہ بات سے قطعِ نظر قاضی صاحب اور ان کے رفقا پر جتنے الزامات فریقِ ثانی لگاتا ہے، وہ اکثر و بیشتر صحیح ہیں یعنی انتخابات میں منکرات اور لہو ولعب کا استعمال، قاضی صاحب کی جائز و ناجائز ذاتی پروجیکشن، الیکشن فنڈ کی ناجائز ذرائع سے آمد وخرچ اور جماعت کی شائستگی، وقار اور اخلاقی بلندی کی روایات توڑے جانا وغیرہ لیکن اس طرح تو ہوتا ہے، اس طرح کے کاموں میں اقتدار کے لیے استعجال کی خاطر جو فکری تبدیلی بڑے معصوم انداز میں ۱۹۴۸ء میں ہوئی تھی، اسے نصف صدی میں یہیں پہنچنا تھا، یہ اس کا فطری ارتقا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو البتہ تعجب کی بات تھی اور اب اس کا توڑ بھی موجود نہیں، کیونکہ قاضی صاحب اور ان کی ٹیم نے پچھلے چند سالوں میں جماعت میں اپنے فکری غلبے کو تنظیمی غلبے میں بدلنے کے لیے بڑی جد وجہد کی ہے۔ چنانچہ ایک پلاننگ کے تحت بڑے پیمانے پر ایسے افراد کو ارکان بنایا گیا ہے، جو جماعت کے روایتی معیار کے مطابق رکن بننے کے اہل نہیں تھے۔ امرائے اضلاع، صوبائی و مرکزی ارکان شوریٰ اور ارکانِ عاملہ میں اپنے آدمی لانے کے لیے برسوں سے خاموش اور کامیاب جد وجہد کی گئی ہے، جو اب پھل لا چکی ہے اور اب ان اداروں میں ان کی عددی اکثریت موجود ہے۔ پھر یہ لوگ علم وفکر اور اخلاق میں معتبر نہ سہی، اپنی ذہنی اپج اور تربیت کے لحاظ سے نیوسینس ویلیو (NUISANCE VALUE) رکھتے ہیں، چنانچہ انھیں اپنے سے مختلف نقطۂ نظر رکھنے والوں کو خاموش کرانے، یا ان کو بائی پاس کرنے میں کسی خاص وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا، بلکہ شاطرانہ ہوشیاری اور چالاکی کے یہ امور سٹریٹجی اور پلاننگ کا حصہ سمجھے جاتے ہیں۔ 'پاسبان' اور 'فرنٹ' کی شوریٰ سے منظوری لینے میں یہی طریق کار استعمال کیا گیا۔ چنانچہ خالص قانونی لحاظ سے اسے چیلنج نہیں کیا جا سکتا، لیکن حقیقی صورتِ حال مختلف ہے۔ مثلاً فرنٹ کا تاسیسی اجلاس بلا لیا گیا۔ سارے انتظامات مکمل ہو گئے اور تاسیسی اجلاس سے ایک دن پہلے شوریٰ کا اجلاس منظوری لینے کے لیے بلایا گیا۔ اب ظاہر ہے کیا ہو سکتا تھا۔ پھر شور مچانے والے

بھی بہت تھے۔ چنانچہ مخالف رائے رکھنے والوں کو بھی امیرِ جماعت کی عزت بچانے کی خاطر، مجبوراً ایک انتخاب کی حد تک اس تجربے کی اجازت دینے پر، بجبر و اکراہ' آمادہ ہونا پڑا۔ اس صورتِ حال میں فرنٹ کے قیام کو شوریٰ کا فیصلہ قرار دینا مضحکہ خیز ہی لگتا ہے۔ یہی حال دوسرے فیصلوں کا ہے۔

اس سے یہ کیسے ثابت ہو جائے گا کہ میاں طفیل محمد، نعیم صدیقی اور ان کے رفقا کی رائے غلط ہے؟ وہ کیوں اپنی رائے سے رجوع کر لیں گے؟ کثرت و قلتِ رائے سے نظریات تو ختم نہیں ہو جاتے؟ یا کثرتِ رائے کی قوت اور جبر سے مخالف نقطۂ نظر کو ختم نہیں کیا جا سکتا؟ میاں طفیل اور نعیم صدیقی کوئی ایسے آدمی تو نہیں ہیں جو ڈر کر اپنی رائے سے رجوع کر لیں گے یا ڈر کر خاموش ہو جائیں گے۔

ہمارے نزدیک بحران کا حل یہ ہے کہ شوریٰ کے غیر جانب دار ارکان پر مشتمل (یہ ارکان مناسب سمجھیں تو شوریٰ اور جماعت سے باہر کے کسی فرد یا افراد کی معاونت بھی لے لیں) ایک کمیٹی قائم کی جائے جو ان دو نقطہ ہائے نظر رکھنے والی قیادتوں کو فکری طور پر قریب لانے کی کوشش کرے۔ دونوں فریقوں کو نظریاتی طور پر کچھ لو اور کچھ دو پر مجبور کر کے بقائے باہمی پر مجبور کیا جائے، کیونکہ اگر کوئی ایک فریق غالب آ کر دوسرے کو مٹانے کی کوشش کرے گا، تو اس سے اسے بھی نقصان ہو گا اور جماعت کو بھی۔

سوال یہ ہے کہ وہ کون سا فارمولا ہو سکتا ہے جس پر دونوں فریقوں کو گھیر کر لایا جائے؟

ہماری رائے میں یہ فارمولا چار نکات پر مبنی ہونا چاہیے:

اوّل: فریقِ اول یہ تسلیم کرے کہ فریقِ ثانی کا دعوت و تربیت پر اصرار جائز ہے اور دوسری طرف فریقِ دوم، فریقِ اوّل کے الگ سیاسی محاذ کے مطالبے کو خوش دلی سے تسلیم کرے۔

دوم: سیاسی محاذ کی قیادت قاضی صاحب کے پاس رہے، جو انتظامی طور پر خود مختار ہو لیکن فکری طور پر جماعت کا حصہ ہو۔ جماعت کی قیادت روایتی نقطۂ نظر کے حامل کسی شخص (مثلاً عباسی صاحب) کے پاس رہے، اور جماعت، دعوت و تربیت اور تعلیم و تحقیق کا کام کرے۔

سوم: جماعت کے ارکان و کارکنان کو آزادی ہو کہ وہ اپنا وقت اور سرمایہ اپنے مزاج، صلاحیتوں اور خوشی کے مطابق سیاسی یا دعوتی جس پلیٹ فارم پر چاہیں، خرچ کریں۔

چہارم: سیاسی محاذ اور دعوتی تنظیم میں تعلقاتِ کار کی تفصیلات طے کرنے کے لیے دونوں تنظیموں کے دو دو ارکان پر مشتمل ایک کمیشن تشکیل دے دیا جائے۔ یہ کام بہت زیادہ مشکل نہیں ہو گا، کیونکہ جماعت کو اپنی ذیلی تنظیموں کے ساتھ تعلقاتِ کار قائم کرنے کا پرانا تجربہ ہے۔

OUR THANKS TO

SNOW WHITE DRY CLEANING INDUSTRIES
SH. WILAYAT AHMAD & SONS
CONTINENTAL ART
FEROZE TEXTILE INDUSTRIES
IMAGE COMMUNICATIONS
TIP TOP DRY CLEANERS
F.RABBI & CO. (PVT) LTD
K.B. SARKAR & CO.
PARAMOUNT DISTRIBUTORS (PVT) LTD

تبصرۂ کتب

علی سمان

'اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل'

مصنف: مولانا امین احسن اصلاحی

ضخامت: ۱۲۰ صفحات

قیمت: ۴۲ روپے

ناشر: فاران فاؤنڈیشن، ۱۲۲ فیروزپور روڈ اچھرہ لاہور

"اسلامی ریاست میں فقہی مسائل کا حل" اگرچہ امین احسن اصلاحی صاحب کی ابتدائی تصانیف میں سے ہے، مگر اس مختصر سی کتاب میں بھی فکر کی وہی پختگی اور اجتہادی خیالات و افکار کی وہی تازگی نظر آتی ہے جو ان کی دیگر تصانیف میں ان کا خاصہ رہی ہے۔ کتاب کا دو تہائی حصہ امتِ مسلمہ کے علما میں فقہی اختلافات کی تاریخ پر مشتمل ہے، جبکہ ایک تہائی سے قدرے کم صفحات ان فقہی مسائل کے حل کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔ اصولی بات بھی یہی ہے کہ کسی مسئلے کو حل کرنے سے پیشتر اس کا مکمل پس منظر اور تاریخ جاننا چاہیے۔ مؤلف نے سادہ، مگر تحقیقی انداز میں حنفی، مالکی اور شافعی مکاتیبِ فکر کے قیام کے علاوہ اہلِ حدیث مکتبۂ فکر کے پس منظر پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

کتاب کے پہلے باب میں، تیسرے خلیفۂ راشد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد تک مسلمان علما کے طریقِ کار اور اُن کے باہمی اختلافات کا ذکر ہے یعنی سلف ہی سے اس بات پہ اجماع ہے کہ کسی مسئلے کے حل کے وقت پہلا معیار قرآن اور پھر سنت ہے، اس کے بعد اجتہاد یا اجماع کا درجہ آتا ہے۔ مولانا اصلاحی کے نزدیک 'تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ فقہ میں ہمیشہ اجتہاد پر اجماع کو فوقیت حاصل رہی ہے۔ مولانا نے محدث دہلوی، شاہ ولی اللہ کی کتب کا حوالہ دیتے ہوئے اس حقیقت کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے کہ علماے سلف فتاوی دینے میں انتہائی طرزِ عمل کا

مظاہرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور بیشتر اوقات اجتہاد کی اہم اور فنی ذمہ داری قبول کرنے سے کتراتے ہیں۔ مصنف کی تحقیق کے مطابق، باہمی اختلافات میں بڑھتی ہوئی شدت کی بنیادی وجہ اطاعتِ امیر کا مفقود ہونا یعنی بالواسطہ طور پر نظامِ حکومت کی کمزوری تھا۔ تابعین تک یہ روایت قائم تھی کہ اختلافی صورت میں حتمی فیصلہ حکومت کا ہوتا۔ اگرچہ مجتہد کو اظہارِ رائے کی مکمل آزادی حاصل تھی، لیکن وہ اسے صرف اپنی انفرادی زندگی ہی میں لاگو کرتا، دوسروں پر اپنی رائے ٹھونسنے سے گریز کرتا۔ اجتماعی اعتبار سے لوگ بہرحال کسی خاص شخص کی پیروی پر حکومتِ وقت کی اطاعت کو ترجیح دیتے اور یہ رویہ، مولانا کے نزدیک، حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کے عہدِ مبارک تک اپنی خاص شکل میں باقی رہا۔

کتاب کے دوسرے باب میں حنفی، مالکی اور شافعی مکاتبِ فکر کے قیام کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ حنفی فقہ کے بانی اور امام ابوحنیفہ کے استاد ابراہیم نخعی کوفہ میں قیام پذیر تھے اور وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو فقہی معاملات میں زیادہ قابلِ اعتماد گردانتے تھے۔ دوسری طرف امام مالک کے استاد اور مالکی فقہ کے بانیِ اول سعید بن مسیب کا تعلق مدینہ سے تھا اور وہ اسی نسبت سے حضرت عمرِ فاروق، حضرت ابنِ عباس اور حضرت عائشہ رضوان اللہ علیہم کو نسبتاً قابلِ اعتماد سمجھتے تھے۔ حنفی، مالکی اور اس کے بعد شافعی مکاتب کے درمیان کوئی اصولی اختلافات تو نہ تھے، البتہ جزئیات میں اتفاقِ رائے موجود نہ تھا۔

مولانا امین احسن اصلاحی کے نزدیک، امام شافعی نے حنفی اور مالکی فقہ کے درمیان رابطہ کا فریضہ انجام دیتے ہوئے اتحادِ امت کے لیے ایک قابلِ تعریف کوشش کی۔ پہلی مرتبہ امام شافعی نے اصولِ فقہ پر اسی نام سے ایک کتاب لکھی۔ پھر اُن کے زمانے میں بعض نئی احادیث کے سامنے آنے کے باعث بہت سے اختلافات پیدا ہو گئے تھے کہ اہل الرائے (فقہ) ان مسائل پر پہلے ہی فتویٰ جاری کر چکے تھے۔ امام شافعی ہی نے پہلی مرتبہ روایات و احادیث کو اپنانے یا مسترد کرنے کے بارے میں واضح قواعد و ضوابط کا تعین کیا۔ یاد رہے کہ امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور امام مالک دونوں ہی کے شاگرد رہے ہیں۔

کتاب کے تیسرے باب میں اصحابِ فقہ (اہل الرائے) اور اہلِ حدیث کے اختلافات کا پس منظر بیان کیا گیا ہے جس کے مطابق اصحابِ فقہ (حنفی و مالکی و شافعی) نے چند ایسے معاملات میں فتاویٰ دیے جن پر احادیث موجود تھیں، مگر وہ ان کی نظر سے نہ گزری تھیں۔ دوسری طرف

اہل حدیث جنھوں نے احادیث جمع کرنے پر ساری توجہ مرکوز کر لی تھی، اس بنا پر اصحاب الرائے کو سنت کی خلاف ورزی کا مرتکب سمجھتے کہ ان کے فیصلے حدیث کے موافق نہ تھے، حالاں کہ فی الحقیقت اس سلسلے میں اصحاب الرائے کا قصور صرف اتنا تھا کہ ان تک مذکورہ احادیث پہنچ نہ سکی تھیں، وگرنہ ان کا خلوص شک وشبہ سے بالاتر ہے۔

چوتھے باب میں علما کے ضمن میں تقلید جامد کے خطرناک رجحان کی نشان دہی کی گئی ہے کم و بیش چوتھی صدی ہجری تک عام مسلمان کوئی شرعی مسئلہ پوچھتے وقت علما کی کسی خاص فکر سے وابستگی کو چنداں اہمیت نہ دیتے تھے، لیکن رفتہ رفتہ یہ تخصیص پیدا ہونی شروع ہوگئی۔ علما محنت وتحقیق سے گھبرانے لگے اور مسائل بیان کرتے وقت قرآن وسنت کو معیار بنانے کی بجائے اپنے امام کی مطلق پیروی کی آسان راہ اپنانے لگے۔ اسی سے تقلید جامد کا آغاز ہوا، حالانکہ تقریباً تمام مکاتب فکر کے آئمہ نے خود لوگوں کو اپنے اقوال کی پیروی سے اس وقت تک ہمیشہ روکا جب تک یہ واضح نہ ہو جائے کہ یہ اقوال قرآن یا سنت کی کس نص یا دلیل پر مبنی ہیں۔ انھوں نے آنکھیں بند کرکے اپنے بزرگوں کے اتباع کے رویے کی حوصلہ شکنی کی۔ جب کہ دوسری طرف، اس میں ان کی رواداری اور محبت ومودت کا یہ عالم تھا کہ کبھی حنفی عالم شافعی مسلک کے مطابق مسئلہ بیان کرتا اور کبھی مالکی عالم فقہ حنفی کا تابع ہو جاتا۔ مثال کے طور پر ایک مرتبہ امام شافعی کو امام ابوحنیفہ کے شہر میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا، اب واقعہ یہ تھا کہ ابوحنیفہ وتروں میں دعائے قنوت نہیں پڑھتے تھے، جبکہ امام شافعی کا مسلک مختلف تھا، لیکن اس اختلاف کے باوجود، خود ان کے مطابق، امام شافعی نے محض امام ابوحنیفہ کے احترام میں دعائے قنوت نہیں پڑھی۔ اور اس طرح رواداری کا طرز عمل آئمہ ہی میں نہیں، عمومی طور سے علما میں بھی پایا جاتا تھا۔

کتاب کے پانچویں باب میں فقہی اختلافات کے اسباب پر بحث کی گئی ہے۔ اصلاحی صاحب کے نزدیک، اس کی ایک وجہ اپنے اپنے علاقے کے علمائے دین کے فتاویٰ کو بے جا حد تک فوقیت دینا ہے۔ ثانیاً ایک نکتۂ اختلاف اہل حدیث اور اہل الرائے کے درمیان تھا جو روایات واحادیث اور آرا میں متعصبانہ رویے کے نتیجے میں پیدا ہوا۔ تیسری وجہ صرف مخصوص امام کی پیروی وتقلید ہے۔ یعنی عوام الناس کے علاوہ علما حضرات بھی ایک خاص فقہ کے پابند ہو جائیں اور دیگر حضرت کی آرا کو اہمیت نہ دیں۔ فقہی اختلافات کی شدید صورت میں ظاہر ہونے کی ایک اہم وجہ یہ تاثر بھی تھا کہ آئمہ کرام کے اجتہاد اور فتاویٰ غلطی سے یکسر محفوظ ہیں اور یہ کہ انھیں اسی

طرح دوام حاصل ہے جس طرح قرآنِ مجید یا سنت کو۔ حالانکہ اسلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور شخصیت کے اقوال وافعال کی یہ حیثیت ہے اور نہ حق۔

کتاب کے چھٹے باب میں فقہی اختلافات کا ایک متوازن اور قابلِ عمل حل پیش کرتے ہوئے مؤلف نے یہ نکتہ تفصیل سے بیان کیا ہے کہ اسلامی ریاست ایمان کی تمام جزئیات سے تعرض نہیں کر سکتی اور نہ وہ اپنی رعایا کو کسی خاص فقہ کی تقلید پر مجبور ہی کر سکتی ہے۔ حکومت کا تعلق افراد کے ایسے انفرادی معاملات سے نہیں ہوتا، بلکہ اجتماعی معاملات میں بھی وہ قرآن وسنت کے متفق علیہ اصولوں ہی پر عمل کرتی ہے۔

ساتویں باب کا موضوع ایک اسلامی ریاست میں مختلف فرقوں کی حیثیت ہے۔ اس سلسلے میں اصلاحی صاحب نے اسلامی تاریخ سے خوارج اور اُن کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ڈپلومیٹک طرزِ عمل کا حوالہ دے کر بہت سی باتوں کی وضاحت کر دی ہے۔

اس کتاب کے آخری باب میں اسلامی قانون کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل بحث موجود ہے۔ مصنف نے یہ امر واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلامی قانون کو مدوّن کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ہمارے پاس قرآن کی صورت میں واضح بنیادی اصول وضوابط موجود ہیں اور یہ کہ فقہ یا اسلامی قانون کو باقاعدہ طور سے، مدوّن کر کے نافذ کرنے کی حکومتی سطح کی کوشش، تقلید کا ایک نیا دروازہ کھول سکتی ہے۔ اس ضمن میں مولانا اصلاحی نے انگلستان اور امریکہ کی مثالیں دے کر جدید ذہن کے بہت سے شبہات کا ازالہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان دو ممالک میں بھی قانون مدوّن صورت میں موجود نہیں، لیکن اس کے باوجود منصفین اپنے فرائض صدیوں سے خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہے ہیں۔ اسی باب کے آخر میں امتِ مسلمہ میں قانونِ اسلامی کی تدوین کی مختصر تاریخ دی گئی ہے، جس میں اس سلسلے کی مختلف سطحوں پر کی جانے والی کوششوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

ترتیب : منظور الحسن

"ایک اہم ترین پہلو یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیات سے اعراض کی روش نہ اپنائی جائے، بلکہ ان کے ساتھ تسلیم و رضا کا رویہ اختیار کیا جائے۔ انسان کا اپنے جذبات و احساسات، اپنی خواہشات و تعصبات اور دنیاوی ترغیبات اور نفس کے میلانات سے مغلوب ہو جانا معمول کی بات ہے، لیکن مطلوب رویہ یہ ہے کہ جیسے ہی قرآن کی یاد دہانی اس کے سامنے آئے یا اللہ کے احکامات کی طرف اس کی توجہ ہو، تو سب کچھ چھوڑ کر انھی کی طرف رجوع کیا جائے اور ان کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے۔ اگر کوئی شخص یہ رویہ اختیار نہیں کرتا، تو اسے آخرت کی زندگی میں عذاب بھگتنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"اور جو میری یاد دہانی سے اعراض کرے گا، تو اس کے لیے شقت کی زندگی ہو گی، اور قیامت کے دن ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا، اے رب، تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا، میں تو بینا تھا! ارشاد ہو گا:

اسی طرح دنیا میں ہماری آیتیں تیرے پاس آئیں، تو تُو نے ان کو نظر انداز کیا، تو اسی طرح تو آج نظر انداز کیا جائے گا۔"

اصلاح و دعوت

منظور الحسن

قرآنِ مجید اور ہمارا رویّہ

قرآنِ مجید وہ واحد ذریعہ ہے جو ہمیں اللہ تعالیٰ کی براہِ راست رہنمائی سے فیض یاب کرتا ہے۔ ہمارا مقصدِ وجود کیا ہے، ہمارا انجام کیا ہے، اللہ تعالیٰ سے ہمارا تعلق کیا ہے، کن اصول و قوانین کو اپنا کر ہم دنیوی فلاح اور اخروی نجات سے بہرہ مند ہو سکتے ہیں؟ یہ اور اس نوع کے بے شمار سوالات و اشکالات میں رہنمائی کا منبع صرف اور صرف قرآنِ مجید ہے۔ قرآنِ مجید کی بے پناہ اہمیت اس بات کی متقاضی ہے کہ اس کے ساتھ ہمارا رویّہ ایک طالبِ حق کا ہونا چاہیے۔ اس معاملے میں، خود قرآنِ مجید سے جو رہنمائی ملتی ہے، اس کے چند پہلو یہ ہیں:

ایک اہم ترین پہلو یہ ہے کہ اس کی آیات سے اعراض کی روش نہ اپنائی جائے، بلکہ ان کے ساتھ تسلیم و رضا کا رویہ اختیار کیا جائے۔ انسان کا اپنے جذبات و احساسات، اپنی خواہشات و تعصبات اور دنیاوی ترغیبات اور نفس کے میلانات سے مغلوب ہو جانا معمول کی بات ہے، لیکن مطلوب رویّہ یہ ہے کہ جیسے ہی قرآن کی یاددہانی اس کے سامنے آئے یا اللہ تعالیٰ کے احکامات کی طرف اس کی توجہ ہو تو سب کچھ چھوڑ کر انھی کی طرف رجوع کیا جائے اور ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا جائے۔ اگر کوئی شخص یہ رویہ اختیار نہیں کرتا، تو اسے آخرت کی زندگی میں عذاب بھگتنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

> "اور جو میری یاددہانی سے اعراض کرے گا، تو اس کے لیے مشقت کی زندگی ہوگی، اور قیامت کے دن ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا، اے رب، تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا، میں تو بینا تھا! ارشاد ہوگا: اسی طرح دنیا میں ہماری آتیں تیرے پاس آئیں، تو تُو نے ان کو نظر انداز کیا، تو اسی طرح تُو آج نظر انداز کیا جائے گا۔" (طٰہٰ ۲۰: ۱۲۴-۱۲۶)

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اپنے ایمان و عقیدے کی بنیاد اسی پر رکھی جائے اور اس کے ساتھ مضبوطی اور استقلال سے وابستگی اختیار کی جائے۔ یہی وہ مرکزی نقطہ ہے جو امت کو منتشر ہونے سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو اللہ کی رسی سے تعبیر کیا ہے اور مسلمانوں کو یہ ہدایت کی

ہے کہ وہ سب مل کر اس رسی کو مضبوطی سے تھام لیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

"اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑو اور پراگندہ نہ ہو۔"

(آل عمران ۳: ۱۰۳)

ایک پہلو یہ ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کے حکم کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے۔ یعنی، اسے کوئی درخواست یا التجا نہ سمجھا جائے، بلکہ واجب الاطاعت فرمان مانا جائے اور ہر وقت اس بات کو مدنظر رکھا جائے کہ اگر اس کے احکامات کے بجائے بدعتوں کی پیروی کی گئی تو پھر آخرت کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اور اسی لیے ہم نے یہ کتاب ایک فرمان کی حیثیت سے عربی میں اتاری ہے اور اگر تم اس علمِ صحیح کے آجانے کے بعد ان کی بدعتوں کی پیروی کرو گے، تو خدا کے مقابل میں نہ تمھارا کوئی مددگار ہوگا، نہ بچانے والا۔"

(الرعد ۱۳: ۳۷)

ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ اسے میزان اور فرقان مانا جائے، یعنی کوئی عقیدہ اپنانے سے پہلے، کوئی نظریہ قبول کرنے سے پہلے، کوئی عمل اختیار کرنے سے پہلے اور ہر طرح کے ذہنی و فکری اور انفرادی و اجتماعی معاملات انجام دینے سے پہلے انھیں قرآن کی میزان میں تول لیا جائے اور اس کسوٹی پر پرکھ لیا جائے۔ جو چیز اس پر پوری اترے، اسے قبول کر لیا جائے، اور جو چیز پوری نہ اترے اسے رد کر دیا جائے۔ قرآنِ مجید میں خود اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو میزان اور فرقان سے تعبیر کیا ہے:

"اللہ ہی ہے، جس نے کتاب اتاری قولِ فیصل کے ساتھ اور میزان اتاری۔"

(الشوریٰ ۴۲: ۱۷)

"بڑی ہی بابرکت ہے، وہ ذات جس نے اپنے بندے پر حق و باطل کے درمیان امتیاز کر دینے والی کتاب اتاری، تاکہ وہ اہلِ عالم کے لیے ہوشیار کر دینے والا بنے۔"

(الفرقان ۲۵: ۱)

ایک مزید پہلو یہ ہے کہ کتاب اللہ کا مذاق اڑانے والوں اور اس کی آیات پر نکتہ چینی کرنے والوں سے کنارہ کشی اختیار کی جائے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"اور وہ کتاب میں تم پر یہ ہدایت نازل کر چکا ہے کہ جب تم سنو کہ آیاتِ الٰہی کا انکار کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے، تو تم ان کے ساتھ نہ بیٹھو تاکہ وہ کسی بات میں مشغول ہو جائیں، ورنہ تم بھی انھی کی مانند ہو جاؤ گے۔ بے شک، اللہ منافقوں اور کافروں سب کو

جہنم میں جمع کرنے والا ہے۔" (النسآء ۴: ۱۴۰)

یہ اعراض اُس غیرت و حمیت کا لازمی تقاضا ہے جو سچے اہلِ ایمان کے اندر لازماً موجود ہوتی ہے۔ جہاں ایک طرف دعوت کی حکمت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ کتاب اللہ کا مذاق اڑانے والوں سے لڑنے جھگڑنے سے احتراز کیا جائے، وہاں دوسری طرف دین کے لیے غیرت و حمیت اس امر کی متقاضی ہوتی ہے کہ آیاتِ قرآنی کے بارے میں تمسخرانہ گفتگو سننا گوارا نہ کی جائے۔ چنانچہ اس معاملے میں صحیح رویہ یہی ہے کہ ان محفلوں ہی میں جانے سے گریز کیا جائے جہاں آیاتِ قرآنی کی تضحیک کی جاتی ہو۔

ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے مطالعہ کو روزمرہ کا معمول بنایا جائے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

"جن لوگوں کو ہم نے کتاب بخشی اور وہ اس کے پڑھنے کا حق ادا کرتے ہیں وہی لوگ اس (قرآن) پر ایمان لائیں گے اور جو اس کا انکار کریں گے، تو وہی گھاٹے میں رہنے والے ہیں۔"

(البقرہ ۲: ۱۲۱)

"بے شک، جو لوگ اللہ کی کتاب کا مطالعہ کرتے، نماز کا اہتمام کرتے اور جو کچھ ہم نے ان کو رزق دیا ہے، اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں، وہ ایک ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جس کے لیے کبھی کساد بازاری نہیں۔" (فاطر ۳۵: ۲۹)

قرآن کی یہ تلاوت اپنے فہم و فکر کے دروازے بند کر کے محض برکت حاصل کرنے کے لیے نہیں، بلکہ اس کی آیات کو سمجھنے اور دین سیکھنے کے لیے کی جائے۔ یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ فلاحِ انسانی کے لیے جس کتاب کو سمجھنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، اسے بے سوچے سمجھے اور اپنے قلب و ذہن کے دروازے بند کر کے پڑھا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے کہ قرآنِ مجید سمجھ کر پڑھنے کو اپنے شب و روز کا معمول بنایا جائے۔

مخاطب سے مایوسی

ساجد حمید

یونس نینوا کی بستی میں اٹھا اور اس نے خدا کے نام کی منادی کی۔ اس کی دعوت سے دشت و جبل گونج اُٹھے، مگر انسانوں کے دل اسے پتھر سے زیادہ سخت اور رات سے زیادہ تاریک دکھائی دیے۔ جب ان دلوں میں کوئی سوز پیدا ہوتا نظر نہ آیا اور ان میں اس نے روشنی کی کوئی کرن نہ دیکھی، تو مایوس ہو کر وہ ساحل کی طرف نکل گیا اور شدتِ غم سے خدا کی اس تعلیم کو فراموش

کر بیٹھا کہ: 'اپنی دعوت کو کبھی زیادہ سمجھ کر ترک نہ کر دینا، بلکہ خدا کے فیصلے کا انتظار کرنا۔'
سو خدا نے یونس کو مچھلی کے پیٹ میں قید کر دیا۔ پھر اسے اس اندھیرے سے نکالا اور فرمایا:
'جا تیری قوم تیرے انتظار میں ہے۔'
یونس مچھلی کے پیٹ سے نکل کر قوم کی طرف گیا، تو دیکھا کہ اس کی قوم اپنے بادشاہ کے ساتھ اس کے استقبال کے لیے آئی ہے۔ یونس بہت حیران ہوا اور اس کو احساس ہوا کہ اس کی مایوسی ٹھیک نہ تھی۔ پھر اس کی قوم اس کے ہاتھ پر ایمان لائی اور مسلمان ہوئی۔
پھر کیا ہوا کہ وادیِ غیر ذی زرع میں محمدِ عربی کو خدا نے مبعوث کیا اور یہ حکم دیا کہ وہ خدا کے نام کی بڑائی بیان کرے اور اسے بھی نصیحت کی کہ: 'اپنی دعوت کو کبھی زیادہ سمجھ کر ترک نہ کر دینا، بلکہ خدا کے فیصلے کا انتظار کرنا' اور یہ بھی فرمایا کہ: 'مچھلی والے کی طرح جلدی نہ کرنا۔'
تو اے داعیانِ حق، تم کیوں اپنے مخاطب سے اتنی جلدی مایوس ہو جاتے ہو، کیا تمھارے لیے انبیا کی سیرت میں کوئی سبق نہیں ہے؟

اصلاح بزورِ بازو نیت

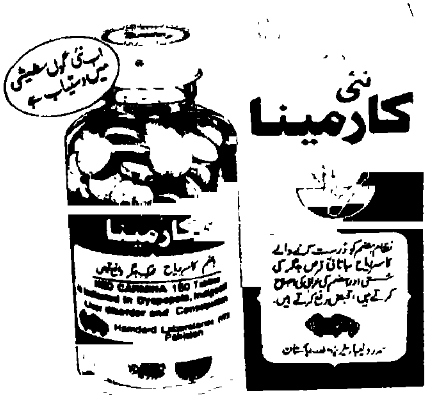
ہر راہی جو اپنے راستے سے واقف نہ ہو، اپنے رہنما کا محتاج ہوتا ہے۔ ازل سے انسان اسی روش پر چلا آ رہا ہے۔ نہ کسی قوم نے آج تک اس سے انحراف کیا ہے، اور نہ کسی معاشرے نے۔
ہمارا رہنما دینِ اسلام ہے۔ ہم اگر کوئی اقدام کریں، تو لازم ہے کہ اس دین کی رہنمائی میں کریں جو ہمارا ہادی ہے، مگر افسوس کہ اس دور میں عامی تو کیا، خود دین کے علم بردار بھی، دین ہی کے لیے، دین کے نام پر، غیر دینی حرکات کرتے نظر آتے ہیں۔
مثلاً، اسلام نے ریاست کے اندر، حکومت کے سوا، کسی کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ کسی برائی کے خاتمے کے لیے مسلح اقدام کرے۔ اسلام کے اجتماعی اصولوں کے مطابق یہ صرف حکومت کا حق ہے۔ یہ حق کسی شہری کو حاصل نہیں ہے، خواہ اس نے اپنے گرد کتنی ہی جمعیت جمع کر لی ہو اور کتنی ہی قوت بہم پہنچا لی ہو۔ یہ اصلاح نہیں انارکی ہے، یہ حق ادا کرنا نہیں حق تلفی ہے، یہ جہاد نہیں فساد ہے۔ ایسا کرنے والا 'فساد فی الارض' کا باعث بنتا ہے، اس لیے وہ گردن زدنی ہے۔

اس سلسلے میں اسلام کو پروا نہیں کہ ایسا کرنے والا کون ہے۔ کسی دینی تحریک کا لیڈر ہے یا دین کے کسی محاذ کا مجاہد، وہ کسی بیوہ کی مدد کر رہا ہے یا کسی غریب کی چیز غصب کرنے والوں سے چھیننے جا رہا ہے۔ اس کے نزدیک یہ سب 'مفسدین فی الارض' ہیں۔ دین کی متعین کردہ حدود سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ نہ جانے مسلمان یہ کیوں بھول گئے ہیں کہ اچھی لگنے والی ہر چیز نیکی نہیں ہوتی، نیکی صرف وہ ہے جو قرآن و سنت کے خلاف نہ ہو۔ ہمیں ہر اصلاحی کام کرتے ہوئے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ جس کو ہم اصلاح کہ رہے ہیں کہیں وہ قرآن کے نزدیک فساد تو نہیں ہے۔ کہیں ہماری حالت وہی تو نہیں ہے کہ جب ان سے یہ کہا جاتا ہے، زمین میں فساد نہ مچاؤ تو کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں: اور پھر قرآن یہ اعلان کر دیتا ہے کہ "آگاہ رہو کہ یہ فساد کرنے والے ہیں"۔ (البقرہ۲: ۱۱، ۱۲)



روزانہ ایک سیب کھائیے
کبھی معالج کے پاس نہ جائیے!

داناؤں کا یہ مشورہ درست، بشرطیکہ آپ کا معدہ بھی درست ہو اور سیب کو جزوِ بدن بنا سکے



ہاضمہ خراب ہو تو اچھی سے اچھی غذا بھی نظامِ ہضم پر بار بن جاتی ہے اور آپ قدرت کی عطا کردہ بہت سی نعمتوں سے صحیح طور پر لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔

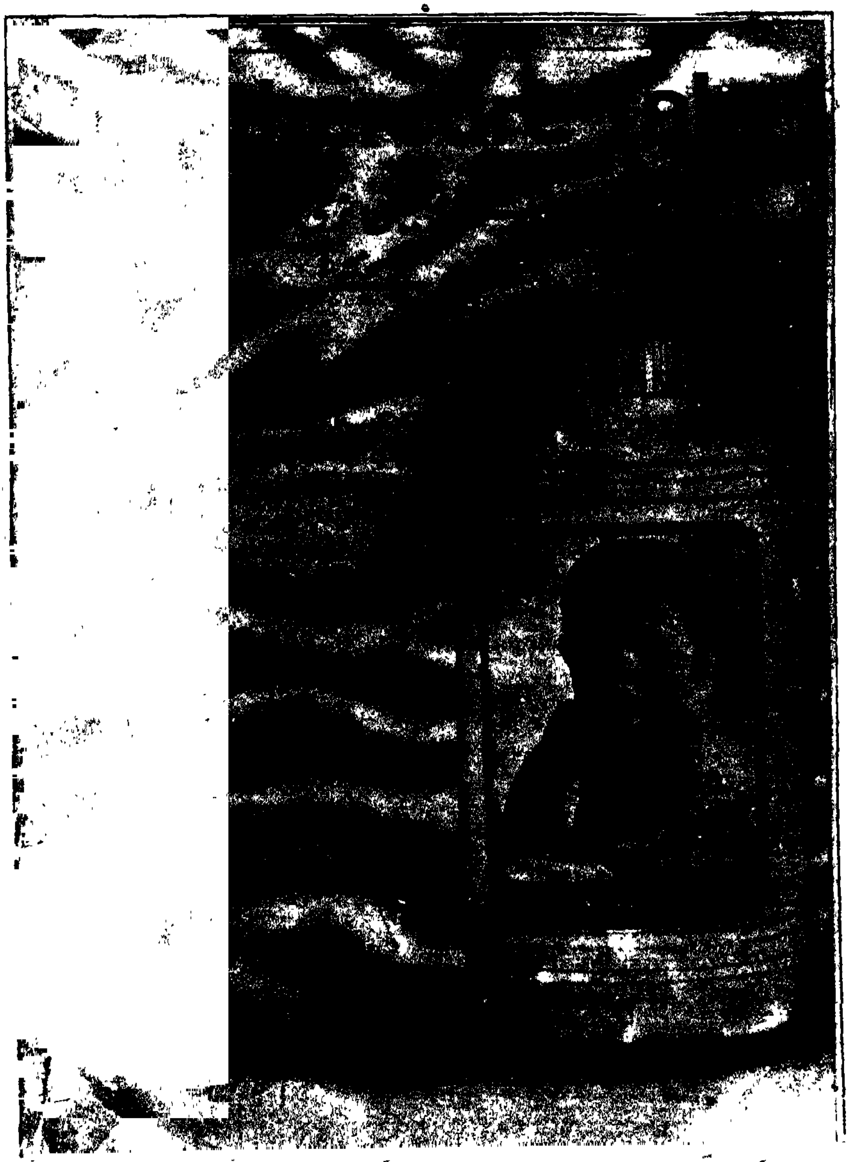
اپنی صحت اور تندرستی کی خاطر کھانے پینے میں احتیاط سے کام لیجیے۔ سادہ اور زود ہضم غذا کھائیے۔ پُرخوری سے بچیے۔ مرچ مسالے دار پکوانوں سے پرہیز کیجیے کیونکہ یہ معدے اور آنتوں کے افعال پر منفی اثرات مرتب کرتے ہیں۔

اگر کسی وقت کھانے پینے میں بے احتیاطی ہو جائے تو نظامِ ہضم کی شکایات مثلاً بدہضمی، قبض، گیس، سینے کی جلن، دردِ شکم اور کھانے سے بے رغبتی سے محفوظ رہنے کے لیے نئی کارمینا لیجیے۔ نئی کارمینا معدہ اور آنتوں کے افعال کو منظم و درست رکھتی ہے۔

نظامِ ہضم کی اصلاح کے لیے پُرتاثیر ہاضم ٹکیاں

خوش ذائقہ **نئی کارمینا** ہمیشہ گھر میں رکھیے

Adarts-CAR-1/92



ماہنامہ

اشراق

جلد ۶	شمارہ ۶
جون	۱۹۹۴ء
محرم	۱۴۱۴ھ

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر : منیر احمد

مدیر انتظامی : شکیل الرحمن

معاون مدیر : قدیر شہزاد

فی شمارہ : ۸ روپے
سالانہ : ۸۰ روپے
بیرون ملک
ہوائی ڈاک : ۴۵۰ روپے
بحری ڈاک : ۲۵۰ روپے

المورد

۶۶ احمد بلاک، گارڈن ٹاؤن، لاہور ۵۴۶۰۰ فون : ۵۸۶۴۴۳۱

مدیر مسئول : جاوید احمد غامدی طابع : قومی پریس لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحشر

[۵۹]

اللہ کے نام سے، جو سراپا رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

اللہ ہی کی تسبیح کی ہے اُن سب چیزوں نے جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں، (اِس طرح کہ اُن کا خالق ہر عیب سے پاک اور ہر کمزوری سے بالکل منزہ ہے) اور وہی غالب اور حکیم ہے۔ (چنانچہ) وہی ہے جس نے اُن کو جو اہلِ کتاب میں سے کافر ہوئے، اُن کے گھروں سے نکالا (اِسی دنیا میں) پہلے حشر کے لیے۔ تمھیں گمان نہ تھا کہ وہ کبھی (اِس طرح) نکلیں گے اور وہ بھی اِسی زعم میں تھے کہ اُن کے قلعے اُنھیں اللہ سے بچالیں گے۔ مگر اللہ اُن پر وہاں سے پہنچا جدھر اُنھوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا اور اُس نے اُن کے دلوں میں ہیبت ڈال دی۔ وہ اپنے گھر اپنے ہاتھوں اجاڑ رہے تھے اور اہلِ ایمان کے ہاتھوں سے بھی۔ تو (اِس سے) عبرت حاصل کرو، اے لوگو جو آنکھیں رکھتے ہو۔

اور (جان لو کہ) اگر اللہ نے اِن (یہودیوں) کے لیے (اِسی طرح جگہ جگہ سے) اجڑنے ہی کی سزا نہ لکھ دی ہوتی تو وہ اُنھیں اِس دنیا میں سزا دیتا، (وہی جو اُس نے عاد و ثمود اور اِس طرح کی دوسری قوموں کو دی۔) اور قیامت میں تو اُن کے لیے دوزخ کا عذاب ہے ہی۔ اِس لیے کہ وہ اللہ اور رسول کے مخالف ہوئے اور جو اللہ کے مخالف ہوں تو (اُنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) اللہ بڑی سخت سزا دینے والا ہے۔

(اُن کے خلاف اِس اقدام کے موقع پر) تم نے جو کھجوروں کے پیڑ کاٹ دیے یا جن کو اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا تو یہ اللہ کے اذن سے ہوا۔ اور (اِس لیے ہوا) کہ وہ اِن نافرمانوں کو ذلیل و خوار کرے۔ (اِس پر اعتراض کی کیا گنجایش؟)

اور جو کچھ اللہ نے اُن کی طرف سے اپنے رسول کی طرف پلٹایا تو اُس پر تم نے اونٹ اور گھوڑے نہیں دوڑائے، بلکہ اللہ اپنے رسولوں کو، جس پر چاہتا ہے، غلبہ عطا فرماتا ہے، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (اِس لیے) اِن بستیوں کے لوگوں سے اللہ جو کچھ اپنے رسول کی طرف پلٹا دے تو وہ اللہ اور رسول اور قرابت مندوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ وہ تمھارے مال داروں ہی میں گردش نہ کرتا رہے۔ اور رسول (کا منصب یہی ہے کہ وہ) جو تمھیں دے، وہ لے لو اور جس سے روکے، اُس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ بڑی سخت سزا دینے والا ہے۔ (پھر یہ بالخصوص) اُن حاجت مند مہاجروں کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنی جائدادوں سے اِس طرح نکالے گئے ہیں، کہ وہ اللہ کا فضل اور اُس کی خوشنودی چاہتے اور اللہ اور اُس کے رسول کی مدد کرتے ہوئے آئے۔ (اِن کے لیے اللہ کی گواہی ہے کہ) یہی راست باز ہیں۔

اور (یہ انصار و مہاجرین) یہ لوگ جو اِن (نئے مہاجروں) سے پہلے (یہاں) گھر بنائے ہوئے اور ایمان محکم کیے ہوئے ہیں، یہ اُن لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے

(اب) اِن کی طرف آئے ہیں اور جو کچھ بھی اُنھیں دیا جائے، اُس کے لیے اپنے دل میں کوئی غرض نہیں پاتے اور اپنے اوپر اُنھیں ترجیح دے رہے ہیں، اگرچہ وہ خود ضرورت مند ہوں۔ اور (واقعہ یہ ہے کہ) جو لوگ خود غرضی سے بچا لیے گئے تو وہی فلاح پانے والے ہیں۔

اور یہ جو اِن کے بعد آئے ہیں، وہ دُعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار، تو ہماری مغفرت فرما اور ہمارے اُن بھائیوں کی بھی جو ہم سے پہلے ایمان لائے اور ہمارے دلوں میں اِن اہلِ ایمان کے لیے (اِن کے بہتر حالات کی وجہ سے) کوئی بُغض نہ پیدا ہونے دے، پروردگار، تو، بے شک، بڑی شفقت والا، بڑا مہربان ہے۔

تم نے دیکھے نہیں وہ لوگ جو منافق ہوئے، وہ اپنے بھائیوں سے، جنھوں نے اہلِ کتاب میں سے کفر کیا، (یہ بنو قریظہ جو اب باقی رہ گئے ہیں، وہ اُن سے) کہتے ہیں کہ تمھیں نکالا گیا تو ہم تمھارے ساتھ نکلیں گے اور تمھارے معاملے میں ہم ہرگز کسی کی بات نہ مانیں گے اور تم سے لڑائی ہوئی تو ضرور تمھاری مدد کریں گے۔ (وہ یہ کہتے ہیں) اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں۔ (واقعہ یہ ہے کہ) وہ نکالے گئے تو یہ ہرگز اُن کے ساتھ نہ نکلیں گے اور اُن سے لڑائی ہوئی تو یہ ہرگز اُن کی مدد نہ کریں گے، اور اگر اُن کی مدد کریں گے تو پیٹھ دکھائیں گے (اور) پھر کہیں سے کوئی مدد نہ پائیں گے۔

اُن کے دل میں اللہ سے بڑھ کر تمھاری دہشت ہے۔ اس لیے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔ یہ کبھی اکٹھے ہو کر تم سے میدان میں نہ لڑیں گے، بلکہ لڑیں گے تو قلعہ بند بستیوں میں بیٹھ کر یا دیواروں کے پیچھے چھپ کر (لڑیں گے)۔ ان میں بڑی سخت مخالفت ہے۔ تم اِنھیں اکٹھا سمجھتے ہو، دراں حالیکہ ان کے دل آپس میں پھٹے ہوئے ہیں۔ اس لیے کہ یہ عقل سے کام نہیں لیتے۔

(یہ جن کو شہ دے رہے ہیں) اُن کے ساتھ بھی وہی ہوگا جو اُن لوگوں کے ساتھ ہوا (اُن یہود بنو نضیر کے ساتھ)، جو اِن سے تھوڑی ہی مدت پہلے اپنے کیے کا مزہ چکھ چکے ہیں اور اِن کے لیے ایک المناک عذاب بھی ہے۔ (یہ شہ دینے والے) یہ (بالکل) شیطان کی طرح ہیں کہ وہ پہلے

انسان سے کہتا ہے کہ منکر ہو اور جب وہ منکر ہو جاتا ہے تو کہتا ہے کہ میں تم سے بری ہوں۔ میں تو اللہ، پروردگارِ عالم سے ڈرتا ہوں۔ (اِن کا رویّہ یہ ہے) تو اِن دونوں کا انجام یہی ہے کہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں جائیں اور یہی اُن لوگوں کو بدلہ ہے جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔

(اِس لیے)، اے لوگو جو ایمان کا دعویٰ کرتے ہو، اللہ سے ڈرو اور (تم میں سے) ہر شخص اچھی طرح دیکھ لے کہ اُس نے آنے والے دن کے لیے کیا سامان کیا ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک، اللہ ہر چیز سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔ اور (سنو)، تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ، (اُن یہودیوں کی طرح) جو اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے خود اُن کو اُنھیں بھلا دیا۔ یہی لوگ، درحقیقت، نافرمان ہیں۔

(تم اِس حقیقت کو سمجھو کہ) اہلِ دوزخ اور اہلِ جنت کبھی یکساں نہ ہوں گے۔ یہ صرف اہلِ جنت ہیں جو مراد کو پہنچیں گے۔

(تم نے دیکھا کہ ہم نے یہ قرآن اِن لوگوں پر اتارا، مگر یہ پتھر ہی رہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ) اگر ہم اِس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے تو (اے پیغمبر)، تم دیکھتے کہ وہ اللہ کی خشیت سے دب جاتا، پھٹ جاتا۔ اور یہ مثالیں ہم لوگوں کو سناتے ہیں کہ شاید وہ غور کریں۔

(وہ اپنی اِس حالت پر غور کریں اور اِس حقیقت پر بھی کہ) وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، غائب و حاضر سے باخبر، وہ سراپا رحمت ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔

وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، بادشاہ، وہ منزہ ہستی، سراسر سلامتی، امن دینے والا، نگہبان، غالب، بڑے زور والا، بڑائی کا مالک، پاک ہے اللہ اُن سے جو یہ شریک بناتے ہیں۔

وہی اللہ ہے، نقشہ بنانے والا، وجود میں لانے والا، صورت دینے والا۔ سب اچھے نام اُسی کے ہیں۔ اُسی کی تسبیح کرتی ہیں جو چیزیں آسمانوں میں ہیں اور زمین میں، اور وہ زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے۔

معز امجد

منشور انقلاب

(۳)

اسلامی ریاست کے قیام کا بنیادی مقصد

دنیا میں جو ریاست بھی قائم ہوتی ہے، اس پر اپنی حدود میں امن قائم رکھنے، بیرونی خطرات سے اس کا دفاع کرنے اور اپنی مادی خوش حالی کے لیے ہر ممکن کوشش کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ عام طور پر یہی کسی ریاست کے قیام کا مطمح نظر اور مقصد ہوتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک ریاست، محض ایک ریاست سے بڑھ کر، اسلامی ریاست کی حیثیت اختیار کرتی ہے، تو کیا قرآن و سنت کی رو سے ان کے علاوہ بھی کوئی مقاصد ہیں، جن کا حصول ان کے پیش نظر ہونا چاہیے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک عام ریاست کے یہ تمام مقاصد، ایک اسلامی ریاست میں بھی بہت اہمیت رکھتے ہیں، مگر غور طلب بات یہ ہے کہ ایک اسلامی ریاست، فقط ایک جغرافی حد بندی ہی کا نام نہیں، بلکہ یہ اپنا ایک مستقل فلسفہ اور اجتماعی زندگی کے بارے میں ایک نظریہ رکھتی ہے۔ جیسا کہ اس کے نام ہی سے واضح ہے، اسلامی ریاست ایسی ریاست ہے جو اسلامی فلسفے کو اپنا فلسفہ تسلیم کرے اور اسی کے نظریۂ حیات کو اپنا نظریہ بنائے۔ دینوی لحاظ سے اگر ہم چند لفظوں میں دین اسلام کی تعریف کریں تو وہ کچھ یوں ہو گی کہ "اسلام، انسانوں کے اپنے پروردگار کے ساتھ اور ایک دوسرے کے ساتھ، صحیح بنیادوں پر تعلقات استوار کرنے کا نام ہے۔"

چنانچہ، ایک اسلامی ریاست کا بنیادی مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اس میں ایسا نظام تشکیل دیا جائے جو ایک طرف تو شہریوں کے، ان کے پروردگار کے ساتھ تعلق کو صحیح بنیادوں پر قائم کرے، اور دوسری طرف ان کے باہمی روابط کو صالح بنیادوں پر استوار کر دے۔

عقل و فطرت، قرآن و سنت اور پچھلے آسمانی صحیفوں کے مطابق انسانوں پر اللہ تعالیٰ کا بنیادی اور

اہم ترین حق یہ ہے کہ وہ اپنے قول و عمل سے اس کی توحید کا اقرار کریں اور اپنے آپ کو ہر قسم کی مشرکانہ غلاظتوں سے پاک رکھیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے شرک کو سب سے بڑا ظلم یا 'ظلم عظیم' قرار دیا ہے۔ دوسری طرف بندوں کے باہمی تعلق پر غور کیجیے تو بلا خوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس کے صحیح بنیادوں پر قائم ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایک دوسرے کے تمام حقوق کا لحاظ کیا جائے اور سب کے ساتھ عدل و قسط کے ساتھ معاملہ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں کو ادا کرو، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔ نہایت عمدہ بات ہے یہ، جس کی اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے۔ بے شک، اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔" (النساء ۴: ۵۸)

چنانچہ، ایک اسلامی ریاست میں جس چیز کو غایت اور مقصود کی حیثیت حاصل ہے، وہ یہ ہے کہ اس میں انسانوں کے اپنے پروردگار کے ساتھ تعلق کو درست کرنے کے لیے، ریاست کی سطح پر توحید کی اقامت اور شرک کے ابطال کا نظام بنایا جائے، اور بندوں کے باہمی تعلقات کو صحیح رکھنے کے لیے ایسا نظام تشکیل دیا جائے، جو عدل و قسط پر مبنی ہو۔ اس اجمال کی تفصیل خود قرآن مجید نے اس طرح کر دی ہے:

"(یہ اہل ایمان وہ لوگ ہیں کہ) اگر ہم ان کو اس سرزمین میں اقتدار بخشیں گے، تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے، بھلائی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے۔" (الحج ۲۲: ۴۱)

غور کیجیے، تو اس آیت کے شروع کے الفاظ "اگر ہم ان کو اس سرزمین میں اقتدار بخشیں گے" سے واضح ہے کہ اس حکم کا تعلق مسلمانوں کے نظم اجتماعی کے اہداف و مقاصد ہی سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسلامی ریاست کے جو مقاصد اس آیت میں بیان فرمائے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ اقامت صلوٰۃ

قرآن مجید کے مطالعے سے واضح ہے کہ جس طرح عقائد کے معاملے میں توحید اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے، اسی طرح اعمال کے معاملے میں نماز بنیادی عمل ہے۔ قرآن کے ایک طالب علم سے یہ بات چھپی ہوئی نہیں کہ نماز وہ عبادت ہے جس نے، گویا، پورے دین کا احاطہ کر رکھا ہے۔

آیۂ زیر بحث میں 'اقامت صلوٰۃ' (نماز کا اہتمام) کی نسبت، چونکہ اسلامی ریاست کی طرف کی گئی ہے، اس وجہ سے، یہاں اس سے مراد ریاست کی سطح پر نظام صلوٰۃ کا قیام ہے۔ بالفاظ دیگر، یہاں 'اقامت صلوٰۃ' سے مراد نماز کا وہ نظام ہے، جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں، سربراہ ریاست

کی حیثیت سے، قائم فرمایا اور آپ کے بعد خلفائے راشدین اور پھر ایک لمبے عرصے تک اموی خلیفوں نے جاری و ساری رکھا۔ اس نظام کی نمایاں خصوصیات میں خاص طور پر، یہ بات شامل تھی کہ مساجد کی تعمیر اور ان کا انتظام ریاست ہی کے ذمے ہوتا اور امامت کی ذمہ داری، اصلاً، سربراہ ریاست اور عمالِ حکومت کی ہوتی تھی۔

یہ بات یہاں ملحوظ رہنی چاہیے کہ انسانوں کے اپنے رب کے ساتھ تعلق میں نماز کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ، دین میں نماز کی اس اہمیت اور مقام کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب ریاست میں نماز کی حفاظت کی جائے گی، تو امید یہی ہے کہ باقی دین پر بھی عمل ہوتا رہے گا۔ اس کے برعکس جب بندوں کے اپنے پروردگار کے ساتھ اس تعلق ہی میں بے پروائی برتی جائے گی، تو وہ وقت بھی دور نہیں، جب پورے ہی دین کی عمارت زمیں بوس ہو جائے۔

ب۔ ایتائے زکوٰۃ

جس طرح نماز انسانوں کے اپنے پروردگار کے ساتھ تعلق کے معاملے میں، مرکزی حیثیت رکھتی ہے، اسی طرح انسانوں کے باہمی تعلق کو صالح بنیادوں پر استوار کرنے میں، ریاست کی سطح پر، نظامِ زکوٰۃ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ، زیرِ بحث آیت میں، ایک اسلامی ریاست کا دوسرا ہدف یہ بیان ہوا ہے کہ اس میں زکوٰۃ کا وہ نظام قائم کیا جاتا ہے، جس کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی اور ریاستِ مدینہ میں جسے، تنہا ٹیکس کی حیثیت سے، جاری فرمایا، اور اسی کے ذریعے سے، غربا اور مسکینوں کی امداد کے ساتھ ساتھ ریاست کے اخراجات بھی پورے کیے۔

ج۔ امر بالمعروف

'معروف' سے مراد، وہ تمام کام ہیں جن کا عقل و فطرت یا دین و شریعت کی رو سے، نیکی ہونا ثابت ہے۔

سورۂ حج کی زیرِ بحث آیت میں، ایک اسلامی ریاست کا تیسرا ہدف یہ بیان ہوا ہے کہ وہاں، ہر قسم کی بھلائیوں کی ترویج و تنفیذ کے لیے ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ یہ بات واضح رہے کہ بھلائیوں کے فروغ کے لیے، جہاں ریاست ترغیب و نصیحت سے کام لے گی وہاں، جن معاملات میں شریعت اجازت دے، ان پر بزور عمل کرانے کے لیے بھی اقدام کرے گی۔

د۔ نہی عن المنکر

'منکر' سے مراد، وہ تمام کام ہیں جن کا عقل و فطرت یا دین و شریعت کی رو سے، برائی ہونا ثابت

ہے۔

آیۂ زیر بحث میں، اسلامی ریاست کا چوتھا ہدف یہ بیان ہوا ہے کہ وہاں، ہر قسم کی برائیوں سے روکا جاتا ہے۔ معروف کی ترویج کی طرح، برائیوں کے استیصال کے لیے بھی، ریاست ترغیب و نصیحت کے ساتھ ساتھ جن معاملات میں ضروری سمجھے، بزور اقدام کر سکتی ہے۔

مولانا مودودی رحمۃ اللہ، سورۂ حج کی اس آیت کے تحت، لکھتے ہیں:

"اس ایک فقرے میں اسلامی حکومت کے نصب العین اور اس کے کارکنوں اور کارفرماؤں کی خصوصیات کا جوہر نکال کر رکھ دیا گیا ہے۔ کوئی سمجھنا چاہے، تو اسی ایک فقرے سے سمجھ سکتا ہے کہ اسلامی حکومت، فی الواقع، کس چیز کا نام ہے۔" (تفہیم القرآن: ج ۳، ص ۲۳۴)

چنانچہ، ایک اسلامی ریاست میں، اس بات کا اعلان کیا جانا چاہیے کہ توحید کی اقامت، شرک کا ابطال، نماز اور زکوٰۃ کا اہتمام، معروف کی ترویج اور منکر کا استیصال، یہ سب اس میں غایت اور مقصود کی حیثیت رکھتے اور اس بنا پر، ہر حال میں، اس کے حکمرانوں کے پیش نظر رہیں گے۔

حمید الدین فراہیؒ

حق و صبر

نجات کا دار و مدار عقلی اور اخلاقی قوتوں کی اصلاح پر ہے۔ عقل اور دل دونوں کے سختی اور نرمی کے اعتبار سے دو پہلو ہیں۔ عقل کی نرمی کا پہلو یہ ہے کہ وہ حق کے سامنے فوراً جھک جانے کے لیے مستعد رہے، وہ جہاں بھی اور جس وقت بھی ظاہر ہو۔ اور قلب کی نرمی یہ ہے کہ وہ خالق کی محبت اور مخلوق کی ہمدردی سے ہمیشہ سرشار رہے۔ عقل کا کام یہ ہے کہ وہ حق پر ایمان لاتی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس کی صفات، اس کی آیات پر۔ اور قلب اپنی بندگی کا احساس کرتا ہے اور پھر بے تابانہ اپنے مولائے حقیقی کی طرف بڑھتا ہے اور خلق کی ہمدردی کا جو فرض اس پر عائد ہوتا ہے اس کے جوش و احساس سے معمور ہو جاتا ہے۔

عقل کی شدت کا پہلو یہ ہے کہ وہ اس حق پر، جو آنکھوں سے اوجھل ہے، ثابت قدم رہے اور اس باطل کو جو نگاہوں کے سامنے موجود ہے چھوڑ دے۔ اور اس پہلو سے قلب کا فرض یہ ہے کہ وہ مصائب و شدائد کے مقابل میں ڈٹا رہے اور اپنے قدم جادۂ مستقیم سے نہ ڈگنے دے اور قابو پا جانے کے بعد عفو و درگزر سے کام لے۔

یہ حق کا تعلق قلب و عقل سے ہوا۔ بالکل یہی حال صبر کا ہے۔ وہ بھی عقل اور دل دونوں سے لگاؤ رکھتا ہے۔

خلاصہ ان تفصیلات کا یہ ہے کہ حق تمام بھلائیوں کے دروازے کھولتا ہے اور صبر تمام برائیوں کے دروازے بند کرتا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ حق اصل مطلوب و محبوب ہے اور صبر اس کے لیے جوش طلب اور سرگرمی ہے۔

ترتیب : شہزاد سلیم

"کسی روایت کی تحقیق میں جس طرح راوی کی ثقاہت، عدالت اور فقاہت اہمیت رکھتی ہے، اسی طرح خود روایت کے الفاظ، اس کا موقع و محل دوسری روایات باب کے ساتھ اس کی مخالفت یا موافقت، عقل و نقل کی کسوٹی پر اس کا مرتبہ اور سب سے زیادہ خدا کی کتاب کے ساتھ اس کی ہم آہنگی اور اس قبیل کی دوسری چیزیں بھی، اس سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ اگر صرف راوی کی تحقیق پر کفایت کر کے یہ چیزیں نظر انداز کر دی جائیں، تو تحقیق کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ ہمارے محدثین زیادہ زور صرف راوی کی تحقیق پر صرف کرتے ہیں، نفسِ متن پر ان پہلوؤں سے غور کرنے کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، حالانکہ ان پہلوؤں سے تحقیق کیے بغیر تحقیق کا حق، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، ہرگز ادا نہیں ہو سکتا۔"

قرآنیات

امین احسن اصلاحی

سورۃ الحجرات

(۳)

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ
فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى
تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ
وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (۹)

"اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان مصالحت کراؤ۔ اگر ان میں سے ایک، دوسرے پر تعدی کرے تو اس سے جنگ کرو، جو تعدی کرے، تاآنکہ اللہ کے فیصلے کی طرف رجوع کرے پس اگر وہ رجوع کرے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ مصالحت کرادو اور ٹھیک ٹھیک انصاف کرو۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔"

اوپر کی آیت میں اس بات کی ممانعت فرمائی گئی ہے کہ کسی فاسق کی روایت پر اعتماد کر کے مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کی کسی جماعت کے خلاف کوئی اقدام کر بیٹھیں۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کے دو گروہ اگر آپس میں لڑ پڑیں تو دوسرے مسلمانوں یا ان کی حکومت کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ فرمایا کہ ان کے درمیان اصلاح احوال کی کوشش کرو۔ اگر دونوں میں سے کوئی ایک پارٹی مصالحت پر آمادہ نہ ہو یا مصالحت کے بعد، مصالحت کے شرائط کے خلاف، دوسری پارٹی پر تعدی کرے تو اس صورت میں دوسرے مسلمانوں یا ان کی حکومت کو تعدی کرنے والی پارٹی سے جنگ کرنی چاہیے، یہاں تک کہ وہ حق کے آگے جھکنے پر مجبور ہو جائے۔

'تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰہِ' سے مراد اس فیصلہ کے آگے جھکنا ہے جو مصالحت کرانے والوں نے فریقین کے سامنے رکھا ہے۔ اگر کوئی پارٹی اس مصالحت سے گریز اختیار کر رہی ہے تو وہ 'گویا' اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے جھکنے سے گریز اختیار کر رہی ہے اس لیے کہ اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسی بات کا حکم دیا ہے اور جب اللہ نے اس کا حکم دیا ہے تو اس کی حیثیت 'اَمْرُ اللّٰہِ' کی ہے۔

'فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَھُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا' یعنی مسلمانوں کے اس اجتماعی ایکشن کے بعد اگر وہ فیصلہ کے آگے سر جھکا دے تو اس بنیاد پر اس کے خلاف کوئی مزید کارروائی نہیں کی جائے گی کہ اس نے سرکشی کی روش اختیار کی، بلکہ فریقین کے درمیان انصاف کے تقاضوں کے مطابق صلح کرادی جائے گی۔ جس فریق کا نقصان ہوا ہے اس کی تلافی ٹھیک ٹھیک کرادی جائے گی۔

لفظ 'اَقْسِطُوْا' اسی عدل کے تقاضوں کو پورا کرنے کی تاکید کے لیے آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ کسی کے ساتھ بے جا رعایت کی جائے نہ کسی کو انصاف کے خلاف دبایا جائے بلکہ بے لاگ رعایت جو کچھ عدل کا تقاضا ہے، وہ پورا کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ایسے ہی انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس آیت سے مندرجہ ذیل اجتماعی اصول نکلتے ہیں:

اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دوسرے مسلمان اس کو برا یا جھگڑا سمجھ کر نہ تو اس سے بالکل الگ تھلگ رہیں اور نہ ان کے لیے یہ جائز ہے کہ بغیر اس بات کی تحقیق کیے کہ کون حق پر ہے، کون ناحق پر، محض خاندانی، قبائل اور گروہی عصبیت کے جوش میں کسی کے ساتھی اور کسی کے مخالف بن جائیں، بلکہ انھیں ساری صورت معاملہ سمجھ کر فریقین کے درمیان مصالحت کی کوشش کرنی چاہیے۔

اگر ایک فریق مصالحت پر راضی نہ ہو، بلکہ جنگ ہی پر ضد کرے یا مصالحت کے لیے من مانے طور پر ایسی شرطیں پیش کرے جو عدل کے منافی ہوں تو اس صورت میں مسلمانوں کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اس کے خلاف طاقت استعمال کرکے اس کو مصالحت کے شرائط کے آگے جھکنے پر مجبور کریں۔

اس طرح کی نزاعات میں غیر جانبدار مسلمان، اللہ و رسول کی ہدایات اور عدل کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کے مصالحت کے لیے جو شرطیں طے کریں، فریقین پر ان کی اطاعت اسی طرح لازمی ہوگی جس طرح شریعت کے احکام کی اطاعت لازمی ہے، یہاں تک کہ جو فریق اس سے انحراف اختیار کرے گا اس سے جنگ کی جائے گی۔

مصالحت ہو جانے کے بعد، اس کی شرائط کے خلاف، اگر کوئی فریق دوسرے فریق پر تعدی کرے گا تو وہ تعدی کرنے والا قرار پائے گا۔ مسلمانوں کا فرض ہو گا کہ اس کی سرکوبی کریں۔

یہ امر واضح رہے کہ یہ ہدایات اس صورتِ حال کے لیے دی گئی ہیں، جب نزاع مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان واقع ہو اور ان کی ایک مرکزی طاقت فریقین کے درمیان مداخلت کرنے کی پوزیشن میں ہو۔ اس زمانے میں یہ پیچیدہ صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے کہ بہت سی چھوٹی بڑی مسلمان حکومتیں الگ الگ قائم ہو گئی ہیں۔ ان کے درمیان اگر، خدانخواستہ، کوئی جنگ چھڑ جائے تو دوسری مسلمان حکومتوں کے لیے اس قضیہ سے بالکل الگ تھلگ رہنا تو جائز نہیں ہے، مصالحت کی کوشش، جس کا آیت میں حکم دیا گیا ہے، ہر ایک کو کرنی ہو گی، البتہ، عملاً، مداخلت کا معاملہ صورتِ حال پر منحصر ہے، جس کا تعلق وقت کے سیاسی تقاضوں سے ہے۔ اگر صورتِ حال اجازت دے گی تو تعدی کرنے والے فریق کو حق کے آگے جھکانے کے لیے اس کے خلاف طاقت استعمال کرنا بالکل جائز ہو گا اور اگر اس سے مزید بین الملی یا بین الاقوامی پیچیدگیاں پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہو تو عملی مداخلت سے تو گریز اختیار کیا جائے گا، لیکن مصالحت کی جدوجہد سے گریز کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ(۱۰)

"مسلمان باہم دگر بھائی بھائی ہیں، تو اپنے بھائیوں کے مابین مصالحت کراؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو کہ تم پر رحم کیا جائے۔"

یعنی، مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ان کے درمیان کسی نزاع کا برپا ہونا ہی اول تو ان کی باہمی اخوت کے منافی ہے، لیکن شیطان کی انگیخت سے کوئی نزاع برپا ہو ہی جائے، تو دوسرے مسلمانوں کو ان کے درمیان مصالحت کی کوشش کرنی چاہیے، نہ کہ اس آگ کو مزید بھڑکانے کی۔

'وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ'، یعنی، اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ اگر تمھارے ہاتھوں کوئی ایسا کام ہوا جو بھائیوں کے درمیان قتل و خون کا سبب ہوا، یا تم محض قومی، قبائلی، علاقائی یا سیاسی مصلحتوں کی خاطر، کسی پہلو سے، اس خون خرابے میں حصہ لینے والے بنے تو یاد رکھو کہ اللہ کی پکڑ سے نہیں بچ سکو گے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مستحق وہی ٹھہریں گے، جو اس کی قائم کی ہوئی اس اخوت کو ہمیشہ استوار و پایدار رکھنے کی کوشش کریں گے، نہ خود اس میں کوئی رخنہ پیدا کریں گے، نہ اپنے امکان کے حد تک کسی کو اس میں کوئی رخنہ پیدا کرنے کا موقع دیں گے۔

'بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ' میں مثنیٰ سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ جنگ دو بھائیوں کے درمیان ہو،

بلکہ یہ ثنی مسلمانوں کے دوگروہوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ثنی کا اس طرح استعمال عربی میں معروف ہے اور اس کی متعدد مثالیں قرآنِ مجید میں موجود ہیں۔

قرآن میں جرح و تعدیل کا ماخذ

ہمارے محدثین اور فنِ رجال کے ائمہ نے سورۂ حجرات کی اسی آیت ــــــ إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا ــــــ کو ماخذ قرار دیا ہے۔ راویوں پر جرح و تنقید کے حکم کا ہی جس کی بدولت 'اسماء الرجال' کا عظیم الشان فن وجود میں آیا، جو ان علوم میں سے ایک ہے، جن کے بانی ہونے کا شرف دنیا میں سب سے پہلے مسلمانوں کو حاصل ہوا۔

آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ جب کوئی فاسق کسی اہم واقعے کی خبر دے تو اس کی اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو۔ یہ حکم یوں تو عام ہے، ہر ایسی خبر کی تحقیق ضروری ہے جو دُور رس نتائج کی حامل ہو، لیکن کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کر کے کوئی روایت کرے تو اس کی تحقیق و تنقید بدرجۂ اولیٰ ضروری ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور واجب الاطاعت ہادی ہیں۔ آپ کی ہر بات، بلکہ ہر ادا امت کے لیے اسوۂ حسنہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے منسوب کر کے کوئی غلط روایت کر دی جائے اور وہ تحقیق کے بغیر قبول کر لی جائے تو یہ چیز دنیا میں بھی موجبِ خسران بن سکتی ہے اور آخرت میں بھی۔

آیت میں اگرچہ فاسق ہی کی روایت کی تحقیق کا حکم ہے، لیکن اس سے آپ سے آپ یہ بات بھی نکلی کہ اگر کوئی راوی مجہول ہو، نہ اس کا فسق معلوم ہو، نہ اس کی ثقاہت، تو اس کی تحقیق بھی ضروری ہوگی، کیونکہ ایک مجہول راوی کی روایت قبول کر لینے میں اندیشہ ہے کہ راوی فاسق ہو۔ چنانچہ محدثین نے مجہول راویوں کی بھی اچھی طرح تحقیق کی، تاکہ ان کا فسق یا ان کی عدالت واضح ہو جائے۔ اگر کسی راوی کی تحقیق میں ان کو کامیابی نہیں ہوئی تو اس کو مجہول قرار دے کر اس کی روایت انھوں نے رد کر دی۔

آیت سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ یہ تحقیق اسی صورت میں ضروری ہوگی، جب فاسق کوئی ایسی روایت کرے، جو دُور رس نتائج کی حامل ہو، اس لیے کہ یہاں لفظ 'نبا' وارد ہوا ہے، جو کسی اہم اور دُور رس نتائج کی حامل خبر ہی کے لیے آتا ہے۔ عام خبر یا واقعہ کے لیے یہ لفظ نہیں آتا۔ چنانچہ روز مرہ زندگی کے عام معاملات میں فاسق یا کافر کی خبر مان لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

آیت میں راوی اور روایت، دونوں کی تحقیق کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ فرمایا گیا ہے کہ ”اے ایمان والو اگر تمھارے پاس کوئی فاسق کوئی اہم خبر لائے تو تحقیق کر لیا کرو“۔ ظاہر ہے کہ یہاں ’تبینوا‘ کا مفعول راوی بھی ہے اور روایت بھی، بلکہ روایت کا مفعول ہونا زیادہ واضح ہے، اس لیے کہ راوی کا فسق تو یہاں معلوم ہی ہے۔ کسی روایت کی تحقیق میں جس طرح راوی کی ثقاہت، عدالت اور فقاہت اہمیت رکھتی ہے، اسی طرح خود روایت کے الفاظ، اس کا موقع و محل، دوسری روایاتِ باب کے ساتھ اس کی مخالفت یا موافقت، عقل و نقل کی کسوٹی پر اس کا مرتبہ اور سب سے زیادہ خدا کی کتاب کے ساتھ اس کی ہم آہنگی اور اس قبیل کی دوسری چیزیں بھی اس سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ اگر صرف راوی کی تحقیق پر کفایت کر کے یہ چیزیں نظر انداز کر دی جائیں تو تحقیق کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ ہمارے محدثین زیادہ زور صرف راوی کی تحقیق پر صرف کرتے ہیں، نفس متن پر ان پہلوؤں سے غور کرنے کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، حالانکہ ان پہلوؤں سے تحقیق کیے بغیر تحقیق کا حق، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، ہرگز ادا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہمارے فقہا نے متن حدیث پر غور کرنے کے لیے اصول وضع کیے اور اس کا نام ’درایت‘ رکھا۔ اس خدمتِ خاص میں سب سے بڑا حصہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ یہ خدمت انجام دے کر انھوں نے صرف فقہ ہی پر احسان نہیں کیا ہے، بلکہ فن حدیث کی بھی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اگر ہمارے علما ان اصولوں کو صحیح طور پر استعمال کرنے کی توفیق پاتے تو حدیث کے خلاف وہ فتنہ ہرگز نہ اٹھ سکتا جو فتنہ پردازوں نے اٹھا دیا اور جس نے گمراہ فرقوں کے لیے دین میں دراندازی کی بہت سی راہیں کھول دیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے ’تدبر حدیث‘ پر اپنی پیش نظر کتاب لکھنے کی توفیق اور مہلت بخشی تو اس کے مقدمہ میں، ان شاء اللہ، ان اصولوں کی قدر و قیمت واضح کروں گا۔[1]

اوپر کی تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ ہمارے محدثین کرام نے فاسق اور مجہول راویوں کی جو پردہ دری کی ہے، وہ قرآن کے اسی واضح اور قطعی حکم کی تعمیل میں کی ہے، تاکہ فاسق راویوں کی روایات سے دین کو بچائیں، مگر اس نکتہ سے کچھ حضرات نے ایک اور اس سے بھی زیادہ عمیق و دقیق نکتہ پیدا کر لیا کہ شریعت کی تمام حرمتیں ابدی نہیں ہیں، اس وجہ سے ایک ’قائد تحریکِ اسلامی‘ کو بھی

---

[1] مولانا اصلاحی، بوجہ ضعیفی، یہ کتاب تصنیف تو نہیں کر سکے، تاہم ”مبادی تدبر حدیث“ کے عنوان سے ان کے خطبات مرتب کیے گئے ہیں، جو کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ (ادارہ)

یہ حق حاصل ہے کہ وہ 'حکمتِ عملی' کے تقاضوں کے تحت' جب ضرورت محسوس کرے کسی حُرمت کو حلت سے بدل دیا کرے۔ ان نکات پر اپنے ناچیز خیالات ہم اپنے مقالات میں ظاہر کر چکے ہیں۔ یہاں ان پر تنقید کی نہ ضرورت ہے' نہ گنجایش۔ بس اتنی بات یاد رکھیے کہ جب قرآن نے فاسق اور مجہول راویوں کی پردہ دری اور ان کی روایات کی تحقیق کا حکم خود اس صراحت کے ساتھ دیا ہے تو محدثین اس خدمت کے لیے غیبت جیسی ناپاک چیز کو 'حکمتِ عملی' کے تحت جائز بنانے کی زحمت کیوں اٹھاتے۔

یہ بات بھی یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ راویوں پر جرح کو غیبت قرار دینے کا سہرا ہمارے ارباب تصوف کے سر ہے۔ تصوف کی ساری عمارت، چونکہ ضعیف اور بے بنیاد روایات ہی پر قائم ہے' اس وجہ سے جب محدثین نے راویوں کی چھان بین کا کام شروع کیا' تو ان حضرات کو محسوس ہوا کہ اگر محدثین اسی بے خوفی کے ساتھ یہ کام کرتے رہے' تو تصوف کی پوری عمارت زمین پر آ رہے گی۔ اس خطرے سے تصوف کو بچانے کے لیے ان حضرات نے یہ نکتہ نکالا کہ یہ محدث حضرات تو لوگوں کی غیبت کرتے پھرتے ہیں۔ صوفیوں کا یہ نکتہ ان کے اپنے حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔

آخر میں اس آیت سے متعلق ایک بات اور یاد رکھیے۔ بعض محدثین اور فقہا فاسق کی روایت قبول کرنے کے باب میں اس کے فسق عملی کو تو اہمیت دیتے ہیں، لیکن اس کے عقائدی فسق کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ ان کی رائے یہ ہے کہ کوئی شخص اگر کسی عملی فسق، مثلاً جھوٹ اور بدکرداری وغیرہ میں مبتلا ہو' تو اس کی روایت یا شہادت تو بے شک قبول نہیں کی جائے گی، لیکن اگر وہ صرف کسی فاسقانہ عقیدہ میں مبتلا ہے' تو مجرد اس کے فسادِ عقیدہ کی بنا پر' اس کی روایت یا شہادت رد نہیں کی جائے گی۔ ہمارے نزدیک یہ رائے بالکل غلط ہے۔ تجربہ گواہ ہے کہ جتنی جھوٹی روایتیں فسادِ عقیدہ میں مبتلا راویوں نے گھڑی ہیں' اتنی فسادِ عمل میں مبتلا راویوں نے نہیں گھڑی ہیں۔ یہ انھی کی گھڑی ہوئی روایتیں ہیں' جو سیرت، تفسیر، تصوف اور تاریخ کی کتابوں میں بھری ہوئی ہیں اور جن سے اہلِ بدعت و ضلالت نے اپنی دکانیں سجائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان علما پر رحم فرمائے' جنھوں نے فاسد العقیدہ راویوں کو چھوٹ دے کر ملت کو ایک ایسے فتنہ سے دوچار کر دیا جس سے اہلِ حق کے لیے عہدہ برآ ہونا نہایت دشوار کام ہو گیا ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو: مقالاتِ اصلاحی ج ۱، مضامین: 'دین میں حکمتِ عملی کا مقام' 'غیبت کی حقیقت اور احادیث کی جرح و تعدیل'۔

ہمارے نزدیک فسقِ عملی و فسقِ عقائدی کی یہ تقسیم بے معنی ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کے حق میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ اوپر جو کلیہ عام فاسقوں کے بارے میں بیان ہوا ہے وہی فاسد العقیدہ راویوں کے بارے میں بھی عقل و نقل کے موافق ہے، یعنی ان کی روایت اور شہادت ان امور میں تو قبول کی جائے گی جن میں ایک کافر کی روایت بھی قبول کی جا سکتی ہے لیکن اہم امور بالخصوص معاملاتِ دین میں ان کی روایت یا شہادت قبول کرنے کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔

ترتیب : طالب محسن

• "ہمارے نفس میں ہر دم خیر و شر کی کشمکش برپا ہے۔ مہد سے لحد تک ہمیں زندگی کے ہر ہر مرحلے میں خیر و صلاح اور شر و فساد میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ گھر کے معاملات ہوں یا کاروبار اور منڈی کا لین دین، دفتری امور ہوں یا باہمی روابط کے عام تقاضے، ہر صورت میں فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ نیکی کی راہ اختیار کی جائے یا بدی کی۔ زندگی کی یہی کشمکش ہے، جہاں دین چاہتا ہے کہ مسلمان کے نفس میں نیکی کا داعیہ اور جذبہ قوی تر اور برائی کا رجحان اور اس کی طرف میلان کمزور ہو جائے۔ برائی مغلوب، اور نیکی کی حیثیت ایک غالب قوت کی ہو، یہاں تک کہ خیر و شر کی اس کشمکش میں شر شکست کھا جائے اور خیر کو فتح حاصل ہو۔"

فکر و نظر

طالب محسن

تزکیۂ نفس

[جاوید احمد صاحب غامدی کے سلسلۂ محاضرات سے ماخوذ]

تزکیۂ نفس، قرآنِ مجید کی ایک معروف اصطلاح ہے۔ عام مسلمان کے لیے بھی یہ کوئی اجنبی اصطلاح نہیں۔ ہمارے ہاں وعظ و نصیحت کی مجالس اور دینی کتب و رسائل میں اس کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ دین سے معمولی دلچسپی رکھنے والا مسلمان بھی اس سے ناآگاہ نہیں رہ سکتا۔

عام خیال یہ ہے کہ یہ ایک خاص نوعیت کا عمل ہے، جس کے ذریعے سے باطن کی اصلاح ہوتی ہے۔ اگرچہ اسے فکر و عمل کی اصلاح کا ذریعہ بھی سمجھا جاتا ہے، لیکن، عام طور پر، اس کا اطلاق ان خاص اعمال پر کیا جاتا ہے، جنھیں اختیار کر کے ایک صوفی سلوک کی مختلف منازل طے کرتا ہے۔ یہی راہِ سلوک ہے، جس کے لیے ہمارے ہاں 'طریقت' کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے۔ بالعموم، تزکیۂ نفس کے لیے کسی شیخ یا پیر کی رہنمائی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ یہ شیخ اس کام کے لیے کچھ ورد اور وظیفے، اور کچھ چلّے اور مراقبے تجویز کرتا اور ان کی تکمیل کے مختلف مراحل میں اپنے مرید کی رہنمائی کرتا ہے۔ جب مرید یہ تمام مراحل طے کر لیتا ہے، تو اسے بعض خصائص حاصل ہو جاتے ہیں۔ اس کے قلب پر انوار و تجلیات نازل ہوتے، اس کے لیے مکاشفات کا باب کھلتا، اس کی زبان پر حق جاری ہوتا، اس کا دل دنیوی علائق سے بالکل پاک ہو جاتا اور دین کے ساتھ وابستگی میں اس کی یکسوئی کا عالم یہ ہوتا ہے کہ کوئی شیطانی وسوسہ اور کوئی دنیوی کشش اسے اپنی طرف راغب نہیں کر سکتی۔

تزکیۂ نفس کے بارے میں عام تصور یہی ہے، لیکن قرآنِ مجید کی روشنی میں دیکھیں تو اس تصور کی کوئی بنیاد نظر نہیں آتی، درآں حالیکہ تزکیۂ نفس دین کا بنیادی موضوع اور قرآنِ مجید کی اہم اصطلاح ہے۔ اس کے باوجود اصل کی جگہ ایک بالکل غلط تصور نے لے لی اور اس کے حوالے سے وہ چیزیں رائج ہو گئیں، جن کی قرآن و سنت میں کوئی بنیاد نہیں۔ گویا، قرآنِ مجید میں جو بات بڑی صراحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے، اسی کے لیے قرآنِ مجید سے رجوع نہیں کیا گیا۔ اس اعتبار سے دیکھیں، تو یہ قرآنِ مجید کی سب سے

زیادہ مظلوم اصطلاح نظر آتی ہے، جب کہ صورتِ واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین انسانوں کی رہنمائی کے لیے ہر لحاظ سے مکمل ہے اور اس میں ایسی کوئی کمی نہیں، جسے پورا کرنے کے لیے ہمیں کسی دوسری طرف دیکھنے کی ضرورت محسوس ہو۔ عبادات ہوں یا انسانوں کے ساتھ تعلق کا معاملہ، انفرادی اور باطنی اصلاح پیش نظر ہو یا معاشرے اور ریاست کی تعمیر و تطہیر، دینِ اسلام میں، انسان کے لیے پوری رہنمائی موجود ہے۔ یہی حقیقت ہے، جسے قرآن مجید نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کارِ رسالت کی تکمیل پر ایک واضح اعلان کی صورت میں بیان کر دیا تھا:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ	"آج میں نے تمھارے لیے، تمھارا دین
وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ	مکمل کر دیا، اور تم پر اپنی نعمت پوری کر
وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔	دی، اور تمھارے لیے، دینِ اسلام کو پسند
(المائدہ ۵ : ۳)	کیا۔"

اس کا نتیجہ تو یہ نکلنا چاہیے تھا کہ ہم رہنمائی کے لیے صرف قرآن و سنت کی طرف رجوع کرتے اور اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کرتے کہ اللہ تعالیٰ کو صرف اسلام ہی بطورِ دین ہمارے لیے پسند ہے اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ کی یہ نعمت پوری طرح مکمل ہے اور اس میں اب کسی ترمیم و اضافے کی کوئی گنجایش نہیں۔ چنانچہ، یہی حقیقت خود قرآنِ مجید نے بھی واضح کی ہے اور حک و اضافے کی ہر کاوش کو مذموم ٹھہرایا ہے۔ ارشاد ہے:

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ	"اور جس نے اسلام کے سوا کسی دوسری
دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ	چیز کو دین بنانا چاہا، تو اس کا یہ عمل ہرگز
وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ	قبول نہیں ہوگا۔ اور یہ شخص یومِ آخر گھاٹا
الْخٰسِرِيْنَ۔ (آلِ عمران ۳ : ۸۵)	پانے والوں میں سے ہوگا۔"

لیکن اس کے برعکس جس دین کے بارے میں قرآنِ مجید نے یہ کہا تھا کہ 'اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ' (آلِ عمران ۳ : ۱۹) "دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے"، ہم نے اسے بطورِ خاص تزکیۂ نفس کے معاملے میں کافی نہ سمجھا، دوسری وادیوں میں اترتے چلے گئے اور اس طرح دین کی اصل روح اور صحیح توازن سے محروم ہو گئے۔

بہرحال، ہمارا یہ دین تین چیزوں کا مجموعہ ہے۔ پہلی چیز فلسفہ و حکمت، دوسری قانون و شریعت اور تیسری تزکیۂ نفس ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ پہلی دونوں کا مقصود بھی اسی تیسری چیز کا حصول ہے۔

فلسفہ و حکمت کا تعلق ان مباحث سے ہے جن میں انسان کی حقیقت، اس کے مقام اور اس کے مقصدِ وجود کی توضیح اور جبر و قدر، خیر و شر اور تقدیر و سنن الٰہی کی تفصیل کی جاتی ہے۔ قانون و شریعت کا تعلق ان حدود و قیود سے ہے، جو زندگی کے عام معاملات پر عائد کی گئی ہیں، اور ان قواعد سے ہے جو اللہ تعالیٰ اور بندوں کے ساتھ تعلق کے حوالے سے متعین کیے گئے ہیں۔ فلسفہ و حکمت کے حقائق کی تعلیم ہو یا قانون و شریعت کے حدود و قواعد کی تلقین، ان دونوں سے مقصود نفسِ انسانی کا تزکیہ ہے۔ اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، دین کا اصل مقصود یہی ہے۔ یہی بات ان آیات سے بھی واضح ہوتی ہے، جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرضِ منصبی بیان ہوا ہے:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ۔ (الجمعہ ۶۲: ۲)	"وہی ذات ہے، جس نے امیوں میں انھی کے ایک شخص کو رسول کی حیثیت سے مبعوث کیا۔ یہ رسول انھیں اللہ کی آیات پڑھ کر سناتا اور اس طرح ان کا تزکیہ کرتا، اور انھیں قانون و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔"

اس آیۂ کریمہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل ذمہ داری تلاوتِ آیات بتائی گئی ہے جس کے ذریعے سے آپ نے تزکیۂ نفوس اور قانون و حکمت کی ذمہ داریاں ادا کیں۔ اس آیت میں تعلیمِ قانون و حکمت سے پہلے تزکیۂ نفس کا ذکر ہوا ہے، جب کہ سورۂ بقرہ میں مذکور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق دعا میں تزکیۂ نفس کا ذکر تعلیمِ قانون و حکمت کے بعد ہوا ہے۔ اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ تزکیۂ نفوس کا ذریعہ کتاب و حکمت کی تعلیم ہے یا یہ کہ کتاب و حکمت کی تعلیم سے مقصود، درحقیقت، تزکیۂ نفس ہی ہے۔ دعا کے الفاظ ہیں:

رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ یُزَكِّیْهِمْ۔ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ۔ (البقرہ ۲: ۱۲۹)	"اے ہمارے پروردگار، ان کے اندر انھی میں سے ایک رسول بھیج، جو انھیں تیری آیات پڑھ کر سنائے، قانون و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ بے شک، تو زبردست ہے، حکمت والا ہے۔"

قرآنِ مجید کی حیثیت ایک منذر کی ہے۔ وہ انسانوں کو یہ بتاتا ہے کہ یہ زندگی عارضی ہے اور اس سے مالکِ کائنات کا مقصود اپنے بندوں کی آزمایش ہے۔ وہ خبردار کرتا ہے کہ اس زندگی کا انجام روزِ قیامت پر ہوگا۔ تمام لوگ اپنے خالق اور مالک کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ چنانچہ، وہ نفوسِ مزکّٰی، جنھوں نے اپنے نفس میں برائیوں کو دبالیا اور نیکیوں کو غالب کر لیا، وہ جنّت کے مستحق ہوں گے، اور جن کا معاملہ اس کے برعکس ہوگا، وہ ناکام و نامراد ٹھہریں گے:

وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا	"اور گواہ ہے نفس، اور جس طرح اسے سنوارا۔
فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا. قَدْ	پھر اس میں نافرمانی اور پرہیزگاری کے
اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَ قَدْ	داعیات رکھ دیے۔ وہ کامیاب ٹھہرا جس
خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا.	نے اسے پاک کر لیا، اور وہ نامراد ہوا جس
(الشمس ۹۱: ۷-۱۰)	نے اسے آلودہ کیا۔"

قرآنِ مجید کے نزدیک انسان کا اصل مسئلہ آخرت کی تیاری ہے۔ آخرت، جہاں برے لوگ جہنم کا ایندھن بنیں گے اور اچھے لوگ جنّت کی نعمتیں پائیں گے۔ وہ ہمیں متنبہ کرتا ہے کہ توقف اور تامل سے کام لیں، غور و فکر کریں اور یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ جنّت پانے کا راستہ کیا ہے۔ یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ جنّت اسی کا مقدر بنے گی، جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا اور اسے برائیوں سے پاک کر لیا، اس لیے کہ جنّت نفوسِ مزکّٰی کا ٹھکانا ہے۔

تزکیے کا یہ عمل، اسی دنیا تک محدود نہیں ہے۔ ہم جب اپنے نفوس کا تزکیہ کر کے قیامت کے روز اٹھیں گے تو اللہ تعالیٰ بھی ہمارا تزکیہ کریں گے۔ اسی طرح ہمارے کام میں جو نقائص رہ جائیں گے، ان کا ازالہ ہو جائے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مزید رحمت اور مہربانی ہوگی، جو وہ اپنے بندوں پر فرمائے گا۔ اور وہ لوگ جو برائیوں سے اپنا دامن آلودہ کر لیں گے، ان کے بارے میں قرآنِ مجید میں فرما دیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نہ ان سے بات کریں گے، نہ ان کی طرف نظرِ عنایت کی جائے گی اور نہ وہ ان کا تزکیہ ہی کریں گے۔ ارشاد ہے:

اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي	"یہ ہیں وہ لوگ جن کا آخرت میں کوئی حصہ
الْاٰخِرَةِ وَ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ	نہیں اور نہ اللہ ان سے بات کریں گے اور نہ
وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ	ان کی طرف قیامت کے روز دیکھیں گے
الْقِيٰمَةِ وَ لَا يُزَكِّيْهِمْ وَ	اور نہ ان کا تزکیہ ہی کریں گے اور ان کے لیے

لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ دردناک عذاب ہے۔"

(آلِ عمران ۳: ۷۷)

تزکیہ، جیساکہ واضح ہے، عربی زبان کا لفظ ہے۔ یہ دو مفہوموں پر مشتمل ہے۔ ایک پہلو سے اس کا مطلب کسی شے کو پاک اور صاف ستھرا کرنا ہے' اور دوسرے پہلو سے یہ پروان چڑھانے اور نشوونما دینے کے مفہوم کا حامل ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جب کوئی کھیت اگانا مقصود ہو تو پہلے جھاڑ جھنکاڑ صاف کر کے زمین تیار کی جاتی ہے۔ پھر بیج بویا جاتا ہے۔ تب نگہداشت کا عمل شروع ہوتا ہے۔ نلائی کی جاتی ہے، ضرورت کے مطابق پانی دیا جاتا، اور وقتاً فوقتاً جڑی بوٹیاں تلف کی جاتی ہیں، تاکہ کھیت پوری طرح برگ وبار لائے۔ غرض کہ اگر ایک اعتبار سے یہ ایک منفی عمل ہے' تو دوسرے پہلو سے ایک مثبت عمل۔ کسی شے کو ترقی دینے کے لیے ضروری ہے کہ جہاں اسے آلائشوں سے پاک کیا جائے، اور اس کی خرابیاں اور نقائص دور کیے جائیں، وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی نمود، نشوونما اور فروغ کے لیے ضروری چیزیں اور سازگار ماحول پیدا کیا جائے۔ یہ دوہرا عمل ہے' جسے ہم تزکیہ کے لفظ میں ادا کرتے ہیں۔ یہی عمل' جب نفسِ انسانی پر کیا جاتا ہے' تو اسے ہم تزکیۂ نفس کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔ قرآن مجید نے 'قد افلح من زکھا' اور 'قد خاب من دسھا' کے جملوں میں اسی کا ذکر کیا ہے اور اس منزل کی نشان دہی کر دی ہے، جس کو پانا فلاحِ اخروی کے لیے ضروری ہے۔

ہمارے نفس میں ہر دم خیر وشر کی کشمکش برپا ہے۔ مہد سے لے کر لحد تک ہمیں زندگی کے ہر ہر مرحلے میں خیر وصلاح اور شر وفساد میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ گھر کے معاملات ہوں یا کاروبار اور منڈی کا لین دین، دفتری امور ہوں یا باہمی روابط کے عام تقاضے، ہر صورت میں فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ نیکی کی راہ اختیار کی جائے یا بدی کی۔ زندگی کی یہی کشمکش ہے' جہاں دین چاہتا ہے کہ مسلمان کے نفس میں نیکی کا داعیہ اور جذبہ قوی تر اور برائی کا رجحان اور اس کی طرف میلان کمزور ہو جائے۔ برائی مغلوب، اور نیکی کی حیثیت ایک غالب قوت کی ہو، یہاں تک کہ خیر وشر کی اس کشمکش میں شر شکست کھا جائے اور خیر کو فتح حاصل ہو۔

قرآن مجید ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ تزکیۂ نفس کے اس عمل کا نقطۂ کمال کیا ہے۔ اس کے نزدیک نفسِ مزکّی کی آخری منزل نفسِ مطمئنہ ہے اور نفسِ مطمئنہ "راضیة مرضیة" کی بادشاہی ہے۔ ارشاد ہے:

يَاۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّـةُ۔	"اے نفسِ مطمئن، اپنے رب کی طرف آؤ،
ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِيَـةً	اس طرح کہ تو اپنے رب سے راضی اور
مَّرْضِيَّـةً ، فَادْخُلِیْ فِیْ	تیرا رب تجھ سے راضی۔ میرے بندوں میں
عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّـتِیْ۔	شامل ہو جاؤ اور میری جنت میں داخل ہو
(الفجر ۸۹ : ۲۷-۳۰)	جاؤ۔"

وہ لوگ، جن کے قدم تنگی اور فراخی، ہر طرح کے حالات میں جادۂ حق سے نہیں ہٹتے، انھیں جب کوئی نعمت ملتی ہے، تو اسے شکر کا امتحان سمجھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ شکر گزار بندوں کی طرح اپنے رب کے ساتھ عبدیت اور بندوں کے ساتھ حسنِ سلوک کے تعلق پر قائم رہیں، مشکل آتی ہے تو اسے صبر و استقامت کا امتحان سمجھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ جان کی بازی لگا کر بھی اس امتحان سے سرخ رو ہو کر نکلیں، جن کا دل عسر و یسر اور نرمی و سختی، ہر طرح کے حالات میں، اپنے رب سے راضی اور مطمئن رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ روزِ محشر انھیں نفسِ مطمئنہ کے خطاب سے نوازیں گے۔ وہ جو اپنے رب سے راضی تھے، انھیں خدا کی رضا کی نوید سنائی جائے گی، انھیں خدا کے بندوں میں شامل کیا جائے گا اور اس کو جنت میں جگہ دی جائے گی۔ اس طرح یہاں کے نفوسِ مطمئنہ اور یہاں کے راضی برضا، جنت کے اطمینان اور خدا کی رضا جیسی نعمتوں سے سرفراز ہوں گے۔ غرض کہ تزکیۂ نفس کا عمل جب اپنے نقطۂ کمال کو پہنچتا ہے، تو بندۂ مومن دنیا میں نفسِ مطمئنہ کی منزل پا لیتا اور آخرت میں وہ بادشاہی اس کا نصیب بن جاتی، جسے قرآنِ مجید نے "راضیۃ مرضیۃ" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔

تزکیۂ نفس اپنے ابتدائی مراحل میں ایک سادہ عمل ہے۔ اس کا آغاز اسی لمحے ہو جاتا ہے، جب انسان برائیوں کی راہ چھوڑ کر نیکیوں کا راستہ اختیار کر لیتا ہے، جس طرح ایک عمارت کا آغاز بالکل سادہ طریقے پر ایک ڈھانچے کی تعمیر سے ہو جاتا ہے۔ ڈھانچے کی تعمیر کا یہ مرحلہ جہاں قدرے آسان ہوتا ہے، وہاں تکمیل کے مراحل بھی سرعت کے ساتھ طے کرتا ہے، لیکن دوسرا مرحلہ جو آرایش و تزئین کا مرحلہ ہے، اس کے مقابلے میں بہت محنت طلب اور طویل مرحلہ ہوتا ہے۔ اس میں ایک ایک گوشے اور ایک ایک جزو کی تکمیل پر الگ الگ توجہ دینی پڑتی ہے۔ یہ کام جس قدر خوب صورت اور معیاری ہو، محنت، توجہ، توقف اور تامل کی بھی اسی قدر ضرورت پڑتی ہے۔ نفسِ انسانی کی تعمیر میں بھی یہ مرحلہ اتنا ہی نازک اور لطیف ہوتا ہے۔ اس میں اسی طرح دقیقہ رسی اور باریک بینی کی ضرورت پڑتی ہے۔

بندۂ مومن چن چن کر اپنے دامن سے کوتاہیاں اور خامیاں دور کرتا اور ان کی جگہ محاسن اور مکارم سجاتا ہے۔ اس کا ذوق اس معاملے میں اتنا بلند ہو جاتا ہے کہ ذرا سی لغزش بھی اسے کھٹکتی ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے دامن پر پڑنے والی شکن بھی دور کر دے اور چھوٹی سے چھوٹی غلطی اور کوتاہی بھی اس سے سرزد نہ ہو۔ اس اعتبار سے یہ عمل ایک آرٹسٹ کا عمل ہے۔ وہ اپنا فن پارہ مکمل کرتے ہوئے ایک ایک خط، ایک ایک زاویے اور ہر ہر قوس کو اپنی توجہ کا مرکز بناتا ہے۔ اور اس عمل میں لبا اوقات گھنٹوں صرف کر دیتا ہے ؎

برائے پاکیِ شعرے شب بروز آرد[1]

تزکیے کا یہ عمل، جس چیز پر وارد ہوتا ہے، وہ ہمارا نفس ہے۔ جس چیز پر لفظِ 'نفس' کا اطلاق ہوتا ہے، وہ کوئی ایسی چیز نہیں، جسے آنکھوں سے دیکھا اور ہاتھوں سے چھوا جا سکے۔ نفسِ انسانی کائنات کے اسرار میں سے ایک سر ہے۔ جس طرح ہماری عقل، ہماری نگاہوں کی رسائی اور ہاتھوں کی پہنچ سے باہر ہے، ہمارے لیے ممکن نہیں کہ ہم اس کا مشاہدہ کر سکیں۔ صرف اس کے کمالات ہیں، جن کا ظہور ہمارے مشاہدے میں آسکتا ہے۔ اسی طرح ہم اپنے نفس کے لباس، اثرات، اس کے اعمال اور صفات کا مشاہدہ تو کرتے ہیں، لیکن خود نفس ہمارے حواس کی گرفت سے باہر ہے۔ گویا نفسِ انسانی بھی، عقل کی طرح جتنا مشہود ہے، اتنا ہی غائب ہے۔

انسانی وجود، ہمارے سامنے چار صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ پہلی صورت، جسے ہم دیکھ اور چھو سکتے ہیں، ہمارا یہ حیوانی وجود ہے۔ درحقیقت، ہمارے نفس کے لیے، یہ حیوانی وجود بمنزلۂ لباس ہے، یا یہ کہ نفسِ انسانی کو دنیا میں ظہور کے لیے، اس مادی وجود کی صورت دی گئی ہے۔ ہماری زندگی میں نفس اور ہمارا یہ حیوانی وجود، ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دوسری صورت عقلی وجود کی ہے۔ عقلی وجود سے مراد انسان میں موجود ادراک کی صلاحیت ہے۔ حواس اور وجدان کے ذریعے سے حاصل ہونے والی معلومات کا تجزیہ کرنا اور ان سے نتائج نکالنا، ہمارے عقلی وجود کا وظیفہ ہے۔ ہمارے نفس کا یہی پہلو ہے، جس کی وجہ سے ہم وحی کے مخاطب بننے کے اہل ہوئے۔ اور یہی چیز ہے جو ہماری تہذیبی، تمدنی، سائنسی اور ثقافتی کامیابیوں کے حصول کا باعث بنی ہے۔ نفس کی تیسری صورت اس کا روحانی وجود ہے۔ یہ ایک یزدانی شے ہے۔ ہمارے نفس کا یہی پہلو ہے،

---

[1] ایک شعر کی تہذیب میں (لبا اوقات) رات گزر جاتی اور دن چڑھ آتا ہے۔

جسے ہم ضمیر اور نفسِ لوّامہ کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور چوتھی صورت ہمارا اخلاقی وجود ہے۔ اس کی بنیادیں ہمارے وجدان، ضروریات، جذبات اور شہوات میں رکھی گئی ہیں اور اس کا اظہار خاندان، معاشرے اور ریاست کے ساتھ ہمارے تعلق میں ہوتا ہے۔

نفس کے یہ چاروں پہلو قرآن کا موضوع ہیں۔ تزکیۂ نفس کے اصول، نفس کی ان چاروں صورتوں پر محیط ہیں۔ جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں، قرآنِ مجید اور سنت کا اصل مقصود تزکیۂ نفس ہے، لہٰذا، اس میں جو کچھ حکمت کی حیثیت سے ہے، وہ بھی اور جو کچھ قانون کی حیثیت سے وہ بھی تزکیۂ نفس ہی کے پیشِ نظر ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا مطالعہ کریں، تو یہ بات سامنے آئے گی کہ آپ نے صحابۂ کرام کے تزکیے کے لیے نفس کے ان سارے پہلوؤں کو بیک وقت پیشِ نظر رکھا۔ ہمارے ہاں صوفیہ نے اگرچہ تزکیۂ نفس کو اپنا موضوع بنایا، لیکن اس توازن کو برقرار نہ رکھ سکے، جو دین میں مطلوب ہے اور جس کی سنت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کی تھی۔

حیوانی وجود کا تزکیہ

تزکیۂ نفس کے بارے میں ان بنیادی مباحث کی تفصیل کے بعد پہلے ہم ان اصول و مبادی کی توضیح کریں گے، جو نفس کے حیوانی وجود کے تزکیے سے متعلق ہیں۔ نفسِ انسانی کی یہ صورت، یعنی حیوانی وجود ایک مشہود چیز، یعنی ایک مادی وجود ہے۔ علوم کی تاریخ میں یہ ہمیشہ سے موضوعِ بحث رہا ہے۔ سائنس اور طب بھی، اس کا مطالعہ کرتے ہیں اور تہذیب و تمدن کی تشکیل میں بھی اسے ایک اہم عنصر کی حیثیت حاصل ہے۔ تہذیبِ جدید نے اس کی تزئین و آرایش کو اپنی مساعی کا ہدف بنایا، یہاں تک کہ معاملہ پلاسٹک سرجری جیسے فنون کے کمالات تک پہنچ گیا ہے۔ اسی طرح، مذہب کا موضوع بھی یہ ہمیشہ سے رہا ہے۔ صوفی جب اسے مٹانے کی بات کرتا ہے، تو درحقیقت، حیوانی وجود ہی کو موضوع بناتا ہے۔ عیسائی راہب جب یہ کہتا ہے کہ جسم کو صاف رکھنا اور نہانا دھونا تقویٰ کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے، تو اس کے پیشِ نظر بھی نفس کا یہی پہلو ہوتا ہے۔ ایک عیسائی راہب کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بارہ سال تک نہیں نہایا تھا۔ اسی طرح ہندو، بدھ اور دوسرے مذہبی گروہوں میں بھی یہ کسی نہ کسی پہلو سے زیرِ بحث آتا اور اس کے بارے میں قواعد و ضوابط دیے جاتے ہیں۔ اسلام نے بھی، جیسا کہ ہم نے اوپر واضح کیا ہے، نفسِ انسانی کے دوسرے پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس کے تزکیے کے لیے بھی متعین اصول دیے ہیں۔

انسان کا حیوانی وجود اپنی بقا کے لیے' خوراک کی احتیاج رکھتا ہے۔ اس کی یہ خوراک اس کے وجود کے لیے، صرف توانائی فراہم کرنے کا ذریعہ ہی نہیں بنتی، اس کے نفس پر بھی اثرانداز ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے ثبوت کے لیے زیادہ دلائل کی ضرورت نہیں۔ مختلف مذہبی گروہوں' تہذیبوں اور معاشروں پر ان کی خوراک کے اثرات کا بہ آسانی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ خدا کے پیغمبر اس معاملے میں غیرمعمولی طور پر حساس ہیں۔ چنانچہ، وہ اپنے ماننے والوں کو چار طرح کی چیزیں کھانے سے روک دیتے ہیں۔ مطلب یہ کہ انھیں وہ چار بنیادی اصول بتا دیتے ہیں، جن کی روشنی میں وہ یہ طے کر سکیں کہ انھیں کیا کھانا چاہیے اور کیا نہیں کھانا چاہیے۔

اس باب میں پہلا اصول یہ ہے کہ وہ چیزیں ہرگز نہ کھائی جائیں' جن کے بارے میں انسان اپنی طبیعت میں کراہت محسوس کرتا ہے۔ اس باب کی سب سے نمایاں چیز مردار ہے۔ چنانچہ' قرآنِ مجید نے اسی کا ذکر بطورِ عنوان کیا ہے۔ اسی اصول پر بول و براز اور اسی نوع کی دوسری چیزیں حرام ہو جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری فطرت میں غلاظت اور آلائش سے جو فطری کراہت رکھی ہے، مطلوب یہ ہے کہ وہ زندہ و بیدار رہے۔ لہٰذا اس نوع کی تمام چیزیں حرام قرار دے دی گئیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ انسان اپنے اندر فسق و فجور اور تعدی و عدوان کا رجحان رکھتا ہے، یہاں تک کہ درندگی پر اتر آتا ہے۔ کسی بے گناہ کو مار ڈالنا اور کسی کی عزت برباد کر دینا، اسی رجحان کی قبیح ترین صورتیں ہیں۔ خون پینا' اسی رجحان کی علامت ہے۔ اسی وجہ سے' قرآنِ مجید نے دمِ مسفوح (بہتا ہوا خون) حرام قرار دیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے' اسی اصول کے تحت' درندوں اور چنگال والے پرندوں کو حرام ٹھہرایا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ انسانی محاسن نمایاں اور غالب رہیں اور درندگی جیسی خوف ناک خو اور خصلت انسان کے اندر پیدا نہ ہو۔

تیسرے اصول سے وہ چیزیں حرام ہوتی ہیں جو کسی اخلاقی برائی پیدا کرنے کا سبب بنتی ہوں۔ سؤر کا گوشت اسی اصول کے تحت حرام ہے۔ جنسی آوارگی اس جانور کی سرشت ہے۔ چنانچہ وہ قومیں جو سؤر کا گوشت کھاتی ہیں' دیکھا گیا ہے کہ ان کے ہاں یہ مرض عام ہے۔ اسی ضمن میں' شراب اور دوسری نشہ آور چیزیں آتی ہیں، لہٰذا انھیں حرام ٹھہرایا گیا ہے۔

چوتھی چیز عقیدے کی نجاست ہے۔ یہ نجاست جس شے کے ساتھ لاحق ہو جاتی ہے' اسے حرام بنا دیتی ہے۔ قرآنِ مجید نے غیراللہ کے نام پر ذبح کیے جانے والے جانور' اسی اصول کے تحت حرام کیے ہیں۔ پھر اسی اصول کی توسیع میں اسے بھی حرام ٹھہرایا، جو کسی خاص استھان سے منسوب کر دیا جائے' مثلاً مندروں

میں کی جانے والی قربانی۔ ایک حلال چیز، جو اوپر بیان کیے گئے تینوں اصولوں کے تحت تو حرام نہیں، صرف اس لیے حرام ہو جاتی ہے کہ اسے جس نام کے ساتھ وابستہ ہونا چاہیے تھا، اس کے بجائے کسی دوسرے نام کے ساتھ وابستہ کر دی گئی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ مال اور وہ دولت بھی حرام ہو جاتی ہے، جسے باطل طریقے سے حاصل کیا گیا ہو۔ اصل شے میں تو خرابی نہیں، لیکن ہمارے عمل کی نجاست اس میں شامل ہو گئی ہے، لہٰذا اس کا کھانا یا استعمال کرنا، اب جائز نہیں رہا۔

جس طرح خوراک ہمارے حیوانی وجود کی ایک بنیادی ضرورت ہے، اسی طرح جنسی جذبے کی تسکین بھی اسی کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ چنانچہ اس پہلو سے حیوانی وجود کے تزکیے کے لیے، بیوی کے ساتھ جائز تعلق بھی، طہارت کا ایک خاص تصور اور احساس پیدا کرنے کے لیے، کچھ شرائط کا پابند بنا دیا گیا ہے۔ قرآنِ مجید نے ایامِ حیض میں بیوی سے مقاربت روک دی ہے، اور کہا ہے کہ جب تک وہ نہا دھو کر پاک نہ ہو جائے، یہ تعلق قائم نہ کیا جائے۔ زن و شو کے اس تعلق میں نجاست کا احساس ایک طبعی چیز ہے۔ اسی لیے اس کے بعد غسل ضروری قرار دے دیا ہے، تاکہ طہارت کا احساس زندہ و بیدار رہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اس باب میں، یہاں تک ہدایت فرمائی ہے کہ مقاربت کے بعد کسی بھی کام، حتیٰ کہ سونے سے پہلے بھی، اگر نہانا ممکن نہ ہو تو، کم از کم، وضو کر لینا چاہیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اہتمام کی اہمیت واضح کرتے ہوئے فرمایا: یہ کیسے ممکن ہے کہ بندہ اپنے رب کے حضور بلا لیا جائے اور وہ پاک صاف نہ ہو۔[1] چنانچہ حالتِ جنابت میں عبادت ممنوع ہے، کیونکہ بندۂ مومن، طہارت کے بارے میں غیر معمولی طور پر حساس ہوتا ہے۔ نماز کے لیے وضو لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس معاملے میں، دین نے نجاست اور طہارت کے مابین ایک لطیف حدِ فاصل قائم کی ہے۔ جسم سے محض ہوا کا اخراج بھی آدمی کو اس قابل نہیں رہنے دیتا کہ وہ نماز کے لیے کھڑا ہو۔ وہی غسل جو جنابت کی صورت میں طہارت کا ذریعہ تھا، اسے ایک عبادت کی حیثیت دے دی۔ اور جمعے کی نماز کے لیے، اس کے اہتمام کی خاص طور پر تلقین کی۔ صحابہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم کو کیا اہمیت دیتے تھے، اس کا اندازہ اس مکالمے سے ہوتا ہے جو حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے مابین ایک جمعے کے اجتماع پر ہوا۔ حضرت عمر خطبہ دے رہے تھے کہ حضرت عثمان مسجد میں داخل ہوئے۔ حضرت عمر نے ان جیسے جلیل القدر آدمی کا نماز میں تاخیر سے آنا پسند نہیں کیا اور ان سے اس کی وجہ پوچھی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ مدینے سے باہر رقبے پر گئے ہوئے تھے کہ تاخیر ہو گئی اور بتایا

---

[1] حدیثوں کے مطالعے اور قرآنِ مجید کے نحوی سے معلوم ہوتا ہے کہ نیند موت ہی کی ایک تعبیر ہے، اور یہ بعید نہیں کہ آدمی نیند کی حالت ہی میں، خدا کے حضور بلا لیا جائے۔

کہ میں بس گھر سے وضو کر کے آگیا ہوں، کہیں رکا نہیں۔ اس پر حضرت عمر نے فرمایا: تو آپ نہائے بھی نہیں اور محض وضو کر کے آ گئے ہیں؟ مطلب یہ کہ جمعے کی نماز کے لیے غسل کرنا ان کے نزدیک، اس قدر اہم تھا کہ انھیں توقع نہ تھی کہ حضرت عثمان نہائے بغیر مسجد میں آجائیں گے۔ نوزائیدہ بچے کو نہلایا جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا آغاز طہارت کے ساتھ کرے۔ مردے کو بھی اسی لیے نہلاتے ہیں کہ اس کا بدن پاک صاف ہو اور پاک صاف لباس ہی میں اسے خدا کے سپرد کیا جائے۔ کسی غیر مسلم کا اسلام قبول کرنے کے بعد نہانا بھی اسی ذیل میں آتا ہے، تاکہ اہلِ اسلام میں شامل ہونے کے لیے نہانا اور پاک صاف ہونا اسے طہارت کے خاص احساس سے سرشار کر دے۔ دین نے مختلف مواقع پر غسل اور وضو کے اہتمام کی اس طرح تعلیم دی ہے کہ طہارت، پاکیزگی اور صفائی نے حیوانی وجود کے شب و روز کا احاطہ کر لیا ہے۔

وہ پانچ چیزیں بھی اسی حیوانی وجود کے تزکیے سے متعلق ہیں جنھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فطرت قرار دیا ہے۔ ناخن کاٹنا، لبیں تراشنا، بغلوں اور زیرِ ناف کے بال صاف کرنا اور ختنہ کرانا ایسی چیزیں ہیں جنھیں نبیوں کی امتوں میں شعائر کا مقام حاصل ہے، ان کی اہمیت کا اندازہ کرنا ہو تو سکھ مذہب کے پیرو کاروں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ بالوں کے معاملے ہی میں جو صورت ان کے ہاں پیدا ہو جاتی ہے، اسے دیکھ کر آدمی پکار اٹھتا ہے کہ یہ پیغمبر ہی ہیں جو انسان کی صحیح رہنمائی کر سکتے اور اسے ایک متوازن راہ پر قائم رکھ سکتے ہیں۔

ہمارا یہ حیوانی وجود لباس کا محتاج ہے۔ شرم و حیا کے پہلو سے جسم کے کچھ اعضا چھپائے جاتے ہیں۔ چنانچہ، لباس کے معاملے میں، دین نے پہلی چیز جسے ضروری قرار دیا ہے، وہ یہ ہے کہ لباس شرم گاہ کو چھپانے والا ہو، تاکہ حفظِ فروج کے معاملے میں آدمی غیر محتاط نہ ہو۔ پھر یہ تلقین کی کہ لباس کو سادہ اور باوقار ہونا چاہیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باب میں یہ سنت قائم کی کہ ہمیشہ اپنے معاشرے کے شرفا کا لباس پہنا اور اسی طرح یہ سکھایا کہ یہی چیز ہر معاشرے کے مسلمانوں سے مطلوب ہے۔ رنگوں کے معاملے میں بھی دین ایک خاص ذوق پیدا کرتا ہے۔ مردوں کے لیے سفید رنگ زیادہ پسندیدہ ہے۔ اگرچہ، دوسرے رنگ بھی وسعت کے پیشِ نظر ممنوع نہیں ہیں، مگر بہت شوخ سرخ اور زرد رنگ بھی بہرحال، پسندیدہ نہیں۔

حیوانی وجود کے تزکیے کے یہ اصول ہیں، جنھیں ہمارے دین نے ہمارے لیے متعین کیا ہے۔ ہم مسلمان، بالعموم، ان کا لحاظ کرتے ہیں۔ لہٰذا ممکن ہے کہ ہم ان کی صحیح اہمیت محسوس نہ کریں۔ اگر ہم دنیا کے وسیع کینوس پر نگاہ ڈالیں تو یہاں سکھ، ہندو، بدھ، اور دوسرے مذاہب کے ماننے والے موجود ہیں۔ ان کی اس باب میں بے اعتدالیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد جب ہم اسلام کے ان اصولوں پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں ان کی قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر محمد امین

اسلام کا تصورِ نجات

(۳)

[ربطِ مضمون کے لیے پچھلا شمارہ ملاحظہ فرمائیں]

۴۔ زیر بحث موضوع پر قرآن و سنت کے احکام اور تفسیری آراجان لینے کے بعد اب ایک نظر ذرا ان دلائل کا تجزیہ بھی کر لیا جائے، جو فاضل مصنف نے اپنے نقطۂ نظر کے حق میں دیے ہیں اور ان میں سرِ فہرست بعض قرآنی آیات سے ان کا استشہاد ہے:

مصنف نے سورۂ صف کی آیت[1] "ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ" کی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ دین سے مراد یہاں ان لوگوں کا طرزِ زندگی ہے، جو الٰہی ہدایت سے بے نیاز زندگی گزارتے ہیں، رہے اہلِ کتاب تو وہ اس میں شامل نہیں ہیں، کیونکہ ان کا دین تو اسلام ہی ہے، کیونکہ قرآن نے خود کہا ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر وہی دین نازل کیا گیا ہے، جو حضرت نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کا دین تھا۔

یہ محض غلط بحث ہے، کیونکہ اگر اہلِ کتاب کا دین بھی اسی طرح اسلام ہے، جس طرح مسلمانوں کا تو پھر جھگڑا کس بات کا ہے؟ پھر اہلِ کتاب حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اسی طرح ایمان کیوں نہیں لے آتے جس طرح وہ سابقہ انبیا پر ایمان لائے ہوئے ہیں اور جس طرح مسلمان اپنے نبی کے علاوہ باقی سارے انبیا کو بھی مانتے ہیں، اسی طرح اہلِ کتاب بھی اپنے اپنے نبی کو ماننے

---

[1] الصف ۶۱: ۹ (وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا کہ وہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے، اگرچہ ان مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار گزرے)۔ (ادارہ)

کے ساتھ باقی سارے انبیا پر ایمان کیوں نہیں لاتے ؟ یہ وہی غلط مبحث ہے جو وفدِ نجران کے نصاریٰ نے پیش کیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان سے فرمایا: 'اسلموا' (اسلام قبول کرو) تو کہنے لگے 'قد اسلمنا' (مطلب یہ کہ ہم تو پہلے ہی سے اسلام قبول کیے ہوئے ہیں)، لیکن ساتھ ہی حضور کی نبوت کا انکار کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دلائل میں جب ان کی کٹ حجتی دیکھی، تو فرمایا کہ اچھا کل تم بھی مع اہل وعیال آجاؤ اور ہم بھی آتے ہیں اور اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ ہم میں سے جو جھوٹا ہو، اس پر اللہ کی لعنت اور عذاب ہو تو وہ مقابلے سے بھاگ گئے اور سیاسی مغلوبیت قبول کر کے جزیہ دینے پر آمادہ ہو گئے۔ اگر انھیں اپنے موقف پر یقین ہوتا تو بھاگتے کیوں ؟ لیکن وہ سمجھ گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم، دراصل اللہ کے سچے رسول ہیں لیکن اپنے مادی اور گروہی مفادات کے تحفظ کی خاطر، انھوں نے حضور کی رسالت کا انکار کر دیا اور سیاسی مغلوبیت قبول کر لی۔

دوسری بات مصنف نے یہ کہی ہے کہ 'الدین' سے مراد یہاں صرف اس وقت کے اور اس خطے کے ادیان ہیں نہ کہ ساری دنیا اور سارے زمانوں کے ادیان۔ سوال یہ ہے کہ 'الدین' کے مفہوم کی اس تحدید کے لیے دلیل کیا ہے ؟ 'لیظھرہ علی الدین کلہ' کے الفاظ میں جو عموم موجود ہے، آخر بغیر کسی قرینے اور جواز کے کس طرح اس کی تخصیص کا دعویٰ قبول کر لیا جائے۔ فاضل مؤلف کا یہ بھی کہنا ہے کہ 'ولو کرہ المشرکون' میں اہلِ کتاب شامل نہیں ہیں، کیونکہ اہلِ کتاب مشرکوں سے الگ ہیں۔ اس سے پیشتر جو مواد ہم پیش کر چکے ہیں، اس سے واضح ہے کہ قرآن و سنت کے نزدیک، اہلِ کتاب بھی کفار و مشرکین میں شامل ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس فرق کی بنیاد پر کہ عام مشرکین و کفار کسی الہامی دین کے سرے سے قائل نہیں اور اہلِ کتاب سابقہ نسخ شدہ سماوی ادیان کے ماننے والے ہیں، مسلمانوں کو ان کے ساتھ برتاؤ میں فرق کرنے کا حکم دیا ہے، مثلاً کتابیات کے ساتھ نکاح اور ان کے ذبیحے کی بعض شروط کے ساتھ اجازت دی ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کافر اور مشرک نہیں ہیں۔ قرآن نے یہودیوں کے خلاف جو تفصیلی چارج شیٹ بیان کی ہے، انھیں امامت سے جس طرح معزول کیا ہے، نصاریٰ کی تثلیث کا جس طرح ذکر کیا ہے اور آخرت میں نجات سے ان دونوں گروہوں کی محرومی کا جس طرح واضح اعلان کیا ہے، اس کے بعد اس امر میں شک کی گنجایش رہ جاتی ہے کہ یہ دونوں گروہ بھی اصلاً، کفار و مشرکین ہی کے زمرے میں شامل ہیں۔ ملاحظہ ہوں، چند آیاتِ قرآنی:

اہل کتاب پکے کافر ہیں اور انھیں عذاب ہوگا

إن الذين يكفرون بالله و
رسله ويريدون أن يفرقوا
بين الله ورسله ويقولون نؤمن
ببعض ونكفر ببعض ويريدون
أن يتخذوا بين ذلك سبيلا. أولئك
هم الكافرون حقا، وأعتدنا للكافرين
عذابا مهينا.

(النساء: ۱۵۰-۱۵۱)

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں، اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہ مانیں گے اور کفر و ایمان کے بیچ میں ایک راہ نکالنے کا ارادہ کرتے ہیں، وہ سب پکے کافر ہیں اور ایسے کافروں کے لیے ہم نے رسوا کن سزا مہیا کر رکھی ہے۔"

عیسائی مشرک اور کافر ہیں

لقد كفر الذين قالوا إن الله هو
المسيح ابن مريم وقال المسيح يا
بني إسرائيل اعبدوا الله ربي وربكم،
إنه من يشرك بالله فقد حرم
الله عليه الجنة ومأواه النار،
وما للظالمين من أنصار.
لقد كفر الذين قالوا إن
الله ثالث ثلاثة وما من
إله إلا إله واحد، وإن لم
ينتهوا عما يقولون ليمسن
الذين كفروا منهم عذاب
أليم.

(المائدہ ۵: ۷۲-۷۳)

"یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنھوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے، حالانکہ مسیح (علیہ السلام) نے کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل! اللہ کی بندگی کرو، جو میرا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی۔ جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرایا، اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ یقیناً، کفر کیا ان لوگوں نے، جنھوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے، حالانکہ ایک الٰہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور اگر یہ لوگ اپنی ان باتوں سے باز نہ آئے تو ان میں سے جس جس نے کفر کیا ہے، اس کو دردناک سزا دی جائے گی۔"

قرآن کے منکر کافر ہیں

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ، فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ، وَمِنْ هٰۤؤُلَاۤءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ. وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ.

(العنکبوت ۲۹ : ۴۷)

"اور ہم نے اسی طرح تمھاری طرف کتاب نازل کی ہے، اس لیے وہ لوگ جن کو ہم نے پہلے کتاب دی تھی، وہ اس پر ایمان لاتے ہیں اور ان لوگوں میں سے بھی بہت سے اس پر ایمان لا رہے ہیں اور ہماری آیات کا انکار صرف کافر ہی کرتے ہیں۔"

اہل کتاب کافر ہیں

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا، فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ.

(البقرہ ۲ : ۸۹)

"اور جب آئی ان کے پاس ایک کتاب اللہ کے پاس سے، مطابق ان پیش گوئیوں کے جو ان کے ہاں موجود ہیں، اور وہ پہلے سے کافروں کے مقابلے میں فتح کی دعائیں مانگ رہے تھے، تو جب آئی ان کے پاس وہ چیز جس کو وہ جانے پہچانے ہوئے تھے تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا، پس ان منکروں پر اللہ کی پھٹکار ہے۔"

مصنف آیت قرآنی 'وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَاۤفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا'[1] کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس آیت سے تو صرف یہ پتا چلتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکاروں کا دین بھی ایک عالمی دین ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا کہ دوسرے ادیان کو ختم اور مغلوب کر کے صرف اسلام کو باقی رہنا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس آیت میں صرف اسلام کے عالمی دین ہونے کا اعلان کیا گیا ہے، لیکن قرآن جیسی کتاب کے ساتھ، جو مروجہ تصنیفی ترتیب نہیں رکھتی، یہ بڑی زیادتی ہے کہ اس کی

---

[1] سبا ۳۴ : ۲۸ (اور ہم نے (اے پیغمبر) آپ کو بھیجا تمام لوگوں کے لیے بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر)

ایک آیت کہیں سے لے لی جائے اور اس موضوع سے متعلق دوسری آیات کو نظر انداز کرتے ہوئے، اس کے من پسند معنی اختیار کر لیے جائیں۔ اب اسی آیت کو اگر مندرجہ ذیل آیاتِ قرآنی سے ملا کر پڑھا جائے تو بات واضح ہو جائے گی کہ مسلمان ایک مشنری امت ہیں اور ساری دنیا تک دعوت پہنچانے اور اسے غالب کرنے کے مکلف ہیں:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَوْ آمَنَ اَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ، مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُوْنَ۔ (آلِ عمران ۳: ۱۱۰)

"تم بہترین امت ہو، لوگوں کی رہنمائی کے لیے مبعوث کیے گئے ہو، معروف کا حکم دیتے ہو، منکر سے روکتے ہو، اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو، اور اگر اہلِ کتاب بھی ایمان لاتے تو ان کے لیے یہ بہتر ہوتا۔ ان میں سے کچھ تو مومن ہیں اور اکثر نافرمان ہیں۔"

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا... (البقرہ ۲: ۱۴۳)

"اور اس طرح ہم نے تمھیں ایک امتِ وسط بنایا ہے، تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے۔"

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ۔ (التوبہ ۹: ۲۹)

"جنگ کرو ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روزِ آخر پر ایمان نہیں لاتے، اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے، اور دینِ حق کو اپنا دین نہیں بناتے، یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔"

ان سب آیات کو اگر ملا کر پڑھا جائے، تو واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام نہ صرف قوت و ریاست کا متمنی ہے، بلکہ وہ عالمی غلبے کا نقیب بھی ہے۔ وہ صرف اپنے نقطۂ نظر کو ٹھیک سمجھتا ہے اور باقی نقطہ ہائے نظر کو دلیل و برہان سے "علی الاعلان" غلط قرار دیتا ہے۔ وہ لوگوں کو زبردستی یہ دین قبول کرنے پر مجبور تو نہیں کرتا، لیکن یہ ضرور کہتا ہے کہ غالب ہونے اور رہنے کا حق صرف اللہ کے کلمے ہی کو ہے۔ وہ غیر مسلموں کو (خواہ وہ اہلِ کتاب ہوں یا کفار و مشرکین) یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ اس کے راستے میں دیوار کھڑی کریں اور قوت سے ایسا ماحول پیدا کیے رکھیں جس میں لوگوں کے لیے اس حیات بخش الٰہی پیغام کو سمجھنا اور قبول کرنا ممکن نہ رہے۔

فاضل مصنف نے سورۂ مائدہ کی آیت "اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالصَّابِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ"[1] سے بھی استشہاد کیا ہے کہ کسی خاص نبوت پر ایمان لانا ضروری نہیں، بلکہ جو بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے، اور نیک اعمال کرے، وہ نجات پائے گا۔

اس آیت کا مفہوم بھی، فاضل مؤلف نے سیاق و سباق سے ہٹ کر کیا ہے، ورنہ اگر وہ آیت سے پہلے اور بعد کی آیات دیکھ لیتے، تو انھیں پتہ چل جاتا کہ مذکورہ آیت میں یہ بات سرے سے زیر بحث ہی نہیں ہے کہ کن کن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے، اور کون کون سی چیزیں باعث نجات ہیں۔ اس سے پہلے کی آیت ملاحظہ ہو:

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۔ (المائدہ ۵: ۶۸)	"کہو، اے اہل کتاب، تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو، جب تک کہ تورات و انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو، جو تمھاری طرف تمھارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہیں۔ ضرور ہے کہ یہ فرمان جو تم پر نازل کیا گیا ہے، ان میں سے اکثر کی سرکشی اور انکار کو اور زیادہ بڑھا دے گا، مگر انکار کرنے والوں کے حال پر کچھ افسوس نہ کرو۔"

یہاں 'مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ' سے مراد، چونکہ قرآن مجید ہے، لہٰذا اہل کتاب سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تمھاری کوئی بنیاد نہیں ہے، جب تک تورات، انجیل اور قرآن پر ایمان نہ لاؤ اور چونکہ تورات و انجیل میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد اور آپ پر ایمان لانے کی تاکید موجود تھی، لہٰذا خود تورات و انجیل پر بھی، اس وقت تک ایمان لانا بے معنی ہو جاتا ہے، جب تک قرآن پر ایمان نہ لایا جاتے اور قرآن پر ایمان لانے کے کوئی معنی نہیں، جب تک صاحب قرآن (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان نہ لایا جاتے۔

پھر یہ بات بھی لائق غور ہے کہ تقریباً، انھی الفاظ میں، یہ آیت اس سے پہلے، سورۂ بقرہ (آیت ۶۲) میں آچکی ہے۔ وہاں بھی اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ کن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے اور کن

---

[1] ۵: ۶۹ (مسلمان ہوں یا یہودی، صابی ہوں یا عیسائی، جو بھی اللہ اور روز آخر پر ایمان لاتے گا اور نیک عمل کرے گا، بے شک اس کے لیے نہ کسی خوف کا مقام ہے اور نہ رنج کا۔)

پر ایمان لانا باعثِ نجات ہے، کیونکہ وہاں کا سلسلۂ کلام جن الفاظ سے شروع ہوتا ہے، وہ یہ ہیں:

يٰبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۔ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۖ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ۔ (البقرہ ۲: ۴۰-۴۱)

"اے بنی اسرائیل، ذرا خیال کرو، میری اس نعمت کا جو میں نے تم کو عطا کی تھی۔ میرے ساتھ تمھارا جو عہد تھا، اسے تم پورا کرو تو میرا جو عہد تمھارے ساتھ تھا، اسے میں پورا کروں اور مجھ ہی سے تم ڈرو۔ اور میں نے جو کتاب بھیجی ہے اس پر ایمان لاؤ جو تمھارے پاس موجود کتاب کی تائید کرتی ہے لہٰذا سب سے پہلے تم ہی اس کے منکر نہ بن جاؤ۔ تھوڑی قیمت پر میری آیات کو نہ بیچ ڈالو اور میرے غضب سے بچو۔"

اس آیت سے بالکل واضح ہے کہ یہاں بنی اسرائیل کو قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے اور اس سے انکار کو صریح کفر قرار دیا گیا ہے، لہٰذا ان آیات سے یہ مفہوم ہرگز نہیں نکالا جا سکتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے، یا یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے بغیر نجات ممکن ہے۔ دراصل، جو بات یہاں کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ نجات کا دارومدار کسی دینی گروہ سے وابستگی پر نہیں، بلکہ ایمان اور عمل صالح پر ہے، اور اس کے مخاطب بھی، دراصل، یہودی ہی ہیں، جن کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ اللہ کی محبوب قوم ہیں اور سیدھے جنت میں جائیں گے۔ قرآن نے کہا کہ کوئی آدمی یہودی، عیسائی یا مسلمان ہونے کی وجہ سے نہیں بخشا جائے گا، بلکہ ایمان اور عملِ صالح ہی ہر آدمی کے کام آئیں گے۔ یہاں، ظاہر ہے، نہ رسالت کے ذکر کا کوئی موقع ہے نہ فائدہ۔ مسلمانوں کو دیگر گروہوں میں اس لیے شامل کیا گیا کہ اس کا اطلاق ان پر بھی ہوتا ہے۔

۵۔ اسلام کے واحد و صادق عالمگیر دین ہونے کے خلاف مصنف نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ یہ انصاف نہ ہوتا، اگر اللہ تعالیٰ اتنی مختلف اور وسیع دنیا کے لیے ایک ہی پیغام بھیجتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مختلف زمانوں میں مختلف قوموں اور ملتوں کے لیے مختلف انبیا و رسل اور ان کے ذریعے مختلف شریعتیں بھجواتا رہا ہے، ورنہ اگر وہ چاہتا تو سب لوگوں کے پاس ایک ہی نبی اور ایک ہی شریعت بھجوا دیتا، لیکن یہ اس کی حکمت کے خلاف ہوتا۔

اس میں شک نہیں کہ پہلے انبیا کے بارے میں یہ نقطۂ نظر صحیح ہے، لیکن ختم الرسل حضرت

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کے بعد یہ صورتِ حال بدل گئی اور اب اس کے بعد بھی یہ رائے رکھنا نہ صرف غلط ہے، بلکہ ایک مسلمان کے لیے نقیضِ ایمان بھی ہے' کیونکہ اس سے اسلام اور قرآن کے تین بنیادی عقائد کی نفی ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری رسول ہیں، ان کے بعد کوئی وحی اور کوئی نیا پیغام نہیں آئے گا، دوسرے یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کا پیغام قیامت تک آنے والے سارے زمانوں اور ملتوں کے لیے ہے' اور تیسرے یہ کہ شریعتِ محمدی اتنی اکمل واشمل ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے اب کسی نئے نبی اور کسی نئے پیغام کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ثانی الذکر دونوں باتیں بھی، دیکھا جائے تو ایک لحاظ سے تصورِ ختمِ نبوت ہی کا نتیجہ اور تقاضا ہیں اور عقیدۂ ختمِ نبوت کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر کہ امتِ مسلمہ کی وحدت اور اسلام کی بقا کا انحصار اب اسی عقیدے پر ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق نے سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے ساتھ مل کر منکرینِ ختمِ نبوت کے خلاف (ان کو غیر مسلم سمجھتے ہوئے) تلوار اٹھائی اور ان کا قلع قمع کیا، اور آج چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی عصرِ جدید کی ایک مسلم ریاست پاکستان کی پارلیمنٹ نے ان لوگوں کو جو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو آخری نبی نہیں سمجھتے، مسلمانوں سے الگ ایک غیر مسلم گروہ قرار دیا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خاتم النبیین ہونے' سارے عالم کے لیے پیغمبر ہونے اور آپ کی شریعت کے کمال وشمول کے نقلی اور عقلی دلائل بہت زیادہ ہیں اور وہ متداول ومعروف بھی ہیں' لہٰذا ان سب کا دوہرانا ہم غیر ضروری سمجھتے ہیں' تاہم فاضل مصنف اور ان کے ہم نواؤں سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ یہ عقائد انھیں محالِ عقلی کیوں نظر آتے ہیں ؟ جب سب لوگوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور ان کے حال ومستقبل کی تمدنی ترقیاں اور تہذیبی ضرورتیں سب اس کے علم میں ہیں' اور اپنے اس علم کی بنیاد پر، جب اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب سلسلۂ نبوت کو مزید جاری رکھنے کی ضرورت نہیں۔ اور جب کوئی نیا نبی نہیں آئے گا، تو ظاہر ہے کہ آخری نبی کا پیغام ہی سب لوگوں تک پہنچایا جائے گا اور اس نبی کے ماننے والے ہی پہنچائیں گے اور جب یہ دین محض، اخلاقی تعلیمات پر مبنی نہیں، بلکہ مکمل نظامِ زندگی ہے اور یہ ریاست وحکومت ہی کے ذریعے سے مکمل طور پر قائم ہو سکتا ہے' تو اس آخری نبی کی امت کی یہ ذمہ داری بھی ہونی چاہیے کہ وہ اسے ریاست وحکومت کی صورت میں غالب بھی کرے۔ اور جب اس شریعت کے ہمیشہ کے لیے قابلِ عمل رہنے کا جواز بھی سمجھ میں آتا ہے کہ ساری اصولی رہنمائی اور بنیادی قسم کی تفصیلات قرآن وسنت میں بیان کر دی گئی ہیں اور

مزید جن تفصیلات میں اسلامی رہنمائی کی ضرورت محسوس ہو سکتی ہے، ان کے لیے اجتہاد کا ایک مستقل ادارہ قائم کر دیا گیا ہے، تو کیا وجہ ہے کہ ختم نبوت کا یہ سارا انسٹی ٹیوشن فاضل مصنف اور ان کے ہم نواؤں کی سمجھ میں نہیں آتا اور وہ اسے خلاف عقل و حکمت سمجھتے ہیں۔

مذکورہ مضمون کے مندرجات سے محسوس ہوتا ہے کہ مصنف کو یہ باتیں سمجھنے میں اشکال دو وجوہ سے پیش آیا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس وقت دنیا کی آبادی کی اکثریت غیر مسلم (عیسائی) ہے۔ ان کو یہ سمجھنے میں دقت پیش آتی ہے کہ آخر دنیا کی اتنی عظیم اکثریت گمراہ کیسے ہو سکتی ہے، جب کہ وہ ایک آسمانی اور الہامی دین کی پیروی بھی کرتی ہے۔ وہ سوچتے ہیں کہ آخر اللہ تعالیٰ کو (نعوذ باللہ) اتنے بہت سے آدمیوں کو گمراہ کرنے اور رکھنے میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟

مصنف کا یہ اشکال رفع ہو جاتا، اگر وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت دینے کی سنت کو سمجھنے کے لیے قرآن کی طرف رجوع کرتے۔ قرآن سے ہمیں اس بارے میں جو رہنمائی ملتی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نیکی کا اچھا ہونا اور معصیت کا برا ہونا انسان کی فطرت میں رکھ دیا ہے۔ وہ اگر قلب سلیم رکھتا ہو، تو لامحالہ نیکی اور خیر کے رستے ہی پر چلے۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے انسان کے ساتھ مہربانی کرتے ہوئے اس کی مزید رہنمائی کا انتظام فرما دیا اور بعض منتخب انسانوں کے ذریعے سے براہ راست پیغام ہدایت بھجوا کر لوگوں کو بتایا اور رسولوں کو عملی نمونہ بنا کر لوگوں پر واضح کر دیا کہ سیدھا راستہ کیا ہے اور اس پر کیسے چلنا ہے۔ اس اتمام حجت کے بعد وہ لوگوں کو زبردستی ہدایت نہیں دیتا اور نہ اس کی پروا کرتا ہے کہ کون اور کتنے لوگ اس ہدایت کو قبول کرتے ہیں اور کتنے رد کرتے ہیں۔ سب لوگ بھی، اگر اس کی بھیجی ہوئی ہدایت کا انکار کر دیں، تو بھی اس کی بادشاہی میں کسی کمی کا سبب نہیں بنتے، ہاں، اگر وہ بستہ ہی سرکشی پر اتر آئیں، اور دنیا کو اپنے فتنہ و فساد سے مہذب انسانوں کی رہایش کے قابل جگہ نہ رہنے دیں، تو اس کا عذاب کا کوڑا حرکت میں آتا ہے، ورنہ اس کا مستقل اصول یہی ہے کہ دنیا کی زندگی میں جو لوگ اس کی ہدایت پر عمل نہیں کریں گے، انھیں آخرت میں سزا دی جائے گی اور جو لوگ اس کی ہدایت پر عمل کریں گے، انھیں آخرت میں اچھا اجر دیا جائے گا۔[1]

قرآن کا یہ فلسفۂ ہدایت و گمراہی، اگر کسی کے ذہن میں ہو، تو پھر اسے یہ سوال پریشان نہیں کرتا کہ لوگوں کی اکثریت غیر مسلم یا بے دین کیوں ہے؟ قرآن کی رو سے، اگر لوگوں کی اکثریت گمراہ

---

[1] النساء ۴: ۹۳، الکہف ۱۸: ۵۹، ۱۰۶، ۱۰۷، القصص ۲۸: ۴۷، الفجر ۸۹: ۱۱-۱۴ اور الشمس ۹۱: ۸۔

ہوتی ہے، تو ہوتی رہے، بلکہ قرآن سے تو یہ پتا چلتا ہے کہ اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہوتی ہے[1] دراصل یہ اللہ کے لیے اہم نہیں ہے کہ کون ایمان لاتا ہے اور کون نہیں، بلکہ یہ انسانوں کا دردِ سر ہے۔ انھیں یہ سوچنا چاہیے کہ اگر وہ اللہ کو مان کر اس کے احکام کے مطابق زندگی بسر کریں گے، تو اس دنیا میں بھی کامیاب ہوں گے اور آخرت میں بھی، اور اگر اس کی ہدایت سے منہ موڑا تو اس دنیا کی چند روزہ زندگی تو جیسے تیسے گزر جائے گی، لیکن آخرت کی ہمیشہ کی زندگی برباد ہو جائے گی[2]

اشکال کی دوسری وجہ جس کا ذکر مصنف نے اگرچہ صراحتہً نہیں کیا، لیکن جو پس منظر میں نمایاں محسوس ہوتی ہے، وہ مصنف اور ان جیسی سوچ رکھنے والے لوگوں کا یہ احساس ہے کہ یہ اکثریت جسے ہم مسلمان گمراہ اور کافر و بے دین کہتے ہیں، دنیا میں اس وقت معزز اور غالب ہے، اور وہ مسلمان جو خود کو واحد سچے دین کا پیرو کہتے ہیں، وہ دنیا میں کم بھی ہیں اور کمزور و بے وقار بھی، بلکہ ہر کہیں ذلیل و رسوا ہو رہے ہیں۔ ان حالات میں، مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ حق ان کے دین میں منحصر ہے، کہیں بلا جواز تو نہیں ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ جنھیں وہ، خواہ مخواہ، اہلِ باطل کہہ رہے ہیں، وہ بھی حق ہی پر ہوں اور ان کا اپنا موقف محض تعصب اور تنگ نظری پر مبنی ہو۔

یہ احساس، دراصل، مغرب کے مادی غلبے سے مرعوبیت کا احساس ہے، اور اس کا سبب اس حقیقت سے غافل ہو جانا ہے کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب اسلام نہیں، بلکہ ترکِ اسلام ہے، اور مغرب کی مادی ترقی کا سبب ان کے دینی، اخلاقی اور روحانی اصولوں کی برتری اور ان پر عمل نہیں، بلکہ اس کے برعکس دنیا میں ترقی اور غلبے کے ان عمومی انسانی اصولوں پر ہے جو مسلم و غیر مسلم سب کے لیے یکساں ہیں، جیسے علوم و فنون میں سبقت، محنت، وقت کی پابندی، اعلیٰ قیادت، اتحاد، تسخیرِ کائنات کی جد و جہد، سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی وغیرہ۔ اہلِ مغرب نے ان اصولوں پر عمل کیا اور اپنے آپ کو اہلِ ارض کے لیے نافع ثابت کیا تو غلط مذہب پر ہونے اور ترکِ مذہب کے باوجود اللہ نے ایک مدتِ مقررہ کے لیے دنیا کے اندر ڈھیل دے رکھی ہے، لیکن بالآخر ان کے لیے دنیا میں

---

[1] "وقلیل من عبادی الشکور" السبا ۳۴: ۱۳۔ "وان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللہ" الانعام ۶: ۱۱۶۔

[2] اس سارے پروسس کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل قرآنی آیات ملاحظہ ہوں:

آلِ عمران ۳: ۱۳۹، ۱۹۵۔ النساء ۴: ۱۴۰۔ الکہف ۱۸: ۱۰۷۔ العنکبوت ۲۹: ۶۴۔ الملک ۶۷: ۲

بھی خسران ہے اور آخرت میں بھی۔ مسلمان بحیثیت مجموعی اپنے دین پر عمل پیرا نہیں، جس کے نتیجے میں وہ دنیا میں ذلیل و رسوا ہو رہے ہیں، لیکن، انفرادی طور پر، اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے والے مسلمان، ان شاء اللہ آخرت میں اللہ کی خوشنودی اور نعمتوں سے فیض یاب ہوں گے اور اگر سب مسلمان مل کر اس دنیا میں بھی اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے لگیں، تو وہ دنیا میں بھی کامیاب و کامران ہوں گے، لہٰذا اس دنیوی ترقی کا حق و باطل سے کوئی تعلق نہیں۔

۶۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں صوفیا کے ایک بڑے حلقے میں رواداری کا ایک غلط تصور موجود رہا ہے اور فاضل مصنف بھی اسی کا شکار معلوم ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام رواداری کا علم بردار ہے۔ وہ دوسروں کو ایذا دہی یا ان پر سختی و جبر کا قائل نہیں، بلکہ اس کے برعکس وہ شرفِ انسانیت اور اکرامِ آدمیت کا داعی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے پیرو کاروں کو اس امر کی تلقین بھی کرتا ہے کہ 'جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ'[1]

یعنی گفتگو اور بحث مباحثے میں فریقِ مخالف کے ساتھ شائستگی اور متانت کا ثبوت دیا جائے۔ حکمت و محبت اور دردمندی کے ساتھ دعوت دینے کے بارے میں بھی قرآن و سنت میں صریح احکام موجود ہیں۔ جو مسلمان عالم اور مبلغ ان پر عمل نہیں کرتے، وہ قصور وار ہیں اور اگر صوفیا نے، اس بارے میں، اسلام کی تعلیمات پر عمل کیا ہے، تو وہ قابلِ تعریف ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس بارے میں مبالغے اور غلو سے اس طرح کام لیا جائے کہ اپنے اصولوں کی بنیادیں بھی لرزتی محسوس ہونے لگیں، اور حقیقت یہ ہے کہ ہمارے صوفیا نے اکثر، اس معاملے میں، غلو سے کام لیا ہے، جس کی جھلک ہمارے شعرا کے ہاں بھی نظر آتی ہے، مثلاً غالب کہتا ہے ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

اور ایک پنجابی شاعر کہتا ہے ؎

مسجد ڈھا دے، مندر ڈھا دے، ڈھا دے جو کچھ ڈھیندا
اک کسے دا دل نہ ڈھاویں، رب دلاں وچ رہندا

یعنی "مسجد توڑ دو، مندر گرا دو اور جو چاہے توڑ پھینکو، لیکن کسی کا دل مت توڑنا کہ دلوں میں تو

---

[1] النحل ۱۶: ۱۲۵ (ان کے ساتھ اس طریقے سے بحث کرو جو پسندیدہ ہے)۔

رب رہتا ہے: زیر نظر مضمون کا مؤلف بھی مسلمانوں کو رواداری کی تلقین کرتا ہے اور اس رواداری کا تقاضا اس کے نزدیک یہ ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ اہل کتاب کو بھی اپنی طرح برسر حق جانیں اور انھیں گمراہ اور دوزخی نہ کہیں۔ ہم بھی رواداری کے حق میں ہیں اور، الحمد للہ اہل کتاب یا کسی دیگر شرکیہ مذہب کے خلاف کوئی تعصب یا نفرت ہمارے دل میں نہیں، لیکن رواداری کا جو مفہوم فاضل مصنف نے بیان کیا ہے وہ چونکہ صریحاً قرآن و سنت کی تعلیمات کے خلاف ہے لہٰذا اس کی تائید نہیں کی جا سکتی۔

۷۔ آخری بات جو ہمیں اس موضوع کے حوالے سے کہنی ہے، وہ یہ ہے کہ قرآن، بلاشبہ گنجینۂ معانی ہے، یقیناً اس کے عجائبات کبھی ختم نہ ہوں گے اور ہر دور کے غواص اس سمندر سے کچھ نہ کچھ نئے موتی نکال لاتے رہیں گے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ سیاق و سباق سے ہٹ کر قرآن کی ایسی تفسیر کی جائے جو تحریف کے درجے کو پہنچ جائے، جو عربی زبان و ادب کے قواعد کے خلاف ہو، وہ ایسی نئی بات ہو جو احادیث کے خلاف ہو یا صحابہ و مفسرین کی اجماعی رائے کی نقیض ہو۔ بلاشبہ ہر عہد کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں، ہمارے عہد کے بھی کچھ تقاضے ہیں اور قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے عصری تقاضوں کو پیش نظر رکھنے کا مطالبہ کرنا کوئی عیب کی بات بھی نہیں، لیکن ہر غیر متعصب آدمی تسلیم کرے گا کہ اس کار خیر کی کچھ حدود تسلیم کرنی ہوں گی (جن کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے) ورنہ ہر مسلمان اپنی ذاتی رائے اور میلانات کے مطابق اگر قرآن کی تفسیر کرنے لگے تو یہ خود قرآن کے ساتھ ظلم ہوگا اور بقول اقبال ؂

احکام ترے حق ہیں، مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

۸۔ ہماری گزارشات کا ماحصل یہ ہے کہ اخروی نجات کے لیے شریعت محمدی پر ایمان شرط ہے اور یہ نقطۂ نظر صحیح نہیں ہے کہ اہل کتاب بھی حق پر ہیں اور مسلمان بھی اور جو کوئی جس دین پر رہتے ہوئے اچھے اعمال کرے گا وہ اللہ کے ہاں اچھا اجر پائے گا، بلکہ اچھے اعمال کا اجر صرف انھی کے لیے ہے جو بنیادی طور پر اطاعت کا رویہ رکھتے ہوں۔ رہے وہ لوگ جو اطاعت کا رویہ رکھنے کی بجائے کفر اور بغاوت کا رویہ اختیار کریں، اللہ کے فرستادہ کسی نبی کو مانیں اور کسی کو نہ مانیں اور اس معاملے میں، اللہ کی مرضی کی بجائے اپنی مرضی چلائیں، اپنے دنیوی مفادات کے مطابق فیصلے کریں، تو ایسے لوگ اللہ کے غضب کے مستحق ہیں۔ وہ اگر کوئی چھوٹا موٹا اچھا کام بھی کریں گے تو بغاوت کے اس بنیادی رویے کی وجہ سے اپنے آپ کو اللہ کے انعام و اکرام کا مستحق ثابت نہیں کر سکیں گے۔ یہی قرآن و سنت کا فیصلہ ہے اور یہی عقل کا تقاضا بھی۔

خورشید احمد ندیم

مذہبی جرائد اور اشاعتِ دین

اس ملک میں شائع ہونے والے دینی اخبارات و جرائد کی تعداد، بلامبالغہ سینکڑوں میں ہے۔ قریباً ہر بستی اور شہر سے ان گنت رسائل چھپتے ہیں، جو مختلف مذہبی مکاتبِ فکر کے ترجمان اور کئی دینی اداروں کے نقیب ہیں۔ بظاہر یہ ایک خوش کن خبر ہے۔ اگر معاشرے میں دین کی تبلیغ و اشاعت کا اس قدر اہتمام ہو تو اس پر ایک صاحبِ ایمان کو مسرت ہی کا اظہار کرنا چاہیے، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ ہمارا سماج بحیثیتِ مجموعی دین سے گریز کی راہ پر گام زن ہے۔ سوسائٹی کے اجتماعی وجود سے، روز بروز، ایسی اقدار کم ہو رہی ہیں، دین جنھیں موجود دیکھنا چاہتا ہے اور ایسے طور طریقے در آرہے ہیں جو ہماری روایات سے متصادم اور ہماری تاریخ کے لیے اجنبی ہیں۔ جو لوگ دین کی طرف رغبت رکھتے ہیں اور دیانت داری سے اس پر عمل پیرا ہونا چاہتے ہیں، وہ بھی فرقہ وارانہ تنازعات میں کچھ اس طرح اُلجھے ہیں کہ کسی فرع میں اختلاف کو بھی کفر سے کم جرم نہیں سمجھتے۔ معاشرے میں دین کی اس غربت کو دیکھتے ہوئے کیا یہ مان لیا جائے کہ یہ اشاعتی و تدریسی سرگرمیاں لاحاصل ہیں؟

ہم سمجھتے ہیں کہ اس سوال کا جواب اثبات میں نہیں ہے۔ دین کی اشاعت کے نام سے ہونے والی یہ کاوشیں، یقیناً، نتیجہ خیز ہیں۔ یہ جرائد جس دین کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں، وہ فی الواقع، معاشرے میں دکھائی دیتا ہے۔ اور آج مذہب کے نام پر جو عجمی تخیلات مقبول ہو رہے ہیں اور جو فرقہ وارانہ کشیدگی یہاں پر مسلط ہے، اس میں جرائد کا کردار بنیادی ہے۔ یہ بات، بظاہر عجیب دکھائی دیتی ہے، لیکن ایک سوچنے سمجھنے والا فرد، جب بھی ان رسائل کے مندرجات کا مطالعہ کرتا ہے، تو اس پر یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے اور وہ اسی نتیجے تک پہنچتا ہے جس کا ہم نے تذکرہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر، یہ اقتباس دیکھیے:

"حضرت مخدوم سمنانی قدس سرہ جب ایک گاؤں سکندرپور میں تشریف لے گئے، تو ہزاروں

لوگ آپ کی زیارت کے لیے آتے۔ اسی دوران میں ایک بوڑھی عورت اپنے جاں بلب بیٹے کو لے کے خدمتِ عالی میں حاضر ہوئی اور عرض کی: حضور یہ میرا ایک ہی بیٹا ہے' بہت سی خوبیوں کا مالک ہے۔ اس کے سوا میرا کوئی نہیں ہے اور اب یہ موت اور زندگی کی کشمکش میں ہے۔ دعا فرمایئے کہ یہ ٹھیک ہو جائے۔ آپ نے کچھ توقف فرمایا، اور پھر اس سے فرمایا کہ اے مادرِ مہربان' ہم نے لوحِ محفوظ میں دیکھا ہے کہ تیرے بیٹے کی عمر ختم ہو چکی ہے۔ اس نے کہا: حضور اگر یہ زندہ ہو جائے تو ٹھیک ہے' ورنہ میں بھی اس کے ساتھ یہیں جان دے دوں گی۔ حضرت نے جب یہ سنا تو فرمایا: مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک سو بیس سال کی عمر دی ہے۔ اب ہم اپنی عمر میں سے دس سال تیرے اس فرزند کو دیتے ہیں۔ جا تیرا بیٹا دس سال تک زندہ رہے گا۔ پھر فرمایا: آج کی تاریخ لکھ لے جب دس سال پورے ہو جائیں گے' یہ دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آپ نے جو کچھ فرمایا تھا، درست ہوا۔ حضرت مخدوم سمنانی قدس سرہ کی اس کرامت سے ہمیں کئی باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ اولیا اللہ کو اپنی عمر زندگی کا علم ہوتا ہے کہ ان کی عمر کتنی ہے۔ آج کسی کو نہیں معلوم کہ اس کی زندگی کتنی ہے یعنی اس کے دنیا سے جانے میں کتنے سال باقی ہیں لیکن اولیائے کرام کی یہ شان ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اس کے عطا کردہ علم سے یہ جانتے ہیں کہ ان کی عمر کتنی ہے یعنی کتنی باقی ہے اور یہی نہیں' بلکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں یہ اختیار دیا ہے کہ اگر وہ اپنی مرضی سے کسی کو اپنی عمر میں سے چند سال دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں۔"

(ماہنامہ "الاشرف" کراچی۔ جولائی ۱۹۹۳ء)

اسی طرح ایک واقعہ ماہنامہ "جہانِ رضا" لاہور کے شمارہ نمبر ۲۴، ۲۵، جلد ۲، بابت ماہ جون، جولائی ۹۳ء میں نقل ہوا ہے' وہ بھی پڑھ لیجیے:

"حضرت مدنی فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھ پر فالج کا شدید حملہ ہوا۔ اس کی وجہ سے میرا آدھا جسم بالکل بے کار ہو گیا۔ سب لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ اب ان کا آخری وقت آن پہنچا۔ ان دنوں میں اپنے پرانے مکان میں جو باب السلام کی طرف تھا، اوپر والی منزل میں رہتا تھا۔ ایک شب میں نے رو رو کر بارگاہِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں عرض کیا: یارسول اللہ' مجھے میرے پیر و مرشد نے آپ کی بارگاہ میں خادم بنا کر بھیجا ہے۔ میرے آقا اگر مجھ سے غلطی ہوئی ہے' تو میرے پیر و مرشد کے صدقے مجھے معاف فرما دیں اور اپنے روضۂ اقدس کی خدمت کا شرف عطا فرمائیں۔ اسی طرح میں نے خواجہ غوث الثقلین رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں عرض کیا۔ رات کو جب سویا تو خواب

میں دیکھا کہ تین بزرگ نورانی چہروں والے تشریف لائے۔ ان میں ایک حضرت غوث پاک، دوسرے حضرت خواجہ غریب نواز اور تیسرے اعلیٰ حضرت تھے۔ اعلیٰ حضرت نے فرمایا: ضیاالدین آج تم نے ایسی درخواست کی ہے کہ غوث پاک رحمہ اللہ تشریف لائے اور دوسرے بزرگ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا، یہ حضرت سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ حضور غوث اعظم رضی اللہ عنہ نے میرے جسم پر دست مبارک پھیرا اور فرمایا کہ اٹھو، میں خواب ہی میں کھڑا ہوا تو یہ تینوں بزرگ نماز پڑھنے لگے۔ میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے جسم میں کچھ حرکت محسوس کی۔ میں کوشش کر کے بیٹھ گیا۔ پھر آہستہ آہستہ کھڑا ہو گیا اور ایک لکڑی کا سہارا لے کر کمرے کا آہستہ آہستہ چکر لگایا۔ نیچے بچوں نے محسوس کیا کہ اوپر چلنے کی آواز آ رہی ہے۔ تمام فوراً اوپر آئے اور مجھے دیکھ کر انتہائی خوش ہوئے۔ میں نے فوراً کہا کہ پہلے یہاں سامنے کے فرش پر لوہے کی الماری لا کر رکھو، کیونکہ یہاں ابھی حضور غوث پاک، حضور غریب نواز اور اعلیٰ حضرت قبلہ نے نماز پڑھی ہے۔"

مولانا محمد زکریا نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات کی حکمتیں بیان کی ہیں۔ وہ ایک جگہ ایک واقعہ اس طرح نقل کرتے ہیں:

"ابن ملجم، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قاتل ایک مرتبہ کسی اپنی حاجت کو لے کر حضرت علی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اس کی حاجت پوری فرما دی اور ارشاد فرمایا کہ یہ میرا قاتل ہے۔ کسی نے عرض کیا کہ اس کو قتل کیوں نہیں کرا دیتے۔ آپ نے فرمایا: پھر مجھے کون قتل کرے گا! ایک روایت میں ہے کہ ابھی اس نے قتل نہیں کیا (تو پھر پہلے سے قصاص کیسے ہو سکتا ہے)۔"

(ماہنامہ "سلوک و احسان" کراچی نومبر ۱۹۹۳ء)

جن جرائد سے یہ اقتباسات نقل کیے گئے ہیں، وہ ہمارے نمایاں مذہبی مکاتب فکر کے ترجمان ہیں۔ جو باتیں ان واقعات میں بیان ہوتی ہیں، وہ پہلی دفعہ نہیں کی جا رہی ہیں، بلکہ ایک مدت سے تواتر کے ساتھ نقل ہوتی رہی ہیں۔ اب جو آدمی کتاب اللہ پر تھوڑی بہت نظر رکھتا ہے، وہ یہ جان کر حیران ہوتا ہے کہ قرآن مجید ان امور پر ایک بالکل مختلف نقطۂ نظر کا حامل ہے۔ مثال کے طور پر، پہلے واقعہ کو لیجیے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اولیا اللہ لوگوں کی اور اپنی عمر اور موت کے بارے میں جانتے ہیں اور انھیں یہ اختیار حاصل ہے کہ کسی کی عمر کم اور کسی کی زیادہ کر دیں۔ قرآن مجید نے اس موضوع پر کئی مقامات پر کلام کیا ہے اور ایک بالکل مختلف بات کہی ہے۔ سورۂ لقمٰن میں ارشاد ہوا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ۚ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ۔ (۳۱: ۳۴)	"بے شک قیامت کا علم اللہ ہی کے پاس ہے۔ وہی بارش برساتا ہے، وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹوں میں کیا پرورش پا رہا ہے۔ کوئی متنفس نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائی کرنے والا ہے اور نہ کسی شخص کو یہ خبر ہے کہ کس سرزمین پر اس کی موت آنی ہے۔ اللہ ہی سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔"

دوسرے واقعہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ "حضرت مدنی" پر فالج کا حملہ ہوا تو انھوں نے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارا۔ پھر خواجہ غوث الثقلین کو۔ نتیجۃً ان کا مرض جاتا رہا یعنی انھیں اللہ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی جبکہ اس باب میں قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم تو خود اپنی ذات ہی کے لیے نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے:

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۚ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔ (الاعراف ۷: ۱۸۸)	"کہہ دو میں اپنی ذات کے لیے کسی نفع و نقصان پر کوئی اختیار نہیں رکھتا، مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو خیر کا بڑا خزانہ جمع کر لیتا اور مجھے کوئی گزند نہ پہنچ پاتا۔ میں تو بس ان لوگوں کے لیے ایک ہوشیار کرنے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں جو ایمان لائیں۔"

تیسرے واقعہ میں حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انھیں یہ غیب کی خبر تھی کہ انھیں کس کے ہاتھوں قتل ہونا ہے۔ اب قرآن مجید کا موقف دیکھیے:

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ۔ (النمل ۲۷: ۶۵)	"ان سے کہو، اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا، اور وہ نہیں جانتے کہ کب وہ اٹھائے جائیں گے۔"

ان جرائد کے مدیران اور ان مضامین کے مصنفین کے بارے میں یہ بات تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ قرآن مجید کی یہ آیات ان کے مطالعہ سے نہیں گزریں۔ سوال یہ ہے کہ قرآن مجید سے متصادم ان تصورات کو دین کے عنوان سے پیش کرنے کا سبب کیا ہے؟ تھوڑا سا تدبر کرنے سے آدمی اس

نتیجے تک پہنچتا ہے کہ اس کی وجہ 'تصوف' ہے۔ تصوف کے نام پر ہمارے ہاں دین کا ایک پورا سلسلہ تشکیل دیا گیا ہے۔ توحید سے لے کر معاد تک، ایک بالکل دوسرا موقف اپنا لیا گیا ہے۔ اسلام اور تصوف میں مطابقت یوں پیدا کی گئی ہے کہ ایک عام دین ہے، جو قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ماخوذ ہے، اس کا تعلق عام آدمی سے ہے۔ اسی طرح ایک خاص دین ہے، جس کا ماخذ قرآن وسنت نہیں، بلکہ کشف والہام ہیں، جو اللہ کے خاص بندوں کے قلوب پر القا ہوتے ہیں۔ اللہ کے ساتھ اس خصوصی تعلق کے سبب سے انھیں کائنات کے نظام میں تصرف کا اختیار دے دیا جاتا ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ 'تفہیمات الٰہیہ' میں لکھتے ہیں:

"اللہ تک پہنچانے والے راستے دو قسم کے ہیں۔ ایک قسم تو وہ ہے جس کی وحی الٰہی اور تعلیمات انبیا نے تلقین فرمائی . . . . . اور دوسری وہ ہے جسے الہام اور معارف اولیا نے متعین کیا ہے۔"

امام غزالی بھی 'احیاء علوم الدین' میں بیان کرتے ہیں:

"بعض علوم پوشیدہ راز کی صورت میں ہوتے ہیں، جنھیں صرف وہ لوگ جانتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتے ہیں۔"

ان کا خیال ہے کہ اس سے مراد علم باطن ہے۔ اولیا اللہ کو جو الہام ہوتا ہے، اس کے بارے میں یہ اہتمام کیا جاتا ہے کہ اس میں غیر اللہ کی طرف سے کوئی آمیزش نہ ہو۔ تصوف کی معروف کتاب 'الرسالۃ القشیریہ' میں درج ہے:

"بندہ جب معرفت کے مقام پر پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ خود اپنی طرف سے اس کے دل میں بات ڈالتا ہے اور اس کے سر کی نگہبانی کرتا رہتا ہے، تاکہ غیر اللہ کی جانب سے اس میں کوئی بات القا نہ ہو۔"

اس الہام کے باعث، ان خاص بندوں پر علم غیب کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ 'انفاس العارفین' میں اپنے چچا ابو الرضا محمد کی وسعت علم کا تذکرہ کرتے ہیں، جو اپنے خادم کو تنبیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"بخدا اگر زمین کے نچلے طبق میں ایک چیونٹی ہو اور اس کے دل میں سو خیال آئیں تو اس کے ننانوے خیالات کو میں جانتا ہوں اور حق تعالیٰ سو کے سو کو جانتا ہے۔"[1]

---

[1] آئمہ تصوف کی کتب کے یہ اقتباسات ڈاکٹر عبید اللہ فراہی کی تصنیف 'تصوف۔ ایک تجزیاتی مطالعہ' سے لیے گئے ہیں۔

اہلِ تصوف کا یہ خیال ہے کہ زمین پر اللہ کے مقرب بندوں کا ایک گروہ ہمیشہ موجود رہتا ہے جن کے ہاتھوں میں عالم کا یہ نظام ہے۔ یہ افراد عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہتے ہیں، اس لیے انھیں 'رجال الغیب'، 'اولیاے مستور' یا 'مردانِ غیب' کہتے ہیں۔

دینِ خاص اور دینِ عام کی یہ تقسیم مان لینے کے بعد ان مذہبی نمائندوں کے نزدیک وہ تضاد پھر باقی نہیں رہتا جو قرآنِ مجید اور ان واقعات میں موجود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک ایسا مفروضہ ہے جس کی بنیاد علم واستدلال کی دنیا میں کہیں موجود نہیں۔ قرآنِ مجید اس باب میں واضح ہے کہ اس زمین پر انسان کی حیثیت یہ ہے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے اور اس کی دائمی نجات کا تمام تر انحصار اس حقیقت کے شعور پر ہے۔ اور جو شخص اس بات کو قبول کر لیتا ہے، اس کے لیے عمل کا ایک ہی راستہ ہے جس کا علم قرآنِ مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے حاصل ہوتا ہے۔ یہی اسلام ہے اور اس سے الگ کسی بھی راستے کو اسلام نہیں کہا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں صاف صاف اعلان کر دیا گیا ہے:

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو فی الاٰخرۃ من الخٰسرین (آل عمران ۳: ۸۵)	"اور جو اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب بنے گا تو وہ اس سے قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نامرادوں میں سے ہوگا۔"

اہلِ تصوف کا یہ نظریہ عقلاً بھی قبول نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اللہ تک رسائی کا ذریعہ تو صرف پیغمبرِ گرامی ہے۔ اگر اللہ تک پہنچنے کا کوئی دوسرا راستہ مان لیا جائے، تو پھر پیغمبر کی ضرورت خود بخود ختم ہو جاتی ہے اور ایمان بالرسالت یا منصبِ رسالت ایک بے معنی اصطلاح بن کر رہ جاتی ہے۔ چنانچہ اس بنا پر ہم یہ رائے رکھتے ہیں کہ زندگی گزارنے کے لیے کسی ایسے راستے کا یقین، جو قرآن و سنت سے ہٹ کر ہو، وہ محض ضلالت ہے، چاہے آپ اسے تصوف کا نام دیں یا کوئی دوسرا۔

ہمارے مذہبی گروہ، جب تک اس حقیقت کو تسلیم نہیں کریں گے کہ اسلام اور تصوف دو الگ چیزیں ہیں، وہ اس تضاد پر قابو نہیں پا سکتے، جو قرآنِ مجید کے ارشادات اور بزرگوں کی روایات میں موجود ہیں۔ جب قرآن و سنت ہی کو عقائد و افکار اور اعمال کے لیے ماخذ کر لیا جائے گا، تو پھر ہم سب اس ایک رنگ میں رنگ جائیں گے جسے 'صبغۃ اللہ' کہا گیا ہے۔ اس کے بعد ممکن ہے کہ فروعات میں اختلاف رہے، لیکن پھر اس کی نوعیت کسی فساد کی نہیں رہے گی، بلکہ وہ "اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں" کا معاملہ ہوگا۔

دینی جرائد کی زیادہ سے زیادہ اشاعت اور ان کی تعداد میں اضافہ ایک اچھی بات ہے، لیکن معاشرے پر اس کے مثبت اثرات اسی وقت محسوس ہو سکتے ہیں، جب یہ اپنے پیغام کے لحاظ سے ہم آہنگ ہوں۔ انداز بیان میں اختلاف ہو سکتا اور اسی مقاصد کے حصول کے لیے حکمت عملی بھی مختلف ہو سکتی ہے لیکن یہ فرق فطری ہے اور حسن کا باعث ہے۔ یہ ہم آہنگی اسی وقت ممکن ہے جب بنیاد ایک ہو۔ اور دین کے معاملے میں قرآن وسنت کے علاوہ کیا بنیاد ہو سکتی ہے۔ اگر ہر علم و روایت پر قرآن وسنت کو حاکم مان لیا جائے، تو سب اختلافات ختم ہو سکتے ہیں لیکن کیا یہ خواہش کبھی پوری ہو سکے گی! اس کا تمام تر انحصار ہمارے دین دار طبقے پر ہے۔

اشراق دستیاب ہے

لاہور

- المورد ـــــــ ۹۸ (۲)، ای ماڈل ٹاؤن
- آصف نیوز ایجنسی، اخبار مارکیٹ
- الائیڈ کارنر، ٹولنٹن مارکیٹ
- دار التذکیر، حمید سنٹر ۹۔ رائل پارک
- کلاسیک، ریگل چوک
- کاشانۂ ادب، کچہری روڈ انارکلی
- جی ٹی ایس بک سٹال، ریلوے اسٹیشن
- بک سٹالز، پلیٹ فارمز ریلوے اسٹیشن
- ظہور بک سٹال (شبستان ہوٹل) ریلوے اسٹیشن
- بک ہاؤس، لبرٹی مارکیٹ
- بک وے، شادمان مارکیٹ
- بک سٹال، الحمرا ہال نمبر ۲، بعد ماہانہ لیکچر

کراچی

- المورد ـــــــ سلور وائیٹ چیمبرز بہادر آباد، چورنگی
- بک سٹال، فنانس اینڈ ٹریڈ سنٹر ہال، بعد ماہانہ لیکچر

راولپنڈی

- ورائٹی بک سٹال، بنک روڈ، صدر
- سٹوڈنٹ بک سٹال، بنک روڈ، صدر
- بک سنٹر، حیدر روڈ، صدر
- سعید نیوز ایجنسی، نزد ناز سینما، مری روڈ
- بکس اینڈ بکس، کمرشل مارکیٹ سیٹلائٹ ٹاؤن
- دار الکتب، کالج روڈ

۶۶ احمد بلاک، گارڈن ٹاؤن، لاہور ۵۴۶۰۰

فون : ۵۸۶۴۴۳۱

ترتیب : منظور الحسن

"موت جب سر پر آجائے، اس وقت موت کو یاد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، موت کو یاد کرنے کا وقت اس سے پہلے ہے۔ جب آدمی اس قابل ہوتا ہے کہ وہ دوسروں پر ظلم کرے اور ظالمانہ کارروائیوں کو عین انصاف کہے، اس وقت وہ کچھ سوچنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اس وقت وہ اپنی انا کی تسکین کے لیے، وہ سب کچھ کر ڈالتا ہے جو اس کو نہیں کرنا چاہیے، مگر جب اس کی طاقت ختم ہو جاتی ہے، جب اس کے الفاظ جواب دینے لگتے ہیں، جب اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ موت کے بے رحم فرشتے کے قبضہ میں ہے، اس وقت اس کو اپنی غلطیاں یاد آتی ہیں، حالاں کہ یاد آنے کا وقت وہ تھا، جب وہ غلطیاں کر رہا تھا اور کسی نصیحت کی پروا کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔"

اصلاح و دعوت

منظور الحسن

تعلق باللہ اور تعلق بالرسول

چند اہم تقاضے

بندے کا اپنے پروردگار کے ساتھ صحیح تعلق ہی، سب سے اہم تعلق ہے۔ اسی تعلق کا صحیح شعور انسان میں، دوسرے تعلقات کی صحیح معرفت پیدا کرتا ہے۔ یعنی انسان کا اپنے خاندان اور معاشرے کے ساتھ مفید تعلق، اسی صورت میں استوار ہوتا ہے، جب اس کا اللہ کے ساتھ تعلق، صحیح بنیادوں پر قائم ہو۔ اللہ تعالیٰ سے تعلق کا حقیقی شعور ہمیں اللہ کے پیغمبر ہی کے ذریعے سے ملا ہے، لہٰذا ان کے ساتھ تعلق کی نوعیت بھی ہمارے لیے بہت اہم ہے۔ قرآنِ مجید نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ تعلق کے تقاضوں کو جگہ جگہ واضح کیا ہے۔ ہم ان میں سے چند اہم تقاضے یہاں بیان کرتے ہیں:

تعلق باللہ

اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کا سب سے اہم تقاضا یہ ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے، معبودِ حقیقی اسی کو مانا جائے، اس کی ذات کے سوا کائنات کی ہر چیز کو فانی تصور کیا جائے، اسی کی عبادت کی جائے اور اسی سے مدد طلب کی جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

> "اور مشرکوں میں سے نہ بنو، اور اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ پکارو۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے۔ فیصلہ اسی کے اختیار میں ہے، اور تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔" (القصص ۲۸: ۸۷-۸۸)

اللہ تعالیٰ سے تعلق کا ایک تقاضا یہ ہے کہ ہر مشکل کے حل کے لیے، اللہ ہی سے مدد طلب کی جائے، ہر کٹھن مرحلے میں اسی کو پکارا جائے۔ جب آدمی خلوصِ نیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ

سے رجوع کرتا ہے، تو وہ اس کی جائز طلب ضرور پوری کرتا ہے۔ اہلِ ایمان کی پسندیدہ روش یہ ہے کہ وہ اپنی مشکلات میں اللہ تعالیٰ سے رجوع کرتے ہیں، اور وہ ان کی مشکلات دور فرما دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"اور جب میرے بندے تم سے میرے متعلق سوال کریں، تو میں قریب ہوں۔ میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں، جب وہ مجھے پکارتا ہے"۔ (البقرہ ۲: ۱۸۶)

انسان کچھ چیزوں کے بارے میں آرزومند ہوتا ہے اور انھیں حاصل کرنا چاہتا ہے اور دوسری کچھ چیزوں کے بارے میں اندیشہ ناک ہوتا ہے اور ان سے بچنا چاہتا ہے یعنی عام طور پر امید و بیم کی کیفیات انسان پر طاری رہتی ہیں۔ ان دونوں کیفیتوں میں انسان سے مطلوب یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی کو پکارے۔ قرآن کا فرمان ہے:

"اور اسی کو پکارو، بیم و رجا دونوں حالتوں میں۔ بے شک اللہ کی رحمت نیکوکاروں سے قریب ہے"۔ (الاعراف ۷: ۵۶)

اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ سب سے بڑھ کر اسی سے محبت کی جائے۔ اللہ ہی ہے جو ہمارا خالق ہے، ہمارا مالک ہے۔ اس کائنات کا سارا انتظام اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اس کائنات کا ذرہ ذرہ اسی کی رحمت کا شاہد ہے۔ ہم اپنے وجود کو دیکھیں، یا اس کائنات پر نظر ڈالیں، دونوں طرف اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان رحمتوں کا ظہور ہے۔ چنانچہ یہ ہماری فطرت کی آواز ہے کہ اس سے بڑھ کر ہماری محبت کا حق دار اور کوئی نہیں ہے اور دنیا کی کسی چیز سے بھی اگر محبت ہو گی، تو وہ محبتِ الٰہی کے تابع ہی ہو گی۔ اللہ تعالیٰ سے محبت کا یہ تقاضا ہے کہ کسی دوسرے کو اس کا ہم سر نہ ٹھہرایا جائے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

"اور لوگوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کے ہم سر ٹھہراتے ہیں، جن سے وہ اس طرح محبت کرتے ہیں، جس طرح خدا سے محبت کرنی چاہیے۔ لیکن جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں، وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہیں"۔ (البقرہ ۲: ۱۶۵)

اللہ تعالیٰ سے تعلق کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے وفاداری نبھائی جائے۔ خدا کے ساتھ وفاداری کو محض بلند بانگ دعوے کرنے اور چند خاص رسموں کو ادا کر دینے سے حاصل نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس کے لیے قربانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے وفاداری نبھانے کا طریقہ، خود اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنی محبوب چیزوں میں سے اللہ کی راہ

میں خرچ کیا جائے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"تم خدا کی وفاداری کا درجہ ہرگز نہیں حاصل کر سکتے، جب تک ان چیزوں میں سے نہ خرچ کرو، جن کو تم محبوب رکھتے ہو۔" (آل عمران ۳: ۹۲)

اِس وفاداری کی مزید وضاحت اس آیتِ قرآنی سے ہوتی ہے:

"خدا کی وفاداری کا حق، اس سے ادا نہیں ہو جاتا کہ اپنا رخ مشرق اور مغرب کی طرف کرو، بلکہ اصل وفاداری تو ان کی ہے جو اللہ پر، یوم آخرت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور نبیوں پر ایمان رکھتے ہیں اور اپنے مال اس کے محبوب ہونے کے باوجود دیتے ہیں، قرابت مندوں کو، یتیموں کو، مسکینوں کو، مسافروں کو، سائلوں کو۔ نیز اس کو خرچ کرتے ہیں، گردنوں کو آزاد کرانے میں، اور نماز کا اہتمام کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، اور جب عہد کر بیٹھیں تو اپنا عہد پورا کر کے رہنے والے ہیں، اور خاص کر وہ لوگ جو بھوک اور بیماری میں اور جنگ کے وقت ثابت قدم رہنے والے ہوں۔ یہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں۔" (البقرہ ۲: ۱۷۷)

اللہ تعالیٰ سے تعلق کا ایک تقاضا یہ ہے کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈرا جائے اور اس بات کو کبھی فراموش نہ کیا جائے کہ یہ دنیا کوئی کھیل تماشا نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک حکیمانہ منصوبہ ہے، جس کے تحت اس دنیا کو ایک دن ختم ہونا ہے اور اس خاتمے پر، لازماً، جزا و سزا کا مرحلہ آئے گا۔ اس مرحلے کے لیے ہر شخص کو ہمہ وقت تیار رہنا چاہیے اور اس حقیقت سے باخبر رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔ وہ ہر فرد کے ایک ایک قول و فعل سے واقف ہے۔ چنانچہ اُخروی نجات کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خوف ہر وقت دل میں جاگزیں رہے تاکہ اس کے احکام کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے۔ قرآن کہتا ہے:

"اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور چاہیے کہ ہر نفس اچھی طرح جائزہ لے رکھے اس کا جو اس نے کل کے لیے کیا ہے، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔" (الحشر ۵۹: ۱۸)

اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ اس کے سامنے عاجزی اور انکساری کا اظہار کیا جائے۔ یہ اظہار اللہ تعالیٰ کے سامنے رکوع و سجود کے ذریعے سے بھی کیا جاتا ہے اور اپنی زبان پر اللہ کی حمد و ثنا کے کلمات جاری کر کے بھی کیا جاتا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

"اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے۔" (الاعراف ۷: ۵۵)

تعلق بالرسول

رسول کے ساتھ تعلق کا سب سے اولین تقاضا یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ اس تقاضے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"اور رسول کی اطاعت کرو، تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔" (النور۲۴:۵۶)

"اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں گے اور جو اس سے ڈریں گے اور اس کے حدود کی پاس داری کریں گے، وہی لوگ ہیں جو فائز المرام ہوں گے۔" (النور۲۴:۵۲)

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات کو دین میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ قرآن ہمیں انھی کے ذریعے سے ملا ہے، سنت انھی کے طریقے کا نام ہے، حدیث انھی کے اقوال کا مجموعہ ہے۔ گویا، دین کے یہ تینوں بنیادی منابع رسول اللہ کی ذات میں اس طرح مرتکز ہو جاتے ہیں کہ آپ کو دین کا اصل ماخذ مانے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں رہتا۔ رسول اللہ کی اس حیثیت میں اطاعت ہی مسلمان سے مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

"اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی اطاعت کرو، اور اپنے اعمال کو رائیگاں نہ کرو۔" (محمد۴۷:۳۳)

رسول اللہ سے تعلق کا ایک تقاضا یہ ہے کہ آپ کی اخلاقی شخصیت کو اپنے لیے نمونہ اور اسوہ تصور کیا جائے اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنے کی سعی کی جائے۔ بڑوں سے آپ کا حسن سلوک، چھوٹوں سے آپ کا اظہار شفقت، ازواج سے آپ کا رویہ، ایک معلم دین کی حیثیت سے آپ کا کردار، بطور حکمران آپ کا طرز عمل، بحیثیت فاتح آپ کا حسن سلوک، غرض یہ کہ ہر معاملۂ زندگی میں آپ کا اسوہ ہمارے لیے مشعل راہ ہونا چاہیے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

"رسول اللہ کی ذات میں تمھارے لیے (اخلاق کا) بہترین نمونہ ہے۔" (الاحزاب۳۳:۲۱)

رسول سے تعلق کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ رسول کی نصرت کی جائے اور اس کی تعظیم و توقیر کی جائے۔ تاریخ گواہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ کی نصرت اور ان کی تعظیم و توقیر کا حق ادا کر دیا۔ دعوت دین کی جدوجہد میں وہ آپ کے دست و بازو بن گئے اور دین کے ہر معاملہ میں اپنے سر تسلیم خم کر دیئے۔ آج رسول اللہ کی نصرت اس طرح کی جا سکتی ہے کہ ان کے دین کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچانے کے لیے جدوجہد کی جائے، ان

کے احکام کے آگے اپنے سر جھکا دیئے جائیں۔

ارشادِ خداوندی ہے:

"بے شک (اے نبی) ہم نے تم کو گواہی دینے والا، خوش خبری پہنچانے والا اور آگاہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے، تاکہ (اے) لوگو، تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ رسول کی مدد کرو اور اس کی توقیر کرو۔" (الفتح ۴۸: ۸،۹)

رسول سے تعلق کا ایک اہم تقاضا یہ بھی ہے کہ رسول اللہ کے ساتھ دنیا کی ہر چیز سے زیادہ محبت کی جائے اور رسول اور اس کے دین کی خاطر، والدین، اولاد، بہن بھائیوں، عزیز و اقارب، اپنے مال اسباب حتیٰ کہ اپنی جان کی قربانی سے بھی گریز نہ کیا جائے۔ رسول اللہ کے ساتھ محبت کے اس تعلق کو اپنے دل میں جاگزیں کرنا اور اپنے زبان و عمل سے اس تعلق کا اظہار کرنا کامل ایمان کا ناگزیر تقاضا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میرے لیے اس کی محبت" اپنے مال اسباب، اہلِ خانہ اور سب لوگوں سے بڑھ کر نہ ہو۔" (مسلم، کتاب الایمان، جلد اوّل)

اس محبت کا اظہار ظاہر بات ہے کہ رسول اللہ کی اطاعت کرنے، آپ کے اسوہ کو اپنانے، آپ کی سنت کو اختیار کرنے اور آپ کے دین کو انفرادی و اجتماعی زندگی میں جاری و ساری کرنے ہی سے ہوگا۔

رسول اللہ کے ساتھ تعلق کا ایک اہم تقاضا یہ بھی ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کا آخری نبی اور رسول مانا جائے یعنی یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وحی والہام کا سلسلہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکا ہے۔ اب اگر کوئی شخص سلسلۂ وحی والہام کے دوبارہ شروع ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کی حیثیت ایک جھوٹے مدعی سے زیادہ ہرگز نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی بات پر کان دھرنا بھی دین اور ایمان کے منافی ہے۔ قرآنِ مجید کا ارشاد ہے:

"محمد تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، بلکہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔" (الاحزاب ۳۳: ۴۰)

وحید الدین خاں

موت کے دوسری طرف

سکندرِ اعظم نے بڑی بڑی فتوحات کیں، مگر جب آخری وقت آیا تو اس نے کہا: "میں دنیا کو فتح کرنا چاہتا تھا، مگر موت نے مجھ کو فتح کر لیا۔ افسوس کہ مجھ کو زندگی کا وہ سکون بھی حاصل نہ ہو سکا جو ایک معمولی آدمی کو حاصل ہوتا ہے۔"

نپولین بونا پارٹ کے آخری احساسات یہ تھے: "مایوسی میرے نزدیک جرم تھی، مگر آج مجھ سے زیادہ مایوس انسان دنیا میں کوئی نہیں۔ میں دو چیزوں کا بھوکا تھا۔ ایک حکومت، دوسرے محبت۔ حکومت مجھے ملی، مگر وہ میرا ساتھ نہ دے سکی۔ محبت کو میں نے تلاش کیا، مگر میں نے اسے کبھی نہیں پایا۔ انسان کی زندگی، اگر یہی ہے جو مجھے ملی تو یقیناً انسانی زندگی ایک بے معنی چیز ہے، کیوں کہ اس کا انجام مایوسی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں۔"

ہارون الرشید ایک بہت بڑی سلطنت کا حکمران تھا، مگر آخر عمر میں اس نے کہا: "میں نے ساری عمر غم غلط کرنے کی کوشش کی، پھر بھی میں غم غلط نہ کر سکا۔ میں نے بے حد غم اور فکر کی زندگی گزاری ہے۔ زندگی کا کوئی دن ایسا نہیں جو میں نے بے فکری کے ساتھ گزارا ہو۔ اب میں موت کے کنارے ہوں۔ جلد ہی قبر میرے جسم کو نگل لے گی۔ یہی ہر انسان کا آخری انجام ہے، مگر ہر انسان اپنے انجام سے غافل رہتا ہے۔"

خلیفہ منصور عباسی کی موت کا وقت آیا تو اس نے کہا: "اگر میں کچھ دن اور زندہ رہتا تو اس حکومت کو آگ لگا دیتا جس نے مجھے بار بار سچائی سے ہٹا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک نیکی اس ساری حکومت سے بہتر ہے، مگر یہ بات مجھ کو اس وقت معلوم ہوئی جب موت نے مجھے اپنے چنگل میں لے لیا۔"

دنیا کے اکثر کامیاب ترین انسانوں نے اس احساس کے ساتھ جان دی ہے کہ وہ دنیا کے ناکام ترین انسان تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ موت کے قریب پہنچ کر آدمی پر جو کچھ گزرتا ہے، اگر وہی اس پر موت سے پہلے گزر جائے تو اس کی زندگی بالکل بدل جائے۔ ہر آدمی جب موت کے کنارے کھڑا ہوتا ہے تو اس کو وہ تمام سرگرمیاں راکھ کے ڈھیر سے بھی زیادہ بے حقیقت معلوم ہوتی

ہیں، جن میں وہ اس قدر گم تھا کہ کسی اور چیز کے بارے میں سوچنے کی اسے فرصت ہی نہ ملی۔ اس کے پیچھے ایک ایسی دنیا ہوتی ہے جس کو وہ کھو چکا اور آگے ایک ایسی دنیا ہوتی ہے جس کے لیے اس نے کچھ نہیں کیا۔

موت جب سر پر آجائے اس وقت موت کو یاد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ موت کو یاد کرنے کا وقت اس سے پہلے ہے جب آدمی اس قابل ہوتا ہے کہ وہ دوسروں پر ظلم کرے اور ظالمانہ کارروائیوں کو عین انصاف کہے، اس وقت وہ کچھ سوچنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اس وقت وہ اپنی انا کی تسکین کے لیے، وہ سب کچھ کر ڈالتا ہے جو اس کو نہیں کرنا چاہیے۔ مگر جب اس کی طاقت ختم ہو جاتی ہے، جب اس کے الفاظ جواب دینے لگتے ہیں، جب اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ موت کے بے رحم فرشتے کے قبضہ میں ہے، اس وقت اس کو اپنی غلطیاں یاد آتی ہیں، حالانکہ یاد آنے کا وقت وہ تھا، جب وہ غلطیاں کر رہا تھا اور کسی نصیحت کی پروا کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔



جولائی ۱۹۶۴ ——— جولائی ۱۹۹۴

ہمقدم کے ۳۰ تابناک سال

دعوت و عزیمت کی راہ میں

اسلامی جمعیّت طلبہ کے قدم بقدم

ھمقدم

اپنی اشاعت کے تیس سال مکمّل کر رہا ہے

اس موقع پر جولائی ۱۹۹۴ء کا شمارہ ہمقدم کی تاریخ کا عظیم الشان

خاص نمبر ہوگا

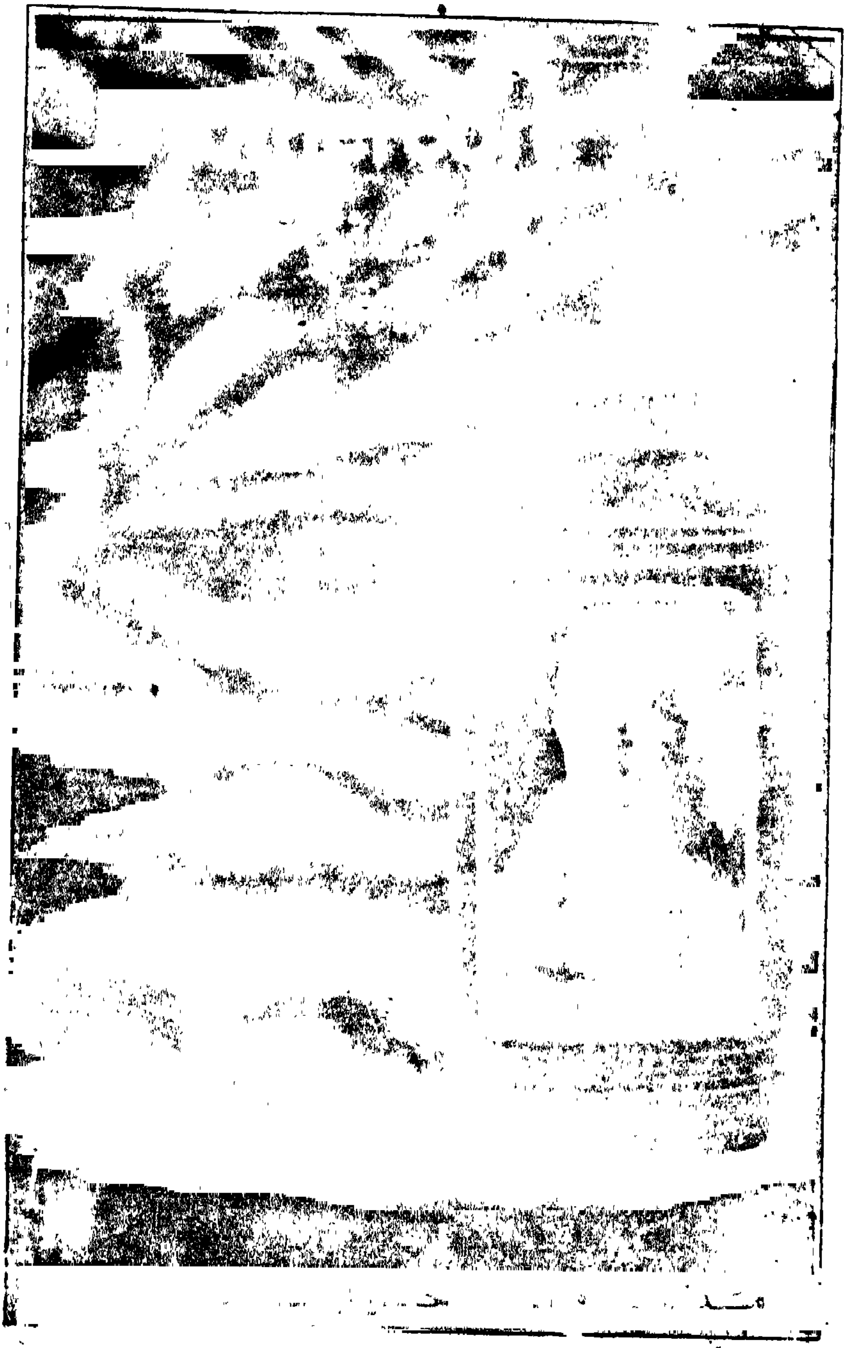
اپنی رائے اور تجاویز جلد از جلد ادارہ ہمقدم کو ارسال کردیں۔

OUR THANKS TO

SNOW WHITE DRY CLEANING INDUSTRIES
SH. WILAYAT AHMAD & SONS
CONTINENTAL ART
FEROZE TEXTILE INDUSTRIES
IMAGE COMMUNICATIONS
TIP TOP DRY CLEANERS
F.RABBI & CO. (PVT) LTD
K.B. SARKAR & CO.
PARAMOUNT DISTRIBUTORS (PVT) LTD



بہترین ذائقے کی عظیم الشّان روایت
رُوح افزا
مشروبِ مشرق
مفرح پھلوں، مؤثر جڑی بوٹیوں، صحت بخش سبزیوں
اور شاداب پھولوں سے تیار کیا جانے والا
حکمت و مہارت کا شاہکار، رُوح افزا، جسم و جاں کو گرمی کی
شدت سے محفوظ رکھتا ہے، تازگی اور توانائی بخشتا ہے۔
مخصوص و منفرد ذائقے اور بے مثال خواص کی
وجہ سے خوش ذوق شائقین کی اوّلین پسند رُوح افزا
- اس صدی کا سب سے بہتر مشروب
رُوحِ ثقافت
رُوح افزا
مدینۃ الحکمۃ: تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ
SHARBAT
ROOH AFZA



دینِ حق کی دعوت

ہمارے پروگرام

مقرر: جاوید احمد غامدی

درسِ قرآن و حدیث

سورۂ نحل

کتاب فضائل القرآن (مشکوٰۃ المصابیح)

ہر جمعہ بعد نماز مغرب

جامع مسجد ای بلاک، ماڈل ٹاؤن لاہور

دین و دانش

سلسلۂ محاضرات

حدیث و سنت کا مقام اور اجماع کی حیثیت

جمعرات، ۲ جون ۹۴ء بعد نماز مغرب

الحمرا ہال نمبر ۳، لاہور

حدیث و سنت کا مقام اور اجماع کی حیثیت

ہفتہ، ۱۱ جون ۱۹۹۴ء، بعد نماز مغرب

فنانس اینڈ ٹریڈ سنٹر آڈیٹوریم، شاہراہ فیصل کراچی

خواتین کے لیے شرکت کا اہتمام ہے

مرکزی دفتر: ۹۸ (۲) ای، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون: ۸۵۷۰۴۰، ۸۵۶۴۱۸
رابطہ دفتر: سنو وائٹ چیمبرز، بہادر آباد، چورنگی، کراچی
فون: ۴۹۳۳۶۹۰ — ۶-۵۶۸۵۱۲۴

المورد

شعبۂ اصلاح و دعوت

ماہنامہ

اشراق

جلد ٦ شمارہ ٧
جولائی ١٩٩٤ء
صفر ١٤١٥ھ

فی شمارہ : ٨ روپے
سالانہ : ٨٠ روپے
بیرون ملک
ہوائی ڈاک : ٣٥٠ روپے
بحری ڈاک : ٢٥٠ روپے

المورد

٦٦ احمد بلاک، گارڈن ٹاؤن، لاہور ٥٤٦٠٠ فون : ٥٨٦٤٤٣١

مدیر مسئول : جاوید احمد غامدی طابع : قومی پریس لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الممتحنہ

[۶۰]

اللہ کے نام سے جو سراپا رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم (اِن اہلِ مکہ کو، اِن) میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ۔ تم اُن سے محبت کی پینگیں بڑھاتے ہو، دراں حالیکہ وہ اُس حق کے منکر ہوئے جو تمھارے پاس آیا ہے۔ وہ رسول کو اور تم کو محض اِس بنا پر (وطن سے) نکال دیتے ہیں کہ تم اللہ، اپنے پروردگار پر، ایمان لائے ہو — تم اگر میری راہ میں جہاد کے لیے اور میری رضا کی طلب میں (اُن کی طرف) نکلے، (اور) اِس طرح (نکلے) کہ اُن کو رازدارانہ دوستی کے پیغام بھیجتے ہو، دراں حالیکہ میں جانتا ہوں جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ بتاتے ہو — اور (اِس کے باوجود تم اِس طرح نکلے تو) تم میں سے جو یہ کرتے ہیں، (وہ پھر یاد رکھیں کہ) وہ راہِ ہدایت سے بھٹک گئے۔

(تم اُن سے دوستی کرتے ہو، اور حقیقت یہ ہے کہ) وہ اگر تم کو پا جائیں تو تمھارے دشمن

ہوں اور تم پر اپنے ہاتھ بھی چلائیں اور اپنی زبانیں بھی اور یہی چاہیں کہ تم بھی کافر ہو کر رہو۔

(تم اِن رشتوں کو دین سے زیادہ اہمیت دیتے ہو، تو سنو کہ) تمھاری یہ قرابتیں ہرگز تمھارے کام نہ آئیں گی اور نہ تمھاری اولاد، قیامت کے دن، وہ تم میں جدائی ڈال دے گا اور (یہ) جو کچھ تم کر رہے ہو، اللہ اُس کو دیکھ رہا ہے۔

(تم اگر غور کرو تو اِس معاملے میں) تمھارے لیے بہترین نمونہ تو ابراہیم اور اُس کے ساتھیوں میں ہے، جب اُنھوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا کہ ہم تم سے اور تمھارے اِن معبودوں سے، جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، بالکل بری ہیں۔ ہم تمھارے منکر ہوئے اور ہمارے اور تمھارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت اور بیزاری عیاں ہوئی، اُس وقت تک کہ تم اللہ واحد پر ایمان لے آؤ ــــــ ابراہیم کی اپنے باپ سے' یہ بات، البتہ، اِس سے الگ ہے کہ (ابّا جان)، میں آپ کے لیے مغفرت کی دعا کروں گا، اگرچہ اللہ کی طرف سے میں آپ کے لیے کسی شے پر کوئی زور نہیں رکھتا ــــــ (یہی موقع ہے، جب اُس نے اور اُس کے ساتھیوں نے دعا کی): اے ہمارے رب، ہم نے تجھ پر بھروسا کیا اور تیری طرف رجوع ہوئے اور تیری ہی طرف ہم کو پلٹنا ہے۔ اے ہمارے پروردگار، اِن کافروں کو ہم پر نہ آزما اور ہم سے درگزر فرما، اے ہمارے مالک۔ بے شک، تو زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے۔

بے شک، اِن لوگوں میں تمھارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ (مگر) اُن کے لیے جو اللہ اور آخرت کی امید رکھتے ہیں۔ (تم اِنھی کے پیچھے چلو) اور (تم میں سے) جو (اِس سے) منہ موڑیں گے تو یاد

رکھو۔ اللہ بے نیاز ہے اور (وہ تمھارا محتاج نہیں ہے) وہ اپنی ذات میں ستودہ صفات ہے۔

تم توقع رکھو کہ اللہ تم میں اور ان لوگوں میں، جن سے تم نے (اب) عداوت مول لی ہے، دوستی پیدا کردے۔ اور (تم جانتے ہی ہو کہ) اللہ بڑی قدرت والا ہے اور (وہ عذاب میں جلدی نہیں کرتا، اس لیے تم سب اگر اپنی اصلاح کرو تو) اللہ مغفرت کرنے والا ہے، اس کی شفقت ابدی ہے۔

اللہ تمھیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم اُن لوگوں کے ساتھ بھلائی اور انصاف کا سلوک کرو جو نہ دین کے معاملہ میں تم سے لڑے ہیں اور نہ تم کو تمھارے گھروں سے نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اللہ تم کو جس بات سے روکتا ہے وہ بس یہ ہے کہ تم اُن لوگوں سے دوستی کرو جو تم سے دین پر لڑے ہیں اور تم کو تمھارے گھروں سے نکالا اور تمھارے نکالنے میں (دوسروں کی) مدد کی ہے۔ اور (تم کو تنبیہ کرتا ہے کہ تم میں سے) جو اِس طرح کے لوگوں سے دوستی کریں گے تو وہ اپنے ہی اوپر ظلم ڈھانے والے ہوں گے۔

(اِس لیے) اے اہلِ ایمان، (معاہدۂ حدیبیہ کے بارے میں جو نزاع تم میں اور اِن اہلِ مکہ میں پیدا ہوئی ہے، اُس کا فیصلہ یہ ہے کہ) جب مسلمان عورتیں ہجرت کرکے آئیں تو اُن کی تحقیق کرو ــــ (تمھیں جاننا چاہیے اور اُنھیں بھی کہ) اللہ تو اُن کے ایمان سے اچھی طرح واقف ہی ہے۔ پھر اگر تم کو معلوم ہو جائے کہ وہ ایمان پر ہیں تو اُن کو اِن کافروں کی طرف واپس نہ کرو۔ نہ یہ عورتیں اُن کے لیے جائز ہیں اور نہ وہ اِن عورتوں کے لیے جائز ہوں گے۔ اور اُنھوں نے جو مہر اِن کو دیے تھے،

وہ اُن کو پھیر دو۔ اور تم پر کوئی گناہ نہیں، اگر تم اِن سے نکاح کر لو جب کہ تم اِن کے مہر (بھی) اِن کو دو۔ اور تم خود بھی کافر عورتوں کے ناموس اپنے قبضہ میں نہ رکھو اور تم نے جو مہر (اُن کو) دیے تھے، وہ تم واپس مانگ لو اور جو اُنھوں نے (تمھاری اِن عورتوں کو) دیے تھے، وہ اُن کو واپس مانگ لیں۔ یہ اللہ کا فیصلہ ہے جو وہ تمھارے درمیان کر رہا ہے، اور اللہ صاحب علم ہے، بڑی حکمت والا ہے۔

اور اگر تمھاری اِن بیویوں کے مہر میں سے کچھ کافروں کی طرف رہ جائے تو جب تمھاری باری آئے تو جن لوگوں کی بیویاں اُدھر رہ گئی ہیں، اُن کو اتنا دے دو جو اُن کے دیے ہوئے مہر کے برابر ہو۔ اور اُس اللہ سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو۔

(اسی طرح) اے پیغمبر، جب مسلمان عورتیں بیعت کے لیے تمھارے پاس آئیں (اور اقرار کریں) کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی اور چوری نہ کریں گی اور زنا نہ کریں گی اور نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی اور نہ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان (میں جو کچھ ہے، اُس کے بارے میں) کوئی بہتان تراشیں گی اور نہ کسی معروف کے معاملے میں تمھاری نافرمانی کریں گی، تو اُن سے بیعت لے لو اور اُن کے لیے مغفرت کی دعا کرو۔ بے شک اللہ مغفرت کرنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔

(اور اب آخر میں یہ بات بھی) اے اہلِ ایمان (کہ) تم اُن لوگوں سے (بھی) دوستی نہ کرو، (اُن یہودیوں سے) جن پر اللہ نے غضب فرمایا ہے۔ وہ آخرت سے مایوس ہوئے، جس طرح (یہ قریشِ مکہ)، یہ کافر اُن لوگوں (کے جی اٹھنے) سے مایوس ہوئے جو (اب) قبروں میں پڑے ہیں۔

———— البیان ————

منشورِ انقلاب

—۴—

اسلامی ریاست میں رائے دہی کا حق اور حکمرانوں کے اوصاف

قرآنِ مجید کی رو سے ایک اسلامی ریاست کے لیے نظامِ حکومت چلانے کا بنیادی ضابطہ یہ ہے کہ اس میں تمام معاملات باہمی مشورے سے چلائے جاتے ہیں۔

اس ضابطے کے مطابق:

۱۔ بلدیاتی مسائل ہوں یا قومی و صوبائی امور، معاشرتی احکام ہوں یا قانون سازی کے ضوابط، اختیارات کا سلب و تفویض ہو یا امرا کا عزل و نصب، تمام ریاستی معاملات مشورے ہی سے طے کیے جائیں گے۔

۲۔ جن معاملات میں اجماع (CONSENSUS) نہ ہو سکے، ان میں اکثریت کی رائے فیصلہ کن ہوگی۔

۳۔ کسی شخص یا گروہ کی یہ حیثیت نہیں ہوگی کہ وہ مجلس کے، اجماع یا اکثریت کے ساتھ کیے گئے، فیصلے کو رد کر کے، اپنی رائے ان پر مسلط کرے۔

قرآنِ مجید کے اس اصول کے مطابق، نظمِ اجتماعی میں، عام لوگوں کی شرکت کا جو طریقہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمایا، وہ حسبِ ذیل دو ضوابط پر مبنی ہے:

ا۔ عامۃ الناس، اپنے معتمد لیڈروں کی وساطت سے ریاست کے معاملات میں مشورہ دیں گے۔

ب۔ امامت کا منصب، ریاست میں موجود مختلف گروہوں میں سے اس گروہ کا استحقاق قرار پائے گا، جسے عوام کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہوگا۔

ان دو ضوابط کی رو سے، ریاست کی سطح پر، رائے عامہ معلوم کرنے کے لیے، انتخابات کرانا اور مختلف پارٹیوں یا گروہوں کا ان انتخابات میں حصہ لینا، جائز ہو گا۔

قرآن و سنت کے ان ضوابط کے اندر رہتے ہوئے، اسلامی ریاست کے نظام کی تشکیل کے معاملے میں، اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ریاست کی سطح پر رائے عامہ معلوم کرنے کا جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے، اس میں رائے دہی کا حق کسے حاصل ہو گا؟ کیا اس میں 'بلا امتیاز' ریاست کے تمام شہریوں کو شریک کیا جائے گا یا کسی مخصوص گروہ ہی کو یہ حق دیا جائے گا کہ وہ اپنے نمائندوں کا انتخاب کرکے، ان کے ذریعے سے ریاست کے معاملات چلائیں؟

اسی سلسلے میں، ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست میں عوام کے نمائندوں، یعنی قومی و صوبائی اسمبلیوں یا مجلس شوریٰ کے ارکان اور سربراہِ ریاست یا امیرالمومنین میں کوئی خاص اوصاف ہونے چاہییں، یا کسی بھی شخص کو امیرالمومنین یا قومی و صوبائی اسمبلیوں کی رکنیت کے لیے اہل سمجھا جائے گا؟

ریاست میں رائے دہی کا حق

ہم یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ اسلامی ریاست ایک ایسی ریاست ہے، جس میں یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس میں اصل مرجعِ اطاعت کی حیثیت اللہ کی کتاب، قرآنِ مجید اور اس کے رسول، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو حاصل ہے، اور یہ مان لیا جائے کہ توحید کی اقامت، شرک کا ابطال، نماز اور زکوٰۃ کا اہتمام، معروف کی ترویج اور منکر کا استیصال اس ریاست میں، غایت اور مقصود کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اسلامی ریاست، خاص فکر کی بنیاد پر قائم ایک نظریاتی ریاست ہے، جس کے اہداف بھی متعین ہیں، اور قوانین کے مآخذ بھی۔ چنانچہ، اس صورتِ حال میں، یہ بات عقل و فطرت کا عین تقاضا ہو گی کہ ریاستی معاملات میں صرف ان لوگوں سے رائے لی جائے جو اس ریاست کے اہداف و مقاصد سے، نہ صرف اتفاق کرتے ہوں، بلکہ درحقیقت، ان کے اہداف و مقاصد بھی یہی ہوں۔ بالفاظِ دیگر، ایک اسلامی ریاست میں، ریاست کے مسلمان شہریوں ہی کو رائے دہی کا یہ حق حاصل ہونا چاہیے۔ اس کے برعکس، اگر ریاست کے تمام شہریوں کو، خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، یہ حق دے دیا جائے، تو اس کی مثال ایسی ہی ہو گی کہ کراچی جانے والے مسافروں کے مسائل حل کرنے کے لیے ان مسافروں سے رائے لی جائے جن کی منزلِ مقصود پشاور ہے، یا ہوائی سفر میں درپیش مسائل

کا حل تلاش کرنے کے لیے بس کے مسافروں سے دریافت کیا جائے۔ بالبداہت واضح ہے، کہ یہ ایک نامعقول بات ہوگی۔

چنانچہ، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید نے، جہاں ریاست کے معاملات چلانے میں مشورے کا اصول بیان کیا ہے، وہاں یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ یہ مشورہ مسلمانوں ہی سے لیا جانا چاہیے۔ سورۂ شوریٰ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"ان کے معاملات ان کے باہمی مشورے سے چلتے ہیں۔" (الشوریٰ ۴۲: ۳۸)

غور کیجیے، تو یہاں اللہ تعالیٰ نے صرف اتنی بات نہیں فرمائی کہ "ان کے معاملات مشورے سے چلتے ہیں"، بلکہ یہ فرمایا ہے کہ "ان کے معاملات، ان کے باہمی مشورے سے چلتے ہیں"، اور اس سے یہ بات واضح فرما دی ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں رائے دینے کا حق صرف مسلمان شہریوں ہی کو حاصل ہوگا۔[1]

چنانچہ، جب یہ بات طے کر دی جائے کہ ریاستی معاملات میں مشورہ دینے کا حق، صرف ریاست کے مسلمان شہریوں کو حاصل ہوگا، تو اب، لازماً، یہ مسئلہ پیدا ہوگا کہ اس بات کا تعین کس طرح کیا جائے کہ ایک شخص مسلمان ہے یا غیر مسلم؟

فتح مکہ کے بعد، جب اسلامی ریاست مدینہ سے بڑھ کر پورے جزیرہ نمائے عرب پر پھیل گئی، اور لوگوں کے اسلام یا کفر کی تعیین کا مسئلہ پیدا ہوا، تو اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کے گروہ میں شمولیت کے لیے تین شرائط بیان فرمائیں، اور یہ واضح فرما دیا کہ جو لوگ یہ تین شرائط پوری کر دیں، انھیں اسلامی ریاست میں شہریت کے تمام حقوق حاصل ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"پس، اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، تو تمھارے دینی بھائی ہیں۔" (التوبہ ۹: ۱۱)

اس آیت میں جو تین شرطیں بیان ہوئی ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ یہ کہ وہ اسلامی نظام کے مقابل میں سرکشی کا رویہ چھوڑ دیں، کفر و شرک سے اجتناب کریں، اسلامی عقائد پر ایمان لائیں اور اسلامی قانون کی بالادستی قبول کر لیں۔

---

[1] یہاں یہ بات، بہرحال، ملحوظ رہنی چاہیے کہ غیر مسلموں کو ایک اسلامی ریاست میں مشورہ دینے کا حق، اصلاً، حاصل نہیں ہے۔ البتہ، اگر کسی معاملے میں، مسلمان انھیں یہ حق دینا چاہیں یا کسی معاملے میں ان سے رائے لینا چاہیں یا ریاستی سطح پر، انھیں کوئی ذمہ داری سونپنا چاہیں، تو، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسا کر سکتے ہیں۔

۲۔ یہ کہ وہ اپنے پروردگار کی یاد میں رہنے کے لیے، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق، نماز پڑھنے لگیں۔

۳۔ یہ کہ ریاست پر اس کے عمال، عامۃ الناس اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کی جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، انھیں پورا کرنے کے لیے، وہ اسلامی بیت المال کو زکوٰۃ ادا کریں۔

آیت کے آخری الفاظ "وہ تمھارے دینی بھائی ہیں" (فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ) سے ظاہر ہے، یہی مراد ہے کہ اسلام کے نظام اجتماعی میں، ان سب لوگوں کو برابر کی حیثیت حاصل ہو جائے گی، جو اوپر بیان کی گئی شرطیں پوری کر دیں۔ ریاست کا نظام ان کے مشورے سے قائم ہو گا اور ان کے مشورے کے مطابق، چلایا جائے گا۔ یہ حق، انھیں پروردگار عالم نے دیا ہے اور دنیا کا کوئی حکمران یا سیاسی ادارہ، انھیں اس سے محروم نہیں کر سکتا۔

ارکان شوریٰ اور امیر المومنین کے بنیادی اوصاف

اسلامی ریاست میں جن لوگوں کو قومی و صوبائی اسمبلیوں یا مجلس شوریٰ کے ارکان اور سربراہ ریاست یا امیر المومنین کی حیثیت سے منتخب کیا جائے، ان کو علم و تقویٰ اور تدبیر و سیاست میں دوسروں سے ممتاز ہونا چاہیے۔

ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہم اپنی سیاست کی زمام اقتدار دیں، انھیں ایسا معاملہ فہم اور مدبر سیاست دان ہونا چاہیے، جو دین کے ساتھ ساتھ معیشت، معاشرت یا دیگر عمرانی یا سیاسی علوم کو، فی الجملہ سمجھتے ہوں، جو صرف عوامی قسم کے مقرر اور بڑے بڑے زمیندار اور سرمایہ دار نہ ہوں، بلکہ اپنی قوم کے مسائل حل کرنے اور اسے دینی اور دنیوی فلاح کی راہ پر گامزن کرنے کا جذبہ اور صلاحیت رکھتے ہوں۔

علم اور تدبیر و سیاست کے ساتھ ساتھ اسلامی ریاست کے ارباب اقتدار کو تقویٰ کی مثال بھی ہونا چاہیے۔ اسلامی ریاست کی رہنمائی میں معاشرے کا ارتقا، رضائے الٰہی کی سمت میں ہونا چاہیے اور امیر المومنین اور اس کے عمال کو اس ارتقا میں لیڈر اور مثال ہونا چاہیے۔ چنانچہ اسلامی حکومت کے ارباب حل و عقد صرف حکومتی مطالبات منوانے اور اس کا اقتدار تسلیم کرانے ہی پر مامور نہیں ہوتے، بلکہ شفیق باپ اور نیک دل معلم کی طرح، ان کی غلطیوں، ان کی کمزوریوں اور ان کی جہالتوں کو دور کرنے کے ذمہ دار بھی ہوتے ہیں۔ جو تبدیلیاں عام لوگوں سے مطلوب ہیں، وہ ان سب کا عملی نمونہ ہوتے ہیں۔ آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا کہ زانیوں اور شرابیوں نے لوگوں میں زنا اور شراب نوشی کے برائی ہونے کا احساس پیدا کیا ہو،

خائنوں نے لوگوں میں امانت کا جذبہ بیدار کیا ہو۔ راشیوں اور چور بازاری کرنے والوں نے دیانت اور راست بازی کی روش سکھائی ہو، اور کافرانہ خصائل اور جاہلی افکار و نظریات کے حاملین نے اسلامی نظامِ زندگی برپا کیا ہو۔ یہ بات اس کائنات کے مزاج اور اس کی فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ اسی اصول کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس طرح واضح فرمایا ہے:

"لوگ اس وقت تک سیدھی راہ پر قائم رہیں گے، جب تک ان کے حکمران اور رہنما سیدھے راستے پر رہیں گے۔"

یہ اللہ کا خوف اور اس کا تقویٰ ہی ہے جو حکمرانوں کو سیدھے راستے پر رکھے گا، انھیں اپنی رعایا کے دکھ درد میں راتوں کو جگائے گا، بھوک سے روتے بچوں کے لیے اپنی پیٹھ پر آٹے کی بوریاں لادنے پر مجبور کر دے گا اور عوام کا غم، ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی صورت میں بہائے گا۔ اگر کوئی ایسا شخص مسلمانوں پر حکمران بن جائے یا بنا دیا جائے، جس کے دل میں خدا کا خوف نہیں، تو، جیسا کہ مشاہدے سے بھی ثابت ہے، وہ دنیا میں مسلمانوں کے لیے اور آخرت میں اپنے لیے بربادی ہی کا باعث بنے گا۔

ترتیب : ساجد حمید

"جب تم اختلاف پاؤ تو سوادِ اعظم کی رائے کی پیروی کرو"۔ اس حکم کا تعلق سیاسی نظام سے ہے۔ شریعتِ اسلامیہ نے، جس سیاسی نظام کے لیے، قانون سازی کی ہے، اس کے لیے بنیادی اصول یہ دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے باہمی مشورے پر چلے۔ چنانچہ، جس سیاسی نظم (الجماعۃ) کی بنیاد باہمی مشورے (شوریٰ) کے اصول پر رکھی گئی ہے، اس میں اختلافی امور میں فیصلہ کرنے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ سوادِ اعظم (اکثریت) کی رائے ہی نافذ العمل مانی جائے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ اسلام کا نظامِ حکومت، چونکہ 'امرھم شوریٰ بینھم' کے اصول پر مبنی ہے۔ اس لیے یہ واضح سی بات ہے کہ جب بھی مشورہ لیا جائے گا، تو دو میں سے ایک صورت لازماً پیدا ہوگی؛ شوریٰ' بالاجماع' کسی فیصلے پر پہنچ جائے گی یا اختلافِ رائے ہو جائے گا۔ اختلاف کی صورت میں، اگر معاملہ افہام وتفہیم سے بھی طے نہ پائے، تو پھر دین کا حکم ہے کہ سوادِ اعظم، یعنی اکثریت کی رائے کو فیصلہ کن قرار دیا جائے۔"

حدیث وسنت

ساجد حمید

سوادِ اعظم کی اتباع

عن ابن عمر قال: قال رسول الله صلى الله عليه و سلم: لا يجمع الله هذه الأمة على الضلالة أبدا. وقال يد الله على الجماعة. فإذا شذ الشاذ منهم إختطفته الشياطين[ل] فاذا رأيتم إختلافا[ب] فاتبعوا السواد الأعظم، فإنه من شذ، شذ في النار. (مستدرک، کتاب العلم)

ل۔ تلبیس ابلیس، ابنِ جوزی، باب: ۱۔

ب۔ سنن ابنِ ماجہ، کتاب الفتن۔

ابنِ عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ میری امت کو کبھی ضلالت پر جمع نہیں کرے گا۔ اور آپ نے فرمایا: نظمِ اجتماعی پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ تو جو اس سے الگ ہوا، شیاطین اسے اچک لے جائیں گے۔ چنانچہ، جب تم (اس میں) اختلاف پاؤ، تو (اس کے ساتھ وابستہ رہنے کے لیے) سوادِ اعظم کی رائے کی پیروی کرو، اس لیے کہ جو الجماعۃ سے الگ ہوا، وہ دوزخ میں پڑا۔

سب سے پہلے، یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ یہ روایت، دراصل، دو روایتوں کا مجموعہ ہے: ابتدا سے 'علی الضلالۃ ابدا' تک پہلی روایت ہے، اور 'وقال: ید اللہ علی الجماعۃ' سے آخر تک دوسری روایت۔ ہمارے نزدیک، کسی موقع پر استدلال کرتے ہوئے، دونوں روایتوں کو ایک

ہی موقع پر بیان کیا گیا، مگر بعد کے راویوں نے اسے ایک ہی روایت کی حیثیت سے بیان کر دیا۔ ہماری اس رائے کی بنیاد درج ذیل دلائل پر ہے:

۱۔ یہ روایت، موجودہ صورت میں، قرآن و سنت کے مسلمات کے خلاف ہے۔ 'لا یجمع اللّٰہ ھذہ الأمۃ علی الضلالۃ أبدا' پر 'فاتبعوا السواد الأعظم' کے عطف سے روایت میں یہ معنی پیدا ہو جاتے ہیں کہ امت جس بات پر متفق ہو، یا سواد اعظم جس رائے کو اختیار کر لے، وہی حق ہے، لہٰذا اسی کی پیروی کی جائے۔ اگر اس کا مطلب یہی ہے، تو پھر یہ لازم ہے کہ ہم ملت اسلامیہ کے سواد اعظم (اکثریت) کی رائے کو حق مانیں، خواہ اکثریت کی رائے دین کے مسلمات کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ جبکہ ہمارا ایمان یہ ہے کہ قرآن مجید ہی اصل حاکم ہے۔ اس کے خلاف سواد اعظم تو کیا، اگر ساری دنیا بھی یک زباں ہو جائے، تب بھی قرآن ہی کی بات مانی جائے گی۔

۲۔ قرآن مجید اور احادیث کی نصوص سے یہ بات ثابت ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دین اجنبی ہو جائے گا۔ اور 'ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ وَقَلِيلٌ مِّنَ الْآخِرِينَ'[1] کے مطابق، اخیار امت کی تعداد کم ہوتی جائے گی۔ اور 'خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم'[2]، کے اصول پر، شر عام ہوتا جائے گا، اور 'بدأ الاسلام غریبا و سیعود غریبا'[3] کے مطابق، حق لوگوں کے لیے اجنبی ہوتا جائے گا۔ چنانچہ نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ حق کے علم بردار، بالعموم، کم ہی ہوتے ہیں۔

۳۔ اس روایت کی انھی مشکلوں کے حل کے لیے، عام طور پر، سواد اعظم سے صحابہ، جمہور علما یا اخیار امت مراد لیے جاتے ہیں۔ یہ رائے ہمارے نزدیک، قابل قبول نہیں ہے، کیونکہ روایت کے الفاظ میں کوئی قرینہ ایسا نہیں، جس کی بنیاد پر سواد اعظم کے یہ معنی مراد لیے جائیں، بلکہ کلام کی ترکیب ایسی ہے کہ سواد اعظم سے مسلمانوں کی اکثریت ہی مراد لی جا سکتی ہے۔

۴۔ 'لا یجمع اللّٰہ ھذہ الأمۃ علی الضلالۃ أبدا' کے بعد 'وقال' سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ دونوں باتیں الگ الگ ہیں۔ بعض طرق میں 'وقال' حذف ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ غالباً راویوں کا سہو ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی اس روایت میں 'وقال' کا موجود ہونا، ہمارے نزدیک، اس

---

[1] الواقعہ ۵۶: ۱۳۔ "پہلے والوں میں بہت اور بعد والوں میں کم۔"

[2] عن اسانید المختلفۃ۔ "سب سے بہتر میرا زمانہ ہے، پھر اس سے کم، اس کے بعد کا زمانہ ہے، پھر اس کے بعد کا۔"

[3] عن اسانید المختلفۃ۔ "اسلام آیا، تو اجنبی تھا، اور عنقریب، یہ پھر اجنبی ہو جائے گا۔"

بات کا قطعی فیصلہ کر دیتا ہے کہ یہ دو الگ الگ روایتیں ہیں۔ چنانچہ ہمارے نزدیک ان روایتوں کو الگ الگ سمجھنا ضروری ہے۔ اس وجہ سے ہم ان کی شرح بھی الگ الگ کریں گے۔

پہلی روایت

عن ابن عمر قال. قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يجمع الله هذه الأمة على الضلالة أبدا.	''ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ میری امت کو کبھی ضلالت پر جمع نہیں کرے گا۔'

مشکلات اور ان کا حل

'جمع نہ کرنے' سے مراد یہ ہے کہ ملت' اپنے تمام افراد کے ساتھ کبھی ضلالت یا گمراہی اختیار نہیں کرے گی، بلکہ کچھ لوگ' ہر زمانے میں' ضرور حق پر قائم رہیں گے۔

۲۔ گمراہی اختیار کرنے سے مراد، دین کے کسی جزو میں گمراہی بھی مراد ہو سکتی ہے اور پورے دین میں بھی، اور اسی طرح اصول میں اور فروع میں بھی۔ آپ کے اس فرمان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ، چونکہ ملت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوگی، اس لیے اگر وہ کسی بات پر جمع ہو جائے، تو وہ بات' یقیناً' حق ہوگی۔ اس کے بارے میں ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ یہ رائے قرآن و حدیث کے مسلّمات کے خلاف ہے۔

حدیث کا سادہ مفہوم

ملّت اپنے تمام افراد کے ساتھ کبھی ضلالت پر جمع نہیں ہوگی، بلکہ اہلِ حق کی، قلیل یا کثیر جماعت' ہر زمانے میں موجود رہے گی۔

قرآن مجید میں بنیاد

اس روایت کی بنیاد قرآنِ مجید کی اس آیت پر ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُونُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ	''اسی طرح ہم نے تمھیں ایک بہترین امت بنایا، تاکہ تم لوگوں پر (اس دین کی) شہادت

الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ دینے والے بنو، اور یہ رسول تم پر شہادت دے۔'
(البقرہ ۲: ۱۴۳)

امت اسلامیہ کو اس منصب پر فائز کرنے کا یہ لازمی تقاضا تھا کہ وہ جس حق کی شہادت کے لیے برپا کی جا رہی ہے، وہ حق ہمیشہ زندہ رہے۔ چنانچہ اس کے لیے ملت میں دو اہتمام کیے گئے ہیں: ایک یہ کہ قرآن مجید کو ہر قسم کی کمی بیشی اور تحریف سے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس امت کے اندر، ہمیشہ کے لیے ایک گروہ کو حق پر قائم کر دیا گیا، تاکہ حق کے طالبوں کے لیے ان کا علم و عمل مشعل راہ کا کام دیتا رہے۔ ہماری زیر بحث روایت میں اسی دوسرے اہتمام کے نتیجے کو بیان کیا گیا ہے کہ ملت کے اندر، چونکہ اہل حق کا ایک گروہ ہمیشہ موجود رہے گا، اس لیے پوری ملت کبھی گمراہی پر جمع نہ ہو گی۔

وضاحت حدیث

اگر اس آیت کی روشنی میں اس روایت کو سمجھا جائے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ملت، بحیثیت مجموعی، ضلالت پر کبھی جمع نہ ہو گی۔ اس میں ہمیشہ اہل حق کا ایک گروہ موجود رہے گا، تاکہ حق کے طالبوں کے لیے، ان کا علم و عمل شمع راہ بنا رہے اور خلق کو قرآن و سنت کی ہدایت کی جو روشنی مطلوب ہے، وہ کبھی گل نہ ہونے پائے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کے الفاظ میں یہ پہاڑی کے وہ چراغ ہیں، جن سے راہ ڈھونڈنے والے اپنی منزل پائیں گے۔ یہی چراغ ہر ظلمت میں روشن رہیں گے اور باطل کے ہر طوفان کے مقابلے میں حق کی حمایت میں اپنی لو کو مزید بڑھاتے رہیں گے۔

چنانچہ، اس طرح کے لوگ خواہ ان کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو، اس امت میں ہمیشہ باقی رہیں گے۔ فتنوں کا کیسا ہی زور ہو، ضلالت امت کے رگ و ریشے میں کتنی ہی گہری اتر جائے، خوب، جب ناخوب اور بدعت، جب سنت قرار پا جائے، تو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ اس امت کے ایک حصے کو حق پر قائم رکھے گا۔ وہ اپنے زمانے میں حق کی منادی کرتے رہیں گے، اور ان کے علم و تقویٰ کا معاشرے پر بہت رعب ہو گا۔ یہی بات ایک اور موقع پر آپ نے ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے:

لا تزال طائفة فی أمتی قائمة "میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ اللہ کے حکم پر

بامر الله لا یضرھم من خذلھم او خالفھم حتی یاتی أمر اللہ وھم ظاھرون علی الناس۔	قائم رہے گا، جو کوئی ان کو دبانا چاہے یا ان کی مخالفت کرے گا، تو وہ ان کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکے گا، یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ سنا دیا جائے، اس وقت تک، یہ گروہ لوگوں پر غالب رہے گا۔"

(مسلم، کتاب الامارہ)

زیر بحث روایت سے، عام طور پر، یہ مطلب سمجھا جاتا ہے کہ ملت، چونکہ ضلالت پر جمع نہیں ہو سکتی، اس لیے جب بھی یہ کسی بات پر جمع ہو جائے، تو وہ بات، یقیناً، حق ہو گی۔ ہمارے نزدیک یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے وجوہ ہم مضمون کی تمہید میں بیان کر آئے ہیں۔ یہاں اتنی بات مزید واضح رہے کہ روایت کے الفاظ سے یہ منطقی نتیجہ نکالنے کو تو نکالا جا سکتا ہے اگر یہ متکلم کا منشا نہیں ہے۔ وہ تو صرف یہ بشارت سنانا چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حق کو باقی رکھنے کا یہ اہتمام کر دیا ہے، چنانچہ پوری کی پوری ملت اپنے کسی دور میں بھی گمراہ نہ ہو گی، بلکہ اس میں اہل حق کا ایک گروہ ہمیشہ رہے گا۔

دوسری روایت

ید اللہ علی الجماعة، فإذا شذ الشاذ منھم إختطفته الشیاطین، فإذا رأیتم إختلافا فاتبعوا السواد الأعظم فإنه من شذ، شذ فی النار۔	"نظم اجتماعی (ریاست) پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ تو جو اس سے الگ ہوا، شیاطین اسے اچک لے جائیں گے چنانچہ جب تم (اس میں) اختلاف پاؤ، تو (اس کے ساتھ وابستہ رہنے کے لیے) سوادِ اعظم کی رائے کی پیروی کرو۔ اس لیے کہ جو الجماعة سے الگ ہوا، وہ دوزخ میں پڑا۔"[1]

مشکلات اور ان کا حل

'ید اللہ علی الجماعة': "نظم اجتماعی (ریاست) پر اللہ کا ہاتھ ہے۔" 'ید اللہ' علیہ رحمت اور سرپرستی سے کنایہ ہے۔ یعنی ان پر اللہ کی رحمت سایہ فگن رہے گی اور اللہ انھیں اپنی پناہ اور نگرانی میں رکھے گا۔ "السلطان ظل اللہ علی الارض"[2] کا اسلوب اور مضمون بھی یہی ہے۔ اس میں

[1] خطبہ مسنونہ، عن اسانید المختلفة۔

'الجماعة' (نظمِ اجتماعی یا ریاست) کے ساتھ وابستگی کی برکات کی طرف اشارہ ہے۔

'الجماعة' سے مراد مسلمانوں کا نظمِ اجتماعی (ریاست) ہے۔ ریاست بنا کر ایک منظم قوم کی حیثیت سے رہنا مسلمانوں پر لازم کیا گیا ہے۔

'السواد الاعظم' سے مراد قوم و ملت کی اکثریت ہے۔ اس حکم کا تعلق نظمِ سیاسی سے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا عطف 'ید اللہ علی الجماعة' پر ہوا ہے۔ چنانچہ سیاسی نظام میں قوم کے نمائندے، جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے 'العرفاء' کا نام دیا ہے، ان کی اکثریت بھی سوادِ اعظم ہے۔

حدیث کا سادہ مفہوم

ایک نظمِ اجتماعی (ریاست) کے تحت متحد اور منظم رہنے میں، اللہ کی رحمت ملت کے شاملِ حال رہے گی۔ اس سے الگ ہونے والا شیاطین کے نرغے میں آجائے گا۔ اس لیے نظمِ اجتماعی (ریاست) ہی سے وابستہ رہو۔ جب اختلاف ہو جائے، تو اس نظم کو چھوڑنے کے بجائے اکثریت کی رائے مان کر اس سے وابستہ رہو، تاکہ امتِ مسلمہ اور تم اللہ کی تائید و نصرت اور رحمت سے محروم نہ ہو۔

قرآنِ مجید میں بنیاد

اس روایت میں، آپ نے دو باتیں فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کی تائید 'الجماعة' ہی کو حاصل رہے گی۔ اور دوسرے یہ کہ اختلاف کی صورت میں سوادِ اعظم کی اتباع کی جائے، اور جس نے اس کی اتباع نہ کی، اس کی سزا دوزخ ہے۔ اب ہم قرآنِ مجید سے ان دونوں باتوں کی بنیاد الگ الگ بیان کریں گے۔

پہلی بات آپ نے یہ فرمائی کہ اللہ کی تائید 'الجماعة' ہی کو حاصل رہے گی۔ آپ کا یہ فرمان قرآنِ مجید کی درج ذیل آیات پر مبنی ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا	"اللہ کی رسی کو مضبوطی سے مل کر تھامے رہو، اور
وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ	تفرقے میں نہ پڑو، اللہ کے اس فضل کو یاد رکھو
اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ	کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، تو اللہ نے

قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ	تمھارے دلوں کو جوڑ دیا، اور تم آپس میں بھائی
اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى	بھائی بن گئے۔ اور تم آگ کے ایک گڑھے پر
شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَ	کھڑے تھے، تو اللہ نے تمھیں اس سے بچالیا۔
كُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ	اسی طرح اللہ تمھارے لیے اپنی آیات کو
اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ	واضح کرتا ہے، تاکہ تم راہ یاب ہو۔ اور اس لیے
تَهْتَدُوْنَ ۔ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ	چاہیے کہ تم میں ایک گروہ (اس اختیار کے ساتھ)
اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ	قائم ہو، جو نیکی کی دعوت دے، معروف کا حکم
يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ	دے، اور منکر سے روک دے، اور اپنے اندر اس
عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔	گروہ کو قائم کرنے والے ہی فلاح پائیں گے۔

(آل عمران ۳: ۱۰۳-۱۰۴)

ان آیات پر تدبر کی نگاہ ڈالی جائے، تو یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ ہم 'اعتصام بحبل اللہ' پر قائم رہنے اور تفرقے سے بچنے کے لیے اپنے اندر ایک نظم اجتماعی قائم کریں، 'ولتکن منکم امۃ' کا مطلب یہی ہے یعنی مسلمانوں پر یہ واجب کیا گیا ہے کہ وہ ایک حکمران کے تحت، ایک ہی سیاسی نظام میں متحد قوم کی حیثیت سے رہیں۔ اسی چیز کو اس حدیث میں 'الجماعۃ' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ملت اسلامیہ اگر اللہ کے اس حکم پر کاربند رہتی ہے تو، یقیناً اللہ تعالیٰ بھی اپنی رحمت اور تائید سے ملت اسلامیہ کو محروم نہ کریں گے۔ اسی بات کو قرآن مجید نے 'اولٰئک ھم المفلحون' کے الفاظ میں بیان کیا ہے، یعنی ایسا طریقہ اختیار کرنے والے اس دنیا اور آخرت، دونوں میں فوز و فلاح پائیں گے۔

اس روایت میں دوسری بات جو آپ نے فرمائی وہ یہ ہے کہ جب تم اختلاف دیکھو، تو سواد اعظم (اکثریت) کی پیروی کرو۔ آپ کا یہ فرمان قرآن کی آیت شوریٰ 'اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ'[1] پر مبنی ہے۔ سواد اعظم کی اتباع اس شورائی نظام کا لازمی تقاضا ہے، جس کا حکم قرآن مجید نے دیا ہے۔ اس کی وضاحت ہم آگے چل کر کریں گے۔

[1] الشوریٰ ۴۲: ۳۸، ان کا نظام ان کے باہمی مشورے پر مبنی ہے۔

وضاحتِ حدیث

ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ ملّتِ اسلامیہ پر، ایک حکومت کے تحت، متحد ہو کر رہنا واجب کیا گیا ہے۔ یہ، بحیثیتِ امت، اس کے فرائض میں سے ہے۔ اس روایت میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کی تعمیل سے حاصل ہونے والے ثمرات میں سے ایک کی طرف توجہ دلائی ہے، جس کا مقصد اس حکم کی تعمیل پر ابھارنا اور یہ سمجھانا ہے کہ اللہ کی تائید و نصرت کی مستحق متفرق جماعتیں نہیں، بلکہ ایک سیاسی نظم کی پابند ملت ہے، جو طوائف الملوکی کا شکار نہ ہو، جس کا نظام 'امرھم شوریٰ بینھم' کے اصول پر چلتا ہو، جو ایک ہی حکمران پر مجتمع ہو اور کسی منتشر بھیڑ کی طرح پراگندہ نہ ہو، کیونکہ نظامِ اجتماعی سے تخلف شیطانی چالوں میں سے ہے، جو قوموں اور ان کے افراد کو اتنا کمزور کر دیتی ہے کہ وہ اپنے دشمن اور شیطان کے نرغے میں بآسانی آ جاتے ہیں، جس کا نتیجہ اللہ کی تائید و نصرت سے محروم ہو جانا ہے، جبکہ ان دشمنوں کے مقابلے میں مضبوط و مستحکم ہونا اللہ کی تائید و نصرت کی علامت ہے۔

'جب تم اختلاف پاؤ تو سوادِ اعظم کی رائے کی پیروی کرو'۔ اس حکم کا تعلق سیاسی نظام سے ہے۔ شریعتِ اسلامیہ نے جس سیاسی نظام کے لیے، قانون سازی کی ہے، اس کے لیے بنیادی اصول یہ دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے باہمی مشورے پر چلے۔ چنانچہ جس سیاسی نظم (الجماعۃ) کی بنیاد باہمی مشورے (شوریٰ) کے اصول پر رکھی گئی ہے، اس میں اختلافی امور میں فیصلہ کرنے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ سوادِ اعظم (اکثریت) کی رائے ہی نافذ العمل مانی جائے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ اسلام کا نظامِ حکومت، چونکہ 'امرھم شوریٰ بینھم' کے اصول پر مبنی ہے۔ اس لیے یہ واضح سی بات ہے کہ جب بھی مشورہ لیا جائے گا، تو دو میں سے ایک صورت لازماً پیدا ہو گی: 'شوریٰ بالاجماع' کسی فیصلے پر پہنچ جائے گی یا اختلاف رائے ہو جائے گا۔ اختلاف کی صورت میں، اگر معاملہ افہام و تفہیم سے بھی طے نہ پائے، تو پھر دین کا حکم ہے کہ سوادِ اعظم، یعنی اکثریت کی رائے کو فیصلہ کن قرار دیا جائے۔ یہی حکم ہماری زیر بحث حدیث میں دیا گیا ہے کہ 'فاذا رأیتم إختلافا فاتبعوا السواد الأعظم'، کہ جب بھی اختلاف پیدا ہو جائے، تو اکثریت کی رائے کی پیروی کرو۔

یعنی اکثریت (سوادِ اعظم) کی رائے کی بنیاد پر قانون سازی کر لو، کیونکہ اختلاف کی صورت

میں فیصلہ کرنے کا یہی طریقہ قابلِ عمل اور نزاع سے بچانے والا ہے' اور اسی پر عمل پیرا ہو کر التزامِ جماعت پر قائم رہا جا سکتا ہے۔ یہ ٹھیک نہیں ہے کہ آدمی، محض اختلافِ رائے کی بنا پر، ملت کے نظمِ اجتماعی سے تخلف یا علیحدگی اختیار کر کے عتابِ الٰہی کا شکار بنے۔

چونکہ اس حکم کا تعلق سیاسی اور اجتماعی امور سے ہے' اس لیے ہم حکمران کے انتخاب، ملکی نظام کی تشکیل، قانون سازی، قانون سازی میں شریعت کے مدعا کی تعیین اور اہم قومی امور میں حکمتِ عملی کی ترتیب جیسے معاملات میں بصورتِ اختلاف و اتفاق، سوادِ اعظم کی رائے کی پیروی کے پابند ہیں۔

تخلف اختیار کرنے سے مراد یہ ہے کہ سوادِ اعظم کے طے کردہ قانون کی اتباع چھوڑ کر، محض رائے کے اختلاف کی بنا پر، ریاست کی نافرمانی اور اس سے تخلف کی راہ اختیار کی جائے۔ ایسا کرنے والا جہنمی ہے، کیونکہ وہ 'من فارق الجماعة مات ميتة جاهلية' (مسلم، کتاب الامارہ) کے حکم میں آتا ہے۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اسلامی ریاست میں کوئی آدمی اپنی ذاتی رائے رکھ ہی نہیں سکتا۔ ہماری مراد صرف یہ ہے کہ جب ایک اختلافی امر میں اتفاقِ رائے سے فیصلہ نہ ہو سکے، تو اکثریت کی رائے کو ملکی قانون کی صورت میں نافذ کر دیا جائے گا۔ نفاذ کے بعد وہ رائے ریاستی قانون ہے، جس کی اتباع ہر شخص پر لازم ہے۔ اختلافِ رائے کی بنیاد پر اس قانون کی خلاف ورزی نہیں کی جا سکتی، البتہ، جس کو اختلاف ہو، وہ اس قانون پر عمل کرتے ہوئے، اپنی رائے کے حق میں رائے عامہ ہموار کر سکتا، اور اسی طرح قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے اسے ملکی قانون بنانے کی کوشش بھی کر سکتا ہے۔

خلاصۂ بحث

زیرِ بحث روایت، درحقیقت دو روایتوں کا مجموعہ ہے۔ پہلی روایت میں، یہ فرمایا گیا ہے کہ اس ملت کے افراد کی ہدایت و راہنمائی کے لیے ہمیشہ صالح علما کا ایک گروہ موجود رہے گا۔ یہ اہتمام اس لیے کیا گیا ہے کہ ملت شہادتِ حق کی ذمہ داری ادا کر سکے۔

دوسری روایت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ ایک نظمِ سیاسی سے جڑ کر رہنے میں اللہ کی رحمت مسلمانوں کے شاملِ حال ہو گی۔ مسلمانوں پر ایک نظمِ اجتماعی سے وابستہ رہنا فرض کیا گیا ہے، اس

نظام کی بنیاد شوریٰ کے اصول پر رکھی گئی ہے۔ اختلاف کی صورت میں طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ اکثریت کی رائے کو فیصلہ کن مان کر نظام چلایا جائے، اور یہ ہدایت کی گئی ہے کہ محض اختلاف کی بنا پر نظمِ اجتماعی سے تخلف اختیار نہ کیا جائے، بلکہ اختلافِ رائے کے باوجود، اسی قانون پر چلا جائے جسے عوام یا عوام کے معتمد اربابِ حل وعقد کی اکثریت کی تائید حاصل ہو۔

دعا اور اعتراف

تاریخ اسلام کا ایک واقعہ وہ ہے جس کو مواخاۃ کہا جاتا ہے۔ مکے کے مسلمان جب مہاجر کی حیثیت سے مدینہ میں آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ، دو دو شخص، اللہ کی راہ میں بھائی بھائی بن جاؤ (تاخوا فی اللہ اخوین اخوین)۔ اس ہدایت کے مطابق ہر انصاری نے ایک مہاجر کو اپنا بھائی بنالیا۔ انصار نے اپنے تمام اثاثے کو تقسیم کرکے آدھا خود لیا اور آدھا اپنے مہاجر بھائی کو دے دیا۔ اس مواخاۃ کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ اس معاملے میں انصار نے یک طرفہ طور پر، جس کمالِ ایثار کا ثبوت دیا، اس کی کوئی دوسری مثال پوری معلوم تاریخ میں نہیں ملتی۔ انصار کے اعلیٰ سلوک سے خود مہاجرین بے حد متاثر تھے۔

حضرت انس روایت کرتے ہیں کہ مہاجرین نے کہا "اے خدا کے رسول، جس قوم کے یہاں ہم آئے ہیں، ان سے بہتر قوم ہم نے نہیں دیکھی۔ وہ کم میں بہترین ہمدردی کرنے والے ہیں اور زیادہ میں بہترین خرچ کرنے والے ہیں۔ وہ محنت میں ہماری طرف سے کافی ہو گئے اور پیداوار میں ہم کو شریک کرلیا۔ حتیٰ کہ ہم کو ڈر ہے کہ سارا اجر انھی کو نہ مل جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں، جب تک تم ان کی تعریف کرو اور اللہ سے ان کے لیے دعا کرتے رہو"

(سیرۃ ابن کثیر، ج ۲ ص ۳۲۸)

اس حدیث سے نہایت اہم اسلامی اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ زید کو بکر سے کچھ ملے، مگر زید کے پاس کوئی مادی چیز لوٹانے کے لیے نہ ہو تو وہ کیا کرے۔ ایسی حالت میں زید کو چاہیے کہ وہ بکر کے عطیے کا کھلے دل سے اعتراف کرے۔ اعتراف کا یہ احساس اتنا زیادہ گہرا ہو کہ زید کے دل سے بکر کے لیے دعائیں نکلنے لگیں۔ مال والے کے پاس دینے کے لیے اگر مال ہے، تو بے مال والے کے پاس بھی دینے کے لیے ایک چیز موجود ہے، اور وہ دعا اور اعتراف ہے۔ اور بلاشبہ دعا اور اعتراف کی اہمیت کسی مادی عطیہ سے کم نہیں۔

(بشکریہ 'الرسالہ')

جاوید احمد غامدی

”رسول کی بعثت کوئی معمولی واقعہ نہیں ہوتی۔ وہ کوئی اجنبی نہیں ہوتا جو عام لوگوں کے درمیان سے اٹھ کر دعوت کے لیے منبر سنبھال لیتا ہے۔ اس کی آمد سے پہلے نبیوں کی ایک بڑی جماعت اس کا تعارف کراتی ہے۔ اس تعارف میں ابہام ہوتا ہے نہ اجمال۔ اس میں اس کا وطن، اس کی دعوت کے خصائص، اس کا زمانہ، اس کی قوم، اس کی زندگی کے خاص خاص واقعات، اس کے ساتھیوں کی صفات، اس کا نام، غرض ہر چیز وضاحت کے ساتھ بتائی جاتی ہے۔ وہ آتا ہے تو اپنی دعوت کی ابتدا اسی حوالے سے کرتا ہے اور اپنے مخالفوں پر اتمام حجت کے لیے بار بار یہی کہتا ہے کہ: مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ۔ (الصف ۶۱:۶) یعنی میں تمھارے ہاں پہلے سے موجود پیشین گوئیوں کا مصداق بن کے آیا ہوں۔ وہ اسے ان کے سامنے اپنی صداقت کی قطعی دلیل کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔“

میزان

جاوید احمد غامدی

نبوّت و رسالت

نبوّت و رسالت کے الفاظ قرآن مجید میں مترادف کی حیثیت سے بھی آتے ہیں[1]، لیکن قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو الگ الگ اصطلاحات بھی ہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ۔ (الحج ۲۲ : ۵۲)

"اور ہم نے تم سے پہلے جو رسول اور نبی بھی بھیجا ہے تو جب بھی اس نے کوئی ارمان کیا، شیطان اس کے ارمان میں خلل انداز ہو گیا۔"

یہ الفاظ صریح ہیں کہ نبی اور رسول دو الگ الگ اصطلاحیں ہیں۔ زبان کا ذوق رکھنے والا کوئی شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا۔ ہمارے ارباب تاویل اس فرق کی نوعیت اگرچہ ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھ سکے ہیں، لیکن الفاظ جس مفہوم پر صاف دلالت کرتے ہیں، اسے انھوں نے بھی بیان کر دیا ہے۔ زمخشری اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

دلیل بیّن علی تغایر الرسول والنبی۔ (الکشاف، ج ۳، ص ۱۶۴)

"یہ الفاظ نبی اور رسول کے فرق پر دلیل واضح ہیں۔"

نبیوں کی جو خصوصیات عام طور پر معروف ہیں، وہ ہر رسول میں بھی ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبوّت کا منصب رسولوں کو بہرحال حاصل ہوتا ہے۔ وہ نبیوں ہی کی طرح خدا کی وحی انسانوں کو پہنچاتے ہیں۔ انھی کی طرح توحید اور معاد پر ایمان کی دعوت دیتے ہیں۔ تاہم بعض

---

[1] ملاحظہ ہو: البقرہ ۲: ۸۷، آل عمران ۳: ۱۸۳، المائدہ ۵: ۷۰۔

حیثیتوں سے ان کے مقام اور نبیوں کے مقام اور ان کی ذمہ داریوں اور نبیوں کی ذمہ داریوں میں فرق ہے۔ قرآنِ مجید اور دوسرے صحیفوں میں جگہ جگہ اس فرق کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس موضوع پر ان کتابوں کے ہر ہر مقام کا احاطہ کرنے کا یہ محل نہیں ہے۔ چند مابہ الامتیاز خصوصیات، البتہ ہم یہاں بیان کیے دیتے ہیں:

۱۔ نبیوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ اپنے سے پہلے آنے والے نبی کی پیش گوئیوں کا مصداق بن کر آتے ہیں۔ قرآنِ مجید اور قدیم صحیفوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نبی نے اپنے بعد آنے والے نبی کی بشارت دی ہے۔ نبی کو ماننے یا نہ ماننے پر چونکہ آدمی کے کفر و ایمان کا انحصار ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس معاملے میں یہ اہتمام فرمایا ہے کہ عام اہلِ حق کی طرح نبی محض اپنی سیرت اور اپنی تعلیمات ہی کے بل بوتے پر دعوت کے لیے کھڑا نہیں ہو جاتا، بلکہ آسمان کے بادشاہ کی طرف سے اپنا پروانۂ تقرر ساتھ لے کر آتا ہے۔

رسولوں کے باب میں یہ اہتمام غیر معمولی ہو جاتا ہے۔ ان سے پہلے آنے والا نبی ہی نہیں، نبیوں کی ایک پوری جماعت انسانوں پر اتمامِ حجت کے ساتھ اُن کی منادی بھی کرتی ہے۔ وہ ان کے مولد و موطن اور ان کے احوال و وقائع، غرض ہر چیز کی خبر صاف الفاظ میں دیتی ہے۔ وہ خدا کی زمین سے اپنا کام مکمل کرنے کے بعد رخصت ہوتی ہے تو اپنے ماننے والوں سے اس پیش گوئی کی حفاظت کا عہد لیتی ہے۔ یہاں تک کہ بعثتِ رسول کی خبر نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی ہوئی اس قوم تک پہنچ جاتی ہے، جس میں اس کا آنا مقدر ہوتا ہے۔ ہمارے اس نقطۂ نظر کی شہادتیں قرآنِ مجید، تورات اور اناجیلِ اربعہ میں جگہ جگہ موجود ہیں۔ اسرائیلی سلسلہ کے آخری رسول حضرت مسیح علیہ السلام ہیں۔ ان کے بارے میں نبیوں کی پیشین گوئیاں ہم یہاں نقل کیے دیتے ہیں، ان سے واضح ہو جائے گا کہ رسولوں کے باب میں اس اہتمام کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔

تورات میں ہے:

"دیکھو میں اپنا رسول بھیجوں گا اور وہ میرے آگے راہ درست کرے گا اور خداوند جس کے تم طالب ہو، ناگہاں اپنی ہیکل میں آ موجود ہو گا۔ ہاں، عہد کا رسول جس کے تم آرزو مند ہو، آئے گا۔ رب الافواج فرماتا ہے: پر اس کے آنے کے دن کی کس میں تاب ہے۔ اور جب اس کا ظہور

ہوگا تو کون کھڑا رہ سکے گا؟ کیونکہ وہ سنار کی آگ اور دھوبی کے صابون کی مانند ہے۔ اور وہ چاندی کو تانے اور پاک صاف کرنے والے کی طرح بیٹھے گا اور بنی لاوی کو سونے اور چاندی کی مانند پاک صاف کرے گا تاکہ وہ راست بازی سے خداوند کے حضور ہدیے گزرانیں۔ تب یہوداہ اور یروشلم کا ہدیہ خداوند کو پسند آئے گا جیسا ایامِ قدیم اور گزشتہ زمانے میں۔"

(ملاکی: باب ۳، آیت ۱-۴)

اناجیل میں ہے:

"اے یوسف ابنِ داؤد اپنی بیوی مریم کو اپنے ہاں لے آنے سے نہ ڈر کیونکہ جو اس کے پیٹ میں ہے وہ روح القدس کی قدرت سے ہے۔ اس کے بیٹا ہوگا اور تو اس کا نام یسوع رکھنا کیونکہ وہی اپنے لوگوں کو ان کے گناہوں سے نجات دے گا۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ جو خداوند نے اپنے نبی کی معرفت کہا تھا وہ پورا ہو کہ: دیکھو ایک کنواری حاملہ ہوگی اور بیٹا جنے گی اور اس کا نام عمانوایل رکھیں گے۔"

(متی: باب ۱، آیت ۲۰-۲۳)

"اور اس نے قوم کے سب سردار کاہنوں اور فقیہوں کو جمع کرکے ان سے پوچھا کہ مسیح کی پیدائش کہاں ہونی چاہیے؟ انھوں نے اس سے کہا کہ یہودیہ کے بیتِ لحم میں، کیونکہ نبی کی معرفت یوں لکھا گیا ہے کہ: اے بیتِ لحم یہوداہ کے علاقے، تو یہوداہ کے حاکموں میں ہرگز سب سے چھوٹا نہیں ہے، کیونکہ تجھ میں سے ایک سردار نکلے گا جو میری امت اسرائیل کی گلہ بانی کرے گا۔"

(متی: باب ۲، آیت ۴-۶)

"اور خواب میں ہدایت پا کر گلیل کے علاقہ کو روانہ ہوگیا اور ناصرہ نام ایک شہر میں جا بسا تاکہ جو نبیوں کی معرفت کہا گیا تھا وہ پورا ہو کہ وہ ناصری کہلائے گا۔"

(متی: باب ۲، آیت ۲۲-۲۳)

"جب اس نے سنا کہ یوحنا پکڑوا دیا گیا تو گلیل کو روانہ ہوا اور ناصرہ کو چھوڑ کر کفرنحوم میں جا بسا، جو جھیل کے کنارے زبولون اور نفتالی کی سرحد پر ہے تاکہ جو یسعیاہ نبی کی معرفت کہا گیا تھا وہ پورا ہو کہ: زبولون کا علاقہ اور نفتالی کا علاقہ۔ دریا کی راہ یردن کے پار۔ غیر قوموں کی گلیل۔ یعنی جو لوگ

اندھیرے میں بیٹھے تھے انھوں نے بڑی روشنی دیکھی اور جو موت کے ملک اور سایہ میں بیٹھے تھے ان پر روشنی چمکی۔"

(متی: باب ۴، آیت ۱۲-۱۶)

"یسوع یہ معلوم کرکے وہاں سے روانہ ہوا اور بہت سے لوگ اس کے پیچھے ہو لیے اور اس نے سب کو اچھا کر دیا اور ان کو تاکید کی کہ مجھے ظاہر نہ کرنا تاکہ جو یسعیاہ نبی کی معرفت کہا گیا تھا وہ پورا ہو کہ: دیکھو یہ میرا خادم ہے جسے میں نے چُنا۔ میرا پیارا جس سے میرا دل خوش ہے۔ میں اپنا روح اس پر ڈالوں گا اور یہ غیر قوموں کو انصاف کی خبر دے گا۔ یہ نہ جھگڑا کرے گا نہ شور اور نہ بازاروں میں کوئی اس کی آواز سُنے گا۔ یہ کچلے ہوئے سرکنڈوں کو نہ توڑے گا۔ اور دھواں اٹھتے ہوئے سن کو نہ بجھائے گا جب تک کہ انصاف کی فتح نہ کرائے اور اس کے نام سے غیر قومیں امید رکھیں گی۔"

(متی: باب ۱۲، آیت ۱۵-۲۰)

"یہ سب باتیں یسوع نے بھیڑ سے تمثیلوں میں کہیں اور بغیر تمثیل کے وہ ان سے کچھ نہ کہتا تھا، تاکہ جو نبی کی معرفت کہا گیا تھا وہ پورا ہو کہ: میں تمثیلوں میں اپنا منہ کھولوں گا۔ میں ان باتوں کو ظاہر کروں گا جو بنائے عالم سے پوشیدہ رہی ہیں۔"

(متی: باب ۱۳، آیت ۳۴-۳۵)

حضرتِ یحییٰ کے بارے میں تو اناجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بعثت کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ اپنے بعد آنے والے کی راہ صاف کریں۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے یسعیاہ نبی کی طرح بیابان میں پکارنے والے کی طرح پکارا اور حضرتِ مسیح کی رسالت کی منادی اس طرح کی کہ دشت و جبل گونج اٹھے۔ انجیل مرقس میں ہے:

"اور یوحنا اونٹ کے بالوں کا لباس پہنے اور چمڑے کا پٹکا اپنی کمر سے باندھے رہتا اور ٹڈیاں اور جنگلی شہد کھاتا تھا۔ اور یہ منادی کرتا تھا کہ میرے بعد وہ شخص آنے والا ہے جو مجھ سے زور آور ہے۔"

(باب ۱، آیت ۶-۷)

قرآنِ مجید نے اسی بنا پر ان کے بارے میں فرمایا ہے:

أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَىٰ مُصَدِّقًا "اللہ تجھے یحییٰ کی بشارت دیتا ہے جو اللہ

بِكَلِمَةٍ ۔ (آلِ عمران ۳ : ۳۹) کے ایک کلمہ کی تصدیق کرنے والا ہے۔"

حضرتِ مسیح نے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو وہ جیل میں تھے۔ انھوں نے وہیں سے اپنے شاگردوں کی معرفت کہلوا بھیجا کہ: "آنے والا تو ہی ہے یا ہم دوسرے کی راہ دیکھیں"۔ حضرتِ مسیح نے جواب دیا: "جو کچھ تم سنتے اور دیکھتے ہو جا کر یوحنا سے بیان کر دو کہ اندھے دیکھتے اور لنگڑے چلتے پھرتے ہیں۔ کوڑھی پاک صاف کیے جاتے اور بہرے سنتے ہیں، اور مردے زندہ کیے جاتے ہیں، اور غریبوں کو خوشخبری سنائی جاتی ہے۔" (متی: باب ۱۱، آیت ۲-۵)

مسیح علیہ السلام کی خصوصیات انھوں نے جس طرح بیان کی ہیں، ان سے منصبِ رسالت کے بعض دوسرے پہلو بھی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

> "میں تم کو توبہ کے لیے پانی سے بپتسمہ دیتا ہوں، لیکن جو میرے بعد آتا ہے، وہ مجھ سے زور آور ہے۔ میں اس کی جوتیاں اٹھانے کے لائق نہیں۔ وہ تم کو روح القدس اور آگ سے بپتسمہ دے گا۔ اس کا چھاج اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ اپنے کھلیان کو خوب صاف کرے گا اور اپنے گیہوں کو تو کھتے میں جمع کرے گا مگر بھوسی کو اس آگ میں جلائے گا جو بجھنے کی نہیں۔"
>
> (متی: باب ۳، آیت ۱۱-۱۲)

قرآنِ مجید نے بھی ان کے بارے میں یہی بات کہی ہے:

وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۔ (آلِ عمران ۳ : ۵۵)

"اور میں (اے عیسیٰ ابنِ مریم) تیری پیروی کرنے والوں کو قیامت تک اُن لوگوں پر غالب کرنے والا ہوں جنھوں نے تیرا انکار کیا۔"

یعنی بھوسی کو اس آگ میں جلانے والا ہوں جو کبھی نہ بجھے گی۔

نبیوں اور رسولوں کے اس مقدس سلسلہ کے خاتم نبیِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ کی بعثت کی خبر حضرت ابراہیم سے لے کر حضرت مسیح تک نبیوں ہی نہیں، جلیل القدر رسولوں نے بھی دی ہے۔ اسرائیلی سلسلہ کے سب سے جلیل القدر رسول حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل پر واضح کر دیا تھا کہ آنے والا نبی بنی اسماعیل میں سے ہوگا۔ اس کے لیے انھوں نے 'تیرے بھائیوں میں

سے‘ یا ’انھی کے بھائیوں میں سے‘ کے الفاظ استعمال کیے جن کا واضح مطلب یہی ہے کہ آخری نبی کی بعثت بنی اسماعیل میں ہوگی۔

" خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی سننا ۔ ۔ ۔ ۔ اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ان کے لیے انھی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا۔ اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔"

(استثنا: باب ۱۸، آیت ۱۵-۱۹)

استثنا میں ہے:

''خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر آشکارا ہوا، وہ کوہِ فاران سے جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی۔"

(باب ۳۳، آیت ۲)

حضرت مسیح کی پیشین گوئیاں اناجیل میں ان الفاظ میں مذکور ہیں:

"یسوع نے ان سے کہا کہ کیا تم نے کتابِ مقدس میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہوگیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے۔ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہی تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی۔ اور جو اس پتھر پر گرے گا اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے، مگر جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔"

(متی: باب ۲۱، آیت ۴۲-۴۴)

''اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔"

(یوحنا: باب ۱۴، آیت ۳۰)

قرآن مجید میں بھی ان پیشین گوئیوں کا حوالہ موجود ہے۔ سورۂ اعراف میں اہل ایمان کی صفات بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ۔ (۷: ۱۵۷)	"جو پیروی کریں گے اس نبی امی رسول کی جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔"

حضرت مسیح کے بارے میں تو معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح حضرت یحییٰ نے ان کی منادی کی، اسی طرح وہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت دینے کے لیے آئے تھے۔ قرآن مجید نے مزید وضاحت کی ہے کہ انھوں نے یہ بشارت آپ کے نام مبارک کی تصریح کے ساتھ دی۔ سورۂ صف میں ہے:

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ۔ (۶۱: ۶)	"اور جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا کہ اے بنی اسرائیل میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں۔ ان پیشین گوئیوں کے مصداق جو مجھ سے پہلے تورات میں موجود ہیں اور ایک رسول کی بشارت دیتا ہوا آیا ہوں جو میرے بعد آئے گا۔ اس کا نام احمد ہوگا۔"

اثبات مدعا کے لیے ایک آدھ حوالہ کافی تھا، لیکن ہم نے ان پیشین گوئیوں کا تفصیل کے ساتھ تذکرہ اس حقیقت کی وضاحت کے لیے کیا ہے کہ رسول کی بعثت کوئی معمولی واقعہ نہیں ہوتی۔ وہ کوئی اجنبی نہیں ہوتا جو عام لوگوں کے درمیان سے اٹھ کر دعوت کے لیے منبر سنبھال لیتا ہے۔ اس کی آمد سے پہلے نبیوں کی ایک بڑی جماعت اس کا تعارف کراتی ہے۔ اس تعارف میں ابہام ہوتا ہے نہ اجمال۔ اس میں اس کا وطن، اس کی دعوت کے خصائص، اس کا زمانہ، اس کی قوم، اس کی زندگی کے خاص خاص واقعات، اس کے ساتھیوں کی صفات، اس کا نام، غرض ہر چیز وضاحت کے ساتھ بتائی جاتی ہے۔ وہ آتا ہے تو اپنی دعوت کی ابتدا اسی حوالے سے کرتا ہے اور اپنے مخالفوں پر اتمام حجت کے لیے بار بار یہی کہتا ہے کہ: مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ۔ (الصف ۶۱: ۶) یعنی میں تمھارے ہاں پہلے سے موجود پیشین گوئیوں کا مصداق بن کے آیا ہوں۔ وہ اسے ان کے

سامنے اپنی صداقت کی قطعی دلیل کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے :

اَوَلَمۡ یَکُنۡ لَّهُمۡ اٰیَةً اَنۡ یَّعۡلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ۔ (الشعراء ۲۶: ۱۹۷)

"کیا ان کے لیے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ بنی اسرائیل کے علما اسے جانتے ہیں؟"

۲۔ رسولوں کے بارے میں اس اہتمام کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کی زمین پر خدا کی کامل حجت بن کر آتے ہیں۔ وہ آفتاب نیم روز کی طرح قوم کے آسمان پر چمکتے ہیں۔ کوئی دانا و بینا کسی دلیل و برہان کی بنا پر ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کو کسی حال میں ان کی تکذیب کرنے والوں کے حوالے نہیں کرتا۔ نبیوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی قوم ان کی تکذیب ہی نہیں کرتی، بارہا ان کے قتل کے درپے ہو جاتی ہے۔ اور ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ اس میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ تورات کا اپنا بیان ہے کہ زکریا کو عین ہیکل سلیمانی میں مقدس اور قربان گاہ کے درمیان سنگسار کر دیا گیا[1]۔ یرمیاہ نبی رسی سے باندھ کر کیچڑ بھرے حوض میں لٹکا دیے گئے[2]۔ حضرت یحییٰ کا سر قلم کر کے ہیرودیس نے اپنی محبوبہ کی نذر کر دیا[3]۔ قرآن مجید نے بھی یہود کی فرد قرار داد جرم میں نبیوں پر اس تعدی کا ذکر اکثر مقامات پر کیا ہے۔ لیکن قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولوں کے معاملے میں اللہ کا قانون اس سے مختلف ہے۔

چنانچہ دیکھیے :

حضرت ابراہیم کے لیے اُن کی قوم نے الاؤ دہکایا تو آسمان سے فرمان صادر ہوا :

یٰنَارُ کُوۡنِیۡ بَرۡدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰۤی اِبۡرٰهِیۡمَ۔ (الانبیاء ۲۱: ۶۹)

"اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور ابراہیم کے لیے سلامتی بن جا۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے بنی اسرائیل کو 'بیاباں میں تین دن کی راہ' لے جانے کا مطالبہ کیا تو تمام قبطیوں میں ایک ہلچل برپا ہو گئی۔ اس وقت ان کو قتل کی دھمکی دی گئی اور اندیشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں یہ لوگ آپ کو سنگسار ہی نہ کر دیں تو بنی اسرائیل کے اس عظیم پیغمبر نے

---

[1] ۲۔ تواریخ : باب ۲۴، آیت ۲۱۔

[2] یرمیاہ : باب ۳۸، آیت ۶۔

[3] مرقس : باب ۶، آیت ۱۷۔ ۲۹۔

انھیں پُر وقار تنبیہ کی :

اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَ رَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ۔ وَ اِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِیْ فَاعْتَزِلُوْنِ ۔	"مَیں نے تمھارے اور اپنے پروردگار کی پناہ چاہی اس بات سے کہ تم مجھے سنگ سار کرو اور تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو میری راہ چھوڑ دو۔"
(الدخان ۴۴ : ۲۰ ۔ ۲۱)	

حضرت مسیح کو یہود نے صلیب پر چڑھانے کا فیصلہ کر لیا تو فرشتوں نے ان کی روح ہی قبض نہیں کی، اُن کا جسم بھی اٹھا کر لے گئے کہ مبادا یہ سرپھری قوم اس کی توہین کرے ۔ یہود نے اگرچہ یہ گناہ اپنے سر لینے کی جسارت کی ہے، لیکن قرآن نے جس لب و لہجے میں اس کی تردید کی، اس کے تیور دیکھنے کے قابل ہیں ۔ سورہ نساء میں ہے :

وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ، وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ ۔ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ، وَمَا قَتَلُوْهُ یَقِیْنًا ، بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا ۔	"اور ان کے اس دعوے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم اللہ کے رسول کو قتل کیا ۔ حالانکہ نہ انھوں نے اس کو قتل کیا، نہ صلیب پر چڑھایا، بلکہ معاملہ ان کے لیے مشتبہ کر دیا گیا ۔ اور جن لوگوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا، وہ اس معاملے میں شک میں مبتلا ہیں ۔ ان کے پاس اس کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے ۔ وہ بس گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور انھوں نے اس کو ہرگز قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف اٹھا لیا اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔"
(۴ : ۱۵۷ ۔ ۱۵۸)	

نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم نے آپ کے قتل کا فیصلہ کیا اور دارالندوہ کی سازش کے نتیجے میں قریش کے بڑے بڑے خاندانوں کے تیغ بند جوان آپ کے گھر کا محاصرہ کر کے کھڑے ہو گئے تو آپ ان کے سر پر خاک ڈال کر اس طرح نکل گئے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

سورۂ انفال میں ہے:

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ۔ (۸ : ۳۰)

"اور یاد کرو جب کہ یہ کافر تمھارے بارے میں سازش کر رہے تھے کہ تم کو قید کر دیں یا قتل کر دیں یا مکہ سے نکال باہر کریں۔ وہ سازش کر رہے تھے اور اللہ بھی تدبیر فرما رہا تھا اور اللہ بہترین تدبیر فرمانے والا ہے۔"

ام القریٰ سے نکل جانے کے بعد سراقہ نے آپ کا تعاقب کرنے کی کوشش کی تو اس کے گھوڑے کی ٹانگیں زمین میں دھنس گئیں۔ غار کے ساتھی نے اپنا اندیشہ ظاہر کیا تو غیر معمولی اطمینان کے ساتھ جواب ملا: لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (التوبہ ۹: ۴۰) "غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔" قرآن مجید نے اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے مزید وضاحت کی کہ اس وقت ہم نے رسول کی تائید کے لیے اپنے لشکر اتارے۔ سورۂ توبہ میں ہے:

فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا۔ (۹ : ۴۰)

"پھر اللہ نے اس پر اپنی سکینت نازل فرمائی، اور اس کی مدد ایسی فوجوں سے کی جو تم نے نہیں دیکھیں۔"

۳۔ اس اہتمام و حفاظت کے ساتھ رسولوں کے ذریعے سے خدا کی حجت پوری ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ انھیں غلبہ عطا فرماتے ہیں۔ نبی اپنی قوم کے مقابلے میں ناکام ہو سکتا ہے، لیکن رسولوں کے لیے غلبہ لازمی ہے۔ عام اس سے کہ یہ ان کی زندگی میں حاصل ہو جائے یا ان کی وفات کے بعد ان کے ساتھیوں کو حاصل ہو۔ قرآن مجید میں یہ قانون جگہ جگہ تاکید و صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ سورۂ مجادلہ میں ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اُولٰٓئِكَ فِي الْاَذَلِّيْنَ۔ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ اِنَّ اللّٰهَ

"بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں وہ ذلیل ہو کر رہیں گے۔ اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول بہرحال غالب رہیں گے۔ بے شک اللہ

قَوِیٌّ عَزِیْزٌ۔ (۵۸: ۲۰-۲۱) قوی و عزیز ہے۔"

سورۂ فتح میں مسلمانوں کو تسلّی دیتے ہوئے پادشاہِ کائنات نے اپنا یہ قانون ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

وَلَوْ قٰتَلَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا	"اور اگر یہ کافر تم سے جنگ کرتے تو مغلوب
لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا یَجِدُوْنَ وَلِیًّا	ہو کر پیٹھ پھیرتے۔ پھر یہ کوئی کارساز پاتے نہ
وَّلَا نَصِیْرًا۔ سُنَّۃَ اللّٰہِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ	مددگار۔ یہ اللہ کی ٹھہرائی ہوئی سنّت ہے جو
مِنْ قَبْلُ، وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ	پہلے سے چلی آرہی ہے اور اللہ کی سنّت میں
تَبْدِیْلًا۔ (۴۸: ۲۲-۲۳)	تم ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔"

رسولوں کو یہ غلبہ بالعموم ان کی زندگی ہی میں حاصل ہو جاتا ہے[1]۔ لیکن جن رسولوں کی وفات ہی ان کی ہجرت کی قائم مقام ہوئی، اُن کے بعد اُن کے پیرو بہرحال اپنے مخالفوں پر غالب آئے۔ چنانچہ مسیح علیہ السلام کو جسم و روح کے ساتھ قبض کر لینے کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا:

اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسٰی، اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ	"جب اللہ نے کہا، اے عیسیٰ میں تجھے
وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَ مُطَھِّرُکَ مِنَ	قبض کر لینے والا ہوں، اور تجھے اپنی طرف
الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ	اٹھا لینے والا ہوں، اور کافروں سے تجھے پاک
اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْآ	کرنے والا ہوں اور تیری پیروی کرنے والوں
اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ۔	کو قیامت تک ان لوگوں پر غالب کرنے والا
(آلِ عمران ۳: ۵۵)	ہوں، جنھوں نے تیرا انکار کیا۔"

۴۔ یہ رسولوں کی بعثت کا ایجابی پہلو ہے۔ سلبی پہلو سے اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ جس قوم کی طرف مبعوث ہوتے ہیں، ان کی ہجرت کے بعد، اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ اس عام تباہی سے اگر کچھ لوگ بچتے ہیں تو صرف وہ جنھیں اپنی بستی کے سرداروں کے زبردست ہونے کی

---

[1] سورۂ صف کی آیت: 'ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ' (۶۱: ۹) میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہی حقیقت بیان ہوئی ہے۔

وجہ سے آزادی کے ساتھ دعوتِ حق پر غور کرنے کا موقع نہیں ملا ہوتا۔ جن لوگوں پر یہ عذاب آتا ہے، من حیث القوم، وہ بہرحال ہلاک کر دیے جاتے ہیں۔ اس عذاب کے بارے میں اللہ کا قانون یہ ہے کہ جب تک رسول قوم کے درمیان موجود ہوتا ہے، وہ محفوظ رہتی ہے۔ رسول کی ہجرت کے بعد، عام اس سے کہ وہ کسی اور خطۂ ارض کی طرف ہو یا خدا کی طرف، یہ آتا ہے اور اس شان سے آتا ہے کہ زمین تھراتی ہے اور آسمان پناہ مانگتا ہے۔ قرآنِ مجید میں اس اصول کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ، وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ۔ وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ، اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (الانفال ۸: ۳۳-۳۴)	"اور اللہ ان پر عذاب نازل کرنے والا نہ تھا جب کہ تم ان میں موجود تھے۔ اور نہ اللہ کا یہ قاعدہ ہے کہ لوگ استغفار کر رہے ہوں اور وہ ان پر عذاب نازل کرے۔ اور اب کیوں نہ وہ انھیں عذاب دے گا جب کہ وہ مسجدِ حرام سے روک رہے ہیں۔ حالاں کہ وہ اس کے متولی نہیں، اس کے متولی تو خدا سے ڈرنے والے ہو سکتے ہیں مگر ان میں سے اکثر اس بات کو نہیں جانتے۔"

'وما كان الله معذبهم وهم يستغفرون' میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم قریش کو دعوتِ استغفار ہے اور مراد اس سے یہ ہے کہ اب جب کہ رسول ان کے درمیان میں نہیں ہے اور خدا کی حجت ان پر پوری ہو چکی ہے تو اس کا عذاب کسی وقت بھی انھیں آ لے گا۔ لیکن مہلت کے اس عرصے میں اگر یہ استغفار کریں اور حق کو قبول کر لیں تو اللہ کی رحمت انھیں اپنی آغوش میں لے لے گی۔

قریش کو رسول کی ہجرت کے بعد یہ مہلت کیوں ملی؟ اس کی وضاحت ہم ان شاء اللہ آگے اس کے محل میں کریں گے۔ یہاں اس قانون کا صرف یہ پہلو نگاہ میں رہے کہ رسول قوم کے لیے امان ہوتا ہے۔ قوم کے اندر اس کی موجودگی کے معنی ہی یہ ہیں کہ ابھی اس میں زندگی کی رمق

باقی ہے۔ لیکن جب کوئی قوم اس امان سے محروم ہو جاتی ہے تو زمین پر اس کے قیام کی مدت بھی پوری ہو جاتی ہے۔ رسول کے ذریعے سے اتمامِ حجت کے بعد اگر کوئی چیز باقی رہ جاتی ہے تو صرف یہ کہ آسمان کے پردے کھول دیے جائیں اور انسان کا خالق بارگاہِ جلال سے خود ہم کلام ہو۔ لیکن یہ کشفِ حجاب خدا کے قانونِ آزمایش کے خلاف ہے۔ اس لیے رسول کے چلے جانے کے بعد اس کی قوم کا پیمانۂ حیات لبریز ہو جاتا ہے اور خدا کا عذاب زمین کو اس کے وجود سے پاک کر دیتا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں اس قانون کی وضاحت ان الفاظ میں ہوئی ہے:

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا۔ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا۔ (۱۷: ۷۶-۷۷)

"اور یہ تمھارے قدم اس سرزمین سے اکھاڑ دینے پر تلے ہوئے ہیں تاکہ تمھیں یہاں سے نکال باہر کریں۔ اور اگر ایسا ہوا تو تمھارے بعد یہ خود بھی یہاں کم ہی رہیں گے۔ یاد رکھو کہ ہم نے تم سے پہلے اپنے جو رسول بھیجے ان کے معاملے میں ہماری یہ مستقل سنت رہی ہے اور تم ہماری سنت میں کوئی تغیر نہ پاؤ گے۔"

سورۂ غافر میں یہ قانون اس طرح بیان ہوا ہے:

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ۔ فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ۔ (۴۰: ۷۷)

"پس ثابت قدم رہ۔ بے شک اللہ کا وعدہ حق ہے۔ یا تو ہم تمھیں اس عذاب کا کچھ حصہ جس کی وعید ہم انھیں سنا رہے ہیں، دکھا دیں گے یا تمھیں وفات دیں گے، پھر وہ ہماری طرف لوٹائے جائیں گے۔"

سورۂ ابراہیم میں اس کے سلبی اور ایجابی دونوں پہلوؤں کو اس طرح واضح کیا ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا فَاَوْحٰى

"اور کافروں نے اپنے رسولوں سے کہا کہ یا تو ہم تمھیں اپنے ملک سے نکال باہر کریں گے یا تمھیں ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا تب

اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ۔	ان کے رب نے ان کی طرف وحی کی کہ ہم
وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ	ان ظالموں ہی کو ہلاک کردیں گے اور ان کے
بَعْدِهِمْ۔ (۱۴: ۱۳-۱۴)	بعد تمھیں زمین میں آباد کریں گے۔"[1]

اس عذاب کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ قرآنِ مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کے کافروں کے لیے دو حالتوں میں سے کوئی نہ کوئی حالت ضرور ظہور میں آجاتی ہے۔

رسول کے ساتھیوں کی تعداد قلیل ہوتی ہے تو برأت وہجرت کے بعد رسول کے بستی سے نکلتے ہی ساف و حاصب کا طوفان اٹھتا ہے اور ان کی بستیوں کو الٹ دیتا ہے۔ خدا کی عدالت زمین پر لگتی ہے اور حق و باطل کے درمیان فیصلہ ہوجاتا ہے۔ کافروں کی بستیاں کھنڈروں میں تبدیل ہوجاتی ہیں تاکہ بعد میں آنے والے اہلِ حق ان کے حوالے سے انسانوں پر خدا کی حجت قائم کریں۔ بستیوں کے مالک آخر وقت تک اسی گمان میں مبتلا رہتے ہیں کہ بادل ان کی سوکھی کھیتیوں کو سیراب کرنے کے لیے اُمڈ آئے ہیں۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ان کے محلات زمین بوس ہوجاتے ہیں۔ کھیتیاں اجڑ جاتی ہیں۔ پہاڑ ریزہ ریزہ ہوجاتے ہیں۔ پلک جھپکنے میں وہ سب کچھ ختم ہوجاتا ہے جس کے بل بوتے پر وہ رسول کا انکار کر رہے تھے۔ عذاب میں کبھی ہوا کی تباہ کاریاں غالب ہوتی ہیں اور کبھی پانی کی ہلاکت خیزیاں۔ قوم کے کارفرما عناصر اور مترفین و مستکبرین بہرحال تباہ ہوجاتے ہیں۔ ان کے اتباع وعوام نے اگر آزادیِ رائے کے ساتھ رسول کا انکار کیا ہوتا ہے تو وہ بھی اس طوفان کی نذر ہوجاتے ہیں۔ ان میں سے آخر وقت تک اپنے سرداروں کے ہاتھوں مجبور و بے بس رہنے کی وجہ سے کچھ لوگ اگر بچ جاتے ہیں تو جرمِ ضعیفی کی سزا انھیں بھی مل کر رہتی ہے اور وہ اِدھر اُدھر پراگندہ ہوکر، جس کو جہاں پناہ ملنے کی توقع ہوتی ہے، اسی طرف کا رخ کرلیتے ہیں۔ قرآنِ مجید کے الفاظ میں:

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ	"اور ان سے پہلے کتنی ہی قومیں ہم نے ہلاک
قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا	کر چھوڑیں، جو ان سے قوت میں کہیں بڑھ کر

---

[1] وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (النور ۲۴: ۵۵) وغیرہ کے وعدے بھی، ہمارے نزدیک، دراصل اسی قانون سے متعلق ہیں۔

فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ، هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ۔ (ق ۵۰: ۳۶)	تھیں، تو جس کا جدھر سینگ سمایا ادھر کو بستیوں میں نکل کھڑا ہوا کہ ہے کوئی پناہ کی جگہ؟"

قرآن نے ان ہلاکت خیزیوں کا ذکر جگہ جگہ کیا ہے لیکن سورۂ قمر (۵۴) میں اس کی تاریخ جس جامعیت و اختصار کے ساتھ بیان ہوئی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ سورہ کے ایک ایک لفظ سے غضب ابلا پڑ رہا ہے۔ کلام کی بلاغت اپنے عروج پر ہے۔ ایک ایک قوم کی سرگزشتِ نقمت کا حوالہ دینے کے بعد قریش کو خطاب کیا ہے اور دیکھیے کہ کس اسلوب میں خطاب کیا ہے:

اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ۔ اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَ يُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ۔ (۴۳—۴۵)	"تمھارے کفار کیا ان سب سے بہتر ہیں یا تمھارے لیے کتابوں میں برأت لکھی ہوئی ہے۔ کیا کہتے ہیں ہم مضبوط جتھا ہیں، تو عنقریب یہ جتھا شکست کھا جائے گا اور پیٹھ دکھا کر بھاگے گا۔"

قومِ نوح پر عذاب کا واقعہ اس سورہ میں اس طرح بیان ہوا ہے:

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا وَقَالُوْا مَجْنُوْنٌ وَّازْدُجِرَ۔ فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ۔ فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ۔ وَ فَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ۔ وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ۔ تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا، جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ۔ وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً	"ان سے پہلے قوم نوح نے انکار کیا اور ہمارے بندے کو جھٹلایا اور کہا کہ دیوانہ ہے اور اسے جھڑکا گیا۔ پس اس نے اپنے رب کو پکارا کہ میں مغلوب ہو گیا۔ پس تو ان سے انتقام لے۔ تو ہم نے آسمان کے دروازے موسلا دھار بارش کے ساتھ کھول دیے اور زمین کے چشمے پھوٹ نکلے اور پانی اس مقام پر پہنچ گیا جو اس کے لیے ٹھیرایا گیا تھا اور ہم نے اسے تختوں اور کیلوں والی پر اٹھا لیا۔ وہ ہماری آنکھوں کے سامنے بہتی تھی۔ یہ تھا بدلہ اس کے لیے جس کا انکار کیا گیا۔

فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ۔ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ۔ (۹ — ۱۶)

اور ہم نے اس زمین کو عذاب کی نشانی بنا کر چھوڑا، تو ہے کوئی نصیحت پانے والا۔ پھر کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھیں میری تنبیہات۔"

قوم عاد پر یہ ہلاکت اس طرح نازل ہوئی:

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ۔ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ۔ تَنْزِعُ النَّاسَ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ۔ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ۔ (۱۸ — ۲۱)

"عاد نے جھٹلایا تو کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھیں میری تنبیہات۔ ہم نے ان پر بادِ صرصر مسلط کر دی قائم رہنے والی نحوست کے دن میں، جو لوگوں کو اس طرح اکھاڑ پھینکتی تھی گویا وہ کھجور کے کھوکھلے تنوں کے بوتے ہیں۔ پھر کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھیں میری تنبیہات۔"

ثمود اس طرح تباہ ہوئے:

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ۔ فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ ، اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ۔ ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ۔ سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ۔ اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ۔ وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ،

"ثمود نے تنبیہات کو جھٹلایا اور کہنے لگے: کیا ہم اپنے ہی اندر کے ایک آدمی کی پیروی کریں؟ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ ہم بہک گئے ہیں اور جس آگ سے یہ ڈراتا ہے فی الواقع اس میں جا پڑے ہیں۔ کیا ہمارے درمیان یہی رہ گیا تھا کہ اس پر خدا کا ذکر نازل کیا گیا۔ نہیں، بلکہ یہ جھوٹا اور برخود غلط ہے۔ ہاں، کل ہی جان لیں گے کہ کون جھوٹا اور برخود غلط ہے۔ ہم اونٹنی کو ان کے لیے آزمایش بنا کر بھیج رہے ہیں تو اب ذرا صبر کے ساتھ

كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ۔ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ۔ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِىْ وَنُذُرِ۔ اِنَّا اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ۔

(۲۳ - ۳۱)

دیکھتا رہ۔ اور ان کو جتادے کہ پانی تقسیم ہے ان کے اور اونٹنی کے درمیان۔ ہر ایک اپنی باری کے دن پانی پر آئے گا۔ پس انھوں نے اپنے بڑے کو پکارا تو اس نے ہاتھ چلایا اور اونٹنی کو مار ڈالا۔ پھر انھوں نے دیکھ لیا کہ کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھیں میری تنبیہات۔ ہم نے ان پر ایک ہی ڈانٹ بھیجی اور وہ باڑے والے کی روندی ہوئی باڑ کی مانند ہو گئے۔"

قوم لوط کی داستانِ عبرت یوں بیان ہوئی ہے:

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍ بِالنُّذُرِ۔ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ، نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ۔ نِعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا۔ كَذٰلِكَ نَجْزِىْ مَنْ شَكَرَ۔ وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ۔ وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ فَذُوْقُوْا عَذَابِىْ وَنُذُرِ۔ وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ۔

(۲۳ - ۳۸)

"قوم لوط نے تنبیہات کو جھٹلایا۔ ہم نے ان پر حاصب بھیجی۔ صرف لوط کے پیرو اس سے محفوظ رہے۔ ہم نے صبح ہوتے ہی ان کو بچا کر نکال دیا۔ یہ انعام تھا ہماری طرف سے۔ ہم اسی طرح شکرگزاروں کو جزا دیتے ہیں۔ لوط نے اپنی قوم کو ہماری پکڑ سے ڈرایا تھا مگر وہ اس کی تنبیہات کو باتوں میں اڑاتے رہے۔ اور انھوں نے اسے مہمانوں کی حفاظت سے روکا تو ہم نے ان کی آنکھیں موند دیں۔ پس چکھو میرے عذاب اور میری تنبیہات کا مزہ اور صبح سویرے ہی ایک نہ ٹلنے والے عذاب نے انھیں آلیا۔"

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ یہ عذاب صرف اس صورت میں آتا ہے جب کہ رسول کے ساتھی قلیل تعداد میں ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر وہ معتد بہ تعداد میں ہوں اور رسول کو ہجرت

کے بعد کسی جگہ سیاسی اقتدار حاصل ہو جائے تو انکار کرنے والوں کو کچھ مہلت مل جاتی ہے۔ اس دوران میں رسول کے پیرو اپنی صفوں کو مضبوط کرتے اور اپنی جمعیت کی تنظیم کرتے ہیں۔ پھر ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے درمیان کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ اس کشمکش کے پہلے مرحلے میں قوم کے لیڈر اور مترفین جماعتِ حق کی تلواروں کا لقمہ بنتے ہیں۔ یہ تلواریں خدائی تازیانہ بن کر ان کی پیٹھ پر برستی ہیں۔ ساف وحاصب کی طرح ان پر چھا جاتی ہیں۔ ابر و باد کی طرح ہر طرف سے یلغار کرتی ہیں۔ خدا کے فرشتے ان کے سروں اور ان کی گردنوں اور ان کے پور پور کر ان کے سامنے لاتے اور زبانِ حال سے کہتے ہیں :

فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ۔ (الانفال ۸ : ۱۲)

"مارو ان کی گردنوں پر اور مارو ان کے جوڑ جوڑ پر۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ مرحلہ جنگِ بدر کے موقع پر آیا اور قریش کے وہ تمام سردار جن کے ایمان لانے کا اب کوئی امکان نہ تھا، اس معرکہ میں ختم ہو گئے۔ یہ صرف ابولہب تھا، جس نے اس عذاب سے بچنے کی کوشش کی اور جنگ میں شامل نہیں ہوا۔ چنانچہ قریش کے اکابر میں سے یہ واحد شخص تھا، جس کا نام لے کر قرآن نے پیش گوئی کی کہ :

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ۔
مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ۔
سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ
وَّامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ
فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ۔ (اللھب ۱۱۱)

"ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ خود بھی ختم ہوا۔ نہ اس کا مال اس کے کام آیا اور نہ جو کچھ اس نے کمایا۔ وہ شعلہ زن آگ میں پڑے گا اور (اس کے ساتھ) اس کی بیوی بھی، ایندھن ڈھوتی ہوئی۔ اس کے گلے میں بٹی ہوئی رسی ہو گی۔"

بدر کی شکست کے سات دن بعد یہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہو گئی اور بنی ہاشم کے اس سردار کا عدسہ کی بیماری سے اس طرح خاتمہ ہوا کہ مرنے کے بعد بھی تین دن تک کوئی اس کے پاس نہ آیا، یہاں تک کہ اس کی لاش سڑ گئی اور اس کی بدبو پھیلنے لگی۔ آخر کار ایک گڑھا کھدوایا گیا اور لکڑیوں سے دھکیل کر اس کی لاش اس میں پھینک دی گئی۔

یہ پہلا مرحلہ تھا۔ اس کے بعد دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ اس میں مخالفوں کے قلعے اکھڑ جاتے

ہیں۔ ان کی قوت پارہ پارہ ہو جاتی ہے اور وہ ہر لحاظ سے ڈگ ڈال دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ تیسرے مرحلے میں چند مہینوں کی مہلت دے کر الٹی میٹم دے دیا جاتا ہے کہ وہ اسلام یا تلوار میں سے جسے چاہیں قبول کریں۔

قریش کو یہ الٹی میٹم سورۂ توبہ میں دیا گیا۔ چنانچہ قرآن کی یہ تنہا صورت ہے جس کی ابتدا چونکہ عذاب کی خبر سے ہوئی ہے، اس وجہ سے اس پر کلمۂ رحمت، یعنی 'بسم اللہ'، نہیں لکھی جاتی۔ ارشاد فرمایا ہے:

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ۔ (۹: ۱-۲)

"ان مشرکین کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ برأت ہے جن سے تم نے معاہدے کیے تھے۔ سو اب ملک میں چار ماہ پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کے قابو سے باہر نہیں جا سکتے اور اللہ نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اب کافروں کو رسوا کر کے رہے گا۔"

اس کے بعد یہ لوگ الٹی میٹم کی اس مدت میں ایمان لے آتے ہیں یا ہمیشہ کے لیے زمین سے مٹا دیے جاتے ہیں۔ رسولوں کے بارے میں یہ اللہ کی قطعی سنت ہے جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ولن تجد لسنة الله تبديلا۔

ترتیب : طالب محسن

"عقلی وجود کے تزکیے کا راستہ کیا ہے؟ عقل اِن آفات سے کیسے نجات پا سکتی ہے؟ قرآنِ مجید سے معلوم ہوتا ہے اور عقل سے بھی یہی بات سامنے آتی ہے کہ اس کا راستہ صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ عقل اپنے سامنے موجود سوالات کا صحیح جواب پا لے۔ اس دنیا کے بارے میں، اس کائنات کے بارے میں، اور خود اس کے اپنے بارے میں جو بنیادی سوالات پیدا ہوتے ہیں، ان کا جواب اسے مل جائے۔ وہ جان لے کہ اس کا اپنا منبع کیا ہے، وہ کہاں سے آئی ہے، اسے کیا حیثیت حاصل ہے، اس کا مقصود کیا ہے، یہ کائنات کیسے وجود میں آئی ہے اور اس کی منزل کیا ہے؟

ان سارے عقدوں کی شاہِ کلید پروردگارِ کائنات کی معرفت اور اس کی صفات کا صحیح شعور ہے۔ جب عقل اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت پا لیتی ہے، تو مسائل کے اندھیرے چھٹ جاتے اور اوہام کی تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ، وہ راستہ کھل جاتا ہے، جس پر چل کر عقل تزکیے کی منازل طے کر لیتی ہے۔"

فکر و نظر

تزکیۂ نفس

ـ ۲ ـ

عقلی وجود کا تزکیہ

[جاوید احمد صاحب غامدی کے سلسلۂ محاضرات سے ماخوذ]

انسان کے لیے سب سے زیادہ باعثِ شرف چیز اس کی عقل ہے۔ یہ فطرت کی ایک غیرمعمولی نعمت ہے، جو انسان کو ودیعت کی گئی ہے۔ انسان کو جو چیزیں دوسرے جان داروں سے ممتاز کرتی ہیں، انھی میں سے ایک یہ عقل ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی تندرست ہے، صحیح الاعضا ہے، رعنا جوان ہے، اس میں کوئی کمی نہیں، لیکن اس کی عقل مفلوج ہو جائے تو ہم اسے پاگل ٹھہرا دیتے ہیں۔ وہ شکل وصورت سے تو ایک انسان ہی ہوتا ہے، مگر بسا اوقات، اس کی زندگی حیوانوں سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ آج نظر آنے والی انسان کی تہذیبی، تمدنی اور سائنسی ترقی اسی عقل کی منت کش ہے۔ پچھلی دو صدیوں میں مادی علوم کی کرشمہ سازیاں اور انسانی علوم کی دریافتیں اسی عقل کی عنایات ہیں۔ یہی عقل ہے جس کے بل پر انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ کائنات کا یہ عقدہ سلجھا لے گا اور اپنے تمام مسائل خود ہی حل کرے گا۔

یہ عقل، بلاشبہ ایک عظیم نعمت ہے، لیکن اس کے ساتھ کچھ آفات بھی لگی ہوئی ہیں۔ یہ شہوات کے پیچھے اندھی ہو جاتی، رغبات اسے لبھا لیتیں، جذبات اس پر غالب آجاتے اور تعصبات اسے معطل کر دیتے ہیں۔ یہ اپنے ہی وجود سے رشوت لے لیتی اور اپنے ہی بنائے ہوئے دام میں پھنس جاتی ہے۔ بسا اوقات، اس پر تساہل طاری ہو جاتا اور انفرادی ہی نہیں، اجتماعی سطح پر بھی کسل مندی کا شکار ہو جاتی ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اس کا تزکیہ ہو، اسے ان آلودگیوں سے پاک کیا جائے اور اس کے سامنے ایک برتر مقصد رکھا جائے، تاکہ یہ اپنا عمل صحیح رخ پر انجام دے اور صحیح نتائج تک پہنچے۔

عقلی وجود کے تزکیے کا راستہ کیا ہے؟ عقل اِن آفات سے کیسے نجات پا سکتی ہے؟ قرآنِ مجید سے معلوم ہوتا ہے اور عقل سے بھی یہی بات سامنے آتی ہے کہ اس کا راستہ صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ عقل اپنے سامنے موجود سوالات کا صحیح جواب پالے۔ اس دنیا کے بارے میں، اس کائنات کے بارے میں اور خود اس کے اپنے بارے میں جو بنیادی سوالات پیدا ہوتے ہیں، ان کا جواب اسے مل جائے۔ وہ جان لے کہ اس کا اپنا منبع کیا ہے، وہ کہاں سے آئی ہے، اسے کیا حیثیت حاصل ہے، اس کا مقصود کیا ہے، یہ کائنات کیسے وجود میں آئی ہے اور اس کی منزل کیا ہے؟

ان سارے عقدوں کی شاہ کلید پروردگارِ کائنات کی معرفت اور اس کی صفات کا صحیح شعور ہے۔ جب عقل اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت پالیتی ہے تو مسائل کے اندھیرے چھٹ جاتے اور اوہام کی تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ، وہ راستہ کھل جاتا ہے، جس پر چل کر عقل تزکیے کی منازل طے کر لیتی ہے۔

پروردگار کی معرفت کیا ہے؟ ہمارے ہاں اس کے بارے میں دو نقطۂ نظر پائے جاتے ہیں۔ ایک نقطۂ نظر کا تعلق اہلِ تصوف سے ہے اور دوسرا نقطۂ نظر وہ ہے، جس کا ماخذ قرآنِ مجید کی نصوص ہیں۔ اہلِ تصوف کے نزدیک یہ ایک ابتدائی سی بات ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی صفات اور ان صفات کے حوالے سے اپنے اوپر عائد ہونے والی ذمہ داریوں کا ادراک حاصل کر لیں۔ ان کے نزدیک اصل منتہیٰ جسے پانا چاہیے، وہ ذاتِ الٰہی کی معرفت ہے۔ اور یہ معرفت بھی اس طرح حاصل ہونی چاہیے کہ قلب ذاتِ الٰہی کے انوار وتجلیات کا مشاہدہ اور نفسِ انسانی ذاتِ الٰہی سے ہم کنار ہو جائے اور اسے ذات کے لحاظ سے پالے۔ جب کہ دوسری طرف قرآنِ مجید کے نزدیک، ذاتِ باری تعالیٰ کا براہِ راست علم اور مشاہدہ ممکن نہیں۔ دنیا میں سب سے بڑی ہستی، پیغمبر کی ہستی ہوتی ہے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب ذاتِ باری تعالیٰ کے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، تو انھیں جواب ملا کہ تم اس کا تحمل نہیں کر سکتے۔ پھر ذات نہیں، بلکہ صفات ہی کی ایک تجلی نے پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے بطلِ جلیل ہوش وحواس کھو بیٹھے اور اپنی قامت پر کھڑے نہ رہ سکے۔ اس دنیا میں یہ اصول نہیں ہے کہ انسان جو کچھ چاہے اسے دے دیا جائے۔ قاعدہ یہ ہے کہ انسان جس چیز کا تحمل نہیں رکھتا، وہ اسے نہیں دی جاتی۔ اور اگر وہ اس کے درپے ہو جاتے، تب بھی یہ اسے مل تو نہیں جاتی، البتہ کبھی کبھار الٹا نقصان کا باعث بن جاتی ہے۔ مثال کے طور پر، ہماری آنکھیں یہ طاقت نہیں رکھتیں کہ وہ سورج کا براہِ راست مشاہدہ کر سکیں۔ لہٰذا

جو بھی اس کی سعی کرے گا، اس کے لیے یہ تو ممکن نہیں کہ وہ سورج کا مطالعہ کرے، البتہ اپنی آنکھیں ضرور خیرہ کر سکتا ہے۔

قرآنِ مجید کے نزدیک وہ معرفت، جو عقل کے تزکیے کا ذریعہ بنتی ہے، اللہ تعالیٰ کی حقیقی معرفت ہے۔ مطلب یہ کہ یہ ایقان حاصل ہو کہ اس کائنات کے پیچھے فرماں روا کی حیثیت سے ذاتِ باری تعالیٰ موجود ہے۔ پھر یہ بات مکمل تفصیل کے ساتھ جانی جائے کہ اس کی صفات کیا ہیں؟ وہ رحیم ہے، رحمان ہے، خالق ہے، مالک و آقا ہے، پروردگار ہے، ہادی و رہنما ہے، کائنات پر اسی کی حکومت ہے۔ غرض، پروردگار کی جو صفات بھی ہمارے سامنے ظہور کرتی ہیں، ہمیں ان کا کامل ادراک حاصل ہو۔ یہ چیز بھی پروردگارِ کائنات کی معرفت ہی کا حصہ ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا طریقہ معلوم ہو جائے۔ پروردگار کے ساتھ ہمارا آقا اور بندے، اور عبد اور معبود کا تعلق ہے؛ چنانچہ یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ تعلق کیسے نباہا جائے، تاکہ اس کے نتیجے میں ہمارا آقا اور ہمارا معبود ہم سے راضی ہو جائے، ہمیں اس کی خوشنودی اور تقرب حاصل ہو اور ہم اس کے پسندیدہ بندوں میں شمار ہوں۔ اسی طرح معرفتِ الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ ہمیں علم ہو کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں افراد اور اقوام کے ساتھ کیسے معاملہ کر رہے ہیں۔ وہ کیا ضابطہ ہے جو انسانوں کی زندگیوں میں انفرادی حیثیت سے کارفرما ہے اور وہ کیا قاعدہ ہے جو نوعِ بشر کی اقوام و ملل میں جاری و ساری ہے۔ اقوام و افراد کے معاملے میں جاری قانونِ مکافات سے آگاہی اس لیے بھی بہت اہم ہے کہ فرد پر قوم اثر انداز ہوتی اور قوم پر افراد کے اعمال اپنے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ انسان اس قانون کا علم حاصل کرے، تاکہ اس کی روشنی میں اپنا لائحۂ عمل طے کر سکے۔ اور آخری چیز جسے، اس باب میں، اپنے علم میں لے آنا ضروری ہے، وہ اس حیاتِ دنیوی کا مقصد ہے۔ کیا یہ زندگی ہی سب کچھ ہے یا معاملہ اس سے آگے بھی جائے گا۔ کیا اس دنیا میں انسان جو کچھ پا لیتا ہے، اور یہاں جو کچھ کر لیتا ہے، اسی پر معاملہ ختم ہو جائے گا یا اس کے نتائج و عواقب بھی سامنے آئیں گے اور اسے اپنے کیے کا بدلہ بھی ملے گا؟

پروردگارِ کائنات کی معرفت کے مختلف پہلوؤں کے اجمالی ذکر کے بعد، اب ہمارے پیشِ نظر یہ سوال ہے کہ اس معرفت کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟ صوفیہ کے ہاں، چونکہ، اللہ تعالیٰ کو باعتبارِ ذات پا لینا ہی اصل منزل ہے، لہٰذا ان کے نزدیک، اس کا طریقہ بھی مختلف ہے۔ وہ کشف، الہام، ریاضت، مجاہدے اور مراقبے کو اس کے ذرائع میں شمار کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں انسان کا یہ خاکی وجود تقرب

کی راہ کی اصل رکاوٹ ہے۔ لہٰذا ان کی تمام سعی و جہد کا مقصود یہی ہوتا ہے کہ وہ اس حیوانی وجود سے چھٹکارا اور نجات پالیں، تاکہ اصل انسان جو ذاتِ باری ہی کا ایک شمہ ہے اپنے مقصود کو پالے۔ وہ اس قابل ہو جائے کہ حقیقت کا مشاہدہ عیاناً کر سکے، بلکہ، وہ اس سے آگے اس حقیقت کو جان لے کہ حق اصل میں وہ خود ہے۔ ان کے نزدیک، اس سفرِ معرفت میں کیا حاصل ہوتا ہے، اس کی ایک جھلک غزالی کی تصنیف 'المنقذ من الضلال' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"اس راہ کے مسافروں کو مکاشفات و مشاہدات کی نعمت ابتدا ہی میں حاصل ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ بیداری کی حالت میں نبیوں کی ارواح اور فرشتوں کا مشاہدہ کرتے، ان کی آوازیں سنتے اور ان سے فائدے حاصل کرتے ہیں۔"

قرآنِ مجید میں پروردگار کی معرفت کا مفہوم، جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں، یہ نہیں ہے۔ چنانچہ، اس کے نزدیک، اس کا راستہ بھی وہ نہیں، جسے صوفیہ بیان کرتے ہیں اور جس کی طرف اشارہ ہم نے اوپر کی سطور میں کیا ہے۔ قرآنِ مجید اس کا راستہ 'تعقل'، 'تفکر' اور 'تذکر' قرار دیتا ہے۔ یہ تینوں قرآنِ مجید کی اصطلاحات ہیں اور ان کا ایک واضح مفہوم قرآنِ مجید کے مطالعے سے سامنے آتا ہے۔

'تعقل' یہ ہے کہ تعصبات کے بجائے عقل کو فیصلہ کن حیثیت دی جائے۔ آدمی تعصبات، جذبات اور رغبات کا شکار ہونے کے بجائے عقل کے فیصلے کو برتری دے، اُن دلائل کی بنیاد پر رد و قبول کا فیصلہ کرے، جن سے عقل مطمئن ہوتی ہے اور کسی خواہش اور تعصب کو اس فیصلے تک پہنچنے کی راہ میں حائل نہ ہونے دے۔ قرآنِ مجید میں توحید کے دلائل زیرِ بحث ہوں یا آخرت کا معاملہ، حقائق پر غور کی دعوت دینے کے لیے، بالعموم، "افلا تعقلون" کے الفاظ آتے ہیں اور اس سے قرآنِ مجید کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اپنے تعصبات اور خواہشات سے بلند ہو کر ان دلائل و مباحث کا جائزہ لو۔

'تفکر' یہ ہے کہ آدمی انفس و آفاق پر غور کرے۔ انفس سے مراد خود انسان کا اپنا وجود اور اس کا باطن ہے، اس کا وجدان اور اس کی فہم و ادراک کی صلاحیت ہے اور یہ وصف ہے کہ وہ تجزیہ کر سکتا اور نتائج نکال لیتا ہے۔ آفاق کا اطلاق ہماری دنیا اور ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات پر ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ انفس و آفاق پر غور کرنے کا ایک طریقہ وہ ہے جسے سائنس دانوں نے اختیار کیا ہے، لیکن ان کی سعی 'کیا ہے؟' کا جواب پانے تک محدود ہے، جب کہ 'تفکر' کا تعلق 'کیوں ہے؟' اور 'کہاں سے ہے؟' جیسے سوالات سے ہے۔ ظاہر ہے، یہ سائنسی طریقۂ غور سے آگے کی منزل ہے۔ اس کے نتائج اور ہیں اور اُس کے نتائج اور ہیں۔ قرآنِ مجید میں جگہ جگہ انفس و آفاق کے مختلف مظاہر پر اسی

طریقے سے، غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور قرآن یہ چاہتا ہے کہ اس غور و فکر کا جو بھی نتیجہ نکلتا ہے، اسے ایک جرأت مند آدمی کی طرح قبول کر لیا جائے اور اس کے جو تقاضے بھی سامنے آتے ہیں، انھیں استقلال کے ساتھ پورا کیا جائے۔

'تذکر' سے قرآنِ مجید کی مراد ان بدیہیات کی یاد تازہ کرنا ہے، جنھیں ہم تعقل و تفکر کے ذریعے سے سمجھ لیتے ہیں۔ جب ان سے انحراف کا امکان پیدا ہو یا یہ ذہن سے محو ہونے لگیں تو آدمی متنبہ ہو جائے اور یاد دہانی حاصل کرلے۔ قرآنِ مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کا وہ واقعہ اس تذکر کی ایک نہایت عمدہ مثال ہے، جب انھیں زلیخا نے لبھانے کی کوشش کی اور گناہ پر آمادہ کرنے کے لیے سب داؤ آزما ڈالے۔ اس موقع پر، انھیں جس چیز نے اس آلودگی سے بچایا، وہ اللہ تعالیٰ کی ایک برہان تھی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۔

"وہ ان کے درپے پہلے ہی تھی، وہ بھی اس کی طرف راغب ہو جاتا اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتا۔"

(یوسف ۱۲: ۲۴)

یہ برہان، درحقیقت، وہ نورِ یزدانی ہے، جو، اگرچہ، ہر انسان کو ودیعت کیا گیا ہے، لیکن اس طرح کی آزمایش کے موقع پر یہ کام انھی کے آتا ہے، جو اس کی قدر کرتے رہے ہوں۔ حضرت یوسف علیہ السلام اللہ کے ایسے ہی پارسا اور پاکیزہ نفس بندے تھے۔ انھوں نے زلیخا کی خواہش کے باوجود اپنے مالک کے پیچھے خیانت سے صاف انکار کر دیا۔ زلیخا نے اپنی سی سعی کر کے بچ نکلنے کے تمام راستے مسدود کر دیے۔ امکان پیدا ہو گیا کہ حضرت یوسف اس کے جال میں آجائیں، لیکن ان کے اندر موجود نورِ یزدانی چمکا، تاریکیاں کافور ہو گئیں، اور وہ برائی سے بچ گئے۔ یہ، دراصل، اس سعی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام تھا، جو انھوں نے اپنا دامن پاک رکھنے کے لیے کی تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو عام حالات میں برائیوں سے بچاتے رہتے ہیں، جب وہ ایسے حالات میں گھر جائیں کہ بظاہر بچنا مشکل نظر آتا ہو تو اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرتے اور انھیں برائی سے بچا لیتے ہیں۔

'تعقل'، 'تفکر' اور 'تذکر' عقلی وجود کے گراں قدر وظائف ہیں۔ یہ تینوں، بلاشبہ، نہایت بیش بہا ہیں، لیکن ان کے ساتھ کچھ آفات بھی لگی ہوئی ہیں۔ 'تعقل' کے لیے، بسا اوقات، ممکن نہیں رہتا کہ وہ

جذبات، تعصبات اور رغبات سے پیچھا چھڑا لے؛ 'تفکر' مظاہرِ فطرت کے مادی پہلو کا اسیر ہو جاتا ہے، جیسا کہ اس سائنسی دور میں یہ چیز بہت غالب آگئی ہے۔ اور 'تذکر' میں بعض اوقات شیطان کا الہام شامل ہو جاتا اور اس کی وسوسہ اندازیاں غلبہ پا لیتی ہیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ایک ایسا طریقہ دریافت ہو جس کے ذریعے سے 'تعقل'، 'تفکر' اور 'تذکر' ان آفات سے محفوظ ہو جائیں اور اپنا کام صحیح نہج پر انجام دیں۔ قرآنِ مجید کے نزدیک، اس کا راستہ خود قرآنِ مجید پر تدبر ہے۔ معاملات پر غور میں 'تعقل'، صحیفۂ کائنات پر 'تفکر' اور وجدان میں ودیعت بدیہات سے 'تذکر' صرف ایک ہی صورت میں ان آفات سے محفوظ رہ سکتے ہیں، جب یہ سارا عمل قرآنِ مجید پر تدبر کی روشنی میں ہو۔ اس باب میں قرآنِ مجید کی حیثیت ایک رہنما اور ایک حاکم کی ہے۔ جس طرح عقل کے بغیر ایک انسان پاگل ہو جاتا ہے، اسی طرح وحی یعنی قرآنِ مجید کی رہنمائی کے بغیر عقل باؤلی ہو جاتی ہے۔ قرآنِ مجید صحیفۂ حق ہے۔ اس زمین پر اسے تنہا ہدایتِ ربانی کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ کائنات کے پروردگار کا کلام ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے، جس کے عجائب کبھی ختم ہونے والے نہیں۔ جس طرح اس کی حکومت سب پر قائم ہے۔ شافعی و مالک پر، اشعری و ماتریدی پر، اور بخاری و مسلم پر، اسی طرح اس کا حکم عقل، فکر، اور ذکر پر بھی چلتا ہے۔

مختصر یہ کہ عقل جہاں ایک عظیم نعمت ہے، وہاں اس کے ساتھ آفات بھی لگی ہوئی ہیں۔ اس کے تزکیے کے لیے خدا کی سچی معرفت ضروری ہے اور اس معرفت کا راستہ 'تعقل'، 'تفکر' اور 'تذکر' ہے۔ 'تعقل'، 'تفکر' اور 'تذکر' کو بے راہ ہونے سے بچانے کا طریقہ یہ ہے کہ قرآنِ مجید میں تدبر کیا جائے، یعنی عقل اپنے یہ وظائف قرآنِ مجید کی روشنی میں انجام دے۔ تزکیۂ نفس کا راستہ بھی قرآنِ مجید سے معلوم کیا جائے۔ اس کے لیے جو کچھ بھی اعمال کیے جائیں، ان کی بنیاد قرآنِ مجید پر ہونی چاہیے۔ قرآنِ مجید کے بغیر اور قرآنِ مجید کی رہنمائی میں تعقل، تفکر اور تذکر، دونوں میں غیر معمولی فرق واقع ہو جاتا ہے۔ قرآنِ مجید کی رہنمائی میں تعقل کی برکات کا مشاہدہ کرنا ہو تو ہمارے علما کی عزیمت، یقین اور اعتماد کی ایک جھلک تاریخ کے اوراق میں دیکھ لیں۔ قرآنِ مجید کے بغیر تعقل میں جو انتشار، بے جہتی، اور عجز و درماندگی پائی جاتی ہے، اس کا مشاہدہ کرنا ہو تو فلسفے کی بھول بھلیاں پر ایک نظر ڈال لیں۔ قرآنِ مجید ایک شاہ کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ ہاتھ پکڑتا اور منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ اس کی رہنمائی ایک استاد کی رہنمائی ہے۔ یہ اس قابل بناتا ہے کہ انسان صحیح نتائج پر پہنچ سکے۔ اور ان چیزوں پر متنبہ کر دیتا ہے، جن میں ٹھوکر کھانے کا اندیشہ ہو۔

تدبرِ قرآن کی شرائط اور حدود

اب ہم ان شرائط اور حدود کی وضاحت کریں گے جو اس غرض کے لیے قرآنِ مجید پر تدبر کے لیے ضروری ہیں:

۱. نیت کی پاکیزگی

قرآنِ مجید پر تدبر کی پہلی شرط یہ ہے کہ آدمی کی نیت پاک ہو مطلب یہ کہ اس کے پیشِ نظر صرف یہ ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کا منشا جان لے، نہ اپنی خواہشات کے دلائل ڈھونڈنے کے لیے قرآنِ مجید کھولے اور نہ مقصد یہ ہو کہ وہ اپنے فرقے اور اپنے تعصب کے لیے سہارے تلاش کرے اور نہ اس کی غرض اپنی پسندیدہ فقہی آرا کے مؤیدات فراہم کرنا ہو۔ یہ سب چیزیں نیت کے فساد کی علامت ہیں۔ قرآنِ مجید اس طرح کے طرزِ فکر کو فسق قرار دیتا ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ	"اس کے ذریعے سے بہت ہدایت پاتے
كَثِيْرًا. وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا	اور بہت سے گمراہ ہو جاتے ہیں۔ اور اس
الْفٰسِقِيْنَ. (البقرہ ۲: ۲۶)	سے فاسق ہی گمراہ ہوتے ہیں۔"

قرآنِ مجید سے اس غلط طریقے سے استفادے کے شواہد ہماری علمی تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔ جب یونانی فلسفے نے یلغار کی، جب فقہی موشگافیوں نے زور پکڑا، جب اخباری ذہن نے غلبہ پایا اور ہمارے قریبی زمانے میں، جب مغربی فکر و فلسفہ ایک چیلنج بن کر ابھرا، ہر ہر زمانے میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے یہ کوشش کی کہ وہ قرآن کو اپنے مزعومات کا مؤید دکھائیں۔ خواہ اس کے لیے قرآن کے الفاظ، اس کا دروبست اور سیاق و سباق کتنی ہی بڑی رکاوٹ کیوں نہ ہو۔ قرآنِ مجید سے صحیح رہنمائی اور قرآنِ مجید پر تدبر کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اس کا قاری اس طرح کے کسی مقصد کے بغیر قرآن سے صرف قرآن کا نقطۂ نظر جاننے کے لیے رجوع کرے اور جب اسے قرآنِ مجید کا نقطۂ نظر معلوم ہو جائے تو کسی تحفظ اور شرط کے بغیر اسے مان لے۔

۲. اپنی حیثیت کے مطابق معاملہ

قرآنِ مجید پر تدبر کی دوسری شرط یہ ہے کہ قرآنِ مجید پر غور کرنے والا اپنی استعداد اور صلاحیت کے مطابق قرآنِ مجید کے ساتھ معاملہ کرے۔ ہر وہ کام جسے انجام دینے کے لیے مخصوص تربیت اور علم و مطالعے کی ضرورت ہوتی ہے، انسان فطری طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ایک وہ لوگ ہوتے

ہیں جو اپنا سفر خود طے کرتے ہیں اور دوسرے وہ جنھیں رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً صحت ہی کا معاملہ لیجیے۔ ایک وہ لوگ ہیں جو اس سے متعلق علوم کا مطالعہ کرتے اور علاج و دوا کے فنون سیکھتے ہیں اور دوسرے وہ لوگ ہیں جو علاج معالجے کے لیے ان سے رجوع کرتے، ان کی رہنمائی سے فائدہ اٹھاتے، اور وہ جو کچھ تجویز کرتے ہیں، اس پر عمل کرتے ہیں۔ اس باب میں یہ رویہ اختیار کرنا کوئی بھی درست نہیں سمجھتا کہ ان کی تشخیص اور علاج میں ضروری علم اور اسی فن کے دوسرے ماہرین سے مشورہ کیے بغیر تبدیلی کر دی جائے۔ قرآنِ مجید کا معاملہ بھی اسی فرق کا متقاضی ہے۔ یہ ایک ادب پارہ ہے۔ اس کی زبان عربی ہے اور عربی بھی وہ ہے، جو آج سے چودہ پندرہ صدیاں پہلے جوارِ مکہ میں بولی جا رہی تھی۔ پھر اس پر ہزاروں افراد نے اپنی محنتیں صرف کی ہیں۔ اس کے معانی و مطالب کی جستجو کی ہے۔ اس کی شرحیں اور تفسیریں لکھی ہیں۔ اور اس سے اپنے لیے قانون، حکمت، اور تزکیہ کے معاملات میں استفادہ کیا ہے۔ لہٰذا، یہاں بھی فطری طور پر افراد دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ وہ لوگ جنھوں نے عربی زبان کا علم حاصل کیا ہو، اس کے ادب میں تنقیدی نظر پیدا کی ہو، جو کچھ پچھلی صدیوں میں قرآنِ مجید پر کام ہوا ہے، اسے پڑھا ہو۔ ظاہر ہے، اس طرح کے لوگ رہنمائی کا مقام پا لیں گے اور وہ لوگ جنھیں یہ علم، یہ استعداد حاصل نہیں ان کے پاس، پہلے لوگوں سے استفادے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں۔ اس سے ہماری مراد یہ نہیں کہ ان لوگوں کی اندھی تقلید کی جائے۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ قرآنِ مجید پر کلام کے لیے ضروری ہے کہ وہ صلاحیت پیدا کی جائے جو اس کے لیے ہونی چاہیے اور اگر ایسا ممکن نہیں تو پھر ایسے لوگوں کی رہنمائی حاصل کرنی چاہیے، جو یہ صلاحیت بہم پہنچا چکے ہوں۔ ہر سوال اور ہر اشکال حل کرنے میں ان کے کیے ہوئے کام سے فائدہ اٹھائے۔ عربی نہیں جانتا تو ترجمہ دیکھے، مشکل پیش آئے تو تفسیر کا مطالعہ کرے۔ عقدہ پھر بھی حل نہ ہو تو علما سے رجوع کرے۔ بڑی سے بڑی چیز آدمی سمجھ سکتا ہے، بشرطیکہ آدمی کا رویہ طالب علمانہ ہو۔ یہاں ایک اور بات بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ قرآنِ مجید کے معاملے میں یہ طریقہ بھی کسی طرح موزوں نہیں کہ آدمی صفر سے آغاز کرے۔ جس طرح یہ ایک حماقت ہو گی کہ سائنس کے میدان میں کوئی شخص اپنی تحقیقات کا آغاز کوپرنیکس اور گلیلیو کے دور کی سطح سے کرے اور ان کاموں کو نظر انداز کر دے جو نیوٹن اور آئن سٹائن جیسے لوگوں نے بعد میں کیے ہیں، اسی طرح قرآنِ مجید کے معاملے میں بھی اس طرح کا طرزِ عمل ایک واضح حماقت قرار پائے گا۔ بعض لوگ قرآنِ مجید کے معاملے میں ایک شیطانی فلسفے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کا استدلال یہ ہوتا ہے کہ قرآنِ مجید، چونکہ سب کے لیے ہے، لہٰذا اسے ہر آدمی کی رہنمائی براہِ راست کرنی چاہیے۔ اس طرزِ فکر کا حامل

آدمی ایک ضدی اور ہٹ دھرم آدمی کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ اسے نہ قرآنِ مجید سے حق ملتا ہے اور نہ کوئی دوسرا ہی اسے راہِ راست پر لا سکتا ہے۔ یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ تذکیر و نصیحت کے لیے قرآنِ مجید ایک سہل ترین کتاب ہے، لیکن علمی اور تحقیقی مقاصد کے لیے اس کی طرف رجوع کیا جائے تو یہ ایک بہت ہی مشکل کتاب ہے۔

اسی اصول کا ایک دوسرا پہلو بھی قرآنِ مجید کے ہر طالب علم کے سامنے رہنا چاہیے۔ جس طرح علمی استعداد نہ ہو تو قرآنِ مجید پر براہِ راست غور گمراہی اور ضلالت پر منتج ہو سکتا ہے، اسی طرح اگر اہلیت ہو اور آدمی تقلید کا مسلک اختیار کرے تو اس سے بدترین جمود پیدا ہو جاتا اور علمی فضا ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح متعفن ہو جاتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں خطرناک ہیں۔ ان دونوں ہی سے گریز کرنا چاہیے۔

۳۔ برتر کلام مانا جائے

قرآنِ مجید پر تدبر کا ایک بنیادی تقاضا یہ بھی ہے کہ اسے ایک برتر کلام مانا جائے اور اس کی عظمت کو تسلیم کیا جائے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ پہلے سے ایک رائے قائم کر لی جائے۔ یہ قرآنِ مجید کے باب میں، حقیقی صورتِ حال کا تقاضا ہے اور اس کا ادراک انتہائی ضروری ہے۔ اس کتاب نے ایک عظیم امت کھڑی کی ہے۔ یہ ایک نئی تہذیب اور نئے تمدن کی تشکیل کا باعث بنی ہے۔ آج بھی کم و بیش ایک ارب کے قریب لوگ اسے خدا کی کتاب مانتے ہیں۔ یہ صدیوں سے قانون، اخلاق، معیشت، معاشرت اور تعلق باللہ کے لیے متعین کیے گئے اصولوں اور ضوابط کی اساس بنی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے، ایسی کتاب کو ایک ناول اور قصے کی حیثیت سے دیکھنا بے انصافی ہے اور یہ رویہ قرینِ عقل نہیں قرار پا سکتا، بطورِ خاص، ایک ایسی کتاب کے بارے میں جس کے الفاظ خدا کے الفاظ قرار دیے جا رہے ہوں، صدیوں سے انسان جس کی نظیر لانے سے قاصر رہا ہو اور جو ابدی فلاح کی پیامبر ہو۔

۴۔ تقاضوں کے مطابق بدلنے کا عزم

قرآنِ مجید ایک ایسی کتاب ہے، جو صرف اس کے لیے رہنما بنتی ہے جو اس کے مطابق بدلنے کا عزم لے کر اسے کھولے۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص حقیقت دیکھے، حق پا لے اور اس کے مطابق اپنے آپ کو نہ بدلے، تب بھی جادۂ حق اس کے لیے کھلا رہے۔ جس شخص نے ہدایت پائی، لیکن اس پر عمل پیرا نہ ہوا، وہ ہدایت کی اصل روح سے محروم رہتا ہے۔ قرآنِ مجید کے معاملے میں علم عمل کے لیے اور عمل علم کے لیے رہنما ہے۔ بے عمل عالم کی، اس کتاب کے حوالے سے، کوئی اہمیت ہے اور نہ وہ کسی بھی اعتبار سے عالم کہلانے کا مستحق ہے۔ بلکہ، یہ کتاب ایسے شخص کے لیے حقیقت تک پہنچنے کی راہ میں خود

حائل ہو جاتی ہے۔

۵۔ تفویض الی اللہ

قرآنِ مجید کا مطالعہ کرتے ہوئے، کسی خاص مسئلے پر غور کرنے میں، جب عقدہ حل نہ ہو، راستہ کھلتا ہوا نظر نہ آئے، تو ایک بندۂ مومن کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے رب کے حوالے کر دے۔ وہ اس سے دعا کرے کہ وہ اس کے لیے راستہ کھول دے۔ اس کی سب سے بہترین صورت تہجد کی نماز ہے۔ اس نماز میں اس مقام کی تلاوت کی جائے، جہاں مشکل درپیش ہے۔ اول تو مشکل حل ہو جائے گی اور اگر حل نہ بھی ہوئی تو آدمی اطمینانِ قلب سے محروم نہیں ہو گا۔ آدمی جب اپنے آپ کو خدا کے آگے ڈال دیتا ہے، تو شیطان کی در اندازی سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ شیطان کے لیے اسے گمراہ کرنے کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شمعیں جل اٹھتی ہیں، تاریکی دور ہو جاتی ہے اور آدمی اطمینان کے ساتھ راستہ تلاش کر لیتا ہے۔

نفس کے دوسرے پہلوؤں کی طرح عقلی وجود بھی تزکیے کا محتاج ہے۔ اس کے لیے خدا کی معرفت ضروری ہے۔ خدا کی معرفت کا راستہ 'تعقل'، 'تفکر' اور 'تذکر' کا راستہ ہے۔ عقلی وجود کے ان وظائف کے ساتھ کچھ آفات لگی ہوئی ہیں۔ لہٰذا انھیں ان آفات سے بچانے اور راہِ راست پر رکھنے کا ذریعہ قرآنِ مجید پر تدبر ہے۔ قرآنِ مجید پر تدبر مذکورہ شرائط کے مطابق ہو تو 'تعقل'، 'تفکر' اور 'تذکر' کو صحیح راستہ مل جائے گا، خدا کی معرفت حاصل ہو جائے گی اور عقلی وجود تزکیہ پالے گا۔

OUR THANKS TO

SNOW WHITE DRY CLEANING INDUSTRIES
SH. WILAYAT AHMAD & SONS
CONTINENTAL ART
FEROZE TEXTILE INDUSTRIES
IMAGE COMMUNICATIONS
TIP TOP DRY CLEANERS
F.RABBI & CO. (PVT) LTD
K.B. SARKAR & CO.
PARAMOUNT DISTRIBUTORS (PVT) LTD

ترتیب : منظور الحسن

"ذکر سے مراد، دراصل، یاد ہے۔ یعنی اللہ کے تصور کا آدمی کے ذہن پر اتنا غلبہ ہو جانا کہ وہی اس کی مستقل سوچ بن جائے۔ آدمی کو ہر وقت خدا کے کمالات اور اس کی عظمتوں کا احساس ہوتا رہے۔ دنیا کے ہر منظر میں اس کو خدا کی جھلک دکھائی دے۔ کائنات کی ہر آواز میں اس کو خدا کا نغمہ سنائی دے۔ وہ ہر واقعہ اور تجربہ سے اپنے لیے ربانی سبق لیتا ہے۔

آدمی، جب اس طرح خدا کو یاد کرنے لگتا ہے، تو اس کا ذہن خدائی حقیقتوں کے بارے میں جاگ اٹھتا ہے۔ اس کے اندر صحیح اور غلط کا شعور پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر ایک قسم کی ذہنی روک یا نفسیاتی قلعہ بن جاتا ہے، جس کے اندر وہ شیطان سے محفوظ ہو کر رہ سکے۔ جو آدمی اس طرح اللہ کی یاد میں جینے لگے، اس پر قابو پانا شیطان کے لیے ممکن نہیں۔"

اصلاح و دعوت

منظور الحسن

قرآنِ مجید سے بے پروائی

انسانوں کی فلاح 'بلاشبہ، قرآنِ مجید پر ایمان اور اس کی تعلیمات پر عمل ہی سے ممکن ہے، لیکن اس حقیقت سے ناآشنا بعض لوگ، اپنے کسی تعصب میں مبتلا ہو کر، یا محض جدت پسندی کی رو میں، قرآنِ مجید کو اتنی اہمیت دینے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتے، جتنی اہمیت وہ کسی عام کتاب کو دیتے ہیں۔ جب انھیں اس کتاب کے مطالعے کے لیے کہا جاتا ہے، تو وہ کہتے ہیں کہ یہ کتاب چودہ سو سال پہلے کے لوگوں کے لیے، ممکن ہے مفید ہو۔ لیکن تہذیب و تمدن کے ارتقا نے جو حالات اور مسائل پیدا کیے ہیں، اُن کا حل تو، بہرحال، نئے علوم و فنون اور جدید فلسفہ و فکر میں پنہاں ہے۔ چنانچہ، ان کے نزدیک، قرآن کی فکرِ قدیم کو پڑھنا، محض وقت کا زیاں ہے۔

ان لوگوں کے اس نقطۂ نظر سے تو ہم بحث نہیں کرتے، البتہ، اتنا ضرور کہتے ہیں کہ اس کتاب کے بارے میں، بعض ایسے مشہود حقائق ہیں، جن سے صرفِ نظر، واقعہ یہ ہے کہ کسی عاقل اور سلیم الفطرت شخص کے لیے ممکن نہیں۔

ایک حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی کم و بیش ایک چوتھائی آبادی، اس کتاب کے متعلق یہ دعویٰ کرتی ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے، جو اللہ کے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے اور اسی کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق، اس کلام کو کتاب کی شکل میں منظم کیا گیا۔ یہ عظیم اکثریت دعویٰ کرتی ہے کہ گزشتہ چودہ صدیوں سے یہ کتاب اس دنیا میں موجود ہے۔ اس پورے عرصے میں، اس کے الفاظ میں، اس کے جملوں میں، اس کے مضامین میں اور اس کی ترتیب میں، کوئی معمولی تغیر بھی واقع نہیں ہوا۔

قرآن مجید کے بارے میں، دوسری حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ لاکھوں لوگوں کے حافظوں میں اس کا ایک ایک لفظ محفوظ ہے۔ مسلمانوں کا کوئی گھر ایسا نہیں ہوگا جس میں یہ کتاب موجود نہ ہو۔ اس کے علاوہ دنیا کی تمام اہم زبانوں میں اس کے

تراجم ہو چکے ہیں۔ کروڑوں مسلمان جن کی قومیں مختلف ہیں، جن کی نسلیں جدا ہیں، جن کے خطے الگ الگ ہیں، جن کی زبانیں ایک نہیں، وہ سب، یکساں طور پر، قرآنِ مجید پر اللہ کی کتاب کی حیثیت سے ایمان رکھتے ہیں۔ یہ مقام دنیا میں کسی دوسری کتاب کو حاصل نہیں۔

اس کے بارے میں تیسری حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب خطۂ عرب میں ایک ایسا انقلاب برپا کر چکی ہے، جس کی نظیر معلوم تاریخ میں کہیں بھی موجود نہیں۔ ہر شخص مانتا ہے کہ اس کتاب نے عربوں کو اس طرح تبدیل کر دیا کہ وہ جو رہزن تھے، رہنما ہو گئے، جنگ و فساد جن کا روزمرہ تھا، وہ امن و صلح کے علم بردار بن گئے۔ وہ لوگ جو مٹی اور پتھر کے بتوں کی عبادت کرنے والے تھے، بت شکن کہلائے۔ اخلاقی قباحتوں میں مبتلا لوگ، نمونۂ اخلاق قرار پائے۔ یہی وہ ذہنی و فکری انقلاب تھا جس نے عربوں کو صدیوں تک، دنیا کی امامت کے منصب پر فائز رکھا۔

اس کتاب کے بارے میں، چوتھی حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کے ماننے والے، یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ کتاب، انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں، فلاح کا اصل ذریعہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ فرد کی روحانی و مادی ضروریات، خاندان کے ساتھ اس کے تعلقات، اور سیاست، معیشت اور معاشرت کے حوالے سے، انسانوں کی اجتماعی احتیاجات کا احاطہ، جس طرح قرآنِ مجید کرتا ہے، انسانی عقل اس کے سامنے عجز ہی کے اعتراف پر مجبور رہے۔

قرآن مجید کے بارے میں یہ، وہ نمایاں حقائق ہیں جن کا انکار کوئی شخص بھی نہیں کر سکتا۔ کیا یہ حقائق اس بات کے لیے کافی نہیں کہ ایک بار غیر جانبدار ہو کر، پورے شعور کے ساتھ، اس کتاب کا مطالعہ کیا جائے؟

خدا کی بارگاہ میں آدمی کے لیے بہترین سفارش اس کا اپنا عمل نہیں ہے، بلکہ خود خدا ہی کے فضل کا واسطہ ہے۔ جب بندہ اس اعتماد پر اپنے رب سے مانگتا ہے کہ جس نے بن مانگے سب کچھ بخشا ہے، وہ بھلا مانگنے پر کس طرح محروم فرمائے گا تو ربِ کریم اپنے بندے کو محروم نہیں رکھتا۔

"تدبرِ قرآن" امین احسن اصلاحی

وحید الدین خاں

عقل سے کام نہ لینا

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ۔ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ۔ (الانفال ۸: ۲۱-۲۲)	"اور (اے ایمان والو) تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے کہا کہ ہم نے سنا، حالانکہ وہ نہیں سنتے۔ یقیناً، اللہ کے نزدیک بدترین جانور وہ بہرے، گونگے لوگ ہیں، جو عقل سے کام نہیں لیتے۔"

قرآن کی اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ سب سے زیادہ برے جانور وہ لوگ ہیں جو نماز نہیں پڑھتے، جو داڑھی نہیں رکھتے، جو ٹلی تشخص کو اختیار نہیں کرتے، بلکہ یہ فرمایا کہ سب سے زیادہ برے جانور وہ لوگ ہیں، جو حق کو سننے کے لیے بہرے بنے ہوئے ہیں۔ جن کے سامنے حق کی بات آتی ہے، مگر اس کو وہ اپنے دماغ میں جگہ نہیں دیتے۔ وہ اس کو اس طرح لیتے ہیں، جیسے کہ انھوں نے اس کو نہ سنا اور نہ سمجھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اندھا پن یا بے عقلی ایک ایسا جرم ہے جو نماز اور داڑھی اور ملی تشخص کو چھوڑنے سے بھی زیادہ بڑا جرم ہے۔

اس کا سبب کیا ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ فہم و تدبر انسان کی سب سے اعلیٰ صفت ہے۔ اسی بنیاد پر، اس کو دوسری مخلوقات پر نوعی امتیاز حاصل ہوا ہے۔ جو آدمی فہم و تدبر کھو دے، اس نے گویا، اپنی خصوصیتِ بشری کو کھو دیا۔ اور جو مخلوق اپنی نوعی خصوصیت کو کھو دے، اس کے بعد، عین فطری ہے، کہ وہ اللہ کے یہاں بے قیمت ہو کر رہ جائے۔

"لا یعقلون" سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی کے سامنے سچائی لائی جائے، مگر وہ اس کو اہمیت نہ دے سکے۔ وہ اس کو الٹے مفہوم میں لے کر اسے نظر انداز کر دے۔ وہ اس کو کم تر قرار دے کر اس کا مذاق اڑائے۔ وہ عقل کو استعمال کر کے اس کو سمجھنے کی کوشش نہ کرے، بلکہ

فوری تاثر کے تحت' اس پر غیر متعلق رائے زنی کرنے لگے۔ اس کا ردِّ عمل بے عقلی کا ردِّ عمل ہو نہ کہ عقل کا ردِّ عمل۔

ایسے لوگ اعتراف کی لذت سے محروم رہتے ہیں۔ ان کی روح صرف کثیف چیزوں کا ادراک کرتی ہے۔ لطیف چیزوں کو اپنی خوراک بنانے کی صلاحیت ان کے اندر باقی نہیں رہتی۔

نفسیاتی قلعہ

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: امرکم بذکر اللہ کثیراً و مثل ذٰلک کمثل رجل طلبہ العدو سراعاً حتیٰ اتی حصناً حصیناً فاحرز نفسہ فیہ وکذٰلک العبد لا ینجوا من الشیطان الا بذکر اللہ۔

(الترمذی)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تم کو زیادہ سے زیادہ اللہ کا ذکر کرنے کی تلقین کرتا ہوں اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی کا اس کے دشمن نے تیزی سے پیچھا کیا، یہاں تک کہ وہ بھاگ کر ایک مضبوط قلعہ میں داخل ہو گیا۔ اس طرح اس نے قلعہ بند ہو کر اپنے آپ کو بچا لیا۔ یہی معاملہ بندے کا ہے۔ وہ صرف اللہ کی یاد ہی کے ذریعے سے شیطان سے بچ سکتا ہے۔"

یہ حدیث بتاتی ہے کہ انسان کو سب سے زیادہ گمراہ کرنے والا اس کا دشمن شیطان ہے۔ اس سب سے بڑے دشمن سے بچنے کی تدبیر صرف یہ ہے کہ آدمی ہمیشہ اللہ کا ذکر کرتا رہے۔

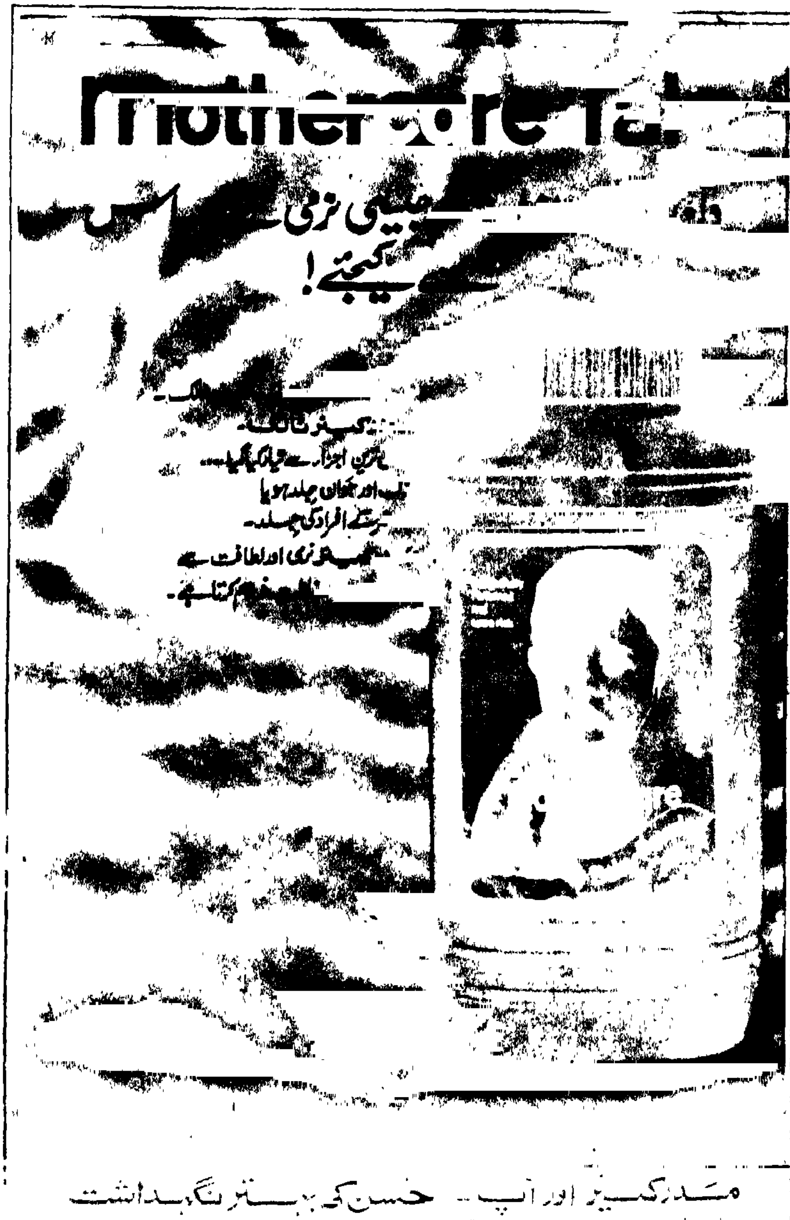
ذکر سے مراد کچھ مقرر کلمات کا ورد نہیں ہے۔ اس قسم کی لسانی ورزش کا مذکورہ ذکر سے کوئی تعلق نہیں۔ معروف قسم کا وِرد یا تکرارِ الفاظ کسی بھی درجہ میں آدمی کو شیطان کے بہکاوے سے بچانے والے نہیں' اور نہ وہ کسی کے لیے شیطانی حملوں کے مقابلے میں حفاظت کا قلعہ بن سکتے ہیں۔

ذکر سے مراد' در اصل' یاد ہے یعنی اللہ کے تصور کا آدمی کے ذہن پر اتنا غلبہ ہو جائے کہ وہی اس کی مستقل سوچ بن جائے۔ آدمی کو ہر وقت خدا کے کمالات اور اس کی عظمتوں کا احساس ہوتا رہے۔ دنیا کے ہر منظر میں اس کو خدا کی جھلک دکھائی دے۔ کائنات کی ہر آواز میں اس کو خدا کا نغمہ سنائی دے۔ وہ ہر واقعہ اور تجربہ سے اپنے لیے ربانی سبق لیتا رہے۔

آدمی، جب اس طرح خدا کو یاد کرنے لگتا ہے، تو اس کا ذہن خدائی حقیقتوں کے بارے میں جاگ اٹھتا ہے۔ اس کے اندر صحیح اور غلط کا شعور پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر ایک قسم کی ذہنی روک یا نفسیاتی قلعہ بن جاتا ہے، جس کے اندر وہ شیطان سے محفوظ ہو کر رہ سکے۔ جو آدمی اس طرح اللہ کی یاد میں جینے لگے، اس پر قابو پانا شیطان کے لیے ممکن نہیں۔



Adarts-HRA-3/94



مدرکیئر اور آپ۔ حسن کی بہتر نگہداشت

زیرِ سرپرستی
جاوید احمد غامدی

ماہنامہ

اشراق

جلد ۶ شمارہ ۸
اگست ۱۹۹۴ء
ربیع الاوّل ۱۴۱۵ھ

مدیر
منیر احمد

معاونین
منظور الحسن
قدیر شہزاد

مدیرِ انتظامی
شکیل الرحمن

مجلسِ ادارت
طالب محسن — خالد ظہیر
ساجد حمید — معز امجد
شہزاد سلیم — محمد رفیع
نادر عقیل انصاری — نعیم احمد بلوچ
خورشید احمد ندیم

فی شمارہ : ۸ روپے
سالانہ : ۸۰ روپے

بیرونِ ملک
ہوائی ڈاک : ۴۵۰ روپے
بحری ڈاک : ۲۵۰ روپے

المورد

انتظامی دفتر: ۶۶ احمد بلاک، گارڈن ٹاؤن، لاہور ۵۴۶۰۰ فون: ۵۸۶۴۴۳۱

مدیرِ مسئول: جاوید احمد غامدی ○ طابع: قومی پریس، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الملک

[٦٧]

اللہ کے نام سے جو سراپا رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

بہت بزرگ، بہت صاحبِ فیض ہے وہ جس کے ہاتھ میں عالم کی پادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ (وہی) جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی۔

(وہی) جس نے سات آسمان بنائے، تہ برتہ۔ رحمٰن کی تخلیق میں تم کوئی خلل نہ پاؤ گے۔ پھر پلٹ کر دیکھو، کیا کوئی نقص کہیں پاتے ہو؟ بار بار نگاہ دوڑاؤ، تمھاری نگاہ تھک کر نامراد پلٹ آئے گی۔

اور (اِس قدرت کے پہلو بہ پہلو رحمت کے یہ جلوے بھی ہیں کہ) ہم نے اس چرخِ زیریں کو چراغوں سے رونق دی ہے، اور (اِس کے نگہداشت کا یہ اہتمام بھی کیا ہے کہ) ہم نے اِن کو (اِنھی ستاروں کو) شیطانوں کے لیے سنگ ساری بنا دیا ہے اور اِن کے لیے دہکتی ہوئی آگ بھی ہم

نے مہیا کر رکھی ہے۔ اور وہ لوگ جو (قیامت کے منکر ہوئے اور اس طرح) اپنے پروردگار کے منکر ہوئے، اُن کے لیے جہنّم کی سزا ہے، اور وہ کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔

وہ جب اُس میں ڈالے جائیں گے تو اُس کا دھاڑنا سنیں گے اور وہ اُبل رہی ہوگی۔ قریب ہے کہ غضب سے پھٹ پڑے۔ ہر مرتبہ جب کوئی بھیڑ اُس میں ڈالی جائے گی تو اُس کے نگران اُن سے پوچھیں گے: کیا تمھارے پاس کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا؟ وہ کہیں گے: ہاں، ایک خبردار کرنے والا آیا تو سہی، مگر ہم نے اسے جھٹلا دیا اور کہہ دیا کہ اللہ نے کوئی چیز نہیں اتاری۔ (ہم نے کہہ دیا کہ) تم تو بس ایک بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو۔ اور وہ کہیں گے: اگر ہم سنتے یا سمجھتے تو (آج) ان اہلِ جہنّم میں نہ ہوتے۔ اِس طرح وہ اپنے گناہ کا اقرار کریں گے، تو (اب) لعنت ہو اِن اہلِ جہنّم پر۔

(اِس کے برخلاف) وہ لوگ جو بِن دیکھے اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں، ان کے لیے، بے شک، مغفرت بھی ہے اور بہت بڑا اجر بھی۔ اور (سنو، اے لوگو)، تم کوئی بات چھپا کر کہو یا کھول کر، وہ اس کو جانتا ہے۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ تو دلوں کے بھید تک جانتا ہے۔ کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے؟ اور وہ بڑا دقیقہ رس ہے، بڑا ہی خبردار۔

وہی جس نے زمین کو تمھارے لیے ایک فرماں بردار ناقہ بنا دیا ہے، تو اب تم اُس کے مونڈھوں پر چلو پھرو اور اُس کے، (اپنے پروردگار کے دیے ہوئے) رزق میں سے کھاؤ اور یاد رکھو کہ جب اُس نے تمھارے لیے یہ سب اہتمام کیا ہے تو وہ تمھیں اِس طرح نہ چھوڑے گا۔

تم کو، ہر حال میں،) اُس کے حضور جی اٹھنا ہے۔

تم کیا اُس سے بے خوف ہوئے جو آسمان میں ہے کہ وہ تم کو زمین میں دھنسا دے۔ پھر یکایک تم دیکھو کہ وہ سرپٹ بھاگ رہی ہے؟ کیا تم اُس سے بے خوف ہوئے جو آسمان میں ہے کہ وہ تم پر پتھر برسانے والی ہوا بھیج دے۔ سو اب تم جانو گے کہ کیسی ہے میری تنبیہ۔ اور وہ بھی جو اِن سے پہلے تھے، (اِسی طرح) جھٹلا چکے تو (تم نے دیکھا کہ) کیسی ہوئی ان پر میری پھٹکار۔

کیا اِن لوگوں نے اپنے اوپر (اڑتے ہوئے) پرندے نہیں دیکھے؟ پر پھیلائے ہوئے اور وہ (اِسی طرح اُن کو) سمیٹ بھی لیتے ہیں۔ رحمٰن کے سوا کوئی نہیں جو انھیں تھامے ہوئے ہو۔ بے شک، وہ ہر چیز پر نگراں ہے۔

(تم عذاب کا مطالبہ کرتے ہو تو بتاؤ) تمھارے پاس وہ کون سی فوج ہے جو رحمٰن کے مقابلے میں تمھاری مدد کرے گی؟ (یہ جانتے ہیں کہ کوئی نہیں) واقعہ یہ ہے کہ یہ کافر نرے فریب میں مبتلا ہیں۔ اچھا بتاؤ، وہ کون ہے جو تمھیں روزی دے گا، اگر وہ اپنی روزی روک لے؟ (انھیں معلوم ہے کہ کوئی نہیں)۔ پر یہ سرکشی اور حق بیزاری پر اڑے ہوئے ہیں۔

(یہ اس لیے ہوا کہ یہ جانوروں کی طرح منہ اوندھائے چل پڑے)۔ پھر کیا وہ جو اپنے منہ پر اوندھا چلے، وہ سیدھی راہ پائے گا یا وہ جو سیدھا ایک سیدھی راہ پر چل رہا ہے؟ (اِن پر افسوس) اِن سے کہو، وہی ہے جس نے تم کو (انسان کی حیثیت سے) اٹھایا اور تمھارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے (کہ تم حقیقت کو سمجھو)۔ پر تم کم ہی شکر ادا کرتے ہو۔ اِن سے کہہ دو، وہی ہے جس نے

تم کو زمین میں بویا، (اس لیے کہ وہ اپنی بوئی ہوئی یہ فصل کاٹ کر اس میں دانے اور بھوسا الگ کردے) ۔ اور (اس کے لیے) تم، (یقیناً)، اُسی کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے ۔

اور (یہ سب سن لینے کے بعد بھی) وہ کہتے ہیں کہ یہ ڈراوا کب سامنے آئے گا، اگر تم سچے ہو؟ ان سے کہہ دو، اس کا علم تو اللہ ہی کے پاس ہے اور میں تو بس ایک کھلا ہوا ڈر سنانے والا ہی ہوں۔ وہ اب یہ کہتے ہیں ، مگر جب اُس کو دیکھیں گے کہ پاس آلگا ہے تو ان منکروں کے چہرے بگڑ جائیں گے اور اِن سے کہا جائے گا کہ یہی ہے جس کا تم تقاضا کر رہے تھے ۔

(یہ کہتے ہیں کہ ہم تو اِس پیغمبر کے لیے گردشِ زمانہ کے منتظر ہیں) ۔ ان سے پوچھو کہ تم نے کبھی سوچا کہ اللہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو ہلاک کردے یا ہم پر رحم فرمائے ، (تو اس سے تمھیں کیا حاصل ہوگا! تم تو یہ بتاؤ کہ اِس صورت میں) پھر کون ہے جو کافروں کو دردناک عذاب سے بچائے گا؟

کہہ دو، (ہم اپنے بارے میں کوئی دعوٰی نہیں کرتے ۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ) وہ سراپا رحمت ہے ۔ ہم اُس پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے اُسی پر بھروسا کیا ہے ۔ (اس لیے امید یہی ہے کہ وہ ہم پر رحم فرمائے گا) ۔ مگر (تم بھی سن لو کہ) اب بہت دیر نہ ہوگی کہ تم جان لو گے کہ کھلی ہوئی گمراہی میں کون پڑا ہوا ہے ۔ ان سے کہہ دو کہ اچھا اِسی بات پر غور کرو کہ اگر تمھارا یہ پانی زمین میں اتر جائے تو پھر کون ہے جو پانی کی یہ نتھری ہوئی سوتیں تمھیں نکال کر لا دے گا؟

منشورِ انقلاب

(۵)

اربابِ اقتدار کا معیارِ زندگی

اگر ہم اپنے شہریوں میں اچھے اوصاف اور اخلاق پیدا کرنا اور انھیں فروغ دینا چاہیں تو، عام طور پر، ہم اس معاملے میں، قانون کا سہارا لیتے ہیں۔ اس طریقے سے یہ تو ممکن ہے کہ لوگ، قانون کے ڈر سے، اپنے عمل میں کچھ تبدیلی پیدا کر لیں، اور وہ بھی صرف اسی صورت میں، اگر قانون نافذ کرنے والے ادارے ہر دم مستعد رہتے اور ایمان داری کے ساتھ قانون کا نفاذ کرتے ہوں، مگر ہم میں سے ہر شخص یہ جانتا ہے کہ مجرد قانون سے کبھی کوئی مستقل تبدیلی نہیں لائی جا سکی۔ قانون کے ذریعے سے لوگوں کے ظاہری عمل میں تو شاید کوئی تبدیلی آ گئی ہو، مگر اس طاقت نے لوگوں کے دلوں کو کبھی نہیں بدلا۔ ہمارے اپنے ملک میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ لوگوں کے عمل کو بدلنے میں قانون کا سہارا لیا گیا، تو چند ہی دنوں میں یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ اس سے قانون کی کتاب میں چند شقوں کے اضافے کے سوا، اور کچھ بھی حاصل نہ ہو سکا۔

اخلاقیات اور اس قسم کے معاملات میں تبدیلی لانے کا ایک طریقہ ترغیب و نصیحت کا ہے۔ یہ طریقہ، اگرچہ صبر آزما ہے، کیونکہ اس کے ذریعے سے تبدیلی، عام طور پر، سست رفتار ہوتی ہے، مگر، یہ واقعہ ہے کہ اس طریقے سے جو تبدیلی آتی ہے، وہ مستقل ہوتی ہے، دلوں کو بدل کر عمل میں نمودار ہوتی ہے۔ روحوں سے اٹھتی اور معاشرے کا قانون بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام، عام طور پر، ترغیب و نصیحت ہی کے ذریعے سے معاشرے کو تبدیل کرتا اور اس کے بعد ہی قانون کا نفاذ کرتا ہے۔ اس صورت میں، قانون لوگوں کے لیے کوئی اجنبی چیز نہیں رہتا اور اس وجہ سے انھیں اس کو اپنے دل و جان سے قبول کر لینے میں بھی کوئی تردد نہیں ہوتا۔

لوگوں میں اس طرح کی تبدیلی لانے کا ترغیب و نصیحت سے بھی زیادہ مؤثر اور بہتر طریقہ یہ ہے

کہ ان کے رہنما اور لیڈر اپنے کردار اور سیرت سے ان کے لیے مشعل راہ بن جائیں، تاکہ لوگ ان کی باتیں سننے کے ساتھ ساتھ ان کے عمل، کردار اور اخلاق کو اپنانے کی بھی کوشش کریں۔ مینجمنٹ اور لیڈرشپ پر کی گئی تازہ تحقیقات سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ اپنے مقاصد کی برآوری میں دنیا میں سب سے زیادہ کامیاب لیڈر وہی رہے ہیں، جنھوں نے 'LEADING BY EXAMPLE' کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے اپنے آپ کو عوام کے لیے مثال اور نمونہ بنا دیا۔

یہی وجہ ہے کہ وہ تمام اوصاف، اخلاق اور رویے، جو عام شہریوں کے لیے پسندیدہ ہیں، اسلام انھیں ریاست کے اہل اقتدار میں بدرجۂ اتم دیکھنا چاہتا ہے، تاکہ وہ اپنی جذباتی تقریروں ہی سے لوگوں کو متاثر کرنے کی کوشش نہ کرتے رہیں، بلکہ اپنے عمل سے بھی لوگوں کے لیے مثال اور نمونہ بنیں۔

معاشرے کی سطح پر، سادگی، کفایت شعاری اور قناعت کی بڑی اہمیت ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اگر مصنوعی اور بلند معیار زندگی، نمایش اور عیش و عشرت جیسے رویے معاشرے میں عام ہو جائیں، تو اس سے معاشرے کی تمام اقدار تلپٹ ہو جاتیں ہیں اور دولت اصل قدر بن جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں ہر شخص دولت کمانے کی دوڑ میں اس طرح مگن ہو جاتا ہے کہ اس کا ایمان، اس کی رشتہ داریاں اور اس کے اخلاق سب مٹی میں مل جاتے، اور وہ دو ٹانگوں پر چلنے والا ایک جانور بن کر رہ جاتا ہے۔

چنانچہ، اسی وجہ سے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ اور اس کے بعد، پورے جزیرہ نمائے عرب کے سربراہ ریاست کی حیثیت سے، یہ سنت جاری فرمائی کہ ایک مسلمان حکمران اپنا معیار زندگی، ریاست کے ایک عام شہری کی سطح پر رکھے، تاکہ سادگی اور قناعت جیسی اعلیٰ اقدار کو معاشرے میں فروغ حاصل ہو۔ یہی پیغمبرانہ سنت ہمیں خلفائے راشدین کے دور میں پوری شان کے ساتھ جاری و ساری نظر آتی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب خلیفہ منتخب ہوئے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انھیں یہ نصیحتیں فرمائیں:

> "اگر آپ اپنے پیش رو کی جگہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، تو قمیص میں پیوند لگا لیجیے، (غریبوں کی طرح) تہمد اونچا باندھیے، جوتے اپنے ہاتھ سے گانٹھیے، جرابوں میں پیوند لگا لیجیے، ارمان کم رکھیے اور بھوک سے کم کھائیے۔"

اور پھر، یہ وہی عمر بن خطاب ہیں جن کی حکمرانی میں وہ سلطنت رہی، جس نے قیصر و کسریٰ کے سرنگوں کر دیے اور جس کی سرحدیں اقصائے عالم تک پھیل گئیں، مگر اس حکمران کا حال یہ تھا کہ جب وہ اپنے ایک مفتوحہ علاقے (فلسطین) کے باسیوں کے ساتھ فتح کے عہدنامے پر دستخط کرنے

کے لیے مدینہ سے روانہ ہوا، تو ستو کا ایک تھیلا، ایک لکڑی کا پیالہ، ایک غلام اور سواری کا ایک اونٹ اس کا کل زادِ سفر تھا۔ جب فلسطینی اس کا استقبال کرنے آئے، تو اسے ایک پادری سے یہ کہنا پڑا کہ میرے پاس کپڑوں کا ایک ہی جوڑا ہے، جو سفر سے گرد آلود ہو گیا ہے، اگر مجھے کرائے پر کپڑے مل جائیں تو میں انھیں دھلوا لوں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی سنت کی پیروی میں، ریشم و کمخواب میں پلے، عمر بن عبدالعزیز جب ریاست کی سربراہی سنبھالتے ہیں، تو اپنے جسم پر ٹاٹ پہن لیتے اور اپنی بیوی کے تمام زیورات اور عالی شان کپڑے بیت المال میں جمع کرا دیتے ہیں۔

ابوداؤد کی ایک روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت، حکومت کے نمائندوں کو ان الفاظ میں دی ہے:

"جو ہمارا (حکومت کا) ملازم ہو، اگر اس نے شادی نہ کی ہو تو شادی کر لے، اور اگر اس کے پاس کوئی خادم نہ ہو، تو ایک خادم رکھ لے، اور اگر اس کے پاس مکان نہ ہو، تو ایک مکان بنوا لے۔ جو اس حد سے آگے بڑھا، وہ خائن ہے یا چور۔"

مسلمان حکمرانوں کا یہی وہ معیارِ زندگی ہے جس کو شاعرِ مشرق نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

سماں 'الفقر فخری' کا رہا شانِ امارت میں
"آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را"

اور

جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب
سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے، شاہی نہیں

ترتیب : معز امجد

"بعض گھروں میں حائضہ عورتوں کے باورچی خانے میں داخلے پر بھی پابندی لگا دی جاتی اور ان کے برتنوں، کپڑوں اور بستروں کو بالکل الگ کر دیا جاتا تھا۔ غرضیکہ ان مخصوص دنوں میں، عورت کو انسان کے بجائے ایک اچھوت مخلوق بنا دیا جاتا۔ خاتم النبیین، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر پاکیزہ اور پاکیزگی کو پسند کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ مگر طہارت اور پاکیزگی کے باب میں، آپ نے جو حدود متعین کیں اور جو رویہ اختیار فرمایا، اس پر جس پہلو سے بھی غور کر کے دیکھیے، انسان پکار اٹھتا ہے کہ یہ ہر قسم کی افراط و تفریط سے یکسر پاک ہے۔ آپ کی زندگی میں ہمیں جو اعتدال نظر آتا ہے، وہی فطرت کا تقاضا اور دین میں مطلوب رویہ ہے۔ اگر کوئی شخص، ان معاملات میں، آپ کے طے کردہ معیارات سے تجاوز کرتا ہے، تو اس کے معنی، یقیناً، یہی ہوں گے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے پیغمبر سے زیادہ پاکیزہ سمجھتا ہے۔" نعوذ باللہ من ذلک۔

فقہیات

معز امجد

بابُ الحیض والنفاس[1]

فصل ا۔ حیض سے متعلق اسلام کا قانون

'حیض' اس خون کو کہتے ہیں جو ہر مہینے چند روز کے لیے عورتوں کو آتا ہے۔ حیض سے متعلق، قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ، قُلْ هُوَ	"وہ تم سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں،
اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي	کہہ دو، یہ ناپاکی ہے، اس لیے ایامِ حیض میں
الْمَحِيْضِ، وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى	عورتوں سے الگ رہو اور جب تک وہ پاک
يَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ	نہ ہو جائیں، ان سے قربت نہ کرو۔ پھر جب
فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ	وہ غسل کر لیں، تو ان کے پاس جاؤ، جہاں
اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ	سے اللہ نے تمھیں حکم دیا ہے۔ بے شک اللہ
وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ۔	توبہ کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں
(البقرہ ۲: ۲۲۲)	کو پسند کرتا ہے۔"

آیۂ زیرِ بحث میں، اللہ تعالیٰ نے ایامِ حیض کے دوران میں، عورتوں سے قربت کرنے سے روکا ہے۔ اس آیتِ مبارکہ میں، یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ ان دنوں میں عورتوں سے الگ رہنے کا یہ حکم اس علت پر مبنی ہے کہ یہ 'اذی'، یعنی ناپاکی ہے۔

جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ حیض کے ایام میں عورت کو ایک جسمانی ناپاکی لاحق ہوتی ہے، تو اس سے آپ سے آپ، یہ بھی لازم آئے گا کہ ان دنوں میں، عورتوں کو ایسے تمام کاموں سے بھی

---

[1] ہم باب الغسل میں واضح کر چکے ہیں کہ حیض اور نفاس کے بارے میں شریعت کے احکام یکساں ہیں۔

پرہیز کرنا چاہیے، جن کے کرنے میں شریعت نے، جسمانی طور پر، پاک ہونا ضروری قرار دیا ہے۔ چنانچہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنِ مجید کے اس حکم کی فرع بیان کرتے ہوئے، ان مخصوص دنوں میں، عورتوں کے لیے بعض دوسری چیزیں بھی ممنوع ٹھہرائی ہیں۔

قرآنِ مجید اور سنتِ ثابتہ کے مطابق، ایک عورت کو حیض کے دنوں میں، جن کاموں سے الگ رہنا چاہیے، وہ یہ ہیں:

۱۔ جنسی تعلق

قرآنِ مجید کی مذکورہ آیت کے مطابق، حیض کے دنوں میں شوہر اپنی بیوی سے زن وشو کا تعلق قائم نہیں کرسکتا۔

قرآنِ مجید کے الفاظ "لا تقربوھن حتی یطھرن، فاذا تطھرن فاتوھن من حیث امرکم اللہ[1]" سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہاں 'عورتوں سے الگ رہو' سے مراد یہی ہے کہ ان سے زن وشو کا تعلق قائم نہ کیا جائے۔ اس کا، ہرگز، یہ مطلب نہیں ہے کہ عورت کو بالکل اچھوت بنا کر رکھ دیا جائے۔

یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ اس ضمن میں، ہم یہاں چند روایات نقل کیے دیتے ہیں:

عن عائشة قالت: كنت ارجل راس النبی صلی اللہ علیه وسلم وانا حائض۔ (بخاری، کتاب الحیض)	"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: میں حیض کی حالت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں میں کنگھی کیا کرتی تھی۔"
ان ام سلمة قالت: حضت وانا مع النبی صلی اللہ علیه وسلم فی الخمیلة فانسللت وخرجت منها فاخذت ثیاب حیضتی	"ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: میں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک چادر میں لیٹے ہوئے تھے کہ مجھے حیض شروع ہوگیا۔ میں چپکے سے چادر سے نکلی اور اپنے حیض کے کپڑے پہن

---

[1] البقرہ ۲: ۲۲۲، "جب تک وہ پاک نہ ہوجائیں، ان سے قربت نہ کرو۔ پھر جب وہ غسل کرلیں، تو ان کے پاس جاؤ، جہاں سے اللہ نے تمھیں حکم دیا ہے۔"

فلبستها، فقال لي رسول الله صلى الله عليه وسلم انفست؟ قلت: نعم. فدعاني فادخلني معه في الخميلة. (بخاري، کتاب الحیض)	آئی۔ میں لوٹی، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا: کیا تمھیں حیض ہو گیا ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔ آپ نے مجھے بلایا اور اپنے ساتھ پھر چادر میں لٹا لیا۔"
عن ميمونة قالت: كان النبي صلى الله عليه وسلم يباشر نسائه فوق الازار وهن حيض. (مسلم، کتاب الحیض)	"حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں، جب ازواج مطہرات میں سے کوئی حیض سے ہوتیں، تو آپ آزار کے اوپر اوپر سے، ان سے پیار کر لیا کرتے تھے۔"
عن عائشة قالت: كنت اشرب وانا حائض فانا وله النبي صلى الله عليه وسلم فيضع فاه على موضع في فيشرب. (مسلم، کتاب الحیض)	"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: میں حیض کی حالت میں پانی پیتی، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پانی کا برتن لے کر وہیں سے پانی پی لیتے، جہاں سے میں نے پیا ہوتا۔"

ان روایات پر غور کیجیے، تو معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عام طریقہ یہی تھا کہ آپ ازواجِ مطہرات کے ایامِ حیض میں، ان کے ساتھ زن و شو کے تعلق کے علاوہ، روزمرہ زندگی کے باقی تعلقات کو برقرار رکھتے تھے۔ ایک طرف اللہ کے پیغمبر کا یہ رویہ ہے اور دوسری طرف ہمارے معاشرے میں یہ صورتِ حال بھی رہی ہے کہ حائضہ عورت کے کسی چیز کے چھونے تک کو پاکیزگی کے خلاف تصور کیا جاتا تھا۔ بعض گھروں میں حائضہ عورتوں کے باورچی خانے میں داخلے پر بھی پابندی لگا دی جاتی اور ان کے برتنوں، کپڑوں اور بستروں کو بالکل الگ کر دیا جاتا تھا۔ غرضکہ، ان مخصوص دنوں میں، عورت کو انسان کے بجائے ایک اچھوت مخلوق بنا دیا جاتا۔ خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر پاکیزہ اور پاکیزگی کو پسند کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ مگر طہارت اور پاکیزگی کے باب میں، آپ نے جو حدود متعین کیں اور جو رویہ اختیار فرمایا، اس پر جس پہلو سے بھی غور کر کے دیکھیے، انسان پکار اٹھتا ہے کہ یہ ہر قسم کی افراط و تفریط سے یکسر پاک ہے۔ آپ کی زندگی میں ہمیں جو اعتدال نظر آتا ہے، وہی فطرت کا تقاضا اور دین میں مطلوب رویہ ہے۔ اگر کوئی شخص، ان معاملات میں، آپ کے طے کردہ معیارات سے تجاوز کرتا ہے، تو اس کے معنی، یقیناً، یہی ہوں گے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے پیغمبر سے زیادہ پاکیزہ سمجھتا ہے۔ نعوذ باللہ من ذلك۔

قربت سے اجتناب کی مدت

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، حیض کے دوران میں شوہر اپنی بیوی کے ساتھ زن و شو کا تعلق قائم نہیں کر سکتا۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ممانعت کب تک رہے گی؟ کیا حیض ختم ہونے کے فوراً بعد یہ تعلق قائم کیا جا سکتا ہے، یا اس کے لیے عورت کے غسل تک انتظار کرنا لازم ہے؟

قرآن مجید کے ارشاد: فاعتزلوا النساء فی المحیض، ولا تقربوھن حتی یطھرن فاذا تطھرن فاتوھن من حیث امرکم اللہ[1] سے ہمارے نزدیک، یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ ممانعت 'حتی یطھرن' (جب تک انھیں خون آنا بند نہ ہو جائے) تک ہی ہے۔ البتہ، 'فاذا تطھرن فاتوھن من حیث امرکم اللہ' (پھر جب وہ غسل کر لیں، تو ان کے پاس جاؤ، جہاں سے اللہ نے تمھیں حکم دیا ہے) سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بہتر یہی ہے کہ عورت کے غسل کر لینے کے بعد ہی یہ تعلق قائم کیا جائے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ عورت سے قربت کی ممانعت کی اصل علت، چونکہ خون ہے، اس وجہ سے اس کے انقطاع کے بعد، یہ پابندی تو اٹھ جاتی ہے، لیکن بہتر یہی ہے کہ جب عورت نہا دھو کر، پاکیزگی حاصل کر لے، تب اس سے ملاقات کی جائے۔

غور کیجیے، تو اس سے اسلامی شریعت کا یہ مزاج بھی سامنے آتا ہے کہ اس میں انسانوں کی نفسیات اور ان کی طبیعتوں کے اختلاف کا کس شان سے خیال رکھا گیا ہے۔ مذکورہ مسئلے میں، یہ بات تو قطعی طور پر، کہی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو پسند یہی ہے کہ شوہر، بیوی کے حیض کا غسل کر لینے کے بعد ہی اس سے تعلق قائم کرے۔ لیکن اس بات کو، اگر حتمی قانون بنا دیا جاتا، تو اسے نبھانے میں، لوگوں کو بعض اوقات بڑی دشواری کا سامنا ہو سکتا تھا۔ اس وجہ سے، اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت کا تقاضا یہی ہوا کہ انسان کی کمزوریوں کا خیال رکھتے ہوئے، زن و شو کے تعلق کی ممانعت کو کم سے کم وقت تک محدود رکھا جائے۔ چنانچہ، یہ تو لازم قرار دیا گیا کہ ایام حیض میں زن و شو کا تعلق قائم نہ کیا جائے، مگر ساتھ ہی یہ بیان کر دیا کہ حیض ختم ہونے کے ساتھ یہ ممانعت تو ختم ہو جاتی ہے، تاہم ہمارے پروردگار کو یہ بات زیادہ پسند ہے کہ عورت کے غسل کر لینے کے بعد ہی یہ تعلق قائم کیا جائے۔

۲۔ نماز اور روزہ

نماز بندے کی اپنے رب کے حضور حاضری ہے۔ نماز کے لیے ناگزیر ہے کہ ہم اپنے آپ کو

---

[1] البقرہ ۲: ۲۲۲ 'ایام حیض میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں، ان سے قربت نہ کرو۔ پھر جب وہ غسل کر لیں، تو ان کے پاس جاؤ، جہاں سے اللہ نے تمھیں حکم دیا ہے۔'

پاک صاف کرکے خدا کے حضور میں دست بستہ کھڑے ہوں۔ حیض کے دنوں میں، چونکہ عورتوں کو ایسی علت لاحق ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ پاک نہیں رہتیں، اس لیے انھیں ان دنوں میں نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔ اس معاملے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مروجہ سنت بھی یہی ہے۔ چنانچہ، اس معاملے میں، صحابہ کرام، فقہا اور تابعین میں سے کسی کی رائے بھی اس کے برعکس نہیں ہے۔

نماز ہی کی طرح، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنت بھی قائم فرمائی ہے کہ حیض کے ایام میں عورتوں کو روزے بھی نہیں رکھنے چاہییں۔ چنانچہ، اس معاملے میں بھی، اسلاف میں کوئی اختلاف نقل نہیں ہوا ہے۔

البتہ، یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حیض کی وجہ سے چھوٹنے والی نمازوں اور روزوں کی قضا ادا کرنی ضروری ہے یا نہیں؟

اس سوال کا جواب بھی ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ملتا ہے۔ اس معاملے میں، آپ نے مسلمان عورتوں کو یہ تعلیم دی کہ انھیں حیض کے دنوں میں چھوٹنے والی نمازوں کی قضا ادا نہیں کرنی، جبکہ ان دنوں میں چھوٹنے والے روزے ایام حیض کے بعد، کسی وقت پورے کرنے ہوں گے۔

روایات سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو حیض کی وجہ سے، چھوٹنے والے روزے پورے کرنے کا حکم دیا، مگر ایام حیض میں قضا ہونے والی نمازیں پوری کرنے کو نہیں کہا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے پوچھا: 'کیا وجہ ہے کہ حیض کے بعد، عورتیں قضا روزے تو رکھتی ہیں، مگر قضا نمازیں نہیں پڑھتیں؟' حضرت عائشہ نے جواب میں فرمایا:

كان يصيبنا ذلك فنومر بقضاء الصوم ولا نومر بقضاء الصلوة۔ (مسلم، کتاب الحیض)	"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہمیں حیض ہوا ہی کرتا تھا، پھر ہمیں روزے پورے کرنے کا حکم تو دیا گیا، مگر نمازیں قضا کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔"

یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ شریعت نے حیض میں چھوٹنے والے روزوں کو پورا کرنا ضروری قرار دیا ہے، مگر نماز کے معاملے میں رخصت دے دی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ شریعت میں سب سے زیادہ اہمیت جس عبادت کو حاصل ہے، وہ نماز ہی ہے۔ صحت ہو یا بیماری، سفر ہو یا حضر، کسی حال میں نماز چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے۔ نماز کی اس اہمیت کے پیش نظر یہ بات اور بھی زیادہ عجیب لگتی ہے کہ ایام حیض میں، روزوں کے برخلاف، قضا نمازیں پوری کرنے کا حکم نہیں دیا۔ ہم، یہاں اس حکم کی حکمت واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

پہلے نماز کا معاملہ لیجیے۔ ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر دن کی پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ حیض کوئی ایسی علت نہیں ہے، جو کسی عورت کو ناگہانی طور پر لاحق ہوتی ہو، بلکہ ہر مہینے کے مخصوص ایام میں، اسے اس صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ، اگر ایامِ حیض میں چھوٹنے والی نمازوں کی قضا ادا کرنی ضروری قرار دے دی جاتی، تو، بے شک، عورتوں کے لیے اسے نبھانا ایک مشکل کام ہوتا، اور خدائے رحمان و رحیم کی رحمت سے بعید ہے کہ وہ اپنے بندوں پر کوئی ایسا بوجھ ڈال دے جسے اٹھانا ان کے بس میں نہ ہو۔ لہٰذا، قرآنِ مجید میں بیان کردہ ضابطے لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا[1] کے تحت، ایامِ حیض میں چھوٹنے والی نمازوں کی قضا نہیں ہوتی۔

روزوں کے معاملے میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ روزے صرف ماہِ رمضان ہی کے فرض ہیں، نماز کی طرح، یہ کوئی روزمرہ کی عبادت نہیں ہیں۔ چنانچہ، کسی حائضہ کے لیے روزوں کی قضا ادا کرنے میں وہ مسئلہ پیدا نہیں ہوتا، جو نماز کی قضا کے معاملے میں، ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ دوسری اور اہم ترین بات یہ ہے کہ روزوں کے باب میں اللہ تعالیٰ کا اپنا ارشاد ہے:

وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ۔ (البقرہ ۲: ۱۸۵)	"اور تم میں سے جو رمضان کے مہینے میں بیمار ہو یا سفر میں ہو، تو وہ دوسرے دنوں میں روزوں کی گنتی پوری کرے۔"

اور، اس معاملے میں، دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ حیض بھی ایک قسم کی علت یا مرض ہی ہے، جو عورتوں کو لاحق ہوتا ہے۔ چنانچہ، اس معاملے میں، عورتوں کو مریضوں پر قیاس کر کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھیں، حیض کی وجہ سے چھوٹنے والے روزے، رمضان کے بعد کسی وقت پورے کرنے چاہییں۔

۴۔ مسجد میں جانا

مسجد، اللہ تعالیٰ کی عبادت کا گھر اور مسلمانوں کی دینی اور سیاسی اجتماع گاہ ہے۔ چنانچہ، مسجد کے تقدس کا تقاضا ہے کہ وہاں جاتے وقت ہمیشہ پاکیزگی اور صفائی کا اہتمام رکھا جائے۔ اس وجہ سے جس طرح کسی جنبی کے لیے، بغیر کسی مجبوری کے، مسجد میں جانے کی ممانعت ہے، اسی طرح حیض کی حالت میں بھی، اگر کوئی مجبوری نہ ہو تو کسی عورت کو مسجد میں نہیں جانا چاہیے۔

---

[1] الانعام ۶: ۱۵۲، 'ہم کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے'۔ دین کے سارے احکام، خواہ وہ معاملات سے متعلق ہوں یا عبادات سے، خود قرآن ہی کی رو سے اس استثنا کے ساتھ مشروط ہیں۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا۔ (النساء ۴: ۴۳)	"اے ایمان والو، نشے کی حالت میں نماز کے قریب بھی نہ جاؤ، یہاں تک کہ تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو، اور نہ جنابت کی حالت میں، مگر یہ کہ صرف گزر جانا پیشِ نظر ہو، یہاں تک کہ غسل کر لو۔"

قرآنِ مجید کی اس آیت میں، اگرچہ صرف جنبی ہی کے مسجد میں داخل ہونے پر پابندی لگائی گئی ہے، لیکن، بالبداہت، واضح ہے کہ اس پابندی کی وجہ، جنابت کی حالت میں جسم کا ناپاک ہونا ہے۔ چنانچہ، جب حیض میں بھی جنابت کی طرح، عورت پاک نہیں رہتی، اور جنابت ہی کی طرح، شریعت نے اس پر غسل کرنا لازم ٹھہرایا ہے، تو لازماً، یہی پابندی حائضہ پر بھی عائد ہو جائے گی۔

یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایات سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ ابوداؤد کی روایت ہے:

عن عائشة رضی الله عنها قالت، جاء رسول الله صلی الله علیه وسلم و وجوه بیوت اصحابه شارعة فی المسجد، فقال: وجهوا هذه البیوت عن المسجد، ثم دخل النبی صلی الله علیه وسلم و لم یصنع القوم شیئا رجاء ان تنزل فیهم رخصة، فخرج الیهم (بعد) فقال: وجهوا هذه البیوت عن المسجد، فانی لا احل المسجد لحائض ولا جنب۔ (کتاب الطهارة)	"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے گھروں کے دروازے مسجد میں کھلتے دیکھے، تو فرمایا: اپنے گھروں کے دروازے مسجد سے پھیر لو۔ لوگوں نے اس امید میں اس حکم کی تعمیل میں تاخیر کی کہ شاید اس میں انھیں کوئی رخصت دے دی جائے۔ اس کے بعد، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ انھیں حکم دیا: اپنے گھروں کے یہ دروازے مسجد سے پھیر لو، کیونکہ میں اس کی اجازت نہیں دوں گا کہ کوئی حائضہ یا جنبی مسجد میں داخل ہو۔"

سورۂ نساء کی مذکورہ آیت کے آخر میں 'الا عابری سبیل'[1] کہہ کر جس طرح اللہ تعالیٰ نے جنبی

---

[1] "مگر یہ کہ صرف گزر جانا پیشِ نظر ہو۔"

کو یہ رخصت دے دی ہے کہ بحالتِ مجبوری، وہ مسجد سے گزر سکتا ہے، اسی طرح حائضہ کو بھی یہ رخصت حاصل ہو گی کہ وہ، مجبوری کی حالت میں، مسجد سے گزر سکتی ہے۔

جب کسی حائضہ کے لیے عام حالات میں مسجد میں داخل ہونا ممنوع ہے، تو اس سے آپ سے آپ، یہ بات نکلتی ہے کہ کوئی حائضہ بیت اللہ کا طواف نہیں کر سکتی اور نہ مسجد کے اندر، اعتکاف میں بیٹھ سکتی ہے۔

اگر حج کے دوران میں عورت کو حیض ہو جائے، تو اسے چاہیے کہ وہ بیت اللہ کے طواف کے علاوہ، باقی تمام مناسک، دوسرے حاجیوں کی طرح پورے کرلے۔ بخاری کی روایت ہے:

عن عائشة قالت: خرجنا لا نرى الا الحج، فلما كنا بسرف حضت، فدخل على النبي صلى الله عليه وسلم وانا ابكي، قال: مالك، انفست؟ قلت: نعم، قال: ان هذا امر كتبه الله على بنات آدم، فاقضي ما يقضي الحاج غير ان لا تطوفي بالبيت۔ (کتاب الحیض)	"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ہم لوگ حج کے ارادے سے مدینہ سے چلے۔ جب ہم سرف کے مقام پر پہنچے تو مجھے حیض ہو گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس آئے، تو میں رو رہی تھی۔ آپ نے فرمایا: کیا ہوا، کیا حیض ہو گیا ہے؟ میں نے اثبات میں جواب دیا، تو آپ نے فرمایا: کوئی حرج نہیں، یہ آدم کی بیٹیوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ ہی کا فیصلہ ہے۔ تم طواف کے علاوہ باقی تمام مناسک حاجیوں کے ساتھ ادا کر لو۔"

۴۔ قرآنِ مجید کو چھونا یا اس کی تلاوت کرنا

جس طرح مسجد کے تقدس کا یہ تقاضا ہے کہ جنابت یا حیض کی حالت میں اس میں داخل نہ ہوا جائے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآنِ مجید کے تقدس کا بھی یہ تقاضا ہے کہ ایسی حالت میں اسے پڑھا یا چھوا نہ جائے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا يقراء القرآن الجنب ولا الحائض۔ (ابنِ ماجہ، کتاب الطہارۃ)	"جنبی اور حائضہ قرآن نہ پڑھیں۔"

اسی طرح آپ کا ارشاد ہے :

لا یمس القرآن الا طاھر رواہ النسائی۔ (فقہ السنہ، باب ما یجب لہ الوضوء)

"قرآنِ مجید کو صرف وہی چھوئے جو پاک ہو۔"

جس طرح قرآنِ مجید نے مسجد میں داخل ہونے کی ممانعت کے بعد 'الا عابری سبیل' کے الفاظ سے مجبوری کی حالت میں اس ممانعت کو، ایک حد تک مستثنیٰ کر دیا ہے، اسی طرح مجبوری کی حالت میں قرآن کو چھونے یا اسے پڑھنے کے معاملے میں بھی ایک حد تک، استثنا دیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر، اگر کوئی عورت حیض کی حالت میں، قرآنِ مجید کی کوئی دعا پڑھتی یا کوئی مسئلہ بیان کرنے کے لیے اس کی آیات سے استشہاد کرتی ہے، تو، ہمارے نزدیک، یہ بات بھی 'الا عابری سبیل' میں دی گئی رخصت کے تحت جائز ہوگی۔

فصل ۲۔ تنبیہات

اوپر، ہم نے تفصیل سے عورتوں پر ایامِ حیض میں، جاری ہونے والے احکام بیان کر دیے ہیں۔ اب، اس فصل میں ہم حیض سے متعلق چند ضمنی مسائل پر اپنا نقطۂ نظر بیان کریں گے۔

۱۔ غسل میں عجلت نہ کرنا

یہ بات پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ اسلامی قانون کے مطابق، ایامِ حیض میں عورتوں پر عبادات اور جنسی تعلق کے معاملے میں، پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ ان پابندیوں کے ہوتے ہوئے، اس بات کا امکان موجود ہے کہ کوئی عورت، کسی بھی وجہ سے، جلد سے جلد طہارت حاصل کرنے کی کوشش کرے اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ وہ پاک ہو گئی ہے، وقت سے پہلے ہی طہارت کا غسل کر لے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ عورتوں کو اسی وقت غسلِ حیض کرنا چاہیے، جب انھیں حیض کا خون آنا بالکل بند ہو گیا ہو۔ کسی بھی وجہ سے، اس سے پہلے، یہ غسل نہیں کرنا چاہیے، ورنہ اس کے نتیجے میں پوری طرح سے طہارت حاصل نہیں ہو گی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی 'صحیح' میں ایک واقعہ نقل کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی اس معاملے میں عورتوں کو یہی ہدایت دی :

کن نساء یبعثن الی عائشۃ بالدرجۃ فیھا الکرسف فیہ

"کچھ عورتیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھیلیوں میں روئی ڈال کر بھیجا کرتیں جن

الصفرة فتقول : لا تعجلن حتى ترين القصة البيضاء. (كتاب الحيض)

پر حیض کے خون کی کچھ زردی لگی ہوتی۔ اس پر حضرت عائشہ فرماتیں کہ ابھی غسل کرنے میں جلدی نہ کرو (اس وقت تک انتظار کرو) جب تک روئی کے یہ ٹکڑے بالکل سفید نہ ہو جائیں۔"

۲۔ استحاضہ

'استحاضہ' ایک قسم کی بیماری ہے۔ استحاضہ میں عورت کو ایام حیض کے علاوہ بھی خون آتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب قرآن مجید نے حیض کو ناپاکی قرار دیا ہے، تو یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ، چونکہ استحاضہ میں بھی عورتوں کو خون آتا ہے، اس وجہ سے، اس کا حکم بھی، شاید وہی ہو گا جو حیض کا ہے۔ یعنی، ایک مستحاضہ کے لیے بھی وہ سب کچھ ممنوع ہو گا، جس سے حائضہ کو روکا گیا ہے۔

اس معاملے میں، سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ قرآن مجید میں جس چیز کو ناپاکی قرار دیا گیا ہے، وہ حیض ہی ہے۔ مزید براں، یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ حیض اور استحاضہ ایک ہی چیز نہیں ہیں۔ ان کے الگ الگ نام خود اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس کے علاوہ، طبی لحاظ سے بھی ان میں فرق ہے۔ چنانچہ، وہ ناپاکی جس کے بارے میں قرآن مجید نے 'هو اذى فاعتزلوا النساء فى المحيض فلا تقربوهن حتى يطهرن[1]' کا حکم دیا ہے، وہ حیض ہی ہے۔ لہٰذا اس کی کوئی وجہ نہیں کہ ایک مستحاضہ کے لیے بھی وہ سب کچھ ممنوع مانا جائے، جسے قرآن مجید نے ایک حائضہ کے لیے ممنوع ٹھہرایا ہے۔

اس معاملے میں، دوسرا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ، اگرچہ مستحاضہ، حائضہ کے حکم میں نہیں ہوتی، مگر، چونکہ اسے، بے وقت، خون آتا رہتا ہے، اس وجہ سے، اس کا وضو قائم نہیں رہ سکتا، تو کیا اس کو عبادات ترک کر دینی چاہییں؟ اس مسئلے کا جواب وہی ہے جس کی طرف، اس سے پہلے، 'باب الوضو' میں ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ وہاں ہم نے لکھا ہے:

> اگر کسی شخص کو ایسی بیماری ہو، جس کی وجہ سے سبیلین[2] سے کوئی چیز خارج ہوتی رہتی ہو، تو اس صورت میں، اس کو ہر نماز سے پہلے، وضو کر لینا چاہیے۔ اس کے بعد، اگر نماز کے دوران

---

[1] البقرہ ۲: ۲۲۲، 'یہ ناپاکی ہے، اس لیے ایام حیض میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں، ان سے قربت نہ کرو'۔

[2] یعنی پیشاب اور پاخانے کی جگہ۔

ہیں اس کو یہ چیز خارج ہوتی محسوس ہو، تو اس کو وضو اور نماز دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس رخصت کی اساس قرآنِ مجید ہی میں موجود ہے۔ قرآنِ مجید کے سارے احکام، خواہ وہ معاملات سے متعلق ہوں یا عبادات سے، خود قرآن ہی کی رو سے، ایک استثنا کے ساتھ مشروط ہیں، قرآنِ مجید کا ارشاد ہے:

لَا تُكَلِّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا۔ (البقرہ ۲: ۲۳۳)	"کسی جان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر کسی چیز کا مکلف نہیں ٹھہرایا جاتا۔"

اسی طرح وضو، غسل اور تیمم کے حکم کے بعد، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ (المائدۃ ۵: ۶)	"اللہ یہ نہیں چاہتا کہ تمھارے لیے کوئی تنگی پیدا کرے، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے، اور تم پر اپنی نعمت تمام کرے، تاکہ تم اس کے شکر گزار ہو۔"

چنانچہ، اس اصول پر، ہمارے نزدیک، مستحاضہ، سلس البول کے مریض[1] اور ایسے شخص کو، جس کی ہوا خارج ہوتی رہتی ہو، ہر نماز سے پہلے وضو کر لینا چاہیے۔ اس کے بعد اگر نماز کے دوران میں اس کو، اپنی علت کے مطابق، سبیلین سے کوئی چیز خارج ہوتی محسوس ہو تو اس کو وضو اور نماز دہرانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ بخاری کی روایت ہے:

عن عائشة قالت: اعتكفت مع النبي صلى الله عليه وسلم امرأة من أزواجه فكانت ترى الدم والصفرة، والطست تحتها وهي تصلي، (كتاب الحيض)	"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج میں سے ایک، آپ کے ساتھ اعتکاف میں بیٹھیں۔ انھیں استحاضہ کا خون آیا کرتا تھا، چنانچہ نماز پڑھتے ہوئے، وہ اپنے نیچے ایک برتن رکھ لیا کرتی تھیں۔"

اس قسم کی بیماری میں یہ رخصت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایات سے بھی معلوم ہوتی ہے۔

---

[1] جس کا پیشاب نہ رکتا ہو، اور پیشاب کے قطرے نکلتے رہتے ہوں۔

ابنِ ماجہ کی روایت ہے :

عن عائشة قالت جأت فاطمة بنت ابی حبیش الی النبی صلی الله علیه وسلم فقالت : انی امراة استحاض فلا اطهر افادع الصلوة ؟ فقال لها : لا اجتنبی الصلوة ایام محیضك ، ثم صلی و ان قطر الدم علی الحصیر، رواه ابن ماجه (نیل الاوطار ، ج ۱ ص ۳۲۳)	"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں ، فاطمہ بنت ابی جبیش نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور انھیں بتایا کہ انھیں استحاضہ ہے کیا اس وجہ سے ، انھیں نماز چھوڑ دینی چاہیے ؟ آپ نے فرمایا : نہیں ، حیض کے دنوں میں نماز چھوڑ دو ، پھر غسل کر کے ہر نماز سے پہلے وضو کرلو ، اور پوری نمازیں پڑھو ، خواہ چٹائی (یعنی جائے نماز) پر خون ہی کیوں نہ ٹپکتا رہے۔"

مستحاضہ کے لیے حیض کی تعیین

شریعت نے جن کاموں سے حائضہ کو الگ رہنے کا حکم دیا ہے ، ظاہر ہے کہ وہ سب ایک مستحاضہ پر بھی ، اس کے ایامِ حیض میں ممنوع ہیں۔ ہم پہلے یہ بیان کر چکے ہیں کہ استحاضہ میں عورت کو ، وقت بے وقت خون آتا رہتا ہے۔ چنانچہ ، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک مستحاضہ اپنے ایامِ حیض کی تعیین کس طرح کرے گی ؟

عام طور پر ، ایک مستحاضہ ، خون کی رنگت اور کثافت کے ذریعے سے حیض اور استحاضہ میں فرق کر سکتی ہے۔ حیض کا خون زیادہ گہرے رنگ کا اور گاڑھا ہوتا ہے ، جبکہ استحاضہ کا خون زردی مائل اور پتلا ہوتا ہے۔ چنانچہ مستحاضہ کو چاہیے کہ وہ خون کی رنگت کے لحاظ سے حیض اور استحاضہ میں فرق کر کے ، حیض کے دنوں میں ، اس سے متعلق شریعت کے احکام کی پابندی کرے۔ اس کے بعد ، جب خون کی رنگت اور کثافت میں کمی ہو جائے ، تو اسے چاہیے کہ غسل کر کے پاک ہو جائے۔

یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایات سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ ابوداؤد رحمہ اللہ کی روایت ہے :

عن فاطمة بنت ابی حبیش انها كانت تستحاض فقال لها النبی صلی الله علیه وسلم اذا كان دم الحیضة فانه	"فاطمہ بنت ابی جبیش رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے مستحاضہ ہونے کا ذکر کیا ، تو آپ نے فرمایا : حیض کا خون تو سیاہی مائل ہوتا ہے اور

اسود يعرف، فاذا كان ذلك فامسكي عن الصلوٰة، واذا كان الآخر فتوضئ وصلي فانما هو عرق. (كتاب الطهارة)

پہچانا جاتا ہے' ایسا ہو تو نماز چھوڑ دو پھر جب اس کی رنگت بدل جائے تو وضو کر کے نماز پڑھ لیا کرو۔ یہ حیض نہیں، یہ تو ایک رگ (کا خون) ہے [جو بہ نکلتی ہے]۔"

مگر یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ عورتوں کے لیے خون کی رنگت کے لحاظ سے حیض اور استحاضہ میں فرق کرنا مشکل ہو جائے۔ ایسی عورتوں کو چاہیے کہ، استحاضہ کی بیماری ہونے سے پہلے، انھیں مہینے کے جن دنوں میں حیض آتا تھا، انھی مخصوص دنوں کو، وہ آئندہ کے لیے بھی اپنے حیض کے دن شمار کر لیں، اور ان دنوں میں' ان تمام احکام کی پابندی کریں، جو شریعت نے حائضہ پر عائد کیے ہیں۔

یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایت سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ امام مالک کی 'موطا' میں روایت ہے:

عن ام سلمة زوج النبي صلى الله عليه وسلم ان امراة كانت تهراق الدماء في عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم فاستفتت لها ام سلمة رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: لتنظر الى عدد الليالي والايام التي كانت تحيضهن من الشهر قبل ان يصيبها الذي اصابها، فلتترك الصلوة قدر ذلك من الشهر فاذا خلفت ذلك فلتغتسل، ثم لتستثفر بثوب، ثم لتصلي،
(كتاب الطهارة)

"ام المومنین، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں، ایک عورت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بہت خون آتا تھا۔ اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا، تو آپ نے فرمایا: وہ غور کرے کہ اس طرح [یعنی استحاضہ] ہونے سے پہلے' ہر ماہ کتنے دن اسے حیض آتا تھا۔ پھر وہ ہر مہینے کے اتنے ہی دن [حیض شمار کر کے] نماز سے الگ رہے۔ پھر، جب وہ دن گزر جائیں، تو غسل حیض کرے اور کوئی کپڑا باندھ کر نماز پڑھ لیا کرے۔"

ترتیب : طالب محسن

"روحانی وجود کے تزکیے کا راستہ صرف ایک ہے، اور وہ راستہ یہ ہے کہ بندے کا اپنے رب سے تعلق، صحیح بنیاد پر، استوار ہو جائے، وہ بنیاد جو قرآن و سنت سے معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ یہ قرآن و سنت ہی کا بتایا ہوا راستہ ہے جو مادی وجود کی جبلتوں اور روحانی وجود کے تقاضوں، ہر ایک کے لیے صحیح اور سیدھا راستہ ہے۔ یہ بات ایک محکم اصول کی حیثیت رکھتی ہے کہ قرآن و سنت نے اس معاملے میں جو بھی حدود و قیود اور طریقے متعین کر دیے ہیں، نہ اس سے ذرہ برابر تجاوز ہونا چاہیے اور کسی طرح کی کمی ہی اس میں روا رکھی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ، تجویز کیا جانے والا، ہر طریقہ اور ہر راستہ، نہ صرف یہ کہ غیر دین ہے بلکہ ایک بدترین بدعت ہے۔ خواہ وہ اپنے ظاہر میں کوئی ورد، کوئی وظیفہ، اور بظاہر کوئی نیک عمل ہی کیوں نہ ہو۔"

فکر و نظر

طالب محسن

تزکیۂ نفس

— ۳ —

روحانی وجود کا تزکیہ

حیوانی اور عقلی وجود کی طرح، ہمارے نفس کا روحانی پہلو بھی تزکیے کا محتاج ہے۔ روحانی وجود، ہمارے نفس کا وہ پہلو ہے، جسے ہم انسان کی اصل شخصیت قرار دے سکتے ہیں۔ ہم اپنے اس پہلو سے خوب واقف اور اس کا قوی احساس اپنے اندر پاتے ہیں۔ ہمارا وجدان گواہی دیتا ہے کہ یہ پوری طرح ہماری شخصیت کا حصہ ہے۔ جب ہم 'میں' کا لفظ بولتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ 'میں ہوں'، تو یہ اسی باطنی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ وحیِ الٰہی سے بھی، اسی بات کی تائید ہوتی ہے کہ نفس کا یہ پہلو، اپنا ایک الگ اور واضح تشخص رکھتا ہے اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس کی تخلیق کا عمل بھی، حیوانی وجود کی تخلیق کے عمل سے مختلف ہے۔

قرآنِ مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق کے عمل کا ایک پہلو یہ ہے کہ مادے سے مختلف ہیئتوں کو وجود میں لایا جائے۔ چنانچہ، ہمارے اردگرد موجود' اللہ تعالیٰ کی سینکڑوں تخلیقات اسی طریقِ تخلیق کے تحت وجود پائے ہوئے ہیں۔ قرآن مجید نے اس عمل کو 'کُنْ فَیَکُوْنُ' ، 'ہوجا' تو وہ ہوجاتی ہے'، کے الفاظ میں بیان کیا ہے، یعنی، اللہ تعالیٰ جب کوئی چیز تخلیق کرنا چاہتے ہیں، تو اسے اپنی ہدایت کے مطابق، وجود پزیر ہونے کا حکم دیتے ہیں، اور وہ چیز عین حکم اور طے شدہ نظام اوقات کے مطابق وجود میں آجاتی ہے۔ جب کہ تخلیق کے دوسرے عمل کے لیے 'نفخ'، یعنی پھونک کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ پھونک کا یہ عمل کیا ہے؟ اس کی وضاحت سیدنا مسیح علیہ السلام کے ایک معجزے سے بخوبی ہوجاتی ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

اَنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ اَنِّیْ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ كَهَیْــٴَـةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَكُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ. (آل عمران ۳: ۴۹)	"میں تمھارے پاس تمھارے رب کی نشانی لے کر آیا ہوں کہ تمھارے سامنے مٹی سے پرندے کی صورت بناتا ہوں اور پھر اس میں پھونک دیتا ہوں، تو وہ اللہ کے اذن سے ایک اڑتا پرندہ بن جاتی ہے۔"

پھونک کے عمل سے، جو چیز مادی وجود میں منتقل کی جاتی ہے، اسے ہم جان اور روح کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ قرآنِ مجید میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کا عمل تفصیل سے بیان ہوا ہے، اور اس میں بھی روح پھونکنے کا عمل الگ بیان ہوا ہے۔ سورۂ حجر میں ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ. فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ. (۱۵: ۲۸-۲۹)

"جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں نے کھنکھناتے گارے سے ایک بشر تخلیق کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ چنانچہ جب میں اسے سنوار لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں، تو تم اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا۔"

قرآنِ مجید سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل، ہر انسان کی پیدائش میں ایک مرحلے کی حیثیت سے، اب بھی شامل ہے۔ سورۂ سجدہ میں ہے:

وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ. ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ. ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ. (۳۲: ۷-۹)

"اس نے انسان کی تخلیق کا آغاز گارے سے کیا۔ پھر ایک بے حقیقت پانی سے اس کی نسل کا سلسلہ جاری کیا۔ پھر (دونوں صورتوں میں) نوک پلک سنوارنے کے بعد اپنی روح پھونکی۔ اور تمھارے لیے سمع، بصر اور فواد کی صلاحیتیں پیدا کیں، لیکن تم کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔"

قرآنِ مجید نے اس طرح تخلیق کے دہرے نظام کا ذکر کر کے یہ بات واضح کر دی ہے کہ انسان کا حیوانی وجود ایک الگ چیز اور اس کا روحانی وجود ایک دوسری چیز ہے۔ ہم، اگرچہ، پھونک کے اس عمل کی حقیقت پوری طرح متعین نہیں کر سکتے، لیکن قرآنِ مجید صریح ہے کہ ہمارے وجود کا غیر مرئی پہلو ایک روحِ ربانی ہے، جسے پانے کے بعد ہم شرفِ انسانیت سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ انسان کا یہ قالب، مادی اور غیر مادی، دو وجودوں کا مجموعہ ہے۔ یہ غیر مادی اور روحانی وجود ہے، جسے ہمارے مادی وجود سے نکال لیا جائے، تو ہم زندگی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ روح کی جسم سے علیحدگی، ایک محسوس واقعہ ہے۔ جس وقت روح بدن سے الگ ہوتی ہے، تو ہم دیکھتے ہیں کہ جسم ایک خاص کیفیت سے گزرتا ہے۔

قرآنِ مجید نے بھی ایک مقام پر اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ۔ (الواقعہ ۵۶: ۸۳-۸۴)

"(اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ کسی کے محکوم نہیں ہو) تو کیوں نہیں، جب کسی کی جان حلق میں پہنچتی ہے، تو تم اس موقعے کو دیکھ رہے ہوتے ہو۔ (مطلب یہ کہ کسی کا بس نہیں چلتا کہ اسے بچا لے)"

موت کے اس وقت کے لیے 'نزع' کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور یہ لفظ بھی جسم سے کسی چیز کے نکال لیے جانے ہی کو تعبیر کرتا ہے۔

قرآنِ مجید نے یہ بھی بتایا ہے کہ یہ روحانی وجود ہے، جس سے یوم الست اللہ تعالیٰ نے عہد توحید لیا تھا۔ سورۂ اعراف میں ہے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا۔ (۷: ۱۷۲)

"اور یاد کرو، جب نکالا تمھارے رب نے بنی آدم سے — ان کی پیٹھوں سے — ان کی ذریت کو اور ان کو گواہ ٹھہرایا، خود اُن کے اوپر کہ کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ بولے، کیوں نہیں، (تو ہمارا رب ہے)، ہم اس کے گواہ ہیں۔"

توحید اور بندگی کی یہ شہادت روحانی وجود کا ایک اٹوٹ حصہ ہے۔ حقائق کا ادراک اور ان کا اعتراف، اس کی ذات میں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا یہ وجود حقیقتوں کا منکر نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ انھیں مسلمات کی حیثیت سے جانتا اور مانتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ ایک پاکیزہ اور خطاؤں سے منزہ وجود ہے۔

یوم الست کے عہد اور حقائق کے ادراک کا ہمارے شعور کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ اسے ہم اپنی زندگی کی ایک مثال سے بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ ماں کا وجود ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ جب ایک بچہ اس دنیا میں جنم لیتا ہے، تو اس کے سارے حواس بیدار ہوتے ہیں۔ وہ اس وقت اپنے اوپر گزرنے والی کیفیات سے آگاہ ہوتا اور اس کا اظہار بھی کرتا ہے، لیکن شب و روز کی گردش، یہ سب کچھ، اس کے شعور سے محو کر دیتی ہے۔ جب یہ بڑا ہوتا ہے، تو اپنی ماں کے وجود کو تسلیم کرتا، اس سے وابستہ رہتا اور اپنے اوپر، حقوق و فرائض کے حوالے سے، عائد ہونے والی ذمہ داریاں ادا کرتا ہے۔ جس طرح اپنی

پیدائش کا واقعہ کسی کو بھی یاد نہیں، لیکن کوئی اس حقیقت سے کبھی انکار نہیں کرتا کہ وہ فلاں ماں کی اولاد ہے۔ اس کے گرد و پیش کی شہادت ہی اس کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح عہد الست کا واقعہ کسی کو بھی یاد نہیں، لیکن اس کی طرف جب بھی بلایا جاتا ہے' تو روحانی وجود اس سے گریزاں نہیں ہوتا، بلکہ ایک لپک اور طلب اس کے لیے اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔

ہم نے واضح کیا ہے کہ روحانی وجود ایک پاکیزہ وجود ہے۔ یہ مومن قانت ہے اور حقائق کو بغیر پس و پیش کے مان لیتا ہے۔ جب یہ سب کچھ ایک حقیقت ہے، تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے تزکیے کی کیا ضرورت ہے۔ اس سوال کا جواب کچھ تفصیل کا متقاضی ہے۔ درحقیقت، روحانی وجود، اس دنیا میں ایک مادی قالب میں ظاہر ہوا ہے۔ اُس کا اور مادی وجود کا باہمی تعلق، اس قدر اٹوٹ اور گہرا ہے کہ اُس کی ضرورتیں اِس کی ضرورتیں بن گئی ہیں۔ پھر یہ ضروریات ہی نہیں، انسان کی خواہشات، جذبات اور تعصبات بھی اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ علو و اقتدار کی خواہش آنکھ کھلتے ہی نمودار ہو جاتی ہے۔ مقام اور مرتبہ پانے کی طلب، یوں محسوس ہوتا ہے، اوّل روز ہی سے اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ جنسی جذبہ بھی ایک سیلاب ہے، جو کسی شخص کو کسی بھی سمت میں بہا کر لے جا سکتا ہے۔ اسی طرح، غصہ، نفرت اور انتقام، انسانی کردار اور رویّوں کی تشکیل میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ ساری چیزیں روحانی وجود کا گھیراؤ کرتی ہیں۔ اُس پر اِن کا بوجھ پڑتا ہے اور وہ دبنا شروع ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات صورت یہ ہو جاتی ہے کہ آدمی جبلتوں کا غلام اور خواہشات کا کھلونا بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ چیزیں، بعض اوقات، روحانی وجود کو اتنا دبا لیتی ہیں کہ اس کے لیے آنکھ کھولنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ انتہا بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ انسان خدا کا انکار کر دیتا ہے۔ اسی طرح بسا اوقات، وہ کردار کے اعتبار سے اتنا گر جاتا ہے کہ اس کی زندگی ایک جانور کی زندگی سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں روحانی وجود' حوصلہ ہار دیتا ہے، اور اس میں مقابلہ کرنے کے لیے دم خم باقی نہیں رہتا۔ اگرچہ یہ سب، بہت جلد نہیں ہو جاتا' اس میں بڑی دیر لگتی ہے۔ اس کے پیچھے ایک طویل کشمکش ہوتی ہے۔ ہمارا یہ ملکوتی وجود مقابلہ کرتا ہے اور ضمیر یا نفس ملامت گر کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری ادا کرتا رہتا ہے، مگر انسان اپنے اختیار کی آزادی سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس کی آواز دباتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ منزل آجاتی ہے، جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔

عام طور پر، نفس کا روحانی پہلو، اسی کشمکش سے دوچار ہوتا ہے، لیکن بعض اوقات، معاملہ اس کے بالکل برعکس صورت بھی اختیار کر لیتا ہے۔ اس صورت میں روحانی وجود' انسانی وجود کے دوسرے

پہلوؤں کو لاحق ضرورتوں، جذبات اور خواہشات کی زنجیریں توڑ دیتا اور بطورِ خاص حیوانی وجود کے تقاضوں کو ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ چنانچہ، اس کے نتیجے میں رہبانیت اور اس کی مختلف شکلیں وجود میں آتی ہیں۔ یوگ، ویدانت اور سنیاس، اسی رہبانیت کے مختلف مظاہر ہیں۔ پھر اسی کی کوکھ سے وحدت الوجود کا فلسفہ جنم لیتا ہے۔ انسان ذاتِ خداوندی کا شمہ ہونے کا دعویٰ کر بیٹھتا اور اس خبط میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ حیوانی وجود اور اس کے تقاضوں سے نجات حاصل کر کے، حقیقتِ اعلیٰ سے ہم کنار ہو جائے۔ یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ یہ تصور دین میں اپنی کوئی بنیاد نہیں رکھتا۔ قرآنِ مجید نے پھونک کے عمل سے جس چیز کی وضاحت کی ہے، وہ تخلیق کا عمل ہے۔ اس سے ہرگز مراد یہ نہیں ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کا کوئی حصہ ہمارے اندر منتقل ہو جاتا ہے۔ قرآنِ مجید کی تصریحات کے باوجود، حیرت انگیز امر یہ ہے کہ یہ فلسفہ، جو ایک عالمگیر گمراہی کی حیثیت رکھتا ہے، دنیا کے دوسرے مذاہب کے ساتھ ساتھ اسلام کے جسدِ فکری میں بھی داخل ہو گیا اور غلط عقائد اور بدعات کے فروغ کا باعث بنا۔ ہمارے ہاں اللہ سے تعلق کے لیے محبت کے بجائے 'عشقِ حقیقی'، مرنے والے بزرگ کی برسی کے لیے 'عرس' اور اس کی وفات کے لیے 'وصال' کے الفاظ اسی گمراہ کن فلسفے کے نتیجے میں رائج ہوئے ہیں۔

مولانا روم کے یہ اشعار اسی فلسفے کو بیان کرتے ہیں:

بشنو از نے چوں حکایت می کند | وز جدائی ہا شکایت می کند

"بانسری سے سنو، کس طرح ایک حکایت سنا رہی ہے۔ اور اپنی جدائیوں کا نالہ کھینچ رہی ہے۔"

تا مرا از نیستاں ببریدہ اند | در نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

کہتی ہے، جب سے مجھے نرکل کے جھنڈے کاٹا گیا ہے۔ ہر مرد و زن میری آواز میں نالہ سنج ہے۔"

دین، اللہ تعالیٰ اور بندے کے تعلق کو عبد اور معبود کا تعلق قرار دیتا ہے اور تصوف میں یہ تعلق عاشق اور معشوق کا تعلق ہے۔

ان دونوں صورتوں میں سے، جو صورت بھی پیش آئے، ہمارا یہ روحانی وجود، بہرحال، تزکیے کا محتاج ہے۔ اس پہلو سے بھی کہ وہ ان تقاضوں کو بالکل نظر انداز کر کے اور ان کی بیڑیاں توڑ کر رہبانیت کی بدعت میں مبتلا نہ ہو جائے اور اس پہلو سے بھی کہ مادی وجود کے تقاضے غلبہ پالیں اور انسان محض جانور بن کر نہ رہ جائے۔

روحانی وجود کے تزکیے کا راستہ صرف ایک ہے، اور وہ راستہ یہ ہے کہ بندے کا اپنے رب سے تعلق، صحیح بنیاد پر استوار ہو جائے، وہ بنیاد جو قرآن و سنت سے معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ یہ

قرآن و سنت ہی کا بتایا ہوا راستہ ہے جو مادی وجود کی جبلتوں اور روحانی وجود کے تقاضوں، ہر ایک کے لیے صحیح اور سیدھا راستہ ہے۔ یہ بات ایک محکم اصول کی حیثیت رکھتی ہے کہ قرآن و سنت نے اس معاملے میں جو بھی حدود و قیود اور طریقے متعین کر دیے ہیں، نہ اس سے ذرہ برابر تجاوز ہونا چاہیے اور نہ کسی طرح کی کمی ہی اس میں روا رکھی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ، تجویز کیا جانے والا ہر طریقہ اور ہر راستہ، نہ صرف یہ کہ غیر دین ہے، بلکہ ایک بدترین بدعت ہے۔ خواہ وہ اپنے ظاہر میں کوئی ورد، کوئی وظیفہ، اور بظاہر کوئی نیک عمل ہی کیوں نہ ہو۔

اگرچہ تصوف بھی روحانی وجود کے تزکیے کے لیے، تعلق باللہ ہی کو راستہ قرار دیتا ہے، لیکن اس میں غلطی یہ ہے کہ وہ بندے اور رب کے تعلق کے لیے، جیسا کہ ہم پہلے بھی واضح کر چکے ہیں، غلط اساسات متعین کرتا ہے۔ وہ بندے کے روحانی وجود کو شمۂ خداوندی قرار دیتا اور اس کے خدا کے ساتھ وصال کو منزل ٹھیراتا ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ حیوانی اور روحانی دونوں وجود، خدا کی تخلیق ہیں اور عدم سے وجود میں آئے ہیں، لہٰذا خدا اور بندے کا اصل تعلق عبد اور معبود کا تعلق ہے اور آئندہ سطور میں ہم اسی تعلق کی صحیح اساسات کی توضیح کریں گے۔

اللہ کے ساتھ تعلق کی بنیادیں

ذکر

عام زندگی میں کسی کے ساتھ تعلق ملاقاتوں اور گفتگوؤں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، لیکن اگر ملاقات ممکن نہ ہو تو یہ تعلق یاد میں ڈھل جاتا ہے۔ ہم، چونکہ، اللہ تعالیٰ کو دیکھ نہیں سکتے، لہٰذا اللہ تعالیٰ سے ہمارے تعلق کا اظہار 'یاد' یعنی 'ذکر' کی صورت میں ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ذکر اپنے اندر کئی پہلو رکھتا ہے۔ اس کا ایک پہلو پروردگار کائنات کی عظمت کا اعتراف ہے۔ یہ اعتراف عظمت ہی ہے، جس کے اظہار کے لیے کلمات حمد زبان پر جاری ہو جاتے ہیں، اور اسی کے لیے رکوع و سجود اعضا و جوارح کی زبان بن جاتے ہیں۔ کائنات کا مشاہدہ، درحقیقت، خدا کی عظمتوں، قدرتوں اور رحمتوں کی وسعت اور گیرائی کا مطالعہ ہے۔ یہ چیز اللہ تعالیٰ کی یاد کے اس پہلو کو مزید گہرا اور راسخ بنا دیتی ہے۔

یاد کا دوسرا پہلو، ان نعمتوں پر شکر سے متعلق ہے، جو ہمیں زندگی کے شب و روز میں حاصل ہوتی ہیں۔ اس زاویے سے دیکھیں، تو کائنات میں ہمیں خدا کی عظمت اور قدرت کے جو نشان بھی نظر آتے ہیں، وہ اصل میں ہمارے لیے نعمت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا، جوں ہی یہ شعور پیدا ہوتا ہے، ہمارا دل اعتراف عظمت

اور اظہارِ شکر کے جذبے سے سرشار ہو جاتا ہے۔

ذکر کا تیسرا پہلو ہمارے سراپا احتیاج ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ ہمیں صبح و شام مختلف ضرورتیں پیش آتی ہیں، اور اگر حقائق پر نظر ہو تو یہ چیز مبرہن ہو جاتی ہے کہ ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہمیں اللہ کی مدد اور عنایت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ہم اس سے مانگتے اور اس کے حضور میں درخواست کرتے ہیں۔ اس طرح احتیاج، پھر دعا اور درخواست سے ذکرِ الٰہی کی تیسری جہت وجود میں آتی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے 'اللہ اکبر'، 'سبحان اللہ' اور 'الحمد للہ' کے کلمات کو کلماتِ ذکر قرار دیا ہے۔ یہ کلمات بھی، درحقیقت، شکر اور اعترافِ عظمت ہی کی جامع تعبیر ہیں۔ ان کلمات سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ دین میں زبان سے ذکر کا مطلب کسی لفظ یا اسم کا بار بار جپنا نہیں ہے۔ یہ ایک واضح تصور اور تجربی احساس ہوتا ہے، جو ایک مکمل بات کی صورت میں، زبان پر جاری ہو جاتا ہے اور آدمی فرطِ احساس کے تحت اسے بار بار دہراتا ہے۔ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے روز و شب کے معمولات میں جو دعائیں سکھائی ہیں، وہ بھی یادِ الٰہی کے انھی پہلوؤں کو بڑی جامعیت کے ساتھ، اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ جہاں یہ دعائیں اللہ تعالیٰ کی مختلف نعمتوں کو پانے کا ذریعہ بنتی ہیں، وہاں دین کے اصل اور باطنی پہلو کی یاد دہانی بھی کرتی رہتی ہیں۔ یہ دعائیں، چونکہ، ہر موقعے کے لیے ہیں، لہٰذا، ان کے التزام سے، یادِ الٰہی زندگی کے شب و روز کا احاطہ کر لیتی ہے۔ قرآنِ مجید ایسے ہی مسلمانوں کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ۔ (آلِ عمران ۳: ۱۹۱)

"وہ جو اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور کروٹ لیتے یاد کرتے ہیں۔"

ذکر ہی کے دوام اور احاطے کے لیے نماز فرض کی گئی ہے۔ قرآنِ مجید نے سورۂ طٰہٰ میں نماز کی یہی غرض بیان کی ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ۔ (۲۰: ۱۴)

"میری یاد کے لیے نماز کا اہتمام کرو۔"

نماز ذکر کی ایک جامع صورت ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی یاد کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر لیتی ہے۔ اس میں زبان پر حمد، شکر، تسبیح اور دعاؤں کے الفاظ جاری ہو جاتے ہیں، اور اعضا و جوارح قیام، رکوع اور سجود کی صورت میں زبان کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ اللہ کی عظمت کے اظہار کا کلمہ 'اللہ اکبر' ساری نماز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ نماز کا آغاز اسی تسبیح سے ہوتا ہے۔ پھر تسبیح اور تفویض کے

کلمات دہرائے جاتے ہیں۔ سورۂ فاتحہ شکر کے مضمون سے شروع ہوتی اور دعا کے الفاظ پر ختم ہوتی ہے۔ پھر قرآنِ مجید کی تلاوت کی جاتی ہے۔ قرآنِ مجید خود الذکر ہے۔ یہ پروردگارِ عالم کی یاددہانی ہے۔ خدا کی حقیقی یاد اور خدا سے صحیح تعلق اسی پر منحصر ہے۔ رکوع و سجود تسبیح کے کلمات سے عبارت ہیں۔ اور تسبیح، حمد و شکر ہی کا ایک سلبی پہلو ہے۔ تشہد کے کلمات اعتراف و اقرار اور اظہارِ وابستگی کے کلمات ہیں۔ پھر اختتام درود اور دوسری دعاؤں پر ہوتا ہے۔ اس طرح نماز اپنے اندر ذکر اور یادِ الٰہی کے سارے پہلوؤں کو سمو لیتی ہے۔ پھر اس نماز کے لیے اوقات اس طرح متعین کیے گئے ہیں کہ شب و روز میں کائنات کے ہر تغیر پر نماز واجب ہو جاتی ہے۔ دن سرگرمیوں کا مرکز ہے، اس میں بھی نمازیں ہیں۔ نیند موت کی یاددہانی ہے۔ اس کے آغاز و اختتام پر بھی نماز رکھ دی گئی ہے، تاکہ خدا کی یاد زندگی کا پوری طرح احاطہ کرے۔

وفاداری

اللہ تعالیٰ کے ساتھ وفاداری، اللہ کے ساتھ تعلق کی دوسری بڑی اساس ہے اور اس کا سب سے بڑا مظہر انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہوا ہے:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ.	"تم ہرگز وفاداری کے معیار پر پورے نہیں اترو گے، جب تک اس میں سے خرچ نہ کرو جو تمھیں نہایت عزیز ہے۔" (آل عمران ۳: ۹۲)

تقاضا یہ ہے کہ ذاتی ضروریات کو پورا کر کے باقی جو کچھ ہے، وہ افراد، معاشرے اور قوم و ملت کی ضروریات پر خرچ کیا جائے۔ واضح رہے کہ یہاں ذاتی ضروریات سے ہماری مراد صرف روزمرہ کی گھریلو ضروریات ہی نہیں، کاروبار اور مستقبل میں پیش آنے والی ضروریات بھی اسی میں شامل ہیں۔ خدا کا سچا بندہ وہ ہے، جو اس کی دی ہوئی نعمتوں کو خدا کے بندوں کے لیے عام کر دے۔ زکوٰۃ کی صورت میں انفاق فی سبیل اللہ کی کم از کم حد بھی متعین کر دی گئی ہے، جسے ہر مسلمان، اگر وہ صاحبِ نصاب ہو تو اپنی ریاست کو ادا کرتا ہے، لیکن یہ واضح رہے کہ اس کی حیثیت کم از کم مطلوب کی ہے، اعلیٰ اور برتر رویہ وہی ہے، جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔

تقویٰ

اللہ تعالیٰ سے تعلق کی تیسری اساس پرہیزگاری اور حدود آشنائی ہے۔ دین کی ساری شریعت، درحقیقت، اسی غرض سے ہے کہ وہ حدود و قواعد متعین کر دیے جائیں، جنھیں ملحوظ رکھنے کے بعد

ایک مسلمان پرہیزگار مسلمان بن جائے۔ ایک ماہ کے روزے اسی پرہیزگاری اور حدود آشنائی کی خصوصی تربیت کے لیے فرض کیے گئے ہیں۔ قرآنِ مجید نے روزے کے فرض کرنے کی وجہ یہی بیان کی ہے۔ ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ (البقرہ ۲: ۱۸۳)	"اے ایمان والو، تم پر اسی طرح روزے فرض کیے گئے ہیں، جس طرح پہلوں پر کیے گئے تھے۔ (اور مقصود یہ ہے کہ) تم ان کے ذریعے سے صاحبِ تقویٰ (پرہیزگار) بن سکو۔"

روزہ معمول سے ہٹ کر کچھ زائد پابندیاں اختیار کرنے کا نام ہے۔ بطن و فرج پر پابندیاں لگ جاتی ہیں۔ اعضا و جوارح: آنکھ، زبان، کانوں اور ہاتھوں پر پہرہ بٹھا دیا جاتا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ نفس کی آلودگیاں کمزور پڑ جائیں اور اطاعت، عبادت اور تقویٰ کی طرف رغبت زیادہ ہو۔ روزہ اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کا مسلسل احساس طاری کیے رکھتا ہے۔ جس طرح وہ خورد و نوش سے روزہ دار ہونے کی وجہ سے رکا رہتا ہے، اسی طرح اسے غیر اخلاقی بات اور عمل سے رُکے رہنا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب روزے دار کو جھگڑا پیش آجائے تو وہ یہ کہہ کر رک جائے کہ میں روزے سے ہوں۔

رمضان کا آخری عشرہ اعتکاف کا عشرہ ہے۔ اعتکاف کرنے والا دنیا سے کٹ کر صرف اللہ کی یاد کے لیے اپنے آپ کو خاص کر لیتا ہے۔ چنانچہ، بعض پابندیاں، جو رمضان میں صرف دن کے ساتھ خاص ہیں، وہ معتکف پر رات کے وقت بھی لگ جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو دین ہمیں دیا ہے، وہ ان حدود کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نام ہے، جو اللہ کو پسند ہیں اور روزہ انھی حدود کی پابندی کی تربیت کا ایک خصوصی پروگرام ہے۔

محبت

ہمارے ہاں اللہ کے ساتھ محبت کے لیے، محبت کے بجائے، بالعموم عشق کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ درانحالیکہ، عشق کا لفظ قرآنِ مجید کے لیے ایک اجنبی لفظ ہے۔ اگرچہ، عشق بھی عربی زبان کا لفظ ہے، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ لگاؤ کی تعبیر کے لیے کسی طرح بھی موزوں نہیں۔ ہمارے ہاں ایک شاعر نے بجا طور پر جذبۂ عشق کو دماغ کا خلل قرار دیا ہے۔

اس ضمن میں قرآنِ مجید نے لفظِ محبت اختیار کیا ہے اور تشریح بھی کی ہے کہ اللہ کی محبت سے

اس کی کیا مراد ہے۔ سورۂ بقرہ میں، اللہ تعالیٰ سے محبت کا ذکر ایک محمود اور مطلوب جذبے کی حیثیت سے ہوا ہے۔ ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۔ (۲: ۱۶۵)	"ایمان والے سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔"

سورۂ آلِ عمران میں یہ بھی بتا دیا کہ یہ محبت کس طرح ظاہر ہونی چاہیے:

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ ۔ (۳: ۳۱)	"اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو، تو میری (رسول اللہ کی) پیروی کرو۔"

سورۂ توبہ میں یہی حقیقت ایک دوسرے اسلوب میں واضح کی گئی ہے:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۔ (۹: ۲۴)	"اے نبی، ان سے کہہ دیجیے، اگر تمھارے باپ، دادا، تمھاری اولاد، تمھارے بھائی، تمھاری بیویاں، تمھاری برادری، وہ مال جسے تم نے کمایا ہے، تجارت جس کے مندے سے تم ڈرتے ہو اور مکان جو تمھیں پسند ہیں، اگر تمھیں اللہ، اس کے رسول اور اس کی راہ جہاد سے زیادہ عزیز ہیں، تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر فرما دے۔"

ان آیاتِ کریمہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ محبتِ الٰہی، درحقیقت، اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کے ساتھ وابستگی کے تقاضے ہر حال میں پورے کرنے کا نام ہے۔ یہاں تک کہ صورتِ حال، اگر متقاضی ہو تو بندہ اپنے وطن، گھر، مال و دولت، اولاد اور تجارت کا مفاد بھی اس وابستگی کی خاطر قربان کر دے۔ اور ہر حال میں، اللہ اور اس کے دین کے منشا کو ترجیح دے۔

یہی حقیقت ایک حدیث میں بھی بیان ہوئی ہے۔

عن انس قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لا یومن احدکم حتی اکون احب الیه	حضرتِ انس سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی شخص سچا مسلمان نہیں ہو سکتا جب

من والدہ وولدہ والناس　　تک کہ میں اس کے باپ، اولاد اور تمام

اجمعین۔　(بخاری، کتاب الایمان)　مخلوق سے زیادہ اس کا محبوب نہ بن جاؤں"۔

جب ایک بندۂ مومن، محض تعمیلِ ارشاد کرتے ہوئے، دین کے احکام بجا لاتا ہے، تو یہ اطاعت ہے اور جب دین کی خاطر ایک جذبہ اور ایک جوش اس اطاعت کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے، تو اسے محبتِ الٰہی قرار دیا جاتا ہے۔ یہی جذبہ ہے جو دین کی نصرت، حمایت اور حمیت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور موقع کے لحاظ سے یہ محبت کبھی باہمی نصیحت یا دعوت و انذار میں وصلتی اور کبھی جہاد و قتال کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ دین سے ایسی وابستگی رکھنے والے ہی شہادت کے مرتبے کے مستحق بنتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ، اگر ضرورت پڑے تو دین کی خاطر جان کا نذرانہ بھی پیش کر دیتے ہیں، اور ایسے ہی لوگ اس بات کے مستحق ہوتے ہیں کہ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بشارت دیں کہ ان کے معاملے میں حساب کتاب بہت سہل کر دیا جائے گا اور وہ بغیر کسی گہری چھان بین کے جنت میں بھیج دیے جائیں گے۔

ہمارے دین میں، حج کی عبادت اس محبتِ الٰہی کے جذبے ہی کی ایک جامع تعبیر ہے۔ اس میں بندۂ مومن اللہ کے گھر کی طرف دیوانہ وار لپکتا ہے۔ اس کی زبان پر 'لبیک لبیک' کے الفاظ ہوتے ہیں، جو ترانۂ حمد اور ترانۂ وابستگی ہے۔ حج ہی وہ واحد عبادت ہے، جس میں طواف کی صورت میں شمع و پروانہ کی حکایت کی یاد تازہ کی جاتی ہے، اور ہر طواف کا آغاز اللہ کے ساتھ کیا ہوا عہد وفا کرنے کے اعلان کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا کے ایک جلیل القدر پیغمبر ہیں۔ انھوں نے اپنے رب کے ساتھ وابستگی اور اس کے دین کی نصرت و حمایت میں بے مثال رویہ اختیار کیا۔ قرآنِ مجید میں ان کا ذکر غیر معمولی اہتمام سے ہوتا ہے۔ حج کے اکثر شعائر انھی کی سنت، یعنی ان کی جد و جہد اور مساعی کے عملی مظاہر ہیں، جنھیں حج کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔

دین کے لیے جذبۂ محبت و حمیت کا سب سے بڑا مظہر جہاد ہے۔ منیٰ اور مزدلفہ میں قیام اور سفر جہاد ہی کے عمل کی تمثیل بن جاتے ہیں۔ سعی اور رمیِ جمار یعنی سنگ باری میں بھی اسی جہاد کا ایک پرتو ہوتا ہے۔ قربانی اپنی جان قربان کر دینے کا علامتی اظہار اور سر منڈانا غلامی میں دینے کی قدیم روایت ہے اور ان دونوں اعمال پر حج مکمل ہوتا ہے۔ گویا ایثار، انابت اور رجوع جو محبت ہی کے جذبے کی مختلف صورتیں ہیں، اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہیں۔

روحانی تزکیے کا یہ پروگرام ہے، جو انبیا نے ہمیں سکھایا ہے۔ اسی کو قرآنِ مجید بیان کرتا ہے۔ اور جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں، یہ ایک مکمل پروگرام ہے۔ اس سے باہر دیکھنا یا اس میں ترمیم و اضافہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس سے باہر دیکھنا یا نئے طریقے اختیار کرنا، درحقیقت، قرآن و سنت کی تصحیح کی جسارت ہے اور ایسی جسارت روزِ قیامت نیکی کے بجائے، ظاہر ہے، گناہ ہی شمار ہوگی۔

خورشید احمد ندیم

مذہب کے نام پر تشدد

شیخ سعدی نے گلستان میں ایک حکایت بیان کی ہے۔ وہ کچھ یوں ہے کہ ایک لومڑی کو کسی نے دیکھا کہ حیران و پریشان بھاگی چلی جا رہی ہے۔ دیکھنے والے نے اسے روکا اور معلوم کرنا چاہا کہ اس کے اضطراب کا سبب کیا ہے؟ جواباً لومڑی گویا ہوئی: مجھے معلوم ہوا ہے کہ کچھ لوگ اونٹ کے بچوں کو بیگار کے لیے پکڑ رہے ہیں۔ لہٰذا، میں اپنی جان کے خوف سے بھاگ رہی ہوں۔ اس پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے اس نے کہا، اگر اونٹ کے بچوں کو پکڑا جا رہا ہے تو اس میں تمھارے لیے تشویش کی کیا بات ہو سکتی ہے؟ تمھیں تو اونٹ سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ لومڑی نے جواب دیا: "اگر دشمنوں نے میرے بارے میں یہ خبر اڑا دی کہ یہ بھی اونٹ کا بچہ ہے، تو میں گرفتارِ بلا ہو جاؤں گی اور اس سے پہلے کہ صحیح صورتِ حال کا علم ہو، معلوم نہیں، میرا کیا حشر ہو۔"

اس حکایت میں ہمارے عہد کی تصویر جھلکتی ہے کہ لومڑی کو شتر سمجھ کر پکڑ لیا جاتا ہے اور کوئی یہ جاننے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ ایک لومڑی کو آخر ایک اونٹ سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ یہ ابھی کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ گوجرانوالہ کے نواح میں ایک حافظِ قرآن کو توہینِ قرآن کے جرم میں سنگسار کر دیا گیا اور کسی نے پتھر اٹھانے سے پہلے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ جس پر سنگ باری کی جا رہی ہے، کیا فی الواقع، وہ اس کا سزاوار ہے۔ جب جذباتی فضا چھٹی، تو معلوم ہوا کہ انھوں نے ایک ایسے شخص کو قتل کر ڈالا ہے، جو دراصل خود ایک بندۂ مومن تھا۔ یہ محض ایک واقعہ نہیں ہے۔ اگر معاشرے میں آئے دن پیش آنے والے واقعات پر نظر ہو تو ایسے کئی حافظ سجاد فاروق ملیں گے جو لوگوں کے جذبات کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اور اب تو لوگوں کا حال غالب کے قاتل جیسا بھی نہیں کہ جس نے 'قتلِ غالب کے بعد اس فعل سے توبہ کر لی۔ گویا ندامت کا احساس بھی باقی نہیں۔

اس طرح کے واقعات کے اصل محرکات کیا ہیں؟ اور اگر، واقعتہً، کسی آدمی پر فردِ جرم عائد ہوتی ہے، تو اس سے عہدہ برآ ہونے کی صحیح صورت کیا ہے؟ اس بات کا شعور ہی مستقبل میں

حالات کی بہتری کا ضامن ہو سکتا ہے۔

مذہب کا تعلق ان امور سے ہے جن سے آدمی کی وابستگی فطری ہوتی ہے۔ اس لیے مذہب کے ساتھ جذباتی لگاؤ کوئی قابلِ مذمت فعل نہیں ہے۔ یہ لگاؤ ہی، دراصل، وہ قوت ہے، جو عمل کی تحریک پیدا کرتا ہے۔ ہم مسلمان ہیں اور اس اعتبار سے اسلام کے ساتھ ہمارا تعلقِ خاطر ہے۔ یہی وہ قلبی جذبہ ہے جو کبھی صدام حسین کی حمایت میں لوگوں کو سربازار لے آتا ہے اور کبھی بوسنیا اور کشمیر میں ہونے والے مظالم پر انھیں مضطرب کر دیتا ہے۔ اسی جذبے ہی کے تحت جب ہم کسی کے بارے میں سنتے ہیں کہ وہ توہینِ رسالت کا مرتکب ہوا ہے، یا کسی نے قرآن جلا ڈالا ہے، تو ہم دین کی حمایت میں سب کچھ کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس بات کو سچ مانتے ہوئے ایک سوال لازماً پیدا ہوتا ہے کہ ہم جس دین کی حمیت میں اور جس عظیم الشان شخصیت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں سب کچھ کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں، اس دین اور اس شخصیت کی تعلیمات میں کیا کوئی ایسی ہدایت موجود ہے جو ہمیں یہ بتائے کہ جذبات کی حدود کیا ہیں اور اگر کبھی ایسی صورتِ حال درپیش ہو کہ ہمارے جذبات مشتعل ہونے لگیں، تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ دین کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دیگر شعبہ ہائے حیات کی طرح وہ اس معاملے میں بھی ہمیں راہنمائی سے محروم نہیں کرتا۔

اسلام، انسانی زندگی کے لیے جو قواعد سازی کرتا ہے، اس میں فرد اور اجتماعیت (جسے ہم ریاست کہتے ہیں)، دونوں کی حدود کا تعین کرتا ہے۔ وہ کیا معاملات ہیں جو فرد کی انفرادی زندگی سے متعلق ہیں، اور ایک ریاست کے اختیارات کیا ہیں، اور وہ کون سے امور ہیں جن کے بارے میں صرف ریاست ہی اختیار رکھتی ہے؟ اسلام میں ان مسائل و معاملات سے متعلق جو راہنمائی ملتی ہے، اس سے یہ بات، صریحاً، واضح ہے کہ حدود و تعزیرات کا معاملہ ریاست ہی سے متعلق ہے۔ کسی فرد کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ایک جرم پر کسی کی گرفت کرے۔ اگر ایک جرم کسی کی آنکھوں کے سامنے بھی ہو، تو وہ انفرادی حیثیت میں، اس پر کوئی سزا نافذ نہیں کر سکتا۔ اگر کہیں کوئی جرم صادر ہوا ہو تو پہلے عدالت میں مقدمہ پیش ہوگا، ملزم کو صفائی کا موقع دیا جائے گا، گواہ پیش ہوں گے اور صرف جرم ثابت ہونے پر وہ سزا نافذ ہوگی، جو اس جرم کے باب میں قانون سے ثابت ہے۔ یہ ایسا قانون ہے جس سے کسی فرد یا جرم کو کوئی استثنا حاصل نہیں۔ چنانچہ یہ بات طے ہے کہ اگر کوئی فرد، ریاست کے قوانین کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہے، تو اس کا یہ فعل، بذاتِ خود قابلِ تعزیر جرم ہے، قطعِ نظر اس کے کہ اس نے یہ اقدام کسی معصیت کے خلاف کیا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے فقہِ حنفی کی مشہور کتاب 'ہدایہ' کے حوالے سے اپنی تصنیف

"امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی" میں اس طرح بیان کیا ہے :

"یہ ہدایہ کے متن کا مسئلہ ہے کہ 'الامر بالمعروف بالید الی الامراء و باللسان الی غیرھم'، جس کا مطلب یہ ہے کہ جو اقتدار رکھتے ہیں، انھی سے اس حکم کا تعلق ہے کہ بزور لوگوں کو حق پر قائم کرنے اور باطل سے ہٹانے کی کوشش کریں، لیکن ایک عام آدمی جو حکومت کے اقتدار سے محروم ہے، اس پر صرف زبان سے معروف کا امر اور منکر کی نہی واجب ہے۔ یہاں تک کہ اس بنیاد پر امام ابوحنیفہ کا فتویٰ ہے کہ گانے بجانے کے آلات جو ممنوعات شرعیہ میں سے ہیں، اگر کسی مسلمان کے پاس ہوں اور دوسرا مسلمان ان کو غیر شرعی قرار دیتے ہوئے توڑ دے، تو اس کا تاوان ادا کرنا پڑے گا، کیونکہ اس نے ان حدود میں تصرف کیا ہے، جو اس کے فرائض کے دائرے سے خارج تھے۔ قریب قریب، مختلف الفاظ میں، مالکی اور شافعی علما کی کتابوں میں بھی یہی لکھا ہے۔ یعنی، مارنے پیٹنے، یا قتل و قتال پر آمادہ ہو جانا، یہ عام لوگوں کا کام نہیں ہے....."

پچھلے کچھ عرصے سے ہمارے معاشرے میں یہ تشویش ناک رجحان پروان چڑھا ہے کہ دین کے نام پر مختلف گروہ منظم کیے جاتے ہیں۔ ان میں نوجوانوں کے جذبات کو کسی دوسرے گروہ کے خلاف برانگیختہ کیا جاتا ہے، اور ان کی دینی حمیت کو چیلنج کرتے ہوئے، انھیں آمادہ کیا جاتا ہے کہ کسی ایسے انسان کی جان تک لے لیں، جس کے بارے میں انھیں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ توہین رسالت، توہین صحابہ یا کسی ایسے جرم میں ملوث ہے۔ چنانچہ حال ہی میں، سرگودھا میں جب دو علما کے قتل میں ملوث ایک انیس سالہ نوجوان کو گرفتار کیا گیا، تو اس نے بتایا کہ وہ ایک خفیہ مذہبی تنظیم کا رکن ہے، اور لاہور میں ایک عیسائی منظور مسیح، جس پر توہین رسالت کا الزام تھا، کے قتل میں بھی اس کا ہاتھ ہے۔

یہ واقعات معاشرے کو جس کرب میں مبتلا کر رہے ہیں، اس کا اندازہ لگانا ہمارے لیے مشکل نہیں۔ لوگوں کے گھر اور عبادت گاہیں تک محفوظ نہیں۔ آپ ایک مسجد میں نماز کے لیے کھڑے ہیں اور معلوم نہیں کہ چند منٹ بعد وہاں بم کا دھماکا ہونے والا ہے۔ ایک عدم تحفظ کا احساس ہے، جو آہستہ آہستہ سارے معاشرے کو اپنی گرفت میں لے رہا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان واقعات میں وہ لوگ بھی ملوث ہو سکتے ہیں، جو ملک دشمن قوتوں کے وفادار ہیں، لیکن اس سے انکار محال ہے کہ اس صورت حال کے ذمہ دار ہمارے ہی لوگ ہیں۔ خطیب شہر کی شعلہ نوائی کیا ہم سے پوشیدہ ہے؟ کیا ہم مسجد کے میناروں سے اٹھنے والی وہ آوازیں نہیں سنتے، جو الفاظ نہیں آگ برساتی ہیں؟ گوجرانوالہ میں حافظ قرآن کے قتل

کی ترغیب دینے والے کسی بیرونی طاقت کے نمائندے نہیں، ہماری نمازوں کے امام تھے۔

یہ ممکن ہے کہ ہمارے شعلہ نوا خطیب اور انقلابی علما جس الزام کی تشہیر کر رہے ہیں، وہ سچ ہو، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ محض الزام ہو یا کسی غلط فہمی پر مبنی ہو۔ اسی طرح اس بات کا امکان بھی رد نہیں کیا جا سکتا کہ جس شخص پر فردِ جرم عائد کی جا رہی ہے، وہ اپنی رائے سے رجوع کر چکا ہو۔ اس صورتِ حال کا فیصلہ اس وقت ممکن نہیں، جب تک سارا معاملہ کسی عدالتی کارروائی سے نہ گزرے، اور جہاں استغاثہ اور جوابِ استغاثہ دونوں کو سن نہ لیا جائے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت کا واقعہ ہے کہ بصرہ کے ایک نیک شخص عامر بن عبد القیس کے بارے میں یہ مشہور ہو گیا کہ وہ گوشت نہیں کھاتے، جمعہ کی نماز میں شریک نہیں ہوتے اور نکاح کے قائل نہیں۔ بصرہ میں اگرچہ ان کے زہد و تقویٰ کا شہرہ تھا، لیکن ایک گروہ کی طرف سے اس بات کی کچھ ایسی تشہیر ہوئی کہ امن و امان کا مسئلہ پیدا ہونے لگا۔ ناقدین نے جب یہ شکایات سیدنا عثمان تک پہنچائیں، تو انھوں نے عامر سے کہا کہ وہ شام منتقل ہو جائیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس وقت شام کے عامل تھے۔ عامر جب شام پہنچنے کے بعد حضرت معاویہ سے ملنے کے لیے گئے تو آپ کھانا تناول فرما رہے تھے اور دسترخوان پر ثرید موجود تھا، جو گوشت سے بنا ہوا ایک کھانا ہے۔ حضرت معاویہ کے کہنے پر عامر بھی شریکِ طعام ہو گئے۔ اس پر حضرت معاویہ نے استفسار کیا کہ آپ کے بارے میں اطلاع یہ تھی کہ آپ گوشت کھانا جائز نہیں سمجھتے۔ عامر نے جواباً بتایا کہ یہ الزام محض غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ ایک دفعہ میں نے ایک قصاب کو دیکھا، جو ایک بکری کو ہانکے لیے جا رہا ہے اور ساتھ ہی گاہکوں کو بھی متوجہ کر رہا ہے۔ اسی دوران میں اس نے بکری ذبح کر دی اور تکبیر بھی نہیں کہی۔ میں نے اس واقعہ کے بعد بازار سے گوشت خریدنا چھوڑ دیا۔ اب، اگر گوشت کھانے کو دل چاہتا ہے، تو گھر ہی میں کوئی جانور ذبح کر لیتا ہوں۔ باقی دو الزامات کے بارے میں جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا تو عامر نے انھیں بھی محض تہمت قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ جمعہ کی نماز مسجد میں پڑھتے ہیں۔ تاہم، وہ خاموشی سے پچھلی صف میں، جہاں جگہ ملتی ہے بیٹھ جاتے ہیں اور جماعت کے بعد گھر چلے جاتے ہیں۔ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق سنن و نوافل ادا کرتے ہیں۔ جہاں تک نکاح کا معاملہ ہے تو عامر نے بتایا کہ وہ تارکِ سنت نہیں ہیں۔ ان دنوں ایک جگہ ان کے رشتے کی بات چل رہی تھی کہ انھیں بصرہ ہی چھوڑنا پڑا۔ اس واقعے سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات تحقیق کی کمی کے باعث بعض ایسی باتیں مشہور ہو جاتی ہیں، جن میں کوئی صداقت نہیں ہوتی۔ تاہم معاشرے میں ایسے لوگوں کی موجودگی کا بھی انکار نہیں ہو سکتا، جو فی الواقع، ان جرائم میں ملوث

ہوتے ہیں، جن کی فرد ان پر عائد ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک نہایت اہم بات یہ ہے کہ اس امت میں وہ اختلافات جو اب صدیوں پر محیط ہیں، ان کے لیے تو یہ طرزِ عمل، بطورِ خاص، نہایت ہی برا ہے۔ اس بارے میں زیادہ سے زیادہ یہی کوشش کی جا سکتی ہے کہ لوگ اختلافات کے آداب سے واقف ہوں اور دین کا علم زیادہ سے زیادہ اس کے اصل ماخذوں کے ذریعے سے عام کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ امت کے علما ہی یہ خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ اربابِ ریاست و مذہب دونوں کو اپنی ذمہ داریاں ادا کرنا ہوں گی اور اپنی حدود کا بھی لحاظ رکھنا ہوگا۔ یہ ریاست کا فرض ہے کہ وہ ایسے واقعات کا سدِ باب کرے جو ایسی جذباتی فضا کو جنم دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے معاشرے میں ایسی کتب چھپ رہی ہیں، جن میں رسول اللہ اور صحابۂ کرام کے بارے میں ایسے الفاظ درج ہیں جو یقیناً قابلِ گرفت ہیں اور جنھیں پڑھ کر جذبات مشتعل ہو سکتے ہیں۔ یہ حکومتِ وقت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کتب کے ناشرین اور مصنفین کے خلاف قانون کے مطابق، کارروائی کرے، تاکہ ایسی لغو چیزوں کی اشاعت ختم ہو سکے۔ اسی طرح، ایسے افراد کو 'فساد فی الارض' کے جرم میں شدید سزائیں دی جائیں، جو، بلاتحقیق، لوگوں کے جذبات کو مشتعل کرتے اور امنِ عامہ کے مسائل پیدا کرتے ہیں، بلکہ اس سے بڑھ کر 'فساد فی الارض' کے جرم کے لیے قرآنِ مجید کی روشنی میں باقاعدہ قانون سازی ہونی چاہیے، جو ایسے مجرموں کے لیے عبرت ناک سزائیں تجویز کرتا ہے۔

جو اہلِ مذہب ہیں اور معاشرے میں جن کا تعارف دین کے حوالے سے ہے، انھیں غور کرنا چاہیے کہ مسلمانوں کے اجتماعی نظم میں ان کے کام کی حدود کیا ہیں۔ وہ سماج میں، اصلاً، داعی کے مقام پر کھڑے ہیں۔ یعنی، ان کا کام لوگوں کو دین کی طرف بلانا ہے۔ عامۃ الناس ہوں یا اہلِ اقتدار، علما کا کام یہ ہے وہ انھیں ان ذمہ داریوں سے آگاہ کریں، جو دین نے ان پر نافذ کی ہیں۔ اس سے بڑھ کر قانون کو ہاتھ میں لینا یا دوسرے الفاظ میں خود ریاست کے منصب پر فائز ہونا ان کے لیے جائز نہیں ہے۔ دعوت کے اسلوب میں بھی یہ واضح ہے کہ بات احسن طریقے ہی سے کی جائے۔

قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ۔ (النحل ۱۶: ۱۲۵)

"اپنے پروردگار کے راستے کی طرف حکمت کے ساتھ دعوت دو اور اچھی نصیحت کے ساتھ، اور ان سے بحث کرو اس طریقے سے جو پسندیدہ ہو۔"

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ بھی اسی طرزِ عمل کی گواہ ہے۔ اس سے بڑھ کر لاٹھی لے کر کسی کے پیچھے پڑ جانے کی دین میں کوئی گنجایش نہیں ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآنِ مجید میں یہی کہا گیا ہے کہ آپ ان پر داروغہ نہیں بنائے گئے۔ آپ کی ذمہ داری تو بس بات پہنچا دینا ہے:

قُلْ يَآيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ	"کہہ دو: اے لوگو، تمھارے رب کی طرف
الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى	سے تمھارے پاس حق آگیا ہے، تو جو ہدایت
فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ	قبول کرے گا وہ اپنے لیے ہی کرے گا اور
ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ	جو بھٹکے گا اس کا وبال اسی پر ہوگا اور میں
اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۔ (یونس ۱۰: ۱۰۸)	تمھارے ایمان کا ذمہ دار نہیں ہوں۔"

دعوت سلیقے سے دی جائے اور علمی تنقید کو رواج دیا جائے۔ یہی دعوتِ دین کی اساس ہے۔ وہ دعوت جو معاشرے میں فساد برپا کر دے اور لوگوں کو جینے کے حق سے محروم کر دے، وہ نہ صرف یہ کہ دین میں پسندیدہ نہیں، بلکہ قابلِ مذمت ہے۔

"..... رؤیا، چونکہ علمِ نبوت کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے اور رؤیا میں حقائق، مجاز کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں، جن کو سمجھنا ایک ذہنی مناسبت کا مقتضی ہے، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ حضراتِ انبیا علیہم السلام کو تعبیرِ رؤیا کا ایک خاص ذوق اور ایک خاص علم عطا فرماتا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے جب محسوس فرما لیا کہ اس رؤیا میں حضرت یوسف کے لیے نبوت کی بشارت ہے، تو ساتھ ہی ان پر یہ بات واضح ہو گئی کہ اب حضرت یوسف علیہ السلام کو تعبیرِ رؤیا کا علم بھی عطا ہو گا، تا کہ رؤیا کی شکل میں جو حقائق ان پر وارد ہوں، ان کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر وہ منشائے خداوندی کی تعمیل کر سکیں۔"

نقطۂ نظر

وصی مظہر ندوی

سورۂ یوسف کی دو آیات

قرآنِ مجید' اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ایسی کتاب ہے، جس کی تفسیر و تعبیر، تشریح و توضیح' اور استنباط و استخراج کے حوالے سے اصحابِ علم و دانش نے اتنی خدمت کی ہے جس کی مثال دنیا کی کوئی آسمانی یا انسانی کتاب پیش کرنے سے قاصر ہے۔ تاہم' اس کتاب کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ اس کے عجائبات کبھی ختم نہ ہوں گے' بلکہ ہر دور کے عصری تقاضوں کے مطابق اس کی تبیین کا معاملہ' خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

ثُمَّ اِنَّ عَلَيۡنَا بَيَانَهٗ۔ "پھر لاریب' اس کی تبیین بھی ہماری ذمہ داری ہے۔" (القیامہ ۷۵: ۱۹)

قرآنِ مجید کے اسی اعجاز کا سہارا لیتے ہوئے' سورۂ یوسف کی دو آیات کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں' جو حضرت الاستاذ مولانا امین احسن اصلاحی کے بیان کردہ اس پہلو سے' جزوی طور پر مختلف ہے۔ جو انھوں نے اپنی شاہ کار تفسیر "تدبرِ قرآن" میں اختیار فرمایا ہے' جبکہ میری معروضات کی غرض و غایت محض طالب علمانہ تشنگی کی تسکین ہے۔

'تاویل الاحادیث'

سورۂ یوسف میں 'تاویل' بطورِ مضاف استعمال ہوا ہے۔ بعض آیات میں مضاف الیہ 'الاحادیث' ہے۔ بعض میں 'الرؤیا' یا اس کی ضمیر ہے' اور بعض آیات میں 'الاحلام' ہے۔

جہاں تک کلمۂ 'تاویل' کا تعلق ہے' تو اس پر گفتگو' اس وقت' مقصود نہیں' مختصراً اتنا کہنا کافی ہے کہ یہ کلمہ قرآنِ حکیم میں 'حقیقت' یا 'انجام' کے معنی میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ اس وقت گفتگو کا موضوع الاحادیث، الرؤیا اور الاحلام ہیں۔ ہم یہ دیکھیں گے یہ تینوں کلمات

ہم معنی ہیں، یا ان کے مفہوم ایک دوسرے سے کلی یا جزوی طور پر مختلف ہیں؟

'رویا' اور 'حلم'، تو، تقریباً، ہم معنی ہیں۔ ان دونوں کلمات کا اطلاق ان باتوں پر ہوتا ہے، جو انسان سونے کی حالت میں دیکھتا ہے، جبکہ 'الاحادیث' (واحد الاحدوثۃ) کے معنی ہیں، ہر وہ بات جو موضوع گفتگو بن جائے۔ اس معنی کے لحاظ سے کسی اہم خواب کو بھی 'احدوثۃ' کہا جا سکتا ہے، اگر لوگوں میں اس کا چرچا ہو جائے۔ لغوی لحاظ سے اتنے واضح فرق کے باوجود، اکثر مترجمین اور مفسرین نے 'تاویل الاحادیث' اور 'تاویل الرویا' کو ہم معنی، یا قریب المعنی سمجھ لیا ہے۔ غالباً، اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ سورۂ یوسف میں چار اہم خوابوں اور حضرت یوسف علیہ السلام کی جانب سے ان کی دو، رس تعبیر کا تذکرہ موجود ہے، اور ان خوابوں کی تعبیر کے لیے 'تاویل' ہی کا لفظ اختیار کیا گیا ہے۔ اس لیے 'تاویل الاحادیث' کو بھی 'تاویل الرویا' کے ہم معنی سمجھ لیا گیا، حالانکہ لغوی معنی اور قرآنی سیاق، دونوں سے صاف ظاہر ہے کہ 'تاویل الاحادیث' خوابوں کی تعبیر کے علم سے بالکل علیحدہ علم ہے۔ خود حضرت الاستاذ مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ نے سورۂ یوسف کی آیت ۶، ۲۱ اور ۱۰۱ میں ہر جگہ احادیث کا ترجمہ "باتیں" کیا ہے، لیکن تعجب ہے کہ تشریح و تفسیر میں، ہر جگہ اس کو خوابوں کی تعبیر تک محدود کر دیا ہے۔ صرف آیت ۲۱ کی تشریح میں اس لفظ کی وسعت کو کسی حد تک باقی رکھا ہے۔

راقم کی ناچیز فہم کے مطابق 'تاویل الاحادیث' سے ایک بالکل علیحدہ علم مراد ہے۔ جس کا تعلق حضرت یوسف علیہ السلام کی آئندہ عملی زندگی سے ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

وَقَالَ الَّذِی اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖۤ اَكْرِمِیْ مَثْوٰىهُ عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ ؗ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ؕ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۔ (یوسف ۱۲: ۲۱)	"اور مصر میں جس نے اس کو خریدا تھا، اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ اس کو اعزاز کے ساتھ رکھیو، امید ہے کہ یہ (ہونہار لڑکا) ہمارے لیے مفید ثابت ہوگا، یا ہم اس کو بیٹا ہی بنا لیں گے، اور اس طرح ہم نے یوسف کے لیے (اس سرزمین میں) قدم جمانے کی صورت پیدا کر دی (اس لیے کہ ہم اس پر انعام کریں)، اور تاکہ ہم اس کو 'تاویل الاحادیث' کا علم سکھائیں، اور اللہ اپنے کام پر غالب ہے، لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔"

صاف ظاہر ہے کہ عزیز مصر کے گھر میں خوابوں کی تعبیر سکھانے کی کوئی درس گاہ تو کھلی ہوئی نہ تھی کہ اس گھر میں داخل ہونے سے ان کو یہ علم حاصل ہو جاتا، بلکہ اہلِ مصر اس علم سے تو ایسے کورے تھے کہ بادشاہ کا پورا دربار بادشاہ کے خواب کی تعبیر بتانے میں نہ صرف ناکام رہا، بلکہ انھوں نے اپنی جہالت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا:

وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ۔ (یوسف ۱۲: ۴۴) "اور ہم خوابوں کی تعبیر دینا نہیں جانتے۔"

پھر وہ کیا علم تھا جس کے لیے طویل مدت تک حضرت یوسف علیہ السلام کو عزیز مصر کے گھر میں رکھنا ضروری سمجھا گیا؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ چونکہ سیدنا یوسف علیہ السلام بدوی اور قبائلی زندگی سے مانوس تھے، ان کو مصر جیسے متمدن ملک کے معاملات و مسائل سے کوئی واقفیت نہ تھی، جبکہ حکمتِ الٰہی کے تحت ان کو مصر کا حکمران بنانا پیش نظر تھا، اس لیے ان کو مصری سیاست کے اہم ستون عزیز مصر کے گھر میں طویل مدت تک رکھا گیا، جہاں ملک کے سیاسی حالات، محلاتی سازشیں اور جوڑ توڑ کے علاوہ درباریوں کی بیگمات کے انداز و اطوار، ان کے تعلقات و روابط اور سازشوں کا تانا بانا بننے میں ان کا مخصوص کردار، اور حکمران طبقے کی اخلاقی حالت کا قریبی مشاہدہ کرنے کا موقع انھیں حاصل ہوا، اور یوں وہ مصر پر حکومت کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہو گئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی تعلیم و تربیت کے اس اہتمام کو اللہ تعالیٰ نے اسی لیے اپنی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کا ایک اظہار قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے: "اور اللہ اپنے فیصلے کے نفاذ پر پوری طرح غالب ہے۔"

اسی طرح آیت ۱۰۱ کو ملاحظہ کیجیے:

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ۔ "اے میرے رب تو نے مجھے بادشاہت عطا کی اور مجھے 'تاویل الاحادیث' کا علم سکھایا۔"

دیکھیے، اس آیت میں بادشاہت اور 'تاویل الاحادیث' کا ایک ساتھ ذکر کر کے ان دونوں کے تعلق کو ظاہر کیا گیا ہے، جبکہ بادشاہت کے اپنے خواب کی عملی تعبیر ہونے کا تذکرہ اس سے قبل کی آیت میں ہو چکا ہے۔

سورۂ یوسف کی آیت نمبر ۶ کی تشریح و تفسیر میں حضرت الاستاذ مدظلہ نے تحریر فرمایا ہے:

"'یعلمك من تاویل الاحادیث' میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک تو اس بات کی طرف کہ اس رویا کی حقیقت اللہ تعالیٰ خود تم پر واضح کر دے گا۔ چنانچہ جب اس کی حقیقت حضرت یوسف نے اپنی آنکھ سے دیکھ لی، تو فرمایا: 'ھذا تاویل رویای من قبل' (۱۰۰) "اے میرے باپ، یہ میرے خواب کی تعبیر ہے، جو میں نے پہلے دیکھا تھا، میرے رب نے اس کو حقیقت کر دکھایا۔۔۔۔" (تدبر قرآن، ج ۴ ص ۱۹۱)

بلاشبہ، حضرت الاستاذ نے ایک اہم نکتہ بیان فرمایا ہے، لیکن 'وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاوِيلِ الْاَحَادِيثِ' کے الفاظ سے اس نکتے کو سمجھنے میں، دیگر متعدد قرائن کے علاوہ دو باتیں مانع ہیں:

(۱) اگر اس نکتے کی طرف اشارہ مقصود ہوتا، تو يُعَلِّمُكَ (تجھ کو سکھائے گا) کے بجائے يُرِيكَ (تجھ کو دکھائے گا) یا يُعَلِّمُكَ (تجھ کو خبر دے گا) کے الفاظ استعمال فرمائے جاتے۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ اس نکتے کی طرف اشارہ کرنے کی صورت میں 'الاحادیث'، یعنی جمع کا صیغہ لانے کے بجائے 'الحدیث' یا 'الاحدوثة'، واحد کا صیغہ لایا جاتا۔ تب یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بتا دیا تھا، کہ تم نے آج جو خواب دیکھا ہے، اس کو تم خود حقیقت کی صورت میں دیکھ لو گے۔

آیتِ کریمہ کے موجودہ الفاظ اور ان کی ترتیب سے تو یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے خواب میں، چونکہ مخفی طور پر نبوت کی بشارت موجود تھی، اور ظاہری طور پر، یہ خواب آپ کے اقتدار میں آنے کی بشارت بھی دے رہا تھا، اس لیے حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان دونوں نتائج کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيلِ الْاَحَادِيثِ۔ (یوسف ۱۲: ۶)	"اور اسی طرح تیرا رب تجھ کو برگزیدہ کرے گا (نبوت عطا کرے گا)، اور تجھ کو (لوگوں کی) باتوں کی حقیقت (سیاست و حکمرانی) کا علم سکھائے گا۔"

'قدت قمیصه'

سورۂ یوسف کی دوسری آیت جس کے بارے میں طالبِ علمانہ گزارش کی اجازت چاہتا ہوں، وہ ہے:

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهُ مِنْ دُبُرٍ وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَى الْبَابِ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ (یوسف ۱۲: ۲۵)

"اور دونوں، ایک دوسرے سے پہلے، دروازے تک پہنچنے کے لیے لپکے اور اس (عورت) نے اس کا پیراہن پیچھے سے چاک کر دیا اور دونوں نے اس کے شوہر کو دروازے کے قریب پایا، اس (عورت) نے کہا: کیا سزا ہو اس کی جو تیرے گھر والوں کے ساتھ برا ارادہ رکھے، بجز اس کے کہ اس کو قید کر دیا جائے یا دردناک سزا دی جائے۔"

جس طرح اردو زبان میں کاٹنا، کترنا، پھاڑنا، چاک کرنا وغیرہ جیسے الفاظ مختلف معانی میں مستعمل ہیں، اسی طرح عربی میں قطع، قرض، خرق، قدّ اور قطّ وغیرہ مستعمل ہیں اور قرآنِ مجید میں یہ الفاظ یا ان کا کوئی نہ کوئی مشتق موجود ہے لیکن مذکورہ بالا آیت اور اس کے بعد کی آیات ۲۶، ۲۷ اور ۲۸ میں لفظ 'قدّ' بہ تکرار و اہتمام آیا ہے جبکہ ان چار آیات کے سوا قرآنِ مجید میں یہ مادہ کہیں اور استعمال نہیں ہوا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ 'ق د د' کا مادہ اگرچہ محض کاٹنے کے لیے بھی بول دیا جاتا ہے لیکن اپنے مخصوص معنی کے لحاظ سے اس کا اطلاق لمبائی میں کاٹنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اسی لیے خشک گوشت کے لمبے لمبے ٹکڑوں کو 'قدید' کہتے ہیں اور لکھنے کے لیے قلم میں جو چیرا لگایا جاتا ہے اسے بھی 'قد' کہتے ہیں، جبکہ قلم کی چوڑائی کو ہموار کرنے کے لیے کاٹنے کو 'قطّ' کہتے ہیں۔ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے:

ان علیا اذا اعتلٰی قد واذا اعترض قط۔

"حضرت علی رضی اللہ عنہ (جنگ میں) جب کسی کے اوپر چھا جاتے، تو لمبائی میں اس کے دو ٹکڑے کر دیتے، اور جب کسی کی چوڑائی میں آتے، تو چوڑائی میں اس کے دو ٹکڑے کر دیتے تھے۔"

سورۂ یوسف کی مذکورہ بالا چاروں آیات میں 'قدّ' کا لفظ اسی مخصوص مفہوم کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اور اس سے، در اصل، حضرت یوسف علیہ السلام کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے قرینہ کی ایک شہادت فراہم کی گئی ہے۔

صورتِ واقعہ کی جو تصویر ان آیات سے سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام

اس رسواکن صورتِ حال سے بچ کر نکلنے کے لیے دروازے کی طرف بھاگے۔ ادھر وہ عورت بھی دروازے کی طرف بھاگی کہ حضرت یوسف دروازہ کھول کر (جس کو اس نے بڑی مضبوطی سے بند کر دیا تھا کہ لفظ 'غَلَّقَتِ' سے ظاہر ہے) باہر نہ نکل جائیں۔ چنانچہ، دونوں ساتھ ساتھ دروازے تک پہنچے، اور جب عورت کو یقین ہو گیا کہ یوسف دروازہ کھول چکے ہیں اور اب وہ باہر چلے جائیں گے، تو اس نے پیچھے سے آپ کا پیراہن اوپر سے نیچے تک پھاڑ دیا۔ اس دور میں، چونکہ لوگ، بالعموم، ایک لمبا سا کُرتہ شانوں سے ٹخنوں تک پہنتے تھے، جس کو سامنے کی طرف سے تکموں سے باندھ لیا جاتا تھا، اس لیے کُرتہ پیچھے سے چاک ہونے کے بعد زمین پر آ رہا، اور حضرت یوسف علیہ السلام قطعاً بے لباس ہو گئے۔ عورت کو یقین تھا کہ وہ اس حالت میں باہر نہ جائیں گے، کہ اچانک عزیزِ مصر دروازہ کھول کر سامنے آ گیا اور ابھی وہ سیدنا یوسف کی اس حالت کو دیکھ کر حیران ہی ہو رہا تھا کہ عورت نے فوراً پینترا بدل کر سارا الزام یوسف علیہ السلام پر ڈال دیا۔ حضرت یوسف نے الزام کا انکار تو کیا، لیکن ان کے پاس اپنی بے گناہی کا کوئی ثبوت موجود نہ تھا۔ بلکہ جسم کی عریانی، بظاہر، الزام کو ثابت کر رہی تھی کہ اتنے میں عورت کے خاندان کے کسی شخص نے جو موقع پر موجود تھا، یا آ گیا تھا، غالباً، عورت کے الزام کو مزید پکا ثابت کرنے کے لیے قرینے کی شہادت اس طرح دی کہ یوسف کا کُرتہ اٹھا کر دیکھ لیا جائے اگر وہ آگے سے چاک ہو تو یوسف کو جارح سمجھا جائے گا۔ اور اگر وہ پیچھے سے چاک ہو تو پھر یہ اس عورت کی زیادتی کا ثبوت ہو گا (کیونکہ کوئی شخص پیچھے کی طرف سے اپنا پہنا ہوا کُرتہ خود اوپر سے نیچے تک بآسانی نہیں پھاڑ سکتا، اور نہ جارحیت کے مرتکب کو کُرتہ پیچھے سے پھاڑنے کی کوئی ضرورت تھی۔)

چنانچہ، قرینے کی اس شہادت کے مطابق جب کُرتے کو اٹھا کر دیکھا گیا، تو معلوم ہوا کہ کُرتہ پُشت کی طرف ہی سے چاک ہے۔

(کُرتہ اگر جسم ہی پر ہوتا تو اس کا آگے یا پیچھے سے پھٹا ہوا ہونا، پہلی نظر ہی میں معلوم ہو جاتا۔ اس کے لیے خصوصی اہتمام کی ضرورت نہ ہوتی، جیسا اہتمام آیت کے الفاظ 'فَلَمَّا رَاٰ قَمِیْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ' "تو پھر جب اس نے دیکھا کہ اُس کا کُرتہ پیچھے سے چاک ہے" (یوسف ۱۲: ۲۸)' سے ظاہر ہے۔

اسی طرح، اگر کُرتا پیچھے سے صرف نوچا ہوا ہوتا اور مکمل چاک نہ ہوتا، تو اسے بھی سیدنا یوسف کی بے گناہی، مکمل طور پر، ثابت نہ ہوتی، بلکہ یہ امکان باقی رہتا کہ یوسف علیہ السلام کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کے لیے اور ان کو بھاگ جانے سے روکنے کے لیے اس نے پیچھے سے کُرتا پکڑا ہوا اور اس طرح وہ کھنچ گیا ہو۔ قرآنِ حکیم نے 'قدّ' کا لفظ استعمال کر کے کُرتے کے اوپر سے نیچے تک چاک ہونے کو

واضح کر دیا۔

جہاں تک سیدنا یوسف علیہ السلام کے مکمل بے لباس ہو جانے کا معاملہ ہے، تو قرآنِ حکیم نے واضح الفاظ میں اس کا ذکر اپنے اس مخصوص اسلوب کی وجہ سے نہیں کیا کہ وہ قابلِ ستر معاملات کو، بالعموم کنایوں میں ظاہر کرتا ہے اور صراحت سے اجتناب کرتا ہے تاکہ تہذیب اور شایستگی کے تقاضے مجروح نہ ہوں۔

ھذا ما عندی والعلم عند اللہ

طالب محسن

ہمارا نقطۂ نظر

مولانا وصی مظہر صاحب ندوی' ان اربابِ علم میں سے ایک ہیں' جو دین پر غور و فکر اور تحقیق و اجتہاد کی ہر کاوش کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور خود بھی اس سلسلے میں گاہے گاہے قلم اٹھاتے رہتے ہیں۔ زیرِ نظر مضمون میں' سورۂ یوسف کی تفسیر کے سلسلے میں مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کے دو تفسیری مباحث سے انھوں نے اختلاف کیا ہے' اور بڑی خوبی کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر مدلل طریقے سے واضح کیا ہے۔

قرآنِ مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کی جس صلاحیت کا ذکر 'تاویل الاحادیث' کے الفاظ میں ہوا ہے' عام طور پر' مفسرین اس سے خوابوں کی تعبیر کی صلاحیت ہی مراد لیتے ہیں۔ 'تدبرِ قرآن' میں معلوم ہوتا ہے' مولانا اصلاحی نے بھی اسی مفہوم کو ترجیح دی ہے۔ مولانا ندوی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ الفاظ جس سیاق و سباق میں آئے ہیں' اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان سے مراد 'سیاسی معاملات کا فہم' ہے۔

یہ بات تو صحیح ہے کہ 'تاویل الاحادیث' کے الفاظ عام ہیں' اور ان کے معنی 'خوابوں کی تعبیر' کر دینا محلِ نظر ہے' لیکن ان سے محض 'سیاسی معاملات کا فہم' مراد لینے کے حق میں' مولانا کے دلائل بھی ایسے قوی نہیں ہیں کہ حتمی طور پر یہی معنی طے کر دیے جائیں۔ درحقیقت' یہ الفاظ جس مفہوم پر دلالت کرتے ہیں' وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو باتوں کی گہرائی میں اترنے کا غیر معمولی ملکہ عطا کیا تھا۔

'تاویل' کا لفظ عربی زبان میں بات کی اصل حقیقت یا اس کے اصل مصداق کے معنی میں آتا ہے۔ خود قرآنِ مجید میں اس کے کئی شواہد موجود ہیں' مثلاً سورۂ کہف ہی میں دیکھ لیجیے:

سَأُنَبِّئُكَ بِتَأْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا (الکہف ۱۸: ۷۸)

آپ میں تمھیں اس چیز کی حقیقت بتاؤں گا جس پر تم صبر نہ کر سکے۔

البتہ، یہ اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے کہ سورۂ یوسف میں آپ کی اس صلاحیت کے اظہار کا ذکر خوابوں کی تعبیر ہی کے حوالے سے ہوا ہے۔ پوری سورہ پڑھ جائیے، آپ کی اس صلاحیت کے ساتھ، نہ کہیں سیاسی بصیرت کا معاملہ بیان ہوا ہے، اور نہ کسی دوسرے عنوان سے اس صلاحیت کے ظہور کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہی وہ پہلو ہے جسے تمام مفسرین پیش نظر رکھتے اور ان الفاظ سے 'خوابوں کی تعبیر' کے معنی مراد لیتے ہیں۔

مولانا ندوی نے اپنا نقطۂ نظر مؤکد کرنے کے لیے سورہ کی آیت ۱۰۱ کا حوالہ بھی دیا ہے۔ اس آیت میں قرآنِ مجید نے حضرت یوسف علیہ السلام کے اظہارِ تشکر کا تذکرہ کیا ہے جس میں آپ نے اقتدار کے حصول اور اپنی تاویلِ احادیث کی صلاحیت کا ذکر کیا ہے، حالانکہ اس سے پہلے آیت ۲۱ اور آیت ۶ سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے یہ خصوصی اہتمام صرف اس لیے کیا تھا کہ آپ اپنے فرائضِ نبوت کما حقہ سر انجام دے سکیں۔ 'تدبرِ قرآن' میں مولانا امین احسن اصلاحی آیت ۶ کے تحت لکھتے ہیں:

"..... رؤیا، چونکہ علومِ نبوت کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے اور رؤیا میں حقائق، مجاز کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں، جن کو سمجھنا ایک ذہنی مناسبت کا متقضی ہے، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ حضرات انبیا علیہم السلام کو تعبیرِ رؤیا کا ایک خاص ذوق اور ایک خاص علم بھی عطا فرماتا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے جب محسوس فرما لیا کہ اس رؤیا میں حضرت یوسف کے لیے نبوت کی بشارت ہے، تو ساتھ ہی ان پر یہ بات واضح ہو گئی کہ اب حضرت یوسف علیہ السلام کو تعبیرِ رؤیا کا علم بھی عطا ہو گا، تاکہ رؤیا کی شکل میں جو حقائق ان پر وارد ہوں، ان کو ٹھیک سمجھ کر وہ منشائے خداوندی کی تعمیل کر سکیں۔"

دوسرا نقطۂ نظر، انھوں نے اسی سورہ کے حوالے سے یہ بیان کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا کرتہ گریبان سے آخر تک پھٹ گیا تھا اور واپس گر گیا تھا، جہاں زلیخا نے اسے پیچھے سے پکڑ کر آپ کو روکنے کی کوشش کی تھی، جب بھاگتے ہوئے دروازے پر آقا سامنے آیا تو آپ کے جسم پر کرتا نہیں تھا۔ اس بحث میں مولانا ندوی نے جو دلائل دیے ہیں، ان میں ایک حد تک وزن ہے، لیکن انھیں تنہا واضح اور قطعی قرار دینا مشکل ہے کہ حتمی فیصلہ ممکن ہو۔ ایک مشکل یہ ہے کہ قرآنِ مجید میں واقعہ بڑے ہی ایجاز سے

بیان ہوا ہے اور اس میں داستان کے ضروری حصے ہی بتائے گئے ہیں اور پھر تعیینِ حقیقت میں ایک شکل یہ بھی ہے کہ تورات سے بھی اس معاملے میں کوئی رہنمائی نہیں ملتی، بلکہ اس کا بیان دوسرے بہت سے معاملات کی طرح اس معاملے میں بھی قرآنِ مجید سے مختلف ہے۔ اگر صورتِ معاملہ واقعتاً وہی رہی ہو جو مولانا ندوی نے بیان کی ہے اور پھر قرآنِ مجید نے اس میں موجود قباحت کی وجہ سے اسے بیان کرنے سے گریز کیا ہو تو ہمیں بھی اس کے درپے نہیں ہونا چاہیے۔

OUR THANKS TO

SNOW WHITE DRY CLEANING INDUSTRIES
SH. WILAYAT AHMAD & SONS
CONTINENTAL ART
FEROZE TEXTILE INDUSTRIES
IMAGE COMMUNICATIONS
TIP TOP DRY CLEANERS
F.RABBI & CO. (PVT) LTD
K.B. SARKAR & CO.
PARAMOUNT DISTRIBUTORS (PVT) LTD

ترتیب : منظور الحسن

"حقیقت یہ ہے کہ پیغمبرِ اسلام کی پوری زندگی ایک سادہ انسانی واقعہ ہے، اور اسی لیے وہ ہمارے لیے نمونہ ہے۔ آپ کو راستہ چلتے ہوئے اسی طرح ٹھوکر لگی جس طرح عام انسان کو لگتی ہے (بخاری)۔ آپ کے مخاطبینِ اولین کو آپ کا صاحبِ الہام ہونا اس لیے ناقابلِ فہم نظر آیا کہ آپ انھیں، بظاہر، اپنے ہی جیسے ایک انسان نظر آتے تھے:

"آپ بازار میں خرید و فروخت کرتے ہیں، اور اسی طرح تلاشِ معاش کرتے ہیں جس طرح ہم کرتے ہیں۔" (البدایہ والنہایہ)

"حقیقت یہ ہے کہ پیغمبرِ خدا کی زندگی کی عظمت، اس کے انسانی واقعہ ہونے میں ہے، نہ کہ پراسرار معجزاتی داستان ہونے میں۔ آپ کی کامیابی نصرتِ الٰہی کے تحت ہوئی، اس لحاظ سے، بلاشبہ، وہ معجزہ تھی، مگر اس معجزۂ الٰہی کا ظہور 'بشر رسول' کی سطح پر ہوا، نہ کہ کراماتی شخصیت کی سطح پر۔"

اصلاح و دعوت

وحید الدین خاں

سیرت

ایک تحریک کی حیثیت سے

"مولانا کی کتاب 'الاسلام' کا یہ مضمون، جسے ہم قسط وار شائع کریں گے، سیرت پر ایک بے مثال تحقیق ہے۔ مصنف نے اپنے مخصوص دل نشیں انداز میں، تاریخ و سیر سے، اس تحریر میں، حکمتِ دین کے گوہرِ آب دار دریافت کیے ہیں۔ قارئین کی سہولت کے لیے عربی عبارتیں، بعض جگہ، حذف کی گئی ہیں۔" (ادارہ)

پیغمبرِ اسلام کی جو سیرتیں لکھی گئی ہیں، ان کا انداز عام طور پر یہ ہوتا ہے، گویا آمنہ کے پیٹ سے ایک عجوبہ شخصیت نکلی اور اس نے پراسرار طریقوں سے پورے عرب کو مسخر کر ڈالا۔ سیرت کی کتابیں انسانی تاریخ سے زیادہ کرامات و معجزات کی ایک طلسماتی داستان نظر آتی ہیں۔ یہ ذوق اتنا بڑھا کہ جن واقعات میں کوئی معجزاتی پہلو نہ تھا، وہاں بھی لوگوں نے اپنے قوتِ تخیل سے کوئی نہ کوئی چیز ڈھونڈ نکالی۔ مثال کے طور پر صہیب بن سنان کی ہجرت کے بارے میں آتا ہے کہ جب وہ مکہ سے روانہ ہوئے، تو قریش کے کچھ نوجوانوں نے انھیں آگے بڑھ کر روکا۔ صہیب نے کہا: اگر میں تمھیں اپنا مال دے دوں، تو کیا تم مجھے جانے دو گے؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ چنانچہ چند اوقیہ[1] سونا جو صہیب کے پاس تھا، وہ سب انھوں نے ان کو دے دیا، اور مدینہ پہنچ گئے۔ بیہقی کی ایک روایت میں ان کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے:

"حضرت صہیب کہتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے مدینہ میں دیکھا تو فرمایا: اے ابو یحییٰ تمھاری یہ تجارت بڑی نفع بخش رہی۔ میں نے کہا یا رسول اللہ، مجھ سے پہلے آپ تک مکہ سے کوئی نہیں آیا، یہ خبر یقیناً آپ کو جبریل فرشتے نے دی ہے۔"

مگر یہی واقعہ ابنِ مردویہ اور ابنِ سعد نے نقل کیا ہے، تو اس کے الفاظ یہ ہیں:

"میں قریش کے لوگوں کو اپنا مال دے کر مکہ سے روانہ ہوا۔ یہاں تک کہ مدینہ پہنچ گیا۔

[1] عرب میں وزن کا ایک پیمانہ (ادارہ)

اس کی اطلاع نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی، تو آپ نے فرمایا: صہیب کی تجارت نفع بخش رہی، صہیب کی تجارت نفع بخش رہی۔"

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبرِ اسلام کی پوری زندگی ایک سادہ انسانی واقعہ ہے، اور اسی لیے وہ ہمارے لیے نمونہ ہے۔ آپ کو راستہ چلتے ہوئے اسی طرح ٹھوکر لگی جس طرح عام انسان کو لگتی ہے (بخاری) آپ کے مخاطبینِ اولین کو آپ کا صاحبِ الہام ہونا اس لیے ناقابلِ فہم نظر آیا کہ آپ انھیں، بظاہر اپنے ہی جیسے ایک انسان نظر آتے تھے:

"آپ بازار میں خرید و فروخت کرتے ہیں، اور اسی طرح تلاشِ معاش کرتے ہیں جس طرح ہم کرتے ہیں۔" (البدایہ والنہایہ)

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبرِ خدا کی زندگی کی عظمت، اس کے انسانی واقعہ ہونے میں ہے نہ کہ پُراسرار معجزاتی داستان ہونے میں۔ آپ کی کامیابی نصرتِ الٰہی کے تحت ہوئی، اس لحاظ سے، بلاشبہ وہ معجزہ تھی، مگر اس معجزۂ الٰہی کا ظہور "بشر رسول" کی سطح پر ہوا، نہ کہ کراماتی شخصیت کی سطح پر۔

قرآن میں پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی جو تصویر دی گئی ہے، اس کو سامنے رکھا جائے، تو آپ کی یہی تصویر اس کے مطابق نظر آئے گی۔

آغازِ دعوت

اپنی زندگی کے چالیسویں سال، جب آپ کو غارِ حرا میں پہلی وحی ملتی ہے، تو آپ پر ٹھیک وہی ردِ عمل ہوتا ہے، جو ایک "انسان" پر ہونا چاہیے۔ آپ خوف زدہ حالت میں گھر واپس آتے ہیں۔ یہاں آپ کی بیوی خدیجہ ہیں۔ وہ خود واقعۂ وحی سے الگ ہونے کی وجہ سے اس پوزیشن میں تھیں کہ اس کے بارے میں غیر متاثر رائے قائم کرسکیں۔ چنانچہ وہ آپ سے کہتی ہیں:

کلا واللہ ما یخزیك اللہ ابدا، انك لتصل الرحم وتحمل الکل وتکسب المعدم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق۔ (صحیحین، عن عائشہ)	"ہرگز نہیں۔ خدا کی قسم، اللہ آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا۔ آپ رشتہ داروں کے حقوق ادا کرتے ہیں، کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، بے روزگاروں کو کمانے کے قابل بناتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور مصیبت کے وقت لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔"

دعوت کی جد وجہد کے سلسلے میں آپ کے یہاں وہی فطری ترتیب نظر آتی ہے، جو کسی نئے ماحول میں ایک داعی کو پیش آتی ہے۔ حالات کا تقاضا تھا کہ اولاً پوشیدہ طور پر کام کیا جائے :

" ابن اسحاق کا بیان ہے کہ علی بن ابی طالب آپ کے گھر میں آئے۔ اس وقت آپ اور حضرت خدیجہ نماز پڑھ رہے تھے۔ انھوں نے پوچھا : اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ کیا ہے۔ آپ نے جواب دیا : اللہ کا دین، جس کو اس نے اپنے لیے منتخب کیا اور اس کی تبلیغ کے لیے اپنے رسول بھیجے۔ میں تم کو ایک اللہ کی طرف بلاتا ہوں، اس کا کوئی شریک نہیں اور اس کی عبادت کی تلقین کرتا ہوں۔ اور یہ کہ تم لات وعزیٰ کو ماننا چھوڑ دو۔ علی بن ابی طالب نے کہا، یہ ایسی بات ہے جس کو آج سے پہلے میں نے نہیں سنا۔ میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا، جب تک اپنے باپ ابو طالب سے اس کی بابت بات نہ کر لوں۔ آپ کو یہ پسند نہیں آیا کہ اعلان سے پہلے یہ راز کھل جائے۔ آپ نے کہا اے علی، اگر تم اسلام نہیں لاتے تو اس معاملہ کو پوشیدہ رکھو۔ علی بن ابی طالب اس رات رکے رہے۔ پھر اللہ نے ان کے دل میں اسلام ڈال دیا۔ اگلے روز صبح وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا، اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کل آپ نے مجھ سے کیا کہا تھا ؟ آپ نے فرمایا، گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اور لات وعزیٰ کو نہ مانو، اور جن کو خدا کا شریک وسہیم بنایا جاتا ہے، ان سے بیزاری کرو۔ حضرت علی نے اس پر عمل کیا اور اسلام لے آئے۔ اس کے بعد ابو طالب کے ڈر سے آپ کے پاس چھپ چھپ کر آتے رہے، اور علی رضی اللہ عنہ نے اپنے اسلام کو چھپائے رکھا اور اس کو ظاہر نہ کیا "

(البدایہ والنہایہ ج ۳، ص ۲۴)

اوس وخزرج کے ابتدائی مسلمان جب یثرب واپس ہوئے تو آغاز میں ان کا طریقہ بھی یہی تھا کہ خفیہ طور پر دعوتی کام کرتے (طبرانی)۔

آپ نے اپنی پوری زندگی میں شدت سے اس کا اہتمام رکھا کہ کوئی اقدام اس وقت سے پہلے نہ کیا جائے جب تک اس کی طاقت نہ پیدا ہو چکی ہو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ۳۸ صحابہ جمع ہو گئے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ سے "ظہور" کے لیے اصرار کیا۔ یعنی، اب ہم لوگ سامنے آجائیں اور کھلم کھلا تبلیغ کریں، مگر آپ کا جواب تھا : یا ابابکر، انا قلیل (اے ابوبکر، ابھی ہم تھوڑے ہیں)۔ اسی طرح نبوت کے چھٹے سال جب

حضرت عمر اسلام لائے تو انھوں نے آپ سے کہا: اے خدا کے رسول، ہم کیوں اپنے دین کو چھپائیں، جب کہ ہم حق پر ہیں؟ اس کے برعکس، دوسروں کا دین نمایاں رہے، حالاں کہ وہ باطل پر ہیں۔ آپ نے انھیں بھی یہی جواب دیا: یا عمر، انا قلیل۔ آپ کا یہی انداز مسلسل جاری رہا، یہاں تک کہ ہجرت کے بعد جب اسلامی طاقت ایک جگہ منظم اور مرتکز ہو گئی اور قریش فوج لے کر اس کے استیصال کے لیے آگئے، اس وقت مقابلہ کی اجازت دی گئی۔ اہلِ اسلام کے لیے عملی اقدام کا وقت وہ ہوتا ہے، جب وہ اس پوزیشن میں ہو جائیں کہ اپنے اقدام سے اسلام کے لیے نیا مستقبل پیدا کر سکتے ہوں۔ اس سے پہلے عملی اقدام جائز نہیں۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ کو دعوتِ عام کی ذمہ داری سونپی گئی تو آپ کو احساس ہوا کہ یہ بہت بڑا کام ہے جس کے لیے ہمہ تن مصروف ہونا ضروری ہے۔ آپ نے چاہا کہ آپ کے خاندان کے لوگ آپ کی اقتصادی ذمہ داریوں میں آپ کے کفیل ہو جائیں، تاکہ آپ اس کام کو بخوبی طور پر انجام دے سکیں۔ آپ نے اپنے مکان پر خاندانِ عبدالمطلب کو جمع کیا، جو اس وقت تقریباً ۴۰ افراد پر مشتمل تھا۔ ایک روایت کے مطابق ۴۰ آدمی جمع ہوئے۔ آپ نے انھیں بتایا کہ خدا نے مجھے نبوت عطا کی ہے، تم لوگ میرے ساتھ تعاون کرو، تاکہ میں اس ذمہ داری کو ادا کر سکوں:

یا بنی عبد المطلب، انی بعثت الیکم خاصة و الی الناس عامة فایکم یبایعنی علی ان یکون اخی وصاحبی۔ من یضمن عنی دینی ومواعیدی ویکون معی فی الجنة ویکون خلیفتی فی اھلی فقال رجل، یا محمد انت کنت بحر امن یقدم بھذا۔

(مسند احمد، عن عائشہ)

”اے خاندانِ عبدالمطلب، میں تمھاری طرف خاص طور پر، اور تمام لوگوں کی طرف عام طور پر بھیجا گیا ہوں، پھر تم میں سے کون مجھ سے اس پر بیعت کرتا ہے کہ وہ میرا بھائی اور ساتھی ہوگا۔ تم میں سے کون میرے قرضوں اور میرے وعدوں کا ضامن بنتا ہے اور میرے پیچھے میرے گھر والوں کا ذمہ دار بنتا ہے، اور وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔ ایک شخص بولا: اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، آپ تو ایک سمندر ہیں۔ کون اس ذمہ داری کے لیے کھڑا ہو سکتا ہے۔“

آپ کا خاندان آپ کی ذمہ داری لینے کے لیے تیار نہ ہوا۔ عباس بن عبدالمطلب آپ کے چچا تھے۔ وہ اقتصادی حیثیت سے اس پوزیشن میں تھے کہ آپ کی ذمہ داری لے سکیں مگر وہ بھی خاموش رہے تاہم اللہ تعالیٰ نے آپ کی نصرت فرمائی۔ اولاً آپ کی اہلیہ خدیجہ بنت خویلد اور اس کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما کا مال مکی زندگی میں آپ کا اقتصادی سہارا بنا رہا۔

لوگوں کو دعوتِ حق پہنچانے کے لیے آپ بچوں کی طرح حریص تھے۔ ابنِ جریر نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ مکہ کے ممتاز لوگ ایک روز غروبِ آفتاب کے بعد کعبہ کے پاس جمع ہوئے اور آپ کو بات چیت کے لیے بلایا، اس کے بعد روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم تیزی سے آئے۔ آپ کو خیال ہوا کہ شاید انھیں قبولِ حق کی طرف کچھ میلان ہو گیا ہے۔ اور آپ قریش کی ہدایت کے لیے بے حد حریص تھے اور ان کی ہلاکت آپ پر بہت گراں گزرتی تھی۔" (ابنِ جریر عن ابنِ عباس)

بلانے والوں نے آپ کو محض بحث مباحثہ کے لیے بلایا تھا، نہ کہ بات ماننے کے لیے چنانچہ طویل گفتگو کے بعد آپ غمگین واپس لوٹے:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم حزن اور افسوس کے ساتھ اپنے گھر واپس آئے، کیونکہ قوم سے جس چیز کی امید لگا کر گئے، اس کو نہ پایا۔ وہ لوگ اس سے بہت دور تھے۔"

(تہذیب سیرۃ ابنِ ہشام، ج ۱، ص ۶۸)

اسی طرح، ابوطالب کے مرض الموت میں، جب لوگ ان کے پاس جمع ہوئے، تو انھوں نے کہا کہ ہمارے اور اپنے بھتیجے کے درمیان اپنی موت سے پہلے کچھ طے کر دیجیے۔ ابوطالب نے آپ کو بلایا اور پوچھا کہ قوم سے آپ کیا چاہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا:

تقولون لا الٰہ الا اللہ و	"(میں چاہتا ہوں کہ) یہ لا الٰہ الا اللہ کہہ
تخلعون ما تعبدون من	دیں اور اس کے سوا جنھیں یہ پوجتے ہیں،
دونہ۔	انھیں چھوڑ دیں۔"

مگر قوم اس کو ماننے پر تیار نہ ہوئی۔ اس کے بعد جب لوگ چلے گئے، تو ابنِ اسحاق کی روایت کے مطابق، ابوطالب نے کہا، بھتیجے! خدا کی قسم، میرا خیال ہے کہ تم نے قوم سے کسی مشکل چیز کا مطالبہ نہیں کیا۔ ابوطالب کی زبان سے یہ جملہ سن کر آپ کی جو کیفیت ہوئی وہ یہ تھی:

قال، فطمع رسول اللہ صلی	راوی کہتے ہیں، یہ سن کر نبی صلی اللہ علیہ

الله علیه وسلم فیه فجعل يقول له ، اى عم! فانت فقلها استحل لك بها الشفاعة يوم القيامة۔	وسلم کو ابوطالب کے بارے میں امید پیدا ہوگئی اور آپ ان سے کہنے لگے: اے چچا، پھر آپ ہی اس کلمہ کو کہہ دیجیے تاکہ قیامت کے دن میرے لیے آپ کی سفارش کرنا حلال ہو جائے۔"
(البدایہ والنہایہ)	

آپ مدعو کی طرف سے ہر قسم کے اشتعال کو آخری حد تک برداشت کرتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد ہند بنت عتبہ بن ربیعہ آپ کی خدمت میں بیعت کے لیے حاضر ہوئی۔ آپ نے بیعت کے الفاظ ادا کرتے ہوئے حسب معمول جب یہ فرمایا: تم اپنی اولاد کو قتل نہیں کرو گی، تو ہند فوراً بولی: "(جنگ کے بعد) کیا آپ نے ہمارے لیے کوئی اولاد چھوڑی ہے جس کو ہم قتل کریں"۔ (ابن کثیر) مگر آپ نے اس کے طنزیہ جملہ کا کوئی اثر نہیں لیا اور اس کو خوشی کے ساتھ بیعت کر لیا۔

اس مشن کی راہ میں، آپ نے نہ صرف اپنے وقت اور اپنے جسم و دماغ کی ساری طاقت لگا دی، بلکہ اپنا سارا اثاثہ بھی اس کی راہ میں قربان کر دیا۔ نبوت سے پہلے مکہ کی ایک دولت مند خاتون سے نکاح کی وجہ سے آپ کافی مال دار ہو گئے تھے۔ مکہ کے ابتدائی دور میں، ایک بار سرداران قریش نے عتبہ بن ربیعہ کو اپنا نمائندہ بنا کر آپ کے پاس گفتگو کے لیے بھیجا۔ وہ آپ کے پاس پہنچ کر خود ہی مرعوب ہو گیا:

> "اور عتبہ اس کے بعد گھر بیٹھ رہا اور لوگوں کے پاس نہ گیا۔ ابوجہل نے کہا: "اے برادران قریش، خدا کی قسم، میرا خیال ہے کہ عتبہ محمد کی طرف مائل ہو گیا اور اسے محمد کا کھانا پسند آگیا، اور یقیناً اسے کسی حاجت کی بنا پر ایسا کرنا پڑا۔ آؤ، ہم عتبہ کے پاس چلیں۔" چنانچہ وہ گئے۔ ابوجہل نے کہا: "اے عتبہ، خدا کی قسم، ہم کو اس لیے آنا پڑا کہ تم محمد کی طرف مائل ہو گئے، اور ان کا معاملہ تم کو پسند آگیا۔ اگر تمھیں ضرورت ہو تو ہم تمھارے لیے اتنا مال جمع کر دیں، جو تمھیں محمد کے کھانے سے بے نیاز کر دے۔" عتبہ یہ سن کر بگڑ گیا اور قسم کھا کر کہا کہ میں محمد سے کبھی بات نہ کروں گا۔" (البدایہ والنہایہ ج ۳)

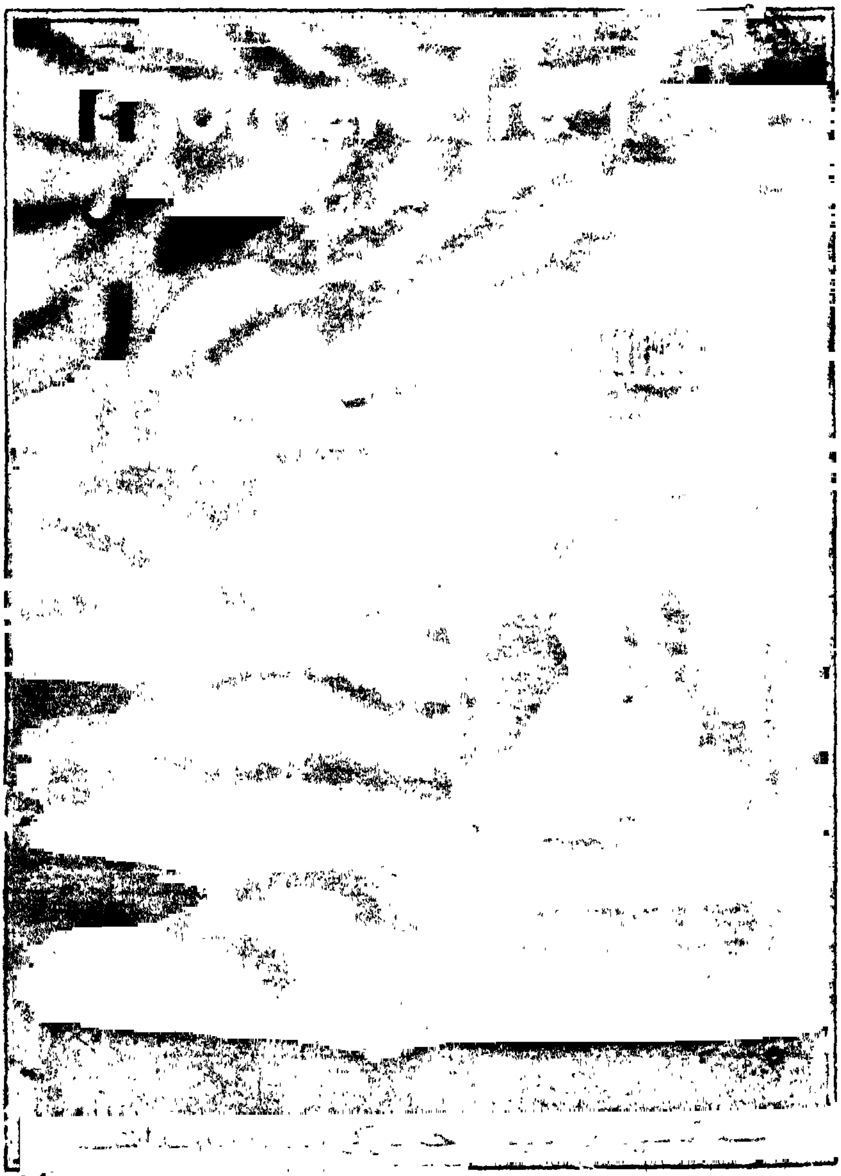
اسی طرح، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ولید بن مغیرہ آپ کے پاس آیا۔ آپ نے اس کو قرآن سنایا۔ قرآن کے ادب نے اس کو شدید طور پر متاثر کیا۔ ابوجہل کو معلوم ہوا تو ولید بن مغیرہ کے یہاں پہنچا، اور اس سے کہا: لوگوں کا ارادہ ہے کہ تمھارے لیے مال جمع کریں، کیوں کہ تم کو

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مال کی خواہش ہو گئی ہے۔

اس قسم کی مالی حیثیت سے آپ نے نبوت کا آغاز کیا، مگر تیرھویں سال جب آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی، تو آپ کے پاس کچھ باقی نہ رہا تھا، حتیٰ کہ آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے قرض لے کر سامانِ سفر درست کیا۔ [باقی]



Adarts-HRA-3/94



زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

ماہنامہ

اشراق

لاہور

جلد ۶ شمارہ ۹
ستمبر ۱۹۹۴ء
ربیع الثانی ۱۴۱۵ھ

مدیر
منیر احمد
معاونین
منظور الحسن
قدیر شہزاد
مدیر انتظامی
شکیل الرحمن
مجلس ادارت
طالب محسن خالد ظہیر
ساجد حمید معز امجد
شہزاد سلیم محمد رفیع
نادر عقیل انصاری نعیم احمد بلوچ
خورشید احمد ندیم

فی شمارہ : ۸ روپے
سالانہ : ۸۰ روپے
بیرون ملک
ہوائی ڈاک : ۴۵۰ روپے
بحری ڈاک : ۲۵۰ روپے

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

انتظامی دفتر: ۶۶ احمد بلاک، گارڈن ٹاؤن، لاہور ۵۴۶۰۰ فون: ۵۸۶۴۴۳۱

مدیر مسئول: جاوید احمد غامدی ○ طابع: قومی پریس، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

القلم

[۶۸]

اللہ کے نام سے جو سراپا رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورۂ "ن" ہے۔ قلم گواہی دیتا ہے (اُن صحیفوں میں جو اُس سے لکھے گئے) اور (یہ قرآن بھی) جو (اب) یہ (لکھنے والے اُس سے) لکھ رہے ہیں کہ تم اپنے پروردگار کی عنایت سے کوئی دیوانے نہیں ہو، اور تمھارے لیے، یقیناً، وہ صلہ ہے جس پر کبھی زوال نہ آئے گا اور تم، لاریب، بڑے اعلیٰ اخلاق پر ہو۔ اس لیے اب کچھ دیر نہ ہو گی کہ تم بھی دیکھو گے اور وہ بھی دیکھ لیں گے، کہ تم میں اور تمھارے اِن مخالفوں میں سے کس کے ساتھ ہے وہ شخص جو فتنہ میں پڑا ہوا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ تمھارا پروردگار ہی خوب جانتا ہے اُن کو جو اُس کی راہ سے بھٹک گئے اور اُن کو بھی جو ہدایت پانے والے ہیں۔

اس لیے تم اِن جھٹلانے والوں کی کسی بات پر کان نہ دھرو۔ یہ تو چاہتے ہیں کہ تم ذرا نرم پڑو تو یہ بھی نرم پڑ جائیں گے۔ اور تم کسی بات پر کان نہ دھرو، (اِن میں سے) ہر جھوٹی قسمیں کھانے والے کی، ذلیل، اشارہ باز، چغلی لیے پھرتا، بھلائی سے روکتا، حد سے بڑھتا، حق مارتا، پتھر دل اور اس پر مزید یہ کہ بے اصل بھی ہے۔ یہ اِس لیے ہوا کہ اُس کے پاس بہت مال و اولاد ہے۔ اِس کو ہماری آیتیں سنائیے تو کہتا ہے: یہ تو پہلوں کے افسانے ہیں۔ (یہ سمجھتا ہے کہ یہ بڑی ناک والا ہے۔ سنو، اب تم دیکھو گے کہ) اِس کی یہ سونڈ ہم عنقریب داغ دیں گے۔

ہم نے اِن کو اُسی طرح امتحان میں ڈالا ہے جس طرح باغ والوں کو امتحان میں ڈالا، جب انھوں نے قسم کھائی کہ وہ صبح دم اپنے اِس باغ کے پھل، لازماً، توڑ ہی لیں گے اور (کسی غریب اور مسکین کے لیے) کچھ بھی نہ چھوڑیں گے۔ پھر وہ سوتے رہے اور، (اے پیغمبر) تیرے پروردگار کی طرف سے ایک پھرنے والا اُس پر پھر گیا۔ اِس طرح کہ (اُن کا) وہ (لہلہاتا ہوا باغ) کٹی ہوئی فصل کی طرح ہو رہا۔ چنانچہ صبح ہوئی تو ایک دوسرے کو پکارنے لگے کہ پھل توڑنے ہیں تو چلو سویرے اپنے کھیت پر پہنچو۔ پھر چل پڑے اور آپس میں چپکے چپکے کہتے تھے کہ آج کوئی مسکین تمھارے پاس اِس (باغ) میں اندر نہ آنے پائے۔ اور وہ بڑے جوش میں نکلے، اِس خیال میں کہ سب اُن کی قدرت میں ہے۔ لیکن جب اُس کو دیکھا تو بولے: یقیناً ہم راستہ بھول گئے، نہیں بلکہ بے نصیب ہوئے۔ اُن میں سے اُس شخص نے جو سب سے بہتر تھا، کہا: میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم اپنے پروردگار کی تسبیح کیوں نہیں کرتے۔ تب پکار اٹھے: پاک ہے ہمارا پروردگار۔ اِس

میں شبہ نہیں کہ ہم ہی ظالم تھے۔ پھر ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔ بولے: ہائے بدبختی، ہم ہی سرکشی میں مبتلا رہے۔ اب توقع ہے کہ ہمارا رب اِس کی جگہ اِس سے بہتر باغ ہمیں عطا فرما دے۔ ہم اپنے رب ہی کی طرف لوٹتے ہیں۔ (ام القریٰ کے لوگو، تم اِس پیغمبر کو جھٹلا رہے ہو تو دیکھ لو) اِس طرح آئے گا عذاب، اور آخرت کا عذاب تو اِس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اے کاش، یہ لوگ اُس کو جانتے۔

اُن کے لیے، البتہ، جو (اِس عذاب سے) ڈرنے والے ہیں، اُن کے پروردگار کے پاس نعمت کے باغ ہیں۔ (تم سمجھتے ہو کہ یہ کبھی نہ ہوگا، تو) پھر کیا ہم (اپنے) فرماں بردار بندوں کو مجرموں کے برابر کر دیں گے؟ تمھیں کیا ہوا ہے، (یہ) تم کیسا حکم لگاتے ہو؟ کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم پڑھتے ہو کہ وہاں تمھارے لیے وہی کچھ ہے جو تم پسند کرو گے؟ کیا تم نے قسمیں لے رکھی ہیں ہم سے، جو روزِ قیامت تک چلی جائیں گی کہ تمھارے لیے وہی کچھ ہے جو تم حکم لگاؤ گے؟ اِن سے پوچھو کہ اِن میں سے کون اس کا ذمہ لیتا ہے؟ کیا اِن کے کوئی شریک ہیں (جو اِس کا ذمہ لیں گے)، تو لائیں اپنے اِن شریکوں کو، اگر یہ سچے ہیں۔

(اِن کے پاس کچھ نہیں)۔ یہ اُس دن کو یاد رکھیں جب بڑی ہلچل پڑے گی اور یہ سجدے کے لیے بلائے جائیں گے تو سجدہ نہ کر سکیں گے۔ اِن کی آنکھیں جھکی ہوں گی۔ اِن پر ذلت چھا رہی ہوگی۔ (یہ ظالم، اِن کی کمر تختہ ہو گئی)۔ یہ اُس وقت بھی سجدے کے لیے بلائے جاتے تھے، جب یہ بھلے چنگے تھے۔

اس لیے (اب) چھوڑ دو مجھے اور اِن کو جو اس کلام کو جھٹلا رہے ہیں۔ ہم اِن کو قدم قدم اتاریں گے، (تباہی کی طرف)، وہاں سے جہاں سے یہ نہیں جانتے۔ اور میں اِن کو ڈھیل دے رہا ہوں (کہ اپنا زور لگالیں) اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میری تدبیر بڑی محکم ہے۔

(یہ سنتے کیوں نہیں)؟ کیا تم اِن سے کوئی بدلہ چاہتے ہو کہ یہ اُس کے تاوان سے دبے جاتے ہیں؟ یا اِن کے پاس غیب کا علم ہے کہ (آخرت میں بھی سُرخ رُو ہوں گے اور) یہ اُس کو لکھ لاتے ہیں؟ (نہیں، کچھ بھی نہیں) اس لیے (اے پیغمبر) تم اپنے پروردگار کے حکم کے انتظار میں صبر کیے رہو، اور (اپنی قوم کے معاملے میں) مچھلی والے، (یونس) کی طرح نہ ہو جاؤ، جب اُس نے (مچھلی کے پیٹ میں) پکارا اور وہ غم سے بھرا ہوا تھا۔ (اس وقت) اگر اُس کے پروردگار کی عنایت اُس کے شاملِ حال نہ ہو جاتی تو (اپنی اس عجلت کے نتیجے میں) وہ (اُسی چٹیل میدان میں پھینک دیا جاتا، (جہاں مچھلی نے اُس کو اگل دیا تھا)، اِس طرح کہ لائقِ مذمت ہوتا۔ (لیکن وہ پلٹا)، تو اُس کے پروردگار نے اُس کو (از سرِ نو) برگزیدہ فرمایا اور اُس کو (اپنے) صالح بندوں میں شامل کر لیا۔

(اس لیے تم صبر کیے رہو)۔ اور (اس کے باوجود صبر کیے رہو کہ) یہ کافر جب (تم سے) یہ یاد دہانی سنتے ہیں تو، بے شک یہی لگتا ہے کہ اپنی نگاہوں کے زور سے تمھیں پھسلا دیں گے اور کہتے ہیں کہ یہ ضرور دیوانہ ہے، دراں حالیکہ یہ تو ایک یاد دہانی ہے، اہلِ عالم کے لیے۔

———— الملک ————

منشورِ انقلاب

(۶)

ریاست کی تنظیم

ہر وہ شخص جو تنظیمی معاملات سے کچھ واقفیت رکھتا ہے، وہ اس اصول سے واقف ہے کہ ایک شخص کی ذمہ داریوں، اس کے زیرِ انتظام علاقے اور اس کی رعایا کو جتنا محدود کر دیا جائے، اس کے لیے اپنے کام کو بہتر طریقے سے سرانجام دینا، اتنا ہی آسان ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انتظامیہ، خواہ ریاست کی ہو یا کسی کاروبار کی، اس میں کاموں یا زیرِ انتظام علاقوں یا رعایا کی تعداد کے لحاظ سے وحدتیں بنا دی جاتی ہیں، اور پھر ان وحدتوں کا انتظام سنبھالنے کے لیے، ان پر عامل یا حکمران مقرر کر دیے جاتے ہیں۔ جب بھی انسانوں کے کسی گروہ کا انتظام سنبھالا جائے گا، اسی اصول کے مطابق سنبھالا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی ناظم یا حکمران یا عامل ایسا نہیں ہو سکتا جس میں انتظامات سنبھالنے کی لامحدود صلاحیتیں ہوں، یہاں تک کہ پیغمبروں کو بھی، اسی اصول کے مطابق، اپنی امتوں اور ریاستوں کا انتظام کرنا پڑا۔ تورات کی کتاب 'خروج' میں ہے:

> "تب موسیٰ کے خسر (سیدنا شیب) نے اس سے کہا کہ تو اچھا کام نہیں کرتا۔ اس سے تو کیا بلکہ یہ لوگ بھی، جو تیرے ساتھ ہیں، قطعی گھل جائیں گے، کیونکہ یہ کام تیرے لیے بہت بھاری ہے۔ تو اسے اکیلا نہیں کر سکتا، سو اب تو میری بات سن۔ میں تجھے صلاح دیتا ہوں اور خدا تیرے ساتھ رہے..... اور تو رسوم اور شریعت کی باتیں ان کو سکھایا کر اور جس راستہ ان کو چلنا اور جو کام ان کو کرنا ہو، وہ ان کو بتایا کر۔ اور تو ان لوگوں میں سے ایسے لائق اشخاص چن لے جو خدا ترس اور سچے اور رشوت کے دشمن ہوں اور ان کو ہزار ہزار اور سو سو اور پچاس پچاس اور دس دس آدمیوں پر حاکم بنا دے، کہ وہ ہر وقت لوگوں کا انصاف کیا کریں اور ایسا ہو کہ بڑے بڑے مقدمے تو وہ تیرے پاس

لائیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں کا فیصلہ خود ہی کر دیا کریں۔ یوں تیرا بوجھ ہلکا ہو جائے گا اور وہ بھی اس کے اٹھانے میں تیرے شریک ہوں گے۔" (باب ۱۸، ۱۸: ۲۳)

چنانچہ، اسی اصول کے مطابق، ریاستوں کو انتظامی وحدتوں میں تقسیم کیا جاتا اور ہر انتظامی وحدت پر حکومت کی طرف سے کسی شخص کو عامل مقرر کر دیا جاتا ہے. ظاہر ہے کہ اس معاملے میں، اسلامی ریاست کوئی استثنا نہیں ہے۔ البتہ، ریاست کی اس تنظیم میں، اسلامی ریاست کے کچھ امتیازات ہیں، جن کا ہر حال میں، لحاظ کیا جانا چاہیے :

۱۔ اس معاملے میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہر انتظامی وحدت کا مرکز اس کی جامع مسجد کو بنایا جائے۔ جامع مسجد کی حیثیت مسلمانوں کی دینی اور سیاسی اجتماع گاہ کی ہے۔ ہم ریاست کے بنیادی مرجعِ اطاعت، ریاست کے مقاصد، اربابِ اقتدار کے اوصاف اور ان کے رہن سہن کے معیار پر لکھ چکے ہیں۔ ان سب مباحث کو پیشِ نظر رکھیے، تو یہ بات سمجھنے میں بڑی آسانی ہو گی کہ اسلام نے سیاست کو عبادت بنا دیا ہے۔ چنانچہ، جس طرح عبادات میں نماز کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اسی طرح ہماری سیاست اور اجتماعیت میں، مسجد کی حیثیت بھی مرکزی ہونی چاہیے۔

۲۔ جامع مسجد کی اس مرکزی حیثیت کے پیشِ نظر، ہر انتظامی وحدت میں عدالتوں، پولیس اور دیگر انتظامی دفاتر کو، ان جامع مسجدوں سے ملحق کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب تک یہ تمام دفاتر اور عدالتیں جامع مسجدوں سے ملحق قائم نہیں ہوں گی، اس وقت تک، ان جامع مسجدوں کو وہ مرکزی حیثیت بھی حاصل نہیں ہو گی، جو ایک اسلامی ریاست میں انھیں حاصل ہونی چاہیے۔ مزید برآں، ان چھوٹی چھوٹی انتظامی وحدتوں کی سطح پر، دفاتر اور عدالتوں کے قیام سے رشوت خوری، انتظامیہ میں پائی جانے والی بددیانتیوں اور لوگوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا خاتمہ ہو سکے گا اور اس کے ساتھ ساتھ، عوام الناس کو اپنے دروازوں پر جلد اور فوری انصاف بھی میسر آ سکے گا۔ اس کے نتیجے میں، ہم وہ حکومت قائم کرنے کی طرف پیش رفت کر سکیں گے جس کا سربراہ یہ کہے گا کہ "دجلہ اور فرات کے کنارے بھوکوں مرنے والے کتے کا بھی ذمہ دار ہوں۔"

۳۔ ریاست کے دار الحکومت، اور ہر صوبائی دار الحکومت میں ایک جامع مسجد کو مرکزی جامع مسجد قرار دیا جائے۔ صوبوں کی سطح پر، ان مرکزی جامع مسجدوں کے ساتھ انتظامی دفاتر اور عدالتوں کے صوبائی مراکز، اور وفاقی دار الحکومت کی مرکزی جامع مسجد کے ساتھ وفاقی دفاتر اور عدالتِ عظمیٰ قائم کی جائے گی۔

۴۔ نمازِ جمعہ کا خطاب اور اس کی امامت کی ذمہ داری ریاست کے صدر مقام کی مرکزی جامع

مسجد میں سربراہِ ریاست، صوبائی دارالحکومتوں کی مرکزی جامع مسجدوں میں ان صوبوں کے گورنر اور مختلف انتظامی وحدتوں کی جامع مسجدوں میں ان کے عمال ہی انجام دیں۔

قرآنِ مجید نے ریاست پر یَدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ (بھلائی کی دعوت) کی جو ذمہ داری عائد کی ہے، ریاست کی طرف سے جمعہ کا خطاب اور نمازِ جمعہ کی امامت اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

ہم یہ بات پہلے واضح کر چکے ہیں کہ اسلامی ریاست میں نماز اور زکوٰۃ کو پبلک لاء (PUBLIC LAW) کی حیثیت حاصل ہے، اور جو شخص نماز نہیں پڑھتا، یا بیت المال کو اپنے حصے کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا، قانون کی نظر میں اسے مسلمان نہیں سمجھا جائے گا۔ چنانچہ، یہی وجہ ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں نماز کا اہتمام حکومت کی سطح پر کیا جانا چاہیے۔ اس سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنت جاری فرمائی کہ عام حالات میں حکمران اور ان کے نمائندے ہی نمازوں کی امامت کا فریضہ انجام دیں گے، اور، خاص طور پر، جمعہ کا خطبہ دینا اور اس نماز کی امامت کرانا تو ان کی ذمہ داری بنا دی گئی۔ اس سلسلے میں، یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ نمازِ جمعہ کی امامت اور اس میں خطاب کرنے سے حکمرانوں کا اپنے عوام کے ساتھ ایک ہفتہ وار تعلق قائم ہو جائے گا، اور اس دور نے حکمرانوں اور عوام کے درمیان، جو دوری پیدا کر دی ہے، وہ رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گی۔

خلفائے راشدین اور اموی خلفا کے دور میں، یہ بات ایک دینی اور سیاسی روایت کے طور پر جاری رہی۔ یہاں تک کہ ہمارے دورِ اوّل میں یہ قانون رہا ہے کہ کوئی شخص، ریاست کی اجازت کے بغیر اگر جمعہ کے منبر پر کھڑا ہوتا، تو اس بات کو ریاست کے خلاف بغاوت سمجھا جاتا اور ایسا کرنے کی سزا موت ہوتی تھی۔

۵۔ جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں، جمعہ کے منبر سے ریاست کی طرف سے عوام کو بھلائی کی دعوت دی جاتی ہے، اس وجہ سے ریاست کی مرکزی جامع مسجد میں امیرالمومنین، صوبوں کی جامع مسجدوں میں گورنر، اور انتظامی وحدتوں کی جامع مسجدوں میں علاقے کے عمال یا ایڈمنسٹریٹر ہی یہ منبر سنبھالیں گے۔ ان جامع مسجدوں کے علاوہ، باقی تمام مساجد میں، مثال کے طور پر، محلوں کی مسجدوں میں، جمعہ کی نماز نہیں پڑھائی جائے گی۔ چنانچہ، جب جمعہ کی نماز، صرف جامع مسجدوں ہی میں ادا کی جائے گی، تو اس سے یہ بات بھی لازم آئے گی کہ انتظامی وحدتوں کی جامع مسجدوں کو اس طرح بنایا جائے کہ وہ علاقے کی پوری آبادی کے لیے کفایت کریں۔

۶۔ ریاست کی طرف سے اقامتِ صلوٰۃ ہی کے سلسلے کی ایک اہم کڑی یہ بھی ہے کہ وہاں موجود تمام مساجد کا انتظام، ریاست ہی کی ذمہ داری اور اسی کا حق ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مساجد کی تعمیر، ان پر مامور لوگوں کا تقرر اور ان کی تنخواہیں، یہ سب ریاست ہی کی طرف سے ہوگا۔ کسی شخص یا گروہ کو یہ اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ اپنی مسجد تعمیر کرے۔ ظاہر ہے کہ اس ممانعت کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص مسجد کی

تعمیر و انتظام کرتا ہے، تو اس سے اللہ کی عبادت کا گھر نہیں، بلکہ فرقہ بندی کا ایک نیا قلعہ تعمیر ہوتا ہے، جو مسلمانوں کو ملانے کے بجائے ان کی جمعیت کو پارہ پارہ کرنے اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے نفرتیں پیدا کرنے کا کام کرتا ہے۔

۷۔ مساجد کے انتظام و انصرام کی ذمہ داری حکومت پر ہونے کا مطلب، صرف یہ ہے کہ کسی خاص مسلک یا فرقے کی کوئی مسجد نہ ہو، بلکہ ریاست میں موجود ہر مسجد کا مسلک و مذہب وہی ہو، جسے ریاست کی سطح پر دین کی صحیح تعبیر کی حیثیت سے اپنایا جائے۔ اس کے یہ معنی، ہرگز نہیں ہیں کہ مختلف مکاتب فکر کے اہل علم پر اپنا نقطۂ نظر بیان کرنے اور لوگوں کو اس کا قائل کرنے کے معاملے میں، کسی قسم کی پابندی عائد کر دی جائے، بلکہ اس کے برعکس، ہر صاحب علم کا یہ حق ہو کہ وہ کسی بھی مسجد میں، اپنے لیے اوقات مخصوص کر کے، اپنے نقطۂ نظر کے مطابق، تعلیم و تدریس اور درس کی مجالس منعقد کر سکتا ہے۔ اس معاملے میں، کسی بھی مسلک یا مکتب فکر کے علما کے ساتھ، جانبدارانہ سلوک نہ کیا جائے۔ البتہ مسجد کے منبر پر بیٹھنے کا حق یا مسجد کی طرف سے کوئی بات کرنے کا حق، انھی لوگوں کو حاصل ہونا چاہیے، جو ریاست کی طرف سے مامور ہوں۔

چنانچہ، ایک اسلامی ریاست میں:

۱۔ ہر انتظامی وحدت کا مرکز اس کی جامع مسجد کو قرار دیا جانا چاہیے اور انتظامی وحدتوں کی تقسیم اس طرح کی جانی چاہیے کہ ہر وحدت کی جامع مسجد اس کی پوری آبادی کے لیے کفایت کرے۔

۲۔ تمام وحدتوں کے لیے ضروری انتظامی دفاتر اور عدالتیں ان جامع مسجدوں ہی سے ملحق قائم کی جانی چاہییں۔

۳۔ ریاست کے صدر مقام اور ہر صوبائی دار الحکومت میں ایک مسجد کو مرکزی جامع مسجد قرار دیا جانا چاہیے۔

۴۔ نماز جمعہ کا خطاب اور اس کی امامت ریاست کے صدر مقام کی مرکزی جامع مسجد میں سربراہ حکومت، صوبوں میں گورنر اور مختلف انتظامی وحدتوں کی جامع مسجدوں میں ان کے عمال کو کرنی چاہیے۔

۵۔ ان کے علاوہ تمام مساجد میں جمعہ کی اقامت ممنوع قرار دی جانی چاہیے۔

۶۔ مساجد کا انتظام حکومت ہی کو کرنا چاہیے۔

۷۔ ہر صاحب علم کو یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ جس مسجد میں چاہے، اپنے نقطۂ نظر کے مطابق تعلیم و تدریس اور اصلاح و ارشاد کی مجالس منعقد کرے۔

ذکر کا صحیح طریقہ

شاہ عبدالرحیم صاحب، شاہ ولی اللہ دہلوی کے والد بھی تھے اور ان کے استاد اور شیخ اور مربی بھی۔ شاہ ولی اللہ صاحب اپنی نوجوانی کی عمر میں ایک بار کچھ لوگوں کے ساتھ ایک باغ کی سیر کے لیے گئے۔ جب واپس آئے تو والد صاحب نے فرمایا کہ ولی اللہ تم نے اِس دن رات میں وہ کیا حاصل کیا، جو باقی رہے۔ ہم نے تو اس مدت میں استادرود شریف پڑھا۔ شاہ صاحب کہتے ہیں کہ یہ سن کر میرا دل باغ کی سیر سے بالکل ہٹ گیا۔ اس کے بعد پھر اس کا شوق پیدا نہیں ہوا۔ (تاریخ دعوت و عزیمت، حصہ پنجم، ص ۱۰۳)

قرآن میں بار بار کہا گیا ہے کہ زمین و آسمان میں خدا کی نشانیاں بکھری ہوئی ہیں، ان پر غور کرو۔ شاہ ولی اللہ صاحب شہر کے باہر ایک باغ میں گئے۔ وہاں وہ غالباً ۲۴ گھنٹے تک رہے۔ باغ خدا کی نشانیوں کا چمنستان ہوتا ہے۔ وہاں چاروں طرف خدا کی تجلیات بکھری ہوئی ہوتی ہیں۔ ایسی حالت میں شاہ صاحب کے والد (شاہ عبدالرحیم صاحب) کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ تم خدا کی نشانیوں کی دنیا میں گئے تھے، وہاں تم نے کیا کیا نشانیاں دیکھیں۔ خدائی معرفت کے کون سے تجربات وہاں تم کو حاصل ہوئے۔

مگر شاہ عبدالرحیم صاحب سلوک کے اس قرآنی طریقہ سے واقف نہ تھے۔ وہ صرف صوفیا کے ایجاد کردہ سلوک کو جانتے تھے، اور اسی پر ان کا عمل تھا۔ ان کا معمول تھا کہ روزانہ ایک ہزار بار درود، ایک ہزار بار نفی اثبات، بارہ ہزار بار اسم ذات کا ورد کرتے تھے۔ (ص ۸۷) ایسی حالت میں وہ شاہ ولی اللہ صاحب کو وہی رہنمائی دے سکتے تھے جو انھوں نے دی۔

صوفیا کے درمیان ذکر اور اوراد و وظائف کے نام سے اس قسم کا جو طریقہ رائج ہوا، وہ بلاشبہ بدعت تھا۔ قرآن و سنت کے مطابق، صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی اللہ کے جلال و کمال پر غور کرے۔ وہ کائنات میں بکھری ہوئی آیات (نشانیوں) میں اپنے رب کی جھلکیاں دیکھے۔ وہ احتساب کے ذریعے سے اپنے ذہن کو دنیا سے ہٹا کر آخرت کی فکر میں لگائے۔ ذکر ایک ذہنی عمل ہے، نہ کہ تکرارِ لسان۔ ذکر، یادِ الٰہی میں ڈوبنا ہے، نہ کہ لفظِ اللہ کا ورد کرنا۔ ذکر، خدا کی عظمتوں کو پانا ہے، نہ کہ خدا کے اسم کا شمار کرنا۔

وحید الدین خان

ترتیب : شہزاد سلیم

" ایمان میں داخل ہو جانے کے بعد نہ مردوں کے لیے یہ زیبا ہے کہ وہ دوسرے مردوں کو حقیر خیال کر کے ان کا مذاق اڑائیں، نہ عورتوں کے لیے جائز ہے کہ وہ دوسری عورتوں کو تمسخر کا نشانہ بنائیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرافت و رذالت کا انحصار آدمی کے ایمان و عمل پر ہے، اور ایمان و عمل کا صحیح وزن قیامت کے دن، اللہ تعالیٰ کی میزانِ عدل سے معلوم ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھ رہا ہو، لیکن قیامت کے دن کھلے کہ خدا کی میزان میں اس کا وزن پرِ کاہ کے برابر بھی نہیں ہے۔ اسی طرح، امکان اس کا بھی ہے کہ جس کو اہلِ دنیا نے کبھی اپنی آنکھوں میں جگہ نہیں دی، قیامت کے دن پتا چلے کہ خدا کی بادشاہی میں، جو مقام اس کا ہے، وہ ان لوگوں کا نہیں ہے جنھوں نے اس کو حقیر جانا۔"

قرآنیات

امین احسن اصلاحی

سورۃ الحجرات

(۴)

اوپر آیت ۱ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس اہتمامِ خاص کا ذکر فرمایا ہے جو اس نے مسلمانوں کو کفر و فسق اور عصیان سے بچانے کے لیئے خاص اپنے فضل سے فرمایا۔ اب آگے بعض ان باتوں سے روکا گیا ہے جو ایمان کے منافی اور داخلِ فسق ہیں، اور جن سے دلوں کے اندر اس فساد کی تخم ریزی ہوتی ہے جو پورے معاشرے کو مسموم کر کے رکھ دیتا ہے اور جس کا سدِ باب نہ ہو تو جن کو اللہ تعالیٰ نے 'رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ' کے وصف سے ممتاز فرمایا ہے، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۭ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۱۱

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، نہ مردوں کی کوئی جماعت دوسرے مردوں کا مذاق اڑائے، ممکن ہے وہ ان سے بہتر ٹھہریں، اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، کیا عجب وہ ان سے بہتر نکلیں۔ اور نہ اپنوں کو عیب لگاؤ۔ اور نہ آپس میں ایک دوسرے پر برے القاب چسپاں کرو۔ ایمان کے بعد فسق کا تو نام بھی برا ہے! اور جو لوگ توبہ نہ کریں گے تو وہی لوگ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنیں گے۔"

۱؎ ربطِ مضمون کے لیے ملاحظہ فرمایئے: 'اشراق' جون ۹۴ء۔

'یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' کا خطاب یہاں صرف خطاب ہی کے لیے نہیں ہے، بلکہ آگے وہ برائیاں بیان ہو رہی ہیں، جو داخل فسق اور منافیِ ایمان ہیں۔ اس خطاب سے اہل ایمان کو گویا اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جو لوگ ایمان سے مشرف ہو چکے ہیں، ان کے لیے زیبا نہیں کہ وہ ایمان کے بعد فسق کے داغ دھبوں سے اپنے دامن کو آلودہ کریں۔

فرمایا کہ ایمان میں داخل ہو جانے کے بعد نہ مردوں کے لیے یہ زیبا ہے کہ وہ دوسرے مردوں کو حقیر خیال کر کے ان کا مذاق اڑائیں، نہ عورتوں کے لیے جائز ہے کہ وہ دوسری عورتوں کو تمسخر کا نشانہ بنائیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرافت و رذالت کا انحصار آدمی کے ایمان و عمل پر ہے، اور ایمان و عمل کا صحیح وزن قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی میزانِ عدل سے معلوم ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھ رہا ہو، لیکن قیامت کے دن کھلے کہ خدا کی میزان میں اس کا وزن پرِکاہ کے برابر بھی نہیں ہے۔ اسی طرح امکان اس کا بھی ہے کہ جس کو اہل دنیا نے کبھی اپنی آنکھوں میں جگہ نہیں دی، قیامت کے دن پتا چلے کہ خدا کی بادشاہی میں جو مقام اس کا ہے، وہ ان لوگوں کا نہیں ہے جنھوں نے اس کو حقیر جانا۔

یہاں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کا ذکر بھی خاص اہتمام سے ہوا ہے، حالانکہ، بظاہر، اس کی ضرورت نہیں تھی۔ 'لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ' کے عام الفاظ ان کے لیے بھی کافی تھے۔ لیکن قرآن نے فضائل و رذائل، دونوں کے بیان میں یہ اسلوب ملحوظ رکھا ہے کہ عورتوں کا ذکران مواقع میں خاص اہتمام کے ساتھ ہوا ہے، جہاں تاکید کے ساتھ ان کو کسی فضیلت کے لیے ابھارنا یا کسی فتنہ سے بچانا مقصود ہے۔ یہاں یہی دوسری صورت ہے۔ جس بُرائی سے یہاں مردوں کو روکا گیا ہے، وہ عورتوں کے اندر اس سے زیادہ نہیں، تو کم بھی نہیں پائی جاتی، جتنی مردوں کے اندر پائی جاتی ہے۔ جن عورتوں کے اندر اپنی خاندانی، نسبی اور مالی برتری یا اپنے ظاہری حسن و جمال کا غرور ہوتا ہے، ان کا اندازِ خطاب و کلام ان عورتوں کے ساتھ حقارت آمیز ہوتا ہے جن کو وہ اپنے مقابل میں فروتر خیال کرتی ہیں۔

یہاں جن باتوں سے روکا گیا ہے، ان کا ایک خاص باطن ہے اور مقصود، درحقیقت، اسی کی بیخ کنی ہے۔ پیرے کی آخری آیت میں، اس باطن کی طرف اشارہ ہے۔ شیطان نے بنی آدم کو گمراہ کرنے کے لیے جو فتنے ایجاد کیے ہیں، ان میں ایک بہت بڑا فتنہ نسل و نسب، خاندان، برادری، کنبہ اور قبیلہ کے شرف و امتیاز کا فتنہ بھی ہے۔ جو لوگ اس فتنہ میں مبتلا ہوتے ہیں، (اور بہت کم

یسے خوش قسمت نکلتے ہیں جو اپنے کو اس فتنہ سے محفوظ رکھ سکیں، ظاہر ہے کہ وہ دوسروں کو اپنے مقابل میں حقیر خیال کرتے ہیں اور جب حقیر خیال کرتے ہیں تو' لازماً' ان کے قول، فعل اور رویہ سے اس کا اظہار بھی ہوتا ہے، یہاں تک کہ یہ چیزیں پختہ ہو کر ان کے ہاں روایت کی حیثیت حاصل کر لیتی ہیں، بلکہ ان کا بس چلتا ہے تو وہ ان کو مذہب کا درجہ بھی دے دیتے ہیں۔ چنانچہ ہندوؤں میں برہمنوں نے، یہود میں بنی لاوی نے اور عربوں میں قریش نے، اسی طرح تقدس کا ایک ایسا مقام اپنے لیے پیدا کر لیا جس کو چیلنج کرنا دوسروں کے لیے ممکن نہیں رہ گیا۔ یہی حال ہر قوم کا ہوا ہے اور مساواتِ انسانی کے بلند بانگ دعووں کے باوجود آج بھی یہی ہے۔ یہاں تک کہ مسلمان جو اس فتنہ کی بیخ کنی کے لیے برپا کیے گئے تھے، وہ بھی آج نہ جانے کتنی برادریوں، قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہیں اور ہر ایک 'ہم چومن دیگرے نیست'، کے نشہ سے سرشار ہے، جس کا اظہار ہر قوم و قبیلہ کے عوام و خواص کے بیانات اور نعروں سے ہوتا رہتا ہے جس سے' فطری طور پر' دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت و کدورت پیدا ہوتی ہے، جو عداوت و بغض کی شکل اختیار کر کے، بالآخر خون خرابے اور تقسیم و تفریق تک نوبت پہنچا دیتی ہے۔

یہاں قرآن نے مسلمانوں کو اسی آفت سے محفوظ رہنے کی ہدایت فرمائی کہ تم کو اللہ نے اپنے فضل سے جاہلیت کی تاریکی سے نکال کر ایمان کی روشنی بخشی ہے۔ تمھارا معاشرہ 'اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ' کی اساس پر قائم ہے اور تم آپس میں ایک دوسرے کے لیے 'رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ' بنائے گئے ہو تو اپنے دوسرے بھائیوں کو حقیر سمجھ کر یا ان کو اپنے طنزیہ اور حقارت آمیز الفاظ کا ہدف بنا کر اس معاشرہ کا حلیہ مسخ کرنے کی کوشش نہ کرو۔

'عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ': یہ اس اصل حکمت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو اس بات میں صحیح رہنمائی دینے والی ہے کہ عزت و شرف کی بنیاد نسل، نسب، خاندان، برادری، قوم و قبیلہ اور مال و دولت پر نہیں، بلکہ آدمی کے دین و تقویٰ پر ہے اور اس بات کا فیصلہ کل کو قیامت کے دن ہو گا کہ کس کا تقویٰ زیادہ ہے اور وہ اللہ کے نزدیک اشرف و اعلیٰ ہے اور کون اپنے تمام ادعائے حسب و نسب اور غرور عزو شرف کے باوجود، خدا کے نزدیک، بالکل بے وزن اور بے حقیقت ہے۔

'وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ': 'لمز' کے معنی کسی پر طعن کرنا، آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے اس پر کوئی طنز آمیز فقرہ چست کر دینا ہے۔ مثلاً سورۂ توبہ کی آیت ۷۹ میں منافقین کے بارے میں فرمایا ہے کہ 'اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ': یعنی جب غریب مسلمان اپنی گاڑھی

کمائی میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تو منافقین ان کی حوصلہ شکنی کے لیے ان پر، باندازِ استخفاف، طنزیہ فقرے چست کرتے ہیں کہ لو آج حاتم کی قبر پر لات مارنے یہ بھی اٹھ کھڑے ہوتے! اس قسم کے زہرآلود فقرے قائل کے حسد کی بھی غمازی کرتے ہیں، اور اس کے کبر و غرور کی بھی، اور ان کا اثر دوسروں پر یا تو حوصلہ شکنی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے یا نفرت و عناد کی صورت میں، اور یہ دونوں ہی چیزیں معاشرے کے اندر زہر پھیلانے والی ہیں۔

'اَنْفُسَكُمْ' یہاں اسی طرح استعمال ہوا ہے جس طرح النساء کی آیت ۲۹ میں 'لَاتَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ' (اپنے آپ کو قتل نہ کرو) آیا ہے۔ اس سے یہ بات نکلی کہ جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان پر طعن کرتا ہے وہ، گویا، اپنے ہی اوپر طعن کرتا ہے۔ اس لیے کہ تمام مسلمان آپس میں 'اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ' کے اصول پر بھائی بھائی ہیں، تو جس نے اپنے کسی بھائی کو اپنے کسی طعن و طنز کا ہدف بنایا اس نے، گویا، اپنے ہی سینہ کو اپنے تیر کا نشانہ بنایا اور اپنے ہی کو مجروح کیا۔

'وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ': 'تنابزوا بالالقاب' کے معنی آپس میں ایک دوسرے پر بُرے القاب چسپاں کرنا ہے۔ اچھے القاب سے ملقب کرنا جس طرح کسی فرد یا قوم کی عزت افزائی ہے، اسی طرح بُرے القاب کسی پر چسپاں کرنا اس کی انتہائی توہین و تذلیل ہے۔ ہجویہ القاب لوگوں کی زبانوں پر آسانی سے چڑھ جاتے ہیں، اور ان کا اثر نہایت دُوررس اور نہایت پایدار ہوتا ہے۔ ان کی پیدا کی ہوئی تلخیاں پشت ہا پشت تک باقی رہتی ہیں، اور اگر معاشرے میں یہ ذوق اتنا ترقی کر جائے کہ ہر گروہ کے شاعر، ادیب، ایڈیٹر اور لیڈر اپنی ذہانت اپنے حریفوں کے لیے بُرے القاب ایجاد کرنے میں لگا دیں، تو پھر اس قوم کی خیر نہیں ہے۔ اس کی وحدت، لازماً، پارہ پارہ ہو کے رہتی ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ دورِ جاہلیت میں عربوں کے اندر یہ ذوق بدرجۂ کمال ترقی پر تھا۔ قبیلہ کا سب سے بڑا شاعر اور خطیب وہی مانا جاتا جو دوسروں کے مقابل میں اپنے قبیلہ کے مفاخر بیان کرنے اور حریفوں کی ہجو و تحقیر میں یکتا ہو۔ ان کے ہجویہ اشعار پڑھیے تو کچھ اندازہ ہو گا کہ اس 'فنِ شریف' میں انھوں نے کتنا نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا۔ ان کی اس چیز نے ان کو کبھی ایک قوم بننے نہیں دیا۔ وہ برابر اپنوں ہی کو گرانے اور پچھاڑنے میں لگے رہے۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ اسلام نے ان کو انسانی وحدت اور ایمانی ہم آہنگی سے آشنا کیا، جس کی بدولت وہ دنیا کی ہدایت و قیادت کے اہل بنے۔ قرآن نے یہاں ان کو دورِ جاہلیت کے انھی فتنوں سے آگاہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں ایمان و اسلام کی برکات سے نوازا ہے تو اس کی قدر کرو، شیطان کے ورغلانے سے پھر انھی لاف

زنیوں اور سطاک بازیوں میں نہ مبتلا ہو جانا جن سے اللہ نے تمھیں بچایا ہے۔

'بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ'۔ 'بِئْسَ' اور 'نِعْمَ' کے اندر فی الجملہ مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس کا ٹھیک معنی خیز ترجمہ یہ ہوگا کہ 'نہایت ہی بُرا لفظ ہے فسق ایمان کے بعد' یہ اسی طرح کی بات ہے جس طرح کہیں 'الشر یہ کا سمہ' شریر کا تو لفظ بھی بُرا ہے، پھر شریر کے بُرے ہونے کا کیا ٹھکانا ہے! ہماری زبان میں بھی کسی شے کی انتہائی بُرائی کے اظہار کے لیے یہ اسلوب موجود ہے۔ مثلاً کہتے ہیں 'بھائی' اس چیز کے تو نام سے بھی گھن آتی ہے'۔

'بَعْدَ الْاِيْمَانِ' کے اضافہ سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اگر تم ایمان سے آشنا نہ ہوتے ہوتے اور تم سے کوئی بات فسق کے قسم کی صادر ہو جاتی تو یہ چیز زیادہ تعجب انگیز نہ ہوتی لیکن جب تمھیں اللہ نے ایمان کی حلاوت سے آشنا کر دیا، جیساکہ فرمایا ہے 'وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ' تو اب تو تمھیں 'فسق' کے نام سے بھی گھن محسوس کرنی چاہیے چہ جائیکہ تم سے کسی عمل فسق کا صدور ہو!

اس ٹکڑے سے یہ حقیقت واضح ہوتی کہ اوپر جن چیزوں سے روکا گیا ہے، یہ سب فسق میں داخل ہیں اور اہلِ ایمان کی حسِ ایمانی اتنی بیدار ہونی چاہیے کہ ارتکابِ فسق تو درکنار لفظِ فسق سے بھی وہ نفور و بیزار ہوں۔

'وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ'۔ یہ نہایت سخت الفاظ میں ان لوگوں کو تنبیہ ہے جو اس وضاحت کے بعد بھی اس قسم کے کسی فسق کے مرتکب ہوں گے۔ فرمایا کہ جو لوگ ان باتوں سے توبہ نہیں کریں گے، وہ یاد رکھیں کہ ظالم وہی ٹھہریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے سامنے ایمان کی برکتیں بھی واضح کر دی ہیں اور ان کو کفر و فسق کے نتائج سے بھی اچھی طرح آگاہ کر دیا ہے۔ اب ذمہ داری لوگوں کی اپنی ہے۔ اس اتمامِ حجت کے بعد بھی جو لوگ اپنی روش سے باز نہیں آئیں گے، وہ اس کے نتائج سے لازماً دوچار ہوں گے اور یہ ان کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ظلم نہیں ہوگا، بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنیں گے۔

جاوید احمد غامدی

"جرم و سزا کے معاملے میں، اس شریعت کی بنا جس اصول پر رکھی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ مجرم چونکہ دو ہی قسم کے ہوتے ہیں: ایک وہ جن سے جرم سادہ طریقے پر صادر ہو جاتا، اور دوسرے وہ جو تنہا یا جتھا بنا کر، جرم کا ارتکاب اس طریقے سے کرتے ہیں کہ ان کا وجود معاشرے کے لیے وبال اور حکومت کے لیے، امن و امان کا مسئلہ بن جاتا ہے، لہٰذا اُن سے نمٹنے میں بھی، ان کا یہ فرق، لازماً، ملحوظ رہنا چاہیے۔

اسلامی شریعت کا یہی اصول ہے، جس کے مطابق، مجرموں کی یہ دونوں قسمیں، قرآنِ مجید میں ان کی سزا، اور اس سزا سے متعلق حدود و شرائط کے لحاظ سے بالکل الگ الگ بیان ہوئی ہیں۔

پہلی قسم کے مجرم یہی چوری، زنا اور قتل و جراحت وغیرہ کے مجرم ہیں۔

دوسری قسم کے مجرموں کے لیے، قرآنِ مجید میں، "اللہ و رسول سے محاربہ" اور "فساد فی الارض" کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔"

میزان

جاوید احمد غامدی

حدود و تعزیرات

—۱—

انسان کو اللہ تعالیٰ نے اختیار کی جو نعمت عطا فرمائی ہے، وہ اس دنیا میں، جہاں اس کے لیے سب سے بڑا شرف ہے، وہاں اُس کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ اس کے سوءِ استعمال سے، بارہا، خدا کی اس زمین پر فساد پیدا ہو جاتا اور اس طرح فرشتوں کی وہ بات انسان کے حق میں پوری ہو جاتی ہے، جو انھوں نے اس کی تخلیق کے وقت، پروردگارِ عالم کے حضور میں کہی تھی کہ :

اَتَجۡعَلُ فِیۡهَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا وَیَسۡفِكُ الدِّمَآءَ. (البقرہ ۲: ۳۰)	"پروردگار، کیا آپ اُسے بنائیں گے جو زمین میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا۔"

انسانی تاریخ میں اس فساد کا سب سے پہلا ظہور ابوالبشر آدم کے بیٹے قابیل کے ہاتھ سے ہوا۔ چنانچہ یہ ضرورت اس کے ساتھ ہی سامنے آ گئی کہ انسان کو خود انسان کے اس شر و فساد سے بچانے کے لیے، کوئی تدبیر ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں جو حقائق الہام کیے ہیں، اُن کی روشنی میں، یہ بات تو بالکل واضح تھی کہ اس کا واحد راستہ، جرم سے پہلے ماحول کی درستی، تعلیم و تربیت اور تبلیغ و تلقین، اور جرم کے بعد، قرار واقعی تادیب و تنبیہ ہی ہے۔ لیکن اس تادیب و تنبیہ کے لیے کیا طریقے اختیار کیے جائیں؟ اس کی تعیین میں میں چونکہ عقلِ انسانی بہت کچھ ٹھوکر کھا سکتی اور تاریخ کی گواہی یہی ہے کہ اس معاملے میں، اس نے زیادہ تر ٹھوکر ہی کھائی ہے، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کی وساطت سے انسان کو اپنی شریعت دی، جس میں زندگی کے دوسرے معاملات کے علاوہ جان، مال، آبرو

اور نظم اجتماعی سے متعلق چند بڑے جرائم کی سزائیں خود مقرر کر دیں اور باقی معاملات میں چند اصولی باتیں واضح کر دینے کے بعد مسلمانوں کے نظم اجتماعی ہی پر چھوڑ دیا کہ وہ ان کے متعلق جو قانون چاہے، بنا لے۔ اللہ تعالیٰ کی یہی شریعت، بالکل آخری اور قطعی صورت میں، اس وقت اللہ کی کتاب، قرآنِ مجید اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں، ہمارے پاس موجود ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (الجاثیہ ۴۵: ۱۸)

"پھر ہم نے تم کو دین کے معاملہ میں ایک واضح شریعت پر قائم کیا ہے۔ اس لیے تم اسی کی پیروی کرو اور ان کی خواہشوں کے پیچھے نہ چلو، جو علم نہیں رکھتے۔"

بنیادی اصول

جرم و سزا کے معاملے میں، اس شریعت کی بنا جس اصول پر رکھی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ مجرم چونکہ دو ہی قسم کے ہوتے ہیں: ایک وہ جن سے جرم سادہ طریقے پر صادر ہو جاتا، اور دوسرے وہ جو تنہا یا جتھا بنا کر، جرم کا ارتکاب اس طریقے سے کرتے ہیں کہ اُن کا وجود، معاشرے کے لیے وبال اور حکومت کے لیے، امن و امان کا مسئلہ بن جاتا ہے، لہٰذا اُن سے نمٹنے میں بھی اُن کا یہ فرق، لازماً، ملحوظ رہنا چاہیے۔

اسلامی شریعت کا یہی اصول ہے، جس کے مطابق، مجرموں کی یہ دونوں قسمیں، قرآنِ مجید میں ان کی سزا، اور اس سزا سے متعلق حدود و شرائط کے لحاظ سے بالکل الگ الگ بیان ہوئی ہیں۔

پہلی قسم کے مجرم یہی چوری، زنا اور قتل و جراحت وغیرہ کے مجرم ہیں۔

دوسری قسم کے مجرموں کے لیے، قرآنِ مجید میں "اللہ و رسول سے محاربہ" اور "فساد فی الارض" کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

ذیل میں ہم مجرموں کی ان دونوں قسموں سے متعلق، اسلام کے ضابطۂ حدود و تعزیرات

کی وضاحت کریں گے۔

محاربہ اور فساد فی الارض

محاربہ اور فساد فی الارض کے معنی، قرآنِ مجید کی اصطلاح میں یہ ہیں کہ کوئی شخص یا گروہ یا جتھا، قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے اور پوری جرأت وجسارت کے ساتھ، اس نظامِ حق وعدل کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرے جو اللہ اور رسول کی ہدایت کے تحت، ایک اسلامی حکومت، کسی خطۂ ارض میں قائم کرتی ہے۔ چنانچہ وہ مجرم جو زنا بالجبر کا ارتکاب کریں یا بدکاری کو پیشہ بنالیں، یا کھلم کھلا اوباشی پر اتر آئیں، یا اپنی آوارہ منشی، بدمعاشی اور جنسی بے راہ روی کی بنا پر شریفوں کی عزت وناموس کے لیے خطرہ بن جائیں، یا اپنی دولت واقتدار کے نشے میں غریبوں کی بہو بیٹیوں کو سرِعام رسوا کریں، یا قتل، ڈکیتی، رہزنی، بغاوت، اغوا، دہشت گردی، تخریب، ترہیب اور اس طرح کے دوسرے سنگین جرائم سے حکومت کے لیے امن وامان کا مسئلہ پیدا کر دیں، اُن کی سرکوبی کے لیے سزاؤں کا ایک مفصل ضابطہ ہے، جو قرآنِ مجید کی سورۂ مائدہ میں بیان ہوا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۔ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِى الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۔ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۔	”وہ لوگ جو اللہ اور رسول سے لڑتے اور ملک میں فساد برپا کرنے کے لیے تگ ودو کرتے ہیں، اُن کی سزا بس یہ ہے کہ عبرت ناک طریقے سے قتل کیے جائیں یا سولی چڑھائے جائیں یا اُن کے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹ ڈالے جائیں یا وہ جلاوطن کر دیے جائیں۔ یہ ان کے لیے اس دنیا میں رسوائی ہے، اور آخرت میں بھی ان کے لیے بڑی سزا ہے۔ مگر جو لوگ توبہ کر لیں، اس سے پہلے کہ تم ان پر قابو پاؤ، تو سمجھ لو کہ اللہ مغفرت

فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (۵: ۳۳-۳۴) فرمانے والا ہے۔ اس کی شفقت ابدی ہے۔"

اس آیت میں چار سزائیں بیان ہوئی ہیں:

تقتیل،

تصلیب،

ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹ دینا،

نفی۔

ان کی تفصیل یہ ہے:

تقتیل

آیت میں اس کے لیے 'ان یقتلوا' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان کے معنی یہ ہیں کہ محاربہ اور فساد فی الارض کے یہ مجرم صرف قتل ہی نہیں، بلکہ عبرت ناک طریقے سے قتل کر دیے جائیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ 'قتل' یہاں 'تقتیل' کی صورت میں آیا ہے۔ عربیت کے اداشناس جانتے ہیں کہ بنا میں یہ زیادت، نفس فعل میں شدت اور مبالغہ ہی کے لیے ہوئی ہے۔ اس وجہ سے 'تقتیل' یہاں 'شر تقتیل' کے مفہوم میں ہے۔ چنانچہ حکم کا تقاضا یہ ہوگا کہ ان مجرموں کو ایسے طریقے سے قتل کیا جائے، جو دوسروں کے لیے عبرت انگیز اور سبق آموز ہو۔ آگ میں جلانا اور اس طرح کے دوسرے اُن طریقوں کو چھوڑ کر، جو شریعت میں ممنوع ہیں، حکومت اس مقصد کے لیے، جو طریقے چاہے اختیار کر سکتی ہے۔ رجم یعنی سنگ سار کر دینا بھی، ہمارے نزدیک، اسی کے تحت داخل ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں اوباشی کے بعض مجرموں کو یہ سزا اسی آیت کے حکم کی پیروی میں دی ہے۔[۱]

تصلیب

یہ بھی 'صلب' سے تفعیل ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے: 'او یصلبوا'۔ یعنی ایسے لوگوں کو صرف

[۱] اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے، ہماری کتاب "برہان" میں مضمون "رجم کی سزا"۔

سولی ہی نہ دی جائے، بلکہ عبرت ناک طریقے سے سولی دی جائے۔ یہ سولی وہ چوبی آلہ ہے، جس پر مجرم کے ہاتھوں اور پاؤں میں میخیں ٹھونک کر، اسے لٹکا دیتے، یہاں تک کہ وہ اسی پر لٹکا ہوا جان دے دیتا ہے۔ سزا کی یہ صورت، ظاہر ہے کہ کچھ کم عبرت انگیز نہیں ہے، لیکن آیت میں لفظ 'تصلیب' کا تقاضا ہے کہ اس کے لیے بھی وہ طریقے اختیار کیے جائیں جو زیادہ دردناک اور زیادہ عبرت انگیز ہوں۔

ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹ دینا

ارشاد فرمایا ہے: 'او تقطع ایدیھم وارجلھم من خلاف'۔ بے ترتیب کاٹ دینے کا یہ حکم بھی صاف واضح ہے کہ عبرت انگیزی ہی کے نقطۂ نظر سے ہے، اور اس کا مقصود بھی صاف یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے کسی مجرم کی اگر جان بخشی بھی کی جائے تو اس طرح کی جائے کہ اسے عبرت کا ایک نمونہ بنا کر، اس کی شر انگیزی کے تمام آلحہ بالکل بے کار کر دیے جائیں۔

نفی

آیت میں یہ سزا 'او ینفوا من الارض' کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ یعنی یہ کہ انھیں جلاوطن کر دیا جائے۔ غور کیجیے تو یہ سب سے کم تر سزا ہے، جو ان مجرموں کو دی جائے گی۔ پہلی دو سزائیں مجرم کا خاتمہ کر دیتی ہیں۔ تیسری سزا اسے ہاتھ پاؤں سے محروم کر کے، ایک نمونۂ عبرت کے طور پر زندہ رکھتی، اور یہ چوتھی اور آخری سزا، اس کے جسم و جان کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر محض اس کے وطن اور گھر در سے، اسے محروم کرتی ہے۔ قرآن کے الفاظ کا تقاضا ہے کہ عام حالات میں سزا، اسی صورت میں دی جائے۔ لیکن کسی وجہ سے اگر یہ ممکن نہ ہو، تو مجرم کو کسی خاص علاقہ میں پابند یا اس کے گھر میں نظر بند کر دینے سے بھی، حکم کا منشا، یقیناً، پورا ہو جائے گا۔

چند متعلقات

ان سزاؤں سے متعلق پہلی چیز جو سورۂ مائدہ کی اس آیت میں حرف 'او' سے واضح ہوتی

یہ ہے کہ قرآنِ مجید نے یہاں حکومت کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ جرم کی نوعیت، مجرم کے حالات اور جرم کے موجود اور متوقع اثرات کے لحاظ سے، ان میں سے جو سزا مناسب سمجھے، اس طرح کے مجرموں کو دے سکتی ہے۔ تقتیل اور تصلیب جیسی سزاؤں کے ساتھ، اس میں نفی کی سزا اس لیے رکھی گئی ہے کہ سزا میں انتہائی سختی کے ساتھ، حالات کا تقاضا ہو تو مجرم کے ساتھ نرمی کے لیے بھی گنجایش باقی رکھی جائے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں معلوم ہے کہ آپ نے اپنے زمانے میں اوباشی کے اُن مجرموں کو جو اپنے حالات اور جرم کی نوعیت کے لحاظ سے رعایت کے مستحق تھے، مائدہ کی اسی آیت کے تحت جلاوطنی کی سزا دی، اور وہ مجرم جنھیں کوئی رعایت دینا ممکن نہ تھا، اسی آیت کے تحت رجم کر دیے گئے۔[1] استاذ امام امین احسن اصلاحی اپنی تفسیر "تدبر قرآن" میں لکھتے ہیں :

"اس طرح کے حالات میں صرف اسی امر کو ملحوظ نہیں رکھنا پڑتا ہے کہ جرم کرنے والے جتھا نے صرف مال کو نقصان پہنچایا ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر زمانہ، مقام اور جتھابندی کرنے والے مجرموں کے عزائم اور اُن کے اثرات پر نگاہ رکھنی پڑتی ہے۔ مثلاً زمانہ جنگ یا بدامنی کا ہو، تو اس میں، لازماً سخت اقدام کی ضرورت ہو گی، اسی طرح مقام سرحدی یا دشمن کا آماج گاہ ہو، تب بھی موثر کارروائی ضروری ہو گی۔ اگر شرارت کا سرغنہ کوئی بڑا خطرناک آدمی ہو اور اندیشہ ہو کہ اس کو ڈھیل ملی تو بہتوں کے جان و مال اور عزت و آبرو

---

[1] زنا اور اوباشی کے بعض مجرموں کے شادی شدہ اور غیر شادی شدہ ہونے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استفسار بھی اسی قبیل سے تھا، جسے فقہا نے غلطی سے مناطِ حکم سمجھا، اور اس کی بنا پر سورۂ نور کی آیۂ جلد کو شادی شدہ زانیوں کے حق میں منسوخ قرار دے دیا۔ گویا معاملے کی نوعیت یہ تھی کہ اس طرح کے مجرموں کو سزا دیتے وقت ان کے لیے کسی رعایت کا فیصلہ کرنے کے لیے دوسری بہت سی چیزوں کے ساتھ یہ بھی دیکھا جائے کہ وہ شادی شدہ ہیں یا نہیں، لیکن انھوں نے اس "یہ بھی" کو "یہی" قرار دیا اور اس طرح ایک ایسی بے جوڑ چیز اسلام کے ضابطۂ حدود و تعزیرات میں داخل کر دی جو عقل و نقل، دونوں کی رو سے بالکل بے بنیاد ہے۔ اس کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، آخر میں ضمیمہ : "رجم کی سزا"۔

کو خطرہ پیش آجائے گا، تب بھی حالات کے لحاظ سے موثر قدم اٹھانا پڑے گا۔ غرض اس میں اصلی اہمیت جزوی واقعات کی نہیں، بلکہ بغاوت کے مجموعی اثر اور ملک و ملت کے مصالح کی ہے۔" (ج ۲، ص ۵۰۶-۵۰۷)

چنانچہ زنا کے بعض عادی مجرموں کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خذوا عنی، خذوا عنی، قد جعل الله لهن سبيلا. البكر بالبكر جلد مائة ونفی سنة والثيب بالثيب جلد مائة والرجم.

(مسلم، کتاب الحدود)

"مجھ سے لو، مجھ سے لو۔ زنا کی ان عادی عورتوں کے بارے میں اللہ نے جو راہ نکالنے کا وعدہ کیا تھا، وہ اس نے نکال دی۔ اس طرح کے مجرم اگر کنوارے یا اطہر ہوں، تو ان کی سزا سو کوڑے اور جلا وطنی ہے اور رنڈوے یا شادی شدہ ہوں تو سو کوڑے اور سنگ ساری ہے۔[1]"

اس روایت میں 'جعل الله لهن' کا اشارہ اُن عورتوں کی طرف ہے جن سے نمٹنے کے لیے ایک عبوری حکم سورۂ نساء میں بیان ہوا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا

"اور تمھاری عورتوں میں سے جو بدکاری کرتی ہیں، ان پر اپنے اندر سے چار گواہ طلب کرو۔ پھر اگر وہ گواہی دے دیں، تو ان کو گھروں

---

[1] رجم کے ساتھ سو کوڑے کی سزا کا ذکر یہاں محض قانون کی وضاحت کے لیے ہے۔ روایتوں سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بیان تو کیا ہے، لیکن رجم کے ساتھ تازیانے کی یہ سزا کسی مجرم کو کبھی نہیں دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موت کی سزا کے ساتھ کسی اور سزا کا جمع کرنا اخلاقیاتِ قانون کے خلاف ہے۔ قید، تازیانہ، جرمانہ، ان سب سزاؤں میں دو باتیں پیشِ نظر ہوتی ہیں: ایک معاشرے کی عبرت، دوسرے آئندہ کے لیے مجرم کی تادیب و تنبیہ۔ موت کی صورت میں ظاہر ہے کہ تادیب اور تنبیہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس وجہ سے جب مختلف جرائم میں کسی شخص کو سزا دینا مقصود ہو، اور ان میں سے کسی جرم کی سزا موت بھی ہو، تو قانون، فیصلے یا حکم میں یہ سب سزائیں بیان تو کی جاتی ہیں، لیکن عملاً، موت کے علاوہ کوئی سزا کبھی نافذ نہیں کی جاتی۔

فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا. وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا، فَاِنْ تَابَا وَ اَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا. اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا. (۴: ۱۵-۱۶)

میں بند کر دو، یہاں تک کہ موت انھیں لے جائے یا اللہ ان کے لیے کوئی راہ نکال دے۔ اور وہ مرد و عورت جو تم میں سے یہ برائی کرتے ہیں، انھیں ایذا پہنچاؤ۔ پھر اگر وہ توبہ کریں اور اصلاح کر لیں تو اُن سے درگزر کرو، بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

'اللّتی یاتین الفاحشۃ' (وہ عورتیں جو بدکاری کرتی ہیں) اور 'اللّذان یاتینھا' (وہ مرد و عورت جو بدکاری کرتے ہیں) کا یہ اسلوب دلیل ہے کہ یہ زنا کے عادی مجرم ہیں۔ ان کی دو قسمیں یہاں بیان ہوئی ہیں: ایک وہ قحبہ عورتیں جو عصمت فروشی کا دھندا کرتی، اور دوسرے وہ مرد و عورت جن کا ناجائز تعلق، یاری آشنائی کی صورت اختیار کر لیتا، اور استواری و پائیداری کے مختلف مراحل سے گزر کر، روزمرہ کا معمول بن جاتا ہے۔ ہماری زبان میں 'عورت اور اس کا آشنا' کے الفاظ اسی تعلق کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ پہلی صورت میں، غور کیجیے تو قانون کے لحاظ سے اصل مسئلہ عورت ہی کا ہوتا ہے، اور دوسری صورت میں بالبداہت واضح ہے کہ مرد و عورت، دونوں یکساں زیر بحث آتے ہیں۔[1] چنانچہ آیت میں پہلے صرف عورتوں اور بعد میں ایک مرد و عورت کا ذکر اسی رعایت سے ہوا ہے۔ قرآن کی بعض دوسری آیات میں، اسی مدعا کے لیے 'مسافحات' (کھلے عام بدکاری کرنے والیاں) اور 'متخذات اخدان' (آشنائی گانٹھنے والیاں) کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

اوپر جو روایت ہم نے نقل کی ہے، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زنا کے انھی مجرموں کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ چونکہ محض زنا ہی کے مجرم نہیں ہیں، بلکہ اس کے ساتھ آوارہ منشی اور جنسی بے راہ روی کو اپنا معمول بنا لینے کی وجہ سے فساد فی الارض کے مجرم بھی ہیں، اس وجہ سے، ان میں سے ایسے مجرموں کو، جو اپنے حالات کے لحاظ سے رعایت کے مستحق ہیں، زنا کے جرم میں

[1] یہی چیز ہے، جس کے نہ سمجھنے کی وجہ سے، یہ آیت ہماری تفسیروں میں، اب تک ایک لاینحل معما بنی ہوئی ہے۔

سورۂ نور کی آیت ۲ کے تحت سو کوڑے اور معاشرے کو ان کے شر و فساد سے بچانے کے لیے، ان کی اوباشی کی پاداش میں مائدہ کی آیت ۳۳ کے تحت نفی، یعنی جلاوطنی کی سزا دی جائے، اور ان میں سے وہ مجرم جنھیں کوئی رعایت دینا ممکن نہیں ہے[1]، مائدہ کی اسی آیت کے حکم 'ان یقتلوا' کے تحت رجم کر دیے جائیں۔

چنانچہ یہ بالکل واضح ہے کہ فساد فی الارض کے جرم میں حرف 'او' کے ساتھ چار سزاؤں کا یہ بیان جرم کی نوعیت اور مجرم کے حالات کی اسی رعایت پر دلالت کرتا ہے۔

دوسری چیز، جس کی طرف آیت میں 'یسعون' اور 'یحاربون' میں جمع کا اسلوب اشارہ کرتا ہے، یہ ہے کہ جرم اگر جتھا بنا کر ہوا ہے، تو اس کی سزا بھی انفرادی حیثیت سے نہیں، بلکہ اس جتھے کو جتھے ہی کی حیثیت سے دی جائے گی۔ چنانچہ مجرموں کا کوئی گروہ اگر فساد فی الارض کے طریقے پر قتل، اغوا، زنا، تخریب، ترہیب اور اس طرح کے دوسرے جرائم کا مرتکب ہوا ہے، تو اس کی تحقیق کی ضرورت نہیں ہے کہ متعین طور پر جرم کا ارتکاب کن ہاتھوں سے ہوا اور کن سے نہیں ہوا ہے، بلکہ جتھے کا ہر فرد اس ذمہ داری میں شریک سمجھا جائے گا، اور اس کے ساتھ معاملہ بھی، لازماً، اسی حیثیت سے ہوگا۔

تیسری چیز، جس کے لیے آیت میں 'ذلک لھم خزی فی الدنیا' کے الفاظ آئے ہیں، یہ ہے کہ اس طرح کے مجرموں کو سزا دیتے وقت، کسی شخص کے دل میں ہم دردی کے کوئی جذبات پیدا نہ ہوں۔ وہ پروردگار جو ان کا خالق ہے، ان جرائم کے بعد، اس کا فیصلہ یہی ہے کہ انھیں اس دنیا میں بالکل رسوا کر دیا جائے۔ استاد امام لکھتے ہیں:

> "دنیا میں ان کی یہ رسوائی دوسروں کے لیے ذریعۂ عبرت و بصیرت ہوگی، اور اس کے اثر سے اُن لوگوں کے اندر بھی قانون کا ڈر اور احترام پیدا ہوگا، جو یہ صلاحیت نہیں رکھتے کہ مجرد قانون کی افادیت و عظمت کی بنا پر اس کا احترام کریں۔ موجودہ زمانے میں جرم اور مجرمین کے لیے فلسفہ کے نام سے جو ہم دردانہ اور رحم دلانہ نظریات پیدا ہو

---

[1] روایت میں المثر یا کنوارے اور رنڈوے یا شادی شدہ کے الفاظ اسی اصول کی وضاحت کے لیے آئے ہیں۔

گئے ہیں، یہ انھی کی برکت ہے کہ انسان بظاہر جتنا ہی ترقی کرتا جاتا ہے، دنیا اتنی ہی جہنم بنتی جا رہی ہے۔ اسلام اس قسم کے مہمل نظریات کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ اس کا قانون ہوائی نظریات پر نہیں، بلکہ انسان کی فطرت پر مبنی ہے۔"

(تدبر قرآن، ج ۲، ص ۵۰۷)

چوتھی چیز، جو اس آیت میں، 'الا الذین تابوا من قبل ان تقدروا علیھم'، کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے، یہ ہے کہ اس طرح کے مجرم اگر حکومت کے کسی اقدام سے پہلے خود آگے بڑھ کر، اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دیں، تو ان سے پھر عام مجرموں ہی کا معاملہ کیا جائے گا۔ اس صورت میں انھیں محاربہ اور فساد فی الارض کا مجرم قرار نہیں دیا جائے گا۔ استاد امام نے لکھا ہے:

"یہ خاص اختیارات صرف ان باغیوں کے خلاف استعمال کیے جائیں گے جو حکومت کے حالات پر قابو پانے سے پہلے تک اپنی بغاوت پر اڑے رہے ہوں، اور حکومت نے اپنی طاقت سے ان کو مغلوب و مقہور کیا ہو۔ جو لوگ حکومت کے ایکشن سے پہلے ہی توبہ کر کے اپنے رویے کی اصلاح کر چکے ہوں، ان کے خلاف ان کے سابق رویہ کی بنا پر، اس قسم کا کوئی اقدام جائز نہیں ہوگا، بلکہ ان کے ساتھ عام قانون کے تحت معاملہ ہوگا۔ اگر ان کے ہاتھوں عام شہریوں کے حقوق تلف ہوئے ہوں، تو حتی الامکان ان کی تلافی کرا دی جائے گی۔

آیت میں 'فاعلموا' کے لفظ کے زور کو اگر ذہن میں رکھیے، تو یہ بات صاف نکلتی ہے کہ قابو میں آنے سے پہلے ہی توبہ و اصلاح کر لینے والوں کے معاملے میں حکومت کے لیے کوئی انتقامی کارروائی جائز نہیں ہے۔ خدا غفور اور رحیم ہے۔ جب وہ پکڑ سے پہلے توبہ کر لینے والوں کو معاف کر دیتا ہے، تو اس کے بندوں کا رویہ اس سے الگ کیوں ہو؟"[1]

(تدبر قرآن، ج ۲، ص ۵۰۸) [باقی]

[1] یہاں یہ بات، البتہ، واضح رہے کہ بھاگنے کی کوئی راہ نہ پا کر، اعتراف جرم کے لیے حاضر ہو جانے والوں کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان کے بارے میں، حکومت یہ اختیار، یقیناً رکھتی ہے کہ چاہے تو انھیں یہ رعایت دینے سے انکار کر دے۔

زکوٰۃ وصدقات

جب ایک آدمی زکوٰۃ اور صدقہ کے تحت کسی کو کچھ دیتا ہے، تو بظاہر وہ کسی غیر کو دے رہا ہوتا ہے، مگر حقیقت کے اعتبار سے اس کا رخ خود دینے والے کی طرف ہوتا ہے۔ دوسرے کو دے کر، آدمی خود اپنی پاکی کا اہتمام کرتا ہے۔

ایسا کرکے آدمی اپنے دل سے مال کی محبت کو نکالتا ہے۔ وہ اس یقین کو تازہ کرتا ہے کہ اس کے پاس جو مال ہے، وہ خدا کی امانت ہے، نہ کہ اس کی ذاتی ملکیت۔ اس طرح، وہ اپنے اندر اس احساس کو جگاتا ہے کہ اس کے اوپر دوسروں کا حق ہے۔

زکوٰۃ یا صدقہ، اس بات کی تربیت ہے کہ آدمی انسان کو دے، مگر وہ اس کا بدلہ خدا سے پانے کی امید رکھے۔ وہ یک طرفہ طور پر، دوسرے انسانوں کا خیر خواہ اور مددگار بنے۔ وہ اپنے مال میں ایسے لوگوں تک کا حق سمجھے، جن سے اسے کچھ پانے کی امید نہ ہو۔

زکوٰۃ دینا، گویا دوسروں کے لیے نفع بخش بننا ہے۔ اس طرح زکوٰۃ، آدمی کے لیے اس یاددہانی کا ذریعہ ہے کہ تم کو اس دنیا میں مانگنے والا نہیں بننا، بلکہ دینے والا بننا ہے۔ تم کو اپنے حقوق سے زیادہ، اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا ہے۔ تمھیں اپنے آپ کو اس قابل بنانا ہے کہ تمھارا ہاتھ ہمیشہ اوپر رہے، وہ کبھی نیچے نہ ہونے پائے۔

زکوٰۃ، گویا ایک قسم کی عملی دعا ہے۔ زکوٰۃ دینے والا اس لیے دیتا ہے، تاکہ وہ خدا سے پائے۔ وہ اس لیے دوسروں کے کام آتا ہے، تاکہ خدا اس کے کام بنا دے۔ وہ اس لیے یک طرفہ طور پر مدد پہنچاتا ہے، تاکہ خدا بھی اس کو یک طرفہ طور پر اپنی رحمت اور بخشش کے سایہ میں لے لے۔

اس دنیا میں، بظاہر، ایک آدمی بے مال ہے اور دوسرا صاحبِ مال۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے ہر آدمی محتاج ہے، کیوں کہ کسی کا مال بھی، ذاتی مال نہیں۔ ہر آدمی کا مال خدا کا عطیہ ہے۔ مال والا ایک آدمی، جب کسی بے مال والے کو کچھ دیتا ہے، تو اس عمل کے ذریعہ سے وہ خود اپنی ہی حقیقت کو اپنے ذہن میں تازہ کرتا ہے۔ وہ گویا زبانِ حال سے یہ کہتا ہے کہ میں وہی ہوں جو تم ہو۔ اگر خدا چاہے تو کل کے دن وہ میرا حال تمھارے جیسا کر دے اور تمھارا حال میرے جیسا۔

وحید الدین خان

ترتیب : طالب محسن

"بعض لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تمدن کو نمونہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رہنے، کھانے پینے، لباس اور بود و باش کی بھی، وہی دینی حیثیت ہے جو دوسرے دینی معاملات میں سنت کو حاصل ہے۔ ہمارے نزدیک، جس طرح حیثیتِ نبوت کو اسوہ بنانا غلط ہے، بالکل اسی طرح آپ کے تمدن کو اسوہ قرار دینا بھی غلط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی امت نے اپنے اجتماعی وجود میں بھی اسے یہ حیثیت کبھی نہیں دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد ایک خاص طریقے اور خاص سامانِ تعمیر سے بنائی گئی تھی۔ اس مثال کو کہیں بھی دینی حیثیت سے نہیں دوہرایا گیا۔ اس زمانے میں جنگ بھی مخصوص ہتھیاروں سے لڑی جاتی تھی اور اسے کسی وقت بھی لازم نہیں سمجھا گیا کہ وہی ہتھیار استعمال کیے جائیں اور آج بھی امریکہ کی توپوں کا مقابلہ تیغ و سناں سے کیا جائے۔ ہمارے نزدیک، یہی معاملہ آپ کے لباس، طرزِ بود و باش اور طعام کا ہے۔"

فکر و نظر

طالب محسن

تزکیۂ نفس

— ۴ —

اخلاقی وجود کا تزکیہ

نفسِ انسانی کے چاروں پہلوؤں میں سے سب سے نمایاں پہلو، انسان کا اخلاقی وجود ہے۔ اسی پہلو سے ایک انسان اپنے معاشرے میں تعلقات کے مختلف دوائر سے متعلق ہوتا ہے، لہٰذا اس کی اصلاح کی اہمیت باقی پہلوؤں کے مقابلے میں قدرے زائد ہو جاتی ہے۔

اخلاقی وجود میں کار فرما محرکات چار ہیں۔ محرکات سے ہماری مراد وہ چار چیزیں ہیں جو انسان کو مختلف کام کرنے پر ابھارتی ہیں، یا وہ چار عوامل ہیں، جن کے باعث ایک انسان اپنے علاوہ دوسرے انسانوں سے متعلق یا ان پر اثر انداز ہونے پر مجبور ہے اور اس کے نتیجے میں دوسرے انسانوں کو اس کے رویے، طرزِ معاملہ اور قماش سے واسطہ پڑتا ہے۔ یہ محرکات درجِ ذیل ہیں:

۱۔ بنیادی ضروریات

۲۔ خواہشات

۳۔ شہوات

۴۔ جذبات

انسان کی بنیادی ضروریات کو اخلاقی وجود کا پہلا محرک قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور ان ضروریات کو بنیادی قرار دیا جاتا ہے، جن کے بغیر زندگی گزارنا کسی بھی انسان کے لیے ناممکن ہوتا ہے۔ مثلاً، خود زندگی ہی کی بقا کے لیے خوراک کی ضرورت ہے۔ جسم کو ڈھانپنے کے لیے اور اسے موسمی شدائد سے بچانے کے لیے لباس کی ضرورت ہے۔ اور اسی طرح شب و روز گزارنے کے لیے چھت کی ضرورت ہے۔ یہ وہ بنیادی ضروریات ہیں، جن کے لیے انسان سرگرداں رہتا ہے۔ انسان ان کا محتاج ہے اور وہ ہر حال میں انھیں دستیاب کرنے کی سعی کرتا ہے۔

اخلاقی وجود کے دوسرے محرک کو ہم خواہشات کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ خواہشات، درحقیقت، بنیادی ضروریات ہی میں ایک نئی جہت کا اضافہ کرتی ہیں۔ جب کسی بنیادی ضرورت کے ساتھ خواہش کا پہلو جمع ہوتا ہے، تو یہ ضرورت متنوع اور رنگارنگ روپ بھرنے لگتی ہے۔ خوراک کی ضرورت، مثلاً جب ذائقے ہی کی ایک خواہش کے ساتھ عمل کرتی ہے، تو مختلف قسم کے کھانے، رنگ برنگ مشروبات اور نوع بنوع مٹھائیاں اختراع ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ملک اور معاشرے کے اس باب میں اتنے تنوعات ہیں کہ شاید احاطہ کرنا ممکن نہ ہو۔ لباس اور چھت کی ضرورت، مثلاً جب برتری اور امتیاز ہی کی خواہش کے ساتھ بروئے کار آتی ہے، تو تراش خراش کی مختلف نوعیتیں وجود میں آتیں اور ملبوسات کے ہزاروں ڈھنگ ایجاد ہوتے ہیں۔ اسی طرح گھر محض چھت اور چار دیواری ہی کا نام نہیں رہتا، کوٹھیاں، محلات اور حویلیاں وجود میں آتی ہیں۔ بلکہ معاملہ اہرامِ مصر اور تاج محل جیسی عمارتوں کی تخلیق تک جا پہنچتا ہے۔ یہ بڑی بڑی مسجدیں، یہ عالی شان مقابر، اور یہ مہیب فصیلوں والے قلعے، انسان کی برتری کی خواہش ہی کی کرشمہ سازیاں ہیں۔

تیسرے محرک کی حیثیت شہوات کو حاصل ہے۔ جنس کا یہ جذبہ صرف صنفی تعلق تک محدود نہیں ہے اس کے اثرات ادب، شاعری، موسیقی، مصوری، سنگ تراشی، ظروف سازی اور تعمیرات میں ظاہر ہوتے ہیں اور فنونِ لطیفہ کی تاریخ میں ہر جگہ نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ کسی بھی جغرافی یا نظریاتی وحدت کی تہذیب اور اس کے تمدن کی تشکیل میں اس کا کردار ہمیشہ ہی انتہائی اہم رہا ہے اور اس کا سب سے اہم اور مثبت کردار تو کسی سے بھی پوشیدہ نہیں کہ یہ جذبہ بقائے نسل انسانی کا ضامن ہے۔ اسی طرح معاشرے میں ہونے والے جرائم میں بھی اسے ایک بڑے اور اہم محرک کی حیثیت حاصل ہے۔

اخلاقی وجود کا چوتھا محرک انسان کے جذبات ہیں۔ نفرت، محبت، غیرت، انتقام، حیا اور خلوص وغیرہ انفعالِ قلب، جنھیں ہم جذبات کے نام سے موسوم کرتے ہیں، انسان کی اصل شخصیت کی تشکیل کرتے ہیں۔ ان کے ذریعے سے انسان اپنے وجود کا اظہار کرتا ہے۔ انسان، درحقیقت، جس پہلو سے انسان کہلاتا ہے، اس میں ان جذبات کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ دنیا میں انسان نے جتنے بڑے بڑے معرکے سر کیے ہیں، ان میں ان جذبات کا کردار پوری طرح شامل رہا ہے۔ لیکن ان جذبات کے ساتھ ایک مشکل بھی لاحق ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ بار ہا حدود سے متجاوز ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ انھیں باگیں ڈالنی پڑتی ہیں۔ اگر انھیں قابو میں نہ رکھا جائے تو انسان اتنا بھی گر سکتا ہے کہ قرآنِ مجید کے اس ارشاد کا مصداق بن جائے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ o ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۔ (التین ۹۵: ۴-۵)

"لاریب، ہم نے انسان کو بہترین صورت پر پیدا کیا اور پھر اسے بدترین جگہ پر اتار دیا۔"

اخلاقی وجود کے تزکیے کی ضرورت نفسِ انسانی کے باقی پہلوؤں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معاشرے کی تعمیر اور اس میں حسن وخوبی، یعنی اعلیٰ اقدار قائم رکھنے میں اخلاقی وجود کا کردار بڑا اہم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نفسِ انسانی کا اخلاقی پہلو اگر مزکّٰی ہو تو دنیا خوبصورت انسانوں کی "جنت" میں تبدیل ہو جائے۔ اور اگر صورتِ حال اس کے برعکس ہو تو یہ ایک "جہنم" ہے جس میں خود انسان ہی انسان کے لیے عذاب بن جاتا ہے۔

اسلام نے اخلاقی وجود کے تزکیے کے لیے دوجہتی طریقہ اختیار کیا ہے۔ ایک جہت میں تمام بشری عیوب سے پاک اور سارے اخلاقی معیاروں پر پورا اترنے والا آئیڈیل مسلمانوں کے سامنے رکھ دیا ہے۔ یہ آئیڈیل بھی کوئی خیالی وجود نہیں، بلکہ ایک انسان، ایک عظیم الشان شخصیت کو آئیڈیل قرار دیا گیا ہے، جسے ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ آپ کو اپنے معاشرے اور اپنی جدوجہد کے دوران میں ہر طرح کے حالات پیش آئے، لیکن آپ نے ایک شان دار اور دل پذیر شخصیت کی حیثیت سے زندگی گزاری۔ آپ ایک انسان تھے، اس کے باوجود آپ نے بے عیب رویے اور غیر معمولی کردار کا مظاہرہ کیا۔ یہ آپ کی عظمت ہی کی دلیل ہے کہ کسی سلیم الفطرت آدمی کے لیے کسی بھی موقعے پر آپ کی طرف سے کسی کمزوری کی نشان دہی ممکن نہیں۔

دوسری جہت سے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ انسان کا اخلاقی وجود جس جس دائرے میں، اپنا اظہار کرتا ہے، اس سے متعلق تفصیلی ہدایات دی ہیں اور اس طرح زیغ وانحراف کے تمام راستے مسدود کر دیے ہیں۔ یہ ہدایات زندگی کے جن دائروں سے متعلق ہیں، ان کی وضاحت سے پہلے، ہم یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ ہونے کے بارے میں چند ضروری تصریحات کریں گے۔

اس سے قبل ہم نے نفسِ انسانی کے دوسرے پہلوؤں کے تزکیے کے ابواب میں قرآن وسنت کی تعلیمات ہی کا ذکر کیا ہے اور ان ابواب میں کہیں بھی اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حوالہ نہیں دیا۔ درحقیقت ان پہلوؤں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ایک واجب الاطاعت شارع اور ایک واجب الاتباع ہادی کی ہے۔ آپ نے لوگوں کو نہ صرف دینی تعلیمات سے آگاہ کیا اور شریعت کے احکام دیے، بلکہ سب سے بڑھ کر خود دین پر عمل بھی کیا۔ چنانچہ آپ نے جو دین پیش کیا اس پر عمل کرنے میں آپ کے طریقے کو

دین کے دوسرے ماخذ' سنت کی حیثیت حاصل ہے۔ اور اس طرح قرآن اور سنت دونوں مل کر دین کے فرائض اور آداب و نوافل کا تعین کرتے ہیں اور بطورِ خاص سنت ہمارے لیے عمل متواتر کی حیثیت سے شرائع اور عبادت کے عملی پہلوؤں سے آگاہی کے لیے محکم اساس فراہم کرتی ہے۔

اخلاقی پہلو کے تزکیے کے حوالے سے، دراصل، کسی خاص طریقے یا عملی صورت کے تعین کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس لیے' اس باب میں آپ کا رویہ اور طرزِ عمل ہمارے لیے مثال اور نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ باقی ابواب میں تزکیے کے لیے ہمیں جو اعمال بجالانے کے لیے کہا گیا ہے' ان کا طریقہ جاننے کے لیے ہم سنت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جبکہ اخلاقی پہلو میں آپ کی سیرت' ہمارے لیے زندگی کے مختلف مراحل میں پیش آنے والے معاملات کے لیے عظیم الشان کردار کے خدوخال نمایاں کرتی ہے اور آپ کی زندگی کا یہی پہلو تزکیۂ اخلاق میں ہمارے لیے نمونے اور مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن مجید سے بھی یہی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ جس آیۂ کریمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ زندگی کو ہمارے لیے اسوہ قرار دیا گیا ہے' اس سے پہلے جنگِ احزاب میں پیش آنے والے شدید ترین حالات کا ذکر ہوا ہے اور پھر بعض لوگوں کی بزدلی اور کم ہمتی کا ذکر کر کے' ارشاد فرمایا ہے :

لَقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِىۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (الاحزاب ۳۳: ۲۱)	"لاریب، تمھارے لیے اللہ کے رسول کے طریقے میں بہترین نمونہ ہے۔"

اس طرح ان بزدلوں کو غیرت دلائی کہ تمھارے اندر ہی محاذ پر خدا کا رسول بھی موجود تھا۔ اور تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس نے کس عزم و ہمت کے ساتھ تمام خطرات کا مقابلہ کیا۔ تم نے اس بہترین نمونے کی پیروی نہ کی اور بزدل اور رڈر پوک بنے رہے۔ اس آیت کے سیاق کی دلالت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ درحقیقت، وہ چیز جسے اسوۂ حسنہ کہا گیا ہے، وہ آپ کا کردار آپ کی سیرت اور آپ کا طریقِ کار اور رویہ ہے۔

ہمارے ہاں، اس باب میں بھی، دین کے دوسرے معاملات کی طرح، بہت کچھ تجاوز ہوا ہے۔ بعض لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیتِ نبوت کو اپنے لیے اسوہ بنائے، بعض آپ کے تمدن اور طرزِ بودوباش کو اسوہ قرار دیتے اور بعض لوگ آپ کے مقصدِ رسالت کو اپنے لیے اسوہ ٹھہراتے ہیں۔

جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیتِ نبوت کو اسوہ قرار دیتے ہیں، ان کا نقطۂ نظر، درحقیقت' یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ انبیا کے تعلق کی نوعیت کوئی ناقابلِ حصول شے نہیں۔ یہ تعلق کوئی بھی آدمی استوار کر سکتا ہے۔ مثلاً، ان کے نزدیک، اللہ تعالیٰ سے مکالمہ، فرشتوں سے ملاقات، اور غیب کی خبریں

جان لینا اب بھی ہر شخص کے لیے ممکن ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو، چونکہ، قرآن مجید نے اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے، للٰذا، اس سے یہ نتیجہ آپ سے آپ نکل آتا ہے کہ آپ کو حاصل یہ خصوصیات بھی قابلِ حصول ہونی چاہئیں۔

ان کے نزدیک، اس کی شرط یہ ہے کہ آدمی عبادت و ریاضت کے ذریعے سے اپنا نفس الہام و القا، فرشتوں سے ملاقات اور مکالمۂ الٰہی کے قابل بنا لے۔ بڑے بڑے صوفیہ، مثلاً ابنِ عربی، غزالی، ابوطالب مکی، مجدد الف ثانی، شاہ اسمٰعیل شہید بڑی صراحت کے ساتھ یہ نقطۂ نظر بیان کرتے ہیں اور اپنے بارے میں بھی مدعی ہیں کہ انھیں یہ خصائص حاصل ہیں۔ تصوف کی کتابوں، مثلاً قوت القلوب، المنقذ من الضلال، مکتوبات (مصنفہ مجدد الف ثانی) اور عبقات میں اس کی تفصیل پڑھی جا سکتی ہے۔ عقیدۂ ختمِ نبوت کی تشریح بھی یہ طبقہ ایک خاص طرح سے کرتا ہے۔ ان کے نزدیک، کمالاتِ نبوت کا حصول تو اب بھی ممکن ہے، لیکن منصبِ نبوت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ اور ختمِ نبوت کا مطلب، درحقیقت، صرف یہ ہے کہ اب کسی نئی شریعت کے آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ شریعتِ اسلام ہی اب قیامت تک کے لیے اہلِ ایمان کے لیے الٰہی شریعت ہے، البتہ کمالاتِ نبوت کے حصول میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ جو شخص بھی اپنے آپ کو ان کے قابل بنا لے گا، اسے یہ حاصل ہو جائیں گے۔ چنانچہ مجدد الفِ ثانی نے 'حکیم' اور شاہ اسمٰعیل شہید نے 'ولایتِ علیا' کے جو اوصاف بیان کیے ہیں، ان سے صوفیہ کے ان عقائد کی پوری تفصیل سامنے آجاتی ہے۔ صریح الفاظ میں لکھا ہے کہ یہ لوگ وہیں سے پاتے ہیں، جہاں سے انبیا پاتے ہیں اور یہ دنیا میں محض نظم قائم رکھنے کے لیے اپنے وقت کے پیغمبر کی اتباع کرتے ہیں۔ لیکن یہ سارے دعاوی قطعی طور پر بے بنیاد ہیں۔ اس لیے کہ نہ صرف یہ کہ قرآن و سنت ان کی تائید نہیں کرتے، بلکہ جو کچھ قرآن و سنت میں دین بیان ہوا ہے وہ ان مزعومات کی بالکلیہ تردید کر دیتا ہے۔ ہمارے صوفیہ کی یہی غلطی ہے جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، اس زمانے میں ایک شخص نے ان دعاوی ہی پر اکتفا نہیں کی، بلکہ ظلی نبوت کا دعویٰ بھی کر ڈالا۔ اس نے محسوس کیا کہ ان ساری چیزوں (کمالاتِ نبوت) کا حصول ممکن ہے، تو پھر دعویٔ نبوت میں کیا حرج ہے، جبکہ میں کوئی نئی شریعت نہیں دے رہا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنِ مجید کے ختمِ نبوت کے اعلان کی خود تشریح کر دی ہے۔ اس تشریح کے بعد صوفیہ کا تعمیر کردہ یہ محل اپنی بنیاد ہی سے محروم ہو جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا:

ان اباھریرہ قال: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ	"ابوہریرہ کہتے ہیں: میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ نبوت

وسلم يقول، لم يبق من النبوة الا المبشرات. قالوا: وما المبشرات؟ قال: الرؤيا الصالحة۔ (بخاری، کتاب التعبیر، باب المبشرات)

اور اس کے علاوہ میں سے سوائے بشارت کے کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ صحابہ نے پوچھا: بشارتوں سے کیا مراد ہے۔ آپ نے جواب میں وضاحت کی: اچھے خواب۔"

دوسری طرف قرآنِ مجید میں یہ بات بڑی صراحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے کہ نبوت کوئی کسب سے حاصل کرنے کی چیز نہیں ہے کہ آدمی کچھ اعمال و وظائف انجام دے، کچھ خوبیاں اپنے اندر پیدا کرے اور ان کے نتیجے میں اسے حاصل کر لے۔ یہ سرتاسر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہوتا ہے کہ وہ کسی شخص کو منصبِ نبوت کے لیے چن لیتا ہے۔ خود وہ شخص اس سے بالکل بے خبر ہوتا ہے۔ اس کی نبوت سے پہلے کی زندگی اس طرح کی کسی سعی سے بالکل خالی ہوتی ہے کہ اسے اس منصب کا خواہش مند اور اس کے لیے سعی و جہد کرنے والا سمجھا جائے اور یہ قیاس کیا جا سکے کہ یہ اس کی محنتوں اور مجاہدوں کے نتیجے میں اسے حاصل ہوا ہے۔ اس شخص کے لیے تو یہ ایک خبر ہوتی ہے کہ اسے منصبِ نبوت پر سرفراز کر دیا گیا ہے اور اسے اب کچھ فرائض اور ذمہ داریاں ادا کرنی ہیں، جو اس منصب کا تقاضا ہیں۔

اسی طرح بعض لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تمدن کو نمونہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رہنے، کھانے پینے، لباس اور بود و باش کی بھی، وہی دینی حیثیت ہے جو دوسرے دینی معاملات میں سنت کو حاصل ہے۔ ہمارے نزدیک، جس طرح حیثیتِ نبوت کو اسوہ بنانا غلط ہے، بالکل اسی طرح آپ کے تمدن کو اسوہ قرار دینا بھی غلط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی امت نے اپنے اجتماعی وجود میں بھی اسے یہ حیثیت کبھی نہیں دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد ایک خاص طریقے اور خاص سامانِ تعمیر سے بنائی گئی تھی۔ اس مثال کو کہیں بھی دینی حیثیت سے نہیں دہرایا گیا۔ اس زمانے میں جنگ بھی مخصوص ہتھیاروں سے لڑی جاتی تھی اور اسے کسی وقت بھی لازم نہیں سمجھا گیا کہ وہی ہتھیار استعمال کیے جائیں اور آج بھی امریکہ کی توپوں کا مقابلہ تیغ و سناں سے کیا جائے۔ ہمارے نزدیک، یہی معاملہ آپ کے لباس، طرزِ بود و باش اور طعام کا ہے۔

دنیا مختلف تہذیبوں، ثقافتوں، رسوم و رواج اور طور اطوار کا مجموعہ ہے۔ اس اختلاف اور رنگا رنگی کی وجہ جغرافی اور موسمی حالات کا تفاوت اور ضروریات کی بوقلمونی ہے۔ وہ دین جسے عالمگیر دین کی حیثیت حاصل ہو، اس طرح کے معاملات میں کسی ایسی تحدید و تقیید کا علم بردار نہیں ہو سکتا، جو دین کو ایک خطے، ایک تہذیب اور ایک ثقافت میں مقید کر دینے کے مترادف ہو، درآں حالیکہ اس کے بالکل برعکس حقیقت

یہ ہے کہ اسلام تہذیب و تمدن میں تغیر و تبدل کی فطری رفتار پر بھی کوئی قدغن عائد نہیں کرتا۔

درحقیقت اس باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی اصل نوعیت سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ ان معاملات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ ہے کہ آپ نے ہمیشہ اپنے زمانے کے شرفا کا طریقہ ہی اختیار کیا ہے۔ چنانچہ مسلمان پر جو چیز لازم ہوتی ہے، وہ صرف یہ ہے کہ شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے اپنے وطن اور معاشرے کے شرفا کا طرز بود و باش ہی اختیار کرے۔

کچھ لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب رسالت کو اپنے لیے اسوہ قرار دے لیا ہے۔ ان کے نزدیک، وہ انقلاب جو دور نبوی علیہ السلام میں برپا ہوا، اس میں پیش آنے والے مراحل ہر اسلامی انقلابی جدوجہد کا ماخذ ہیں۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کار دعوت میں دعوت کا عرصہ، ہجرت کا مرحلہ، اقتدار کا حصول اور غلبے کی تکمیل کے جو مراحل پیش آئے تھے، وہی اب ہر اس دعوت کے مراحل ہیں جو اسی مقصد کو سامنے رکھ کر منظم کی گئی ہو۔ دراں حالیکہ اس بارے میں نبی اور رسول کے فرق کو سمجھنا بہت ضروری ہے[1]۔ اصل صورت یہ ہے کہ نبی کے مخاطبین کے ساتھ ایک اور رسول کے مخاطبین کے ساتھ دوسرے طریقے سے معاملہ کیا جاتا ہے۔ نبی محض دعوت دیتا ہے اور اس کی دعوت کی کامیابی، یعنی دعوت کا معاشرے میں عمومی غلبہ یا ناکامی، دونوں میں سے کوئی بھی صورت پیش آسکتی ہے۔ یہاں تک کہ قوم اپنے نبی کی جان بھی لے سکتی ہے، جبکہ رسول زمین پر اللہ کی عدالت بن کر آتا ہے۔ اس کی قوم، اگر اس کی دعوت قبول کر لے، تو دنیا و آخرت دونوں کی رسوائی سے بچ جاتی ہے اور اگر قبول نہ کرے، تو تباہ کر دی جاتی ہے۔ یہی اصول ہے، جسے قرآن مجید نے 'لأغلبن انا و رسلی'، 'لازم ہے کہ میں اور میرے رسول غالب آئیں' کے الفاظ میں واضح کیا ہے۔ یہ غلبہ بھی، لازماً اقتدار کی صورت میں حاصل نہیں ہوتا۔ اس کی ایک صورت تو یہ ہوئی ہے کہ مخاطب قوم کے اقل قلیل کے سوا من حیث المجموع پوری قوم نے رسول کا انکار کر دیا۔ چنانچہ اتمام حجت کے بعد، جس کا فیصلہ خود اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، رسول اور اس کے ساتھیوں کے سوا پوری قوم طوفان، آندھی، سیلاب جیسی آفات سے نیست و نابود کر دی گئی ہے۔

دوسری صورت میں، اگر دعوت کو فروغ حاصل ہوا ہے تو اسے ہر رسول کی تاریخ میں مختلف مراحل پیش آئے ہیں۔ اس تفاوت کا اندازہ حضرت موسیٰ، حضرت یونس علیہما السلام، اور حضرت محمد

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے 'نبوت اور رسالت' جاوید احمد غامدی۔

صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کے مطالعے سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ ہر رسول کو جو بھی احوال پیش آتے ہیں، یہ کسی متعین لائحہ عمل کے مراحل نہیں ہوتے۔ وہ ہر نیا اقدام سر تا سر اللہ کے فیصلوں اور رہنمائی میں کرتے ہیں۔ مثلاً، ہم دیکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مکے میں کوئی غیر معمولی کامیابی حاصل نہیں ہوئی، لیکن وہ اس وقت تک انتہائی نامساعد حالات کے باوجود مکہ ہی میں دعوت کا کام کرتے رہے، جب تک انھیں ہجرت کی اجازت نہیں ملی۔ آپ کی دعوت مدینے میں پہنچتی ہے اور مکے کے بالکل برعکس، مختصر سے عرصے میں اوس و خزرج کے لیڈروں سمیت، یثرب اس دعوت کے آگے سرفگندہ ہو جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینے میں ایک حکمران کی حیثیت سے آنے کی دعوت ملتی ہے۔ پھر بدر میں اللہ تعالیٰ کی غیر معمولی مدد نازل ہوتی ہے اور قریش کے قریباً تمام سردار مارے جاتے ہیں۔ یہ ایک الٰہی منصوبہ تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعے سے کیا جا سکتا ہے کہ ابولہب جنگ میں شریک نہیں ہوا، لیکن یہ غیر حاضری بھی اسے موت سے نہ بچا سکی۔ اسے عدسے کی بیماری نے آلیا اور قریش کے شکست خوردہ لشکر کی واپسی سے پہلے، انتہائی بے چارگی کی موت اس طرح مر گیا کہ اسے دفن کرنے کے لیے بھی کوئی تیار نہ تھا۔ قرآنِ مجید جنگِ بدر کو اس عذابِ الٰہی کی ایک قسط قرار دیتا ہے، جو رسولوں کے مکذبین پر نازل ہوتا رہا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں، یہ معاملہ، درحقیقت، 'یُعَذِّبْھُمُ اللّٰہُ بِاَیْدِیْکُمْ' (اللہ ان پر تمھارے ہاتھوں عذاب نازل کرے گا) کی عملی تعبیر تھا۔ یہاں تک کہ ۹ ہجری کے سال، حج اکبر کے موقع پر محرم کے آخر تک کی مہلت دے کر یہ اعلان کر دیا گیا کہ اس کے بعد کوئی مشرک زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ عذاب کی اس آخری قسط کا اعلان سورۂ توبہ میں کیا گیا۔ اسی وجہ سے کہ یہ عذاب کی سورہ ہے، اس پر 'بسم اللہ' نہیں لکھی جاتی، اس لیے کہ بسم اللہ کا کلمہ، فی الحقیقت، اللہ کی رحمت شاملِ حال کرنے کی دعا کا کلمہ ہے۔ غرض کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی قوم کے ساتھ گزرنے والے تمام مراحل اول تا آخر الٰہی منصوبہ تھے۔ اگر آپ کی دعوت مکہ میں وہی قبولیت پا لیتی، جو اسے مدینہ میں حاصل ہوئی تھی تو آپ کی دعوت و اقتدار کی تاریخ موجودہ تاریخ سے بالکل مختلف ہوتی۔ دوسرے رسولوں کے حالات کے مطالعے سے بھی یہی حقیقت سامنے آتی ہے۔ کہیں دعوت ہی کے مرحلے میں داستان تمام ہو گئی۔ کہیں ہجرت تو ہوئی، لیکن کوئی خلافت قائم نہ ہو سکی، اور کہیں پوری کی پوری قوم ایمان لے آئی، نہ ہجرت ہوئی اور نہ جہاد ہوا۔ اس تفصیل سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ کسی بھی داعی کے لیے رسالتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے مراحل کو اسوہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہمارے لیے اسوہ ہے، لیکن اس کا دائرہ، اصلاً، ہمارے

اخلاقی وجود تک محدود ہے۔ دین و شریعت کے دوسرے دائروں میں، جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں، آپ کا مقام ایک واجب الاتباع ہادی اور واجب الاتباع شارع کا ہے۔ وہاں ان کا کرنا، ان کا کہنا اور ان کا روکنا ہمارے لیے شریعت قرار پاتا ہے اور اخلاقی دائرے میں ان کی شخصیت ہمارے سامنے ایک آئیڈیل رکھتی ہے۔ یہ آئیڈیل حاصل کرنے کی سعی ہمیں اس بات کا مستحق بنا دیتی ہے کہ ہمیں خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا امتی قرار دیا جائے۔

تمہید میں ہم نے انسان کے اخلاقی وجود کے چار محرکات کا ذکر کیا ہے، ان کے حوالے سے آپ ایک غیر معمولی طور پر متوازن شخصیت کے مالک تھے۔ بنیادی ضروریات فراہم کرنے میں آپ غیر متزلزل اعتدال پر قائم رہے، خواہشات پر ہمیشہ پورا قابو رکھا، شہوات کے معاملے میں کبھی راہِ توازن سے نہ ہٹے، اور جذبات کے اظہار میں بھی انھیں اپنی شخصیت پر مکمل قدرت حاصل تھی۔ غرض انسان کے اخلاقی وجود کے چاروں محرک کس طرح انسانی شخصیت میں، فی الحقیقت، کارفرما ہونے چاہییں، یہ چیز سیرتِ اطہر کی صورت میں ہمارے سامنے پوری طرح متعین ہو جاتی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں حیاتِ دنیوی کے تمام دور دیکھے۔ مکے میں آپ ایک شہری کی حیثیت سے، چالیس سال ایک بیٹے، ایک شوہر، ایک باپ، ایک رشتے دار، ایک محلے دار اور ایک تاجر کی حیثیت سے غیر معمولی کردار کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ پھر آپ کو منصبِ رسالت پر فائز کر دیا جاتا ہے اور آپ ایک داعی کی حیثیت سے تیرہ سال کا عرصہ بسر کرتے ہیں اور داعیانِ حق کے لیے شاندار اسوہ قائم کرتے ہیں۔ انھی داعیانہ مساعی کے نتیجے میں آپ کو مدینے میں اقتدار حاصل ہو جاتا ہے اور ایک حکمران، ایک قاضی، ایک کمان دار، ایک مجاہد اور ایک سیاسی رہنما جیسی مختلف حیثیتیں بھی آپ کی ذات میں جمع ہو جاتی ہیں اور یہاں بھی آپ اسی اعلیٰ معیار پر قائم رہتے ہیں۔ اور ان سارے پہلوؤں کے پیچھے یہ عظیم حقیقت بھی پوری طرح کارفرما رہی کہ آپ خدا کے بندے تھے۔ چنانچہ آپ جس طرح خدا پر بھروسا رکھتے، جس طرح اس پر توکل کرتے اور جس طرح اس کی رضا کے طالب رہتے تھے، اس میں بھی خدا کے ساتھ تعلق کے حوالے سے آپ کا اسوہ ہمارے لیے بصیرت کا بہت کچھ سامان رکھتا ہے۔ یہ آپ کی اخلاقی عظمتیں تھیں اور آپ کی زندگی کا یہی پہلو ہے، جسے قرآنِ مجید نے اخلاقی وجود کے لیے اسوہ قرار دیا ہے اور جس کی پیروی ہر مسلمان کے لیے اخلاقی وجود کے تزکیے کی راہ کھول دیتی ہے۔

ہم نے اس باب کے آغاز میں یہ بیان کیا تھا کہ دین نے اخلاقی وجود کے تزکیے کے لیے دو جہتی طریقہ اختیار کیا ہے۔ اوپر کی سطور میں ہم نے ایک جہت کی توضیح کی ہے اور سعی کی ہے کہ اس سے متعلق

پائی جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ کر دیں۔ اگر محض اظہارِ مدعا مقصود ہو تو یہ جہت صرف چند الفاظ کی محتاج ہے کہ اخلاقی وجود کے تزکیے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ایک آئیڈیل ہے، لیکن غور کیجیے تو آپ دیکھیں گے کہ اپنے اثرات کے اعتبار سے یہ جہت اپنے اندر ایک جہانِ معنی رکھتی ہے۔ آئندہ سطور میں ہم دوسری جہت کی وضاحت کریں گے۔ اس میں قرآن و سنت یا شریعتِ اسلامی کا وہ پہلو زیرِ بحث آئے گا، جو اخلاقی وجود کے تزکیے سے متعلق ہے۔

انسان اپنے خارج سے اپنے اخلاقی وجود کے حوالے سے متعلق ہوتا ہے۔ ہم اس خارج کو بآسانی پانچ دائروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا دائرہ آدمی کا گھر ہے۔ دوسرا اس سے بڑا دائرہ آدمی کا محلہ ہے۔ پھر ایک دائرہ وہ حلقہ ہے، جہاں وہ اپنی معاشی جدوجہد کے حوالے سے متعلق ہوتا ہے۔ چوتھا دائرہ معاشرے کا دائرہ ہے، جس کے ایک فرد کی حیثیت سے یہ اپنی زندگی گزارتا ہے۔ اور پانچواں دائرہ ریاست کا دائرہ ہے، جس میں اسے شہری کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ ان میں سے ہر دائرہ اپنے اندر وہ عوامل رکھتا ہے، جو آدمی کے رویے پر اثر انداز ہوتے ہیں یا اسے خاص رویہ اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ مرد و زن کا باہمی ربط، معیشت کی جدوجہد، پاس پڑوس کی ذمہ داریاں، اعزہ و اقربا کے حقوق، شہریت کے فرائض اور ریاست کا بگاڑ، غرض کئی چیزیں سامنے آتی ہیں، جن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے آدمی مختلف طریقے اختیار کرتا ہے۔

اسلام کے نزدیک، انسانی سماج کی تعمیر تین اصولوں پر ہوئی ہے۔ یہ اصول اس معاملے میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ انھیں ہم انسانی سماج کی اساسات بھی قرار دے سکتے ہیں:

۱. وحدتِ آدم
۲. اشتراکِ رحم
۳. وحدتِ الٰہ

وحدتِ آدم سے مراد یہ ہے کہ آدم کا جوڑا اسی کی جنس سے پیدا کیا گیا ہے۔ عورت اور مرد شرفِ انسانیت میں برابر ہیں، یعنی انھیں یکساں صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں۔ عقل، شعور، معرفت اور مسئولیت کے معاملے میں ایک کو دوسرے پر کوئی امتیاز حاصل نہیں۔ فرق کی نوعیت وہی ہے، جو ایک مرد اور عورت میں فطرت نے خلقی طور پر رکھا ہے۔

اشتراکِ رحم کا مطلب یہ ہے کہ تمام نوعِ انسانی ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہے۔ اس میں قبیلوں، برادریوں اور قوموں کے اعتبار سے آج جو فرق پیدا ہو گیا ہے، یہ محض تعارف کا ذریعہ ہے۔ ایک انسان

ہونے کی حیثیت سے کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی مشرقی کو کسی مغربی پر کوئی فضیلت نہیں۔

وحدتِ الٰہ سے مراد یہ ہے کہ اس کائنات کا مالک، آقا، پروردگار، خالق اور حاکم ایک ہی ہستی ہے، وہی سب کا معبود ہے، باقی جو کچھ بھی ہے، اسے اس کی مخلوق کی حیثیت حاصل ہے۔ کوئی ذات امورِ کائنات میں اسباب سے ماورا تصرف کی اہلیت نہیں رکھتی اور نہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو اس معاملے میں اپنا شریک بنایا ہے۔

اس طرح اسلام ہر انسان کو یہ شعور بخشتا ہے کہ وہ ایک ہی معبود کا بندہ، ایک ہی نوع کا فرد اور ایک ہی باپ اور ایک ہی ماں کی اولاد ہے۔

اس بنیادی اصول کی وضاحت کے بعد، اب ہم ان دائروں سے متعلق شریعت کے احکام کا اجمالی ذکر کریں گے جن کی توضیح ہم نے، اس دوسری جہت کے حوالے سے، اوپر کی ہے۔

گھر

گھر ایک صالح تمدن میں بنیادی اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک گھر اس وقت وجود میں آتا ہے، جب کوئی مرد کسی عورت کو بیوی کی حیثیت سے اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ یہ، درحقیقت، ایک خاندان کے وجود میں لانے کا پہلا قدم ہے۔ یہ ایک غیر معمولی فیصلہ ہے۔ اس سے شہوات ایک دائرے میں محدود ہو جاتی ہیں اور اس طرح ایک صالح معاشرے کی تعمیر کے لیے ایک ضروری اکائی وجود میں آجاتی ہے۔ یہی پہلو ہے، جس کی حفاظت کے لیے قرآنِ مجید نے محرمات، یعنی ان عورتوں کی ایک جامع فہرست دی ہے، جنھیں بیوی نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ محرمات ہی کا تصور ہے، جو گھر کے اندر ماں باپ اور اولاد، بہنوں اور بھائیوں اور بعض دوسرے نسبی اور سسرالی رشتوں میں پاکیزہ تعلق کی اساس بنتا ہے۔ ہمارا دین اس معاملے میں اس قدر حساس ہے کہ وہ اس عورت کے حوالے سے بھی محرمات کی ایک نوع وجود میں لاتا ہے، جس کا دودھ پی کر ایک بچہ پلا بڑھا ہو۔ اس طرح وہ پاکیزہ ماحول وجود میں آتا ہے، جو اسلامی گھر اور اسلامی معاشرے کی شان ہے۔

گھر ہی کے حوالے سے ایک دوسرا اہم نکتہ گھر کے نظم سے متعلق ہے۔ خاندان معاشرے کا ایک بنیادی یونٹ ہے۔ چنانچہ اس کا نظم، اگر اختلال کا شکار ہو، تو معاشرے کا نظم اختلال سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ نظم کی یہ اہمیت ریاست میں نظام کی ضرورت سے بآسانی سمجھی جا سکتی ہے۔ ہر معاشرہ اپنے وجود کی خارجی دشمنوں اور داخلی انتشار سے حفاظت ہی کے لیے ایک ریاست کی صورت اختیار کرتا ہے اور

اپنے میں سے ایک فرد کو اپنا حکمران مان لیتا اور اس کے ساتھ اس کے احکام کی اطاعت اور فرماں برداری کا عہد باندھتا ہے، حالانکہ یہ فرد اس کے علاوہ کوئی خصوصیت نہیں رکھتا کہ اسے معاشرے نے یہ حیثیت دی ہے۔ جس ضرورت کے تحت معاشرہ طوقِ اطاعت پہننے پر مجبور ہوا ہے، وہی ضرورت گھر میں بھی یہ تقاضا کرتی ہے کہ کوئی فرد گھر کے سربراہ کی حیثیت سے معاملات چلائے۔ جس طرح معاشرے میں سربراہی کے لیے کسی فرد کے انتخاب کی بنیاد اُس کی اس منصب کے لیے موزونیت ہے، اسی طرح گھر میں سربراہِ خاندان کی حیثیت، ہمارے دین نے مرد کو اسی وجہ سے دی ہے۔ اور جہاں مرد کو خصوصی مقام دیا ہے، وہاں اس پر کچھ ذمہ داریاں بھی عائد کی ہیں۔ اس پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ وہ اپنے گھر کا محافظ اور کفیل بنے اور اہلِ خانہ کو روزِ آخر عذاب سے بچانے کے لیے سب سے زیادہ فکرمند ہو۔ قرآنِ مجید میں پہلی حقیقت کو 'اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ'، 'مرد عورتوں پر نگران ہیں' اور دوسری حقیقت کو 'قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا': 'اپنی ذات اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ' کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اہلِ جنت کے ایک قول سے بھی، جو قرآنِ مجید میں بیان ہوا ہے، اہلِ ایمان کے کردار کے اس دوسرے پہلو پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ سورۂ طور میں ہے: 'اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ': 'اس سے پہلے ہم اپنے گھر والوں کے بارے میں فکرمند رہتے تھے' (۵۲: ۲۶)۔

دوسری طرف بیویوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنے شوہروں کی فرماں بردار بن کر رہیں، ان کے رازوں کی امین بنیں اور سرکشی اور سرتابی کا رویہ اختیار نہ کریں، تاکہ خاندان کی وحدت مستحکم ہو اور وہ تخلیقی عمل جو بچے کو جنم دینے اور اس کی پرورش و تربیت تک پھیلا ہوا ہے، ایک محفوظ و مسنون ماحول میں ہو۔ جہاں شوہر سربراہِ خاندان کی حیثیت رکھتا ہے، اسی طرح عورت کو گھر کی ملکہ کا مقام حاصل ہے۔ عورت کا قنوت اور مرد کی قوامیت گھر کی اس اکائی کی روح ہیں۔ اس اکائی کا نظام اگر صحیح خطوط پر استوار ہو تو معاشرہ اور اس کے بعد تمام عالم کا نظام صحیح نہج پر آجاتا ہے۔

خاندان کی اس بنیادی اکائی کا آغاز ایک میاں اور ایک بیوی کے سنجوگ سے ہوتا ہے۔ پھر بچوں کی آمد اس گھر کی ہیئت میں بنیادی تبدیلی لاتی ہے۔ اب میاں بیوی محض زوجین نہیں رہے، بلکہ ماں اور باپ بھی بن گئے ہیں۔ باپ کی حیثیت سے مرد کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو جاتا اور ماں کی حیثیت سے بیوی پر بھی کچھ زائد ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں۔

بچوں کی پرورش، ان کی تربیت اور ان کی تعلیم اور پھر ان کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے مراحل آتے اور گزر جاتے ہیں۔ اولاد بڑی ہو جاتی ہے۔ والدین بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ ایک دور

بچوں پر ایسا گزرا تھا، جس میں انھیں والدہ اور والد کی شفقتوں اور محبتوں کی ضرورت تھی اور اب والدین اس دور میں داخل ہو گئے ہیں، جہاں انھیں بچوں کی طرف سے نگہداشت، محبت اور خدمت کی ضرورت ہے۔ اگر والدین میں بچوں کو پالنے کا جذبہ ختم ہو جائے، تو ان کی زندگی ختم ہو سکتی ہے، اسی طرح اگر بچے بوڑھے والدین کی ذمہ داری اٹھانے سے انکار کر دیں، تو ان کے لیے در بدر کی ٹھوکریں اور بے چارگی کی موت کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ خاندان کی یہ بنیادی اکائی یہ ذمہ داری بھی ادا کرتی ہے۔

قرآنِ مجید نے اس معاملے میں اولاد کو خصوصی حکم دیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ
وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۔ اِمَّا يَبْلُغَنَّ
عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ كِلٰهُمَا
فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا
وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا۔
وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ
مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ
ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ
صَغِيْرًا۔ (بنی اسرائیل ۱۷: ۲۳-۲۴)

"اللہ نے حتمی طور پر کہہ دیا ہے کہ اللہ کے سوا
کسی کی پرستش نہ کرو۔ والدین کے ساتھ حسن
سلوک کرو۔ اگر ان میں سے ایک یا دونوں،
بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں، تو انھیں اف
تک نہ کرو اور نہ جھڑکی دو اور اچھے طریقے
سے بات کرو۔ شفقت کے بازو ان کے
لیے پھیلائے رکھو اور دعا کرو کہ اے رب،
ان پر رحمت فرما، اسی طرح جیسے انھوں نے
مجھے بچپن میں پالا تھا۔"

قرآنِ مجید میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کا ذکر، بالعموم، توحید اور عبادت میں شرک سے اجتناب کے مضمون کے بعد ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے حق کے بعد، دین میں سب سے بڑا حق والدین کا ہے۔

قرآنِ مجید کے وہ ارشادات بھی گھر کے دائرے ہی سے متعلق ہیں، جن میں رشتہ داروں اور عزیزوں سے حسن معاملہ کی تعلیم دی گئی ہے۔ صلۂ رحمی کی تعبیر، وہ سارے تقاضے کما حقہ واضح کر دیتی ہے، جو رشتے داروں کے حقوق سے متعلق دین میں ہم سے مطلوب ہیں۔

گھر کے ماحول کی پاکیزگی اور عفت مآبی کی حفاظت کے لیے عزیزوں، رشتہ داروں اور دوست احباب کے آنے جانے سے متعلق بھی قرآنِ مجید نے تفصیلی احکام دیے ہیں۔ مثلاً، یہ حکم دیا ہے کہ کسی دوسرے کے گھر میں بغیر اجازت کے داخل نہ ہوا جائے اور بطورِ خاص یہ ہدایت دی ہے کہ اگر اجازت نہ ملے، تو بغیر دل کی تنگی کے واپس چلے جانا چاہیے۔ یہ ہدایت اگر ملحوظ رکھی جائے، تو وہ بہت سی شکایتیں

اور تلخیاں پیدا ہی نہ ہوں، جو اس طرح کے معاملات میں ہمارے گھروں میں عام پیش آتی رہتی ہیں۔ اجازت مل جانے کے بعد گھر میں داخل ہونے کے آداب بتلائے ہیں۔ مردوں اور عورتوں سے کہا ہے کہ وہ غضِ بصر سے کام لیں۔ یعنی خود کو بدنگاہی سے بچائیں۔ 'غضِ بصر' سے مراد نگاہوں کو جھکا کر رکھنا ہے اور ان الفاظ سے قرآن مجید نے شرم و حیا کی پاسداری کو تعبیر کیا ہے۔ اصلاً مقصود یہ ہے کہ عورت مرد کو اور مرد عورت کو بے باکی اور بے حیائی سے نہ دیکھے۔ باہم گفتگو کرتے ہوئے، جو نظر پڑ جاتی ہے، اس سے ہی روک دینا، یہاں مقصود نہیں ہے۔ پھر عورتوں اور مردوں سے کہا ہے کہ وہ اپنے لباس درست رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ اور بطورِ خاص عورتوں کو یہ ہدایت کی ہے کہ وہ اپنی زینتوں کا اظہار نہ کریں یعنی اپنی سروں کی اوڑھنیاں سینوں پر بھی ڈال کر رکھیں۔

محلہ

گھر کے بعد، ہمسایوں یعنی محلے کا دائرہ ہے۔ اس باب میں بھی دین نے خصوصی ہدایات دی ہیں۔ قرآن مجید نے ہمسائگی کی تمام صورتیں بیان کر کے، ان کے حقوق واضح کیے ہیں۔ دین کی تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پڑوسی مقدم تر ہے، جو عزیز رشتہ دار بھی ہے اور دوسرے درجے پر وہ پڑوسی آتے ہیں، جو عزیز رشتہ دار نہیں ہیں۔ ہمسایہ صرف وہی نہیں، جس کا گھر ہمارے گھر کے قریب ہے، بلکہ وہ بھی ہمسایہ ہے، جس کے ساتھ ہم منڈی بازار میں یا دفتر کارخانے میں مل بیٹھ کر کام کرتے یا سفر وغیرہ میں کچھ عرصے کے لیے ہم نشست ہوتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: مجھے ہمسایے کے حقوق کے بارے میں بہت تلقین کی گئی، یہاں تک کہ مجھے گمان ہوا کہ اسے وراثت میں شریک کر دیا جائے گا۔ ایک عورت کے بارے میں آپ سے سوال کیا گیا کہ وہ نفل نماز کا بہت اہتمام رکھتی ہے، لیکن اس کے پڑوسی اس سے بہت تنگ ہیں۔ آپ نے فرمایا: جہنم میں جائے گی۔

کسبِ معاش

تیسرا دائرہ کسبِ معاش کا دائرہ ہے۔ دین نے اس میں وہ تمام چیزیں ممنوع قرار دے دی ہیں، جو اپنے اندر کوئی فساد رکھتی ہیں۔ شریعت کی حلال و حرام کی ان تمام پابندیوں کی بنیاد اخلاق و عقیدے کی صلاح و فساد پر رکھی گئی ہے۔ پھر جائز چیزوں میں بھی اسراف و تبذیر کو ممنوع ٹھہرا دیا ہے۔ اس لیے کہ یہ چیز سوسائٹی کی اقدار برباد کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ اس کے نتیجے میں روپے اور دولت

کو سوسائٹی میں عزت اور قدر و منزلت کے تعین میں بنیادی محرک کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ہر اس چیز کی تجارت بھی ممنوع ہے جس کا کھانا اور پینا ممنوع ہے، تاکہ معاشرے میں خبائث کے فروغ کی ہر راہ بند کر دی جائے۔ عام ضرورت کی چیزیں اس غرض سے ذخیرہ نہیں کی جا سکتیں کہ انھیں روک کر زیادہ سے زیادہ منافع کمایا جا سکے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص عام ضرورت کی چیز چالیس دن تک روکے رکھے اور اس کے بعد اسے خیرات بھی کر دے تو یہ خیرات قبول نہیں کی جائے گی۔ "اکل اموال بالباطل" کا ہر طریقہ ناجائز ہے۔ اس کی ایک لمبی فہرست ہے۔ غبن، خیانت، چوری، دھوکا، ملاوٹ وغیرہ قسم کے تمام اعمال اسی ضمن میں گناہ قرار دیے گئے ہیں۔ دھوکے اور نقصان کے امکانات کو روکنے کے لیے بھی خاص ہدایات فرمائی ہیں۔ مثلاً، یہ کہ عیب بتا کر چیز بیچی جائے، بڑھا چڑھا کر خوبیاں بیان نہ کی جائیں۔ منڈی کے رجحان میں رکاوٹ نہ ڈالی جائے اور منڈی میں مال پہنچنے سے پہلے بھاؤ تاؤ نہ کیا جائے وغیرہ اسی سلسلے کی ہدایات ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک شخص بازار میں بہت ہی سستے داموں کھجور بیچ رہا تھا۔ حضرت عمر کو معلوم ہوا تو بازار پہنچے۔ اس شخص نے بتایا کہ مجھے کھجوروں کا ایک ٹوکرا تحفے میں ملا تھا۔ میں نے حسب ضرورت رکھ لیں اور باقی بیچ رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا: بازار کے بھاؤ بیچو، ورنہ اٹھا کر گھر لے جاؤ۔ مقصود یہ تھا کہ مارکیٹ میں جو لوگ کاروباری طریقے سے کھجور حاصل کر کے بیچ رہے ہیں، انھیں نقصان نہ ہو۔ گداگری ممنوع قرار دے دی گئی۔ اس لیے کہ یہ سفلہ پن ہے اور شرف انسانی کے خلاف ہے۔ دل کی وسعت اور عالی ظرفی کے پیش نظر ان چیزوں کی بیع و شرا پسند نہیں کی گئی، جو ویسے ہی اٹھا کر دے دینی چاہییں۔ عام حالات میں ناپسندیدہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے پر اعتماد نہ کریں اور قرض دینے کے لیے مالی ضمانت یعنی رہن کا مطالبہ کریں۔ مالی معاملات کرتے وقت تحریر کر لینے اور گواہ ٹھہرانے کی بطور خاص ہدایت کی ہے، تاکہ جھگڑے اور نقصان سے بچا جا سکے۔ نماز اور بطور خاص جمعے کی نماز کے وقت خرید و فروخت ممنوع قرار دے دی گئی ہے، اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاوا آ جائے، اس کے بعد دنیا کے دھندوں میں مشغول رہنا، کس طرح درست ہو سکتا ہے۔

معاشرہ

چوتھا دائرہ انسان کا اپنے معاشرے سے تعلق کا دائرہ ہے۔ ہر مسلمان اپنے ماحول اور اپنے معاشرے میں اپنی حیثیت کے مطابق اصلاح کا ذمہ دار ہے۔ ایک انسان کا قریبی ماحول ہے، جس میں اسے کچھ لوگوں پر تفوق ہوتا ہے اور اس کے لیے ممکن ہوتا ہے کہ وہ برائی کے روکنے کے لیے عملی اقدام کرے۔

باپ کے مقام پر، شوہر کی حیثیت میں، ملک و افسر کے منصب پر اور حکمرانی کی مسند پر، غرض کسی شخص کو جو کچھ اختیار حاصل ہے، اسے چاہیے کہ وہ اپنی حدود میں رہتے ہوئے برائی کے خاتمے کی سعی کرے، لیکن جہاں اسے یہ حیثیت حاصل نہیں، وہاں اس کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ نصیحت اور خیر خواہی کی بات کرے اور اس سے آگے کوئی قدم نہ اٹھائے۔ یہاں یہ بات واضح رہے کہ معاشرے کی سطح پر اصلاح و انذار کی اصل ذمہ داری علما پر عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ کوئی عالم دین اگر اپنا یہ فرض پورا کر رہا ہو تو عام آدمی کے لیے ضروری ہے کہ جس قدر بھی اس کے لیے ممکن ہو اس کے ساتھ تعاون کرے۔

ریاست

انسان کے معاشرتی وجود ہی کے حوالے سے نصیحت فرمائی کہ مسلمان بھیڑ بکریوں کی طرح منتشر بھیڑ کی صورت میں نہ رہیں۔ وہ اگر کسی ایسے ملک میں ہیں، جہاں غیر مسلموں کو اقتدار حاصل ہے، تب بھی ان کی اپنی ایک تنظیم ہونی چاہیے، جو ان کے اجتماعی وجود کی نمائندہ ہو اور ان کے سیاسی مفادات کی حفاظت کرے۔ اور اگر وہ کسی ایسے دیار میں ہوں، جہاں وہ اپنی حکومت بنا سکتے ہوں، تو وہ اپنی ریاست تشکیل دیں، یعنی اپنے اندر باقاعدہ حکومت قائم کریں۔ التزام جماعت (اپنی ریاست کے ساتھ وابستگی) کا حکم ہر اس مسلمان کے لیے ہے، جو کسی اسلامی ریاست کا شہری ہے۔ چنانچہ اس حکم کی پیروی کرتے ہوئے مسلمان ہمیشہ اپنی ریاست کا وفادار اور خیر خواہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے حکمرانوں کا مطیع اور قانون پسند شہری ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ تفرقے اور اختلال کی ہر نوعیت، ہمارے دین میں غیر مطلوب ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص نظم اجتماعی سے بالشت برابر بھی انحراف کرے گا، اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔ اس طرح ہمارے دین نے ریاست کے ساتھ وفاداری، اطاعت امیر اور قانون پسندی کو ایک نئی حیثیت دے دی ہے۔ دوسروں کے لیے، جو چیز محض قانون کا احترام ہے، ایک مسلمان کے لیے وہی چیز دین و ایمان کا تقاضا ہے۔

حکمران اور شہری کے باہمی تعلق کی وہ اساس جس کا ذکر ہم نے اوپر کی سطور میں کیا ہے، معمول کے حالات کے لیے ہے۔ لیکن، جب حکمران بگڑ جائیں تو ان کی اصلاح کی ذمہ داری شہریوں پر عائد ہو جاتی ہے۔ ان پر لازم ہے کہ وہ ہر حال میں کلمۂ حق کہیں اور اس سلسلے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت اور کسی ظالم کا جور انھیں اس سے روکنے میں کامیاب نہ ہو۔ ظاہر ہے، ہر آدمی کے لیے اس جدوجہد کے لیے یکساں مؤثر مواقع نہیں ہوتے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ بھرپور تعاون کرے جو

آگے بڑھ کر اصلاحِ احوال کے لیے کوشاں ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں، ایک بدو نے جس طرح حضرت عمر کا قمیص کے کپڑے پر احتساب کر ڈالا تھا، یہی جذبہ حکمرانوں کی اصلاح کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ضروری ہے۔

ریاست کے حوالے سے تیسری ذمہ داری، اسلامی ریاست کے دفاع اور اس کے وجود کے دینی مقاصد کے لیے جہاد و قتال کا فریضہ ہے۔ جونہی ریاست اپنے دفاع کے لیے، یا دنیا سے غیر الٰہی نظاموں کے خاتمے کے لیے جہاد کا اعلان کرے، مسلمانوں کے لیے اپنے جان و مال کے ساتھ اس میں حصہ ڈالنا ضروری ہو جاتا ہے۔

اخلاقی وجود کے تزکیے کے لیے، یہ طریقہ کار ہے جو دین نے اختیار کیا ہے۔ ایک طرف مسلمانوں کے سامنے ایک ایسی شخصیت ایک اعلیٰ اور کامل نمونے کی حیثیت سے رکھ دی ہے، جس کے بارے میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا خراجِ تحسین یہ ہے کہ: 'كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰن' 'آپ کے اخلاق عینِ قرآن تھے'؛ اور جو خود قرآنِ مجید کے الفاظ میں: 'اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ' 'لاریب، تم بڑے اعلیٰ اخلاق پر قائم ہو' کا مصداق تھی۔ اور دوسری طرف، معاشرے کی ان ساری جہتوں کے حوالے سے تفصیلی احکامات دیے ہیں، جہاں انسان کا اخلاقی وجود روبہ عمل ہوتا ہے۔ اس طرح انسان کے اس پہلو کی اصلاح اور تزکیے کا بھی غیر معمولی اہتمام کر دیا ہے، جسے انسانی سماج، معاشرے اور قوموں کی تعمیر میں غیر معمولی حیثیت حاصل ہے۔

اطلاع

شعبہ اصلاح و دعوت' المورد کے ناظم' ڈاکٹر محمد فاروق خان نے' پاکستان ٹیلی ویژن پر "خود آگاہی" کے زیرِ عنوان' فرد اور معاشرے کے روحانی امراض کے بارے میں' دین اسلام اور علم نفسیات کی روشنی میں' لیکچرز کا سلسلہ شروع کیا ہے۔

ان کے یہ لیکچرز صبح کی نشریات میں' ہر بدھ کو سنے جا سکتے ہیں۔

شعبہ اصلاح و دعوت

المورد

تبصرۂ کتب

اصف افتخار

"بلاسود عوامی بینکاری"

مصنف: سعید الحسن

ضخامت: ۴۸ صفحات

قیمت: ۱۰ روپے

ناشر: سعید الحسن، سیکٹر ۸/۴، جی، ٹی اینڈ ٹی کالونی، زیرو پوائنٹ، کوارٹر ۹/۲۔ سی، اسلام آباد۔

فاضل مصنف حکومت پاکستان کے اسسٹنٹ چیف اکاؤنٹس آفیسر کے عہدے سے سبک دوش ہوتے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے "بلاسود عوامی بینک" کے قیام کے لیے یہ منصوبہ تجویز کیا ہے کہ دو، دو ہزار روپے کے کئی اکاؤنٹ کھولے جائیں، اور ان سے جمع ہونے والے سرمایے سے، دو طرز کے بینک قائم کیے جائیں:

۱۔ کمرشل بینک: اس کے لیے کھاتہ داروں کی طرف سے جمع شدہ سرمایہ (PAID UP CAPITAL) کی کم ازکم مقدار تیس کروڑ ہونی چاہیے، جو اس کو چلانے کے لیے ضروری ہے۔

۲۔ انوسٹمنٹ بینک: اس قسم کے بینک کے لیے، کم ازکم دس کروڑ کی بنیادی سرمایہ کاری ضروری ہے۔

اس سے قطع نظر کہ اتنی بڑی رقم اس طریقے سے جمع ہو گی یا نہیں، مسئلہ یہ ہے کہ یہ بینک کس طریق کار پر چلائے جائیں گے، کیونکہ بینکاری حفاظت، انتقالِ زر ہی کا نام نہیں ہے، بلکہ اداراتی سطح پر فراہمی قرض (INSTITUTIONAL CREDIT CREATION) کا نام ہے، جس کی اصل الاساس ربٰو ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ بینک اس قرضے کی فراہمی کے لیے ربٰو کی کون سی متبادل اساس، کو بروئے کار لائیں گے، مگر اس مسئلے پر اس کتاب میں خاطر خواہ روشنی ڈالی گئی، جب کہ موجودہ معیشت میں اسے ایک بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔

منصوبہ جاتی قرض (PROJECT LOANS)[1] تو خیر مضاربت یا مشارکت کے اصول پر دیے جا سکتے ہیں، اور موجودہ بینک بھی اس کی پوری اہلیت رکھتے ہیں۔ اس منصوبے کو بروئے کار لانے کے لیے کسی نئے بینکاری نظام کی ضرورت نہیں ہے۔ اصل مشکل گردان قرضوں (WORKING CAPITAL LOANS)[2] کی ہے۔ اس ضمن میں، ہمارے بینکوں نے 'کتاب الحیل' کھول رکھی ہے، اور شریعت سے کھیل کی ایک زوردار تاریخ لکھی جا رہی ہے، جس پر شیطان بھی انگشت بدنداں ہے۔ چنانچہ برطانوی رسالے 'اکانومسٹ' کا یہ تبصرہ بے جا نہیں کہ 'اسلامی بینکاری' اصل میں اسلامی دھوکا (ISLAMIC FUDGE) ہے۔

ہمارے نزدیک، فاضل مصنف نے ایک اہم سوال سے تعرض کیا کہ "بلاسود عوامی بینک" میں اداراتی سطح پر قرضے کا لین دین کس اصول پر ہوگا۔ اس کے لیے وہ کیا طریقہ کار اختیار کریں گے، اور سود کی جگہ وہ کس چیز کو استعمال میں لائیں گے۔ اگر وہ اس معاملے میں، اسی راہ کے راہی ہیں جس پر ان دنوں، عام بینک چل رہے ہیں، تو یہ وہی فریب ہے جس میں شاید سادہ لوح مسلمانوں کو تو مبتلا کیا جا سکتا ہے، لیکن اللہ اور دین کی راہ میں کوئی پیش رفت نہیں ہے۔ اس لیے بے جا نہ ہوگا، اگر ہم فاضل مصنف سے یہ درخواست کریں کہ سود کا اگر کوئی متبادل ان کے پیش نظر ہے تو وہ ہمیں اس سے مطلع فرمائیں اور یہ کہ وہ کس اساس پر اس نظام کو چلانا چاہتے ہیں؟

اس کتاب کی طباعت کا معیار مناسب ہے۔ سفید کاغذ پر طبع شدہ یہ کتاب، اپنے اندر بہت سی الجھنوں کو لیے اسی کشمکش کی تصویر پیش کرتی ہے، جس میں مسلمانان پاکستان پچھلی نصف صدی سے مبتلا ہیں۔ اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ، آمین۔

---

[1] منصوبہ جاتی قرض سے مراد وہ قرضہ ہے جو کسی منصوبہ کو بروئے کار لانے کے لیے حاصل کیا جاتا ہے مثلاً کوئی صنعت شروع کرنے کے لیے

[2] گردان قرضے کاروبار کی روزمرہ ضروریات کے لیے حاصل کیے جاتے ہیں۔ ایسے قرضے پر سود کی شرح ۴۵ پیسے فی ہزار روپے یومیہ ہوتی ہے۔

مکاتیب

طالب محسن

• فرشتوں کی ذمہ داریاں
• عورتوں کا بال کٹوانا

محترمی و مکرمی

السلام علیکم

فرشتوں کے معاملے میں، یہ بات تو قرآنِ مجید سے پوری طرح واضح ہے کہ انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین ذمہ داریاں دی جاتی ہیں۔ اس چیز کے ماننے میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں کہ کچھ ذمہ داریاں مستقل نوعیت کی ہوں۔ جہاں تک حضرت میکائیل علیہ السلام کا تعلق ہے کہ ان کی مستقل ذمہ داری کیا ہے تو اس کا ذکر قرآنِ مجید میں موجود نہیں۔ احادیث میں بھی، میرے علم کی حد تک، حضور کے قول کی حیثیت سے اس کا ذکر نہیں ہوا۔ البتہ، یہود کے اس تصور کی حیثیت سے اس کا ذکر ضرور ہوا ہے کہ ان کے نزدیک، حضرت جبرئیل علیہ السلام تو ہمیشہ ان کے لیے جنگ و جدال اور عذاب کی مصیبتیں ہی آسمان سے لائے، جبکہ حضرت میکائیل رحمت، خوش حالی اور بارش کی نوید لاتے رہے۔

فرشتے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بعض خاص ذمہ داریوں پر مامور ہیں، یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ البتہ، صوفیہ اس حقیقت سے جو نتیجہ نکالتے ہیں، وہ کسی طرح بھی درست نہیں۔ فرشتے محض اللہ تعالیٰ کی مرضی اور احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔ اور ان کے فرائض ان کی اس صلاحیت کے مطابق ہیں، جو انھیں اللہ تعالیٰ نے عنایت کی ہے۔ اور ہم اسے صرف اس لیے مان رہے ہیں کہ اس کی خبر خود اللہ تعالیٰ نے ہمیں دی ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں یہ خبر دے دیتے کہ میں فرشتوں کے علاوہ اپنے برگزیدہ بندوں کو بھی نظامِ کائنات میں بعض ذمہ داریاں دے دیتا ہوں، تو ہمیں اس کے ماننے میں کوئی تردد نہ ہوتا، خواہ اس کی صورت وہی کیوں نہ ہوتی جو اہلِ تصوف بیان کرتے ہیں۔

صورتِ حال اس کے برعکس یہ ہے کہ قرآنِ مجید قریش کے اسی طرح کے مزعومات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ محض نام ہیں جو ان لوگوں نے رکھ لیے ہیں، اور ان کے پاس ان

منزعومات کے حق میں اللہ کی طرف سے کوئی برہان یا دلیل نہیں ہے۔ اور یہ محض خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں۔ (النجم ۵۳: ۲۳- یوسف ۱۲: ۴۰- الاعراف ۷: ۷۱)

چنانچہ، ہمارے لیے صائب راستہ یہی ہے کہ ہم اس طرح کے معاملات میں، اس حد سے، ذرہ برابر بھی آگے نہ بڑھیں، جہاں اللہ تعالیٰ نے ہمیں روک دیا ہے۔

والسلام
طالب محسن

محترمی و مکرمی

السلام علیکم

روزمرہ زندگی میں عورت کے لیے سر کے بال کٹوانے سے متعلق دین میں منفی یا مثبت کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ اس کی وجہ، غالباً، یہی ہے کہ اس زمانے کی معاشرت میں اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی کہ اس کے بارے میں کچھ کہا جاتا۔ البتہ دو ایک چیزیں ایسی ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رائج تصور کہ عورت کے لیے بال کٹوانا حرام ہے، کوئی دینی بنیاد نہیں رکھتا۔ مثلاً، حج میں، اگرچہ، عورت سارے بال تو نہیں کٹواتی لیکن اپنے بالوں کا کچھ حصہ، بہرحال، اسے کٹوانا ہوتا ہے، اور اسے حج کے ایک شعیرے کی حیثیت حاصل ہے۔ اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق معلوم ہے کہ انھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ترکِ زینت کے خیال سے اپنے بال چھوٹے کر لیے تھے۔ البتہ جو چیز ممنوع ہے، وہ غیر مردوں کے سامنے اظہارِ زینت اور نمایشِ حسن ہے اور اسی طرح مردوں کا سا لباس اور تراش خراش اختیار کرنا بھی عورت کے لیے جائز نہیں۔ ان پہلوؤں کو ملحوظ رکھتے ہوئے، اگر کوئی عورت چھوٹے بال رکھنا چاہے، تو اس میں ہمارے نزدیک کوئی حرج نہیں۔

والسلام
طالب محسن
شعبہ تصنیف و تالیف
قسم دراسات السیرۃ النبویہ
المورد لاہور

ترتیب : منظور احسن

"دعوتِ دین کی حکمتِ عملی کے معاملے میں، بعض لوگ یہ اصرار کرتے ہیں کہ ہمیں وہی طریقے اختیار کرنے چاہییں، جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں اختیار کیے تھے۔ اس معاملے میں جہاں تک اصولی رہنمائی کا تعلق ہے، تو ان کی یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔ یعنی ہمیں اپنی دعوت کی حکمتِ عملی، انھی اصولوں پر استوار کرنی چاہیے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں کارفرما تھے۔ مثلاً ہماری تمام تر جدوجہد، اپنی ابتدا سے انتہا تک، صرف اور صرف دعوت ہی کے اسلوب میں ہونی چاہیے اور تشدد و احتجاج کا کوئی شائبہ بھی اس دعوت میں موجود نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں بحیثیت داعی اپنے ساتھیوں کے ساتھ محبت و اخوت کا تعلق قائم کرنا چاہیے اور جب تک اقتدار حاصل نہ ہو جائے، جہاد و قتال کا نام بھی ہمیں اپنی زبان پر نہیں لانا چاہیے۔ لیکن، ابلاغِ دعوت کے لیے جو طریقے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مخصوص تمدن میں اختیار کیے، اگر تمدن کا ارتقا، ان سے مختلف طریقے اختیار کرنے کا داعی ہے، تو یہ رسول اللہ کے طریقے کی پیروی ہی کا تقاضا ہے کہ ہم، انھی مختلف طریقوں کو اختیار کریں۔"

اصلاح و دعوت

وحید الدین خاں

سیرت

ایک تحریک کی حیثیت سے

— ۲ —

دعوت کی ہمہ گیری

ابن اسحاق نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک بار قریش کے اشراف ابوطالب کے یہاں جمع ہوئے۔ ان میں عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابوجہل بن ہشام، امیہ بن خلف اور ابوسفیان بن حرب جیسے لیڈر شامل تھے۔ ابوطالب کی معرفت ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آخر آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں، آپ نے کہا:

كلمة واحدة تعطونيها تملكون	"میں صرف ایک بات کا مطالبہ کرتا ہوں، اگر
بها العرب وتدين لكو بها	تم اسے مان لو، تو تم سارے عرب کے مالک
العجم۔ (البدایہ والنہایہ، ج ۲، ص ۱۲۳)	بن جاؤ گے، اور عجم تمہارا مطیع فرمان ہوگا"

توحید کا کلمہ، بظاہر صرف ایک اعتقادی کلمہ ہے مگر اس کے اندر ہر قسم کی انسانی فتوحات کا راز چھپا ہوا ہے۔ یہ انسانی فطرت کی آواز ہے، اس لیے وہ انسانی نفسیات کی انتہائی گہرائیوں میں شامل ہو جاتا ہے، اور اکثر خود مخالفین کے اندر اپنے حامی پیدا کر لیتا ہے۔ خالد بن ولید فتح مکہ سے کچھ پہلے اسلام لائے۔ مگر اسلام کی سچائی بہت پہلے سے ان کے قلب میں ان کا پیچھا کیے ہوئے تھی۔ اسلام کے بعد انھوں نے اپنے بارے میں بتایا کہ میرے دل میں بہت پہلے یہ بات پڑ چکی تھی کہ حق قریش کی طرف نہیں، بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے، اور مجھے آپ کے ساتھ مل جانا چاہیے۔ وہ کہا کرتے تھے:

> "میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تمام جنگوں میں شریک رہا، مگر کوئی جنگ ایسی نہیں جس میں میں شریک ہوا ہوں، اور یہ خیال لے کر واپس نہ آیا ہوں کہ میں صحیح جگہ نہیں کھڑا ہوں" (البدایہ والنہایہ، ج ۴)

اسی طرح بہت سے لوگوں کے بارے میں روایتیں ملتی ہیں کہ ان کے دل میں بہت پہلے سے اسلام کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو چکا تھا۔ حتیٰ کہ وہ اس کا خواب دیکھنے لگے تھے۔ مثلاً خالد بن سعید بن العاص نے اسلام سے پہلے خواب دیکھا کہ وہ آگ کے بہت بڑے گڑھے کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں۔ کوئی انھیں دھکا دے کر اس میں گرانا چاہتا ہے۔ اتنے میں پیغمبر اسلام آئے اور انھوں نے آپ کو آگ میں گرنے سے بچا لیا۔

دعوتی عمل بظاہر اقتصادیات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ مگر بالواسطہ طور پر وہ زبردست اقتصادی عمل ہے۔ کیونکہ دعوت کے نتیجہ میں جب ایک شخص اسلام کو اختیار کرتا ہے تو اس کے تمام ذرائع بھی، خود بخود اسلام کو حاصل ہو جاتے ہیں۔ مکہ کے ابتدائی زمانہ میں خدیجہ رضی اللہ عنہا کی دولت اسلام کے کام آتی رہی۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ایمان لائے جنھوں نے تجارت سے چالیس ہزار درہم کمائے تھے۔ ان کا سرمایہ اسلامی تحریک کا اقتصادی سہارا بنا۔ ہجرت کے موقع پر وہ چھ ہزار درہم لے کر گھر سے روانہ ہوئے تھے، جس سے سفر کے تمام اخراجات پورے کیے گئے۔ غزوۂ تبوک میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دس ہزار دینار دیے، جس سے لشکر کی ضروریات کا تہائی حصہ ادا کیا گیا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے صرف ایک موقع پر پانچ سو گھوڑے جہاد کے لیے دیے۔ اسی طرح جو لوگ اسلام قبول کرتے تھے، ان کی جان کے ساتھ ان کا مال بھی اسلام کے خزانہ کا ایک جزء بن جاتا تھا۔

توحید کا نظریہ واحد نظریہ ہے جس میں سماجی تقسیم اور طبقاتی امتیاز کے لیے کوئی گنجایش نہیں۔ اس لیے جب اس نظریہ کی بنیاد پر کوئی تحریک اٹھتی ہے، تو وہ عوام کو حیرت انگیز طور پر متاثر کرتی ہے، کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ توحید کے زیر سایہ وہ مساوات اور انسانی عظمت کا حقیقی مقام پا سکتے ہیں۔ مغیرہ بن شعبہ فارس کے سپہ سالار رستم کے دربار میں گئے، تو درباریوں پر ان کی تقریر کا ردعمل، ابن جریر کی روایت کے مطابق یہ تھا:

> "نیچے کے لوگوں نے کہا: خدا کی قسم، اس عرب نے سچ بات کہی۔ سرداروں نے کہا: خدا کی قسم اس نے ایسی بات پھینکی ہے کہ ہمارے سب غلام اس کی طرف چلے جائیں گے۔ خدا ہمارے پہلوں کو غارت کرے، وہ کس قدر احمق تھے کہ انھوں نے اس قوم کے معاملہ کو ہلکا سمجھا۔"
> (تاریخ طبری، ج ۲، ص ۳۶)

نبوت کے تیرھویں سال پیغمبر اسلام حضرت ابوبکر کے ساتھ مدینہ پہنچے تو یہاں کی آبادی کے

تقریباً ۵۰۰ آدمی آپ کے استقبال کے لیے جمع ہوئے اور انھوں نے کہا: "آئیے، آپ یہاں محفوظ ہیں اور ہمارے سردار ہیں"۔ (البدایہ والنہایہ ج ۳)

مدینہ کی یہ سرداری آپ کو کس طرح حاصل ہوئی؟ جواب یہ ہے کہ دعوت کے ذریعہ سے۔ مدینہ (یثرب) کا پہلا شخص جس کو آپ نے اسلام کی دعوت دی، غالباً سوید بن صامت خزرجی ہے۔ اس سے آپ نے اسلام کا ذکر کیا، تو اس نے کہا: شاید آپ کے پاس وہی ہے جو میرے پاس ہے۔ آپ نے پوچھا: تمھارے پاس کیا ہے؟ وہ بولا: حکمتِ لقمان۔ آپ نے فرمایا: بیان کرو، اس نے کچھ اشعار سنائے۔ آپ نے فرمایا، میرے پاس قرآن ہے، جو اس سے بھی افضل ہے۔ اس کے بعد آپ نے اس کو قرآن سنایا۔ وہ فوراً مسلمان ہو گیا۔ یثرب واپس ہو کر جب اس نے اپنے قبیلہ کے سامنے اسلام کا پیغام رکھا، تو انھوں نے اس کو قتل کر دیا۔ (تاریخ طبری، ص ۲۳۲)

اس کے بعد یثرب کے ایک سردار ابوالحیسر انس بن رافع مکہ آئے۔ ان کے ساتھ بنی عبدالاشہل کے جوانوں کی ایک جماعت بھی تھی۔ یہ لوگ اس لیے مکہ آئے تھے کہ قبیلہ خزرج کی حمایت کے لیے قریش سے معاہدہ کریں۔ آپ کو ان کی آمد کی اطلاع ملی، تو آپ ان کے پاس گئے اور کہا: تم لوگ جس کام کے لیے آئے ہو، کیا اس سے زیادہ بھلی بات میں تم کو نہ بتاؤں؟ اس کے بعد، آپ نے توحید کی دعوت ان کے سامنے پیش کی۔ ان کے ایک نوجوان ایاس بن معاذ بولے: اے قوم، خدا کی قسم یہ بات اس سے بہتر ہے جس کے لیے تم آئے ہو۔ مگر وفد کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ انھوں نے کہا: چھوڑو، ہم دوسرے کام کے لیے آئے ہیں۔ وہ یثرب واپس گئے اور اس کے جلد ہی بعد اوس اور خزرج کے درمیان وہ جنگ چھڑ گئی جو بعاث کے نام سے مشہور ہے۔

خبیب بن عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ یثرب کے دو شخص سعد بن زرارہ اور ذکوان بن قیس مکہ آئے اور عتبہ بن ربیعہ کے یہاں ٹھہرے۔ پیغمبر اسلام کا تذکرہ سنا تو آپ سے ملنے کے لیے آئے۔ آپ نے ان دونوں کو اسلام کی دعوت دی اور قرآن پڑھ کر سنایا۔ دونوں نے اسلام قبول کر لیا۔ پھر وہ اپنے میزبان عتبہ بن ربیعہ کے پاس نہیں گئے، بلکہ آپ کے یہاں سے سیدھے یثرب واپس چلے گئے۔ یہ ان پہلے لوگوں میں سے ہیں، جنھوں نے اہلِ یثرب تک، اوّلاً اسلام پہنچایا۔ یہ نبوت کے دسویں سال کا واقعہ ہے۔

نبوت کے گیارھویں سال حج کے موقع پر یثرب سے قبیلہ خزرج کے چھ آدمی آئے۔ انھوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور واپس جا کر اپنی بستی میں اسلام کی تبلیغ شروع کی۔ اگلے سال (۱۲ نبوی)

بارہ آدمیوں نے آکر بیعت کی جو اسلام کی تاریخ میں عقبہ اولی (۶۲۱ء) کے نام سے مشہور ہے۔ نبوت کے تیرھویں سال، اس تعداد میں مزید اضافہ ہوا اور یثرب کے ۷۵ لوگ مکہ حاضر ہوئے اور بیعت عقبہ ثانیہ کا واقعہ وجود میں آیا۔

مکہ کے برعکس یثرب میں ایک خاص بات یہ ہوئی کہ پہلے ہی مرحلے میں وہاں کے ممتاز لوگوں نے اسلام قبول کرلیا۔ یہ قبائلی دور تھا اور قبائل میں یہ رواج تھا کہ سردارِ قبیلہ کا جو مذہب ہوتا تھا، وہی پورے قبیلہ کا مذہب ہوتا تھا، اس لیے یثرب میں بہت تیزی سے اسلام پھیلنے لگا۔ حتیٰ کہ کوئی گھر نہ بچا جس میں اسلام داخل نہ ہوگیا ہو۔ اس طرح جب یثرب کی آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگئی تو فطری طور پر وہی بستی میں سب سے زیادہ با اثر ہوگئے۔ (طبرانی)

منظور الحسن

فکر میں قدامت اور حکمتِ عملی میں جدت کی ضرورت

ہم مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کا دین اپنی خالص شکل میں، دنیا کے کونے کونے تک پہنچے، اور کرۂ ارض پر موجود ہر شخص کو قرآنِ مجید کا الہامی پیغام سنایا جائے، تاکہ وہ اپنی دنیوی زندگی کو سنوار سکے اور آخرت کی تیاری کے لیے سرگرمِ عمل ہو جائے۔

اگر ہم یہ چاہتے ہیں تو پھر، اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم دینی فکر میں، قدیم ترین اور اپنی حکمتِ عملی میں، جدید ترین ہو جائیں۔ دینی فکر میں قدیم ترین ہونے سے مراد یہ ہے کہ دین، ہم اسی کو سمجھیں جو صدیوں سے، ہمارے پاس قرآن وسنت کی شکل میں، موجود ہے۔ اس دین میں، بعد کے ادوار یا موجودہ دور کی کسی آمیزش کو ہم ہرگز گوارا نہ کریں۔ ہر روایت، ہر اجتہاد اور ہر رائے کو ہم قرآن وسنت کی کسوٹی پر پرکھیں، اور اس کے بعد جو چیز بھی نئی یا اجنبی محسوس ہو، اسے رد کر دیں۔ دینی فکر کے ساتھ ہمارا یہ رویہ، دین میں در آنے والی خرابیوں اور بدعات کو دور کر دے گا۔ اور اس طرح ہماری دینی فکر ہمیشہ، خالص شکل میں، ہمارے پاس موجود ہو گی۔

جہاں، یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی دینی فکر، بدعات سے پاک کر کے، اس کے دورِ اول کے تاثر کو قائم کریں، وہاں، یہ بھی ضروری ہے کہ ہم ابلاغِ دین کی حکمتِ عملی کو جدید خطوط پر استوار کریں۔ اس سلسلے میں ہمیں وہ تمام طریقے اختیار کرنے چاہییں جو تہذیب وتمدن اور علوم وفنون کے ارتقا کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئے ہیں۔

مثال کے طور پر موجودہ دور میں کوئی منظم دعوتی کام ہی ثمر آور ہو سکتا ہے، چنانچہ ابلاغِ دعوت کے لیے ہم ادارے اور تنظیمیں قائم کریں۔ آج کے دور میں، صحافت کا شعبہ، بہت موثر ہو گیا ہے۔ اس شعبے میں زیادہ سے زیادہ کام، ہمارے فکر کو تیزی سے پروان چڑھا سکتا ہے۔ اخبارات وجرائد اور کتب ورسائل کی اشاعت کے ذریعے سے، ہم اپنا حلقۂ مخاطبین، زیادہ وسیع کریں۔ قومی اور بین الاقوامی زبانوں میں اپنے دینی افکار کو بیان کریں۔

الیکٹرانک میڈیا نے دنیا کی وسعتوں کو سمیٹ دیا ہے۔ کوئی خطہ، کوئی قوم اب ہمارے لیے اجنبی نہیں رہی۔ چنانچہ، ہمیں چاہیے کہ ابلاغِ دین کے لیے، ہم الیکٹرانک میڈیا کا بہترین استعمال کریں۔ یہ اور اس نوع کے دوسرے جدید طریقوں کو استعمال میں لا کر ہی ہم، اس دور میں، دعوت کا کام بہتر طور پر انجام دے سکتے ہیں۔

دعوتِ دین کی حکمتِ عملی کے معاملے میں، بعض لوگ یہ اصرار کرتے ہیں کہ ہمیں وہی طریقے اختیار کرنے چاہییں، جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں اختیار کیے تھے۔ اس معاملے میں، جہاں تک اصولی رہنمائی کا تعلق ہے، تو ان کی یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔ یعنی ہمیں اپنی دعوت کی حکمتِ عملی، انھی اصولوں پر استوار کرنی چاہیے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں کارفرما تھے۔ مثلاً ہماری تمام تر جدوجہد اپنی ابتدا سے انتہا تک صرف اور صرف دعوت ہی کے اسلوب میں ہونی چاہیے اور تشدد و احتجاج کا کوئی شائبہ بھی، اس دعوت میں موجود نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں بحیثیتِ داعی اپنے ساتھیوں کے ساتھ، محبت و اخوت کا تعلق قائم کرنا چاہیے اور جب تک اقتدار حاصل نہ ہو جائے، جہاد و قتال کا نام بھی ہمیں اپنی زبان پر نہیں لانا چاہیے۔ لیکن، ابلاغِ دعوت کے لیے جو طریقے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مخصوص تمدن میں اختیار کیے، اگر تمدن کا ارتقا، ان سے مختلف طریقے اختیار کرنے کا داعی ہے، تو یہ رسول اللہ کے طریقے کی پیروی ہی کا تقاضا ہے کہ ہم، انھی مختلف طریقوں کو اختیار کریں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے، ابلاغِ دعوت کے لیے، اپنے تمدن میں موجود بہترین طریقے اختیار کیے۔ چنانچہ، اُن کی پیروی کرتے ہوئے، ہمیں بھی، اپنی دعوت کی حکمتِ عملی میں، اپنے تمدن کے جدید طریقوں کو اختیار کرنا چاہیے۔

OUR THANKS TO

SNOW WHITE DRY CLEANING INDUSTRIES
SH. WILAYAT AHMAD & SONS
CONTINENTAL ART
FEROZE TEXTILE INDUSTRIES
IMAGE COMMUNICATIONS
TIP TOP DRY CLEANERS
F.RABBI & CO. (PVT) LTD
K.B. SARKAR & CO.
PARAMOUNT DISTRIBUTORS (PVT) LTD


ہاضمہ خراب ہو تو...
Gold
Gold
Gold
...سونے کا نوالہ بھی بے وقعت!
کھانے کا وقت ہو اور بھوک نہ لگے تو یہ معدے اور جگر کی خرابی کی علامت ہے۔ ایسی صورت میں نئی کارمینا لیجیے۔
زود اثر نئی کارمینا فوری طور پر فعلِ ہضم درست کرتی ہے اور معدے کی اصلاح کرتی ہے۔
اب نئی گول شیشی میں دستیاب ہے
نئی کارمینا
■ درد شکم میں نئی کارمینا کی دو ٹکیاں نیم گرم پانی کے ساتھ استعمال کریں
■ بد ہضمی، گیس یا متلی کی شکایت میں نئی کارمینا کی دو ٹکیاں چوسیں
■ نئی کارمینا کی دو سے چار ٹکیاں باقاعدگی کے ساتھ رات کو سوتے وقت نیم گرم پانی سے استعمال کی جائیں تو دائمی قبض سے نجات مل جاتی ہے۔
■ بھوک کی کمی کی شکایت میں صبح ناشتے سے پہلے، دوپہر اور رات کے کھانے سے قبل نئی کارمینا کی دو ٹکیاں چوسیے۔
نظام ہضم کی اصلاح کے لیے پُر تاثیر ہاضم ٹکیاں
خوش ذائقہ نئی کارمینا ہمیشہ گھر میں رکھیے
Adarts-CAR-2


Mothercare
مدر کیئر اور آپ کے حسن کی بہترین نگہداشت

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

ماہنامہ

اشراق

جلد ۶ شمارہ ۱۰
اکتوبر ۱۹۹۴ء
جمادی الاولیٰ ۱۴۱۵ھ

مدیر
منیر احمد
معاونین
منظور الحسن
قدیر شہزاد
مدیر انتظامی
شکیل الرحمن
مجلس ادارت
طالب محسن — خالد ظہیر
ساجد حمید — معز امجد
شہزاد سلیم — محمد رفیع
نادر عقیل انصاری — نعیم احمد بلوچ
خورشید احمد ندیم

فی شمارہ : ۸ روپے
سالانہ : ۸۰ روپے
بیرون ملک
ہوائی ڈاک : ۴۵۰ روپے
بحری ڈاک : ۲۵۰ روپے

المورد
دانش گاہ علوم اسلامی

۹۸ (۲) ای، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۵۴۷۰۰ فون: ۸۵۶۴۱۸-۸۵۷۰۴۰

انتظامی دفتر: ۶۶ احمد بلاک، گارڈن ٹاؤن، لاہور ۵۴۶۰۰ فون: ۵۸۶۴۴۳۱

مدیر مسئول: جاوید احمد غامدی ○ طابع: قومی پریس، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحاقۃ

[۶۹]

اللہ کے نام سے جو سراپا رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

ہونی شدنی! کیا ہے ہونی شدنی! اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ ہونی شدنی!
وہی کھڑکھڑانے والی جس کو ثمود اور عاد نے جھٹلایا، تو ثمود اُس آفت سے ہلاک ہوئے جو حد سے باہر تھی اور عاد اُس آندھی سے برباد ہوئے جو سرکش اور بے قابو ہوئی۔ اُس نے، سات رات اور آٹھ دن، یہ آندھی، اُن پر ٹھیرا دی، اُنھیں جڑ پیڑ سے اکھاڑنے کے لیے۔ تم اُن لوگوں کو دیکھتے کہ اُس میں اِس طرح پچھڑے پڑے ہیں، جیسے وہ کھجور کے کھوکھلے تنے ہوں۔ تو اب کیا اِن میں سے کسی کو باقی دیکھتے ہو؟

اور یہی جرم فرعون اور اُس سے پہلے کے لوگوں نے کیا اور (قومِ لوط کی) اُلٹی ہوئی بستیوں نے بھی۔ اِس طرح کہ اُن سب نے اپنے پروردگار کے رسول کی بات نہیں مانی۔ چنانچہ اُس نے اُن کو پکڑا، ایسی پکڑ جو (اپنی شدت میں) بڑھتی چلی گئی۔

(اسی طرح نوح کو جھٹلانے کے نتیجے میں) جب (طوفان اٹھا اور) پانی حد سے گزر گیا، تو یہ ہم ہی تھے کہ ہم نے تمھیں کشتی میں اٹھا لیا، اس لیے کہ (تمھاری) اِس سرگزشت، کو ہم (لوگوں کے لیے) نصیحت بنا دیں اور سننے والے کان اِس کو سنیں اور یاد رکھیں۔

چنانچہ یاد رکھو (کہ اِسی طرح) جب صور میں ایک ہی مرتبہ پھونک ماری جائے گی، اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ایک ہی مرتبہ پاش پاش کر دیا جائے گا، تو اُس دن ہونے والی ہو جائے گی اور آسمان پھٹ جائے گا، اور (تم دیکھو گے کہ) وہ اُس بہت ہی بودا ہو گا، اور فرشتے اُس کے کناروں پر ہوں گے اور (ان میں سے) آٹھ اُس دن تمھارے پروردگار کا تخت اپنے اوپر اٹھائے ہوں گے۔ اُس دن تم پیش کیے جاؤ گے، اِس طرح کہ تمھاری کوئی چھپی ہوئی بات بھی (اُس دن) چھپی نہ رہے گی۔

پھر جس کا نامۂ اعمال اُس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا، وہ کہے گا: لو پڑھو، میرا

یہ نامۂ اعمال، مجھے یہ خیال رہا کہ ایک دن مجھے اپنے اِس حساب سے دوچار ہونا ہے چنانچہ وہ ایک دل پسند عیش میں ہوگا، بہشتِ بریں میں، جس کے میوے جھک رہے ہوں گے ــــ کھاؤ اور پیو، پورے لطف کے ساتھ، اپنے اُن اعمال کے صلے میں جو تم نے گزرے ہوئے دنوں میں کیے ہیں۔

اور جس کا نامۂ اعمال اُس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، وہ کہے گا: اے کاش، میرا یہ نامہ اعمال مجھے نہ ملتا اور میرا حساب کیا ہے، میں اس سے بے خبر ہی رہتا۔ اے کاش، وہی موت فیصلہ کن ہوجاتی۔ میرا مال، میرے کیا کام آیا؟ میری سب بادشاہی لٹ گئی ــــ اِس کو پکڑو اور اس کی گردن میں طوق ڈال دو۔ پھر اس کو دوزخ میں جھونک دو۔ پھر ایک زنجیر میں جس کی ناپ گزوں میں ستر گز ہے، اِس کو جکڑ دو ــــ یہ نہ اللہ بزرگ و برتر کو مانتا تھا اور نہ فقیروں کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتا تھا۔ اِس لیے آج یہاں اس کا کوئی غم خوار نہیں اور زخموں کے دھوون کے سوا، اِس کے لیے کوئی کھانا نہیں۔ اِس کو یہ گنہ گار ہی کھائیں گے۔

(تم سمجھتے ہو کہ یہ کسی شیطان کا الہام ہے)؟ نہیں، (ہرگز نہیں، تم یہ کہتے ہو)، تو میں

اُس (عالَم) کی شہادت پیش کرتا ہوں جسے تم دیکھتے ہو (اور اپنی آنکھوں سے اُس کے حقائق تک پہنچ سکتے ہو) اور اُس کی بھی، جسے تم نہیں دیکھتے، (مگر اپنی عقل سے اُس کی حقیقتوں کو سمجھ سکتے ہو کہ) یہ ایک رسولِ کریم، (ایک معزز فرشتے) کا لایا ہوا کلام ہے، اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے ــــ تم کم ہی مانتے ہو۔ اور یہ کسی کاہن کا کلام بھی نہیں ہے ــــ تم کم ہی سمجھتے ہو۔ یہ عالم کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ اور (ہمارا) وہ (فرستادہ) اگر اپنی طرف سے کوئی بات بنا لاتا، تو ہم اُس کو اپنے قوی ہاتھ سے پکڑ لیتے، پھر اُس کی رگِ دل کاٹ دیتے، تو تم میں سے کوئی بھی ہم کو، اِس سے روک نہ سکتا۔ (تم نے اِس کی قدر نہیں کی، تو یہ تمھاری محرومی ہے)۔ اور اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ ایک یاددہانی ہے، ڈرنے والوں کے لیے۔ اور ہم خوب جانتے ہیں کہ تم میں اِس کے جھٹلانے والے بھی ہیں۔ (یہ اِسی طرح جھٹلاتے رہیں گے) اور (قیامت میں) یہ، لاریب، اِن کافروں کے لیے ایک پچھتاوا بن جائے گا۔ اور اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ (یہ جس شدنی کی خبر اِس قرآن نے دی ہے)، یہ ایک یقینی حقیقت ہے۔ اِس لیے، (اے پیغمبر، تم اِن کی باتوں پر صبر کرو، اور) اپنے ربِ عظیم کے نام کی تسبیح کرتے رہو۔

ـــــــــــ النبا ـــــــــــ

معز امجد

منشورِ انقلاب

(۷)

طریقۂ انتخاب

اگر ہم اپنی ریاست میں رائج انتخابات کے طریقے پر غور کریں، تو اس میں ہمیں کم از کم، دو خامیاں بہت نمایاں نظر آئیں گی۔ ایک یہ کہ انتخابات کے اس نظام کے تحت، حکومتی ایوانوں میں، ریاست میں موجود ووٹروں کو پوری نمائندگی نہیں ملتی۔ اور دوسری یہ کہ ان انتخابات میں، اپنے افکار اور نظریات کی بنیاد پر جماعتوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ نہیں ہوتا، بلکہ اقتدار کے حصول کے لیے یہ شخصی و انفرادی معرکے ہوتے ہیں، جس کے نتیجے میں، ہمارا سیاسی نظام بہت سے سیاسی، اخلاقی اور اجتماعی فسادات کا شکار ہو گیا ہے۔

پہلی خامی کو سمجھنے کے لیے انتخابات کی ایک سادہ سی فرضی مثال ملاحظہ فرمائیے:

علاقہ	کل ووٹر	حاصل شدہ ووٹوں کی تعداد	
		پارٹی 'الف'	پارٹی 'ب'
لاہور	۱۰۰	۵۱	۴۹
کراچی	۱۰۰	۵	۹۵
پشاور	۱۰۰	۵۱	۴۹
کوئٹہ	۱۰۰	۵۳	۴۷
میزان	۴۰۰	۱۶۰	۲۴۰
حاصل شدہ ووٹوں کی شرح	۱۰۰ ٪	۴۰ ٪	۶۰ ٪
ایوان میں نمائندگی	۴ نشستیں	۳ نشستیں	۱ نشست

اوپر دیے گئے گوشوارے پر غور کیجیے، تو یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ ہمارے ہاں رائج طریقۂ انتخاب میں یہ بہت ممکن ہے کہ ایک جماعت قومی سطح پر، چالیس فی صد یا اس سے بھی کم ووٹ لے کر قومی اسمبلی یا پارلیمان میں حکومتی گروہ قرار پا جائے، جبکہ دوسرا گروہ ساٹھ فی صد یا اس سے بھی زیادہ عوام کی تائید حاصل کرنے کے باوجود، حکومتی ایوانوں میں حزب اختلاف یا اپوزیشن کی سیٹوں پر بٹھا دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات مضحکہ خیز بھی ہے اور عوامی نمائندگی کے نقطۂ نظر سے ناقابل قبول بھی۔

دوسری خامی پر غور کیجیے، تو ہر شخص یہ پکار اٹھے گا کہ اس کے اثرات پہلی خامی سے کہیں زیادہ سنگین اور مفسد ہیں۔ ہم اس خامی کے اثرات اور اس سے پیدا ہونے والے فسادات پر روشنی ڈالنے سے پہلے، یہ چاہتے ہیں کہ اقتدار اور اس کے حصول کے بارے میں، دنیا میں رائج تصورات، اور اسلامی نقطۂ نظر میں پائے جانے والے فرق کو واضح کر دیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی اپنی کتاب "اسلامی ریاست" میں لکھتے ہیں:

"حکومت کے یہ عہدے اور مناصب حصول عزت و جاہ اور کسب دنیا کے نہایت کامیاب ذریعے خیال کیے جاتے ہیں اور، عام طور پر، ان کے متعلق یہی تصور کیا جاتا ہے کہ یہ ملک میں رہنے والوں کے حقوق میں شامل ہیں، اس وجہ سے، نہ صرف ان کے حصول کی جدوجہد جائز سمجھی جاتی ہے، بلکہ اس راہ میں مقابلہ و مجادلہ، جوڑ توڑ، سازش و سفارش، حتیٰ کہ رشوت و جعل سازی کے سارے فن بھی مباح سمجھ لیے گئے ہیں۔ ہر شخص، اپنا حق سمجھ کر، ان کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور، چونکہ ان سے مال اور عزت دونوں کے حاصل ہونے کی توقع ہوتی ہے، اس وجہ سے لوگ جواریوں کی طرح، ان کے لیے بازی کھیلتے ہیں۔ اور دین و دنیا کی جو پونجی بھی پاس ہوتی ہے، بسا اوقات ساری کی ساری اس داؤں پر لگا دیتے ہیں کہ اگر یہ بازی جیت لی، تو ماضی کے سارے نقصانات کی تلافی بھی ہو جائے گی اور مستقبل کی تمام کامیابیوں اور فتوحات کے دروازے بھی کھل جائیں گے۔

..... لیکن اسلام نے، دنیا کے اس عام رجحان کے بالکل برعکس، ان عہدوں اور مناصب کو حقوق کی فہرست میں شمار کرنے کے بجائے امانت کی حیثیت دی ہے۔ اس وجہ سے ایک صحیح اسلامی ماحول کے اندر، یہ عہدے اور مناصب چاہنے اور طلب کرنے کی چیز نہیں سمجھے جاتے، بلکہ بچنے اور بھاگنے کی چیز خیال کیے جاتے ہیں۔ جو لوگ آخرت کی زندگی، قیامت کی بازپرس اور جزا و سزا کے تصور سے بالکل خالی ہوں، ان کے لیے، بلاشبہ، ان چیزوں کے اندر بڑی کشش ہو سکتی ہے، کیونکہ ان کے سامنے ان کے صرف روشن پہلو ہی ہوتے ہیں، ان کے تاریک پہلوؤں سے وہ بالکل ناواقف

ہوتے ہیں، زندگی کی دوسری نعمتوں سے جس طرح بغیر کسی احساس ذمہ داری کے وہ متمتع ہوتے ہیں، اور اپنے اس عیش کو فکرِ فردا کے اندیشوں سے مکدر نہیں ہونے دیتے، اسی طرح ملکی اور قومی ذمہ داریوں کو بھی وہ کبھی ذمہ داری کی حیثیت سے نہیں اٹھاتے، بلکہ ایک حق سمجھ کر لیتے ہیں، اور جہاں تک ان کا بس چلتا ہے، اسی حیثیت سے ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لیکن، ایک مسلمان، جس کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ تم میں سے ہر ایک چرواہا ہے اور ہر ایک سے اس کے گلہ کی بابت پرسش ہوگی۔ مرد سے، اس کے بیوی بچوں کی بابت سوال ہوگا، عورت سے اس کے شوہر اور آل و اولاد کے متعلق سوال ہوگا، آقا سے اس کے غلام کے متعلق سوال ہوگا، حکمران سے اس کی رعایا کے متعلق سوال ہوگا۔ وہ اس حقیقت کو سمجھتے ہوئے، کس طرح اس بات کی آرزو کر سکتا ہے کہ ان بہت سارے بوجھوں کے ساتھ، جو پہلے سے اس پر لدے ہوئے ہیں، کسی شہر کا قاضی، کسی صوبے کا والی یا کسی ملک کا امیر بنا کر اس شہر یا صوبے یا ملک کا بوجھ بھی اس کی کمر پر لاد دیا جائے۔" (ص ۳۰۳-۳۰۴)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی بات اپنے اصحاب میں سے، ان لوگوں سے کہی، جنھوں نے اپنے آپ کو یہ ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے پیش کیا۔ مسلم کی روایت ہے:

"حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ مجھے حکومت کے کسی عہدے پر مقرر کیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے فرمایا: "ابوذر، یہ ایک بھاری امانت ہے اور تم ایک کمزور آدمی ہو۔ قیامت کے دن، یہ امانت، ندامت اور رسوائی کا سبب ہوگی۔ مگر صرف اس شخص کے لیے، جو اس کے حق کے ساتھ اس کو اٹھائے اور اس سلسلے میں، اس پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، انھیں ادا کرے۔"

اسی طرح ایک موقع پر آپ نے عبدالرحمٰن بن سمرہ سے فرمایا:

"اے عبدالرحمٰن، امارت کے طالب نہ بنو، اگر یہ بن مانگے تمھیں ملی، تو اس کام میں خدا کی طرف سے تمھاری مدد کی جائے گی، اور اگر اس کو مانگ کر لوگے، تو تم اس کے حوالے کر دیے جاؤ گے۔"

اس کے علاوہ آپ نے حکومتی عہدوں اور مناصب طلب کرنے والوں کو یہ ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے نااہل قرار دیا ہے اور اپنے عمل سے بھی یہ بات واضح فرما دی کہ ایسے لوگوں کو کوئی ذمہ داری نہ سونپی جائے۔ ابوداؤد کی روایت ہے:

"حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرے ساتھ دو آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ایک نے کہا: آپ ہمیں حکومت کے کسی منصب پر مقرر فرمائیں۔ دوسرے نے بھی اسی قسم کی خواہش ظاہر کی۔ آپ نے جواب میں فرمایا: "ہمارے نزدیک، تم میں سب سے بڑا خائن وہ ہے، جو کوئی عہدہ طلب کرے۔" حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات تک ان میں سے کسی کو کوئی کام سپرد نہ کیا۔"

اسی ضمن میں آپ نے عہدوں پر فائز ایسے لوگوں کے بارے میں، جو اپنی ذمہ داریوں سے کوتاہی برتتے ہیں، فرمایا:

"جو شخص لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتا ہے، وہ قیامت کے دن روکا جائے گا۔ ایک فرشتہ اس کے سر کو پکڑے ہوئے، اسے جہنم کے کنارے پر روکے رکھے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ حکم دے گا، تو اس کو ایسے کھڈ میں پھینک دیا جائے گا جس کی گہرائی چالیس سال کی مسافت کے برابر ہوگی۔"

یہی وجہ ہے کہ خدا کے صالح بندے ہمیشہ عہدوں اور ذمہ داریوں سے گریز کرتے رہے ہیں۔ اور اگر ان پر اس قسم کا کوئی بوجھ ان کی خواہشات کے خلاف ڈال دیا گیا ہے، تو ان کی ساری زندگی اس بوجھ کے نیچے دب کر رہ گئی ہے۔ ان کے لیے نہ کھانے پینے میں کوئی لذت باقی رہ گئی، نہ دوست و احباب کے اندر کوئی دلچسپی۔ ایک معزز عہدے کے ملنے پر خوشیاں منانا اور جشن کرنا تو الگ رہا، زندگی کی جو تھوڑی بہت آزادیاں انھیں میسر تھیں، وہ بھی ان سے چھن گئیں۔ سب سو رہے ہیں، وہ جاگ رہے ہیں۔ سب بے فکر ہیں، وہ سب کے لیے فکر مند اور غم زدہ ہیں۔ سب اپنی اور اپنے بال بچوں کی خوشیوں کے اسباب فراہم کرنے میں منہمک ہیں، اور وہ ساری خدائی کا بوجھ اپنے سر پر اٹھائے ہوئے نہ رات کے سکون سے آشنا ہیں، نہ دن کی دلچسپیوں سے۔

اقتدار کے بارے میں، اسلام کا یہ نقطۂ نظر جان لینے کے بعد اب اگر ہم اپنے طریقۂ انتخاب پر غور کریں، تو ہم پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کے اندر موجود دوسری خامی، جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا، لوگوں میں اسلام کے اس نظریۂ اقتدار کے بالکل برعکس رویہ اور نقطۂ نظر پیدا کر دیتی ہے۔

جب انتخابات، نظریات و افکار کے بجائے شخصیات و افراد کے درمیان حصولِ اقتدار کی

جنگ بن جائیں، تو اس صورت میں ملکی سیاست میں بہت سے فسادات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے چند نمایاں اور اہم فسادات کا ہم یہاں ذکر کرنا چاہیں گے:

۱۔ اس طریقۂ انتخاب میں سب سے پہلا اور بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں افراد خود اپنے آپ کو اقتدار کے لیے پیش کرتے ہیں۔ اس طرح سے اس طریقۂ انتخاب کی ابتدا ہی اسلام کے اصولوں کے منافی رویے سے ہوتی ہے۔

۲۔ اقتدار کے حصول کے لیے، ہر قسم کا طریقہ بے دریغ اختیار کر لیا جاتا ہے، دولت لٹائی جاتی، اپنے اور اپنے آبا و اجداد کے کارناموں اور بڑائی میں قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ غرض کہ وہ تمام خصائص و خصائل، جو ایک عام آدمی کے لیے تو ہمیشہ سے ناپسندیدہ سمجھے گئے ہیں، سیاست میں اس طرح سے رائج ہو گئے ہیں کہ ان کے بغیر کسی سیاست دان کا تصور ہی نامکمل معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ عام طور پر، ان انتخابات میں کامیابی اسی امیدوار کا مقدر ہوتی ہے، جو زیادہ سے زیادہ دولت خرچ کرنے کی قدرت رکھتا ہو۔ اس کے نتیجے میں، دولت ہی حکومت کرتی ہے اور سیاسی بصیرت رکھنے والے، معاملہ فہم لوگوں کو ملک کے بالاتر ایوانوں میں داخل ہونے سے روک دیا جاتا ہے۔

۴۔ اپنے مدمقابل امیدواروں پر مختلف طریقوں سے دباؤ ڈال کر کبھی انھیں خرید کر اور کبھی انھیں مار پیٹ کر مقابلے سے دستبردار کرا دیا جاتا ہے۔

۵۔ آخر کار جب یہ لوگ حکومت کے ایوانوں میں نشستیں جیتنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، تو ان کے پیش نظر سب سے پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ اپنی خرچ کی ہوئی رقم کو، کسی نہ کسی ذریعے سے پورا کیا جائے۔ چنانچہ، ہر معاملے میں، اپنے ذاتی مفاد کو قومی اور ملی مفاد پر ترجیح دی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ قومی راز ملک دشمنوں کے آگے فروخت کیے جاتے، اپنی سیاسی وفاداریوں کو بے دریغ، ذاتی مصلحت کے پیش نظر، تبدیل کیا جاتا، اپنے سیاسی حریفوں پر الزامات لگائے جاتے اور انھیں، طرح طرح سے، ناکارہ اور بے اثر بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اپنے حلقے کے ووٹروں اور اعزہ و اقربا کو، مختلف طریقوں سے، نوازا جاتا ہے۔ غرض کہ ملک کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں دے دی جاتی ہے، جن کو ملکی ترقی اور قومی مفاد، یہاں تک کہ اپنی ملت کی بقا سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ جن کی تمام تر توجہات اپنے بنک بیلنس، اپنی فیکٹریوں، اپنی زمینوں، اپنے اعزہ و اقربا اور اپنے دوست احباب کے مفاد پر مرتکز ہوتی ہیں۔

جو شخص بھی، ہمارے ہاں، رائج طریقۂ انتخاب کا، خواہ ایک سرسری نظر ہی سے، جائزہ لے، وہ

یہ جانتا ہے کہ یہ نقائص اور برائیوں کا ایک مجموعہ ہے، جس کی وجہ سے کسی شریف اور نیک نیت آدمی کا ان میں کامیاب ہونا تو درکنار، ان میں حصہ لینا بھی محال ہے۔

چنانچہ اس نظامِ انتخاب میں ایسی تبدیلیاں لانی چاہییں جن سے مذکورہ خامیاں دور ہوسکیں۔ اس مقصد کے لیے ہمارا مجوزہ طریقۂ انتخاب ان اصولوں پر مبنی ہوگا:

۱۔ انتخابات کے لیے متناسب نمائندگی کا طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ اس طریقے میں، ہر سیاسی پارٹی کو قومی سطح پر حاصل شدہ ووٹوں کے تناسب سے صوبائی اسمبلیوں میں نمائندگی دی جائے گی۔ مثال کے طور پر، اگر قومی سطح پر ڈالے گئے ووٹوں میں سے چالیس فی صد ووٹ پارٹی 'الف' حاصل کرتی ہے اور باقی ساٹھ فی صد ووٹ پارٹی 'ب' کو ملتے ہیں، تو ہمارے مجوزہ نظام کے تحت قومی اسمبلی کی چالیس فی صد نشستیں پارٹی 'الف' اور ساٹھ فی صد نشستیں پارٹی 'ب' کا استحقاق قرار پائیں گی۔ اس کے نتیجے میں پہلی خامی، جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، بآسانی دور ہو جائے گی۔

۲۔ انتخابات میں صرف سیاسی جماعتیں اور پارٹیاں ہی، اپنے افکار و نظریات یا بالفاظِ دیگر اپنے منشور کی بنیاد پر، ایک دوسرے سے مقابلہ کریں گی۔ کوئی فرد اپنی انفرادی حیثیت میں یا آزاد امیدوار کے طور پر، ان انتخابات میں حصہ نہیں لے گا۔ اس کے نتیجے میں دوسری خامی، جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا، بہت حد تک دور ہو جائے گی۔

۳۔ قومی اسمبلی میں حاصل شدہ نشستوں کے لیے سیاسی جماعت اپنے بہترین لوگوں کو نامزد کرے گی۔ اس نامزدگی میں وہ تمام اوصاف و خصائل جو قرآن و سنت کی رو سے اہلِ اقتدار کے لیے پسندیدہ ہیں، ہر حال میں پیشِ نظر رہنے چاہییں۔ اس طرح سے پر کی گئی نشستوں میں سے اگر کوئی نشست' اپنی معینہ مدت پوری کرنے سے پہلے خالی ہو جائے، تو اس پر ضمنی انتخابات کرانے کے بجائے، وہی سیاسی جماعت' جس کے نامزد نمائندے نے پہلے یہ نشست پُر کی ہوئی تھی، اپنا کوئی اور نمائندہ اس نشست کے لیے نامزد کر دے گی۔ اسی طرح اگر کسی وقت یہ معلوم ہو جائے کہ جماعت کا نمائندہ، کسی بھی وجہ سے، اپنی ذمہ داریاں صحیح طریقے سے ادا نہیں کر رہا، تو وہ جماعت اس کی جگہ کسی اور نمائندے کو ایوان کے لیے نامزد کر سکتی ہے۔ اس کے نتیجے میں امید ہے کہ آہستہ آہستہ بلند کردار، نیک نیت، اعلیٰ قابلیتیں رکھنے والے اور اقتدار اور مناصب کی حرص نہ رکھنے والے لوگوں کو حکومت کے ایوانوں میں جگہ مل سکے گی۔

ترتیب : شہزاد سلیم

" غیبت کے معنی کسی کی، اس کی پیٹھ پیچھے برائی بیان کرنے کے ہیں. پیٹھ پیچھے کے مفہوم ہی میں یہ بات داخل ہے کہ غیبت کرنے والا چاہتا ہے کہ اس کے اس فعل کی خبر اس کو نہ ہو جس کی وہ برائی بیان کر رہا ہے. اسی خواہش کی بنا پر وہ یہ کام اس کے پیٹھ پیچھے صرف ان لوگوں کے سامنے کرتا ہے جو یا تو اس کے ہم راز و ہم خیال اور شریکِ مقصد ہوتے ہیں، یا کم سے کم اِن سے یہ اندیشہ نہیں ہوتا کہ وہ اُس کے ہمدرد ہوں گے جس کی وہ برائی بیان کر رہا ہے، اور اس کے سامنے یہ راز فاش کر دیں گے. غیبت کی یہی خصوصیت اس کو ایک نہایت مکردہ اور گھنونا فعل بناتی ہے. اس لیے کہ اس سے نہ کسی حق کی حمیت وحمایت کا مقصد حاصل ہوتا، نہ کسی اصلاح کی توقع ہو سکتی ہے، بلکہ اس طرح ایک بزدل شخص کسی کے خلاف صرف اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی کوشش کرتا ہے."

قرآنیات

امین احسن اصلاحی

سورۃ الحجرات

(۵)

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ (۱۲)

"اے ایمان لانے والو، بہت سے گمانوں سے بچو، کیونکہ بعض گمان صریح گناہ ہوتے ہیں اور ٹوہ میں نہ لگو اور نہ تم میں سے کوئی ایک دوسرے کی غیبت کرے، کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے! سو اس چیز کو تو تم نے ناگوار جانا! اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ بڑا ہی توبہ قبول فرمانے والا، مہربان ہے۔"

یہ اہل ایمان کو از سر نو خطاب کر کے بعض ایسی باتوں سے روکا گیا ہے جو بظاہر تو معمولی نظر آتی ہیں، لیکن یہ انسان کے خود اپنے دل کو ایسے روگ میں مبتلا کر دیتی ہیں کہ وہ تقویٰ کی روئیدگی کے لیے بالکل ناسازگار ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے جن کو ایمان عزیز ہو، ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان آفتوں سے اپنے کو محفوظ رکھیں۔

پہلی بات یہ ارشاد ہوئی کہ انسان اپنے دل کو دوسروں سے متعلق بدگمانیوں کی پرورش گاہ نہ بنائے کہ جس کی نسبت جو برا گمان بھی دل میں پیدا ہو جائے، اس کو کسی گوشے میں محفوظ کر لے۔ انسان کو جن سے زندگی میں واسطہ پڑتا ہے، ان کی بابت کوئی اچھا یا برا گمان دل میں پیدا ہونا ایک امر فطری ہے۔ یہی گمان آدمی کو آدمی سے جوڑتا یا توڑتا ہے۔ اس پہلو سے معاشرے میں یہ دخل

وفصل کی بنیاد ہے۔ اس کی اس اہمیت کا تقاضا ہے کہ آدمی اس کے رد و قبول کے معاملے میں بھی بے پروا و سہل انگار نہ ہو، بلکہ نہایت ہوشیار اور بیدار مغز رہے۔ اہلِ ایمان کو اسلام نے اس باب میں یہ رہنمائی دی ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے بارے میں ہمیشہ نیک گمان رکھے، الّا آنکہ یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اس نیک گمان کا سزاوار نہیں ہے۔ یہ نیک گمانی اس ایمانی اخوت کا لازمی تقاضا ہے جس پر اسلام نے معاشرے کی بنیاد رکھی ہے اور جس کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے برعکس یہ اصول ٹھیرا لے کہ جو رطب و یابس گمان اس کے دل میں پیدا ہوتے جائیں، ان سب کو سینت سینت کے رکھتا جائے تو گمانوں کے ایسے شوقین کی مثال اس شکاری کی ہے جو مچھلیاں پکڑنے کے شوق میں ایسا اندھا ہو جائے کہ مچھلیاں پکڑتے پکڑتے سانپ بھی پکڑ لے۔ ظاہر ہے کہ مچھلیوں کے شوق میں جو شخص ایسا اندھا بن جائے گا، اندیشہ ہے کہ اسی شوق میں کسی دن وہ اپنی زندگی ہی گنوا بیٹھے گا۔ قرآن نے یہاں اسی خطرے سے مسلمانوں کو روکا ہے کہ گمانوں کے زیادہ درپے نہ ہو، کیونکہ بعض گمان صریح گناہ ہوتے ہیں جو انسان کو ہلاکت میں ڈال دیتے ہیں۔ اس سے یہ تعلیم نکلی کہ ایک مومن کو بدگمانیوں کا مریض نہیں بن جانا چاہیے، بلکہ اپنے دوسرے بھائیوں سے حسنِ ظن رکھنا چاہیے۔ اگر کسی سے کوئی ایسی بات صادر ہو جو بدگمانی پیدا کرنے والی ہو تو حتی الامکان اس کی اچھی توجیہ کرے۔ اگر کوئی اچھی توجیہ نکل سکتی ہو۔ اس کے بُرے پہلو کو اسی شکل میں اختیار کرنا جائز ہے جب اس کی کوئی اچھی توجیہ نہ نکل سکے۔ اگر بدگمانی کے سزاوار سے آدمی کو خوش گمانی ہو تو یہ اس بات کے مقابل میں اہون ہے کہ وہ کسی خوش گمانی کے حق دار سے بدگمانی رکھے۔ حدیث شریف میں مومن کی تعریف یہ آئی ہے کہ 'المومن غر کریم' (مومن بھولا بھالا شریف ہوتا ہے)۔ اس زمانہ میں لوگوں کا عام پسندیدہ اصول یہ ہے کہ ہر شخص سے بدگمانی رکھو، الّا آنکہ وہ ثابت کر دے کہ وہ اپنے گُن کا آدمی ہے۔ اس چیز کو لوگ سیاست اور زیرکی خیال کرتے ہیں۔ دشمن کے مقابل میں تو یہ زیرکی و ہوشیاری ضروری ہے لیکن اہلِ ایمان کے مقابل میں یہ سیاست کس طرح صحیح ہو سکتی ہے جب کہ ان کو 'اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ' (المائدہ ۵: ۵۴) "مسلمانوں کے لیے نرم مزاج" اور 'رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ' (الفتح ۴۸: ۲۹) "آپس میں رحم دل" ہونے کی قرآن نے ہدایت فرمائی ہے؟

دوسری بات آیت میں یہ فرمائی گئی ہے کہ 'وَلَا تَجَسَّسُوْا' (ایک دوسرے کی ٹوہ میں نہ لگو)، جس طرح اوپر والے ٹکڑے میں اچھے گمان سے نہیں، بلکہ بُرے گمان سے روکا گیا ہے، اسی طرح یہاں ممانعت اس ٹوہ میں لگنے کی ہے جو بُرے مقصد سے ہو۔ یعنی تلاش اس بات کی ہو کہ

دوسرے کی پرائیویٹ زندگی سے متعلق کوئی بات ہاتھ آئے جس سے اس کی خامیوں سے آگاہی اور اس کے اندرونِ خانہ کے اسرار تک رسائی ہو۔ یہ چیز کبھی تو حسد کے جذبے سے پیدا ہوتی ہے کہ حریف کی زندگی کا کوئی ایسا پہلو سامنے آئے جس سے کلیجہ ٹھنڈا ہو۔ کبھی بغض وعناد کی شدت اس کا باعث ہوتی ہے کہ کوئی ایسی بات ہاتھ لگے جس کی، عند الضرورت، تشہیر کر کے مخالف کو رسوا کیا جا سکے۔ اس زمانے میں اس نے ایک پیشہ کی شکل بھی اختیار کر لی ہے، جس کو جدید اخبار نویسی نے بہت ترقی دی ہے۔ بعض اخبار نویس رات دن کسی نہ کسی اسکینڈل کی تلاش میں گھومتے رہتے ہیں اور ان میں سب سے زیادہ شاطر وہ اخبار نویس سمجھا جاتا ہے، جو کسی نمایاں شخصیت کی پرائیویٹ زندگی سے متعلق کوئی ایسا اسکینڈل تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے جس سے اس کا اخبار یا رسالہ ہاتھوں ہاتھ بکے۔ اس طرح کا تجسس ظاہر ہے کہ اس اخوت اور باہمی ہمدردی کے بالکل منافی ہے جو اسلامی معاشرہ کی اساس ہے، اس وجہ سے اہلِ ایمان کو اس سے روکا گیا ہے۔ رہا وہ تجسس جو ایک مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائی کے حالات کا اس مقصد سے کرتا ہے کہ اس کی مشکلات وضروریات میں اس کا ہاتھ بٹا سکے یا ایک اسلامی حکومت اس غرض سے کرتی ہے کہ رعایا کے حالات سے پوری طرح باخبر رہے تو یہ تجسس نہ یہاں زیرِ بحث ہے اور نہ یہ ممنوع ہے، بلکہ ہر شریف پڑوسی کے لیے یہ نہایت نیکی کا کام ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں کے حالات ومسائل سے آگاہ رہے، تاکہ ان کی مشکلات میں ان کی مدد کر سکے اور حکومت کے لیے تو یہ صرف نیکی ہی نہیں، بلکہ اس کا فریضہ ہے کہ وہ رعایا کے اچھے اور برے، دونوں طرح کے حالات سے پوری طرح باخبر رہنے کا اہتمام رکھے، تاکہ اپنی ذمہ داریوں سے صحیح طور پر عہدہ برآ ہو سکے۔

تیسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ 'وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا' (تم میں سے کوئی ایک دوسرے کی غیبت نہ کرے)۔ غیبت کے معنی کسی کی، اس کی پیٹھ پیچھے برائی بیان کرنے کے ہیں۔ پیٹھ پیچھے کے مفہوم ہی میں یہ بات داخل ہے کہ غیبت کرنے والا چاہتا ہے کہ اس کے اس فعل کی خبر اس کو نہ ہو جس کی وہ برائی بیان کر رہا ہے۔ اسی خواہش کی بنا پر وہ یہ کام اس کے پیٹھ پیچھے صرف ان لوگوں کے سامنے کرتا ہے جو یا تو اس کے ہم راز وہم خیال اور شریکِ مقصد ہوتے ہیں یا کم از کم ان سے یہ اندیشہ نہیں ہوتا کہ وہ اس کے ہمدرد ہوں گے جس کی وہ برائی بیان کر رہا ہے اور اس کے سامنے یہ راز فاش کر دیں گے۔ غیبت کی یہی خصوصیت اس کو ایک نہایت مکروہ اور گھنونا فعل بناتی ہے۔ اس لیے کہ اس سے نہ کسی حق کی حمیت وحمایت کا مقصد حاصل ہوتا، نہ کسی اصلاح کی توقع ہو سکتی

ہے، بلکہ اس طرح ایک بزدل شخص کسی کے خلاف صرف اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔

بعض لوگ کسی کی برائی کے ذکر کی ہر صورت کو غیبت قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک محدثین کا راویوں پر جرح کرنا، کسی کے خلاف عدالت میں گواہی دینا، کسی کے منکر پر نکیر کرنا، کسی کے خلاف تھانے میں رپٹ لکھوانا، کسی کے باب میں کسی مشورہ چاہنے والے کو اس کے کسی واقعی عیب سے آگاہ کرنا اور اس قبیل کی ساری ہی باتیں داخلِ غیبت ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ یہ امور غیبت کے ضمن میں نہیں آتے، بلکہ اس کے برعکس ان مواقع پر انسان اگر صحیح بات کا اظہار نہ کرے تو کتمانِ حق کا گناہ لازم آسکتا ہے۔

'اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْہِ مَیْتًا فَکَرِھْتُمُوْہُ'، یہ غیبت کے گھنونے پن کو مثال سے واضح فرمایا ہے کہ جو شخص اپنے کسی بھائی کی، اس کے پیٹھ پیچھے، برائی بیان کرتا ہے، وہ گویا، اس حال میں اس کا گوشت کھا رہا ہے، جب کہ وہ مردہ پڑا ہوا اور اپنی مدافعت سے بالکل قاصر ہے۔ فرمایا کہ یہ چیز تو ایسی ہے کہ تم میں سے کوئی بھی اس کو پسند نہیں کرتا، تو جب تم اس کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہو تو اسی طرح کی مکروہ چیز، غیبت کو کیوں گوارا کرو! 'مَیْتًا' یہاں 'اَخِیْہِ' میں مضاف سے حال پڑا ہوا ہے اور یہ تصویر ہے، اس کی اپنی مدافعت سے بے بسی کی۔

'وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ'، یہ تنبیہ بھی ہے اور توبہ و اصلاحِ حال کی ترغیب بھی۔ فرمایا کہ اللہ سے ڈرو۔ جو لوگ اس طرح اپنے بھائیوں کا گوشت مفت کھانے کے عادی ہو جاتے ہیں، ان کو اس کی ایسی چاٹ پڑ جاتی ہے کہ وہ اس کے پیچھے اپنا ایمان ہی گنوا بیٹھتے ہیں۔ اللہ نے تمھیں بروقت تنبیہ فرما دی ہے، تاکہ توبہ اور اصلاح کر کے اپنے کو اس خطرہ سے محفوظ کر لو۔ اگر تم نے توبہ کر لی تو اللہ بڑا ہی توبہ قبول فرمانے والا اور اپنے بندوں پر رحم کرنے والا ہے۔

ان دونوں آیتوں (۱۱-۱۲) میں جن چھ باتوں سے روکا گیا ہے، ان پر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے اوپر کی تین باتیں ــــ مذاق اڑانا، طعن کرنا اور برے القاب چسپاں کرنا ــــ ان برائیوں میں سے ہیں جن کا ارتکاب انسان علانیہ پبلک میں کرتا ہے۔ باقی تین برائیاں ــــ سوءِ ظن، تجسس اور غیبت ــــ انسان کی پرائیویٹ زندگی سے تعلق رکھنے والی ہیں جن کو وہ دوسروں سے چھپا کر یا اپنے محرمانِ راز کے اندر محدود رکھ کر کرتا ہے۔ ان دونوں ہی قسم کی برائیوں کی ممانعت اسلامی تزکیہ و تطہیر کے اس اصول پر مبنی ہے جو قرآن میں 'وَذَرُوْا ظَاھِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَہٗ'

(الانعام [illegible]) اورگناہ کے ظاہر اور اس کے باطن، دونوں ہی کو چھوڑ دو کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ جب تک انسان اپنے آپ کو ان برائیوں سے پاک نہیں کرتا جو اس کے باطن سے تعلق رکھنے والی ہیں، اس وقت تک اس کے اندر اللہ تعالیٰ کے علام الغیوب ہونے کا وہ شعور راسخ نہیں ہوتا جس کے بغیر دل کے اندر تقوٰی کی روئیدگی بالکل خارج از امکان ہے۔

جاوید احمد غامدی

" زانی مرد ہو یا عورت، اس کا جرم، اگر ثابت ہو جائے، تو اس کی پاداش میں اسے سو کوڑے مارے جائیں گے۔ اس کے لیے جو طریقہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے اختیار کیا اور جس کی وضاحت حدیث و فقہ کی کتابوں میں اس زمانہ کے بعض مقدمات کی رودادوں سے ہوتی ہے:

(ا) مار کے لیے خواہ کوڑا استعمال کیا جائے یا بید، دونوں صورتوں میں، وہ نہ بہت موٹا اور سخت ہونا چاہیے اور نہ بہت پتلا اور نرم، بلکہ اوسط درجے کا ہونا چاہیے۔

(ب) مار بھی اوسط درجے کی ہونی چاہیے، اور مار کا کام اجڈ اور پیشہ ور جلادوں سے نہیں لینا چاہیے، بلکہ یہ خدمت قوم کے صاحب علم و بصیرت بزرگوں کو انجام دینی چاہیے۔

(ج) مجرم کو ننگا کر کے اور ٹکٹکی پر باندھ کر نہیں مارنا چاہیے۔

(د) مار ایسی نہیں ہونی چاہیے جو زخم ڈال دے اور نہ ایک ہی جگہ مارنا چاہیے بلکہ منہ اور شرم گاہ کو چھوڑ کر باقی تمام جسم پر مار کو پھیلا دینا چاہیے۔"

میزان

جاوید احمد غامدی

حدود و تعزیرات

(۲)

عام جرائم

عام جرائم میں سے، انسان کی تین اہم ترین چیزوں: جان، مال اور آبرو سے متعلق، یہ صرف چار بڑے جرائم ہیں، جن کی سزائیں اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمائیں، اور انھیں قیامت تک کے لیے اپنی واجب الاطاعت شریعت قرار دیا ہے۔ ان جرائم کے لیے بھی یہ سزائیں، جیسا کہ آگے واضح ہوگا، صرف اس صورت میں ہیں، جب کہ مجرم اپنے حالات کے لحاظ سے کسی رعایت کا مستحق نہ ہو اور اس سے جرم بالکل آخری صورت میں سرزد ہو جائے۔ ان جرائم کی ادنیٰ صورتوں اور ان کے علاوہ دوسرے سب جرائم کا معاملہ اللہ تعالیٰ نے اسلامی حکومت اور اس کے ارباب حل و عقد پر چھوڑ دیا ہے، اور وہ 'امرھم شوریٰ بینھم' کی رو سے، یقیناً، اس کے مجاز ہیں کہ باہمی مشورے سے جو سزا چاہیں، ان کے مرتکبین کے لیے تجویز کریں۔

یہ چار بڑے جرائم حسب ذیل ہیں:

۱۔ قتل و جراحت

۲۔ سرقہ

۳۔ زنا

۴۔ قذف

ان جرائم کی جو سزائیں، قرآنِ مجید میں بیان ہوئی ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے:

قتل و جراحت

سب سے پہلے قتل و جراحت کو لیجیے۔ اس کی دو صورتیں ہیں:

ایک یہ کہ جان بوجھ کر کسی شخص کو قتل کر دیا جائے یا اسے کوئی زخم لگایا جائے، یا اس کے کسی عضو کو کوئی نقصان پہنچایا جائے،

دوسرے یہ کہ اس طرح کا کوئی حادثہ کسی شخص کی غلطی کی وجہ سے پیش آجائے۔

پہلی صورت میں، جہاں تک قتل کا تعلق ہے، قرآنِ مجید کے نزدیک، یہ ایسا سنگین جرم ہے کہ ایک انسان کے قتل کو، اس نے پوری انسانیت کا قتل، اور اس کے احیا کو پوری انسانیت کا احیا قرار دیا ہے۔ اس کا ارشاد ہے:

اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ	"جس نے کسی کو قتل کیا، اس کے بغیر کہ
اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا	اُس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں کوئی
قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ	فساد برپا کیا ہو، تو اس نے گویا سب انسانوں
اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ	کو قتل کیا اور جس نے اسے بچایا، اس نے
جَمِيْعًا۔ (المائدہ ۵: ۳۲)	گویا سب انسانوں کو بچا لیا۔"

اس صورت میں، قرآنِ مجید نے اس کے مرتکبین کو، بالخصوص جب وہ کسی مسلمان کو قتل کریں، قیامت میں ابدی جہنم کا مستحق قرار دیا اور پوری صراحت کے ساتھ فرمایا ہے:

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا	"اور جو کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے،
فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا	اس کی سزا جہنم ہے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہے
فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ	گا، اور اس پر اللہ کا غضب اور اس کی
وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا	لعنت ہوئی اور اس کے لیے، اُس نے
عَظِيْمًا۔ (النساء ۴: ۹۳)	بڑا سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

چنانچہ اس جرم سے متعلق جو فرائض، قرآنِ مجید کے اس نقطۂ نظر کی رو سے، اس کتاب کے حاملین پر عائد ہوتے، اور جن ذمہ داریوں کے وہ مکلف ٹھیرتے ہیں، وہ استاذ امام امین احسن اصلاحی

کے الفاظ میں یہ ہیں:

"ایک یہ کہ ہر حادثۂ قتل پوری قوم میں ایک ہلچل پیدا کر دے۔ جب تک اس کا قصاص نہ لے لیا جائے، ہر شخص یہ محسوس کرے کہ وہ اس تحفظ سے محروم ہو گیا ہے، جو اس کو اب تک حاصل تھا۔ قانون ہی سب کا محافظ ہوتا ہے۔ اگر قانون ہدم ہو گیا تو صرف مقتول ہی قتل نہیں ہوا، بلکہ ہر شخص قتل کی زد میں ہے۔

دوسری یہ کہ قاتل کا کھوج لگانا، صرف مقتول کے وارثوں ہی کی ذمہ داری نہیں ہے، بلکہ پوری جماعت کی ذمہ داری ہے، اس لیے کہ قاتل نے صرف مقتول ہی کو قتل نہیں کیا، بلکہ سب کو قتل کیا ہے۔

تیسری یہ کہ کوئی شخص اگر کسی کو خطرے میں دیکھے، تو اس کو پرایا جھگڑا سمجھ کر نظرانداز کرنا اس کے لیے جائز نہیں ہے، بلکہ اس کی حفاظت و حمایت تا بہ حدِ مقدور اس کے لیے ضروری ہے۔ اگرچہ اس کے لیے اسے خود جوکھم برداشت کرنی پڑے۔ اس لیے کہ جو شخص کسی مظلوم کی حمایت و مدافعت میں سینہ سپر ہوتا ہے، وہ صرف مظلوم ہی کی حمایت میں سینہ سپر نہیں ہوتا، بلکہ تمام خلق کی حمایت میں سینہ سپر ہوتا ہے، جس میں وہ خود بھی شامل ہے۔

چوتھی یہ کہ کوئی شخص اگر کسی قتل کو چھپاتا ہے یا قاتل کے حق میں جھوٹی گواہی دیتا ہے یا قاتل کا ضامن بنتا ہے، یا قاتل کو پناہ دیتا ہے، یا قاتل کی دانستہ وکالت کرتا ہے یا دانستہ اس کو جرم سے بری کرتا ہے، وہ گویا خود اپنے اور اپنے باپ، بھائی، بیٹے کے قاتل کے لیے یہ سب کچھ کرتا ہے، کیونکہ ایک کا قاتل سب کا قاتل ہے۔

پانچویں یہ کہ کسی مقتول کے قصاص کے معاملے میں مقتول کے وارثوں یا حکام کی مدد کرنا بھی درحقیقت مقتول کو زندگی بخشنا ہے۔ اس لیے کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ قصاص میں زندگی ہے۔" (تدبرِ قرآن، ج ۲، ص ۵۰۲)

قتل کی اس صورت میں اسلام کا قانون یہ ہے کہ اس میں اصل مدعی حکومت نہیں، بلکہ مقتول کے اولیا ہیں۔ حکومت کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اُن کی مدد کرے اور جو کچھ وہ چاہیں، اسے پوری قوت کے ساتھ ٹھیک ٹھیک نافذ کر دے۔

غور کیجیے تو اس معاملے میں اسلامی قانون کا یہی اصول ہے جو اسے موجودہ قوانین سے ممتاز کرتا اور مجرم کو اس طرح اُن لوگوں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر جن کے خلاف جرم کا ارتکاب ہوا ہے، نہ صرف یہ کہ اُن کی آتشِ انتقام بجھا دیتا، بلکہ قتل وجراحت جیسے جرائم سے مسموم معاشروں میں، فی الواقع، اس زہر کا تریاق بن جاتا ہے۔ استاد امام لکھتے ہیں:

"قصاص کے معاملے میں مقتول کے اولیا کی مرضی کو اسلام نے یہ اہمیت جو دی ہے، یہ مختلف پہلوؤں سے نہایت حکیمانہ ہے۔ قاتل کی جان پر مقتول کے وارثوں کو براہِ راست اختیار مل جانے سے ایک تو ان کے بہت بڑے زخم کے اندمال کی ایک شکل پیدا ہوتی ہے، دوسرے اگر اس صورت میں یہ کوئی نرم رویہ اختیار کریں، تو قاتل اور اس کے خاندان پر یہ ان کا براہِ راست احسان ہوتا ہے، جس سے نہایت مفید نتائج کی توقع ہو سکتی ہے۔"

(تدبرِ قرآن، ج ۱، ص ۴۳۳)

تاہم اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مقتول کے اولیا اپنی اس حیثیت میں حدود سے تجاوز کریں، اور مثال کے طور پر جوشِ انتقام میں قاتل کے علاوہ دوسروں کو بھی قتل کرنے کی کوشش کریں، یا اپنی شرافت ونجابت اور برتری کے زعم میں، اپنے غلام کے بدلے میں آزاد اور عورت کے بدلے میں مرد کے قتل کا مطالبہ کریں، یا مجرم کو عذاب دے دے کر ماریں، یا مار دینے کے بعد اس کی لاش پر غصہ نکالیں، یا قتل کے ایسے طریقے اختیار کریں، جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے، مثلاً، آگ میں جلانا یا مثلہ کرنا۔ اسی طرح جراحت کی صورت میں، جب کہ مجرم کو، اگر اس سے بدلہ لیا جائے، تو اس کے پہنچائے ہوئے نقصان سے زیادہ نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہو، وہ عضو کے بدلے عضو اور زخم کے بدلے زخم ہی پر اصرار کریں۔

ارشادِ خداوندی ہے:

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا، فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا، فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ، اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا. (بنی اسرائیل ۱۷: ۳۳)	"اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو، اس کے ولی کو ہم نے اختیار دیا ہے۔ لہٰذا وہ اب قتل میں حدود سے تجاوز نہ کرے۔ اس لیے کہ اس کی مدد کی گئی ہے۔"

اس میں یہ بات، البتہ، بالبداہت واضح ہے کہ مقتول اگر لاوارث ہو، یا اس کے وارث تو ہوں، لیکن وہ کسی وجہ سے مقتول کے معاملے میں کوئی دل چسپی نہ رکھتے ہوں، یا اُن کی اصل دل چسپی ہی کسی سبب سے مقتول کے بجائے قاتل اور اس کے شرکا کے ساتھ ہو جائے، تو حکومت، یقیناً، مدعی ہو گی، اور وہی اختیار جو مقتول کے اولیا کو حاصل ہے، وہ اس صورت میں اسے حاصل ہو جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

من ترک کلا فالی و من ترک مالا فلورثتہ۔	"جس نے ذمہ داریوں کا کوئی بار چھوڑا ہو، تو وہ (ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے)
وانا وارث من لا وارث لہ۔	میرے ذمہ ہے، اور جس نے مال چھوڑا، تو وہ اس کے وارثوں کا حق ہے۔ جس کا کوئی
(ابوداؤد، کتاب الفرائض)	وارث نہیں، اس کا البتہ، میں وارث ہوں۔"

اس اختیار کی وضاحت قرآنِ مجید میں یہ کی گئی ہے کہ اولیا اگر چاہیں، تو جان کے بدلے میں جان، عضو کے بدلے میں عضو، اور زخم کے بدلے میں زخم کی سزا پر اصرار کریں، اور چاہیں تو عفو و درگزر سے کام لیں، اور اپنے بھائی کا گناہ اسے معاف کر دیں۔ سورۂ بقرہ میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ۔ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ، فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ۔ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ ، فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۔ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ	"اے ایمان والو، تم میں سے جو قتل کر دیے جائیں، اُن کا قصاص تم پر فرض کیا گیا ہے۔ اس طرح کہ قاتل اگر آزاد ہو، تو اس کے بدلے میں وہی آزاد، اور غلام ہو تو اس کے بدلے میں وہی غلام، اور عورت ہو تو اس کے بدلے میں وہی عورت۔ پھر جس کے لیے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ رعایت کی گئی، تو دستور کے مطابق اس کی پیروی کی جائے اور جو کچھ بھی خوں بہا ہو، وہ خوبی کے ساتھ ادا کر دیا جائے۔ یہ تمھارے پروردگار کی طرف سے

يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۔ (٢ : ١٧٨-١٧٩)

ایک قسم کی رعایت اور تم پر اس کی عنایت ہے۔ چنانچہ اس کے بعد اگر کوئی شخص زیادتی کرے، تو اس کے لیے دردناک سزا ہے۔ اور تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے، اے عقل والو، تاکہ تم حدودِ الٰہی کی پابندی کرتے رہو۔"

اسی طرح سورۂ مائدہ میں تورات کے حوالے سے فرمایا ہے :

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ۔ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ، فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ (٥ : ٤٥)

"اور ہم نے اُن پر اس میں فرض کیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت، اور اسی طرح دوسرے زخموں کا بھی قصاص ہے۔ پھر جس نے معاف کر دیا تو وہ مجرم کے لیے کفارہ ہے۔ اور جو اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلے نہ کریں، لاریب، وہی ظالم ٹھیریں گے۔"[1]

ان آیات میں جو قانون بیان ہوا ہے، وہ حسب ذیل تین دفعات پر مبنی ہے :

اوّل یہ کہ قصاص[2] ایک فرض ہے جو اسلامی حکومت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کیا گیا

---

[1] آیت میں کوئی اشارہ چونکہ اس کے نسخ کا موجود نہیں ہے، بلکہ اندازِ بیان اس کے محکم ہونے پر دلالت کرتا ہے، اس وجہ سے قصاص کا یہ حکم جس طرح یہود کے لیے تھا، اسی طرح، لاریب، ہمارے لیے بھی ہے۔

[2] قصاص 'قصص' سے ہے، جس کے اصل معنی کسی کے پیچھے، اس کے نقشِ قدم کے ساتھ ساتھ چلنے کے ہیں۔ اسی سے یہ اس سزا کے لیے استعمال ہوا جس میں مجرم کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جائے جو اس نے دوسرے کے ساتھ کیا ہے۔ اپنے وسیع معنی کے لحاظ سے عربی زبان میں یہ قصاص جانی اور مالی، دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ہے۔ اسلامی معاشرے کے لیے اسی میں زندگی ہے اور مسلمانوں کے لیے یہ اللہ کا نازل کردہ وہ قانون ہے، جس سے انحراف صرف ظالم ہی کرتے ہیں۔ چنانچہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ اس کے علاقہ میں، اگر کوئی شخص قتل کر دیا جائے، تو اس کے قاتلوں کا سراغ لگائے، انھیں گرفتار کرے، اور قانون کے مطابق مقتول کے اولیا کی مرضی، ان پر ٹھیک ٹھیک نافذ کر دے۔

دوم یہ کہ قصاص کے معاملہ میں پوری مساوات ملحوظ رہنی چاہیے۔ لہٰذا اگر کوئی غلام قاتل ہے، تو اس کے بدلے میں وہی غلام، اور آزاد قاتل ہے، تو اس کے بدلے میں وہی آزاد قتل کیا جائے۔ کسی شخص کا معاشرتی اور سماجی مرتبہ اس معاملے میں ہرگز کسی ترجیح کا باعث نہیں بننا چاہیے۔

سوم یہ کہ خود مجروح ہو یا مقتول کے اولیا، اُن کے لیے اس میں دو ہی راستے ہیں: ایک یہ کہ وہ جان کے بدلے میں جان، عضو کے بدلے میں عضو، اور زخم کے بدلے میں زخم کا مطالبہ کریں، اور دوسرے یہ کہ وہ مجرم کو معاف کر دیں، اور اس سے دیت قبول کر لیں۔ یہ دوسری صورت قرآن کا ارشاد ہے کہ پروردگارِ عالم کی طرف سے لوگوں کے لیے ایک رعایت، اور اُن پر اس کی عنایت ہے۔ چنانچہ اس جرم کے متاثرین اگر اسے قبول کریں گے، تو اُن کی یہ معافی مجرم کے لیے کفارہ بن جائے گی،[1] اور اس کے نتیجے میں حکومت اس پر گرفت نہ کرے گی۔

چہارم یہ کہ مجروح یا مقتول کے اولیا اگر دیت پر راضی ہو جائیں تو یہ نہایت حسن و خوبی کے ساتھ ادا کی جائے۔

استاد امام لکھتے ہیں:

> "حسن و خوبی کے ساتھ ادائیگی کی تاکید اس لیے فرمائی کہ عرب میں دیت کی ادائیگی، بالعموم، نقد کی صورت میں نہیں، بلکہ جنس و مال کی شکل میں ہوتی تھی۔ اس وجہ سے اگر ادائیگی کرنے والوں کی نیت اچھی نہ ہوتی تو وہ اس میں بہت کچھ چالیں چل سکتے تھے۔ یہ بات بڑی آسانی سے ممکن ہے کہ اونٹوں یا بکریوں یا غلہ اور کھجور کی مقدار و کیفیت کے لحاظ سے تو دیت کا مطالبہ پورا

---

[1] قرآنِ مجید کا یہ ارشاد اس معاملے میں بالکل قطعی ہے کہ اس کے بعد حکومت مجرم کو، اس جرم میں، ہرگز کوئی سزا نہیں دے سکتی۔

کر دیا جائے، لیکن باعتبارِ حقیقت و کیفیت اس کی حیثیت محض خانہ پری ہی کی ہو۔ اگر ایسا ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان لوگوں کے احسان کی کوئی قدر نہیں کی گئی، جنھوں نے ایک شخص کی جان پر شرعی اختیار پا کر اس کو معاف کر دیا اور اس کی طرف سے مال قبول کر لینے پر راضی ہو گئے۔ ان کے احسان کا جواب تو احسان ہی ہونا چاہیے۔ یعنی دیت کی ادائیگی اس خوبی، فیاضی اور کشادہ دلی کے ساتھ کی جائے کہ ان کو یہ صدمہ نہ اٹھانا پڑے کہ انھوں نے اپنے ایک عزیز کے خون کے بدلے میں بھیڑ بکریاں قبول کر کے کوئی غلطی یا بے غیرتی کی۔"

(تدبر قرآن، ج ۱، ص ۴۲۴)

اس قانون کے الفاظ میں، کسی استثنا کے لیے کوئی گنجایش نہیں ہے۔ بعض فقہا نے اس معاملے میں جن دو روایتوں سے استدلال کیا ہے، یعنی، 'لا یقتل مسلم بمشرک'[1] (کسی مشرک کے قصاص میں کوئی مسلمان قتل نہ ہوگا)، اور 'لا یقاد بالولد الوالد'[2] (بیٹے کے قصاص میں باپ کو قتل نہیں کیا جائے گا)، اُن کا مدعا سمجھنے میں، اُن سے غلطی ہوئی ہے۔ ان میں سے پہلی روایت صرف اُن مشرکینِ عرب سے متعلق ہے جن کے بارے میں، قرآنِ مجید نے سورۂ توبہ میں اللہ تعالیٰ کا یہ قطعی حکم بیان کیا ہے[3] کہ رسول کی قوم ہونے کی وجہ سے، اُن کی جان کی حرمت، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے، اتمامِ حجت کے بعد، ۱۰ ہجری محرم کے آخری دن سے ختم کر دی گئی تھی، اور دوسری روایت کا تعلق، صرف اس صورت سے ہے، جب بیٹا باپ کے کسی تادیبی اقدام کے نتیجے میں، اس کے ہاتھ سے قتل ہو جائے۔[4]

اسلامی قانون میں یہ، عمداً کسی شخص کو قتل کر دینے، اسے زخم لگانے، یا اس کے کسی عضو کو نقصان پہنچانے کی سزا ہے۔ رہی اس جرم کی وہ صورت کہ اس طرح کا کوئی حادثہ کسی غلطی کی وجہ

---

[1] سنن الدارمی، کتاب الدیات، باب ۵

[2] سنن الدارمی، کتاب الدیات، باب ۶

[3] ۹: ۵

[4] باپ اور بیٹے کے رشتے میں یہ صورت، ظاہر ہے کہ قتلِ عمد قرار نہیں دی جا سکتی۔

سے پیش آجائے[1] تو اس کی سزا، قرآنِ مجید کی رو سے، بعض صورتوں میں، دیت اور کفارہ، اور بعض صورتوں میں، صرف کفارہ ہے، اِلّا یہ کہ مجروح خود یا مقتول کے اولیا اسے معاف کر دیں۔

اس صورت میں جان کے بدلے میں جان، زخم کے بدلے میں زخم اور عضو کے بدلے میں عضو کا مطالبہ کسی شخص سے نہیں کیا جا سکتا۔

ارشاد فرمایا ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ	"کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ
مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَ مَنْ قَتَلَ	دوسرے مسلمان کو قتل کرے، مگر یہ کہ اس
مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ	کی کسی غلطی کی وجہ سے ایسا ہو جائے۔ اور
مُّؤْمِنَةٍ وَّ دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى	جو شخص اس طرح، غلطی سے، کسی مسلمان کو
اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۚ فَاِنْ	قتل کر دے، تو اس پر لازم ہے کہ ایک مسلمان
كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ	کو غلامی سے آزاد کرے، اور مقتول کے
وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ	وارثوں کو خوں بہا دے، اِلّا یہ کہ وہ اسے
مُّؤْمِنَةٍ ۚ وَاِنْ كَانَ مِنْ	معاف کر دیں۔ پھر اگر مقتول تمھاری کسی دشمن
قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ	قوم کا فرد ہو، لیکن مسلمان ہو، تو ایک مسلمان کو
فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَ	غلامی سے آزاد کر دینا ہی کافی ہے۔ اور اگر
تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ	وہ کسی معاہد قوم کا فرد ہو، تو اس کے وارثوں
لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ	کو دیت بھی دی جائے گی، اور تم ایک مسلمان

---

[1] چنانچہ اگر غلطی نہ ہو تو یہ قانون اس سے متعلق نہ ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی اصول پر فرمایا ہے: 'العجماء جبار، والبئر جبار والمعدن جبار' (بخاری، کتاب الزکاۃ)، (جانور نے مارا ہو تو اس کے مالک پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ کنوئیں میں گرا ہو تو اس کے مالک پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ کان میں حادثہ پیش آجائے، تو اس کے مالک پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے)۔ یعنی اس صورت میں کوئی ذمہ داری نہیں ہے، جب مالک کی کسی غلطی کو اس میں کوئی دخل نہ ہو۔

مُتَتَابِعَيْنِ، تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ، وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا. (النساء ۴: ۹۲)

غلام بھی آزاد کرو گے۔ پھر جس کے پاس غلام نہ ہو، اسے لگاتار دو مہینے کے روزے رکھنا ہوں گے۔ یہ اللہ کی طرف سے اس گناہ پر توبہ کا طریقہ ہے، اور اللہ علیم و حکیم ہے۔"

یہ قانون بھی تین ہی دفعات پر مبنی ہے :

اول یہ کہ مقتول اگر اسلامی ریاست کا کوئی مسلمان شہری ہے یا مسلمان تو نہیں لیکن کسی معاہد قوم سے تعلق رکھتا ہے تو قاتل پر لازم ہے کہ اسے اگر معاف نہیں کر دیا گیا تو وہ دیت ادا کرے اور اس جرم کے کفارہ میں اور اپنے پروردگار کے حضور میں توبہ کے لیے اس کے ساتھ ایک مسلمان غلام بھی آزاد کرے۔

دوم یہ کہ وہ اگر دشمن قوم کا کوئی مسلمان ہے، تو اس پر دیت کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس صورت میں یہی کافی ہے کہ اپنے اس گناہ کو دھونے کے لیے، وہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کر دے۔

سوم یہ کہ ان دونوں صورتوں میں اگر غلام میسر نہ ہو، تو اس کے بدلے میں مسلسل دو مہینے کے روزے رکھے۔

یہ کسی شخص کے غلطی سے قتل ہو جانے کا حکم ہے۔ لیکن بالبداہت، واضح ہے کہ جراحات کا حکم بھی یہی ہونا چاہیے۔ چنانچہ ان میں بھی دیت ادا کی جائے گی، اور اس کے ساتھ، کفارہ کے روزے بھی دیت کی مقدار کے لحاظ سے، لازماً رکھے جائیں گے۔ یعنی مثال کے طور پر اگر کسی زخم کی دیت ایک تہائی مقرر کی گئی ہے، تو کفارہ کے بیس روزے بھی، لازماً رکھنا ہوں گے۔

قتل عمد اور قتل خطا کے اس قانون میں قصاص اور کفارے کا معاملہ تو بالکل واضح ہے، لیکن قتل و جراحت کی ان دونوں صورتوں میں دیت یا خوں بہا ادا کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے، اس کے بارے میں یہ سوالات، البتہ پیدا ہوتے ہیں :

۱۔ دیت کس طریقے سے، اور کتنی دی جائے گی ؟

۲۔ اس کی حقیقت کیا ہے ؟ یہ کیا اُس معاشی نقصان کا بدل ہے، جو مجرم کی طرف سے مقتول کے وارثوں یا خود مجروح کو پہنچا ہے، یا جان یا عضو کی قیمت ہے، یا اس کے سوا کوئی

تیسری چیز ہے؟

پہلے سوال کے جواب میں، قرآنِ مجید کی ان آیات ہی پر غور کیجیے، جو اس قانون سے متعلق ہم نے اوپر نقل کی ہیں۔

سورۂ نساء کی آیت ۹۲ میں اس کے لیے 'دیة مسلمة الی اهله' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ راجح یہی ہے کہ انھیں خبرِ محذوف کا مبتدا قرار دیا جائے، یعنی 'فعلیه رقبة مومنة و دية مسلمة'۔ لفظِ 'دیة' اس آیت میں نکرہ آیا ہے۔ اسمِ نکرہ کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ اپنے معنی کی تعیین کے لیے یہ لغت و عرف اور سیاقِ کلام کی دلالت کے سوا کبھی کسی شے کا محتاج نہیں ہوتا۔ قرآنِ مجید میں، مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

'ان اللّٰه يامركم ان تذبحوا بقرة'[1] (بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو)۔ لفظِ 'بقرة' اس آیت میں نکرہ استعمال ہوا ہے۔ اس وجہ سے یہ بالکل قطعی ہے کہ یہود کو بس وہ جانور ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا جس کے لیے اہلِ عرب کے لغت و عرف میں لفظ 'بقرة' استعمال کیا جاتا ہے۔ وہ اگر کوئی سی گائے ذبح کر دیتے تو حکم کا منشا، بے شک پورا ہو جاتا۔ اس کے برعکس 'اقيموا الصلوٰة' کو دیکھیے۔ اس میں لفظِ 'صلوٰة' چونکہ لامِ عہد کے ساتھ آیا ہے، اس وجہ سے یہ اب علمِ اصول کی اصطلاح میں 'مجمل مفتقر الی البیان' ہے اور لغت و عرف سے اس کے معنی معلوم ہو جانے کے بعد بھی ناگزیر ہے کہ حکم کا مدعا جاننے کے لیے خود شارع کی طرف رجوع کیا جائے۔ لیکن قرآنِ مجید اگر اسے نکرہ کی صورت میں لاتا تو حکم کا مدعا پوری قطعیت کے ساتھ خود اسی سے واضح ہو جاتا۔ ہم اسے پڑھتے تو بے تکلف سمجھ لیتے کہ ہمیں بس اُس شے کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے، جو عرب جاہلی میں 'صلوٰة' کے نام سے معروف تھی۔ گویا عربیت کی رو سے متکلم اگر وجوب کے حکم میں اُس شے کا ذکر جسے واجب ٹھہرایا گیا ہے، اسمِ نکرہ کی صورت میں کرے گا، تو اس کے معنی ہی یہ ہوں گے کہ اس نے ہمیں اس معاملہ میں 'عرف' کی پیروی کا حکم دیا ہے۔ پھر اسمِ نکرہ کی دلالت چونکہ بہرحال تعمیم پر ہوتی ہے، اس وجہ سے سیاقِ کلام میں کوئی چیز اگر مانع نہ ہوگی، تو اس اسم کے سارے مسمیٰ بغیر کسی تعیین و تخصیص کے اس کے دائرۂ

---

[1] البقره ۲: ۶۷

اطلاق میں شامل سمجھے جائیں گے۔ چنانچہ آیۂ زیربحث میں 'دیة' کے معنی ہیں: وہ شے جو 'دیت' کے نام سے معروف ہے۔ اور 'دیة مسلمة الی اهله' کے الفاظ حکم کے جس منشا پر دلالت کرتے ہیں، وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ مخاطب کے 'عرف' میں جس چیز کا نام 'دیت' ہے، وہ مقتول کے ورثہ کے سپرد کر دی جائے۔

سورۂ بقرہ کی آیت ۱۷۸ میں، قرآنِ مجید نے جہاں قتلِ عمد کی دیت کا حکم بیان کیا ہے، وہاں یہی بات لفظِ 'معروف' کی صراحت کے ساتھ بیان فرمائی ہے:

فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ۔ (البقرہ ۲: ۱۷۸)	"پھر جس کے لیے اُس کے بھائی کی طرف سے کچھ رعایت کی گئی، تو 'معروف' کے مطابق اس کی پیروی کی جائے، اور جو کچھ بھی خوں بہا ہو، وہ خوبی کے ساتھ ادا کر دیا جائے۔"

نساء اور بقرہ کی ان آیات سے واضح ہے کہ قتلِ خطا اور قتلِ عمد دونوں میں قرآنِ مجید کا حکم یہی ہے کہ دیت معاشرے کے دستور اور رواج کے مطابق ادا کی جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں اسے ہی نافذ کیا۔ روایات میں، اس کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ عرب کے دستور کی وضاحت ہے۔ اس میں کوئی چیز بھی خود پیغمبر کا فرمانِ واجب الاذعان نہیں ہے۔

دیت سے متعلق عرب کا یہ دستور کیا تھا؟ شعرائے جاہلیت کے کلام اور ایام العرب کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں ہر اس شخص کی دیت، جس کا نسبی تعلق کسی قبیلہ کے ساتھ صریح ہو، دس اونٹ مقرر تھی۔ قبیلہ کے حلیف اور باندی کے بیٹے کی دیت 'صریح' کی دیت کا نصف اور عورت کی دیت مرد کی دیت کے مقابلے میں آدھی تھی۔ صاحبِ "اغانی" اوس و خزرج کے مابین ایک جنگ کے واقعات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وكانت دية المولى فيهم، وهو الحليف، خمساً من الابل، ودية الصريح عشراً۔ (ج۳، ص ۴۱)	"اور ان کے ہاں مولیٰ یعنی حلیف کی دیت پانچ اونٹ اور صریح یعنی اس شخص کی دیت جس کا نسبی تعلق کسی قبیلہ کے ساتھ قطعی ہو، دس اونٹ مقرر تھی۔"

"المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام" کے مصنف جواد علی نے لکھا ہے :

واما اذا کان القتیل ھجینا، فتکون دیتہ نصف دیۃ الصریح، وتکون دیۃ المرأۃ نصف دیۃ الرجل۔ (ج ۵ ، ص ۵۹۲)

"اور مقتول اگر باندی کا بیٹا ہو تو اس کی دیت 'صریح' کی دیت کے مقابلے میں آدھی اور عورت کی دیت مرد کی دیت کا نصف ادا کی جاتی تھی۔"

بعض قبائل اپنے شرف کی بنا پر دہری دیت لیتے اور بعض فضل و عنایت کے طور پر دوسروں کو دہری دیت ادا کرتے تھے۔ "المفصل" ہی میں ہے :

روی ان الغطارلیف وھم قوم الحارث بن عبد اللّٰہ بن بکر بن یشکر کانوا یاخذون للمقتول منھم دیتین ، و یعطون غیرھم دیۃ واحدۃ اذا وجبت علیھم، وکان لبنی عامر بن بکر بن یشکر وھم من الغطارلیف ایضاً ، وقد عرف عامر المذکور بالغطریف دیتان ولسائر قومہ دیۃ۔ وورد ان بنی الاسود بن رزن کانوا یودون فی الجاھلیۃ دیتین دیتین۔ (ج ۵ ، ص ۵۹۳)

"بیان کیا جاتا ہے کہ غطارلیف یعنی حارث بن عبداللّٰہ بن بکر بن یشکر کی قوم کے لوگ اپنے مقتول کے لیے دو دیتیں لیتے، اور دوسروں کو، اگر خود اُن پر دیت ادا کرنا واجب ہو جائے، تو ایک دیت دیتے تھے۔ بنی عامر بن بکر بن یشکر کے لیے، جن کے بزرگ عامر ہی کو غطریف کہا جاتا تھا، دو دیتیں اور باقی ساری قوم کے لیے ایک دیت مقرر تھی۔ اسی طرح روایات میں آیا ہے کہ بنی اسود بن رزن جاہلیت کے زمانے میں دوسروں کو دوہری دیت ادا کرتے تھے۔"

جواد علی لکھتے ہیں :

ولم یکن ھذا التحدید عن ضعف ، وانما ھو رغبۃ منھم فی الإفضال علی ذوی القتیل۔

"اور دوہری دیت ادا کرنے کی یہ پابندی کسی ضعف کی بنا پر نہیں، بلکہ ان کی طرف سے مقتول کے ورثہ پر فضل و عنایت کے طور

(المفصل، ج ۵، ص ۵۹۲)   پر تھی:

پادشاہوں کی دیت ایک ہزار اونٹ مقرر تھی، اور اسے 'دیة الملوک' کہا جاتا تھا. قراد بن حنش الصاردی بنی فزارہ کی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے:

ونحن رهنا القوس ثمت فوديت   بالف على ظهر الفزارى اقرعا

"اور ہم نے کمان رہن رکھی، پھر فزاری کے مال میں سے پورے ایک ہزار اونٹ اس کے لیے بطور فدیہ دیے گئے۔"

بعشر مئين للملوك سعى بها   ليوفى سيار بن عمرو فاسرعا

"یعنی دس سو اونٹ جو بادشاہوں کی دیت ہے۔ اس کے ایفا کے لیے سیار بن عمرو نے کوشش کی اور یہ ذمہ داری بغیر کسی تاخیر کے پوری کر دی۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے چند سال پہلے اس دستور میں ایک غیر معمولی تبدیلی واقع ہوئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ انھیں دس بیٹے عطا کریں گے تو وہ اُن میں سے ایک قربانی کے طور پر ذبح کر دیں گے۔ چنانچہ جب اللہ نے ان کی آرزو پوری کر دی تو انھوں نے بھی اپنی نذر پوری کرنی چاہی۔ بیٹے کے انتخاب کے لیے قرعہ ڈالا گیا تو وہ عبداللہ کے نام پر نکلا۔ عبدالمطلب انھیں قربان گاہ کی طرف لے جا رہے تھے کہ لوگوں نے انھیں روکا اور بیٹے کے فدیہ میں اونٹ ذبح کرنے کا مشورہ دیا۔ اُس زمانے میں، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، دیت کی مقدار دس اونٹ مقرر تھی۔ چنانچہ دس دس اونٹوں اور عبداللہ کے نام پر قرعہ ڈالا گیا۔ ہر مرتبہ قرعہ عبداللہ ہی کے نام پر نکلا۔ یہاں تک کہ اونٹوں کی تعداد سو ہو گئی۔ اس مرتبہ قرعہ ڈالا گیا تو اونٹوں پر نکلا۔ اس واقعہ کے بعد روایات میں آتا ہے کہ عربوں، بالخصوص قریش میں دیت کی مقدار سو اونٹ قرار پائی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

كانت الدية يومئذ عشرًا من الإبل، وعبد المطلب اول من سن دية النفس مائة من الإبل، فجرت فى قريش والعرب مائة من الإبل.	"دیت اس زمانے میں دس اونٹ تھی۔ یہ عبدالمطلب ہیں، جنھوں نے سب سے پہلے سو اونٹ دیت مقرر کی۔ چنانچہ قریش اور عرب میں دیت کی یہی مقدار رائج ہو گئی۔"

(الطبقات الکبریٰ، ابن سعد ج ۱، ص ۸۹)

زہیر بن ابی سلمیٰ نے اپنے معلقہ میں دیت کی یہی مقدار بیان کی ہے۔ عبس اور فزارہ کی لڑائی میں تین ہزار اونٹ بطورِ دیت ادا کرنے کی وجہ سے، وہ عرب کے دو سرداروں ہرم بن سنان اور حارث بن عوف کی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے :

تعفی الکلوم بالمئین فاصبحت ینجمها من لیس فیها بمجرم

"کئی سو اونٹوں کے ذریعے سے زخم شائے جائیں گے۔ چنانچہ جو شخص بے گناہ تھے، تھوڑے تھوڑے کرکے یہ اونٹ دیت کے طور پر دینے لگے۔"

زہیر کے اس شعر سے یہ بات واضح ہے کہ عبس و فزارہ کے مقتولین کی یہ دیت بالاقساط ادا کی گئی۔ "اغانی" میں ہے :

وکانت ثلاثة آلاف بعیر فی ثلاث سنین۔ (ج ۱۰، ص ۲۹۷)

"چنانچہ یہ تین ہزار اونٹ تھے جو تین سال میں ادا کیے گئے۔"

اسی معلقہ میں زہیر نے بیان کیا ہے کہ دیت کے طور پر 'افال' یعنی چھوٹی عمر کے اونٹ دیے جاتے تھے۔ وہ کہتا ہے :

فاصبح یحدی فیهم من تلادکم مغانم شتی من افال مزنم

"تمھارے موروثی مال میں سے متفرق غنائم جو 'افال' یعنی اچھی نسل کے پورے ہوتے ہیں، مقتولین کے وارثوں کی طرف روانہ کیے جاتے ہیں۔"

'افال' کی تخصیص کے بارے میں شارحِ "معلقات" زوزنی لکھتے ہیں :

خص الصغار لان الدیات تعطی من بنات اللبون والحقاق والاجذاع۔ (شرح المعلقات، زوزنی، ص ۸۰)

"شاعر نے بالخصوص چھوٹی عمر کے اونٹوں کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ دیت کے طور پر دو سالہ، سہ سالہ، چہار سالہ اونٹ ہی دیے جاتے تھے۔"

جراحات کی دیت بھی عرب میں رائج تھی۔ چنانچہ لغتِ عرب کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب جاہلی کی زبان میں 'ارش' اور 'نذر' کے الفاظ دوسرے معانی کے علاوہ اس کے لیے بھی استعمال کیے جاتے تھے۔ "لسان العرب" میں ہے :

اصل الارش الخدش، ثم قیل

"'ارش' کی اصل 'خدش' یعنی خراش یا زخم

لما يوخذ دية لها ارش ، واهل الحجاز يسمونه النذر ۔	ہے۔ پھر یہ اس مال کے لیے بھی مستعمل ہوا جو جراحات کی دیت کے طور پر لیا جاتا تھا۔ اہلِ حجاز کے ہاں اس کے لیے لفظ 'نذر' استعمال ہوتا تھا۔"
(ج ٦ ، ص ٢٦٣)	

عرب کا یہی دستور ہے، جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، قرآنِ مجید کے ارشاد کے مطابق، جیساکہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے، اپنے زمانے میں نافذ کیا۔ چنانچہ اس باب کی بعض روایات میں یہ بات بالصراحت بیان ہوئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت کے معاملات اسی طرح برقرار رکھے، جس طرح آپ کی بعثت سے پہلے جزیرہ نمائے عرب میں رائج تھے۔ ابنِ عباس کی جو روایت دیت کی مقدار میں تبدیلی کے بارے میں ہم نے اوپر نقل کی ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں:

فجرت فی قریش والعرب مائة من الابل فاقرها رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ما کانت علیه ۔	"قریش اور عرب میں دیت کی مقدار یہی سو اونٹ رائج ہو گئی۔ چنانچہ بعد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ہی برقرار رکھا۔"

(الطبقات الکبریٰ ، ابنِ سعد ، ج ١، ص ٨٩)

ایک دوسری حدیث میں، جسے آئمۂ لغت بالعموم لفظِ 'معقلة' کی نظیر کے طور پر پیش کرتے ہیں، اور جو الفاظ کے معمولی تغیر کے ساتھ مسند احمد بن حنبل میں بھی نقل ہوئی ہے، یہی بات اس طرح بیان کی گئی ہے:

کتب بین قریش والانصار کتابا فیه : المهاجرون من قریش علی رباعتهم یتعاقلون بینهم معاقلهم الاولی ۔	"حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش اور انصار کے مابین معاہدے کے طور پر ایک تحریر لکھی، جس میں یہ بات بھی تھی کہ مہاجرینِ قریش اپنی پہلی حالت ہی پر برقرار رہیں گے اور اُن کے مابین دیت کے معاملات اسی طرح ہوں گے جس طرح پہلے سے رائج تھے۔"
(لسان العرب، ج ١١، ص ٤٦٢)	

یمن (جنوبی عرب) کے علاقے میں، البتہ، دستور یہی تھا کہ قتل اور جراحت کی مختلف صورتوں میں دیت کی مقدار حکمران مقرر کرے گا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ علاقہ جب اسلامی ریاست

میں شامل ہوا تو آپ نے اس کے سرداروں کے نام اپنے ایک مکتوب میں دیت کی وہی مقداریں ان کے لیے بھی مقرر کر دیں، جو آپ کے اپنے علاقے میں رائج تھیں۔ "المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام" کے مصنف ڈاکٹر جواد علی جنوبی عرب کے اس دستور کے متعلق لکھتے ہیں:

وقد عرفت الدیة عند العرب الجنوبیین کذلک، ولم تحدد فی القوانین، وانما ترك امر مقدارها الی الملك۔ (ج ۵، ص ۵۹۴)	"دیت جنوبی عرب کے لوگوں میں بھی اسی طرح معروف تھی، لیکن اس کے لیے کوئی باقاعدہ قانون سازی نہیں کی گئی تھی، بلکہ اس کی مقدار کا معاملہ حکمران کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا تھا۔"

اہلِ یمن کے نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مکتوب[1] درج ذیل ہے:

ان من اعتبط مومناً قتلاً عن بینة، فانه قود الا ان یرضی اولیاء المقتول، و ان فی النفس الدیة — مائة من الابل — و فی الانف اذا اوعب جدعه الدیة، وفی اللسان الدیة، و فی الشفتین الدیة، و فی البیضتین الدیة، و فی الذکر الدیة، و فی الصلب الدیة، و فی العینین الدیة و	"جس نے کسی مسلمان کو ناحق مار ڈالا، اور اس کا جرم ثابت ہو گیا، تو اس سے بدلہ لیا جائے گا، الا یہ کہ مقتول کے اولیا دیت پر راضی ہو جائیں۔ اس صورت میں، جان کی دیت سو اونٹ ہو گی، اور ناک کی بھی، جب وہ پوری کاٹ دی جائے۔ زبان اور ہونٹوں اور فوطوں اور مرد کی شرم گاہ، اور پیٹھ اور دونوں آنکھوں کی دیت بھی یہی ہو گی۔ ایک پاؤں اور ایک ہاتھ میں، البتہ آدھی دیت ہو گی۔ جو زخم دماغ تک پہنچے، اس میں ایک تہائی، اور جو پیٹ

---

[1] جراحات کی دیت میں جو نسبتیں اس مکتوب میں بیان ہوئی ہیں، وہ اگر غور کیجیے، تو عدل و انصاف کے نقطۂ نظر سے حرفِ آخر ہیں۔ اسلامی ریاست کے اربابِ حل و عقد کو، اس باب میں قانون سازی کرتے وقت انھیں، بہرحال پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

في الرجل الواحدة نصف الدية [وفي اليد نصف الدية][1] وفي المامومة ثلث الدية، وفي الجائفة ثلث الدية، وفي المنقلة خمس عشرة من الابل، وفي كل اصبع من اصابع اليد والرجل عشر من الابل، وفي السن خمس من الابل، وفي الموضحة خمس من الابل، وان الرجل يقتل بالمرأة، وعلى اهل الذهب الف دينار۔

تک پہنچے، اس میں بھی ایک تہائی ہوگی۔ اسی طرح جس زخم سے ہڈی سرک جائے، اس میں پندرہ اونٹ ہیں۔ ہاتھ اور پاؤں کی ہر انگلی میں دس، دانت میں پانچ، اور جس زخم سے ہڈی کھل جائے، اس میں بھی پانچ اونٹ ہوں گے۔ عورت کے بدلے میں مرد کو قتل کیا جائے گا۔ اور جو لوگ سونا ہی دے سکتے ہوں، ان کے لیے یہ دیت ایک ہزار دینار قرار پائے گی۔"

(سنن النسائی، کتاب القسامہ)

اس بحث سے یہ حقیقت پوری طرح مبرہن ہو جاتی ہے کہ اسلام نے دیت کی کسی خاص مقدار کا ہمیشہ کے لیے تعین کیا ہے، نہ عورت اور مرد، غلام اور آزاد اور کافر اور مومن کی دیتوں میں کسی فرق کی پابندی ہمارے لیے لازم ٹھہرائی ہے۔ دیت کا قانون اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھا۔ قرآنِ مجید نے قتلِ خطا اور قتلِ عمد، دونوں میں اسی کے مطابق دیت ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ قرآن کے اس حکم کی رو سے اب دیت ہر دور اور ہر معاشرے کے لیے اسلام کا واجب الاطاعت قانون ہے۔ لیکن اس کی مقدار، نوعیت اور دوسرے تمام امور میں قرآن کا حکم یہی ہے کہ 'معروف' یعنی معاشرے کے دستور اور رواج کی پیروی کی جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے دیت کے فیصلے اپنے زمانے میں عرب کے دستور کے مطابق کیے۔ فقہ و حدیث کی کتابوں میں دیت کی جو مقداریں بیان ہوئی ہیں، وہ اسی دستور کے مطابق ہیں۔ عرب کا یہ دستور اہلِ عرب کے تمدنی حالات اور تہذیبی روایات پر مبنی تھا۔ زمانے کی گردشوں نے کتابِ تاریخ میں چودہ صدیوں کے ورق الٹ دیے ہیں۔ تمدنی حالات اور تہذیبی روایات

[1] یہ الفاظ سنن النسائی ہی میں، اس مکتوب کی ایک دوسری روایت سے لیے گئے ہیں۔

ان سب میں زمین و آسمان کا تغیر واقع ہو گیا ہے۔ اب ہم دیت میں اونٹ دے سکتے ہیں، نہ اونٹوں کے لحاظ سے اس دور میں دیت کا تعین کوئی دانش مندی ہے۔ 'عاقلہ' کی نوعیت بالکل بدل گئی ہے اور قتلِ خطا کی وہ صورتیں وجود میں آگئی ہیں جن کا تصور بھی اُس زمانے میں ممکن نہیں تھا۔ قرآنِ مجید کی ہدایت ہر دور اور ہر معاشرے کے لیے ہے؛ چنانچہ اس نے اس معاملہ میں 'معروف' کی پیروی کا حکم دیا ہے۔ قرآن کے اس حکم کے مطابق ہر معاشرہ اپنے ہی معروف کا پابند ہے۔ ہمارے معاشرے میں دیت کا کوئی قانون چونکہ پہلے سے موجود نہیں ہے، اس وجہ سے ہمارے اربابِ حل و عقد کو اختیار ہے کہ چاہیں تو عرب کے اس دستور ہی کو برقرار رکھیں، اور چاہیں تو اس کی کوئی دوسری صورت تجویز کریں۔ بہر حال وہ جو صورت بھی اختیار کریں گے، معاشرہ اسے قبول کر لیتا ہے تو ہمارے لیے وہی 'معروف' قرار پائے گی۔ پھر معروف پر مبنی قوانین کے بارے میں یہ بات بھی بالکل بدیہی ہے کہ حالات اور زمانہ کی تبدیلی سے ان میں تغیر کیا جا سکتا اور کسی معاشرے کے اولوالامر اگر چاہیں تو اپنے اجتماعی مصالح کے لحاظ سے انھیں نئے سرے سے مرتب کر سکتے ہیں۔

فقہِ حنفی کے ایک جلیل القدر عالم ابنِ عابدین اپنے رسالہ "نشر العرف" میں لکھتے ہیں:

اعلم ان المسائل الفقهية اما ان تكون ثابتة بصريح النص وهی الفصل الاول واما ان تكون ثابتة بضرب اجتهاد و رای وكثير منها ما يبنيه المجتهد على ما كان فی عرف زمانه بحيث لو كان فی زمان العرف الحادث لقال بخلاف ما قاله اولا ولهذا قالوا فی شروط الاجتهاد انه لا بد فيه من معرفة عادات الناس فكثير من الاحكام تختلف	"جاننا چاہیے کہ فقہی مسائل یا تو نصِ صریح سے ثابت ہوتے ہیں اور یہی پہلی قسم ہے، اور یا اجتہاد و رائے سے ثابت ہوتے ہیں۔ اجتہاد و رائے پر مبنی مسائل میں سے بہت سے وہ ہیں جن کی بنا اہلِ اجتہاد اس حیثیت سے اپنے زمانے کے عرف پر رکھتے ہیں کہ وہ اگر عرفِ حادث کے زمانے میں ہوتے تو اپنی پہلی رائے کے خلاف رائے دیتے۔ چنانچہ اجتہاد کی شرائط میں وہ یہ شرط بھی بیان فرماتے ہیں کہ اس میں لوگوں کی عادات کی معرفت بہر حال ضروری ہے، کیونکہ زمانے میں تبدیلی کے ساتھ بہت

باختلاف الزمان لتغير عرف اهله او لحدوث ضرورة او فساد اهل الزمان بحيث لو بقي الحكم على ما كان عليه اولا للزم منه المشقة والضرر بالناس و لخالف قواعد الشريعة المبنية على التخفيف والتيسير ودفع الضرر والفساد. (رسائل ابنِ عابدین، ص ۱۲۵)

سے احکام تبدیل ہوجاتے ہیں۔ اس کی متعدد وجوہ ہوسکتی ہیں، مثلاً، عرف میں تغیر، ضرورت کا اقتضا، یا لوگوں کے احوال میں اس بنا پر کسی خرابی کا اندیشہ کہ حکم اگر پہلی صورت پر باقی رہا تو ان کے لیے ضرر اور مشقت کا باعث اور ہماری اُس شریعت کے قواعد کے خلاف ہوگا جو آسانی، سہولت اور دفعِ ضرر و فساد پر مبنی ہے۔"

رہا دوسرا سوال، یعنی یہ کہ دیت کی حقیقت کیا ہے، تو اس معاملے میں دو ہی نقطہ ہائے نظر، بالعموم، رائج ہیں: ایک یہ کہ یہ جان کی قیمت ہے، اور دوسرا یہ کہ یہ اس معاشی نقصان کا بدل ہے جو مجرم کی طرف سے مقتول کے وارثوں، یا خود مجروح کو پہنچتا ہے۔

ہمارے نزدیک یہ دونوں نقطہ ہائے نظر غلط ہیں۔ جو لوگ اسے جان کی قیمت قرار دیتے ہیں اُن کی رائے محض مغالطہ پر مبنی ہے۔ عرب جاہلی میں قتل کے معاملات بالترتیب 'ثأر' (انتقام)، 'قصاص' اور 'دیت' کی صورت میں طے کیے جاتے تھے۔ 'ثأر' جیسا کہ اس ترتیب سے واضح ہے، عربوں کے نزدیک اصل غایت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ مقتول کی روح پرندہ بن کر اڑ جاتی ہے اور جب تک اس کا انتقام نہ لیا جائے، وشت وجبل میں 'اسقونی'، 'اسقونی' (مجھے پلاؤ، مجھے پلاؤ) کہہ کر چیختی پھرتی ہے۔ اُن میں سے بعض لوگ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ قبر میں وہی مقتول زندہ رہتا ہے، جس کا انتقام لے لیا جائے اور اگر کسی کا انتقام نہ لیا جائے تو وہ بے جان ہوجاتا اور اس کی قبر میں تاریکی چھا جاتی ہے۔ اپنے ان عقائد کی بنا پر وہ 'ثأر' ہی کو ترجیح دیتے اور دیت تو ایک طرف، قصاص کے لیے بھی کسی مجبوری ہی کی بنا پر راضی ہوتے تھے۔ اُمّ شملہ کہتی ہے:

فیا شمل شمر واطلب القوم بالذی — اصبت ولا تقبل قصاصا ولا عقلا

"اے شملہ، اٹھو، تیار ہو جاؤ اور اپنے دشمنوں سے اس مصیبت کا بدلہ لو جو تمھیں پہنچائی گئی ہے اور دیکھو، قصاص اور دیت کسی حال میں قبول نہ کرنا۔"

عباس بن مرداس السلمی قبیلۂ خزاعہ کے ایک شخص عامر کو جوشِ انتقام دلاتے ہوئے کہتا ہے:

ولا تطمعن ما یعلفونك انهم اتوك علی قرباهم بالمثمل

"اور وہ تمھیں جس دیت کا لالچ دیتے ہیں، اس کا خیال بھی نہ کرو کیونکہ وہ باوجود قرابت کے تمھارے پاس زہر قاتل لے کر آئے ہیں"

اس معاملہ میں قبولِ اسلام کے بعد بھی اُن کے جذبات کس قدر شدید تھے، اس کا اندازہ مسور بن زیادہ کے اُن اشعار سے کیا جاسکتا ہے جو اس نے اپنے باپ کے قتل کے بعد عاملِ مدینہ سعید بن العاص کی طرف سے سات دیتوں کی پیش کش کے جواب میں کہے، وہ کہتا ہے:

أبعد الذی بالنعف نعف کویکب رهینة رمس ذی تراب وجندل

"کیا اس شخص کے بعد جو کویکب کے دامن میں مٹی اور پتھر کی قبر میں دفن کیا گیا ہے"

اذکر بالبقیا علی من اصابنی وبقیای انی جاهد غیر مؤتل

"مجھے نصیحت کی جاتی ہے کہ میں اُس ظالم پر ترس کھاؤں جس نے مجھے یہ صدمہ پہنچایا ہے۔ میرا ترس اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ میں بدلہ لینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں"

فان لم انل ثأری من الیوم او غد بنی عمنا فالدهر ذو متطول

"میرے عم زاد بھائیو، اگر میں آج یا کل اپنا انتقام نہ لے سکا تو کیا ہوا، زمانے کی عمر بڑی طویل ہے"

فلا یدعنی قومی لیوم کریهة لئن لم اعجل ضربة او اعجل

"اگر میں بغیر کسی توقف کے دشمن پر ضرب نہ لگاؤں یا اس کی ضرب کا نشانہ نہ بنوں تو میری قوم مجھے کبھی کسی معرکہ کے لیے طلب نہ کرے"

انختم علینا کلکل الحرب مرة فنحن منیخوها علیکم بکلکل

"تم نے ایک دفعہ جنگ کا سینہ ہم پر رکھ دیا ہے، تو سنو، ہم نے بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم بھی اس کا سینہ تم پر رکھے بغیر چین نہ لیں گے"

یقول رجال ما اصیب لهم اب ولا من اخ اقبل علی المال تعقل

"مجھے وہ لوگ دیت کی پیش کش کرتے اور مال قبول کرنے کی ترغیب دیتے ہیں جن کے باپ اور بھائی کبھی کسی قاتل کی تیغِ ستم کا شکار نہیں ہوتے"

چنانچہ یہ انھی جذبات کا نتیجہ تھا کہ وہ دیت قبول کرنے کو عار سمجھتے اور اسے مقتول کا خون بیچ دینے کے ہم معنی خیال کرتے تھے۔ بنی نصر بن قعین کے ایک شاعر ربیعہ بن عبید کا شعر ہے :

أذواب انی لم اهبك ولم اقم للبيع عند تحضر الاجلاب

"اے ذواب، میں نے تیرا قتل معاف نہیں کیا ہے، نہ بازار عکاظ میں بیع و شرا کے وقت تیرا خون بیچنے (تیری دیت لینے) کے لیے کھڑا ہوا ہوں۔"

لیکن، بالبداہت واضح ہے کہ اس کا دیت کی حقیقت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کی حیثیت محض ایک جذباتی تعبیر کی تھی اور قتل و خون کے معاملات میں اس طرح کی جذباتی تعبیرات کی مثالیں شب و روز ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں۔ ان کی بنا پر حقیقتِ دیت کی تعیین سخن فہمی کی کوئی اچھی مثال نہیں ہے۔ جن لوگوں نے اسے اختیار کیا ہے، اُن کی نگاہ غالباً اس طرف نہیں گئی کہ انسان کی جان اور اس کے اعضا ہر قیمت سے بالاتر ہیں۔ کوئی ماں، کوئی باپ، کوئی بھائی، کوئی بیٹا اس تصور کے تحت کبھی دیت قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے مقتول بیٹے، بھائی یا باپ کے خون کی قیمت وصول کر رہا ہے۔ چنانچہ یہ رائے اگر اختیار کی جائے گی تو اس کا نتیجہ، ظاہر ہے، یہی نکلے گا کہ دیت کا قانون جس مصلحت پر مبنی ہے، معاشرہ اس کے منافع سے بالکل محروم ہو جائے گا۔ ان وجوہ سے، ہم یہ عرض کرنے کی جسارت کریں گے کہ یہ رائے کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

رہے وہ لوگ جو اسے معاشی نقصان کا بدل قرار دیتے ہیں تو انھوں نے غالباً یہ رائے قائم کرتے وقت اس بات پر غور نہیں کیا کہ کسی شے کی حقیقت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس کے چھوٹے بڑے تمام اجزا میں موجود ہو۔ ہر وہ شخص جس نے قانونِ دیت کا مطالعہ سرسری نگاہ سے بھی کیا ہے، بہرحال مانے گا کہ دیت صرف قتلِ نفس ہی میں نہیں، جسم کے تمام اعضا مثلاً : ناک، کان، آنکھ، ڈاڑھ، دانت کے اتلاف میں بھی مقرر کی گئی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ان میں سے بہت سے اعضا کا اتلاف کسی معاشی نقصان کا باعث نہیں بنتا۔ ڈاڑھ اور دانت، ہاتھ کی ایک انگلی، پاؤں کا انگوٹھا، بالفرض اگر تلف ہو جائے تو اس سے معاشی طور پر آخر کیا نقصان پہنچتا ہے؟ دیت کے پورے قانون کو پیشِ نظر رکھ کر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دوسری بہت سی وجوہ سے قطعِ نظر محض اس داخلی تضاد ہی کی بنا پر یہ رائے درست قرار نہیں دی جا سکتی۔

حقیقت دیت کے بارے میں یہ دونوں نقطہ ہائے نظر اگر غلط ہیں، تو پھر دیت کی حقیقت فی الواقع ہے کیا؟ اس سوال کے جواب میں ناگزیر ہے کہ روایاتِ عرب ہی کی مراجعت کی جائے۔

دیت کا مضمون، جاہلی عرب کی شاعری میں کئی جگہ بیان ہوا ہے۔ قتل و خون ریزی کے واقعات ان کی زندگی میں اس قدر عام تھے کہ 'ثأر'، 'قصاص' اور 'دیت' کے مضامین اُن کے شاعروں کی طبع آزمائی کے لیے گویا ہر وقت حاضر رہتے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنے ان اشعار میں عام طور پر دیت قبول کرنے والوں کو عار دلاتے اور انھیں انتقام ہی پر ابھارتے ہیں۔ لیکن اس طرح کے کسی جذباتی پس منظر کے بغیر وہ اگر کبھی دیت کے موضوع پر کچھ کہتے ہیں تو دیت کی حقیقت بھی بالعموم ان کے بیان سے بالصراحت، واضح ہو جاتی ہے۔

دیت کے لیے وہ اس طرح کے مواقع پر لفظ 'غرامة' یا اس کا ہم معنی لفظ 'مغرم' استعمال کرتے ہیں۔ عربی زبان میں یہ لفظ بالکل اسی مفہوم میں بولا جاتا ہے، جس مفہوم میں ہم اردو میں لفظ 'تاوان' یا 'جرمانہ' بولتے ہیں۔ ہماری زبان میں جس طرح ہر اُس مال کے لیے جو کسی جرم کی سزا کے طور پر مجرم سے لیا جائے، لفظ 'تاوان' یا 'جرمانہ' مستعمل ہے، اسی طرح عربِ جاہلی کی زبان میں اس کے لیے لفظ 'غرامة' مستعمل تھا۔ حقیقتِ دیت کی تعبیر کے لیے، عرب شعرا نے، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، یہی لفظ استعمال کیا ہے۔ زہیر بن ابی سلمیٰ کہتا ہے:

ینجمها قوم لقوم غرامة ولم یهریقوا بینهم ملء محجم

"وہ اونٹ، تاوان کے طور پر، تھوڑے تھوڑے کرکے ایک قوم دوسری قوم کو دینے لگی، درآں حالیکہ دینے والوں نے لینے والوں میں چُلّو بھر خون بھی نہیں بہایا۔"

دیت کے بارے میں یہی تصور بعد میں بھی قائم رہا۔ اموی دور کے ایک شاعر عجیر السلولی کا شعر ہے:

یسرك مظلومًا ویرضیك ظالمًا ویکفیك ما حملته عند مغرم

"تم مظلوم ہو تو وہ تمھارا انتقام لے کر تمھیں خوش کر دیتا ہے، اور تم ظالم ہو تو تمھارا ساتھ دے کر تمھیں راضی کر دیتا ہے؛ اور اس ظلم کے نتیجے میں تاوان (یعنی دیت) ادا کرتے وقت تم جو بوجھ بھی اس پر ڈالتے ہو، وہ تنہا اُس کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔"

اس سے واضح ہے کہ دیت معاشی نقصان کا بدل ہے، نہ مقتول کے خون کی قیمت۔ اپنی حقیقت

کے اعتبار سے یہ محض 'غرامۃ' یعنی تاوان یا جرمانہ ہے جو قتل عمد میں قصاص سے درگزر کے بعد اور قتل خطا کی صورت میں بہرحال مجرم پر عائد کیا جاتا ہے۔

سرقہ

قتل و جراحت کے بعد اب سرقہ یعنی چوری کو لیجیے۔ قرآنِ مجید میں اس کی سزا قطعِ ید بیان ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۔ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ (المائدہ ۵: ۳۸-۳۹)

"اور چور، خواہ مرد ہو یا عورت، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو، اُن کے عمل کی پاداش اور اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا کے طور پر، اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ پھر جس نے اپنے اس ظلم کے بعد توبہ اور اصلاح کر لی، تو اللہ اس پر نظرِ عنایت کرے گا۔ بے شک، اللہ بہت درگزر کرنے والا، رحم فرمانے والا ہے۔"

ان آیات میں جو قانون بیان ہوا ہے، وہ درج ذیل نکات پر مبنی ہے:

۱۔ قطعِ ید یعنی ہاتھ کاٹ دینے کی یہ سزا چور مرد اور چور عورت کے لیے ہے۔ قرآن نے اس کے لیے 'سارق' اور 'سارقۃ' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ عربی زبان کے اسالیبِ بلاغت سے واقف، ہر شخص جانتا ہے کہ یہ صفت کے صیغے ہیں، جو وقوعِ فعل میں اہتمام پر دلالت کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کا اطلاق فعلِ سرقہ کی کسی ایسی ہی نوعیت پر کیا جا سکتا ہے، جس کے ارتکاب کو چوری اور جس کے مرتکب کو چور قرار دیا جا سکے۔ چنانچہ اگر کوئی بچہ اپنے باپ یا کوئی عورت اپنے شوہر کی جیب سے چند روپے اڑا لیتی ہے، یا کوئی شخص کسی کی بہت معمولی قدر و قیمت کی کوئی چیز چرا لے جاتا ہے، یا کسی کے باغ سے کچھ پھل، یا کسی کے کھیت سے کچھ سبزیاں توڑ لیتا ہے، یا بغیر کسی حفاظت کے کسی جگہ ڈالا ہوا کوئی مال اچک لیتا ہے، یا آوارہ چرتی ہوئی کوئی گائے یا بھینس ہانک کر لے جاتا ہے، یا کسی اضطرار اور مجبوری کی بنا پر اس فعلِ شنیع کا ارتکاب کرتا ہے، تو بے شک، یہ سب ناشایستہ

افعال ہیں، اور ان پر اسے تادیب و تنبیہ بھی ہونی چاہیے، لیکن یہ وہ چوری نہیں ہے، جس کا حکم ان آیات میں بیان ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لا قطع فی ثمر معلق، ولا فی حریسة جبل فاذا اواه المراح او الجرین، فالقطع فیما یبلغ ثمن المجن۔ (موطا، کتاب السرقۃ)	"میوہ درخت پر لٹکتا ہو، یا بکری پہاڑ پر چرتی ہو، اور کوئی اسے چرالے، تو اس میں ہاتھ نہ کاٹا جائے گا۔ ہاں، اگر وہ کھلیان میں آجائے، اور وہ باڑے میں پہنچ جائے، تو ہاتھ کاٹا جائے گا، بشرطیکہ اس کی قیمت ڈھال کی قیمت کے برابر ہو۔"

لہٰذا یہ انتہائی سزا ہے، اور صرف اسی صورت میں دی جائے گی، جب مجرم اپنے جرم کی نوعیت اور اپنے حالات کے لحاظ سے کسی رعایت کا مستحق نہ رہا ہو۔

۲۔ قطعِ ید کی یہ سزا 'جزاء بما کسبا نکالا من اللہ' ہے، لہٰذا مجرم کو، دوسروں کے لیے عبرت بنا دینے میں عمل اور پاداشِ عمل کی مناسبت، جس طرح یہ تقاضا کرتی ہے کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے، اسی طرح یہ تقاضا بھی کرتی ہے کہ اس کا دایاں ہاتھ ہی کاٹا جائے۔ اس لیے کہ انسانوں میں 'آلۂ کسب' کی حیثیت، اگر غور کیجیے، تو اصلاً اسی کو حاصل ہے۔ 'جزاء بما کسبا' کے الفاظ میں، قرآن کا یہ اشارہ، اگرچہ لطیف ہے، لیکن پیغمبر کے فہمِ رسا نے اسے پا لیا، اور یہ سنت، ہمیشہ کے لیے، قائم کر دی کہ اس جرم کی پاداش میں، چور کا دایاں ہاتھ ہی کاٹا جائے گا، اور لفظِ 'ید' کے قطعی اطلاق کی بنا پر، ہمیشہ پونچے ہی سے کاٹا جائے گا۔

۳۔ چور کے لیے یہ محض دنیوی سزا ہے۔ رہی آخرت، تو اس میں نجات توبہ اور اصلاح ہی سے ہو سکتی ہے۔ یہ دنیوی سزا نہ توبہ کا بدل ہے اور نہ توبہ اس کے لیے بدل کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ، توبہ و اصلاح کے باوجود، حکومت یہ سزا، لازماً، نافذ کرے گی، اور دنیا میں یہ سزا پا لینے کے باوجود، آخرت کا معاملہ، توبہ اور اصلاح ہی سے درست ہو گا۔

زنا

اب زنا کو لیجیے۔ اس کی سزا، قرآنِ مجید کی رو سے ضربِ تازیانہ، مجرم کی فضیحت اور سزا کے

بدعمالت کے ساتھ، اس کے نکاح کی حرمت ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ
وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ.
وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ
فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ، اِنْ كُنْتُمْ
تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ. وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا
طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ.
اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً
اَوْ مُشْرِكَةً وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ
اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ، وَحُرِّمَ ذٰلِكَ
عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (النور ۲۴: ۲-۳)

"زانی عورت ہو یا مرد، دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔ اور اللہ کے اس قانون کو نافذ کرنے میں، اُن کے ساتھ کبھی نرمی کا جذبہ تمھیں دامن گیر نہ ہونے پائے، اگر تم اللہ اور قیامت کے دن پر، فی الواقع، ایمان رکھتے ہو۔ اور ان کی اس سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت وہاں موجود رہنی چاہیے۔ یہ زانی نکاح نہ کر پائے، مگر زانیہ اور مشرکہ کے ساتھ، اور اس زانیہ کے ساتھ نکاح نہ کرے، مگر کوئی زانی یا مشرک۔ اہلِ ایمان پر یہ، بہر حال حرام ٹھیرایا گیا ہے۔"

اس کی تفصیلات یہ ہیں:

۱۔ زانی مرد ہو یا عورت، اس کا جرم، اگر ثابت ہو جائے، تو اس کی پاداش میں اسے سو کوڑے مارے جائیں گے۔ اس کے لیے جو طریقہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے اختیار کیا اور جس کی وضاحت حدیث و فقہ کی کتابوں میں اس زمانہ کے بعض مقدمات کی روداد وں سے ہوتی ہے، اس کی رو سے:

(۱) مار کے لیے خواہ کوڑا استعمال کیا جائے یا بید، دونوں صورتوں میں، وہ نہ بہت موٹا اور سخت ہونا چاہیے، اور نہ بہت پتلا اور نرم بلکہ اوسط درجے کا ہونا چاہیے۔[1]

---

[1] الموطا، امام مالک، کتاب الحدود۔
احکام القرآن، الجصاص، ج ۲، ص ۲۶۲۔
احکام القرآن، ابن العربی، ج ۳، ص ۱۳۲۷۔

(ب) مار بھی اوسط درجے کی ہونی چاہیے، اور مار کا کام اجڈ اور پیشہ ور جلادوں سے نہیں لینا چاہیے، بلکہ یہ خدمت قوم کے صاحب علم و بصیرت بزرگوں کو انجام دینی چاہیے۔[1]

(ج) مجرم کو ننگا کر کے اور ٹکٹکی پر باندھ کر نہیں مارنا چاہیے۔[2]

(د) مار ایسی نہیں ہونی چاہیے جو زخم ڈال دے اور نہ ایک ہی جگہ مارنا چاہیے بلکہ منہ اور شرم گاہ کو چھوڑ کر باقی تمام جسم پر مار کو پھیلا دینا چاہیے۔[3]

(ہ) عورت حاملہ ہو تو اسے وضعِ حمل کے بعد، نفاس کا زمانہ گزر جانے تک مہلت دینی چاہیے۔[4]

۲۔ مجرم کو یہ سزا مسلمانوں کی ایک جماعت کی موجودگی میں، دی جائے گی، تاکہ اس کے لیے یہ فضیحت اور دوسروں کے لیے باعثِ نصیحت ہو۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ اہلِ ایمان کی کسی حکومت یا عدالت کو، اس معاملے میں، ہرگز، کوئی نرمی روا نہیں رکھنی چاہیے۔ مجرم کے ساتھ یہ سختی اس لیے ضروری ہے کہ معاشرہ کا استحکام رحمی رشتوں کی پاکیزگی اور اس کے ہر اختلال و فساد سے محفوظ ہونے ہی پر منحصر ہے، اور زنا، اگر غور کیجیے تو اس چیز کو درہم کر کے پورے معاشرے کو ڈھوروں اور ڈنگروں کے ایک گلے میں تبدیل کرتا، اور اس طرح، درحقیقت، صالح تمدن کو اس کی بنیاد ہی سے محروم کر دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے: 'لا تاخذکم بھما رافۃ فی دین اللہ' (اس قانون کے نفاذ میں، اُن کے ساتھ کسی نرمی کا جذبہ تمھیں دامن گیر نہ ہونے پائے)۔

استاد امام امین احسن اصلاحی، اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

---

[1] زاد المعاد، ابن القیم، ج ۱، ص ۴۴-۴۵۔

[2] احکام القرآن، الجصاص، ج ۳، ص ۲۶۱-۲۶۲۔

[3] احکام القرآن، الجصاص، ج ۳، ص ۲۶۰۔
احکام القرآن، ابن العربی، ج ۳، ص ۱۳۲۴۔
ابوداؤد، کتاب الحدود۔
مسند احمد بن حنبل، ج ۲، ص ۱۱۸۔

[4] احکام القرآن، ابن العربی، ج ۱، ص ۴۰۶۔

"یعنی اس کی تنفیذ کے معاملے میں، کسی نرمی یا مداہنت یا چشم پوشی کو راہ نہ دی جائے۔ نہ عورت کے ساتھ کوئی نرمی برتی جائے، نہ مرد کے ساتھ، نہ امیر کے ساتھ، نہ غریب کے ساتھ۔ خدا کے مقرر کردہ حدود کی بے لاگ اور بے رو رعایت تنفیذ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا لازمی تقاضا ہے۔ جو لوگ اس معاملے میں مداہنت اور نرمی برتیں، ان کا اللہ اور آخرت پر ایمان، معتبر نہیں ہے۔ یہاں یہ چیز بھی قابل توجہ ہے کہ سزا کے بیان میں عورت کا ذکر، مرد کے ذکر پر مقدم ہے۔ اس کی وجہ جہاں یہ ہے کہ زنا عورت کی رضامندی کے بغیر نہیں ہو سکتا، وہاں یہ بھی ہے کہ صنف ضعیف ہونے کے سبب سے، اس معاملہ میں جذبۂ ہم دردی کے ابھرنے کا زیادہ امکان ہے۔ اس وجہ سے قرآن نے یہاں اس کے ذکر کو مقدم کر دیا، تاکہ اسلوب بیان ہی سے، یہ بات واضح ہو جائے کہ اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں ہے، عورت ہو یا مرد۔" (تدبر قرآن، ج ۵، ص ۳۶۲)

حدود الٰہی کے نفاذ میں یہی جذبہ ہے جس کی تعبیر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمائی ہے:

وایم اللہ، لو ان فاطمة بنت محمد سرقت، لقطعت یدها۔ (مسلم، کتاب الحدود)	"خدا کی قسم، اگر محمد کی بیٹی فاطمہ نے بھی چوری کی ہوتی، تو میں، لازماً، اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔"

۳۔ اس سزا کے بعد مسلمانوں میں سے کسی پاک دامن مرد یا عورت کو اس زانی یا زانیہ کے ساتھ نکاح نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اس کے بعد، اگر وہ نکاح کرنا چاہیں، تو انھیں اس نکاح کے لیے، کوئی زانی یا مشرک اور زانیہ یا مشرکہ ہی ملے۔ کسی مومنہ کے لیے وہ ہرگز، اس بات کو جائز نہیں رکھتا کہ اپنے آپ کو کسی زانی کے حبالۂ عقد میں دینے کے لیے راضی ہو اور نہ کسی مومن کے لیے یہ جائز رکھتا ہے کہ وہ اس نجاست کو، اپنے گھر میں لانے کے لیے تیار ہو جائے۔ اس طرح کا ہر نکاح باطل ہے۔ چنانچہ آیت میں 'لا ینکح' کے الفاظ نہی کے مفہوم میں ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اسی کی وضاحت میں فرمایا ہے: 'وحرم ذلك على المؤمنين' (اور اہل ایمان پر یہ حرام ٹھیرا دیا گیا ہے)۔

تاہم جیسا کہ بیان ہوا، یہ حکم صرف اس زانی کے بارے میں ہے، جو ثبوتِ جرم کے بعد سزا کا مستحق قرار پا جائے۔ 'الزانی لا ینکح'، اور 'الزانیۃ لا ینکحھا' میں 'پہلے الزانیۃ والزانی' کے بعد، اعادۂ معرف باللام کا قاعدہ، اسی پر دلالت کرتا ہے، اور اس کے سوا، کسی دوسری رائے کے لیے، اس اسلوب میں، ہرگز، کوئی گنجایش پیدا نہیں کی جا سکتی۔

۴۔ سرقہ کی طرح، اس سزا کے بیان میں بھی، قرآنِ مجید نے چونکہ صفت ہی کے صیغے اختیار کیے ہیں، اس وجہ سے یہ سزا بھی، اس جرم کی انتہائی سزا ہے، اور صرف انھی مجرموں کو دی جائے گی، جن سے جرم بالکل آخری صورت میں صادر ہو جائے، اور اپنے حالات کے لحاظ سے وہ کسی رعایت کے مستحق نہ ہوں۔ چنانچہ پاگل، بدھو، مجبور اور جرم سے بچنے کے لیے ضروری حفاظت سے محروم، سب لوگ، اس سے یقیناً مستثنیٰ ہیں۔

قرآنِ مجید نے، اُن عورتوں کے بارے میں، جن کے مالک انھیں پیشہ کرنے پر مجبور کرتے تھے، پوری صراحت کے ساتھ فرمایا ہے:

وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ ، فَاِنَّ اللّٰهَ	"اور جو انھیں اس پر مجبور کریں گے، تو اس
مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ	جبر کے بعد، اللہ اُن کے لیے غفور و رحیم
رَّحِيْمٌ۔ (النور ۲۴: ۳۳)	ہے۔"

اسی طرح، زمانۂ رسالت کی لونڈیوں کے بارے میں بھی، اُس نے ارشاد فرمایا کہ خاندان کی حفاظت سے محرومی اور ناقص اخلاقی تربیت کی وجہ سے، انھیں بھی یہ سزا نہیں دی جا سکتی۔ یہاں تک کہ اُن کے مالکوں اور شوہروں نے جب انھیں پاک دامن رکھنے کا پورا اہتمام کیا ہو، اور اس کے باوجود وہ اس جرم کا ارتکاب کر بیٹھیں، تو اس صورت میں بھی، اس سزا کی نسبت سے آدھی سزا ہی انھیں دی جائے گی۔ یعنی سو کے بجائے پچاس کوڑے ہی مارے جائیں گے۔ سورۂ نساء میں ہے:

فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ	"پھر وہ جب (اسی طرح) پاک دامن رکھی جائیں
بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ	اور اگر کسی بدچلنی کی مرتکب ہوں، تو ان کے لیے
مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ	اس سزا سے آدھی سزا ہے، جو آزاد عورتوں
الْعَذَابِ۔ (۴: ۲۵)	کے لیے مقرر کی گئی ہے۔"

۵. اس کی تہمت کا جو قانون، ہم ابھی آگے بیان کریں گے، اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ قرآنِ مجید اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اس کے مجرم، اپنے جرم کا خود اقرار کریں، یا جو لوگ اس پر مطلع ہوں، وہ ضرور ہی اس کی خبر حکام تک پہنچائیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من اصاب من هذه القاذورات شيئاً فليستتر بستر الله، فانه من يبد لنا صفحته، نقم عليه كتاب الله. (موطا، کتاب الحدود)	"تم میں سے جو شخص اس طرح کی کسی غلاظت میں ملوث ہو جائے، اسے چاہیے کہ اللہ کے ڈالے ہوئے پردے میں چھپا رہے۔ لیکن اگر وہ پردہ کھولے گا، تو ہم اس پر اللہ کا قانون نافذ کر کے چھوڑیں گے۔"

اسی طرح ایک شخص سے آپ نے فرمایا:

لو سترته بردائك، لكان خيرا لك. (الموطا، کتاب الحدود)	"تم اس (مجرم) کا پردہ ڈھانک دیتے، تو یہ تمھارے لیے زیادہ اچھا تھا۔"

قذف

اس کے بعد اب قذف کو لیجیے۔ اس کی دو صورتیں ہیں:

ایک یہ کہ کوئی شخص کسی شریف اور پاک دامن عورت یا مرد پر زنا کی تہمت لگائے۔

دوسری یہ کہ اس طرح کا معاملہ کسی میاں اور بیوی کے درمیان پیش آجائے۔

پہلی صورت میں اسلام کا قانون یہ ہے کہ اس شخص کو ہر حال میں، چار عینی گواہ پیش کرنا ہوں گے۔ اس سے کم، کسی صورت میں بھی، اس کا الزام ثابت قرار نہ پائے گا۔ قرائن، حالات، طبی معاینہ، یہ سب، اس معاملے میں بالکل بے معنی ہیں۔ آدمی آبرو باختہ اور بدچلن ہے، تو ثبوت جرم کے لیے، ان میں سے ہر چیز بڑی اہمیت کی حامل ہے، لیکن اس کی شہرت، اگر، ایک شریف اور پاک دامن شخص کی ہے، تو اسلام یہی چاہتا ہے کہ اس سے، اگر، کوئی لغزش ہوئی بھی ہے، تو اس پر پردہ ڈال دیا جائے، اور اسے معاشرے میں رسوا نہ کیا جائے۔ چنانچہ، اس صورت میں، وہ چار عینی شہادتوں ہی کا تقاضا کرتا، اور الزام لگانے والا، اگر، اس سے قاصر رہے، تو اسے، لازماً، قذف کا مجرم قرار دیتا ہے۔

اس کی سزا، قرآنِ مجید کی رو سے یہ ہے:

۱۔ اسے اسی کوڑے مارے جائیں۔

۲۔ اسے، ہمیشہ کے لیے، ساقط الشہادت قرار دے دیا جائے۔ یعنی، اس کی گواہی، پھر کسی معاملے میں کبھی قبول نہ کی جائے، اور اس طرح معاشرے میں، اس کی حیثیتِ عرفی بالکل ختم کر دی جائے۔

دوسری صورت میں، قرآن کا ارشاد ہے کہ شہادت نہ ہو، تو معاملے کا فیصلہ قسم سے ہوگا۔ فقہِ اسلامی میں، اس کے لیے لعان کی اصطلاح مستعمل ہے۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ میاں چار مرتبہ، اللہ کی قسم کھا کر یہ کہے گا کہ وہ جو الزام لگا رہا ہے، اس میں سچا ہے، اور پانچویں مرتبہ یہ کہے گا کہ اگر وہ اس الزام میں جھوٹا ہے، تو اس پر خدا کی لعنت ہو۔ اس کے جواب میں عورت، اگر اس قسم کی کوئی مدافعت نہ کرے، تو اس پر زنا کی وہی سزا جاری ہو جائے گی، جو قرآنِ مجید میں اس کے لیے مقرر ہے۔ لیکن وہ اگر اس الزام کو تسلیم نہیں کرتی، تو صرف اس صورت میں سزا سے بری قرار پائے گی، جب وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر یہ کہے کہ یہ شخص جھوٹا ہے، اور پانچویں مرتبہ یہ کہے کہ مجھ پر خدا کا غضب ہو، اگر یہ شخص سچ کہہ رہا ہے۔

یہی معاملہ، اس وقت بھی ہوگا، جب بیوی نے میاں پر الزام لگایا ہو۔

کسی میاں اور بیوی کے درمیان یہ واقعہ پیش آ جائے، تو 'الزانی لا ینکح الا زانیة' کا جو قانون ہم نے اوپر بیان کیا ہے، اس کی رو سے، ان کا نکاح باطل قرار پائے گا، اور عدالت کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ ان کے درمیان تفریق کرا دے۔

ارشادِ خداوندی ہے:

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ "اور جو لوگ پاک دامن عورتوں[1] پر تہمت لگائیں

[1] ان آیات میں، اگرچہ صرف عورتوں ہی پر تہمت کا ذکر ہوا ہے، لیکن عربی زبان میں یہ 'علی سبیل التغلیب' کا اسلوب ہے جو محض اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ اس طرح کے الزامات کا ہدف، بالعموم، عورتیں ہی بنتی ہیں، اور معاشرہ، اس معاملے میں، انھی کے بارے میں، زیادہ حساس بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اشتراکِ علت کی بنا پر، یہ حکم عورت و مرد، دونوں کے لیے عام قرار پائے گا۔ اسے محض عورتوں کے ساتھ خاص قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ
فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً،
وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا،
وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ،
إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ
وَأَصْلَحُوا، فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ
وَالَّذِينَ يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ
يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَاءُ إِلَّا أَنْفُسُهُمْ
فَشَهَادَةُ أَحَدِهِمْ أَرْبَعُ شَهَادَاتٍ
بِاللَّهِ، إِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ،
وَالْخَامِسَةُ أَنَّ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَيْهِ،
إِنْ كَانَ مِنَ الْكَاذِبِينَ. وَيَدْرَؤُا
عَنْهَا الْعَذَابَ أَنْ تَشْهَدَ أَرْبَعَ
شَهَادَاتٍ بِاللَّهِ، إِنَّهُ لَمِنَ
الْكَاذِبِينَ، وَالْخَامِسَةَ أَنَّ
غَضَبَ اللَّهِ عَلَيْهَا، إِنْ كَانَ
مِنَ الصَّادِقِينَ. (النور ۲۴: ۴-۹)

پھر چار گواہ نہ لائیں، تو ان کو اسی کوڑے مارو، اور ان کی گواہی پھر کبھی قبول نہ کرو. اور یہی لوگ فاسق ہیں، لیکن وہ جو اس کے بعد توبہ اور اصلاح کرلیں، تو اللہ ان کے لیے غفور و رحیم ہے. اور جو لوگ اپنی بیویوں پر تہمت لگائیں، اور ان کے پاس ان کی ذات کے سوا کوئی گواہ نہ ہو، تو اُن کی گواہی یہ ہے کہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر کہیں کہ وہ سچے ہیں اور پانچویں مرتبہ یہ کہیں کہ ان پر خدا کی لعنت ہو، اگر وہ جھوٹے ہوں. اور بیوی سے سزا[1] اس طرح ٹل سکتی ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ یہ شخص جھوٹا ہے، اور پانچویں مرتبہ یہ کہے کہ اس بندی پر خدا کا غضب ٹوٹے، اگر یہ اپنے الزام میں سچا ہو."

اسی کوڑے اور ردِّ شہادت ـــــ یہ اس جرم کی دنیوی سزا ہے. اللہ تعالیٰ کے حضور میں،

---

[1] "سزا" سے مراد یہاں سو کوڑے کی وہی سزا ہے جس کا ذکر ان آیات سے پہلے، آیت ۲ میں ہوا ہے. عربی زبان میں یہ قاعدہ بالکل مسلّم ہے کہ معرفہ کا اعادہ اگر معرفہ کی صورت میں کیا جائے، اور کوئی قرینہ مانع نہ ہو، تو دوسرا بعینہٖ پہلا ہوگا. لہٰذا اس کے سوا کوئی اور سزا اس سے کسی طرح مراد نہیں لی جا سکتی.

جیسا کہ ارشاد ہوا، یہ لوگ فاسق قرار پائیں گے، الّا یہ کہ اپنے جرم سے توبہ کریں اور اپنی اصلاح کرلیں۔

تین اہم تنبیہات

عام جرائم کی یہ سزائیں اور ان سے پہلے محاربہ اور فساد فی الارض کے لیے جو سزائیں ہم نے بیان کی ہیں، ان سب کے نفاذ میں، یہ تین باتیں، ہر حال میں، ملحوظ رہنی چاہییں:

اولاً، ان کے نفاذ کے لیے دارالاسلام اور اس میں ایک باقاعدہ حکومت کا قیام شرط ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ان کا حکم ہی قرآنِ مجید کی اُن سورتوں میں بیان ہوا ہے، جو اس وقت نازل ہوئی ہیں، جب یثرب کا اقتدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منتقل ہو چکا تھا، اور ایک باقاعدہ اسلامی حکومت وہاں قائم ہو گئی تھی۔ چنانچہ کوئی شخص یا جماعت، اگر کسی خطۂ ارض میں سیاسی اقتدار نہیں رکھتی، تو اسے، ہرگز، یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ان میں سے کوئی سزا کسی مجرم پر نافذ کرے۔ قرآنِ مجید کے عرف میں 'فاجلدوا' اور 'فاقطعوا' کے مخاطب ہی مسلمانوں کے امرا و حکام ہیں۔ عام مسلمانوں کو ان احکام کا مخاطب، کسی طرح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ابوبکر جصاص اپنی کتاب "احکام القرآن" میں لکھتے ہیں:

وقد علم من قرع سمعه هذا الخطاب من اهل العلم ان المخاطبين بذلك هم الائمة دون عامة الناس، فكان تقديره: فليقطع الائمة والحكام ايديهما واليجلدهما الائمة والحكام۔ (ج ۳، ص ۲۸۳)	"اہلِ علم میں سے جو شخص بھی، اس خطاب کو سنتا، فوراً سمجھ لیتا ہے کہ اس کے مخاطب عام مسلمان نہیں، بلکہ ان کے ائمہ و حکام ہیں چنانچہ اس میں، مثال کے طور پر، تقدیرِ کلام ہی یہ مانی جاتی ہے کہ بس چاہیے کہ امرا و حکام ان کے ہاتھ کاٹ دیں، اور چاہیے کہ امرا و حکام ان کی پیٹھ پر تازیانے برسا دیں۔"

ثانیاً، یہ سزائیں جس طرح مسلمانوں پر نافذ ہوں گی، اسی طرح دارالاسلام کی غیر مسلم رعایا پر بھی، لازماً، نافذ کی جائیں گی۔ قرآنِ مجید نے جس اسلوب میں، انھیں بیان کیا ہے، اس میں کافر و مومن کے درمیان، کسی تخصیص کے لیے، کوئی گنجایش نہیں ہے۔ چنانچہ یہ معلوم ہے کہ غیر مسلموں پر یہ سزائیں رسالت

مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نافذ کی ہیں، اور خلفائے راشدین نے بھی۔ یہ اسلام کا پبلک لا ہے۔ اس میں کسی شخص کو کوئی رعایت نہیں دی جا سکتی۔

ثالثاً، ان میں سے کوڑوں کی سزا، قرآنِ مجید کے اصول 'لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا' کی رو سے، سزا کے تحمل سے معذور کسی شخص کو نہیں دی جا سکتی۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بوڑھے مریض کے بارے میں، جب وہ زنا کے جرم میں پکڑا گیا تو فرمایا کہ اسے یہ سزا نہ دی جائے، اور محض علامت کے طور پر سو ٹہنیاں بس ایک دفعہ مار دی جائیں۔ ابوداؤد میں ہے:

امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یاخذوا لہ مائۃ شمراخ فیضربوہ بھا ضربۃ واحدۃ۔ (کتاب الحدود)	"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ سو ٹہنیاں لیں اور اسے ایک ہی دفعہ مار دیں۔"

اطلاع

پاکستان ٹیلی ویژن پر شعبہ اصلاح و دعوت کے ناظم

ڈاکٹر محمد فاروق خان کے پروگرام

فہم القرآن : بعنوان "واعتصموا بحبل اللہ" مورخہ ۴ اکتوبر ۱۹۹۴ء، بروز منگل، بوقت ۶-۳۰ بجے شام

خود آگاہی : دین اسلام اور علم نفسیات کی روشنی میں، ہر بدھ کے روز، صبح کی نشریات میں۔

المورد، شعبہ اصلاح و دعوت

OUR THANKS TO

SNOW WHITE DRY CLEANING INDUSTRIES
SH. WILAYAT AHMAD & SONS
CONTINENTAL ART
FEROZE TEXTILE INDUSTRIES
IMAGE COMMUNICATIONS
TIP TOP DRY CLEANERS
F.RABBI & CO. (PVT) LTD
K.B. SARKAR & CO.
PARAMOUNT DISTRIBUTORS (PVT) LTD

ترتیب : منظور الحسن

"عرب میں جو لوگ دیر سے اسلام لائے، اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ ان پر بالکل اچانک اسلام منکشف ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ اخلاقی زندگی، آپ کا شب و روز دعوت و تبلیغ میں مشغول رہنا، مخالفتوں کی وجہ سے آپ کا اور آپ کے پیغام کا مستقل چرچا جس کی وجہ سے ہر ایک کے لیے آپ کا وجود ایک سوالیہ نشان بن گیا تھا۔ ان چیزوں نے بے شمار عربوں کے ذہن میں اسلام کے بیج ڈال دیے تھے۔ قبائلی عصبیت اور اسلاف پرستی کی وجہ سے ایک شخص بظاہر ضد اور عناد میں مبتلا ہوتا، مگر اندر اندر اسلام کی خاموش پرورش کو بھی وہ روک نہ سکتا تھا۔ حضرت عمر کے اسلام کے بارے میں عام شہرت یہ ہے کہ اچانک ایک واقعہ آپ کے اسلام کا سبب بن گیا۔ آخری مرحلہ میں آپ کے اسلام کا محرک، بلاشبہ، یہی واقعہ تھا، مگر اس کے ابتدائی بیج آپ کے دل میں بہت پہلے پڑ چکے تھے۔"

اصلاح و دعوت

وحید الدین خاں

سیرت

ایک تحریک کی حیثیت سے

(۳)

دعوت کے مصالح

ہر دور میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جو زمانہ کے اثرات سے محفوظ رہتے ہیں اور اپنی فطرت کی آواز پر کان لگائے ہوئے ہوتے ہیں۔ عرب معاشرہ میں بھی فطری سادگی اور ملت ابراہیمی کے بقایا کے نتیجہ میں ایسے متعدد لوگ تھے جو سچائی کی تلاش میں تھے اور بت پرستی کو ناپسند کرتے تھے۔ عرف عام میں ان کو 'حنیف' کہا جاتا تھا۔ مثلاً قس بن ساعدہ، ورقہ بن نوفل وغیرہ۔ ایسے ہی ایک حنیف جندب بن عمرو الدوسی تھے۔ وہ زمانۂ جاہلیت میں کہا کرتے تھے: یقیناً خلق کا کوئی خالق ہے۔ مگر میں نہیں جانتا وہ کون ہے۔ (ابن عبد البر فی الاستیعاب، ج ۲) جب انھیں آپ کی بعثت کی خبر ملی تو وہ اپنی قوم کے ۷۵ آدمیوں کو ساتھ لے کر آئے اور سب نے اسلام قبول کر لیا۔ ابوذر غفاری بھی اسی قسم کے متلاشیوں میں سے تھے۔ انھیں آپ کے بارے میں علم ہوا، تو اپنے بھائی کو مکہ بھیجا کہ آپ کی خبر لے کر آئے۔ بھائی نے واپس جا کر آپ کے بارے میں جو رپورٹ دی، اس کا ایک فقرہ یہ بھی تھا: میں نے ایک آدمی کو دیکھا جس کو لوگ بددین کہتے تھے، وہ تم سے بہت زیادہ مشابہ تھا۔ (مسلم) ایسے لوگوں کو آپ کی دعوت سمجھنے میں دشواری پیش نہ آئی۔

جب کسی معاشرہ میں دعوت کا آغاز ہوتا ہے تو اس کا بیج ایسے ایسے مقامات پر پڑتا ہے جس کا اندازہ خود داعی کو بھی نہیں ہوتا۔

عرب میں جو لوگ دیر سے اسلام لائے اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ ان پر بالکل اچانک اسلام منکشف ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ اخلاقی زندگی، آپ کا شب و روز دعوت و تبلیغ میں مشغول رہنا، مخالفتوں کی وجہ سے آپ کا اور آپ کے پیغام کا مستقل چرچا جس کی وجہ سے ہر ایک کے

لیے آپ کا وجود ایک سوالیہ نشان بن گیا تھا۔ ان چیزوں نے بے شمار عربوں کے ذہن میں اسلام کے بیج ڈال دیے تھے۔ قبائلی عصبیت اور اسلاف پرستی کی وجہ سے ایک شخص، بظاہر ضد اور عناد میں مبتلا ہوتا، مگر اندر اندر اسلام کی خاموش پرورش کو بھی وہ روک نہ سکتا تھا۔ حضرت عمر کے اسلام کے بارے میں عام شہرت یہ ہے کہ اچانک ایک واقعہ آپ کے اسلام کا سبب بن گیا۔ آخری مرحلہ میں آپ کے اسلام کا محرک بلاشبہ یہی واقعہ تھا، مگر اس کے ابتدائی بیج آپ کے دل میں بہت پہلے پڑ چکے تھے:

"ام عبد اللہ بنت ابی حثمہ کہتی ہیں: خدا کی قسم ہم لوگ ملک حبش کی طرف کوچ کر رہے تھے، اور میرے شوہر عامر اپنی بعض ضروریات کے لیے گئے ہوئے تھے۔ اتنے میں عمر بن الخطاب آ گئے اور میرے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ ابھی تک اسلام نہ لائے تھے۔ ہم لوگوں کو ان سے بڑی تکلیفیں اور سختیاں پہنچی تھیں۔ انھوں نے کہا: اے ام عبد اللہ، کوچ ہو رہا ہے؟ میں نے کہا: ہاں، خدا کی قسم ہم لوگ اللہ کی زمین میں سے کسی زمین میں چلے جائیں گے۔ اس لیے کہ تم لوگ ہمیں ستاتے ہو اور ہمارے اوپر زیادتیاں کرتے ہو۔ یہاں تک کہ اللہ ہمارے لیے کوئی نکاسی کی جگہ پیدا کر دے۔ ام عبد اللہ کہتی ہیں۔ عمر نے کہا: خدا تمھارا ساتھی ہو۔ یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں رقت پیدا ہو گئی، جو میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کے بعد وہ چلے گئے اور ان کو ہمارے مکہ سے جانے کا بہت ملال تھا۔" (البدایہ والنہایہ ج ۳، ص ۷۹)

ہر زمانہ میں کچھ ایسے خیالات ہوتے ہیں جو عوامی ذہنوں میں جڑ پکڑ جاتے ہیں، جب تک خیالات کی یہ دیوار نہ ٹوٹے، کوئی آواز محض اپنی فلسفیانہ صداقت کی بنیاد پر ان کے اندر قبولیت حاصل نہیں کر سکتی۔ ابتدائی زمانہ میں اہل عرب کی طرف سے جس اختلاف کا مظاہرہ ہوا، وہ محض ہٹ دھرمی یا مصلحت پرستی کی بنا پر نہ تھا، بلکہ اس لیے تھا کہ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کعبہ کے متولیوں کے سوا بھی کسی کا دین صحیح اور برحق ہو سکتا ہے۔ جو عرب قبائل، یہود کے پڑوس میں بسے ہوئے تھے، وہ نسبتاً، اس قسم کی اعتقادی پیچیدگی سے محفوظ تھے، کیونکہ یہود سے وہ سنتے رہتے تھے کہ ہماری کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ عرب میں ایک نبی کا ظہور ہوگا:

"انصار کے لوگوں نے جب آپ کا کلام سنا تو چپ ہو گئے، ان کا دل آپ کی دعوت پر مطمئن ہو گیا۔ انھوں نے اہل کتاب سے آپ کے جو اوصاف سنے تھے، اور جس چیز کی طرف آپ نے ان کو بلایا تھا، ان کو پہچانا۔ انھوں نے آپ کی تصدیق کی اور آپ پر ایمان لائے۔" (طبرانی)

عکاظ کے میلے میں جب آپ بنو کندہ کے خیموں میں گئے اور ان کے سامنے اپنی بات پیش کی تو ایک نوجوان

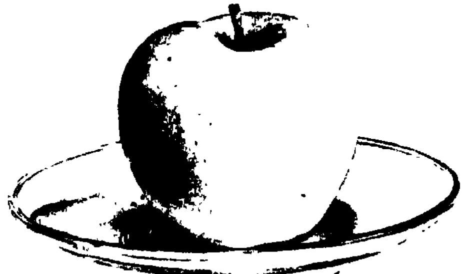
بول اٹھا:

"اے قوم، اس آدمی کا ساتھ دینے میں جلدی کرو، قبل اس کے کہ اور لوگ اس کی طرف سبقت کریں۔ خدا کی قسم، اہلِ کتاب کہہ رہے ہیں کہ حرم سے ایک نبی ظاہر ہوگا جس کا زمانہ قریب آگیا ہے۔" (ابونعیم فی الدلائل)

مدینہ کے قبائل، اوس اور خزرج کے ایمان لانے میں پیش قدمی کرنے کی وجہ ان کا یہی ذہنی پس منظر تھا۔ تاہم مکہ کے لوگوں اور بیشتر عرب قبائل کے لیے صداقت کا معیار کعبہ کا اقتدار تھا۔ قدیم عرب میں کعبہ کی حیثیت وہی تھی جو بادشاہی نظام میں 'تاج' کی ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ تاج کے ساتھ صرف سیاسی اقتدار کا تصور وابستہ ہوتا ہے، جبکہ کعبہ کے ساتھ اقتدار کے علاوہ تقدس کی روایات بھی کامل درجہ میں شامل تھیں۔ عام عرب اپنے سادہ ذہن کے تحت یہ سمجھتے تھے کہ جو کعبہ پر قابض ہو جائے، وہی صداقت کا حامل ہے۔ بنو عامر کے ذوالجوشن الضبابی بتاتے ہیں:

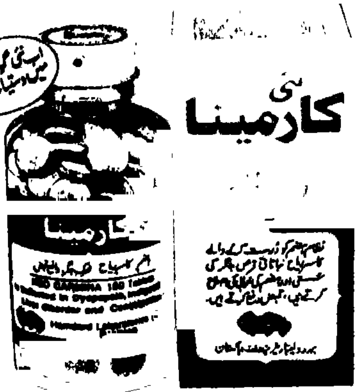
"آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے ذوالجوشن تم اسلام کیوں نہیں لاتے کہ تمہارا شمار اولین لوگوں میں ہو جائے۔ میں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا، کیوں۔ میں نے کہا، میں دیکھتا ہوں کہ آپ کی قوم آپ کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ آپ نے فرمایا، بدر میں ان کی شکست کے بارے میں تم نے کیا سنا۔ میں نے کہا، ہاں مجھے معلوم ہے۔ آپ نے فرمایا ہم کو تمہیں ہدایت کی بات بتائی ہے۔ میں نے کہا، ہاں، بشرطیکہ آپ کعبہ کو فتح کرکے اس پر قابض ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا، اگر تم زندہ رہے تو دیکھ لوگے۔ اس کے بعد ایک روز میں اپنے وطن، غور میں تھا کہ ایک سوار آیا۔ میں نے پوچھا، لوگوں کا کیا ہوا۔ اس نے کہا، خدا کی قسم محمد نے کعبہ کو فتح کر لیا اور اس پر قابض ہو گئے۔ میں نے کہا، میری ماں مجھے گم کرے، اگر میں نے اسی دن اسلام قبول کر لیا ہوتا اور پھر محمد سے خیرہ مانگتا تو وہ ضرور دے دیتے۔" (طبرانی)

یہی وجہ ہے کہ جب مکہ فتح ہو گیا تو لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہو گئے۔ (النصر ۱۱۰: ۲)



روزانہ ایک سیب کھائیے
کبھی معالج کے پاس نہ جائیے!

داناؤں کا یہ مشورہ درست، بشرطیکہ آپ کا معدہ بھی درست ہو اور سیب کو جزوِ بدن بنا سکے



ہاضمہ خراب ہو تو اچھی سے اچھی غذا بھی نظامِ ہضم پر بار بن جاتی ہے اور آپ قدرت کی عطا کردہ بہت سی نعمتوں سے صحیح طور پر لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔

اپنی صحت اور تندرستی کی خاطر کھانے پینے میں احتیاط سے کام لیجیے۔ سادہ اور زود ہضم غذا کھائیے۔

پُرخوری سے بچیے۔ مرچ مسالے دار چٹخاروں سے پرہیز کیجیے کیونکہ یہ معدے اور آنتوں کے افعال پر منفی اثرات مرتب کرتے ہیں۔

اگر کسی وقت کھانے پینے میں بے احتیاطی ہو جائے تو نظامِ ہضم کی شکایات مثلاً بدہضمی، قبض، گیس، سینے کی جلن، دردِ شکم اور کھانے سے بے رغبتی سے محفوظ رہنے کے لیے نئی کارمینا لیجیے۔ نئی کارمینا معدہ اور آنتوں کے افعال کو منظم و درست رکھتی ہے۔

نظامِ ہضم کی اصلاح کے لیے پُرتاثیر اکسیر

خوش ذائقہ **نئی کارمینا** ہمیشہ گھر میں رکھیے

Adarts-CAR-1/92

دین ودانش

(آڈیو' وڈیو کیسٹ)

مقرر: جاوید احمد غامدی

سلسلہ محاضرات

درس قرآن و حدیث

کیسٹ نمبر	کتاب حدیث	کیسٹ نمبر	سورہ
۱-۱۲۳	الصلوٰۃ (صحیح بخاری)	۱-۲۹	الانعام
۱۲۴-۱۵۵	الزکوٰۃ (صحیح مسلم)	۳۰-۶۶	الاعراف
۱۵۶-۱۷۲	الصوم (صحیح مسلم)	۶۷-۸۲	الانفال
۱۷۳-۱۹۱	فضائل قرآن (مشکوٰۃ المصابیح)	۸۳-۱۱۰	التوبہ
		۱۱۱-۱۲۷	یونس
		۱۲۸-۱۳۶	ہود
		۱۳۷-۱۵۹	یوسف
		۱۶۰-۱۶۵	الرعد
		۱۶۶-۱۷۱	ابراہیم
		۱۷۲-۱۷۶	الحجر
		۱۷۷-۱۹۲	النحل

نوٹ:

- درس قرآن و حدیث صرف آڈیو کیسٹ پر دستیاب ہیں۔
- درج ذیل نمبروں والی کیسٹیں معیاری ریکارڈنگ نہ ہونے کے باعث فی الحال دستیاب نہیں ہیں۔ ۴، ۵، ۸۹، ۹۵، ۹۷، ۱۰۲، ۱۲۷، ۱۳۷، ۱۵۴
- سلسلہ محاضرات کے کیسٹ نمبر ۱، ۱۴ اور ۳۵ وڈیو کیسٹ پر دستیاب نہیں ہیں۔

قیمت: آڈیو کیسٹ ۲۵ روپے، وڈیو کیسٹ ۱۴۰ روپے

المورد، شعبہ اصلاح و دعوت

۹۸(۲) ای، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون: ۸۵۶۳۱۸-۸۵۷۰۴۰ فیکس: ۸۵۷۰۵۳

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

ماہنامہ
اشراق
لاہور

جلد ۶ شمارہ ۱۱
نومبر ۱۹۹۴ء
جمادی الاخریٰ ۱۴۱۵ھ

البیان

شذرات

قرآنیات

میزان

فکر و نظر

مکاتیب

تبصرۂ کتب

فی شمارہ : ۸ روپے
سالانہ : ۸۰ روپے
بیرون ملک
ہوائی ڈاک : ۴۵۰ روپے
بحری ڈاک : ۲۵۰ روپے

المورد
دانش گاہ معارف اسلامی

۹۸ (۲) ای، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۵۴۷۰۰ فون : ۸۵۶۴۱۸-۸۵۷۰۴۰

انتظامی دفتر: ۶۶ احمد بلاک، گارڈن ٹاؤن، لاہور ۵۴۶۰۰ فون: ۵۸۶۴۴۳۱

مدیر مسئول: جاوید احمد غامدی ○ طابع: قومی پریس، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

المعارج

[۷۰]

اللہ کے نام سے جو سراپا رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

بہت جلدی مچائی ہے، ایک جلدی مچانے والے نے، اُس عذاب کے لیے جو اِن کافروں پر آکر رہے گا۔ اُسے کوئی ہٹا نہ سکے گا۔ وہ عروج کے زینوں والے (بزرگ و برتر) خداوند کی طرف سے ہوگا۔ (یہ ہر چیز کو اپنے پیمانوں سے ناپتے اور پھر اُس کے لیے جلدی مچا دیتے ہیں۔ اِنھیں بتا دو کہ) فرشتے اور رُوح الامین، (تمھارے حساب سے) پچاس ہزار سال کے برابر، ایک دن میں، اُس کے حضور پہنچتے ہیں۔ اس لیے، (اے پیغمبر)

تم (اِن کی اِس جلد بازی کے مقابلے میں) پورے حسن و وقار کے ساتھ صبر کرو۔ یہ اس کو دُور سمجھتے اور ہم اُس کو بہت قریب دیکھ رہے ہیں۔

(یہ بھی دیکھیں گے)۔

اُس دن جب آسمان تیل کی تلچھٹ کی طرح ہو جائے گا اور پہاڑ دُھنی ہوئی اُون کی طرح ہوں گے، اور کوئی سچّا دوست بھی، (اُس وقت اپنے) کسی دوست کو نہ پوچھے گا۔ (اس کے باوجود کہ) وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے۔ مجرم چاہے گا کہ اے کاش، وہ اُس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنے بیٹوں کو، اپنی بیوی کو، اپنے بھائی کو، اپنے خاندان کو، جو اُسے پناہ دیتا رہا، اور اِس زمین کے ہر شخص کو فدیہ میں دے دے، پھر اپنے آپ کو اُس سے چھڑا لے۔

ہرگز نہیں، وہ آگ کی لپیٹ ہے، چمڑی ادھیڑتی، ہر اُس شخص کو پکارتی ہوئی جس نے پیٹھ پھیری اور مُنہ موڑا اور مال جمع کیا، پھر سینت سینت کر رکھا۔

(یہ اسی طرح جلدی مچاتے رہیں گے۔ تم اِن کی پروا نہ کرو)۔ اِس میں شبہ نہیں، انسان

بہت بے صبرا پیدا ہوا ہے۔ (یہ اگر اپنی تربیت نہ کرے تو، بے شک، یہی ہوتا ہے کہ) اِس پر جب مصیبت آتی ہے تو گھبرا اُٹھتا، اور جب راحت ملتی تو بخیل بن جاتا ہے۔ ہاں، مگر وہ نہیں جو نمازی ہیں، جو ہمیشہ اپنی نماز کی پابندی کرتے اور جن کے مالوں میں سائل و محروم کے لیے ایک مقرر حق ہے، اور جو روزِ جزا کو برحق مانتے، اور جو اپنے پروردگار کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں ـــــ اِس میں شبہ نہیں کہ اُن کے پروردگار کا عذاب نڈر رہنے کی چیز ہی نہیں ہے ـــــ اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ـــــ مگر اپنی بیویوں اور اپنی لونڈیوں سے اِس لیے کہ اِن کے معاملے میں اُن پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ ہاں، جو اِن کے علاوہ کچھ چاہیں، تو وہی حد سے بڑھنے والے ہیں۔ اور جو (خلق اور خالق، دونوں کے معاملے میں) اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس کرتے، اور جو اپنی گواہی پر قائم رہتے اور جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں یہی ہیں جو بہشت کے باغوں میں ہوں گے، بڑی عزت کے ساتھ۔

(اس میں شبہ نہیں کہ یہی بہشت کے باغوں میں ہوں گے)۔ پھر کیا بات ہے کہ (ہمارا یہ فیصلہ سنتے ہی) یہ منکرین، دائیں اور بائیں سے، گروہ در گروہ، تم پر چلے پڑ رہے ہیں۔

کیا ان میں سے ہر شخص، (صرف اِس لیے کہ وہ دنیا میں بڑا ہے)، یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ نعمت بھری جنت میں داخل کر لیا جائے گا؟ ہرگز نہیں، (یہ اپنی اِس بڑائی پر نہ اترائیں)، ہم نے اِن کو اُس چیز سے پیدا کیا ہے، جسے یہ جانتے ہیں۔

(پھر کیا یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اِن کو دوبارہ پیدا نہ کر سکیں گے)؟ نہیں، میں قسم کھاتا ہوں مشرق و مغرب کی ساری وسعتوں کے مالک کی (کہ جب ہم مالک ہیں تو یقیناً)، ہم اس پر قادر ہیں کہ اِن کو (دوبارہ) اِن سے بہتر پیدا کر دیں اور ہم اِس سے عاجز نہ رہیں گے۔ اس لیے (یہ نہیں سمجھتے، تو) اِنھیں چھوڑ دو، یہ باتیں بنائیں اور کھیلیں، یہاں تک کہ اپنے اُس دن کو پہنچ جائیں جس کی دھمکی اِنھیں دی جا رہی ہے۔ جس دن یہ اپنی قبروں سے نکلیں گے، بڑی تیزی کے ساتھ بھاگتے ہوئے، گویا کہ دوڑ کے لیے لگائے ہوئے نشانوں کی طرف دوڑ رہے ہیں، اِن کی آنکھیں جھکی ہیں، اِن پر ذلت چھا رہی ہے۔ یہ ہے وہ دن جس سے یہ ڈرائے جاتے رہے۔

المعارج

منشورِ انقلاب

(۸)

ارکانِ پارلیمان کے لیے ایک اہم ضابطہ

جس شخص کی ہمارے موجودہ سیاسی نظام اور اس میں کار فرما اصول و ضوابط پر نظر ہے، وہ یہ بات جانتا ہے کہ ہمارے ہاں اس بات کو ایک سیاسی روایت کی حیثیت حاصل ہے کہ جب مختلف سیاسی جماعتوں کے نمائندے حکومتی ایوانوں کے لیے منتخب ہو جاتے ہیں، تو اپنی ذاتی آرا سے قطعِ نظر، ہر موقع پر اور ہر حال میں، اپنی سیاسی جماعت ہی کی حمایت میں بولتے اور اسی کے حق میں اپنے ووٹ ڈالتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات نہ صرف اسلامی اقدار کے منافی ہے، بلکہ قومی و ملی مفاد کے بھی خلاف ہے۔

یہ بات تو صحیح ہے کہ ایک جماعت کے نمائندے فی الجملہ، یکساں نظریات و افکار ہی کے حامل لوگ ہوتے ہیں، مگر اس کے یہ معنی، ہرگز، نہیں ہیں کہ ہر ہر معاملے اور جزئیات میں، ان کے درمیان، کامل ہم آہنگی اور اتفاق ہو نا، اور ان معاملات کے بارے میں، جماعت کا موقف ہی ان کے لیے حق و باطل کا معیار ہونا چاہیے۔

وہ لوگ، جن کو حکومتی ایوانوں میں جگہ دی جاتی ہے انھیں، درحقیقت، قومی و ملی مفادات کا امین بنایا جاتا ہے۔ چنانچہ، ان کو ایسی کٹھ پتلیاں نہیں ہونا چاہیے، جن کی ڈوریاں دوسروں کے ہاتھوں میں ہوں، اور جن کی زبانیں دوسروں کے نغمے الاپتی ہوں، بلکہ ہر ہر معاملے میں ان کو وہی بات کہنی چاہیے، جسے وہ خود حق سمجھتے اور اسی بات کی حمایت کرنی چاہیے، جسے وہ اپنے قومی و ملی اور دینی مفاد میں خیال کرتے ہوں۔ بالفاظِ دیگر، جب کوئی شخص، کسی جماعت کی طرف سے پارلیمان کے لیے نامزد کر دیا جائے، تو اب اس کی اپنی نظر میں، اس کی جماعتی وابستگی کو ثانوی حیثیت حاصل ہونی چاہیے اور ہر حال میں، قومی و ملی مفاد میں کام کرنے، حق کا ساتھ دینے، اور اس طرح اپنی ذمہ داری سے کماحقہ، عہدہ برآ ہونے ہی کو اصل اور بنیادی اہمیت

حاصل ہونی چاہیے۔

جب ہارون رشید نے امتِ مسلمہ کی امارت سنبھالی، تو قاضی ابو یوسف نے انھیں یہی ہدایت، ان الفاظ میں، دی:

"حکام کو اپنے رب کے حضور اسی طرح جواب دہ ہونا پڑے گا جس طرح ایک چرواہے کو اپنے مالک کے سامنے ہونا پڑتا ہے۔ اس وجہ سے جو ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے آپ پر ڈالی ہے، اس میں حق قائم کیجیے، اگرچہ ایک ہی گھڑی کے لیے ممکن ہو۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک، خوش قسمت امیر وہ ہوگا، جس کی رعایا اس کے سبب سے خوش حال ہو.... اللہ اور اس کے قانون کے معاملے میں، کسی کی ملامت کی پروا نہ کیجیے، اللہ سے برابر ڈرتے رہیے۔ اور ڈرنا زبان سے نہیں، دل سے ہوتا ہے۔ تقویٰ اختیار کیجیے، اور تقویٰ اللہ کی نافرمانی سے بچنے کا نام ہے۔ اور جو شخص بچنا چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے ضرور بچاتا ہے۔" (کتاب الخراج)

ارکانِ پارلیمان کی تربیت کا نظام

اگر ہم اپنے ماحول پر نظر ڈالیں، تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ہماری بیماریوں کا علاج کرنے والے طبیب اور ڈاکٹر ہوں یا ہمارے مکانوں کی تعمیر کرنے والے انجینئر، ہمارے موقف بیان کرنے والے وکیل ہوں یا ہمارے کاروباری اداروں کا انتظام سنبھالنے والے مینجر، غرض کہ ہر وہ شخص، جسے ہم اپنے معاشرے میں کوئی اہم ذمہ داری سونپتے یا کسی اہم منصب پر فائز کرتے ہیں، اس کے بارے میں، ہمارا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ اپنے کام کا ماہر ہو اور ان تمام تعلیمی و تربیتی مراحل سے گزرا ہو، جو اس کام کے لیے ضروری ہیں۔ ہم کبھی اپنے آپ کو کسی ایسے طبیب یا ڈاکٹر کے حوالے نہیں کرتے، جس کی مہارت کے بارے میں ہمیں شبہ ہو۔ نہ ہم کسی ایسے انجینئر، وکیل یا منتظم ہی کی خدمات حاصل کرنا پسند کرتے ہیں، جس کی قابلیتوں کے بارے میں ہمیں اعتماد نہ ہو۔

مگر، اس کے برعکس، یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جن طبیبوں اور ڈاکٹروں کے ہاتھوں میں ہم اپنی قوم کی نبض تھماتے، اور اس کی تعمیر کا کام، جن انجینئروں کے سپرد کرتے اور، قومی و بین الاقوامی سطح پر، اس کی نمائندگی کی ذمہ داری جن وکیلوں کو دیتے اور اس کے انتظام کا بوجھ جن منتظموں کے کندھوں پر ڈالتے ہیں، ان کی تعلیم و تربیت کی نہ ہمیں کوئی پروا ہے اور نہ ہم نے اس کے لیے کبھی کوئی نظام ہی بنانے کا سوچا ہے۔ غور کیجیے، تو یہ ناگزیر ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہم اپنے ملک کی باگ ڈور دیں، وہ نہ صرف اس منصب

کے لیے ضروری تعلیمی قابلیتوں سے بہرہ مند ہوں، بلکہ خاص اس کام کے لیے ان کی تربیت بھی کی گئی ہو۔

چنانچہ اس سلسلے میں، ایک تربیتی کورس (TRAINING COURSE) کا اجرا کیا جانا چاہیے، جو تمام منتخب نمائندوں کو صحیح طریقے پر، اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے اور بہتر طور پر، اپنے ملک و قوم کی خدمت کرنے کے لیے تیار کرسکے۔

اس ضمن میں سول سروسز (CIVIL SERVICES) کے امیدواروں کی تربیت کا جو نظام ہمارے ملک میں رائج ہے، اس سے رہنمائی لی جاسکتی ہے۔ اگرچہ، اس امتحان میں کامیاب ہونے والے امیدوار پہلے ہی سے کم از کم، بی۔اے (.B.A) کی سند حاصل کیے ہوتے ہیں، پھر بھی انھیں ذمہ داریوں پر فائز کرنے سے پہلے، ایک مخصوص عرصہ تک، انتظامی امور کی تربیت دی جاتی ہے۔ اس دوران میں، انھیں معاشیات، مطالعۂ پاکستان، انگریزی، فنانس، اسلامیات، فن تقریر (PUBLIC SPEAKING) انتظامی علوم وغیرہ جیسے مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ، ان افراد کی جسمانی صحت کے لیے ورزش اور کھیلوں کے مقابلے بھی کرائے جاتے ہیں۔

سول سروسز کے اس تعلیمی و تربیتی پروگرام کی نہج پر، ہمیں قومی و صوبائی اسمبلیوں کے لیے اپنے منتخب نمائندوں کی تربیت کا ایک پروگرام بھی جاری کرنا چاہیے۔ اس پروگرام کے لیے ایک باقاعدہ اکیڈمی کا قیام عمل میں لانا ہوگا۔ یہ ایک اقامتی پروگرام ہونا چاہیے اور اس کی مدت، کم سے کم چھ ماہ ہونی چاہیے۔ اس پروگرام میں ان تمام سیاسی امور کی تربیت اور ان تمام مضامین کا مطالعہ کرایا جانا چاہیے، جو ان نمائندوں کو اپنی آئندہ ذمہ داریاں سرانجام دینے میں معاون ہوسکیں۔ اس ضمن میں معاشیات، سیاسیات، اخلاقیات، حکمرانوں کے لیے اسلامی احکام، اسلامی قوانین کے لیے استنباط کا طریقہ، فن تقریر، قانون اور پالیسی سازی کے اصول و مبادی، انتظامی علوم، امور خارجہ اور ان کے منصب کے لحاظ سے دیگر ضروری علوم کو خاص طور پر شامل کیا جانا چاہیے۔

ترتیب : شہزاد سلیم

"تمام بنی نوعِ انسان کا آغاز آدم اور حوّا علیہما السلام ہی سے ہوا ہے۔ اس وجہ سے باعتبارِ خلقت کسی کو کسی پر کوئی شرف و تفوق حاصل نہیں ہے۔ خاندانوں اور قبائل کی تقسیم محض تعارف اور شناخت کے لیے ہے۔ کسی خاص خاندان یا قبیلہ کو اللہ تعالیٰ نے بجائے خود یہ امتیاز نہیں بخشا ہے کہ جو اس میں پیدا ہو، وہ اللہ کے ہاں معزز بن جائے اور دوسروں کے مقابل میں وہ اپنے کو اشرف و اعلیٰ سمجھنے لگے۔ جس طرح اللہ نے لوگوں کی شکلوں، ان کے رنگوں اور ان کے قد و قامت میں فرق رکھا، تاکہ لوگ ایک دوسرے کو شناخت کر سکیں، اسی طرح خاندانوں اور قبیلوں کی حد بندیاں قائم کر دیں، تاکہ لوگ ایک دوسرے کو پہچان سکیں۔ اس سے زیادہ ان حد بندیوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ کسی خاندان یا قبیلہ کے لوگ اس پندار میں مبتلا ہو جائیں کہ وہ، اللہ کے نزدیک، معزز ہیں یا اس نے ان کو دوسروں پر کوئی برتری بخشی ہے۔ اللہ کے ہاں عزت کی بنیاد تقویٰ پر ہے۔ اس کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو اس سے سب سے زیادہ ڈرنے والا اور اس کی حدود کی سب سے بڑھ کر پابندی قائم رکھنے والا ہے۔"

قرآنیات

امین احسن اصلاحی

سورۃ الحجرات

(۶)

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ (۱۳)

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک ہی نر اور ناری سے پیدا کیا ہے اور تم کو کنبوں اور قبیلوں میں تقسیم کیا ہے کہ تم باہم دگر تعارف حاصل کرو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ اشرف وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ بے شک اللہ بڑا ہی علیم و خبیر ہے۔

ایک عام خطاب سے یہ اس نسلی، خاندانی اور قبائلی غرور کا ایک قلم خاتمہ کر دیا، جو ان برائیوں میں سے اکثر کا سبب بنتا ہے جو اوپر بیان ہوئی ہیں۔ فرمایا کہ "اے لوگو! اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین رکھو کہ ہم نے سب کو ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت سے پیدا کیا ہے"، یعنی تمام بنی نوع انسان کا آغاز آدم اور حوا علیہما السلام ہی سے ہوا ہے، اس وجہ سے باعتبارِ خلقت کسی کو کسی پر کوئی شرف و تفوق حاصل نہیں ہے۔ خاندانوں اور قبائل کی تقسیم محض تعارف اور شناخت کے لیے ہے، کسی خاص خاندان یا قبیلہ کو اللہ تعالیٰ نے بجائے خود یہ امتیاز نہیں بخشا ہے کہ جو اس میں پیدا ہو، وہ اللہ کے ہاں معزز بن جائے اور دوسروں کے مقابل میں وہ اپنے کو اشرف و اعلیٰ سمجھنے لگے۔ جس طرح اللہ نے لوگوں کی شکلوں، ان کے رنگوں اور ان کے قد و قامت میں فرق رکھا، تاکہ لوگ ایک دوسرے کو شناخت کر سکیں، اسی طرح خاندانوں اور قبیلوں کی حد بندیاں قائم کر دیں، تاکہ لوگ ایک دوسرے کو پہچان سکیں۔ اس سے زیادہ ان حد بندیوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ کسی خاندان یا قبیلہ کے لوگ اس پندار میں مبتلا ہو جائیں کہ وہ، اللہ کے نزدیک، معزز ہیں یا اس نے ان کو دوسروں پر کوئی برتری بخشی ہے۔ اللہ کے ہاں عزت کی بنیاد تقویٰ پر ہے۔ اس کے نزدیک سب سے زیادہ

عزت والا وہ ہے جو اس سے سب سے زیادہ ڈرنے والا اور اس کی حدود کی سب سے بڑھ کر پابندی قائم رکھنے والا ہے۔

'اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌ خَبِیۡرٌ' یعنی اس مقرر کردہ معیار پر لوگوں کو پرکھنے میں اللہ تعالیٰ کو کوئی زحمت یا کوئی مغالطہ پیش آنے کا امکان نہیں ہے۔ وہ ہر چیز کو جاننے والا اور ہر ایک کے ہر قول و فعل کی خبر رکھنے والا ہے۔ جو عزت کا مستحق ہو گا وہ اپنا عزت کا مقام پا کے رہے گا، اگرچہ وہ کتنے ہی گمنام اور حقیر خاندان کے اندر سے اٹھا ہو اور جو اس کا مستحق نہیں ہو گا وہ خواہ کتنا ہی بڑا قرشی و ہاشمی یا سورج نسبی اور چاند نسبی ہو لیکن اللہ تعالیٰ اس کو اسی کھڈ میں پھینکے گا جس کا وہ سزاوار ہو گا۔

اس مجموعۂ آیات کی بعض ہدایات کی وضاحت

اس مجموعۂ آیات[1] میں جو باتیں بیان ہوئی ہیں ان کی بقدرِ ضرورت وضاحت آیات کے تحت ہم کرتے آئے ہیں لیکن تجسس اور غیبت کے بعض پہلو مزید وضاحت کے محتاج ہیں یہاں ہم ان کو بھی صاف کر دینا چاہتے ہیں۔

اس زمانے میں چونکہ فرد کی آزادی کا تصور ذہنوں پر بہت غالب ہے، اس وجہ سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام نے جس طرح عام افراد کو دوسروں کے احوال کے تجسس سے روکا ہے اسی طرح حکومت کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے حالات کا تجسس کرے۔ اس کو اپنا احتساب صرف ان معاملات تک محدود رکھنا چاہیے جو علانیہ طور پر اس کے نوٹس میں آجائیں۔ رہے اندرونِ خانہ کے معاملات تو وہ حکومت کے دائرۂ احتساب سے خارج ہیں۔ اس کی تائید میں بعض لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک واقعہ کا حوالہ بھی دیا ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے رات میں ایک شخص کے گانے کی آواز سنی جو اپنے گھر میں گا رہا تھا۔ آپ کو شک گزرا تو آپ دیوار پر چڑھ گئے۔ دیکھا کہ وہاں شراب بھی موجود ہے اور ایک عورت بھی، آپ نے پکار کر کہا: 'اے دشمن خدا کیا تو نے گمان کر رکھا ہے کہ تو اللہ کی نافرمانی کرے گا اور اللہ تیرا پردہ فاش نہ کرے گا'۔ اس نے جواب دیا: 'امیر المومنین، جلدی نہ کیجیے، اگر میں نے ایک گناہ کیا ہے تو آپ نے اکٹھے تین گناہ کر ڈالے ہیں۔ اللہ نے تجسس سے منع کیا تھا اور آپ نے تجسس کیا۔ اللہ نے حکم دیا کہ گھروں میں دروازوں سے داخل ہو اور آپ دیوار چڑھ

---

[1] ربط کے لیے دیکھیے: 'اشراق' ستمبر/ اکتوبر ۹۴ء

کر آتے۔ اللہ نے حکم دیا تھا کہ دوسروں کے گھروں میں اجازت کے بغیر نہ داخل ہو اور آپ میری اجازت کے بغیر میرے گھر میں داخل ہوئے'، یہ جواب سن کر حضرت عمر اپنی غلطی مان گئے اور اس کے خلاف انھوں نے کوئی کارروائی نہ کی، البتہ یہ وعدہ لے لیا کہ وہ بھلائی کی راہ اختیار کرے گا۔

یہ روایت بعض حضرات نے مکارم اخلاق اور ترغیب و ترہیب کی نوعیت کی کتابوں میں درج کی ہے، لیکن نہ سند کے اعتبار سے اس کا کوئی درجہ ہے اور نہ متن ہی کے پہلو سے یہ قابل اعتبار ہے۔ سند کے ضعف کے لیے تو یہی بات کافی ہے کہ بہت سے لوگ خاص طور پر ارباب تصوف، اخلاق و موعظت کی روایات میں تحقیق سند کی اہمیت کے قائل ہی نہیں ہیں جس قسم کے قصوں سے، ان کے نزدیک، کوئی مفید سبق حاصل ہوتا ہو، ان کو بے تکلف، بلا تحقیق سند و متن اپنی کتابوں میں درج کر دیتے ہیں۔ رہا اس کا متن تو اس پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہ واقعہ بالکل ہی بعید از عقل و قیاس ہے۔

اول تو یہی بات ناقابل قیاس ہے کہ کوئی شخص مدینہ منورہ میں، اور وہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں، ایسی جسارت کر سکے کہ شاہد و شراب کے ساتھ اس طرح رنگ رلیوں میں مصروف ہو کر گانے کی آواز حضرت عمر کو باہر گلیوں میں سنائی دے اور ان کو اس بزم عیش میں خلل انداز ہونا پڑے۔ اگر عین مرکز اسلام میں، فاروق اعظم کے دور میں، شیطان کی جسارت کا یہ حال رہا ہے تو ماننا پڑے گا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی شیطان کو مرعوب نہ کر سکے، حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جس راستہ سے گزرتے ہیں، شیطان وہ راستہ ہی چھوڑ کر ہٹ جاتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس روایت کو باور کیجیے تو ماننا پڑے گا کہ حضرت عمر کو قرآن و حدیث کے یہ احکام معلوم نہیں تھے کہ کسی کے گھر میں اس کی دیوار پھاند کر داخل ہونا جائز نہیں ہے، بلکہ دروازے پر کھڑے ہو کر سلام کر کے اجازت لینی چاہیے۔ اگر اجازت ملے تو داخل ہونا چاہیے، ورنہ تین بار سلام کر کے چپکے سے اُلٹے پاؤں واپس ہو جانا چاہیے۔ کیا کوئی شخص عقل و ہوش رکھتے ہوئے یہ باور کر سکتا ہے کہ کتاب و سنت کے ان صریح احکام سے حضرت عمر کو پہلی بار ایک رند شاہد باز نے آگاہ کیا! کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کبھی سورۂ نور اور سورۂ حجرات کی تلاوت کا، العیاذ باللہ، موقع نہیں ملا تھا؟

تیسری بات یہ ہے کہ اگر حضرت عمر نے اپنی یہ تینوں غلطیاں نہایت سعادت مندی سے تسلیم کر لی تھیں تو اپنے عمال اور گورنروں کو یہ ہدایت نامہ کیوں نہیں جاری فرمایا کہ اب تک میں غلطی پر تھا کہ لوگوں کے گھروں کا تجسس کیا کرتا تھا، اب مجھ پر واضح ہو گیا کہ اس میں اکٹھی تین باتیں خلاف شریعت ہیں، اس وجہ سے تم لوگ اندرون خانہ کے معاملات سے تعلق نہ رکھو۔ لوگ اپنے گھروں میں جو ادھم چاہیں

مچائیں۔ اگر تمھیں شبہ گزرے تو دروازے پر کھڑے ہو کر سلام کر کے اجازت مانگو، اگر اجازت ملے تو گھر کے اندر جاؤ، ورنہ تین بار سلام کر کے واپس لوٹ آؤ۔ جہاں تک ہمیں علم ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نہ صرف یہ کہ اس قسم کا کوئی حکم نامہ جاری نہیں کیا، بلکہ متعدد واقعات تاریخوں میں، ایسے موجود ہیں جو شاہد ہیں کہ ان کے عمال بھی تجسس کرتے رہے اور خود حضرت عمر بھی اس حد تک تجسس کرتے تھے کہ راتوں میں دودھ پیتے بچے روتے، تو وہ ان کے رونے کا سبب معلوم کرنے کی بھی کوشش کرتے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ اس روایت کو باور کیجیے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ایک اسلامی حکومت میں اگر کچھ لوگ اپنے گھروں میں شرابیں پئیں، بازاری عورتوں سے رنگ رلیاں منائیں، رقص و سرود کی محفلیں گرم کریں، یہاں تک کہ بم اور اسٹین گن کے ذخیرے بھی جمع کر چھوڑیں، تو بھی حکومت کی پولیس کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ان کے گھروں میں گھس کر ان کے عیش کو مکدر کرے، یہاں تک کہ خلیفۂ وقت کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ بدونِ اذن، وہ ان کے گھروں میں داخل ہونے کی جرأت کر سکے، اور کبھی غلطی سے اگر ایسی جرأت کر بیٹھے تو بس اتنی ہدایت فرما دیا کرے کہ آئندہ آپ لوگ اس طرح کی باتوں سے احتیاط کریں۔

یہ روایت اس قابل تو نہیں تھی کہ اس سے تعرض کیا جاتا، لیکن اس کو اس زمانے میں، ان لوگوں نے بڑے اعتماد سے پیش کیا ہے جو رات دن اسلامی حکومت کا وظیفہ پڑھتے ہیں، اس وجہ سے اس سے تعرض کرنا پڑا۔ بہرحال، یہ روایت، ہمارے نزدیک، بالکل ناقابلِ اعتبار ہے۔ ایک اسلامی حکومت لوگوں کے اخلاق و کردار کی بھی محافظ ہوتی ہے اور ملک کے امن، عدل اور اس کی سلامتی کی بھی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس وجہ سے، اس کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ جہاں کہیں اس کو کوئی شبہ گزرے، وہ اس کا تجسس کرے، لیکن ہر حق کے استعمال پر کچھ اخلاقی و قانونی پابندیاں ہوتی ہیں جن کا لحاظ حکومت کو بھی کرنا پڑتا ہے۔ حکومت، اگر ان کا لحاظ نہیں کرتی تو خواہ اس کا ہاتھ کوئی نہ پکڑ سکے، لیکن، عند اللہ، وہ لوگ مجرم ٹھہریں گے، جنھوں نے ایک ایسے حق کو پبلک کے بے گناہ افراد کو پریشان کرنے کے لیے استعمال کیا جو ان کو امن، عدل اور رعایا کی حفاظت کے لیے عطا ہوا تھا۔

رہے، عام افراد تو ان کو اس باب میں مندرجہ ذیل باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

——— جو تجسس کسی کی بھلائی کی خاطر، نیک ارادہ، نیک مقصد سے ہو وہ، جیسا کہ ہم آیت کے تحت عرض کر چکے ہیں، صرف یہی نہیں کہ ممنوع نہیں ہے، بلکہ نہایت نیکی کا کام ہے۔ قرآن میں ہدایت ہے کہ خوددار غریبوں کی مدد کے لیے ان کو ڈھونڈ کر خود ان کے پاس پہنچنے کی کوشش کرو۔

یہ توقع نہ رکھو کہ وہ تم سے پلٹ کر سوال کریں گے۔

——— اگر کسی شخص کے متعلق یہ شبہ ہو کہ اس کی درپردہ سرگرمیاں دوسرے بے گناہ افراد کے جان و مال اور آبرو کے لیے خطرہ ہیں یا ملک کے امن، عدل اور سلامتی کو ان سے نقصان متصوّر ہے تو اس کو برا یا جھگڑا سمجھ کر اس سے بے تعلق نہیں رہنا چاہیے۔ اگر اصلاح کر سکنے کی پوزیشن میں نہ ہو تو ان لوگوں کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کرے جو اس کی اصلاح کر سکتے ہوں یا اس کا ہاتھ پکڑ سکتے ہوں۔ یہ حقیقت نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کشتی کے مسافروں والی تمثیل میں سمجھائی ہے۔

——— اگر کسی شخص کی کوئی ایسی برائی علم میں آئے جو اس کی ذات ہی تک محدود ہو تو اس کو نصیحت کرے، اگر نصیحت کرنے کے پوزیشن میں ہو۔ اگر اس پوزیشن میں نہ ہو تو اس سے غضِ بصر کرے اور پردہ ڈالے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے عیوب پر پردہ ڈالتا ہے جو دوسروں کے عیوب پر پردہ ڈالتے ہیں لیکن اگر برائی متعدی نوعیت کی ہو تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت پر عمل کرے جو انکارِ منکر والی حدیث میں بیان ہوئی ہے۔

قرآن و حدیث کے سمجھنے میں لوگوں کو زیادہ مغالطہ اس وجہ سے پیش آتا ہے کہ آیات و احادیث کا موقع و محل معیّن کرنے میں لوگ تدبّر سے کام نہیں لیتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض حدیثوں میں اپنے مسلمان بھائی کے گناہوں پر پردہ ڈالنے کی فضیلت بیان ہوئی ہے، لیکن کوئی صاحب مجرّد اس حدیث کی بنا پر اگر یہ فتویٰ دے بیٹھیں کہ دوسروں کی نیکی بدی سے ہمیں کوئی سروکار نہیں، ہمیں صرف اپنی ذات سے تعلق رکھنا چاہیے، کسی سے کوئی بدی ہمارے علم میں آئے بھی تو اس پر ہمیں پردہ ڈالنا چاہیے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ہمارے گناہوں پر پردہ ڈالے گا، تو اگر اس فتوے کی تائید میں ایک حدیث موجود ہے، لیکن یہ فتویٰ ذہنوں میں بڑی الجھن پیدا کر دے گا، اس لیے کہ دوسری حدیثوں میں یہ بات بھی نہایت وضاحت سے بیان ہوئی ہے کہ اگر تم میں سے کوئی برائی دیکھے تو وہ اپنے ہاتھ سے اس کی اصلاح کر دے اگر اس کی طاقت ہو، طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اس کی اصلاح کرے، اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو دل سے اس کو برا سمجھے، اس سے نیچے ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے۔ یہاں 'طاقت' سے مراد، ظاہر ہے کہ اپنے دائرۂ اختیار ہی میں حاصل طاقت ہے چنانچہ حکومت کا دائرۂ اختیار ایک ہوگا اور صاحبِ خانہ کا کچھ اور۔

یہ الجھن ظاہر ہے کہ اس وجہ سے پیدا ہوگی کہ دونوں حدیثوں کا موقع و محل معیّن کرنے کی کوشش کی گئی۔ اگر دونوں کا موقع و محل معیّن ہو جائے تو کوئی الجھن نہیں پیدا ہوگی۔ ایک شخص کو اگر

آپ دیکھتے ہیں کہ کھڑا ہو کر پیشاب کر رہا ہے تو یہ خیال کر کے غضِ بصر بھی کر سکتے ہیں کہ ممکن ہے کہ کوئی عذر ہو۔ اگر عذر نہ واضح ہو تو اس کو عمدہ طریقہ سے نصیحت بھی کر سکتے ہیں کہ یہ طریقہ تہذیب وشائستگی اور اسلامی آدابِ طہارت کے خلاف ہے۔ اگر نصیحت کر سکنے کے پوزیشن میں نہ ہوں، تو اس کے اس اُجڈپن پر پردہ ڈال لیے، اس کا اشتہار نہ دیجیے۔ اِن شاء اللہ آپ کی یہ پردہ پوشی آپ کے لیے عند اللہ، موجبِ اجر ہوگی۔ لیکن ایک شخص کے متعلق اگر آپ یہ علم رکھتے ہیں کہ اس نے اپنے گھر میں شراب کی بھٹی بنا رکھی ہے یا حشیش کا ذخیرہ جمع کر رکھا ہے یا اسلحہ چھپا رکھا ہے یا چکلہ قائم کر رکھا ہے، اور آپ پولیس اور حکومت کو اطلاع دے سکنے کی پوزیشن میں ہونے کے باوجود اس خیال سے اس پر پردہ ڈالے ہوئے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ آپ کے گناہوں پر پردہ ڈالے گا تو، میرے نزدیک، یہ محض خوش فہمی ہے۔ اس طرح کی خوش فہمی میں پڑے ہوئے لوگ ثواب کمانا تو درکنار اپنے ایمان ہی گنوا بیٹھیں گے۔

غیبت کے باب میں بھی بعض لوگوں نے قلتِ تدبّر کے سبب سے، اسی نوع کا خلط مبحث پیدا کر دیا ہے۔ وہ غیبت کے حدود معیّن کرتے وقت بالکل بھول گئے کہ قرآن و حدیث میں جس طرح غیبت کی نہی وارد ہوئی ہے، اسی طرح جرح و تعدیل، شہادتِ حق، انکارِ منکر، خیر خواہیِ مسلمین کے احکام بھی نہایت مثبت اور قطعی الفاظ میں وارد ہوئے ہیں جب ان دونوں میں تطبیق کا سوال پیدا ہوا اور کوئی تطبیق ان کی سمجھ میں نہیں آئی تو انھوں نے یوں تطبیق پیدا کر ڈالی کہ ہیں تو یہ ساری باتیں داخلِ غیبت، لیکن یہ اس لیے مباح کر دی گئی ہیں کہ حکمتِ عملی ان کی مقتضی تھی۔ حالانکہ جرح و تعدیل، شہادتِ حق، انکارِ منکر اور نصحِ مسلمین کے احکام مباحات میں سے نہیں، بلکہ واجباتِ دین میں سے ہیں۔ اسلامی نظام کا سارا جمال و کمال انھی پر منحصر ہے۔ راویوں کی تحقیق اور جرح و تعدیل پر علمِ شریعت کی بنیاد ہے۔ شہادتِ حق اس امت کا وہ فریضۂ منصبی ہے جس کے لیے یہ دنیا میں برپا کی گئی ہے۔ انکارِ منکر کے ساتھ اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امت کے قیام و بقا کو وابستہ کیا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی خیر خواہی صرف اخوت ہی کا تقاضا نہیں ہے، بلکہ اسی سورہ میں آپ پڑھ آئے ہیں، بلکہ ایمان کا بھی تقاضا ہے۔ یہ چیزیں امت پر غیبت کو مباح کر کے نہیں فرض کی گئی ہیں بلکہ ایمان کے تقاضوں کے تحت فرض کی گئی ہیں۔ رہی غیبت تو اس کا ایک خاص دائرہ ہے جس کی وضاحت آیت کے تحت ہم کر آئے ہیں۔

نیا انقلاب

برٹرینڈ رسل نے لکھا ہے کہ قدیم زمانہ میں ہزاروں سال تک مذہب کا دور تھا۔ اس زمانہ میں انسان کوئی ترقی نہ کر سکا۔ انسان کی تمام تر ترقیاں حالیہ چند صدیوں میں ہوئی ہیں، جب کہ مذہب کا غلبہ ختم ہو گیا اور سائنس کا دور دنیا میں شروع ہوا۔

برٹرینڈ رسل کی یہ بات ایک ترمیم کے ساتھ صحیح ہے۔ قدیم زمانہ میں جو غلبہ تھا، وہ حقیقی مذہب کا غلبہ نہیں تھا، بلکہ مشرکانہ مذہب (بالفاظِ دیگر شرک) کا غلبہ تھا۔ یہی شرک ہے جو قدیم زمانہ میں تمدنی ترقیوں میں رکاوٹ بنا رہا، نہ کہ حقیقی معنوں میں مذہب۔ حقیقی مذہب موحدانہ مذہب ہے، جب کہ قدیم تاریخ میں مشرکانہ مذہب ہمیشہ غالب رہا ہے۔

تمدنی ترقیاں فطرت کی تسخیر کا نتیجہ ہیں۔ قدیم زمانہ میں شرک فطرت کی چیزوں کو معبود کا مقام دیے ہوئے تھا۔ ان چیزوں کو آدمی پرستش کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ان کو تحقیق اور تسخیر کی نظر سے کیوں دیکھتا۔ ساتویں صدی عیسوی میں پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے جو انقلاب آیا، اس نے تاریخ میں پہلی بار سچے مذہب (توحید) کو غلبہ کا مقام عطا کیا۔

توحید کے غلبہ کے بعد یہ ہوا کہ فطرت کی چیزیں جو اس سے پہلے پوجنے کی چیزیں بنی ہوئی تھیں، وہ اب تسخیر کی چیزیں بن گئیں۔ (وسخر لکم ما فی السموات والارض)۔ پہلے اگر یہ نظریہ تھا کہ ہم چیزوں کے لیے ہیں، تو اب یہ نظریہ ہو گیا کہ چیزیں ہمارے لیے ہیں نہ کہ ہم چیزوں کے لیے۔

برٹرینڈ رسل نے جس انقلاب کو سائنس کی طرف منسوب کیا ہے، وہ انقلاب، حقیقتاً، سچے مذہب کا لایا ہوا ہے۔ اس کا بیج ساتویں صدی عیسوی میں اسلام (دینِ توحید) کے ذریعہ رکھا گیا، نہ کہ سولھویں صدی میں یورپ کی نشاۃِ ثانیہ کی صورت میں۔ یورپ کی نشاۃِ ثانیہ تو خود اسلامی انقلاب سے متاثر ہو کر ظہور میں آئی۔

برٹرینڈ رسل جیسے لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ اسلام اور دوسرے مذہب کا مطالعہ ایک ہی مشترک عنوان یعنی مذہب (RELIGION) کے تحت کرتے ہیں۔ اگر وہ اس موضوع کا مطالعہ دو الگ الگ عنوانوں کے تحت کریں، تو اس معاملہ کو سمجھنے میں انھیں دشواری پیش نہ آئے۔ محرّف مذہب اور غیر محرّف مذہب میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ دونوں کا مطالعہ ایک عنوان کے تحت نہیں کیا جا سکتا۔

وحید الدین خان

جاوید احمد غامدی

"اگر ایک شخص قتل کے جرم میں قتل کر دیا جاتا ہے، تو، بظاہر، تو ایک جان کے بعد، یہ دوسری جان بھی گویا تلف ہی ہوتی ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے اگر دیکھیے تو اس کے قتل سے، پورے معاشرے کے لیے، زندگی کی ضمانت پیدا ہوتی ہے۔ اگر اس سے قصاص نہ لیا جائے، تو اندیشہ ہے کہ یہ جس ذہنی خرابی میں مبتلا ہو کر، ایک بے گناہ کے قتل کا مرتکب ہوا ہے، وہ خرابی پورے معاشرے میں متعدی ہو جائے۔ بیماری اور بیماری میں فرق ہوتا ہے۔ جو بیماریاں قتل، ڈکیتی، چوری اور زنا وغیرہ، جیسے خطرناک جرائم کا سبب بنتی ہیں، ان کی مثال ان بیماریوں کی ہے، جن میں پورے جسم کو بچانے کے لیے، بسا اوقات، جسم کے کسی عضو کو کاٹ کر، الگ کر دینا پڑتا ہے۔ اگرچہ کسی عضو کو کاٹ پھینکنا ایک سنگ دلی کا کام معلوم ہوتا ہے، لیکن ایک ڈاکٹر کو یہ سنگ دلی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اگر وہ طبیعت پر جبر کر کے، یہ سنگ دلی اختیار نہ کرے، تو اس عضو کی ہم دردی میں، اسے مریض کے پورے جسم کو ہلاکت کے حوالے کرنا پڑتا ہے۔"

میزان

جاوید احمد غامدی

حدود و تعزیرات
(۳)
سزا کا مقصد

ان سزاؤں کے جو مقاصد قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں، وہ یہ ہیں :

قتل کی سزا کا مقصد، اس زمین پر، انسانی وجود کی بقا کا اہتمام ہے۔ چنانچہ دیکھیے، ارشاد فرمایا ہے :

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ، لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ (البقرہ ۲: ۱۷۹)	"اور تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے، اے عقل والو، تاکہ تم حدود الٰہی کی پابندی کرتے رہو۔"

اسی طرح فرمایا ہے :

اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا۔ (المائدہ ۵: ۳۲)	"جس نے کسی کو قتل کیا، اس کے بغیر کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں کوئی فساد برپا کیا ہو، تو اس نے گویا سب انسانوں کو قتل کیا، اور جس نے اسے بچایا، اس نے گویا سب انسانوں کو بچا لیا۔"

استاذ امام امین احسن اصلاحی اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں :

"یہ زندگی فرد کے لحاظ سے نہیں، بلکہ معاشرے کے لحاظ سے ہے۔ اگر ایک شخص قتل کے جرم میں قتل کر دیا جاتا ہے، تو بظاہر تو ایک جان کے بعد، یہ دوسری جان بھی گویا تلف ہی ہوتی ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے، اگر دیکھیے، تو اس کے قتل سے، پورے معاشرے

کے لیے، زندگی کی ضمانت پیدا ہوتی ہے۔ اگر اس سے قصاص نہ لیا جائے، تو اندیشہ ہے کہ یہ جس ذہنی خرابی میں مبتلا ہو کر، ایک بے گناہ کے قتل کا مرتکب ہوا ہے، وہ خرابی پورے معاشرے میں متعدی ہو جائے۔ بیماری اور بیماری میں فرق ہوتا ہے۔ جو بیماریاں قتل، ڈکیتی، چوری اور زنا وغیرہ، جیسے خطرناک جرائم کا سبب بنتی ہیں، اُن کی مثال ان بیماریوں کی ہے، جن میں پورے جسم کو بچانے کے لیے، بسا اوقات، جسم کے کسی عضو کو کاٹ کر، الگ کر دینا پڑتا ہے۔ اگرچہ کسی عضو کو کاٹ پھینکنا ایک سنگ دلی کا کام معلوم ہوتا ہے، لیکن ایک ڈاکٹر کو یہ سنگ دلی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اگر وہ طبیعت پر جبر کر کے، یہ سنگ دلی اختیار نہ کرے، تو اس عضو کی ہم دردی میں، اسے مریض کے پورے جسم کو ہلاکت کے حوالے کرنا پڑے گا۔

معاشرہ اپنی مجموعی حیثیت میں ایک جسم سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس جسم کے بعض اعضا میں بھی بسا اوقات، اسی قسم کا فساد و اختلال پیدا ہو جاتا ہے، جس کا علاج مرہم و ضماد سے ممکن نہیں ہوتا، بلکہ عضو مریض پر آپریشن کر کے، اس کو جسم کے مجموعے سے الگ کر دینا ضروری ہوتا ہے۔ اگر یہ خیال کیا جائے کہ یہ عضو مریض ہے، اس وجہ سے نرمی اور ہم دردی کا مستحق ہے، تو اس نرمی کا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ ایک دن یہ عضو، سارے جسم کو سڑا اور گلا کر رکھ دے۔"

(تدبر قرآن، ج ۱، ص ۴۳۶ - ۴۳۷)

زنا، قذف، محاربہ اور چوری میں سزا کا مقصد پاداش عمل کے ساتھ مجرم کی فضیحت اور رسوائی بھی ہے، تاکہ اسے معاشرے کے لیے عبرت بنا دیا جائے۔

زنا کے حکم میں فرمایا ہے:

وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (النور ۲۴: ۲-۳)	"اور ان کی اس سزا کے وقت، مسلمانوں کی ایک جماعت وہاں موجود رہنی چاہیے۔ یہ زانی نکاح نہ کرنے پائے، مگر کسی زانیہ اور مشرکہ کے ساتھ، اور اس زانیہ کے ساتھ نکاح نہ کرے، مگر کوئی زانی یا مشرک۔ اہل ایمان پر یہ، بہرحال، حرام ٹھیرایا گیا ہے۔"

قذف کے حکم میں ارشاد ہوا ہے :

وَلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ، وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ. (النور ۴:۲۴)	"اور ان کی گواہی پھر کبھی قبول نہ کرو۔ اور یہی لوگ فاسق ہیں۔"

محاربہ اور فساد فی الارض کے حکم میں فرمایا ہے :

ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا، وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ. (المائدہ ۵: ۳۳)	"یہ اُن کے لیے، اس دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بھی اُن کے لیے بڑی سزا ہے۔"

اسی طرح چوری کے حکم میں ارشاد ہوا ہے :

جَزَآءً بِمَا كَسَبَا، نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ. (المائدہ ۵ : ۳۸)	"اُن کے عمل کی پاداش اور اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا کے طور پر، اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔"

'جزاء بما کسبا، نکالا من اللہ'، یہ اس مقصد کی وضاحت کے لیے سب سے زیادہ جامع تعبیر ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی، اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

"(اس) میں قطعِ ید کے دو سبب بیان ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ مجرم کے جرم کی سزا ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ 'نکال' ہے۔ 'نکال' کے معنی کسی کو ایسی سزا دینے کے ہیں، جس سے دوسرے عبرت پکڑیں۔ ان دونوں کے درمیان حرفِ عطف کا نہ ہونا، اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دونوں باتیں' اس سزا میں بہ یک وقت مطلوب ہیں۔ یعنی یہ پاداشِ عمل بھی ہے، اور دوسروں کے لیے سامانِ عبرت بھی۔ جو لوگ، اس کے ان دونوں ہی پہلوؤں پر بہ یک وقت نظر نہیں ڈالتے، وہ بسا اوقات اس خلجان میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جرم کے اعتبار سے سزا زیادہ سخت ہے، حالاں کہ اس سزا میں متعین اس جرم ہی کی سزا نہیں ہے، جو مجرم سے واقع ہوا، بلکہ ان بہت سے جرائم کی روک تھام بھی، اس میں شامل ہے، جن کا وہ اپنے فعل سے محرک بن سکتا ہے' اگر اس کو ایسی سزا نہ دی جائے جو دوسروں کے حوصلے پست کر دے۔ جنس کی طرح مال کی بھوک بھی، انسان کے اندر بڑی ہی شدید ہے۔ اگر اس حرص کو ذرا ڈھیل مل جائے، تو پھر اس کے نتائج کیا کچھ

نکل سکتے ہیں، اس کا اندازہ کرنے کے لیے، موجودہ زمانے کے حالات میں کافی سامانِ بصیرت موجود ہے، بشرطیکہ دیکھنے والی آنکھیں موجود ہوں۔ اس زمانے میں کسی متمدن سے متمدن ملک کے صرف ایک سال کے وہ ہولناک جرائم جمع کر لیے جائیں، جو محض چوری کی وجہ سے پیش آئے، تو وہ آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن تہذیب جدید کے مارے ہوئے انسان کی پیشانی، یہ سن کر، تو عرق آلود ہو جاتی ہے کہ چوری پر کسی کا ہاتھ کٹ جائے، لیکن ان ہزاروں دل ہلا دینے والے واقعات سے اس کا دل نہیں پسیجتا جو بالواسطہ یا بلاواسطہ چوری کی راہ سے ظہور میں آتے ہیں۔ چوری کوئی مفرد جرم نہیں ہے، بلکہ یہ مجموعۂ جرائم ہے، جس سے طرح طرح کے ہولناک جرائم ظہور میں آتے ہیں۔ اگر چوری کی راہ مسدود ہو جائے، تو یہ یا تو بالکل ہی ناپید ہو جائیں گے، یا کم از کم یہ کہ انتہائی حد تک کم ہو جائیں گے۔ چنانچہ تجربہ گواہ ہے کہ چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا سے نہ صرف چوری کے واقعات، انتہائی حد تک، کم ہو گئے، بلکہ دوسرے جرائم میں بھی انتہائی کمی ہو گئی۔ پھر اگر چند ہاتھ کٹ جانے سے، ہزاروں سر، ہزاروں گھر، ہزاروں آبروئیں محفوظ ہو جائیں، ظلم و شقاوت اور حرث و نسل کی بربادی کے بہت سے اسباب کا خاتمہ ہو جائے، تو عقلِ سلیم تو یہی کہتی ہے کہ یہ مہنگا سودا نہیں ہے، بلکہ نہایت بابرکت سودا ہے، لیکن موجودہ زمانے کے دانش فروشوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔"

(تدبر قرآن، ج ۲، ص ۵۱۲-۵۱۳)

ثبوتِ جرم کا طریقہ

ثبوتِ جرم کے لیے، ان سزاؤں میں، قرآنِ مجید نے، کسی خاص طریقے کی پابندی، چونکہ کسی جگہ لازم نہیں ٹھیرائی، اس وجہ سے یہ بالکل قطعی ہے کہ اسلامی قانون میں جرم اُن سب طریقوں سے ثابت کیا جاتا ہے، جنھیں اخلاقیاتِ قانون میں، مسلمہ طور پر، ثبوتِ جرم کے طریقوں کی حیثیت سے قبول کیا جاتا، اور جن کے بارے میں عقل تقاضا کرتی ہے کہ ان سے اُسے ثابت کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ حالات، قرائن، طبی معاینہ، پوسٹ مارٹم، انگلیوں کے نشانات، گواہوں کی شہادت، مجرم کے اقرار، قسم، قسامہ اور اس طرح کے دوسرے تمام شواہد سے، جس

طرح جرم، اس دنیا میں، ثابت ہوتے ہیں، اسلامی شریعت کے جرائم بھی، ان سے بالکل اسی طرح ثابت قرار پاتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی حقیقت، اپنے ارشاد: البینة علی المدعی والیمین علی المدعی علیہ[1] میں لفظ 'البینة' سے واضح فرمائی ہے۔ ابن قیم لکھتے ہیں:

البینة فی کلام اللہ و رسولہ وکلام الصحابة اسم لکل مایبین الحق فھی اعم من البینة فی اصطلاح الفقہاء حیث خصوھا بالشاھدین او الشاھد والیمین۔ (اعلام الموقعین، ج ۱، ص ۹۰)	"البینة، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے کلام میں ہر اس شے کا نام ہے، جس سے حق واضح ہو جائے۔ چنانچہ فقہا کی اصطلاح کے مقابلے میں، اس کا مفہوم وسیع تر ہے، کیونکہ ان حضرات نے اسے دو گواہوں، یا ایک گواہ اور قسم کے ساتھ خاص کر دیا ہے۔"

اس سے مستثنیٰ صرف دو صورتیں ہیں:

اوّل یہ کہ کوئی شخص کسی ایسے شریف اور پاک دامن مرد یا عورت پر زنا کی تہمت لگائے، جس کی حیثیتِ عرفی بالکل مسلم ہو۔ اس صورت میں قرآن کا اصرار ہے کہ اسے ہر حال میں چار عینی گواہ پیش کرنا ہوں گے۔ اس سے کم، کسی صورت میں بھی، اس کا مقدمہ ثابت نہ ہو سکے گا۔ حالات، قرائن، طبی معاینہ، یہ سب اس معاملے میں، اس کے نزدیک، بے معنی ہیں۔ آدمی بدچلن ہو، تو ثبوتِ جرم کے لیے یہ سب طریقے، اختیار کیے جا سکتے ہیں، لیکن اس کی شہرت، اگر، ایک شریف اور پاک دامن شخص کی ہے، تو جیسا کہ اوپر قذف کے حکم میں بیان ہوا، اسلام یہی چاہتا ہے کہ اس سے اگر کوئی لغزش ہوئی بھی ہے، تو اس پر پردہ ڈال دیا جائے، اور اسے معاشرے میں رسوا نہ کیا جائے۔ چنانچہ اس صورت میں وہ چار عینی شہادتوں ہی کا تقاضا کرتا اور الزام لگانے

---

[1] ترمذی، کتاب الاحکام۔ "دلیل پیش کرنا مدعی کی ذمہ داری ہے، اور قسم وہ کھائے گا، جو اس دعوے کا انکار کرے۔"

والا، اگر ایسا نہ کر سکے تو اسے، لازماً، قذف کا مجرم ٹھیرانا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ، ثُمَّ	"اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت
لَمْ يَأْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ	لگائیں، پھر چار گواہ نہ لائیں، تو اُن کو اسی
فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً،	کوڑے مارو، اور اُن کی گواہی پھر کبھی قبول
وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا،	نہ کرو۔ اور یہی لوگ فاسق ہیں۔ لیکن وہ جو
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ اِلَّا	اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لیں، تو اللہ
الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا،	ان کے لیے غفور و رحیم ہے۔"
فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (النور ۲۴: ۴-۵)	

دوم یہ کہ کسی معاشرے میں اسلامی حکومت قائم ہو جانے کے بعد، اس میں موجود اُن قحبہ عورتوں سے نمٹنے کے لیے، جو مسلمان ہونے کے باوجود اس جرم سے باز نہ آئیں، قرآنِ مجید کی رو سے یہی کافی ہے کہ چار مسلمان گواہ طلب کیے جائیں، جو صرف اس بات پر گواہی دیں کہ فلاں، فی الواقع، زنا کی عادی ایک قحبہ عورت ہے۔ اس صورت میں یہ ضروری نہیں ہے کہ انھوں نے کسی خاص موقع پر اسے زنا کرتے دیکھا بھی ہو۔ وہ اگر عدالت میں پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ گواہی دیتے ہیں کہ ہم اسے ایک قحبہ ہی کی حیثیت سے جانتے ہیں، اور عدالت جرح و نقد کے بعد، اُن کی گواہی پر مطمئن ہو جاتی ہے تو قرآنِ مجید میں عادی مجرموں کے لیے مقرر سزاؤں میں سے جو سزا چاہے، وہ اس عورت کو، دے سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ	"اور تمھاری عورتوں میں سے[1] جو بدکاری کرتی
فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ	ہیں، ان پر اپنے اندر سے[2] چار گواہ طلب کرو۔
فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي	پھر اگر وہ گواہی دے دیں، تو ان کو گھروں
الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ	میں بند کر دو، یہاں تک کہ موت انھیں لے

---

[1] یعنی مسلمان عورتوں میں سے جو بدکاری کی عادی ہیں۔

[2] یعنی مسلمانوں میں سے۔

اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا۔ (النساء ۴:۱۵)   جائے، یا اللہ ان کے لیے کوئی راہ نکال دے۔[1]

ان دونوں صورتوں میں، یہ چار گواہوں کی شہادتیں ہوں، یا ان کے علاوہ کسی جرم میں کوئی شہادت، ہمارے نزدیک یہ قاضی کی صواب دید پر ہے کہ وہ کس کی گواہی قبول کرتا اور کس کی گواہی قبول نہیں کرتا۔ اس میں عورت اور مرد کی کوئی تخصیص نہیں ہے. عورت، اگر اپنے بیان میں الجھے بغیر، واضح طریقے پر گواہی دیتی ہے، تو اسے محض اس وجہ سے رد نہیں کر دیا جائے گا کہ اس کے ساتھ کوئی دوسری عورت یا مرد موجود نہیں ہے، اور مرد کی گواہی میں، اگر، اضطراب و ابہام ہے، تو اسے محض اس وجہ سے قبول نہیں کیا جائے گا کہ وہ مرد ہے. عدالت، اگر، گواہوں کے بیانات اور دوسرے قرائن و حالات کی بنا پر مطمئن ہو جاتی ہے کہ مقدمہ ثابت ہے تو وہ، لامحالہ اسے ثابت قرار دے گی، اور وہ اگر، مطمئن نہیں ہوتی تو اسے یہ حق، بے شک، حاصل ہے کہ وہ دس مردوں کی گواہی کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دے۔

قحبہ عورتوں کے معاملے میں شہادت کے سوا، جہاں قرآنِ مجید نے 'منکم' کی شرط عائد کر کے اسے مسلمانوں کے ساتھ خاص کر دیا ہے، یہی معاملہ غیر مسلموں کی گواہی کا بھی ہے۔

یہاں یہ واضح رہے کہ ہمارے فقہا کی رائے، اس معاملے میں مختلف ہے۔ ابنِ رشد اپنی شہرۂ آفاق کتاب "بدایۃ المجتہد" میں لکھتے ہیں:

واتفقوا على انه تثبت الاموال	"تمام فقہا کا اتفاق ہے کہ مالی معاملات
بشاهد عدل ذكر و امرأتين	میں مقدمہ ایک عادل مرد اور دو عورتوں
لقوله تعالى : فرجل و امرأتان	کی گواہی سے ثابت ہوتا ہے۔ اس کی دلیل
ممن ترضون من الشهداءٓ	اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "اگر دو مرد نہ
واختلفوا فى قبولهما فى	ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں سہی تمھارے
الحدود ، فالذى عليه	پسندیدہ لوگوں میں سے"۔ حدود کا معاملہ،
الجمهور انه لا تقبل	البتہ، مختلف فیہ ہے۔ اس میں جمہور کا مذہب

[1] اس 'راہ نکال دے' کی وضاحت ہم نے اوپر محاربہ اور فساد فی الارض کی سزاؤں کے بیان میں کر دی ہے۔

شهادة النساء فى الحدود لا مع رجل ولا مفردات، وقال اهل الظاهر، تقبل اذا كان معهن رجل و كان النساء اكثر من واحدة فى كل شيء على ظاهر الآية' وقال ابوحنيفه، تقبل فى الاموال و فيما عدا الحدود من احكام الأبدان مثل الطلاق والرجعة والنكاح والعتق، ولا تقبل عند مالك فى حكم من احكام البدن. واختلف اصحاب مالك فى قبولهن فى حقوق الابدان المتعلقة بالمال، مثل الوكالات والوصية التى لا تتعلق الا بالمال فقط، فقال مالك وابن القاسم وابن وهب، يقبل فيه شاهد وامرأتان، وقال اشهب وابن الماجشون، لا يقبل فيه الا رجلان. وأما شهادة النساء مفردات، اعنى النساء دون الرجال فهي مقبولة عندالجمهور فى حقوق الابدان

یہ ہے کہ عورتوں کی شہادت کسی حال میں بھی قبول نہیں کی جاسکتی، خواہ وہ کسی مرد کے ساتھ مل کر گواہی دیں یا تنہا۔ اہلِ ظاہر اس کے برخلاف یہ کہتے ہیں کہ وہ اگر ایک سے زیادہ ہوں، اور اُن کے ساتھ اگر کوئی مرد بھی شریک ہو، تو آیت کے ظاہری مفہوم کی بنا پر اُن کی شہادت تمام معاملات میں قبول کی جائے گی۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک، اس صورت میں بھی ان کی گواہی صرف مالی معاملات میں؛ اور حدود کے سوا دوسرے بدنی احکام مثلاً؛ طلاق، رجوع، نکاح اور غلاموں کی آزادی ہی میں قابلِ قبول ہوگی۔ امام مالک اسے بدنی احکام میں نہیں مانتے۔ مال سے متعلق بدنی حقوق، مثال کے طور پر وکالت اور اس وصیّت کے بارے میں جو صرف مال ہی سے متعلق نہیں ہوتی، البتہ، مالک اور اُن کے اصحاب میں اختلاف ہے۔ چنانچہ اشہب اور ابنِ ماجشون ان معاملات میں صرف دو مردوں، اور مالک، ابنِ قاسم اور ابنِ وہب ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی قبول کرتے ہیں۔ رہا تنہا عورتوں کی شہادت کا معاملہ، تو یہ جمہور کے نزدیک صرف ان بدنی حقوق میں قبول کی جائے گی جن پر مرد عام حالات میں کسی طرح مطلع نہیں ہو سکتے،

التی لا یطلع علیھا الرجال غالبا مثل الولادۃ والاستھلال وعیوب النساء۔	جیسے مثلاً: عورتوں کے عیوب، ولادت اور پیدائش کے وقت بچے کا رونا۔"

(کتاب الاقضیہ، ج ۲، ص ۲۴۸)

فقہا نے اپنے اس نقطۂ نظر کی بنیاد سورۂ بقرہ کی جس آیت پر رکھی ہے، وہ یہ ہے:

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى. (۲: ۲۸۲)	"اور تم (قرض کی دستاویز پر) اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کی گواہی کرالو۔ اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں سہی، تمھارے پسندیدہ لوگوں میں سے۔ دو عورتیں اس لیے کہ اگر ایک الجھے تو دوسری یاد دلا دے۔"

اس آیت سے فقہا کا استدلال، ہمارے نزدیک، دو وجوہ سے بالکل غلط ہے:

ایک یہ کہ واقعاتی شہادت کے ساتھ، اس آیت کا سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ یہ لاریب دستاویزی شہادت ہی سے متعلق ہے۔ ہر عاقل جانتا ہے کہ دستاویزی شہادت کے لیے گواہ کا انتخاب ہم کرتے ہیں، اور واقعاتی شہادت میں گواہ کا موقع پر موجود ہونا، بہرحال، ایک اتفاقی معاملہ ہوتا ہے۔ ہم نے اگر کوئی دستاویز لکھی ہے یا کسی معاملے میں کوئی اقرار کیا ہے، تو ہمیں اختیار ہے کہ اس پر جسے چاہیں گواہ بنائیں، لیکن زنا، چوری، قتل، ڈاکا اور اس طرح کے دوسرے جرائم میں، ظاہر ہے کہ جو شخص بھی موقع پر موجود ہوگا، وہی گواہ قرار پائے گا۔ چنانچہ شہادت کی ان دونوں صورتوں کا فرق اس قدر واضح ہے کہ ان میں سے ایک کو دوسری کے لیے قیاس کا مبنیٰ کسی طرح نہیں بنایا جا سکتا۔

دوسری یہ کہ آیت کے موقع و محل اور اسلوبِ بیان میں اس بات کی کوئی گنجایش ہی نہیں ہے کہ اسے قانون و عدالت سے متعلق قرار دیا جائے۔ اس میں عدالت کو مخاطب کر کے یہ بات نہیں کہی گئی کہ اس طرح کا کوئی مقدمہ اگر پیش کیا جائے تو مدعی سے اس نصاب کے مطابق گواہ طلب کرو۔ اس کے مخاطب ادھار کا لین دین کرنے والے ہیں، اور اس میں انھیں یہ ہدایت کی

گئی ہے کہ وہ اگر ایک خاص مدت کے لیے اس طرح کا کوئی معاملہ کریں تو اس کی دستاویز لکھ لیں، اور نزاع اور نقصان سے بچنے کے لیے اُن گواہوں کا انتخاب کریں جو پسندیدہ اخلاق کے حامل، ثقہ، معتبر اور ایمان دار بھی ہوں اور اپنے حالات و مشاغل کے لحاظ سے اس ذمہ داری کو بہتر طریقے پر پورا بھی کر سکتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں، اصلاً مردوں ہی کو گواہ بنانے، اور دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کو گواہ بنانے کی ہدایت کی گئی ہے، تاکہ گھر میں رہنے والی یہ بی بی، اگر، عدالت کے ماحول میں کسی گھبراہٹ میں مبتلا ہو تو گواہی کو ابہام و اضطراب سے بچانے کے لیے ایک دوسری بی بی اس کے لیے سہارا بن جائے۔ اس کے یہ معنی، ظاہر ہے کہ نہیں ہیں اور نہیں ہو سکتے کہ عدالت میں مقدمہ صرف اسی وقت ثابت ہوگا، جب کم سے کم دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں، اس کے بارے میں گواہی دینے کے لیے آئیں۔ یہ ایک معاشرتی ہدایت[1] ہے، جس کی پابندی اگر، لوگ کریں گے، تو ان کے لیے یہ نزاعات سے حفاظت کا باعث بنے گی۔ لوگوں کو اپنی صلاح و فلاح کے لیے، اس کا اہتمام، بہرحال، کرنا چاہیے۔ لیکن مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے، یہ کوئی نصاب شہادت نہیں ہے، جس کی پابندی عدالت کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ کی تمام ہدایات کے بارے میں خود قرآن کا ارشاد ہے:

ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا۔ (البقرہ ۲: ۲۸۲)

"یہ ہدایات، اللہ کے نزدیک، زیادہ مبنی بر انصاف، گواہی کو زیادہ درست رکھنے والی، اور زیادہ قرینِ قیاس ہیں کہ تم شبہات میں مبتلا نہ ہو۔"

ابنِ قیم اس کے بارے میں، اپنی کتاب: "اعلام الموقعین" میں لکھتے ہیں:

فهذا فى التحمل والوثيقة التى يحفظ بها صاحب المال

"یہ گواہی کا بار اٹھانے اور اس میں مضبوطی کے متعلق ہے، جس کے ذریعے سے کوئی

---

[1] چنانچہ دیکھ لیجیے، قرآنِ مجید کے دوسرے تمام احکام کی طرح یہ ہدایت بھی ایسی مطابق فطرت ہے کہ دنیا میں روزانہ لاکھوں دستاویزات لکھی جاتی ہیں، لیکن ان میں عورتیں، شاید، ایک فی لاکھ بھی، کہیں گواہ نہیں بنائی جاتیں۔

حقه، لا فی طریق الحکم و ما یحکم به الحاکم، فان هذا شیٔ و هذا شیٔ۔ (ج ۱، ص ۹۱)

صاحب مال اپنے حق کی حفاظت کرتا ہے۔ عدالت کے فیصلے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ یہ اور چیز ہے' اور وہ اور۔"

اس زمانے میں، بعض لوگوں نے فقہا کے اسی موقف کے حق میں سورۂ نور کی آیت ۴ اور سورۂ نساء کی آیت ۱۵ میں، بالترتیب، 'اربعة شهداء' اور 'اربعة منكم' سے بھی استدلال کیا ہے[1]، اور اس کی تقریر اس طرح کی ہے کہ 'اربعة' چونکہ مونث ہے، اور عربی قاعدے کے مطابق، اس کا معدود مذکر ہونا چاہیے، اس وجہ سے 'اربعة شهداء' سے مراد، لازماً، چار مرد ہی ہیں۔ ان میں عورتیں کسی طرح شامل نہیں ہوسکتیں۔

یہ، بظاہر، عربیت کے قواعد پر مبنی ایک دلیل ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ علم و استدلال کی دنیا میں، عربیت سے اس قدر اجنبی کوئی چیز، شاید ہی کسی شخص نے کبھی دیکھی ہو۔ اس زبان سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ اس کا قاعدہ صرف یہی نہیں ہے کہ تین سے دس تک، اگر، معدود مذکر ہو، تو اس کا عدد مونث ہوگا، بلکہ یہ بھی ہے کہ معدود، اگر، کوئی ایسا اسم ہو، جو مذکر اور مونث، دونوں کے لیے بولا جاتا ہو، تو اس کا عدد بھی، لازماً، مونث ہی ہوگا۔

چنانچہ دیکھیے، سورۂ انعام میں 'ازواج' کا عدد، اسی اصول پر، 'ثمٰنیة' آیا ہے:

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ، مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ، قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ۔ (۶: ۱۴۳)

"تم آٹھ جوڑے لو، بھیڑوں میں سے دو، نر اور مادہ اور بکریوں میں سے دو، نر اور مادہ، پھر ان سے پوچھو کہ اللہ نے ان کے نر حرام کیے ہیں یا مادہ.....؟"

اسی طرح سورۂ مجادلہ میں ہے:

مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ

"کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ تین سرگوشی کریں، اور

۱؎ یہ دونوں آیات اوپر، اس فصل کی ابتدا میں دیکھی جا سکتی ہیں، جہاں ہم نے مستثنیات کی بحث میں، انھیں نقل کیا ہے۔

اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ۔ (۵۸: ۷)

اُن میں چوتھا وہ نہ ہو۔ پانچ سرگوشی کریں اور اُن میں چھٹا وہ نہ ہو۔[2]

'اربعۃ منکم' کی طرح یہاں 'ثلاثۃ' اور 'خمسۃ' کا معدود بربنائے قرینہ محذوف ہے۔ یعنی 'ثلاثۃ نفر' لیکن یہ 'نفر' بھی چونکہ ایک ایسا اسم ہے، جو مذکر اور مونث، دونوں کے لیے یکساں مستعمل ہے، اس وجہ سے عدد، اس آیت میں بھی مونث ہی استعمال ہوا ہے۔

اس اسلوب کی مثالیں درجِ ذیل احادیث[1] میں بھی ہیں:

۱۔ وطعام الاثنین یکفی الاربعۃ۔

۲۔ اذا کان ثلاثۃ، فلا یتناجی اثنان۔

۳۔ ما من مسلم یشھد لہ ثلاثۃ الا وجبت لہ الجنۃ۔

۴۔ لا یموت لمسلم ثلاثۃ من الولد فیلج النار۔

۵۔ رفع القلم عن ثلاثۃ: عن النائم حتی یستیقظ۔

ان احادیث میں بھی دیکھ لیجیے، 'اربعۃ'، 'ثلاثۃ'، یہ دونوں عدد مونث ہی ہیں، لیکن زبان و بیان کے اسالیب سے واقف کوئی شخص کیا یہ کہہ سکتا ہے کہ ان سے مراد صرف مرد ہیں، اور ان میں عورتیں کسی طرح شامل قرار نہیں دی جا سکتیں؟

اسی طرح ایک دوسری دلیل ان لوگوں نے یہ پیش کی ہے کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۸۲[2] میں گواہی کے وقت، چونکہ عورتوں کے گھبرا جانے کا ذکر ہوا ہے، اور اس سے ان کی شہادت میں، چونکہ، شبہ کا احتمال پیدا ہو جاتا ہے، اس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی رو سے کہ 'ادرؤا الحدود بالشبہات'[3] (شبہ ہو تو حد جاری نہ کرو)، اُن کی شہادت پر تعزیری

---

[1] ان کے حوالے، بالترتیب یہ ہیں: ۱۔ دارمی، کتاب الاطعمۃ ۲۔ مسلم، کتاب السلام ۳۔ ترمذی، کتاب الجنائز ۴۔ بخاری، کتاب الجنائز ۵۔ ابوداؤد، کتاب الحدود۔

[2] یہ آیت اسی بحث میں اوپر نقل ہو چکی ہے۔

[3] التلخیص الحبیر، ابن حجر، ج ۴، ص ۵۶۔

یہی مضمون ترمذی اور ابنِ ماجہ کی کتاب الحدود میں 'ادرؤا الحدود عن المسلمین ما استطعتم' اور 'ادفعوا الحدود ما وجدتم لہ مدفعاً' کے الفاظ میں بھی بیان ہوا ہے۔

سزا تو دی جا سکتی ہے، لیکن حد کی سزا، بہر حال، نہیں دی جا سکتی۔

یہ دلیل بھی، اگر غور کیجیے، تو بالکل بے معنی ہے:

اوّلاً، اس لیے کہ عورت، گواہی کے وقت اگر گھبرا جائے گی اور عدالت محسوس کرے گی کہ اس کی گواہی، اس سے متاثر ہوئی ہے، تو وہ کسی خاص مقدمے میں، جہاں یہ معاملہ پیش آ جائے، اس گواہی کو رد کر سکتی ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ آخر کس طرح نکلا کہ قانون کی کتاب میں یہ دفعہ، ہمیشہ کے لیے، ثبت کر دی جائے کہ اب عورتوں کی شہادت ہی قبول نہیں کی جا سکتی۔ وہ گھبرا سکتی ہے۔ اس احتمال کو ہم تسلیم کرتے ہیں، لیکن اس کے مقابلے میں اتنا ہی قوی احتمال کیا یہ بھی نہیں ہے کہ وہ بغیر کسی گھبراہٹ کے پورے اعتماد کے ساتھ اپنی گواہی عدالت میں پیش کر دے؟ قرآن نے اگر کہا ہے تو یہ کہا ہے کہ مبادا وہ گھبرا جائے۔ یہ تو نہیں کہا کہ وہ، بہر حال گھبراتی ہے یا وہ، لازماً گھبرائے گی۔ احتمال، بہر حال میں، احتمال ہی ہے۔ اسے یقین اور قطعیت میں بدل کر ایک قاعدۂ کلیہ کی بنیاد آخر کس منطق کی رو سے بنایا جائے گا؟

ثانیاً، اس لیے کہ 'ادرؤ الحدود بالشبہات' کے معنی، لاریب، یہ نہیں ہیں، اور نہیں ہو سکتے کہ شبہ ہو تو صرف حد روک دی جائے، بلکہ یہی ہیں اور یہی ہو سکتے ہیں کہ شبہ ہو تو سزا روک دی جائے۔ حد کا لفظ یہاں باصطلاح فقہا نہیں، بلکہ محض سزا کے لیے استعمال ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد، اخلاقیاتِ قانون کے اس مسلمہ اصول پر مبنی ہے کہ شبہ ہو تو جرم چونکہ، ثابت ہی نہیں ہوتا، اس وجہ سے مجرم کو کوئی سزا بھی نہیں دی جا سکتی۔ لہٰذا یہ حضرات، اگر، یہ کہتے ہیں کہ عورت کی شہادت سے تعزیر نافذ ہو سکتی ہے، تو اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس سے جرم ثابت ہو جاتا ہے۔ لیکن جرم، اگر، ثابت ہو جاتا ہے، تو پھر حد کیوں نہیں؟ اور ان کی رائے، اگر، یہ ہے کہ عورت کی شہادت میں شبہ، لازماً، باقی رہتا ہے، تو جرم ثابت ہی نہیں ہوا۔ پھر تعزیر کس گناہ پر نافذ کی جائے گی؟ جرم کے معاملے میں یہ بالکل قطعی ہے کہ وہ کبھی دس یا بیس یا نوّے اور ننانوے فی صد ثابت نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ سو فی صد ثابت ہوتا ہے، یا بالکل ثابت نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہ ایک بے معنی بات ہے کہ جرم کے ثبوت اور عدمِ ثبوت کے درمیان بھی کوئی حالت مانی جائے، اور پھر یہ کہا جائے کہ جرم اگر اتنا ثابت ہو، تو حد اور اتنا ثابت ہو، تو اس پر تعزیر

جاری کی جائے گی۔ جرم کی نوعیت اور مجرم کے حالات کی رعایت سے سزا میں فرق تو، بے شک، کیا جاسکتا ہے، لیکن ثبوت کی نوعیت بھی اس فرق کی بنیاد بن سکتی ہے؟ عقل سلیم پوری شدت کے ساتھ اسے رد کرتی، اور فطرتِ انسانی پوری قوت کے ساتھ اسے ماننے سے انکار کرتی ہے۔

[باقی]

اطلاع

شعبہ اصلاح ودعوت کے ناظم ڈاکٹر محمد فاروق خان نے پاکستان ٹیلی ویژن پر "خود آگاہی" کے زیر عنوان، فرد اور معاشرے کے روحانی امراض کے بارے میں، دین اسلام اور علم نفسیات کی روشنی میں، لیکچرز کا سلسلہ شروع کیا ہے۔

ان کے یہ لیکچرز صبح کی نشریات میں ہر جمعرات کو سنے جا سکتے ہیں۔

المورد، شعبہ اصلاح ودعوت

علم کی کسوٹی پر

بائبل میں آدم کے بعد انسانی نسل کا پورا شجرۂ نسب دیا گیا ہے۔ اس سے حساب لگا کر مسیحی علما نے زمین پر آبادکاری کی مدت متعین کی ہے۔ یہ مدت ۱۹۷۵ء میں ۵۷۳۶ سال تھی۔ دوسری طرف، جدید علمی طریقوں سے زمین کی عمر اور اس پر آبادکاری کی مدت کا جو اندازہ کیا گیا ہے، اس کے مطابق یہ مدت مذکورہ اندازہ سے بہت زیادہ قرار پاتی ہے۔ اس اختلاف نے جدید علما کی نظر میں بائبل کے بیان کو مضحکہ خیز بنا دیا۔

اسی طرح بائبل میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ یعنی ۲۴ گھنٹہ والے چھ دنوں میں۔ یہاں بھی سائنس کی تحقیق بائبل کے بیان سے ٹکرا رہی تھی۔ کیوں کہ سائنسی مطالعہ کائنات کی تخلیق کو اربوں اور کھربوں سال کے درمیان پیش آنے والا ایک واقعہ بتا رہا تھا نہ کہ صرف ۱۴۴ گھنٹہ (چھ دن) کے اندر پیش آنے والا واقعہ۔ اس تضاد کی بنا پر جدید انسان کو بائبل علمی حیثیت سے ایک غیر معتبر کتاب نظر آنے لگی۔

علم اور مسیحیت کے درمیان اس طرح کے بہت سے ٹکراؤ پیش آئے۔ اس نے ابتداءً مسیحیت کو اور اس کے بعد تمام مذاہب کو جدید انسان کی نظر میں غیر حقیقی ثابت کر دیا۔ اس نے مذہب کو توہماتی قیاسات کا مجموعہ سمجھ کر اسے نظر انداز کر دیا۔

اس ٹکراؤ نے ابتداءً تمام مذاہب کو جدید انسان کی نظر میں غیر معتبر بنا دیا۔ مگر موجودہ صدی کے نصف ثانی میں مزید تحقیق نے بتایا کہ یہ ٹکراؤ، دراصل، سائنس اور محرف مذہب کے درمیان تھا نہ کہ سائنس اور حقیقی مذہب کے درمیان۔

اس جدید تحقیق نے ساری دنیا میں اسلام کی اشاعت کے نئے مواقع کھول دیے ہیں۔ ایک طرف دوسرے مذاہب ہیں جن کے متعلق واضح طور پر ثابت ہو گیا ہے کہ وہ علمی لحاظ سے قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔ دوسری طرف اسلام کے بارے میں یہ ثابت ہوا ہے کہ وہ استثنائی طور پر دوسرے مذاہب سے الگ ہے۔ اسلام کی تعلیمات میں کوئی بات بھی غیر علمی نہیں۔ وہ جس طرح سچا الہام ہے، اسی طرح وہ خالص علم کی جانچ میں بھی پورا اترتا ہے۔

وحیدالدین خان

ترتیب : طالب محسن

"انبیائے کرام اپنی دعوت میں کبھی کسی مفاہمت کو گوارا نہیں کرتے۔ وہ دینِ خالص کی بات کرتے ہیں اور غیر اسلامی ماحول کو اس بنیاد پر قبول نہیں کرتے کہ ان کی چند باتیں مان لی گئی ہیں۔ کسی غیر اسلامی اقتدار میں شریک ہونا تو ایک طرف، وہ کسی ایسے کُلی اقتدار کو بھی قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے، جس کے نتیجے میں انھیں اپنی دعوت چھوڑنا پڑے۔ چنانچہ یہ معلوم روایت ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو مکی زندگی میں یہ پیش کش کی گئی کہ آپ دعوت کے بدلے میں عرب کی سرداری قبول کر لیں، لیکن آپ نے اس پیش کش کا جواب نفی میں دیا۔"

فکر و نظر

خورشید احمد ندیم

غلبۂ دین کی حکمتِ عملی

(دیگر نقطہ ہائے نظر)[1]

غلبۂ دین کی حکمتِ عملی کے باب میں، اگرچہ ہمارے ہاں بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے، لیکن دو آرا کو بالعموم قبولیتِ عام اور پذیرائی حاصل ہوئی۔ صاحبانِ علم و دانش کی کوئی مجلس ہو یا عامۃ الناس کی چوپال، موضوعِ سخن 'اگر اسلام کا نفاذ ہو' تو اپنے اپنے اسلوب میں لوگ انھی دو نقطہ ہائے نظر سے اتفاق کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک رائے یہ ہے کہ پُر امن جدوجہد اب بہت ہو چکی۔ انتخابی سیاست، ملک کے قانون کا احترام اور رائے کی تشکیل جیسے امور ہی اصلاً، اسلامی انقلاب کے راستے کی نمایاں رکاوٹیں ہیں کسی بڑی تبدیلی کے لیے لازم ہے کہ اب مسلح جدوجہد کا طریقہ اختیار کیا جائے، چنانچہ جہاد ہی اس کے حصول کا واحد راستہ ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ ملک کی اسلامی جماعتیں انتخابات میں آزادانہ طور پر حصہ لینے کے بجائے کسی بڑی سیاسی جماعت سے اتحاد کر کے پارلیمان میں اپنی نمائندگی مؤثر بنائیں۔ اس طرح قانون سازی اور دیگر امور میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں۔ اس رائے کا ایک جزو یہ بھی ہے کہ اسلامی انقلاب کی اصطلاح عامۃ الناس کے لیے ایک ابہام رکھتی ہے، اس لیے ملک کے علما کو چاہیے کہ سرِدست ایک نکتے پر اتفاق کرتے ہوئے اس کے نفاذ کی عملی جدوجہد کریں۔ ان صاحبانِ دانش کے نزدیک یہ نکتہ نظامِ انتخابات کی اصلاح ہے۔ ان کا خیال ہے کہ پاکستان بھر کے علما اس مہم پر نکل کھڑے ہوں کہ ہم صرف صالح افراد ہی کو پارلیمان تک پہنچنے دیں گے۔ کوئی شیعہ ہو یا سنی، دیوبندی ہو یا بریلوی یا سیاسی وابستگی کے اعتبار سے کسی جماعت سے متعلق ہو، صرف وہی شخص بلدیاتی اداروں سے لے کر قومی اسمبلی اور سینٹ تک نمائندگی کر

---

[1] ملاحظہ فرمایے، خورشید احمد صاحب ندیم کا سلسلۂ مضامین 'اسلام اور پاکستان' جو ۱۹۹۲ء سے شائع ہو رہا ہے۔

سکے گا' جو نیک، دیانت دار اور با کردار ہو گا۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اسلامی انقلاب کی علمی تعبیر و تشریح کا کام اپنے طور پر جاری رہنا چاہیے لیکن موجودہ حالات میں چونکہ فوری اقدام کی ضرورت ہے، اس لیے منبر و محراب سے یہی صدا اٹھنی چاہیے۔ اس سے موجودہ نظام میں خیر کی بہت سی راہیں کھلیں گی اور بتدریج اسلامی انقلاب کے لیے ایک سازگار ماحول میسر آئے گا۔[1]

غلبۂ دین بذریعہ جہاد

جہاں تک پہلی رائے کا تعلق ہے تو ایک جمہوری اور آزاد معاشرے میں اسے اختیار کرنے کا کوئی شرعی، اخلاقی یا عقلی جواز موجود نہیں۔ انبیا علیہم السلام کی پاکیزہ زندگیوں میں اس کا کہیں گزر نہیں، باوجود اس کے کہ وہ ایسے معاشروں میں کھڑے رہے ہیں، جہاں اپنی بات کہنا بھی محال تھا۔ گفتار پر پابندیاں تھیں اور حق کی آواز اٹھانا گویا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ انبیا کا طریقہ بہرحال یہی ہے کہ وہ دعوت کے میدان میں کھڑے رہے اور اپنے راستے کی ہر مشکل صبر و استقامت کے ساتھ برداشت کرتے رہے اور کہیں بھی اسلامی انقلاب کو برپا کرنے کے لیے کسی مسلح جدوجہد کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ ایک عوامی مطالبے پر ارباب حل و عقد نے انھیں اپنی دانست میں مصلوب کر دیا، لیکن اتنے مشکل حالات کے باوجود انھوں نے کہیں یہ نہیں کیا کہ ایک گروہ ترتیب دے کر اسلامی انقلاب کے لیے کوئی مسلح جدوجہد کریں۔ قرآن کی شہادت کے مطابق، اگرچہ یہود اپنے عزائم میں کامیاب نہیں ہوئے، لیکن ایسا اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیر معمولی اہتمام کی وجہ سے ہوا، ورنہ جہاں تک سیدنا مسیح کا تعلق ہے ان کی پوری زندگی اس بات کی گواہ ہے کہ وہ تادم آخر سراپا دعوت ہی رہے اور اس سے بڑھ کر کسی اقدام کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ اسی طرح بعض دیگر جلیل القدر پیغمبروں کے ساتھ ان کی مخالف اقوام نے جو سلوک کیا، قرآن مجید اور دیگر آسمانی کتب میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ قرآن مجید نے اگرچہ 'اجمالاً' ذکر کیا ہے، لیکن قدیم کتب میں اس کی تفصیلات بھی رقم ہیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے "تفہیم القرآن" میں ان قدیم آسمانی کتابوں سے بعض ایسے واقعات جمع کر دیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

---

[1] مثال کے طور پر دیکھیے ہفت روزہ 'تکبیر' ۳ فروری ۹۴ء میں جناب صلاح الدین صاحب کا مضمون 'موجودہ سیاسی نظام اور علمائے کرام کی ذمہ داریاں'۔

۱۔ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے بعد جب بنی اسرائیل کی سلطنت تقسیم ہو کر دو ریاستوں (یروشلم کی دولتِ یہودیہ اور سامریہ کی دولتِ اسرائیل) میں بٹ گئی، تو ان میں باہمی لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا اور نوبت یہاں تک آئی کہ یہودیہ کی ریاست نے اپنے ہی بھائیوں کے خلاف دمشق کی ارامی سلطنت سے مدد مانگی۔ اس پر خدا کے حکم سے حنانی نبی نے یہودیہ کے فرماں روا آسا کو سخت تنبیہ کی، مگر آسا نے اس تنبیہ کو قبول کرنے کی بجائے خدا کے پیغمبر کو جیل بھیج دیا۔

۲۔ حضرت الیاس (علیہ السلام) نے جب بعل کی پرستش پر یہودیوں کو ملامت کی اور از سرِنو توحید کی دعوت کا صور پھونکنا شروع کیا، تو سامریہ کا اسرائیلی بادشاہ اخی اب اپنی مشرک بیوی کی خاطر ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑ گیا، حتیٰ کہ انھیں جزیرہ نمائے سینا کے پہاڑوں میں پناہ لینا پڑی۔ اس موقع پر جو دعا حضرت الیاس نے مانگی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

"بنی اسرائیل نے تیرے عہد کو ترک کیا ..... تیرے نبیوں کو تلوار سے قتل کیا اور ایک میں ہی اکیلا بچا ہوں، سو وہ میری جان لینے کے درپے ہیں۔"

۳۔ ایک اور نبی حضرت میکایاہ کو اسی اخی اب نے حق گوئی کے جرم میں جیل بھیجا اور حکم دیا کہ اس شخص کو مصیبت کی روٹی کھلانا اور مصیبت کا پانی پلانا۔

۴۔ پھر یہودیہ کی ریاست میں علانیہ بت پرستی اور بدکاری ہونے لگی، اور زکریاہ نبی (علیہ السلام) نے اس کے خلاف آواز بلند کی، تو شاہ یہودہ یوآس کے حکم سے انھیں ہیکلِ سلیمانی میں "مقدس" اور "قربان گاہ" کے درمیان سنگسار کر دیا گیا۔"

(ج ۱، ص ۸۱)

اس طرح کے اور بہت سے واقعات ہیں جو اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ فرستادوں کے ساتھ پیش آئے، لیکن انھوں نے اس پر ہمیشہ صبر کیا۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو جب مشکلات کا سامنا ہوا، تو اللہ تعالیٰ نے انھی انبیا کے حالات بطورِ مثال سامنے رکھتے ہوئے صبر کی تلقین فرمائی:

قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي	"ہم آگاہ رہے ہیں کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں اس
يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ	سے تم کو غم ہوتا ہے تو صبر کرو۔ یہ تو تمھیں نہیں
وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ	جھٹلا رہے ہیں، بلکہ یہ ظالم تو اللہ کی آیات کا
وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ	انکار کر رہے ہیں۔ اور تم سے پہلے بھی رسولوں
فَصَبَرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا وَأُوذُوا	کو جھٹلایا گیا، تو انھوں نے جھٹلائے جانے اور

حَتّٰۤى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِيْنَ۔

ایذا دیے جانے پر صبر کیا۔ یہاں تک کہ ان کے پاس ہماری مدد آگئی۔ اللہ کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں اور پیغمبروں کی کچھ سرگزشتیں تو تمھیں پہنچ ہی چکی ہیں۔"

(الانعام ۶: ۳۳-۳۴)

ان سب مثالوں کو سامنے رکھیے اور پھر انبیا و رسل علیہم السلام کے ردِ عمل کو دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے ہر طرح کے جبر و تشدد کے باوجود انھوں نے اپنی دعوتی زندگی میں کہیں تشدد، مسلح جدوجہد یا قتال کا راستہ نہیں اپنایا۔ انبیا کا یہ اسوہ اس امر کی شہادت ہے کہ ایک داعی کے لائحۂ عمل میں مسلح تصادم کا کوئی گزر نہیں۔

اگر مسندِ اقتدار پر فائز لوگ مسلمان ہوں اور ان ذمہ داریوں کی ادائیگی میں کوتاہی کے مرتکب ہوں، جو بطورِ حکمران ان پر عائد ہوتی ہیں، تو ان کے خلاف خروج یا کوئی مسلح اقدام کرنا، جائز قرار دیے جانے کے باوجود کبھی پسندیدہ نہیں سمجھا گیا۔ خروج کو جائز قرار دینے والے فقہا اس کے لیے کڑی شرائط عائد کرتے ہیں مثلاً:

۱۔ حکمران کھلے کفر کا ارتکاب کریں۔

۲۔ ان کی حکومت استبدادی ہو، جو مسلمانوں کے مشورے سے قائم نہ ہوئی ہو اور نہ ان کی رائے سے تبدیل ہی کی جا سکے۔

۳۔ بغاوت کے قائد کے لیے لازم ہے کہ اسے اکثریت کا اعتماد حاصل ہو۔

ان تینوں شرائط کے لیے قرآن و سنت سے دلائل دیے جا سکتے ہیں۔[۱] ان کڑی شرائط کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کی جان و مال کو کسی جذباتی فرد کی نذر نہیں کیا جا سکتا اور اس قسم کا اقدام اسی وقت برداشت کیا جا سکتا ہے جب کسی موجود نظام کو بہتر نظام سے بدلنا یقینی ہو۔ تاہم یہ امرِ واقعہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں جب بھی خروج کا ارتکاب کیا گیا، فتنہ و فساد اس خرابی سے بڑھ کر ہوا، جو مسلمان حکمرانوں کے غلط افعال کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ تفقہ فی الدین رکھنے والے اصحابِ امت نے کبھی اس کی تائید نہیں کی۔ امام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب میں، جو کچھ لکھا ہے، وہ بہت قابلِ غور ہے۔ شیخ الاسلام "منہاج السنہ" میں رقم طراز ہیں:

۱۔ ملاحظہ فرمایئے: قانونِ دعوت از جاوید احمد صاحب غامدی، ص ۳۰۔

"حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت انسانوں کی معاش و معاد (دنیوی اور اُخروی زندگی) کی صلاح و فلاح کے لیے ہوئی تھی۔ آپ نے ہر اس بات کا حکم دیا جس میں صلاح (بھلائی) ہے۔ اور ہر اس بات سے منع فرمایا جس میں فساد (بگاڑ اور بُرائی) ہے۔ پس ایسا کوئی کام اگر سامنے آتا ہے جس میں صلاح اور فساد دونوں پہلو پائے جاتے ہیں تو اہلِ سنت یہ دیکھتے ہیں کہ فساد کا پہلو غالب ہے یا صلاح کا۔ اور پھر جو پہلو غالب نظر آتا ہے اُسی کے مطابق اس کام پر حکم لگاتے ہیں۔ صلاح اور فلاح کا پہلو غالب ہے تو اس کام کے کرنے کو ترجیح دیتے ہیں، فساد اور خرابی کا پہلو غالب نظر آتا ہے تو اس کام کے ترک کو ترجیح دی جاتی ہے۔

پس اب ایک یزید یا عبدالملک اور منصور جیسا کوئی شخص خلافت کے منصب پر فائز ہو جاتا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس سے قتال کر کے کسی بہتر شخص کو اس کی جگہ لانے کی کوشش کی جائے؟ اہلِ سنت اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں، کیوں کہ ایسے فعل سے بہ نسبت بھلائی اور مصلحت کے بگاڑ اور فساد کے زیادہ امکانات ہیں۔ پوری تاریخ بتا رہی ہے کہ کسی صاحبِ سلطنت و قوت شخص کے خلاف جب بھی خروج کیا گیا، بالعموم اس کا خیر بہت معمولی اور شر بہت زبردست ہوا۔ مثلاً مدینے والوں نے یزید کے خلاف جو خروج کیا یا ابن الاشعث نے عبدالملک کے خلاف عراق میں کیا یا ابن المہلب نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی یا ابو مسلم نے خراسان میں انھی بنو امیہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا یا خلیفہ منصور کے خلاف مدینے اور بصرے سے بغاوت اُٹھی، ان میں ہر جگہ ہزیمت اور بربادی کے سوا کچھ نہ ملا۔ اور ابو مسلم خراسانی جیتا بھی تو کیا جیت اس کی ہوئی! منصور کے ہاتھوں وہ خود بھی مارا گیا اور جیت میں کس قدر آدمی اس نے مروا دیے! اللہ کی پناہ، الغرض "فلا اقاموا دینا ولا ابقوا دنیا" (نہ دین ہی قائم کر سکے نہ دنیا ہی بچا سکے)

حالانکہ اللہ تعالیٰ کسی ایسے کام کا حکم نہیں فرماتا جس میں نہ دین کی فلاح ہو نہ دنیا کی صلاح (اور ایسے کام اللہ کو پسند نہیں ہیں) چاہے اس کے کرنے والے کیسے ہی متقی بندے اور اصحابِ جنت کیوں نہ ہوں۔ ذرا یہ بتائیے، کیا یہ لوگ (جن کے نام مثلاً اوپر لیے گئے) علی، طلحہ، زبیر اور عائشہ رضی اللہ عنہم سے بڑھ کر ہیں جن کا تقویٰ مسلم ہونے اور جنت کی بشارت جنھیں حاصل ہونے کے باوجود ان کے قتالِ باہمی والے فعل کو قابلِ تعریف نہیں قرار دیا گیا"

(ج ۲، ص ۲۱۲ - ترجمہ عتیق الرحمٰن سنبھلی)

ابنِ تیمیہ مزید لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کے اکابر اہلِ علم نے ہمیشہ ہی ان خروجوں کی مخالفت کی ہے۔ مثلاً یزید کے خلاف اہلِ مدینہ خروج پر آمادہ ہوئے تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ، سعید بن مسیب اور علی بن حسین (زین العابدین) نے ان کو ایسا کرنے سے منع کیا۔ یا ابن الاشعث کی بغاوت کا فتنہ اٹھا تو حسن بصری اور مجاہد وغیرہ نے سمجھایا۔ لہٰذا اہلِ سنت کے یہاں یہ مسئلہ بالکل طے شدہ ہو چکا ہے کہ فتنے کے وقت میں تلوار اٹھانا مناسب نہیں۔ علمائے اہلِ سنت نے اس مسئلے کی اس درجہ اہمیت سمجھی ہے کہ اسے عقائد کی فہرست میں داخل کر کے لازم کیا ہے کہ آئمہ و خلفا کے جور و ستم کا مقابلہ تلوار کی بجائے صبر اور برداشت سے کیا جائے، حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ کیسے کیسے اور کتنے اہلِ علم اور اہلِ دین بھی فتنوں کی لڑائیوں میں شریک ہو چکے ہیں، ان کا یہ فیصلہ اس لیے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں سے اس معاملے میں یہی حکم ثابت ہوتا ہے اور جو کوئی بھی اس سلسلے کی احادیثِ نبویہ پر غور کرے گا، وہ خود بھی اس نتیجے پر پہنچے گا کہ احادیث کا حکم بہترین حکم ہے۔"

جہاں تک دوسرے نقطۂ نظر کا تعلق ہے، اس پر کوئی تبصرہ کرنے سے پہلے اس کی حقیقت اچھی طرح جان لینی چاہیے۔ کچھ افراد اپنے اجتہاد سے اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ فلاں سیاسی جماعت کا برسرِ اقتدار آنا ملک اور دین کے لیے خطرناک ہے۔ چنانچہ وہ دیگر سیاسی جماعتوں کے ساتھ ایک اتحاد تشکیل دیتے ہیں جن سے ان کے نظری، سیاسی ہر طرح کے اختلافات موجود ہیں، پیشِ نظر صرف یہ ہے کہ وہ سیاسی قوت مسندِ اقتدار سے دور رہے، جو ان کے نزدیک، ملک اور دین کی دشمن ہے۔ سابق تجربات کو اگر مدِنظر رکھا جائے، تو پیپلز پارٹی کو ملک کی تقریباً تمام سیاسی و مذہبی جماعتوں نے اسلام اور ملک کا دشمن قرار دے کر اس کے خلاف ۱۹۷۷، ۱۹۸۸ اور ۱۹۹۰ء میں مختلف سیاسی اتحاد تشکیل دیے۔ اس انتخابی اشتراک میں دیگر سیاسی قوتوں کے ساتھ مذہبی جماعتوں کے اختلافات اپنی جگہ موجود رہے، لیکن محض ایک "بڑی برائی" کو سیاسی اقتدار سے دور رکھنے کے لیے ان کی رفاقت کو گوارا کیا گیا۔ اس اتحادی سیاست کے فکری پس منظر میں یہ بات شامل ہے کہ آپ ہمارے کم و بیش دس "صالح افراد" کو اسمبلی تک پہنچانے میں ہماری مدد کریں۔ ہم آپ کے ساٹھ ستر "غیر صالح افراد" کی کامیابی کے لیے جوابی تعاون پیش کریں گے۔ اس راستے کے علم بردار یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ سیاسی اتحاد حکومت بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر دس "صالح

افراد" کا وجود "غیر صالح" ممبرانِ اسمبلی کو کسی ایسے اقدام سے باز رکھے گا جو دین، ملک یا اخلاقی اقدار کے اعتبار سے غیر پسندیدہ ہے۔

اس نقطۂ نظر کا سقم تجربات نے پوری طرح واضح کر دیا ہے اور اب یہ بات 'بالعموم' ہر سطح پر مان لی گئی ہے کہ انتخاب کے موقع پر اس طرح کے سیاسی اتحاد کے نتیجے میں اسلامی انقلاب نہیں آسکتا۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ طرزِ عمل ایک دعوتی تحریک کے مزاج کے خلاف ہے۔ جب آپ معاشرے میں ایک داعی کی حیثیت سے کھڑے ہیں، تو آپ کے لیے کسی امتیاز کو روا رکھنا شرعاً درست ہے نہ عقلاً۔ ملک کی ایک بڑی آبادی کو آپ اسلام دشمن قرار دے کر اسے اپنے مخاطبین کی فہرست ہی سے حذف کر دیں گے، تو آپ نے گویا اس بات کا امکان ہی باقی نہیں رہنے دیا کہ وہ آپ کے مدعو بن سکیں۔ ان افراد کے بارے میں یہ بات بھی واضح ہے کہ وہ ملک دشمن نہیں ہیں، بلکہ محض ایک غلط فہمی کا شکار ہیں۔ پیپلز پارٹی کی مثال اگر سامنے رکھی جائے، تو گزشتہ بیس سال کے عرصہ میں مذہبی جماعتوں نے اس ملک میں جو سیاست کی ہے، اس کا مرکزی نکتہ پیپلز پارٹی کی مخالفت ہے۔ چنانچہ اسی کے نتیجہ کے طور پر اس ملک میں تحریکِ اسلامی بیس سال تک صرف تیس فی صد آبادی کے ساتھ داعی اور مدعو کا تعلق ہی قائم کر سکی۔ حالانکہ دین کی دعوت تو بارانِ رحمت کی طرح ہے جو کوہ و دمن، خشکی و تری، ویرانہ و آبادی، ہر جگہ برستی ہے۔ اور بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ ویرانے میں پھول کھل اٹھیں اور خزاں میں بہار کا منظر دکھائی دینے لگے۔ لیکن اگر بارش اس بارے میں یہ امتیاز روا رکھے کہ اسے ویرانے کو اپنی نمی سے محروم رکھنا ہے تو پھر زمین پر موجود ویرانوں میں کسی بہار کی آمد سے متعلق سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ اس طرح دین کی دعوت کی مثال آفتاب کی روشنی اور حرارت کی ہے جو سب کے لیے زندگی کا پیغام ہے۔ سورج اگر پہاڑوں پر چمکتا ہے تو ساتھ ہی اس کی کرنیں پستیوں اور گہرائیوں میں بھی روشنی کا سامان کرتی ہیں۔ خورشید کی کرنیں اور بارش کی بوندیں، اگر کسی امتیاز کی قائل نہیں، تو یہ قدرت کا اشارہ ہے کہ دین کی روشنی ہر طبقۂ زندگی اور ہر مکتبۂ خیال تک پہنچنی چاہیے۔ ہدایت کا تعلق داعی کے ساتھ نہیں، بلکہ اللہ کے ساتھ ہے۔ داعی کا کام دعوت پہنچا دینا ہے۔ رہی ہدایت تو یہ انتخاب وہ کرتا ہے کہ کون اس کا مستحق ہے اور کون نہیں، بالکل اس طرح جیسے قدرت یہ طے کرتی ہے کہ برستے مینہ کی کس بوند کو سیپ کے منہ میں جا کر موتی بننا ہے اور کسے یوں ہی رائیگاں بہہ جانا ہے۔ اور کون سی سورج کی کرن ہیرے کی ضو بن کر چمکے گی اور کہاں اسے پتھروں سے محض سر ٹکرانا ہے۔

یہ رائے ’عقلاً‘ اس لیے بھی قبول نہیں کی جاسکتی کہ اگر آپ انتخابی عمل کے نتیجے میں تبدیلی کے خواہش مند ہیں اور ملک کی قریباً ایک تہائی آبادی کو ایک امتیازی لائحہ عمل کے تحت ابتدا ہی سے اپنا حریف قرار دے کر یہ سمجھتے ہیں کہ آپ ایک ایسا انقلاب لاسکیں گے جسے عوام کی بھرپور تائید حاصل ہو تو یہ ایسا خواب ہے جو احمقوں کی جنت ہی میں دیکھا جاسکتا ہے۔

شرعی نقطۂ نظر سے دیکھیے، تو اس امت پر شہادت علی الناس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان اُسی وقت اس ذمہ داری کے مکلف ہیں، جب وہ ایک امت ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے، تو پہلے انھیں ایک امت بننا چاہیے۔ ایک امت میں ڈھلے بغیر اگر وہ دنیا پر اتمامِ حجت کے لیے نکل کھڑے ہوں تو یہ ایسا ہی ہے جیسے مسلمانوں کا کوئی گروہ ایک ریاست قائم کیے بغیر حدود و تعزیرات کا نفاذ شروع کر دے۔ یہ بات، البتہ، واضح ہے کہ یہ امت جب شہادت علی الناس کی ذمہ داری ادا کرنے کے لیے نکلے گی، تو پھر ہر قوم ہر مذہب اور ہر گروہ کو اپنا مخاطب بنائے گی۔ اور اس ضمن میں اس کے لیے جائز نہیں ہوگا کہ وہ کوئی امتیاز روا رکھے۔

قرآنِ مجید اور اسوۂ انبیا سے دعوت کے باب میں جو مزید ہدایات ملتی ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت کے مخاطب تو سب ہی ہوں گے، لیکن اولیت اس گروہ کو دی جائے گی جو معاشرے میں اثر و رسوخ رکھتا ہے اور جس کی اقتدا میں عوام، بالعموم، چلتے ہیں۔ اس بنا پر یہ بات حکمت کے خلاف ہے کہ معاشرے میں پذیرائی رکھنے والے ایک گروہ کو سرے سے مخاطب ہی نہ کیا جائے، بلکہ دعوت کا محور ہی اس کی مخالفت قرار پائے۔ مولانا امین احسن اصلاحی اپنی معرکۃ الآرا کتاب ”دعوتِ دین اور اس کا طریقۂ کار“ میں رقم طراز ہیں:

> ”حضرات انبیائے علیہم السلام سب سے پہلے قوم کے اربابِ اثر کو مخاطب کرتے ہیں اور ان کی اصلاح کو عوام کی اصلاح کا ذریعہ بناتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے خود اپنے اس خاندان کو دعوت دی جو قوم کی مذہبی پیشوائی کی مسند پر متمکن تھا، پھر اس بادشاہ کو دعوت دی جس کے ہاتھوں میں سیاسی اقتدار کی باگ تھی اور جو اپنے آپ کو لوگوں کی زندگی اور موت کا مالک سمجھے ہوئے بیٹھا تھا،
>
> اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡ حَآجَّ اِبۡرٰہٖمَ فِیۡ رَبِّہٖۤ اَنۡ اٰتٰىہُ اللّٰہُ الۡمُلۡکَ۔ (البقرہ ۲: ۲۵۸)
>
> ”کیا تم نے اس کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے باب میں اس وجہ سے حجت کی کہ خدا نے اس کو اقتدار بخشا تھا۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ سب سے پہلے فرعون کو مخاطب کریں:

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى.	"تم فرعون کے پاس جاؤ، اس نے بہت سر
فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ	اٹھایا ہے۔ اس سے کہو کہ کیا تم میں کچھ اپنے
تَزَكّٰى، وَاَهْدِيَكَ اِلٰى	آپ کو سدھارنے کا جذبہ ہے؟ کیا میں تمہیں
رَبِّكَ فَتَخْشٰى.	تمہارے رب کی راہ دکھاؤں کہ تم اس سے
(النّٰزعٰت ۷۹: ۱۷-۱۹)	ڈرنے والے بنو۔"

حضرت دانیال علیہ السلام نے اپنے وقت کے شہنشاہِ اعظم نبوخذ نصر کو دعوت دی۔ یرمیاہ نبی نے شمال کے بادشاہوں پر نبوت کی۔ حضرت مسیح نے سب سے پہلے علمائے یہود کو دعوت دی۔ اسی طرح حضرات نوح علیہ السلام، ہود علیہ السلام، شعیب علیہ السلام، سب کی دعوتیں قرآنِ مجید میں مذکور ہیں۔ ان میں سے ہر نبی نے سب سے پہلے اپنے وقت کے اربابِ اقتدار اور متکبرین کو جھنجھوڑا اور ان کے افکار و نظریات پر ضرب لگائی۔ سب سے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور آپ کو حکم ہوا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ۔ یہ لوگ عرب کی مذہبی اور پدرسرانہ (PATRIARCHICAL) حکومت کے اربابِ حل و عقد تھے، اور اس کے واسطے سے سارے عرب کی اخلاقی اور سیاسی راہنمائی کر رہے تھے۔ عرب کے علاوہ بقیہ دنیا کو دعوت دینے کے لیے بھی آپ نے "امتِ وسط" کو جو طریقہ بتایا وہ یہ تھا کہ آپ نے متعدد سلاطینِ عالم کو نامے لکھے اور اسلام کو پہلے ان کے سامنے پیش کیا اور ان سے مطالبہ کیا کہ "اسلام لاؤ، سلامت رہو گے، ورنہ تمہاری اور تمہارے زیر دستوں، دونوں کی گمراہی کی ذمہ داری تم پر آئے گی"۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ بعد میں امت کے اربابِ حل و عقد دعوتِ عام کے لیے اسی طریقے کی پیروی کریں اور خلافتِ راشدہ کی پوری تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسی طریقے پر تبلیغ عام کی وہ ذمہ داری ادا کی جو ان پر شہداء علی الناس کی حیثیت سے، اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ڈالی گئی تھی۔

(ص ۴۹-۵۰)

استاذِ گرامی جاوید احمد صاحب غامدی نے اپنی تصنیف "قانونِ دعوت" میں، جسے اس موضوع پر بلاشبہ، قولِ فیصل کی حیثیت حاصل ہے، ان دلائل کا احاطہ کیا ہے جو معاشرے کے بااثر طبقات کو دعوت کا اولین مخاطب قرار دینے کے ذیل میں دیے جا سکتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں اس دعوت کی جو تاریخ بیان کی ہے، اس کا مطالعہ کرنے

سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے داعی جب بھی اٹھتے ہیں، سب سے پہلے انھی لوگوں کو مخاطب کرتے ہیں جنھیں کسی نہ کسی پہلو سے اپنی قوم میں اثر و رسوخ حاصل ہوتا ہے۔

اس کی چند وجوہ ہیں:

ایک یہ کہ عوام اپنے علم و عمل اور سیرت و اخلاق میں، بالعموم انھی لوگوں کے تابع ہوتے ہیں جو معاشرے میں اثر و رسوخ کے حامل ہوں۔ چنانچہ یہ اگر اصلاح قبول کر لیں، تو یہی چیز عوام کی اصلاح کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

دوسری یہ کہ یہ، درحقیقت، انھی کی بیماریاں ہیں، جن کی چھوت سے عوام میں بیماریاں پھیلتی ہیں۔ اس وجہ سے یہ تندرست ہو جائیں تو دوسروں کے علاج میں بھی زیادہ زحمت باقی نہیں رہتی۔

تیسری یہ کہ یہ لوگ، بالعموم، ذہنی اعتبار سے برتر ہوتے ہیں۔ اس لیے انھی کے دل و دماغ، اگر کسی دعوت سے مفتوح ہو جائیں، تو وہ دعوت دوسری دنیاؤں کو فتح کرتی، اور اگر اس کی بنیاد پر کوئی سیاسی انقلاب بھی کسی معاشرے میں برپا ہو جاتے تو وہ معاشرے کا نظام تبدیل کر دینے اور پھر اسے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق چلا دینے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

چوتھی یہ کہ مادی ذرائع و وسائل کی قوت بھی زیادہ تر انھی کے پاس ہوتی ہے، چنانچہ دعوت اگر ان اربابِ اثر و اقتدار کے دلوں میں اتر جاتے، تو جن ذرائع و وسائل پر یہ قابض ہوتے ہیں، وہ باطل کی تائید میں استعمال ہونے کے بجائے، آپ سے آپ، حق کی نصرت و اعانت کے لیے وقف ہو جاتے ہیں۔

پانچویں یہ کہ وہ لوگ جن کی طبیعت میں، کم سے کم، اتنی رفعت ہو کہ وہ شخصیتوں کے پیچھے چلنے کے بجائے اپنے نظریے اور فکر کے پیچھے چل سکیں اور اس طرح کسی دعوت کو محض پیری مریدی کا ایک حلقہ بن جانے سے بچا کر علم و عمل کی بے پناہ قوتوں کا سیلاب بنا دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں، وہ زیادہ تر اسی طبقے سے مل سکتے ہیں۔

چھٹی یہ کہ عوام چونکہ معاشرے میں ان کے مقام اور ان کی ذہنی برتری سے مرعوب ہوتے ہیں، اس وجہ سے وہ جب تک ان کی دلیلوں کا تار و پود بکھرتے، ان کے فکر و فلسفے کی جڑیں اکھڑتی اور ان کے نظامِ اخلاق و سیاست کے فلک بوس محلوں کی بنیادیں اپنی

آنکھوں سے متزلزل ہوتے نہیں دیکھ لیتے، اس وقت تک وہ نہ دعوتِ حق کے بارے میں پوری طرح یکسو ہوتے نہ اپنے پرانے معتقدات کے گرداب سے نکلتے نہ ان کے بارے میں ریب و تذبذب سے نجات پاتے اور نہ کسی دعوت کی حمایت میں وہ ذہنی رفعت محسوس کرتے ہیں جس سے حوصلہ پاکر بدر و حنین کے مجاہدوں کی طرح، وہ ان صنادید کی قوت و عظمت کا طلسم توڑ دیں۔

ساتویں یہ کہ وہ لوگ جو مختلف مرحلوں میں اس دعوت کو نظریہ و عمل کے انحراف اور اہلِ بدعت کی رخنہ اندازیوں سے بچا کر صحیح راستے پر قائم رکھ سکتے ہیں، وہ بھی زیادہ تر انھی طبقوں سے میسر ہوتے ہیں۔

چنانچہ یہی وجوہ ہیں جن کے پیشِ نظر اللہ کے پیغمبر جب بھی اس دعوت کے لیے اُٹھے۔ انھوں نے سب سے پہلے ان اربابِ اثر و اقتدار ہی کو دعوت کا مخاطب بنایا۔"

(ص ۴۹-۵۰)

چنانچہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ دین کی دعوت سب تک بلا امتیاز پہنچائی جائے گی اور اولین مخاطب وہ لوگ ہوں گے۔ جو معاشرے میں سیاسی، مذہبی یا کسی اور طرح کا بھی اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔ آج، اگر معاشرے کی موثر سیاسی قوت کو نظر انداز کرنے کی رائے کو اہمیت دی جا رہی ہے، تو اس کی بڑی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ تحریکِ اسلامی کو بھی ایک روایتی سیاسی جماعت پر قیاس کیا گیا ہے جو معاصر سیاسی جماعتوں کے ساتھ حریفانہ کشمکش میں اپنی پہچان بناتی اور اس کی شناخت محض ایک مخالف دھڑے کی ہوتی ہے۔ جبکہ حقیقت میں اسلامی تحریک کسی بھی پہلو سے کسی معاصرانہ چشمک میں مبتلا نہیں ہوتی، بلکہ وہ سب کے لیے نجات کا پیغام لے کر آتی ہے۔ دوسرے اس کے مخالف ہو سکتے ہیں، لیکن وہ کسی سے دشمنی نہیں رکھتی۔ چنانچہ آج جنھیں ملک دشمن اور دین دشمن قرار دے دیا گیا ہے، اگر وہ قیامت کے دن یہ استغاثہ لے کر کھڑے ہو گئے کہ دینی دعوت کے علم برداروں نے ان تک دعوت پہنچائی ہی نہیں، تو اس نقطۂ نظر کے حامیوں کو اپنا جواب سوچ رکھنا چاہیے۔

اس نقطۂ نظر کا دوسرا سقم یہ ہے کہ یہ حق کے اصولوں پر ثابت قدمی کے بجائے مفاہمت اور مصلحت کا پیغام ہے۔ یہاں یہ ترغیب دی جا رہی ہے کہ آپ نہ صرف برائی کو قبول کریں، بلکہ ایک حد تک اس کے فروغ میں بھی شریک ہوں۔ ظاہر ہے کہ جب آپ پچاس ساٹھ ایسے افراد کو پارلیمان تک پہنچانے کا باعث بنیں گے جو آپ کے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اس کے اہل نہیں ہیں تو گویا

آپ سماج میں ان قوتوں کے لیے زندگی کا پیغام ہیں جنھیں ایک اسلامی معاشرے میں ختم ہو جانا چاہیے۔ اس خیال کے حق میں زیادہ سے زیادہ یہی بات کہی جا سکتی ہے کہ بصورتِ دیگر بدتر افراد پارلیمنٹ تک پہنچیں گے۔ اگرچہ اس باب میں بھی کلام کیا جا سکتا ہے، لیکن اسی تصور کو اگر درست مان لیا جائے، تو بھی یہ کسی ایسی تحریک کے لیے جواز نہیں قرار پا سکتی جو معاشرے میں ایک ہمہ گیر تبدیلی کی علم بردار ہے۔ غلبۂ دین کی حکمتِ عملی میں اس بات کا کوئی جواز نہیں کہ ایک معاملے میں آپ کی لاتعلقی، اگر ایک بڑی برائی کے فروغ کا باعث بن رہی ہے، تو آپ آگے بڑھ کر چھوٹی برائی کو مضبوط کرنا شروع کر دیں۔ دین کی دعوت تو ہے ہی نیکی کا پیغام۔ اسے تو برائی کو ختم کرنا ہے اور اس کا یہ علاج نہیں کہ آپ مقابلے میں ایک دوسری بُرائی کے دست و بازو بن جائیں، بلکہ اس کا حل صرف یہی ہے کہ آپ معاشرے میں محض خیر کے داعی بن کر کھڑے ہوں۔

دعوتِ دین کی تاریخ سامنے رکھیے، تو معلوم ہوتا ہے کہ انبیائے کرام اپنی دعوت میں کبھی کسی مفاہمت کو گوارا نہیں کرتے۔ وہ دینِ خالص کی بات کرتے ہیں اور غیر اسلامی ماحول کو اس بنیاد پر قبول نہیں کرتے کہ ان کی چند باتیں مان لی گئی ہیں۔ کسی غیر اسلامی اقتدار میں شریک ہونا تو ایک طرف، وہ کسی ایسے کلی اقتدار کو بھی قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے، جس کے نتیجے میں انھیں اپنی دعوت چھوڑنا پڑے۔ چنانچہ یہ معلوم روایت ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو مکی زندگی میں یہ پیش کش کی گئی کہ آپ دعوت کے بدلے میں عرب کی سرداری قبول کر لیں، لیکن آپ نے اس پیش کش کا جواب نفی میں دیا۔ مختلف موقعوں پر اہلِ مکہ نے آپ کو مفاہمت کے لیے جو تجاویز پیش کیں، ان کے مطابق کبھی آپ سے کہا گیا کہ اگر آپ پسند کریں تو ایک سال ہم آپ کے دین میں داخل ہو جائیں اور ایک سال آپ ہمارے دین میں داخل ہو جایا کریں، اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی کہا گیا "اے محمد! آؤ ہم تمھارے معبود کی عبادت کرتے ہیں، تم ہمارے معبود کی عبادت کرو اور ہم اپنے سارے کاموں میں تمھیں شریک کیے لیتے ہیں۔ اگر وہ چیز جو تم لے کر آئے ہو، اس سے بہتر ہوئی، جو ہمارے پاس ہے تو ہم تمھارے ساتھ اس میں شریک ہوں گے، اور اپنا حصہ اس سے پا لیں گے، اور اگر وہ چیز جو ہمارے پاس ہے، اس سے بہتر ہوئی جو تم لاتے ہو تو تم ہمارے ساتھ اس میں شریک ہو گے اور اس سے اپنا حصہ پا لو گے۔"[1] لیکن آپ نے کسی پیش کش کے نتیجے میں ان کے ساتھ اتحاد

---

[1] سیرتِ سرورِ عالم۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی۔ ج دوم، ص ۵۱۹-۵۲۰

کی دعوت کو قبول نہیں کیا۔ تاہم، مدینہ میں آپ نے یہود یا مشرکینِ مکہ کے ساتھ جو معاہدے کیے، وہ ایک داعی کی حیثیت سے نہیں، بلکہ بطورِ حکمران کیے اور اسے دعوت کے باب میں کوئی دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔ چنانچہ دعوتِ دین میں اس کی گنجائش نہیں کہ آپ چند شعبوں میں تو اصلاح کے لیے آمادہ ہوں، اور کچھ میں مفاہمت قبول کر لیں۔ معاشرہ اسلامی تبھی بن سکے گا جب اصلاح کا عمل ہر شعبۂ حیات میں جاری ہو گا۔

اس نقطۂ نظر کی تبلیغ سے جو عملی نتیجہ نکلا ہے، وہ اتنا خطرناک ہے کہ اس کے اثرات شاید طویل عرصہ تک برقرار رہیں۔ ۱۹۹۳ء کے انتخابات سے قبل جب "جماعتِ اسلامی" اور دیگر مذہبی جماعتوں نے سابقہ روایت کے برعکس پیپلز پارٹی کے خلاف کسی اتحاد میں عدمِ شمولیت کا فیصلہ کیا، تو ان کے اس فعل کی مذمت میں جو قلمی و سیاسی جنگ لڑی گئی، اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ یہ جماعتیں عوامی تائید سے محروم ہو گئیں اور مسلم لیگ، اسلام پسندوں کی نمائندہ سیاسی قوت کے طور پر مستحکم ہو گئی حالانکہ مسلم لیگ کا ہر دورِ حکومت اس بات کا شاہد ہے کہ اسلام کے نفاذ کے باب میں ان کی عدم دلچسپی پیپلز پارٹی سے کسی طرح کم نہیں اور "اسلام پسندوں" نے کیا یہ کہ:

شوقِ گل بوسی میں کانٹوں پر زباں رکھ دی

کسی ایسی شخصیت یا جماعت کا مسلمانوں کی قیادت کے منصب پر فائز ہو جانا، جو دین کے فہم سے خالی اور دینی حمیت و کردار سے محروم ہو، ایک المیے سے کم نہیں ہے۔ ایسے شخص کا قوم کے لیے مخلص ہونا بھی مسلمانوں کی قومی زندگی کے لیے مفید نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ترکی کی قوم ابھی تک ان منفی اثرات سے باہر نہیں نکلی، جو مصطفیٰ کمال پاشا جیسے شخص کو اپنا قائد مان لینے کی صورت میں ان پر مرتب ہوئے۔ ترک قوم اب بھی اپنی دینی شناخت سے محروم ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مسلمان قوم نے جب کوئی ایسا فیصلہ کیا تو دین میں بصیرت رکھنے والے اور دینی حمیت کے حامل تشویش کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکے۔ ترکی اور ایران میں یہ صورتِ حال پیش آئی تو علامہ اقبال پکار اٹھے:

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں ہے نمود اس کی
کہ روحِ مشرق ابھی بدن کی تلاش میں ہے

۱۹۴۰ء کی دہائی میں جب برصغیر کے مسلمانوں نے اسی طرح کا ایک فیصلہ کیا تو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے لکھا:

"۔۔۔۔ اس نئی تحریک کے دور میں عامۃ المسلمین کی قیادت وراہنمائی ایک ایسے گروہ

کے ہاتھ میں چلی گئی، جو دین کے علم سے بے بہرہ ہے اور محض قوم پرستانہ جذبے کے تحت اپنی قوم کے دنیوی مفاد کے لیے کام کر رہا ہے۔ دین کا علم رکھنے والا عنصر اس گروہ میں اتنا بھی نہیں جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے اور اس قدرِ قلیل کو بھی کوئی دخل راہنمائی میں نہیں ہے۔ یہ براہِ راست نتیجہ ہے علمائے کرام کی اس غلط سیاسی روش کا جس پر وہ ابھی اصرار کیے چلے جا رہے ہیں اور میں یہ دیکھ رہا ہوں ہندوستان میں اس سے پہلے کبھی تمام مسلمانوں کا اعتماد علمائے دین سے ہٹ کر اس شدت کے ساتھ غیر دین دار اور ناواقفِ دین رہنماؤں پر نہیں جا تھا۔ میرے نزدیک یہ صورتِ حال اسلام کے لیے وطنی قومیت کی تحریک سے کم خطرناک نہیں ہے۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں ایک بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھا بھی (جیسا کہ ترکی اور ایران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں) تو ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے؟ ہیرے نے اگر اپنی جوہریت ہی کھو دی تو پھر جوہری کو اس سے کیا دلچسپی کہ وہ کم بخت پتھر کی صورت میں باقی رہے یا منتشر ہو کر خاک میں رُل مل جائے۔"[1]

مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بات فروری ۱۹۴۱ء میں کہی اور اب اگر اس اقتباس میں علمائے کرام کے ساتھ صاحبانِ قلم کا اضافہ کر دیا جائے تو یہ تحریر عہدِ حاضر کے حالات پر بھی پوری طرح منطبق ہوتی ہے۔

جو لوگ بیان کردہ نقطۂ نظر کے ساتھ موجودہ نظام میں کوئی جزوی اصلاح تجویز کرتے ہیں، ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ اصلاح کا کوئی بھی کام ہو، اپنے نتائج ضرور دکھاتا ہے، لیکن یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ یہ مفید نتائج نہیں ہو سکتے۔ زندگی کے کسی بھی شعبے میں، اگر کوئی شخص بہتری کا کوئی پروگرام ترتیب دیتا ہے، تو یہ ممکن ہے کہ کسی حد تک اس کے نتائج نکل آئیں، لیکن اسے کسی کلّی تبدیلی کا پیش خیمہ سمجھنا ایک خوش گمانی سے زیادہ نہیں۔ ایسے صاحبانِ فکر و نظر سے ہماری یہی گزارش ہے کہ وہ اسلامی انقلاب کی تعبیر میں کسی اختلاف کو بنیاد بنا کر اپنی اصل ذمہ داری سے کنارہ کش نہ ہوں۔ اس وقت ہمارے معاشرے میں اسلامی انقلاب کے ضمن میں جو آرا پیش کی جا رہی ہیں، انھیں ان کا

---

[1] تحریکِ آزادیِ ہند اور مسلمان۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ ج دوم، ص ۱۴۴۔

بغور مطالعہ کرنا چاہیے اور جس رائے کے بارے میں انھیں شرحِ صدر حاصل ہو جاتا ہے، تو پھر وہ اپنی توانائیاں اسی فکر اور پروگرام کے فروغ کے لیے استعمال میں لائیں۔ اسلامی انقلاب کی تعبیر میں اختلاف کسی عام آدمی کے لیے تساہل یا اغماض کی وجہ تو قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن صاحبانِ فکر و نظر کے لیے کسی گریز کا جواز نہیں بننا چاہیے۔ "جماعت اسلامی" کے اکابر، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب، طاہر القادری صاحب یا پھر جاوید احمد صاحب غامدی اس ضمن میں جو کہتے اور لکھتے رہے ہیں، اس کا تقابلی جائزہ اور پھر کسی صحیح تعبیر سے اتفاق اب کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اسی طرح، ان حضرات سے براہِ راست رابطہ بھی کوئی ناممکن امر نہیں۔ ایسے صاحبانِ فکر و نظر جو رائے عامہ کی تشکیل میں کوئی کردار ادا کر رہے ہیں، انھیں چاہیے کہ وہ وقتی بہتری کے لیے کسی جزوی اصلاح کے پروگرام کے ساتھ مستقل اور دوررس تبدیلی کے لیے اپنا وزن اُس پلڑے میں ڈالیں جس سے اُنھیں اتفاق ہو۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ معاشرے میں تبدیلی بتدریج ہی آئے گی، لیکن اس کی صورت یہ نہیں ہو گی کہ کسی ایک شعبے سے آغاز کر کے دوسرے شعبے تک پہنچا جائے، بلکہ اس کی صحیح شکل یہ ہے کہ تمام شعبہ ہائے حیات کی اصلاح کے لیے کوئی جامع لائحۂ عمل ترتیب دیا جائے۔ اس معاشرے میں اسلامی انقلاب کے لیے ہمارے نزدیک جو درست طریقہ ہے، اسے ہم "غلبۂ دین کی حکمتِ عملی" کے عنوان کے تحت بیان کر چکے ہیں[1]۔ تاہم یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہیے کہ آج بھی اصولی طور پر وہی بات صحیح ہے جو مولانا مودودیؒ نے ۱۹۳۹ء میں کہی تھی کہ :

"اب اصلاح کی صورت اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسلام کو از سرِ نو ایک تحریک کی صورت میں اٹھایا جائے اور مسلم کے معنی کو پھر سے تازہ کیا جائے۔ مردوں کی اس بستی میں جو تھوڑے بہت مسلمان دل ابھی حرکت کر رہے ہیں اور جن کی گہرائیوں سے ابھی تک یہ شہادت بلند ہو رہی ہے کہ اسلام ہی حق اور صدق ہے اور انسانیت کی فلاح صرف طریقِ اسلامی ہی میں ہے، ان کو جان لینا چاہیے کہ اب کرنے کا کام یہی ہے۔ مگر اس کام کو کرنا کھیل نہیں ہے یہ وہ کوہ کنی ہے جس کے تصور ہی سے فرہاد کا زہرہ آب ہو جاتا ہے[2]۔"

---

[1] ماہنامہ اشراق، جنوری ۹۴ء

[2] تحریکِ آزادیٔ ہند اور مسلمان۔ ج دوم، ص ۴۳۔

مکاتیب

معز امجد

- شیعہ عقائد و رسوم، چند سوالات
- ایک نشست کی تین طلاقیں
- نامحرم کے بارے میں سفلی خیالات

محترمی و مکرمی سردار عالم خان صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کے سوالوں کے جواب، بالترتیب درج ہیں:

۱۔ شیعہ اور سنی حضرات میں، بنیادی فرق دین کے ماخذ کا ہے۔ دین کے ماخذ سے مراد یہ ہے کہ وہ کون سا ذریعہ ہے جس سے ہمیں دین ملتا ہے۔ سنی حضرات کے نزدیک، دین کے دو ہی ماخذ ہیں، ایک اللہ کی کتاب، قرآنِ مجید اور دوسرے اس کے رسول، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت۔ ان کے برعکس، شیعہ حضرات کے نزدیک، دین کا ایک ماخذ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت بھی ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت 'معصوم عن الخطاء' ہیں، یعنی ان سے غلطی نہیں ہو سکتی۔ اپنی اس حیثیت کے پیشِ نظر، وہ اگر کوئی بات کہہ دیں گے، تو اس کو، دین کی حیثیت سے مان لیا جائے گا۔ چنانچہ، اسی عقیدے کا نتیجہ ہے کہ ان کے نزدیک، قرآنِ مجید کی وہی شرح قابلِ قبول ہے جو کسی اہلِ بیت نے کی ہو۔ نماز اور دیگر عبادات کا وہی طریقہ صحیح سمجھا جائے گا، جس پر اہلِ بیت نے یہ عبادت سرانجام دی اور روایات میں سے انھی کو قابلِ قبول سمجھا جائے گا جو اہلِ بیت سے مروی ہوں۔ ہمارے نزدیک، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت کے بارے میں، شیعہ حضرات کا یہ عقیدہ قرآنِ مجید سے ثابت نہیں ہوتا۔

۲۔ اہلِ بیت کے معصوم عن الخطاء ہونے کے شیعہ عقیدے ہی کا نتیجہ ہے کہ ان کے نزدیک، مسلمانوں کی خلافت سنبھالنے کے اصل حق دار بھی وہی تھے۔ چنانچہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد، ان کے نزدیک، خلافت پر حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کا حق تھا۔ مگر یہ بات چونکہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم نے پوری نہیں ہونے دی، اس وجہ سے شیعہ حضرات

کی نظر میں، انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حق غصب کیا۔ جہاں تک تبرا بھیجنے کا تعلق ہے، تو اس معاملے میں، کچھ شیعہ فرقے اسے دین کا تقاضا سمجھتے ہیں، کچھ کے نزدیک، ایسا کرنا ضروری نہیں ہے اور ان میں سے کچھ اس کو غلط بھی سمجھتے ہیں۔ یہاں یہ بات واضح رہے کہ وہ فرقے جو ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم پر تبرا بھیجنے کو ضروری نہیں سمجھتے یا ایسا کرنے کو غلط سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک بھی یہ تینوں حضرات حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حق غصب کرنے کے مجرم بہرحال ہیں۔

۳۔ مسلمانوں کے کسی امیر کو کسی دوسرے امیر پر فضیلت دینا یا یہ کہنا کہ میری رائے میں، ابوبکر یا عمر یا عثمان یا علی رضی اللہ عنہم بہتر حکمران تھے، غلط نہیں ہے۔ البتہ، جب اس فضیلت ہی پر دین کی عمارت تعمیر کر لی جائے اور اسے اپنے عقیدے کا حصہ بنا لیا جائے، تو یہ دین میں اضافہ ہو گا۔ دین کی حیثیت سے وہی بات قبول کی جا سکتی ہے، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو اور ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس اسلام کی تعلیم دی، اس میں کسی شخص کو، اپنی خاندانی نسبت کی وجہ سے کسی دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہوتی۔ قرآنِ مجید کے مطابق، اللہ کے نزدیک، وہی سب سے افضل ہے، جو سب سے زیادہ متقی ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کے تقویٰ کی مقدار کو نہیں جان سکتا، اس کا فیصلہ تو وہی ہستی کرے گی، جو دل میں اٹھنے والے خیالات کا بھی علم رکھتی ہے۔

۴۔ ماتم اور عزاداری شیعہ عقائد کا حصہ تو نہیں، مگر ان کو شیعہ حضرات کے نزدیک، ایک اہم مستحب دینی عمل کی حیثیت حاصل ہے۔ ہمارے نزدیک کسی بھی ایسے عمل کو دین میں شامل کرنا، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں، بدعت اور گمراہی ہے۔ قرآن وسنت سے ماتم اور عزاداری کا ثابت ہونا تو الگ رہا، ان سے تو ان کا ممنوع ہونا ثابت ہے۔

۵۔ جب قرآن وسنت کے مطابق، ماتم اور عزاداری ممنوع ہے، تو ظاہر ہے کہ پھر کسی بھی مسلمان کا ان میں شریک ہونا ناجائز ہے۔

۶۔ محرم کے دنوں میں شادی بیاہ یا خوشی کی دیگر تقاریب منعقد کرنے پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ کوئی شخص اگر ان مخصوص دنوں میں خوشی کی تقاریب منعقد نہ کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ البتہ، وہ اگر ایسا کرنے ہی کو دین کا تقاضا سمجھے تو یہ بھی ایک بدعت ہو گی۔

۷۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت یا کسی بھی نیک ہستی کا تذکرہ کرنا تو ممنوع نہیں ہے، مثال کے طور پر، سیدنا حسین رحمہ اللہ کی شہادت یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت اور اس طرح کے دوسرے موضوعات پر آپ کوئی سیمینار منعقد کر سکتے ہیں۔ مگر مناقب بیان کرنے کے نام پر ان مجالس

میں جو کچھ ہوتا ہے، اس کے باعث ان میں سے اکثر کو بدعت ہی قرار دیا جائے گا۔

یہاں یہ بات بھی پوری طرح واضح رہنی چاہیے کہ قرآن مجید میں 'اہل بیت' کا لفظ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات ہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید اور عربی زبان میں یہ لفظ بالکل اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے جس معنی میں ہم 'اہل خانہ' بولتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی شخص کے 'اہل خانہ' میں اس کا داماد یا چچازاد بھائی شامل نہیں ہوتے، اور نہ اس کی شادی شدہ بیٹیاں ہی اس میں شامل ہوتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراطِ مستقیم کو پانے اور اس پر قائم رہنے کی توفیق دے، آمین۔

والسلام

معز امجد

(۲)

محترمی محمد اختر مسلم صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ طلاق کے مذکورہ مسئلے میں احناف کی رائے تو وہی ہے جو 'دار العلوم' اور 'بنوری ٹاؤن' کے فتووں سے واضح ہے، یعنی یہ کہ ان کے نزدیک، اکٹھی دی گئی تین طلاقوں سے لازماً تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی، اور اب رجوع کر لینے یا دوبارہ نکاح کر لینے کی گنجائش نہیں ہوگی۔ ان کے برعکس، اہلِ حدیث مکتبِ فکر کے نزدیک، ایک ہی مجلس میں اکٹھی تین طلاقیں دینے سے ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے۔ مزید برآں، کچھ اہلِ حدیث علما کے نزدیک، جن میں ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ سرِ فہرست ہیں، ایامِ حیض میں دی گئی طلاق، چونکہ قرآن و سنت کے منشا کے خلاف ہے اس وجہ سے واقع ہی نہیں ہوتی۔

جہاں تک، اس معاملے میں، ہماری اپنی رائے کا تعلق ہے تو، جیسا کہ آپ کے علم میں ہے، طلاق کے مسئلے پر ہم تفصیل سے لکھ چکے ہیں، اس وجہ سے، سب سے پہلے تو آپ اس نوجوان اور اس کے بزرگوں کو 'اشراق' کے ستمبر اور نومبر ۱۹۹۳ء کے شمارے دکھا دیجیے تاکہ انھیں طلاق کے پورے قانون کے بارے میں، ہماری رائے سمجھنے میں آسانی ہو۔ اس خاص مسئلے میں ہماری رائے یہ ہے کہ طلاق دینے والا اگر اسلام کے قانونِ طلاق سے پوری طرح واقف تھا، طلاق دینے کا طریقہ اچھی طرح جانتا تھا، اس کی نیت وہی تین طلاقیں دینے کی تھی، جو قرآنِ مجید میں بیان ہوئی ہیں، پورے ارادے اور شعور کے ساتھ اس نے اکٹھی تین طلاقیں دے دی ہیں، تو نہ صرف یہ کہ اس کی تین طلاقیں

تین ہی شمار ہوں گی، بلکہ وہ شریعت کے احکام کی خلاف ورزی کا مجرم بھی قرار پائے گا لیکن اگر وہ، ہمارے ملک میں موجود مسلمانوں کی اکثریت کی طرح، اسلام کے قانونِ طلاق سے 'پوری طرح، واقف ہی نہیں تھا یا اس کا ارادہ تین طلاقیں دینے کا نہیں، بلکہ ایک ہی طلاق دینے کا تھا، مگر اپنے جذبات کی شدت میں تین طلاقیں دے بیٹھا ہے' یا وہ یہ سمجھتا تھا کہ طلاق واقع ہی اس وقت ہوتی ہے جب تین طلاقیں دی جائیں' تو اس صورت میں 'اس کے 'بار بار طلاق کا لفظ دہرانے کو شدتِ اظہار پر محمول کر کے' ایک طلاق شمار کی جا سکتی ہے' اور اسے اپنی بیوی سے رجوع کر لینے یا، اگر عدت کی مدت گزر چکی ہو، دوبارہ نکاح کر لینے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ اس کا یہ طریقہ اپنایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی برادری کے چند بزرگوں کو جمع کر کے' یہ حلفیہ اقرار کرے کہ اس کا ارادہ، اصل میں' ایک ہی طلاق دینے کا تھا۔

جہاں تک حلالہ کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں بھی مذکورہ مضمون میں ہم نے تفصیل کے ساتھ اپنی رائے لکھ دی ہے' اس کا مطالعہ فرما لیجیے۔ وہ شخص جو، علم دین کی مسند سے' اس شنیع فعل کا مشورہ دے اور وہ جو چند ٹکوں کی خاطر 'کرائے کا سانڈ' بننے پر آمادہ ہو جاتے' ان سب کے بارے میں' اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ 'اولئک الذین اشتروا الحیاۃ الدنیا بالاخرۃ۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراط مستقیم کو پانے اور اس پر قائم رہنے کی توفیق دے۔ آمین۔

والسلام

معز امجد

(۳)

محترمی محمد آصف صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کے سوالوں کے جواب' بالترتیب' درج ہیں:

۱۔ قرآنِ مجید میں بیان کردہ حجاب کے قانون سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ کسی مرد کے دل میں عورت کا یا عورت کے دل میں مرد کا خیال آنا یا ان کا' ایک دوسرے کے بارے میں، کوئی رائے رکھنا ممنوع یا کوئی قابلِ مواخذہ بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی ہر چیز کو جوڑا جوڑا بنایا ہے۔ اس اصول پر دیکھیے تو مرد کے لیے ایک عورت اور عورت کے لیے ایک مرد اس کے جذبات واحساسات کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ مزید برآں، مرد کے دل میں عورت کے لیے اور عورت کے دل میں مرد کے لیے جذب و کشش بالکل فطری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۔ (الروم ۳۰:۲۱)	"اللہ کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے تمھارے لیے، تمھارے ہی طرح کے جوڑے پیدا کیے، تاکہ تم سکون حاصل کر سکو۔ اور اس نے تم میں ایک دوسرے کے لیے انس و محبت رکھ دی۔ بے شک اس میں غور کرنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔"

چنانچہ، بھوک اور پیاس کی طرح، مرد و عورت کے درمیان اس فطری جذب و کشش ہی کے باعث جنس کا جذبہ ہمیشہ سے انسان کے لیے ایک اہم اور کارفرما جذبہ رہا ہے۔ مگر جس طرح ہر جذبہ حدود سے متجاوز ہو جانے کے بعد، زندگی کے توازن کو درہم برہم کر دینے کا باعث بن جاتا ہے، اسی طرح جنس کا جذبہ بھی حدود میں رہے تو فطری ہے اور حدود سے آگے بڑھ جائے تو پھر دنیا اور آخرت میں انسان کے لیے خسارے کا باعث بن سکتا ہے۔

انسان کے دل میں کبھی، کوئی غلط خیال، اگر آ جائے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہی امید رکھنی چاہیے کہ وہ اسے معاف فرما دیں گے۔ لیکن کوئی شخص اگر جان بوجھ کر اپنا ذہن بے ہودہ قسم کے خیالات ہی سے بھرا رکھے، تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ وہ کبھی نہ کبھی اپنے ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی کرے گا۔ آپ، یقیناً اس بات سے واقف ہوں گے کہ انسان کا عمل، خواہ اچھا ہو یا بُرا، بالعموم، پہلے مرحلے میں ایک خیال اور ارادہ ہی ہوتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ، یہ خیال اس کی زندگی میں اہمیت حاصل کرتا جاتا ہے، اور کئی مرتبہ ایسا وقت بھی آ جاتا ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد اس ایک خیال ہی کی تکمیل بن کر رہ جاتا ہے۔ اس وجہ سے ہر صاحبِ ایمان آدمی کو اپنے ذہن کو پاکیزہ خیالات ہی سے آباد رکھنا چاہیے۔ یہ بات یاد رکھیے کہ گندے ذہن کے لوگوں سے، اتفاقاً، کوئی اچھا کام سرزد ہو جائے تو ہو جائے۔ ان سے، بالعموم، بے ہودہ کاموں ہی کی توقع ہوتی ہے۔ اسی طرح پاکیزہ ذہن کے لوگوں سے برائی سرزد ہو تو جاتی ہے، مگر ان سے، عام طور پر، توقع بھلائی ہی کی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے، آدمی کو ہر ایسی چیز سے بھی دور رہنا چاہیے، جو سفلی جذبات ابھارنے کا ذریعہ بن سکتی ہو۔ یہ بات جان لینے کے بعد، اب اپنی زندگی کے بارے میں، ہر شخص کو خود فیصلہ کرنا ہے، کہ وہ سفلی قسم کے خیالات ہی کا غلام بن کر اس جہانِ فانی سے گزر جانا چاہتا ہے یا اس زندگی کو آخرت کمانے کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ، یہ بھی یاد رکھیے کہ انسان، اگر آخرت کی کامیابی چاہتا ہے، تو اس کا دل اللہ

کی یاد ہی سے آباد ہونا چاہیے۔ اللہ کے بندے اُٹھتے بیٹھتے اسی کو یاد کرتے ہیں۔ اللہ ہی کی یاد سے دلوں کو زندگی ملتی ہے۔ دل، اگر اللہ کی یاد سے خالی ہو جاتے، تو پھر یہ شیطانی خیالات ہی کی آماج گاہ بنے گا۔ یہاں، البتہ، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دل کو پاکیزہ خیالات سے آباد کرنے کا ذریعہ کیا ہے؟ یہ، چونکہ ایک مستقل موضوع ہے، اس وجہ سے یہاں اس بحث سے تعرض ممکن نہیں ہے۔ تاہم، اتنی بات سمجھ لیجیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق، دل میں ایمان کو تازہ رکھنے کے لیے، ایک شخص کو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید کی تلاوت کرنی چاہیے اور اپنی موت کو کثرت سے یاد کرنا چاہیے۔

باقی رہ گئی یہ بات کہ کسی عورت کی طرف، صرف اس کے حسن سے لطف اندوز ہونے کے لیے دیکھنا جائز ہے یا نہیں؟ تو اس معاملے میں ایک بات تو یہ ہے کہ بالعموم، ہر بدکاری کا آغاز حسن سے لطف اندوز ہونے والی نظر ہی سے ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ شیطان کے تیروں میں سے ایک تیر، بری نظر ہے، جس سے وہ مومن کے دل پر حملہ کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک شخص اگر یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کی ماں، بہن اور بیٹی کے حسن سے کوئی دوسرا لطف اندوز ہو، تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے لیے بھی یہی پیمانہ رکھے۔

۲۔ آدمی کا کسی عورت کو پسند کرنا ناجائز نہیں ہے۔ اس کی حدود وہی ہیں، جو قرآن وسنت میں، غیر محرموں کے ساتھ ربط ضبط کے معاملے میں، بیان ہو گئی ہیں۔

۳۔ اسلام میں صحتِ نکاح کی شرط، اصلاً، یہی ہے کہ ایک مرد و عورت یہ اعلانِ عام کر دیں کہ انھوں نے نکاح کر لیا ہے۔ لیکن اسلام اس بات کو بڑی اہمیت دیتا ہے کہ نکاح میں مرد و عورت کے اولیا کی رضامندی بھی شامل ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مرد و عورت کا نکاح، صرف انھی دو کے درمیان تعلق کا نام نہیں ہے، بلکہ اس سے دو خاندانوں کے درمیان رشتہ قائم ہوتا ہے۔ ریاستِ پاکستان میں، چونکہ کورٹ میرج کو قانونی حیثیت حاصل ہے، اس لیے اس نکاح کو، بہرحال، نکاح ماننا پڑے گا۔ البتہ، اس معاملے میں، ہمارے نزدیک، کوئی بڑی وجہ مانع نہ ہو تو پسندیدہ یہی ہے کہ نکاح میں مرد و عورت کے اولیا کی رضا شامل ہو۔

۴۔ کھانا پینا زندگی کی ضرورت ہے، اسے زندگی کا مقصد نہیں بن جانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا۔ "کھاؤ پیو، مگر اسراف نہ کرو۔"

(الاعراف ۷: ۳۱)

یعنی کھانا پینا اور اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا دین داری کے خلاف نہیں ہے۔ دین داری کے

خلاف جو چیز ہے، وہ اسراف ہے اور اسراف، یقیناً، نفس کے تزکیہ میں حائل ہو سکتا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ زندہ رہنے کے لیے کھانا چاہیے، کھانے ہی کے لیے زندہ نہیں رہنا چاہیے۔

۵۔ کوئی شخص اگر دو بھائیوں کے درمیان جھگڑا ختم کرا سکتا ہے، تو اسے ایسا کرنا ہی چاہیے۔ اس مقصد کے لیے اگر غلط بیانی سے کام لینا ناگزیر ہو جائے تو امید ہے کہ رب رحیم اس سے درگزر فرما دیں گے۔

اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

معز امجد

المورد
قسم دراسات الفقہ الاسلامی

تبصرۂ کتب

نعیم بلوچ

'نونہال دینیات' (پانچ حصے)

مرتب: حکیم محمد نعیم الدین زبیری

ضخامت: حصہ اول: ۴۴ صفحات، حصہ دوم، حصہ سوم: ۳۵ صفحات، حصہ چہارم: ۴۴ صفحات، حصہ پنجم: ۵۸ صفحات۔

قیمت: ۱۵ روپے فی حصہ

ناشر: بیت الحکمت، بند مراد خاں، ڈاک خانہ 'مدینۃ الحکمت'، کراچی ۷۴۷۰۰

چھوٹی عمر کے بچوں کو اسلامی عقائد و اقدار سے روشناس کرانا ایک اہم ذمہ داری ہے۔ اس کام کی اہمیت و افادیت کا تقاضا تو یہ تھا کہ اسے حکومتی سرپرستی میں حتی المقدور اعلیٰ معیار اور صحت کے ساتھ سرانجام دیا جاتا، مگر بدقسمتی سے ہمارے ہاں 'دنیوی تعلیم و تدریس' میں بالعموم اور دینی تعلیم کے بندوبست میں بالخصوص مجرمانہ غفلت اور انتہائی بے حسی کا مظاہرہ کیا جاتا رہا ہے۔ علاوہ ازیں مستقبل میں بھی اس میں بہتری کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ اس سنگین صورت حال کو دیکھ کر بعض اہل درد اپنی عقل و بصیرت کے مطابق اس مقصد کے لیے سرگرم عمل رہتے ہیں۔ مدینۃ الحکمت کی جانب سے ابتدائی درجے کے لیے دینیات کے نام سے 'پانچ خوب صورت کتابوں کی اشاعت بھی اس سلسلے کی ایک مستحسن کاوش ہے۔

پیش لفظ میں حکیم محمد سعید صاحب نے بجا طور پر لکھا ہے کہ تعلیمی ترقی کے میدان میں قدم آگے بڑھانے کے لیے نصاب تعلیم کی ازسرنو تدوین ناگزیر ہے۔ اور اس منصوبے کی ابتدا دینیات کے سلسلۂ کتب سے کی گئی ہے۔ حکیم صاحب کے مطابق ان کتب کی تیاری میں سابق ریاست حیدر آباد دکن کے اسکولوں میں رائج نصاب سے رہنمائی لی گئی ہے اور مذکورہ نصاب مولانا مناظر احسن گیلانی، پروفیسر عبدالباری ندوی، مولانا عبداللہ صدیقی اور مولانا ہاشمی فرید آبادی کی نگرانی میں تیار کیا گیا تھا۔

پانچوں کتابوں میں مختلف عنوانات کے تحت بہت آسان، مگر دل نشیں انداز میں بچوں کو

اسلامی عقائد، فرائض و وظائف اور معاشرتی اقدار سے روشناس کرایا گیا ہے۔ آخری حصے میں توحید کے عنوان سے بحث بطورِ خاص، بہت اعلیٰ اور عمدہ ہے۔ بعض خوبصورت نظمیں بھی مختلف حصوں میں شامل ہیں۔ کتاب کو دلچسپ اور بچوں کے لیے باعثِ کشش بنانے کے لیے جا بجا رنگین تصاویر بھی دی گئی ہیں۔ البتہ بعض مقامات پر یہ تصاویر غیر ضروری محسوس ہوتی ہیں۔ عنوانات کی ترتیب میں کوئی ربط یا نظم نہیں ہے۔ مثلاً اذان اور اقامت دوسرے حصے میں، نماز کی رکعتیں اور طریقہ تیسرے حصے میں اور نماز اور اس کا ترجمہ چوتھے حصے میں ہے۔ بعض موضوعات کی تکرار بھی محسوس ہوتی ہے۔ مزید برآں بعض مقامات پر غلط معلومات بھی دی گئی ہیں مثلاً پہلے حصے میں صفحہ ۲۱ پر حضرت عمر بن عبدالعزیز کو "مسلمانوں کا ایک بڑا بادشاہ" کہا گیا ہے، جبکہ وہ بالاتفاق خلیفہ راشد تھے۔ اسی طرح مختلف جگہوں پر اہلِ تصوف کے واقعات بھی بیان کیے گئے ہیں جن کی حقیقت محض سنی سنائی باتوں سے زیادہ نہیں اور وہ اسلام کی بعض تعلیمات سے متصادم بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ حضرت ابراہیم ادھم ایک بڑی سلطنت کے بادشاہ تھے اور انھوں نے اللہ کی محبت میں بادشاہت چھوڑ دی۔ حالانکہ اسلام کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ خلفائے راشدین کی طرح مسلمانوں کی خدمت کرتے۔

اگرچہ مدینۃ الحکمت کی یہ کاوش قابلِ ستایش اور منزل کی جانب ایک اچھا قدم ہے لیکن نصاب کی تیاری میں کتابوں کے ظاہری حسن کے ساتھ ساتھ نفسِ مضمون کی صحت اور ترتیب کو مدنظر رکھنا بھی اشد ضروری ہے۔ امید ہے کہ اگلے ایڈیشن میں ان تمام امور کی طرف توجہ دے کر اس سلسلے کو زیادہ مفید بنا دیا جائے گا۔ تاہم موجودہ صورت میں بھی یقیناً یہ کتابیں اس لائق ہیں کہ قوم کے کم سن معماروں کو ان کے ذریعے سے دینِ حق سے روشناس کرایا جائے۔

دین و دانش

(آڈیو' وڈیو کیسٹ)

مقرر: جاوید احمد غامدی

سلسلہ محاضرات

۱۔ قرآن مجید کیا ہے' اسے کیسا سمجھا جائے؟
۲۔ اسلامی شریعت کیا ہے' کیسے سمجھی جائے؟
۳۔ حدیث و سنت کا مقام اور اجماع کی حیثیت
۴۔ حقیقت دین (۱) ذات باری پر ایمان اور اس کے تقاضے
۵۔ حقیقت دین (۲) رسالت پر ایمان اور اس کے تقاضے
۶۔ حقیقت دین (۳) آخرت پر ایمان اور اس کے تقاضے
۷۔ دعوت دین
۸۔ دین کے بنیادی مطالبات
۹۔ اسلامی انقلاب کی جدوجہد
۱۰۔ انقلاب کی حکمت عملی
۱۱۔ عالمگیر اسلامی انقلاب
۱۲۔ منشور انقلاب (۱) سیاست
۱۳۔ منشور انقلاب (۲) معیشت
۱۴۔ منشور انقلاب (۳) معاشرت
۱۵۔ منشور انقلاب (۴) تعلیم
۱۶۔ منشور انقلاب (۵) حدود و تعزیرات
۱۷۔ اسلام اور پارلیمنٹ
۱۸۔ نظام خلافت
۱۹۔ اسلام اور تصوف
۲۰۔ تزکیہ نفس (۱) حیوانی وجود کا تزکیہ
۲۱۔ تزکیہ نفس (۲) عقلی وجود کا تزکیہ
۲۲۔ تزکیہ نفس (۳) روحانی وجود کا تزکیہ
۲۳۔ تزکیہ نفس (۴) اخلاقی وجود کا تزکیہ (الف)
۲۴۔ تزکیہ نفس (۵) اخلاقی وجود کا تزکیہ (ب)
۲۵۔ اسلام کا قانون سیاست
۲۶۔ اسلامی معیشت (۱) مسئلہ سود اور ایک نیا نظام معیشت
۲۷۔ اسلامی معیشت (۲) زکوۃ یا ٹیکس
۲۸۔ اسلامی معاشرت' فنون لطیفہ اور ذرائع ابلاغ
۲۹۔ حدود و تعزیرات: کیا اسلامی سزائیں ظلم ہیں؟
۳۰۔ پردے کا قانون
۳۱۔ مسلمان خاتون
۳۲۔ ہماری تعلیم
۳۳۔ اسلامی جہاد
۳۴۔ تاریخ امت چند درخشاں پہلو
۳۵۔ انتخابی نتائج (۱۹۹۳) اور اسلامی انقلاب کی جدوجہد
۳۶۔ آپ کے سوالات
۳۷۔ سوال و جواب کی نشست (۱)
۳۸۔ سوال و جواب کی نشست (۲)

درس قرآن وحدیث

سورہ	کیسٹ نمبر	کتاب حدیث	کیسٹ نمبر
الانعام	۱-۲۹	الصلوۃ (صحیح بخاری)	۱-۱۲۳
الاعراف	۳۰-۶۶	الزکوۃ (صحیح مسلم)	۱۲۴-۱۵۵
الانفال	۶۷-۸۲	الصوم (صحیح مسلم)	۱۵۶-۱۷۲
التوبہ	۸۳-۱۱۰	فضائل قرآن (مشکوۃ المصابیح)	۱۷۳-۱۹۱
یونس	۱۱۱-۱۲۷		
ہود	۱۲۸-۱۴۶		
یوسف	۱۴۷-۱۵۹		
الرعد	۱۶۰-۱۶۵		
ابراہیم	۱۶۶-۱۷۱		
الحجر	۱۷۲-۱۷۶		
النحل	۱۷۷-۱۹۲		

نوٹ:

○ درس قرآن وحدیث صرف آڈیو کیسٹ پر دستیاب ہیں۔

○ درج ذیل نمبروں والی کیسٹیں معیاری ریکارڈنگ نہ ہونے کے باعث فی الحال دستیاب نہیں ہیں۔ ۶۱، ۹۸، ۱۰۷، ۱۵۴، ۱۷۷

○ سلسلہ محاضرات کے کیسٹ نمبر ۱۱، ۱۴۰ اور ۳۷ وڈیو کیسٹ پر دستیاب نہیں ہیں۔

قیمت: آڈیو کیسٹ ۲۵ روپے، وڈیو کیسٹ ۱۲۰ روپے

المورد، شعبہ اصلاح ودعوت

۹۸(۲)ای، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون: ۸۵۶۳۱۸-۸۵۷۰۳۰ فیکس: ۸۵۷۰۵۳


مدرکیئر اور آپ ۔ حسن کی بہتر نگہداشت

OUR THANKS TO

SNOW WHITE DRY CLEANING INDUSTRIES
SH. WILAYAT AHMAD & SONS
CONTINENTAL ART
FEROZE TEXTILE INDUSTRIES
IMAGE COMMUNICATIONS
TIP TOP DRY CLEANERS
F.RABBI & CO. (PVT) LTD
K.B. SARKAR & CO.
PARAMOUNT DISTRIBUTORS (PVT) LTD

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

ماہنامہ
اشراق
لاہور

جلد ۶ شمارہ ۱۲
دسمبر ۱۹۹۴ء
رجب ۱۴۱۵ھ

مدیر
منیر احمد
معاونین
منظور الحسن
قدیر شہزاد
مدیر انتظامی
شکیل الرحمن
مجلس ادارت
طالب محسن خالد ظہیر
ساجد حمید معز امجد
شہزاد سلیم محمد رفیع
نادر عقیل انصاری نعیم احمد بلوچ
خورشید احمد ندیم

فی شمارہ : ۸ روپے
سالانہ : ۸۰ روپے
بیرون ملک
ہوائی ڈاک : ۴۵۰ روپے
بحری ڈاک : ۲۵۰ روپے

المورد
دانش گاہ معارف اسلامی

۹۸ (۲) ای، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۵۴۷۰۰ فون : ۸۵۶۴۱۸-۸۵۷۰۴۰

انتظامی دفتر: ۶۶ احمد بلاک، گارڈن ٹاؤن، لاہور ۵۴۶۰۰ فون: ۵۸۶۴۴۳۱

مدیر مسئول: جاوید احمد غامدی ○ طابع: قومی پریس، لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجن

[۷۲]

اللہ کے نام سے جو سراپا رحمت ہے جس کی شفقت ابدی ہے۔

(اے پیغمبر، ان سے) کہہ دو، مجھے وحی آئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے یہ قرآن سنا، تو اپنی قوم سے کہا: ہم نے ایک بڑا ہی دل پزیر قرآن سنا ہے، جو ہدایت کا رستہ دکھاتا ہے، سو ہم اُس پر ایمان لے آتے ہیں اور اب ہم ہرگز، کسی کو اپنے پروردگار کا شریک نہ ٹھیرائیں گے، اور یہ کہ ہمارے مالک کی شان بہت اونچی ہے، اُس نے (اپنے لیے) کوئی بیوی بنائی ہے، نہ بیٹا اور ہمارا یہ احمق، (یہ ہمارا سردار)، اللہ کے بارے میں بالکل حق سے ہٹی ہوئی باتیں کہتا رہا۔ اور یہ

کہ ہم نے سمجھا تھا کہ کیا جن اور کیا انسان، اللہ پر کوئی بھی جھوٹ نہیں باندھ سکتا۔ اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ احمق (ہمارے) اِن جنوں میں سے کچھ شریروں کی دہائی دیتے رہے ہیں تو انھوں نے اُن کی شامت ہی بڑھائی ہے۔ اور یہ کہ انھوں نے، (آدم کے اِن بیٹوں نے) بھی تمھاری طرح یہی سمجھا کہ اللہ مرنے کے بعد پھر کسی کو زندہ نہ اٹھائے گا۔ اور یہ کہ ہم نے آسمانوں کو ٹٹولا، تو دیکھا کہ وہ سخت پہرے داروں اور شہابوں سے بھرا پڑا ہے۔ اور یہ کہ ہم پہلے اس کے ٹھکانوں میں کچھ سننے کے لیے جگہ پالیتے تھے، لیکن اب جو کچھ سننے کی کوشش کرتا ہے، اپنے لیے گھات میں ایک انگارا پاتا ہے۔ اور یہ کہ ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کے حق میں کوئی برائی مقصود ہے، یا اُن کے پروردگار نے اُن کے لیے کسی خیر کا ارادہ کیا ہے۔ اور یہ کہ ہم میں نیک بھی ہیں اور دوسرے بھی، (اور اب ہم جانتے ہیں کہ) ہمارے رستے الگ الگ ہیں۔ اور یہ کہ ہم نے مان لیا کہ ہم اللہ کی گرفت سے نہ زمین میں کہیں جا کر نکل سکتے اور نہ آسمان میں کہیں بھاگ کر اُس کو ہرا سکتے ہیں۔ اور یہ کہ جب ہم نے یہ ہدایت کی بات سنی تو اُس پر ایمان لے آئے۔ اب جو لوگ بھی اپنے رب کو مانیں گے، اُنھیں کسی

نقصان اور کسی زیادتی کا اندیشہ نہ ہوگا۔ اور یہ کہ ہم میں فرماں بردار بھی ہیں اور نافرمان بھی، تو جو فرماں بردار ہوئے، اُنھوں نے رستہ پا لیا۔ اور جو نافرمان ہوئے، (اُن کے بارے میں عقل کا فیصلہ یہی ہے کہ) وہ دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔

اور (اے پیغمبر، اِن سے کہہ دو، مجھے وحی آئی ہے) کہ اگر (تمھارے مخاطب) یہ لوگ (توحید کی) سیدھی راہ پر قائم رہتے، تو ہم اِن کو سیراب کر دیتے۔ اِس لیے کہ اِس میں اُنھیں آزمائیں اور (اِن میں سے) جو اپنے پروردگار کی یاددہانی سے منہ موڑیں گے، اُنھیں وہ ایسے عذاب میں داخل کرے گا جو برابر چڑھتا جائے گا۔ اور یہ کہ، (اے لوگو)، یہ مسجدیں اللہ ہی کے لیے ہیں، اِس لیے (اِن میں) اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو۔ اور یہ کہ جب اللہ کا یہ بندہ (اُس کے گھر میں) اُسے پکارنے کھڑا ہو جاتا ہے، تو لگتا ہے کہ یہ اُس پر ٹوٹ پڑیں گے۔ (اے پیغمبر)، کہہ دو، میں تو صرف اپنے رب ہی کو پکارتا ہوں اور کسی کو اُس کا شریک نہ ٹھیراؤں گا۔ اِن سے کہہ دو، میں تمھارے لیے کسی نفع و ضرر اور کسی ہدایت و ضلالت کا کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ کہہ دو، مجھے اللہ سے کوئی

بچا نہیں سکتا اور نہ میں اُس کے سوا کوئی ملجا کبھی پا سکوں گا۔ ہاں، مگر، مجھ کو اللہ کی طرف سے پہنچانا ہے اور اُس کے پیغام تمھیں دینے ہیں۔ پھر جو اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کریں گے، اُن کے لیے دوزخ کی آگ ہے، جس میں وہ ہمیشہ، رہیں گے۔ (اِس وقت یہ لوگ نہ مانیں گے)؛ یہاں تک کہ، (اے پیغمبر)، جب اُس چیز کو دیکھ لیں گے، جس سے اِنھیں خبردار کیا جاتا ہے، تب جانیں گے کہ کس کی مدد کمزور اور کون گنتی میں تھوڑے ہیں۔ کہہ دو، میں نہیں جانتا کہ جس (عذاب) سے تم کو خبردار کیا جاتا ہے وہ قریب ہی ہے یا میرا پروردگار ابھی اِسے اور کچھ ٹالے گا۔ (یہ غیب کی باتیں ہیں) اور اِس غیب کو وہی جانتا ہے اور اپنا یہ غیب کسی پر ظاہر نہیں کرتا۔ رہے وہ، جن کو وہ رسول کی حیثیت سے منتخب کر لیتا ہے، (تو وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ سکتے) اس لیے کہ اُن کے آگے اور پیچھے وہ پہرا لگا دیتا ہے، تاکہ معلوم رہے کہ اُنھوں نے اپنے رب کے پیغام پہنچا دیے، اور وہ اُن کے ماحول کو گھیرے میں، اور اُن کی ہر چیز کو گنتی میں رکھتا ہے۔

——— البیان ———

منشورِ انقلاب

(۹)

انتظامیہ اور نظامِ عدل

ہمارے ہاں عدلیہ اور انتظامیہ کے موجودہ نظام میں ایسی خامیاں موجود ہیں کہ اگر صرف ان خامیوں ہی پر بحث کی جائے، تو یہ ایک پوری کتاب کا موضوع ہے۔ ہم یہاں اختصار کے پیش نظر صرف ایک ایسی خامی کی طرف توجہ دلائیں گے، جو ان تمام خامیوں کی بنیاد ہے اور جسے دور کر دینے سے ہمارا عدالتی نظام اور ہماری انتظامیہ بہت سی خامیوں سے پاک ہو سکتے ہیں۔

ہماری عدالتیں ہوں یا ہماری انتظامیہ، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان دونوں میں غیر ضروری درجات بنا کر، معاملات کے حل میں، غیر معمولی تاخیر کے اسباب پیدا کر دیے گئے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ اس نظام میں حق داروں کو ان کے حق سے محروم رکھا جاتا، اور کئی کئی برس تک بے گناہ افراد کو حوالات اور جیل خانوں میں بند کر دیا جاتا ہے۔

چنانچہ دیکھیے، ہمارے ہاں جب ضلعی عدالت ایک مقدمے کا فیصلہ کر دیتی ہے، تو مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو اس فیصلے کے خلاف، پہلے عدالتِ عالیہ اور پھر عدالتِ عظمیٰ میں مرافعہ (اپیل) کا حق حاصل ہے۔ عموماً، جب تک عدالتِ عظمیٰ کا فیصلہ نہیں آ جاتا، اس وقت تک کسی چھوٹی عدالت کے فیصلے پر عمل درآمد نہیں کیا جاتا، بلکہ اس کے خلاف حکمِ امتناعی (STAY ORDER) لے کر بڑی عدالت کے فیصلے کا انتظار کیا جاتا ہے۔ پھر معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ اگر کوئی 'اچھا' وکیل ہو، تو وہ اپنے خلاف ہونے والے فیصلے پر عمل درآمد روکنے کے لیے مقدمے کو بالکل نئے سرے سے دوبارہ شروع کر دیتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق، عدالتِ عالیہ میں پیش کی جانے والی ایک اپیل کی پہلی سماعت، اوسطاً اپیل دائر کرنے کے دس سے بارہ سال کے بعد ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک مرتبہ سماعت کا آغاز ہو جانے کے بعد چند دِنوں

میں مقدمے کا فیصلہ ہو جاتا ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مقدمات کی تاریخیں بھگتتے بسا اوقات نسلیں گزر جاتی ہیں۔

یہی معاملہ ہماری انتظامیہ کا بھی ہے۔ مثال کے طور پر، اگر ہمارے انسپکٹر جنرل پولیس (آئی جی) کسی علاقے کے تھانے دار کے لیے کوئی حکم جاری کریں، تو وہ یہ حکم نامہ براہ راست اس علاقے کے تھانے دار (ایس ایچ او) کو دینے کے مجاز نہیں ہیں۔ انھیں یہ حکم نامہ اس علاقے کے ڈی آئی جی صاحب کو دینا ہوگا، پھر اے آئی جی، ایس ایس پی، ایس پی، ڈی ایس پی، اور اے ایس پی سے ہوتا ہوا یہ حکم علاقہ کے تھانے دار تک پہنچے گا۔ ظاہر ہے کہ اس درجہ بندی کی وجہ سے معاملات میں غیر معمولی اور بے جا تاخیر ہوتی ہے۔ افسروں کی درجہ بندی کا، بعینہٖ، یہی معاملہ انتظامیہ کے دوسرے شعبوں کا بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو حکومت کے کسی بھی شعبے سے کوئی کام پڑ جائے، تو سال ہا سال کی تگ و دو کے بعد ہی، کسی خوش قسمت حق دار کو اس کا حق مل سکتا ہے۔

اس بات کے پیش نظر ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ پوری مملکت کو چھوٹی چھوٹی انتظامی وحدتوں میں تقسیم کر کے ہر وحدت کی اپنی عدالت اور انتظامیہ قائم کی جائے۔ عام آدمی کے تمام مسائل اسی عدالت اور منتظمہ کے حوالے کیے جائیں۔ یہاں پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر ملک کی انتظامیہ دیانت داری اور فرض شناسی سے کام کرے، تو مقدمات کی تعداد، آپ سے آپ، بہت کم ہو جاتی، اور اس طرح عدالتوں کا کام بہت محدود ہو سکتا ہے۔ اس طرح اتنی چھوٹی سطح پر عدالت قائم کرنے سے یہ فائدہ بھی حاصل ہوگا کہ عدالت کا قاضی اس علاقے میں رہنے والے تقریباً تمام لوگوں کو، ذاتی طور پر، جانتا ہوگا۔ یہ بات مقدمات کی کارروائی اور ان کے فیصلوں میں، یقیناً، بہت حد تک معاون ہوگی۔

مزید یہ کہ ایسے معاملات کو بہت محدود کیا جائے جن میں مدعی اور مدعا علیہ کو عدالتِ عالیہ اور عدالتِ عظمیٰ، دونوں میں اپیل دائر کرنے کا حق حاصل ہو۔ دیوانی مقدمات میں جو فیصلہ انتظامی وحدت کی عدالت کر دے، اس کے خلاف صرف ایک عدالت میں اپیل کا حق رکھا جائے۔ اسی طرح ضلع کی سطح پر، عدالتِ عالیہ کے بنچ (BENCH) قائم کیے جائیں، تاکہ اس میں دائر کی جانے والی اپیل کی سماعت اور اس کا فیصلہ، جلد سے جلد، کیا جا سکے۔

اسی طرح عدالتوں کے طریقۂ کار (PROCEDURE CODES) میں ایسی ترامیم کی جائیں، جو فوری انصاف فراہم کرنے کی راہ ہموار کر سکیں۔ مثال کے طور پر، اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ انتظامی وحدتوں کی عدالتوں میں پیش کیے جانے والے مقدمات میں وکیلوں کے بجائے خود مدعی اور مدعا علیہ قاضی کے سامنے اپنے اپنے نقطۂ نظر کو پیش کریں، تاکہ ان مقدمات میں فریقین کا مطمحِ نظر قاضی کو مرعوب کرنا نہ ہو، بلکہ اسے

حقیقت سے آشکارا ہو۔ اسی طرح ہمارے ہاں مقدمات اس وقت 'نظام مخالفانہ' (ADVERSARIAL SYSTEM)[1] کے تحت ہوتے ہیں جس میں قاضی کو فریقین میں سے اسی فریق کے حق میں فیصلہ کرنا ہوتا ہے جو اپنا مدعا ثابت کر دے۔ قاضی کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ وہ اس کے خلاف فیصلہ سنائے، اگرچہ وہ یہ جانتا ہی ہو کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ مقدمات کے اس مروجہ نظام کے مقابلے پر 'محتسبانہ نظام' (INQUISITORIAL SYSTEM) ہے۔ اس نظام میں قاضی کو اختیار حاصل ہے کہ وہ اسی فیصلے کو نافذ کرے جو اس کے نزدیک صحیح ہے، اور اس حق کو ثابت کرنے کے لیے وہ ہر طرح کی کارروائی کرنے، اور خود اس کے لیے ثبوت اور شواہد جمع کرنے کا بھی مجاز ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک ان دونوں نظاموں کے اچھے پہلوؤں کو جمع کر کے مقدمات کی سماعت کے بارے میں ایک ایسا نظام وضع کیا جانا چاہیے، جس میں اصل مطمح نظر فوری اور، انسانی حد تک ممکن، انصاف کی فراہمی ہو۔

اس کے علاوہ، موجودہ نظام حکومت میں پائے جانے والے لامحدود درجات کو ختم کر کے انتظامی حصوں کو براہ راست صوبوں اور پھر مرکز کے ساتھ منسلک کر دیا جانا چاہیے۔ اس کے نتیجے میں، حکومتی شعبوں سے متعلق کاموں میں ہونے والی غیر معمولی تاخیر پر قابو پایا جا سکے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ انتظامیہ کی طرف سے ہونے والی زیادتیوں کے ازالے کے لیے ہر صوبے اور ضلع میں با اختیار محتسب مقرر کیے جائیں، تاکہ اس طرح کے مسائل میں عدالتوں کے دروازوں پر دستک دینے کی نوبت ہی نہ آئے، اور انتظامیہ کے خلاف پیدا ہونے والی ہر شکایت کو بغیر کسی تاخیر کے دور کیا جا سکے۔

---

[1] یہ اصطلاحات امریکی نظام قانون کی ہیں۔

اعتذار

بابت 'اشراق' نومبر ۱۹۹۴

عنوان	صفحہ	سطر	اس طرح پڑھیے
سنت ہجرت	۱۱	۶-۷	....قریشی ہو ہاشمی یا سورج بنسی اور چندر بنسی ہو
غلبۂ دین کی حکمت عملی	۲۹	۲۱-۲۲	۔ ز مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی کہ روح شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

—— مدیر

ترتیب : شہزاد سلیم

"دین کی کوئی چھوٹی یا بڑی خدمت کر کے کوئی شخص نہ اللہ و رسول پر کوئی احسان کرتا، نہ دین پر، بلکہ وہ خود اپنے اوپر احسان کرتا ہے کہ اپنی عاقبت سنوارتا ہے۔ احسان، درحقیقت، اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے کہ وہ اس کو اپنے دین کی خدمت کی توفیق دے کر اس کے لیے ابدی فیروزمندی کی راہ کھولتا ہے۔"

قرآنیات

امین احسن اصلاحی

سورۃ الحجرات

(۷)

آیات ۱۴—۱۸ کا مضمون

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں ان لوگوں کے باطن سے پردہ اٹھایا ہے جن کے رویہ پر ابتدائی پانچ آیات میں نکیر فرمائی ہے۔ وہاں ہم اشارہ کر آئے ہیں کہ اطرافِ مدینہ کے بعض قبائل اسلام کی ابھرتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر مسلمانوں میں شامل تو ہو گئے تھے لیکن مرکز سے دور ہونے کے باعث ان کی تربیت اچھی طرح نہیں ہوئی تھی۔ اس وجہ سے وہ اس زعم میں مبتلا تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام پر ان کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ وہ بغیر لڑے بھڑے اسلام میں داخل ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ جب وہ اپنے آپ کو اللہ و رسول کا محسن گمان کیے ہوئے بیٹھے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ادب و احترام کس طرح ملحوظ رکھ سکتے تھے جو ایمان کا متقضی تھا، چنانچہ ان سے اس طرح کی باتیں صادر ہو جاتی تھیں جن پر ابتدائی آیات میں گرفت فرمائی گئی ہے لیکن اندازِ خطاب عام ہی رہا تا کہ جن کے اندر بھی یہ خامیاں ہوں، وہ ان کی اصلاح کریں۔ چنانچہ یہ صورتِ حال جن باتوں کی تعلیم کی متقضی ہوئی، وہ بتا دی گئیں۔ اب آخر میں، ان کے نام کی تصریح کے ساتھ ان کی اصل بیماری کا پتا دے دیا، تا کہ وہ اس کے علاج کی طرف متوجہ ہوں، اس لیے کہ اس بیماری کے ہوتے ایمان کا نشوونما پانا ناممکن ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ۭ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَـيْـــًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۴)

اہلِ بدو نے کہا کہ ہم ایمان لائے۔ ان کو بتا دو کہ تم ایمان نہیں لائے ہاں، یوں کہو کہ ہم نے اطاعت کر لی اور ابھی ایمان تمھارے دلوں کے اندر داخل نہیں ہوا ہے۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو گے تو اللہ تمھارے اعمال میں سے ذرا بھی کم نہیں کرے گا۔ اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔"

'اعراب' سے مراد اطراف مدینہ کے وہی دیہاتی لوگ ہیں، جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے کہ یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کرتے ہیں تو آپ کو اس طرح خطاب کرتے ہیں جس طرح کوئی شخص اپنے برابر کے آدمی کو خطاب کرتا ہے۔ اگر کبھی آپ سے ملنے آتے ہیں تو آتے ہی ان کی خواہش ہوتی ہے کہ بلا تاخیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ملاقات کریں۔ یہاں تک کہ اگر آپ گھر کے اندر تشریف فرما ہوتے ہیں تو یہ انتظار کی زحمت اٹھانا گوارا نہیں کرتے بلکہ گھر کے باہر ہی سے آپ کو نام لے کر پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے اس گنوارپن میں جہاں تربیت سے محرومی کو دخل تھا، وہیں اس بات کو بھی دخل تھا کہ یہ لوگ اس وہم میں مبتلا تھے کہ انھوں نے بغیر کسی جنگ و جدال کے اسلام میں داخل ہو کر آپ کے اوپر احسان کیا ہے، جس کا صلہ ان کو یہ ملنا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اپنا اور اسلام کا محسن سمجھیں اور ہر موقع پر ان کی ناز برداری فرمائیں۔ ان لوگوں کی اسی ذہنیت پر یہاں ضرب لگائی جا رہی ہے۔

'قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا': فرمایا کہ یہ اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں۔ ان کے اس قول کا حوالہ یہاں محض ان کے اقرارِ ایمان کی حیثیت سے نہیں دیا گیا ہے بلکہ آگے کی آیات سے واضح ہو جائے گا کہ یہ بات وہ بطورِ اظہارِ احسان کہتے تھے یعنی وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر بات بات میں یہ احسان جتاتے تھے کہ انھوں نے ایمان قبول کر کے آپ کی عزت و شوکت بڑھائی ہے۔ اس وجہ سے وہ حق دار ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ ان کا لحاظ فرمائیں اور جو مشورے وہ دیں، ان کو بسر و چشم قبول کریں۔

'قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا': پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے ان کو جواب دلوایا گیا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ تمھارا یہ دعویٰ درست نہیں ہے کہ تم ایمان لائے ہو، البتہ یہ دعویٰ تم کر سکتے ہو کہ تم نے اطاعت کر لی ہے۔ لفظ 'اسلام' یہاں اپنے لغوی مفہوم یعنی ظاہری اطاعت کے معنی میں ہے۔ اسلام کا حقیقی مفہوم تو اپنے آپ کو بالکلیہ اپنے رب کے حوالے کر دینا ہے لیکن یہ مجرد ظاہری اطاعت کے معنی میں بھی آتا ہے اور یہاں یہ اسی دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ان

لوگوں کی نسبت ہم اوپر ظاہر کر چکے ہیں کہ دعوتِ ایمان سے زیادہ اسلام کی ابھرتی ہوئی سیاسی طاقت سے مرعوب ہو کر یہ لوگ مسلمانوں میں شامل ہو گئے تھے۔ اس وجہ سے ایمان کی روح ان کے دلوں میں ابھی نہیں اتری تھی، البتہ اسلام کے سیاسی اقتدار کے ماتحت یہ لوگ آ گئے تھے۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے جواب دیا کہ ایمان کا دعویٰ تو ابھی تمھیں زیب نہیں دیتا البتہ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ تم نے اسلام کے اقتدار کے سامنے سر جھکا دیا ہے۔ اس جواب کے اندر یہ بات مضمر ہے کہ جب تم نے اسلام کی سیاسی طاقت سے مرعوب ہو کر اطاعت کی ہے تو یہ چیز جتانے کی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ایک قسم کی مغلوبیت ہی ہے، بس یہ فرق ہے کہ تم بغیر مقابلہ کیے مغلوب ہو گئے اور یہ چیز ایسی نہیں ہے کہ اس کا احسان جتاؤ۔

'وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ' یعنی، ابھی اپنے ایمان کی حکایت زیادہ نہ بڑھاؤ۔ اس نے تمھارے دلوں کے دروازے پر دستک ضرور دی ہے، لیکن وہ دلوں کے اندر گھسا نہیں ہے۔ یہ ایمان اللہ کے ہاں معتبر نہیں ہے۔ اللہ کے ہاں معتبر ایمان وہ ہے جو رگ و پے میں اترے اور دل کو اپنے رنگ میں اس طرح رنگ لے کہ اس سے الگ ہو کر سوچنا اور کوئی عمل کرنا انسان کے لیے آسان نہ رہ جائے۔

'وَإِن تُطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَا يَلِتْكُم مِّنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا' یہ ان کے اظہارِ احسان پر تنبیہ ہے کہ اگر تم ایمان لائے یا تم نے اسلام کی کوئی خدمت کی تو اس کا احسان کیوں جتاؤ! اللہ تمھارے کسی عمل میں ذرا بھی کمی کرنے والا نہیں ہے بلکہ ہر چھوٹے بڑے عمل کا بھرپور صلہ دینے والا ہے۔ ایک کرو گے، ستر پاؤ گے۔ تمھارا ہر عمل تمھارے ہی کام آنے والا ہے، خدا کے کام آنے والا نہیں ہے تو جب تم اپنا ہی کام کر رہے ہو تو اس کا احسان اللہ اور رسول پر کیوں رکھتے ہو!

'إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ' اللہ تعالیٰ بڑا ہی غفور رحیم ہے۔ وہ تمھاری کوتاہیوں اور خامیوں سے درگزر فرمائے گا، صلہ دینے میں ذرا بھی کمی نہیں کرے گا۔ اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ تمھارے اعمال کی قیمت کم کرنے کے لیے تمھارے چھوٹے چھوٹے نقائص کو بہانہ بنائے۔

اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ اگر اب تک تمھارے ذہن میں یہ غلطی سمائی رہی ہے کہ اسلام کے لیے تم نے جو کچھ کیا یہ اللہ اور رسول پر تمھارا احسان ہے تو اب اس تنبیہ کے بعد تم اس غلطی کی اصلاح کرو اور اللہ سے مغفرت مانگو۔ وہ تمھاری مغفرت فرمائے گا۔ وہ بڑا ہی بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ﴿١٥﴾

"مومن تو بس وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر شک میں نہیں پڑے اور اپنے مال اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا یہی لوگ سچے ہیں۔"

فرمایا کہ محض دعویٰ ایمان سے اللہ کے نزدیک مومن نہیں بن سکتا۔ حقیقی مومن اللہ کے نزدیک وہی ہیں جو اللہ اور رسول پر صدق دل سے ایمان لائے پھر شک و تذبذب میں مبتلا نہیں ہوئے، بلکہ مال و جان دونوں سے اللہ کی راہ میں برابر جہاد کیا۔ اپنا مال بھی دین کی تقویت و تائید کے لیے صرف کیا اور جان قربان کرنے کی نوبت آئی تو اس سے بھی دریغ نہیں کیا۔ فرمایا کہ یہی لوگ اپنے دعویٰ ایمان میں سچے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان کا دعویٰ تو بڑی بلند آہنگی سے کرتے ہیں لیکن اپنے تذبذب کے سبب سے اس راہ میں نہ کوئی چوٹ کھانے کے لیے تیار ہیں اور نہ جان و مال کی قربانی کا کوئی حوصلہ رکھتے ہیں، وہ محض دکھاوے کے مجنوں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

یہاں غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ 'جَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ' کا ٹکڑا ان کے عدم تذبذب کی شہادت کے طور پر آیا ہے۔ ایک شخص اگر ایک نصب العین کے لیے جان و مال کی قربانی سے دریغ نہیں کرتا تو یہ ایک ناقابل انکار شہادت اس بات کی ہے کہ اس کو اس نصب العین کی صداقت پر پورا یقین ہے اور اگر وہ اس کی خاطر نہ مال قربان کرنے پر تیار ہے نہ اپنی جان کو کسی خطرے میں ڈالنے کا حوصلہ رکھتا ہے تو اگرچہ وہ اس کے عشق میں کتنی ہی لاف زنی کرے لیکن اس کا عمل گواہ ہے کہ وہ اس کے باب میں ابھی مبتلائے شک ہے۔

قُلْ أَتُعَلِّمُونَ اللَّهَ بِدِينِكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿١٦﴾

"کہو، کیا تم اللہ کو اپنے دین سے آگاہ کر رہے ہو! حالانکہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔"

یعنی یہ لوگ بڑے سرپرستانہ انداز میں کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں۔ ان سے پوچھو کہ کیا تم اللہ کو اپنے دین سے آگاہ کرتے ہو؟ اگر یہ لوگ اللہ کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں تو ان کو جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کو جانتا ہے وہ ظاہر و باطن سے باخبر ہے۔ مخفی سے مخفی چیز کو بھی جانتا ہے وہ ہر بات سے باخبر ہے کوئی چیز بھی اس سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے

کہ اگر ان لوگوں کو اپنے ایمان پر ناز ہے تو اس پر وہ کسی ایسے کے سامنے ناز کریں جو ان کے دین و ایمان سے بے خبر ہو۔ اس کے سامنے ناز کرنے سے کیا فائدہ جو اس کائنات کے ہر سِرّ و علانیہ سے اچھی طرح آگاہ ہے۔ کیا جو ہر چیز سے آگاہ ہے، وہ ان کے ایمان کے طول و عرض سے آگاہ نہیں ہو گا۔

يَمُنُّونَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ [۱۷]

"یہ تم پر احسان رکھتے ہیں کہ یہ لوگ اسلام لائے۔ کہہ دو کہ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان رکھتے ہو، بلکہ یہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تم کو ایمان کی توفیق بخشی، اگر تم سچے ہو۔"

ان لوگوں کے دعوٰیِ ایمان کی قلعی کھولنے کے بعد ان کے دعوٰیِ اسلام کی حقیقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے واضح فرمائی کہ یہ لوگ تمھارے اوپر احسان جتاتے ہیں کہ وہ اسلام لاتے۔ یعنی، ان کا زعم یہ ہے کہ اسلام لا کر انھوں نے پیغمبر کی عزت بڑھائی اور اسلام کی قوت و شوکت بخشی، اس وجہ سے وہ پیغمبر اور اسلام، دونوں کے محسن ہیں اور پیغمبر کا فرض ہے کہ وہ ان کے اس احسان کا احترام کریں۔ فرمایا کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم لوگ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ جتاؤ۔ اگر تم فی الواقع اپنے دعوے میں سچے ہو تو تمھارا احسان میرے اوپر نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان تمھارے اوپر ہے کہ اس نے تمھیں ایمان کی توفیق بخشی۔ 'اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ' کے الفاظ پر نظر رہے۔ یعنی اوّل تو تمھارا ایمان و اسلام کا دعوٰی ہی محض لاف زنی ہے، اور اگر تمھاری بات میں کچھ صداقت ہے تو تمھیں اللہ کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے تمھیں اس کی توفیق بخشی۔ 'ھدایت' کے بعد 'ل' کا صلہ دلیل ہے کہ یہ لفظ یہاں 'توفیق' کے مضمون پر متضمن ہے۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ دین کی کوئی چھوٹی یا بڑی خدمت کر کے کوئی شخص نہ اللہ و رسول پر کوئی احسان کرتا، نہ دین پر، بلکہ وہ خود اپنے اوپر احسان کرتا ہے کہ اپنی عاقبت سنوارتا ہے۔ احسان، درحقیقت، اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے کہ وہ اس کو اپنے دین کی خدمت کی توفیق دے کر اس کے لیے ابدی فیروزمندی کی راہ کھولتا ہے۔ یہاں اس بات پر بھی نظر رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ جواب نہیں دلوایا گیا کہ تم لوگ اپنے ایمان و اسلام کا احسان مجھے نہ جتاؤ، بلکہ میرا احسان تمھارے اوپر ہے کہ میں نے تمھارے سامنے ہدایت کی راہ کھولی۔ اگر یہ جواب دلوایا جاتا تو اس کا ایک محل تھا، لیکن نبی جو کچھ کر سکتا ہے، وہ صرف اتنا ہی ہے کہ وہ لوگوں کو ہدایت کی راہ پر لانے کے لیے اپنی ساری طاقت صرف کر دے، لیکن لوگوں کو ہدایت کی توفیق دینا اس کے اختیار

میں نہیں ہے۔ اس کی توفیق بخشنا صرف اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے' اور معاملہ کا سارا انحصار اسی توفیق بخشی پر ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (۱۸)

"اللہ جانتا ہے آسمانوں اور زمین کے سارے غیب کو، اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔"

یہی آیت ۱۶ والا مضمون ایک دوسرے اسلوب سے بیان فرمایا کہ اپنے ایمان و اسلام کو زیادہ بتانے اور جتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ آسمانوں اور زمین کے سارے بھیدوں کو خود جانتا ہے اور یہ یاد رکھو کہ اللہ تمھارے سارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اصل چیز دعویٰ نہیں، بلکہ عمل ہے۔ اگر عمل کرو گے تو تمہارا دعویٰ بغیر اظہار و اعلان کے اللہ کے ہاں ثابت ہو جائے گا اور اگر عمل نہیں کرو گے تو زبان سے کتنا ہی دعویٰ کرو، یہ بالکل بے حقیقت و بے سود ہو گا۔

دعوتی ذمہ داری

دنیا کا سیلاب اس لیے آتا ہے کہ وہ ہم کو قیامت کے زیادہ بڑے سیلاب کا نقشہ دکھائے۔ حقیقت یہ ہے کہ قیامت اسی طرح کا ایک بہت بڑا سیلاب ہے جیسا سیلاب ہر سال ہماری زمین پر آتا ہے، اور بستیوں اور آبادیوں کو تہس نہس کر دیتا ہے۔ یہ آنے والا سیلاب جب آئے گا تو ہمارے تمام حفاظتی بند ٹوٹ جائیں گے۔ وہ ہم کو اس طرح گھیر لے گا کہ پہاڑ کی چوٹیاں بھی اس کے مقابلے میں ہم کو پناہ دینے سے عاجز رہیں گی۔

دنیا کے سیلاب میں وہی شخص بچتا ہے جس نے اس کے آنے سے پہلے اپنے لیے کشتیاں بنالی ہوں۔ اسی طرح آخرت کے سیلاب میں صرف وہ شخص بچے گا جس نے اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دیا ہو، جو خدا کی کشتی میں سوار ہو گیا ہو۔

آج دنیا کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ قیامت کے آنے والے اس سیلاب سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے۔ خدا نے اپنے پیغمبر اسی لیے بھیجے تاکہ وہ دنیا والوں کو اس آنے والے سیلاب سے خبردار کریں، اس وقت سے پہلے جب خدا لوگوں کو پکڑے۔ تاکہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ہو کہ ہم کو ایک ایسے معاملے میں پکڑا جا رہا ہے جس کے بارے میں ہمیں اس سے پہلے کچھ بتایا نہیں گیا تھا۔

اب کوئی نبی آنے والا نہیں۔ مگر یہ کام بدستور اپنی جگہ باقی ہے۔ ختم نبوت کے بعد امت مسلمہ اسی خاص کام پر مامور ہے۔ اس کی لازمی ذمہ داری ہے کہ وہ تمام قوموں کو اس سے باخبر کرے قبل اس کے کہ خدا کا وہ سیلاب پھٹ پڑے اور پھر نہ کسی کے لیے خبردار کرنے کا موقع ہو اور نہ کسی کے لیے خبردار ہونے کا۔

دین کامل

ترتیب : معز امجد

"آپ اگر اس حدیثِ قطعی کو واقعی آیتِ مداینہ کی تشریح سمجھتے ہیں، تو پھر آپ کی یہ ذمہ داری ہے کہ قرآنِ مجید کے الفاظ سے بھی وہ تشریح و تبیین کر کے دکھایئے جو اس حدیثِ صحیح میں بیان ہوئی ہے۔ آپ خود جس آیت کو آیتِ مداینہ فرما رہے اور جس کے بارے میں آپ ہی کے الفاظ یہ ہیں کہ "آیتِ مبارکہ میں قرض اور لین دین کے بارے میں بہت سی ہدایات بیان کی ہیں"، اسی کے الفاظ سے یہ بات بھی نکال کر دکھا دیجیے کہ یہاں چوری، قتل اور دوسرے جرائم کے بارے میں نصابِ شہادت بیان ہوا ہے، اور یہ بتایا گیا ہے کہ اگر قتل کا کوئی مقدمہ تمھارے سامنے پیش ہو، تو اس میں کم از کم دو مردوں یا چار عورتوں کی گواہی لو۔ اور اگر ایسا کرنا ممکن نہیں تو پھر قرآنِ مجید کی اس واضح آیت کی روشنی میں اس حدیث پر غور فرمایئے۔ یہی وہ طریقہ ہے جسے اپنانے سے قرآنِ مجید کو واقعی حق و باطل کی میزان اور فرقان کی حیثیت حاصل ہو گی۔"

تفہیمات

معز امجد

عورت کی گواہی

"فکر و نظر" کے شمارہ جنوری، مارچ ۱۹۹۳ء میں پروفیسر ڈاکٹر محمود احمد صاحب غازی کا ایک مضمون بعنوان "حدود و قصاص کے مقدمات میں عورت کی گواہی" طبع ہوا، مذکورہ مضمون سے متعلق ہم نے "فکر و نظر" کے مدیر کی وساطت سے محترم ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں چند معروضات پیش کیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ہماری ان معروضات کا جواب مرحمت فرما دیا، جس پر ہم نے کچھ مزید اشکالات پیش کیے۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اس علمی بحث کو ہم اپنے قارئین کے افادہ کے لیے معمولی حک و اضافہ کے ساتھ نقل کر رہے ہیں۔ (مرتب)

—۱—

محترم مدیر فکر و نظر،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

"ادارہ تحقیقاتِ اسلامی" کے سہ ماہی مجلہ 'فکر و نظر' جنوری - مارچ ۱۹۹۳ کا شمارہ دیکھنے کا موقع ملا۔ "حدود و قصاص کے مقدمات میں عورتوں کی گواہی" کے زیرِ عنوان ڈاکٹر محمود احمد صاحب غازی کی تحقیقات پڑھیں۔ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ تقلید اور جمود کے اس تاریک دور میں بھی کچھ لوگ قرآن و سنت پر براہِ راست غور کرتے اور اسی بات کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن و سنت کی میزان پر پوری اترتی اور دین کے انھی دو مآخذ سے ثابت ہوتی ہے۔ یقیناً، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اپنے بزرگوں کی بات قرآن و سنت کی سند کے بغیر ماننا اور اسی پر جم جانا، درحقیقت علم کی اس روح ہی کے خلاف ہے جو انھی بزرگوں سے ہم کو ملی اور جو، بجا طور پر، ہمارا سرمایۂ افتخار ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے اور ہر صحیح بات کو دلوں میں اتار دے۔

مذکورہ تحریر کے آخر میں ڈاکٹر صاحب نے، نکات کی صورت میں، اپنی رائے کا جو خلاصہ بیان فرمایا

ہے، اس میں پہلی اور تیسری بات سے ہم اتفاق کرتے ہیں، جبکہ دوسری اور چوتھی بات کے بارے میں، آپ کی وساطت سے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں چند معروضات پیش کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے:

> ۲۔ البتہ قرآن پاک اور سنتِ رسولِ خدا کی قطعی نصوص کی بنیاد پر، دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہوگی۔

اس معاملے میں، ڈاکٹر صاحب نے 'اگرچہ قرآنِ مجید اور سنتِ رسول کی قطعی نصوص کا اپنی تحریر میں ذکر تو نہیں کیا، مگر، چونکہ یہ معاملہ فقہا کے مابین مختلف فیہ نہیں ہے، اس وجہ سے، ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ انھوں نے اپنی رائے کی بنا سورۂ بقرہ کی اسی آیت پر رکھی ہے، جسے بنیاد بنا کر فقہا نے عورت کی آدھی گواہی کے بارے میں رائے قائم کی ہے۔

سورۂ بقرہ کی آیت ۲۸۲ پر غور کرنے سے چند باتیں، بالکل واضح طور پر سامنے آتی ہیں:

۱۔ پوری آیت میں مسلمانوں کو انفرادی حیثیت میں خطاب کیا گیا ہے۔ ریاست یا عدالت کو خطاب کر کے یہ نہیں کہا گیا کہ: 'جب قرض کے لین دین کا کوئی مقدمہ تمھارے سامنے پیش ہو، تو دیکھو، یہ معاملہ لکھا گیا ہے یا نہیں، اور اس پر دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی ثبت کی گئی ہے یا نہیں....' اس وجہ سے ہمارے نزدیک، آیت میں جو ہدایات دی گئی ہیں، ان کا قانون سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ محض معاشرتی ہدایات ہی ہیں۔ آیت کے الفاظ: 'وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ'[1]، 'وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ'[2] 'وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ'[3]، 'وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا'[4] اور 'وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا'[5] سے بالبداہت واضح ہے کہ یہ احکام معاشرتی ہدایات ہی ہیں۔ انھی ہدایات میں 'وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ'[6] کی ہدایت بھی دی گئی ہے۔ چنانچہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ بھی ایک معاشرتی ہدایت ہی ہے جس کا قانون و عدالت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس بات کی تائید 'أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا

---

[1] 'اور تمھارے درمیان، اس معاملے کو، کوئی لکھنے والا، عدل کے ساتھ لکھے'۔

[2] 'اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے'۔

[3] 'اور اسے وہ لکھائے، جس پر حق عائد ہوتا ہے'۔

[4] 'اور وہ اس میں کوئی کمی نہ کرے'۔

[5] 'اور گواہوں کو جب بلایا جائے، تو وہ آنے سے انکار نہ کریں'۔

[6] 'اور اس پر اپنے میں سے دو مردوں کو گواہ ٹھہرا لو، اور اگر دو مرد نہ ہوں، تو ایک مرد اور دو عورتیں سہی'۔

الْاُخْرٰی[1] اور ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَرْتَابُوْۤا[2] کے الفاظ سے بھی ہو رہی ہے۔ چنانچہ، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان اپنے لین دین کے معاملات میں، ان ہدایات کا خیال رکھیں، تو یہ ان کے لیے خیر و برکت ہی کا باعث ہوگا اور فریقین نہ صرف نقصان اٹھانے سے محفوظ رہیں گے، بلکہ عند اللہ، اپنا اجر بھی محفوظ پائیں گے۔ لیکن، اگر کوئی شخص ان ہدایات کا خیال نہیں رکھتا، تو اس سے اگرچہ عدالت کو صحیح فیصلہ کرنے میں مشکل پیش آسکتی ہے، مگر، بہرحال، مقدمہ اپنے طریقے پر چلے گا، اور قاضی اپنے اطمینان پر فیصلہ بھی سنائے گا۔ مثال کے طور پر، اگر فریقین اپنے معاملے کو تحریر ہی نہیں کرتے، اور جھگڑے کی صورت میں، عدالت کے دروازے پر دستک دیتے ہیں، تو ظاہر ہے کہ عدالت صرف اس بنیاد پر کہ معاملہ تحریر نہیں کیا گیا، مقدمہ خارج نہیں کردے گی، بلکہ دوسرے آثار و شواہد کی بنیاد پر، جس فیصلے پر مطمئن ہو جائے گی، وہ سنا دے گی۔ اسی طرح، اگر ایک عورت کو گواہ بنایا گیا ہے، اور وہ بغیر الجھے، عدالت میں گواہی دیتی اور قاضی کو مطمئن کر دیتی ہے، تو کیا مجرد اس بنیاد پر اس کی گواہی قبول نہ کی جائے گی کہ وہ ایک عورت ہے اور اس کے ساتھ، کوئی اور عورت یا مرد گواہی کے لیے موجود نہیں؟ اس کے برعکس، اگر مرد اپنی گواہی میں الجھ جائیں، اور قاضی کو مطمئن نہ کر سکیں، تو کیا مجرد اس بنیاد پر ان کے حق میں فیصلہ کر دیا جائے گا کہ وہ مرد ہیں؟ بالبداہت واضح ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ہدایات، اسی وجہ سے دی ہیں کہ "اَلَّا تَرْتَابُوْۤا"[3] چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر، کسی موقع پر، ان ہدایات کا خیال نہیں رکھا گیا، مگر، کسی اور ذریعے سے عدالت حتمی فیصلے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی ہے، تو ان ہدایات کا مقصود پورا ہو جائے گا، اگرچہ ان ہدایات کا خیال رکھنے سے عدالت کے لیے صحیح فیصلہ کرنا بہت آسان اور، کافی حد تک، یقینی ہو جاتا۔

۲۔ آیت زیر بحث کا تعلق دستاویزی شہادت ہی سے ہے۔ اس کے احکام کو واقعاتی شہادت پر قیاس کرنا عقلاً غلط ہے۔ ظاہر ہے، دستاویز لکھتے وقت تو ہمارے پاس اختیار ہوتا ہے کہ ہم جسے چاہیں گواہ بنالیں، جب کہ زنا، قتل، چوری، ڈاکے اور رہزنی وغیرہ جیسے واقعات میں گواہوں کے انتخاب کا

---

[1] "کہ ایک بھول جائے، تو دوسری یاد دلا دے۔"

[2] "یہ ہدایات، اللہ کے نزدیک، زیادہ قرین عدل، گواہی کو زیادہ ٹھیک رکھنے والی اور اس امر کے زیادہ قرین قیاس ہیں، کہ تم شبہات میں نہ پڑو۔"

[3] "کہ تم شبہات میں نہ پڑو۔"

اختیار ہمارے پاس نہیں ہوتا۔ وہی لوگ گواہ کی حیثیت سے پیش ہو سکتے ہیں، جو اتفاقاً موقع پر موجود ہوں، خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں، اور خواہ ان کی تعداد کچھ بھی ہو۔ چنانچہ، یہ کہنا تو صحیح ہو سکتا ہے کہ دستاویز لکھتے وقت دو بالغ لوگوں کی گواہی لی جائے، مگر یہ کہنا ہرگز صحیح نہیں ہوگا کہ قتل کا مقدمہ دو بالغ مردوں یا عورتوں کی گواہی سے ثابت ہوگا۔ یہاں تو گواہ کی حیثیت سے وہی پیش ہوں گے، جو موقع پر موجود تھے۔ خواہ وہ بچے ہوں، بوڑھے ہوں، یا جوان۔ اگر قاضی ان کی گواہی پر مطمئن ہو جائے گا، تو اس کے مطابق فیصلہ کر دے گا، اور اگر مطمئن نہیں ہوگا، تو دس مردوں کی گواہی کو رد کرتے ہوئے ملزم کے حق میں فیصلہ سنا دے گا یہی معاملہ حالات و قرائن کا بھی ہے۔

اس ساری بحث کو پیش نظر رکھتے ہوئے بقرہ کی آیت ۲۸۲ پر نظر ڈالیے، تو اس کے متعلقہ حصے کا سادہ مفہوم یوں ہوگا:

"اے ایمان والو، جب تم کسی معین مدت کے لیے قرض کے لین دین کا کوئی معاملہ کرو، تو آئندہ اٹھنے والے جھگڑوں سے بچنے کے لیے، اسے لکھ لیا کرو، اور اس تحریر پر دو لوگوں کی گواہی لے لیا کرو۔ چونکہ گواہوں کا اختیار تمھارے اختیار میں ہے، اس لیے مردوں ہی کو گواہ بناؤ، تاکہ اگر عدالت میں جانا پڑے تو، خواہ مخواہ، عورتیں اس مصیبت میں نہ پھنسیں۔ اور اگر دو مرد نہ ہوں، تو ایک مرد کی جگہ دو عورتیں گواہ کے طور پر رکھ لو۔ تاکہ خانہ دار عورت، اگر عدالت کے اجنبی ماحول سے گھبرا کر الجھ جائے، تو دوسری اس کا سہارا بنے اور اسے یاد دلا دے۔"

اس ساری بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بقرہ کی آیت ۲۸۲ کی بنیاد پر یہ کہنا کہ اسلامی قانون میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے، کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔ یہ آیت دستاویزی شہادت ہی سے متعلق ہے۔ واقعاتی شہادت کا اس آیت سے نہ کوئی تعلق ہے اور نہ واقعاتی شہادت کے احکام کو دستاویزی شہادت کے احکام پر قیاس کرنا ہی درست ہے۔ مزید براں، آیۂ زیر بحث کے احکام کی حیثیت ایک معاشرتی ہدایت ہی کی ہے، جس کا قانون و عدالت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے:

> ۴۔ "زنا بالجبر کو حرابہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ زنا، زنا ہے چاہے بالرضا ہو یا بالجبر، البتہ زنا بالرضا کی صورت میں فریقین اور بالجبر کی صورت میں صرف جبر کرنے والا فریق مستوجب سزا ہوگا۔"

اس معاملے میں، سب سے پہلے تو ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ اس نکتے کا ڈاکٹر صاحب کی ساری بحث سے کوئی تعلق ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس میں کوئی شبہ ہی نہیں کہ زنا، زنا ہے، بالرضا ہو یا

بالجبر جس طرح قتل، قتل ہے، خواہ ایک شخص غیرت و غصے میں آ کر کسی دوسرے کو قتل کر دے یا کسی بس اسٹاپ پر بم نصب کر دے، جس سے بیسوں بچے، بوڑھے اور جوان، بلا امتیاز، ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔

اس معاملے میں، البتہ، عصر حاضر کے ایک جید عالم اور مفسر قرآن، مولانا امین احسن اصلاحی نے سورۂ مائدہ کی آیت حرابہ (۳۳-۳۴) کے تحت لکھا ہے:

"اللہ و رسول سے محاربہ یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ یا جتھہ جرأت و جسارت، ڈھٹائی اور بے باکی کے ساتھ، اس نظام حق و عدل کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرے، جو اللہ اور رسول نے قائم فرمایا ہے۔ اس طرح کی کوشش، اگر بیرونی دشمنوں کی طرف سے ہو، تو اس کے مقابلے کے لیے جنگ و جہاد کے احکام تفصیل کے ساتھ الگ بیان ہوئے ہیں۔ یہاں بیرونی دشمنوں کے بجائے، اسلامی حکومت کے ان اندرونی دشمنوں کی سرکوبی کے لیے تعزیرات کا ضابطہ بیان ہو رہا ہے، جو اسلامی حکومت کی رعایا ہوتے ہوئے، عام اس سے کہ وہ مسلم ہیں یا غیر مسلم، اس کے قانون اور نظم کو چیلنج کریں۔ قانون کی خلاف ورزی کی ایک شکل تو یہ ہے کہ کسی شخص سے کوئی جرم صادر ہو جائے۔ اس صورت میں اس کے ساتھ شریعت کے عام ضابطۂ حدود و تعزیرات کے تحت کارروائی کی جائے گی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لینے کی کوشش کرے، اپنے شر و فساد سے علاقے کے امن و نظم کو درہم برہم کر دے، لوگ اس کے ہاتھوں ہر وقت اپنی جان، مال، عزت، آبرو کی طرف سے خطرے میں مبتلا رہیں۔ قتل، ڈکیتی، رہزنی، آتش زنی، اغوا، زنا، تخریب، ترہیب اور اس نوع کے سنگین جرائم، حکومت کے لیے لا اور آرڈر کا مسئلہ پیدا کر دیں۔ ایسے حالات سے نپٹنے کے لیے عام ضابطۂ حدود و تعزیرات کے بجائے اسلامی حکومت (یہ) اقدامات کرنے کی مجاز ہے۔" (تدبر قرآن، ج ۲، ص ۵۰۵)

اس اقتباس سے واضح ہے کہ مولانا کے نزدیک، جرائم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ کسی شخص سے قتل، زنا، چوری یا اس قبیل کا کوئی جرم صادر ہو جاتا ہے اور دوسرا یہ کہ یہی جرائم ایسی صورت دھار لیتے ہیں، جس سے علاقے کا امن و امان اور نظم و نسق درہم برہم ہو جاتا اور ریاست کے شہری اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کی طرف سے خطرے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ چوری، ڈاکے کی شکل دھار لیتی، قتل تخریب کاری بن جاتا اور زنا، اغوا اور اجتماعی عصمت دری کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی کے نزدیک، ان صورتوں میں، اگرچہ چوری، چوری ہی رہتی، قتل، قتل ہی رہتا ہے، مگر اب چونکہ یہ جرائم کسی

ایک فرد کے خلاف نہیں، بلکہ پورے معاشرے کے خلاف ہیں، جن کے ذریعے سے ریاست کے امن و امان اور لوگوں کے سکھ چین کو برباد کیا گیا ہے، اس وجہ سے ان مجرموں کو پہلی قسم کے جرائم کے تحت سزائیں دینے کے بجائے ملک میں فساد مچانے یا حرابہ یا محاربہ کے قانون کے تحت سزائیں دی جانی چاہییں۔

ڈاکٹر صاحب سے ہماری گزارش ہے کہ وہ خود اس بات پر غور کریں کہ ایک شخص، چپکے چپکے کسی گھر میں داخل ہوتا اور جو چیز بھی ہاتھ لگتی، اسے لے اُڑنے کی کوشش کرتا ہے، جبکہ دوسری طرف ایک گروہ گھر والوں کو زدوکوب اور ہراساں کرتا، ان کی قیمتی اشیا انھی کے ہاتھوں نکلواتا اور اسلحہ لہراتے ہوئے فرار ہو جاتا ہے۔ اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ دونوں صورتوں میں چوری ہی ہوئی ہے، مگر کیا دونوں مجرم ایک ہی قسم کی سزا کے مستحق ہیں؟ ایک شخص غیرت و غصے میں آکر کسی دوسرے کی جان لے لیتا ہے، جبکہ ایک دوسرا شخص، بغیر کسی ذاتی رنجش و دشمنی کے مسجد میں گھس کر نہتے نمازیوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دیتا ہے، جس سے بچے، بوڑھے اور جوان، بلا امتیاز ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ بے شک دونوں صورتوں میں قتل ہی ہوا ہے، مگر کیا ان دونوں مجرموں کے ساتھ ایک جیسا سلوک ہونا چاہیے؟ ایک مرد و عورت جذبات میں آکر زنا کر بیٹھتے ہیں، جبکہ دوسری طرف ایک درندہ صفت آدمی ایک معصوم بچی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا ڈالتا یا ایک شریف زادی کو رسوا کر دیتا ہے۔ بہرحال دونوں صورتوں میں جرم تو زنا ہی کا ہوا ہے، مگر کیا قانون کی نظر میں یہ دونوں مجرم برابر ہوں گے؟ اسی طرح، ایک رکشہ چلانے والا ٹریفک کے قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے، اور دوسری طرف رکشہ ڈرائیوروں کی یونین، ٹریفک کے نظام کو معطل کرنے کے لیے، قانون کی خلاف ورزی کی مہم چلا دیتی ہے۔ کیا ان دونوں کے ساتھ ایک ہی طرح نمٹا جائے گا؟ ہمیں یقین ہے کہ ڈاکٹر صاحب بھی ان سب سوالوں کا جواب نفی ہی میں دیں گے۔ چنانچہ، ہمارے نزدیک، زنا بالجبر کی بہت سی صورتیں ایسی ہیں جو، بے شک، حرابہ ہی میں شامل ہوں گی، اور ہونی چاہییں۔

ڈاکٹر صاحب سے ہماری گزارش ہے کہ ہماری ان معروضات پر ضرور غور کریں اور اپنے نتائج فکر سے ہمیں آگاہ فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ لغزشوں سے درگزر فرمائے، صحیح باتوں کے لیے دلوں میں جگہ پیدا کرے، اور اگر کوئی غلط بات سرزد ہو گئی ہو، تو اس کے ضرر سے ہم سب کو محفوظ رکھے۔

والسلام

معز امجد

—۲—

الاکادمیۃ الدعوۃ

الجامعۃ الاسلامیۃ العالمیہ باسلام آباد، پاکستان

برادر مکرم و محترم ڈاکٹر صاحبزادہ ساجد الرحمٰن صاحب[1]

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۹۹۳ء کو موصول ہوا۔ ابتدا میں میرا خیال تھا کہ میں جناب معز امجد صاحب کے اٹھائے ہوئے نکات کے بارے میں ایک مفصل تحریر تیار کروں لیکن بعد میں یہ خیال ہوا کہ مفصل تحریر کے لیے جس یکسوئی اور فرصت کی ضرورت ہے، وہ سر دست میسر نہیں، اور اس کے انتظار میں خاصا وقت گزر جانے کا امکان ہے۔ اس لیے، مختصراً، چند گزارشات پیش خدمت ہیں:

میں المورد کے شعبہ تصنیف و تالیف کے فاضل رکن، معز امجد صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے حدود و قصاص کے مقدمات میں عورتوں کی گواہی کے زیرِ عنوان میری ناچیز تحریر کا مطالعہ فرمایا اور اس کے بارے میں حوصلہ افزا خیالات ظاہر فرمائے۔ انھوں نے مذکورہ بالا تحریر میں اخذ کردہ بعض نتائج سے اختلاف کیا ہے، جن کو میں نے تحریر کے آخر میں نکات کی شکل میں بیان کیا تھا۔ انھوں نے خواہش ظاہر کی ہے کہ ان کے فرمودات پر غور کر کے، میں اپنی ناچیز رائے ان دونوں نکات کے بارے میں عرض کروں:

۱۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ پاک اور سنتِ رسولِ خدا کی قطعی نصوص کی بنیاد پر، دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہو گی۔ میرے نزدیک اس معاملہ میں نصِ قطعی کے ہونے یا نہ ہونے کی بحث میں جانے سے پہلے، جو بات سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے، وہ یہ ہے کہ دورِ صحابہ سے لے کر آج تک، یہ مسئلہ کبھی بھی مختلف فیہ نہیں رہا کہ دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کی گواہی کے برابر قرار دیا جائے۔ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں صحابہ اور تابعین کے جو اقوال اور فتاویٰ دستیاب ہیں، ان میں کوئی ایک رائے بھی ایسی نہیں ملی، جس میں ہر معاملے میں، عورتوں کی گواہی کو مطلقاً مردوں کے برابر قرار دیا گیا ہو۔

ممکن ہے بعض حضرات اس بات کو کوئی اہمیت نہ دیتے ہوں، لیکن میری رائے میں قرآنِ مجید اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعبیر و تشریح کے معاملے میں، امت کے تعامل اور متفقہ نقطۂ نظر سے صرفِ نظر کرنا درست نہیں۔ اگر سورۂ بقرہ کی آیت مداینہ (البقرہ ۲۸۲) کا وہ مفہوم ہوتا، جو جناب معز

---

[1] مدیر سہ ماہی فکر و نظر، اسلام آباد۔

صاحب نے بیان فرمایا ہے، تو کسی صحابی، تابعی یا فقیہ کا ذہن اس طرف ضرور گیا ہوتا۔

جہاں تک سنتِ رسول کا تعلق ہے، تو بخاری، مسلم اور دوسری متعدد کتب حدیث میں بیان کردہ وہ روایت بڑی بنیادی حیثیت رکھتی ہے، یعنی وہ روایت، جس میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کے اجتماع سے گفتگو فرماتے ہوئے ان کو یہ بات یاد دلائی کہ ان میں سے دو کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے۔ اگر اس آیتِ کریمہ کا وہ مفہوم ہوتا، جو جناب معز امجد نے بیان فرمایا ہے، تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بھی اس عمومی انداز میں دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کے برابر نہ قرار دیتے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ آیتِ مداینہ سے وہ مفہوم نکل سکتا ہے، جو فاضل تبصرہ نگار نے بیان فرمایا ہے، تب بھی مذکورہ بالا حدیث کی موجودگی میں، اس مفہوم کو اختیار کرنے کی کوئی گنجایش نہیں رہتی۔

اگر حدیثِ صحیح، قرآن کی شارح اور مفسر ہے، اور یقیناً ہے، تو آخر کس بنیاد پر آیتِ مداینہ کی تعبیر و تشریح میں اس حدیثِ قطعی کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ ناچیز کو اس سے اختلاف ہے کہ آیتِ زیرِ بحث کا تعلق محض دستاویزات سے ہے۔ اس لیے کہ آیتِ مبارکہ میں قرض اور لین دین کے بارے میں بہت سی ہدایات بیان کی گئی ہیں، جن میں ایک دستاویز کی تیاری کے بارے میں بھی ہے۔

راقم الحروف کا عرض کردہ ایک نکتہ جس سے اختلاف کیا گیا ہے، یہ ہے کہ زنا بالجبر کو حرابہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یہ درست ہے کہ اس کا مضمون میں بیان کردہ بحث سے کوئی ربط محسوس نہیں ہوتا، لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مضمون کے آغاز میں جو تعارفی نوٹ شامل ہونا تھا، وہ کسی وجہ سے شامل ہونے سے رہ گیا۔ یہ تحریر اسلامی نظریاتی کونسل میں زیرِ بحث ایک مسئلے کے بارے میں لکھی گئی تھی، جس میں حدود اور قصاص کے بارے میں عورتوں کی گواہی اور بالخصوص زنا بالجبر کے باب میں عورتوں کا معاملہ درپیش تھا۔ وفاقی شرعی عدالت نے اپنا ایک فیصلہ دیا تھا جس میں یہ قرار دیا تھا کہ زنا بالجبر، چونکہ حرابہ ہے، اس لیے اس کے ثبوت کے لیے چار گواہوں کی شرط ضروری نہیں، بلکہ دو گواہوں کی بنیاد پر بھی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ راقم الحروف کو اس رائے پر شرحِ صدر نہیں تھا، جس کا اظہار محولہ بالا نکتہ میں کیا گیا تھا۔

جہاں تک حضرت مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے اقتباس کا تعلق ہے اس میں جو بات ارشاد فرمائی گئی ہے، وہ یقیناً واقعی اور وزنی ہے، لیکن نہ مولانا محترم نے زنا بالجبر کو، مطلقاً محاربہ قرار دیا ہے اور نہ زنا بالجبر کی ہر صورت محاربہ میں شامل ہے۔

البتہ جیسا کہ مولانا اصلاحی نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر نظم کو درہم برہم کر دے اور لوگ، اس کے ہاتھوں، ہر وقت اپنی عزت و آبرو کی طرف سے خطرات میں مبتلا رہتے

ہوں اور وہ زنا بالجبر کا ارتکاب کر کے حکومت کے لیے لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا کر دے تو یقیناً یہ محاربہ کی ایک قسم ہے اور اس پر محاربہ سے متعلق سزاؤں کا اجرا ہوگا، لیکن زنا بالجبر کی جو تعریف پاکستان کے قانونِ تعزیرات میں کی گئی ہے، اس کی رو سے اس کی اکثر و بیشتر قسمیں حرابہ قرار نہیں دی جا سکتیں۔

والسلام

نیازمند

ڈاکٹر محمود احمد غازی

—۳—

محترم مدیر 'فکر و نظر'،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

'فکر و نظر'، اپریل - جون ۱۹۹۳ء کے شمارے میں حدود اور قصاص کے مقدمات میں عورتوں کی گواہی سے متعلق، ہم نے جو سوالات کیے تھے، ان کے بارے میں محترم ڈاکٹر محمود احمد صاحب غازی کا تبصرہ اور وضاحت پڑھنے کا موقع ملا۔

ہمیں، اگرچہ، اس بات کا پورا احساس ہے کہ ہمارے ممدوح ڈاکٹر صاحب اپنی تدریسی اور علمی و تحقیقی سرگرمیوں کی وجہ سے نہایت مصروف رہتے ہیں، مگر کیا کیجیے، ایک طالب علم کی حیثیت سے ہم بھی مجبور ہیں کہ جب تک، پوری تنقیح کے نتیجے میں، بات اچھی طرح واضح نہ ہو جائے طبیعت میں اضطراب اور دل میں خلجان رہتا ہے۔ چنانچہ، فقط بات کی وضاحت ہی کے لیے ہم آپ کی وساطت سے، ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں چند اور معروضات پیش کرنے کی جسارت کر رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنے قیمتی وقت میں سے چند گھڑیاں نکال کر ہماری ان معروضات پر بھی تبصرہ فرمائیں گے۔

ہم نے پہلی مرتبہ اپنی معروضات پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۸۲ کا تعلق دستاویزی شہادت ہی سے ہے۔ اس کے احکام کو واقعاتی شہادت پر قیاس کرنا، عقلاً غلط ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہماری اس بات کے جواب میں لکھتے ہیں: "ناچیز کو اس سے اختلاف ہے کہ آیت زیر بحث کا تعلق محض دستاویزی شہادت سے ہے۔ اس لیے کہ آیت مبارکہ میں قرض اور لین دین کے بارے میں بہت سی ہدایات بیان کی گئی ہیں، جن میں ایک دستاویز کی تیاری کے بارے میں بھی ہے۔"

اس سلسلے میں، سب سے پہلے تو ہماری معذرت قبول فرمائیے کہ ہم نے جو اصطلاحات استعمال کی

میں اس کی پوری طرح وضاحت نہ کر سکے۔ 'دستاویزی شہادت' یا 'واقعاتی شہادت' کو ہم نے یہاں قانونی اصطلاحات (Documentary Evidence And Circumstancial Evidence) کے طور پر استعمال نہیں کیا ہے۔ 'دستاویزی شہادت' سے ہماری مراد صرف وہ شہادت یا گواہی نہیں ہے جو کسی دستاویز ہی پر لی جائے، بلکہ اس سے ہماری مراد وہ شہادت یا گواہی ہے، جو دو یا دو سے زیادہ افراد کے درمیان لین دین یا کسی بھی دوسرے ایسے معاملے پر لی جائے، جو تمام فریقوں کا اختیاری و ارادی معاملہ ہو۔ اس کے برعکس، 'واقعاتی شہادت' کو ہم نے اس شہادت یا گواہی کے معنی میں استعمال کیا ہے، جو کسی ناگہانی واقعے پر لی جائے۔ مثال کے طور پر، قرض کا لین دین، معاہدہ یا کسی اور ملکیت کی خرید و فروخت، کوئی تحریری یا زبانی معاہدہ (Agreement or Contract) اور اسی طرح کے دوسرے معاملات پر جب گواہی لی جائے گی تو وہ ہماری اصطلاح میں 'دستاویزی شہادت' ہو گی۔ جبکہ قتل، ڈکیتی، زنا یا چوری کے کسی واقعے پر جو گواہی لی جاتی ہے، وہ ہماری اصطلاح میں 'واقعاتی شہادت' ہو گی۔

'دستاویزی شہادت' اور 'واقعاتی شہادت' کی اصطلاحات کی اس وضاحت کے بعد آپ اگر ہماری اس بات پر دوبارہ غور فرمائیں گے کہ: "آیتِ زیرِ بحث کا تعلق دستاویزی شہادت ہی سے ہے"، تو یقیناً آپ اس سے پوری طرح اتفاق فرمائیں گے۔ بلکہ، اگر آپ اجازت دیں، تو ہم یہ بھی عرض کریں گے کہ آیت اپنے مدعا میں اتنی واضح ہے کہ اس معنی پر مفسرینِ قرآن اور فقہا میں سے کسی کا کوئی اختلاف نقل نہیں ہوا ہے۔ اس آیت کے بارے میں آپ کے اپنے الفاظ بھی یہی ہیں: "آیتِ مبارکہ میں قرض اور لین دین کے بارے میں بہت سی ہدایات بیان کی ہیں۔" ظاہر ہے کہ کوئی شخص جو عربی زبان سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہو، وہ یہ بات بآسانی جان سکتا ہے کہ یہاں قرض اور لین دین ہی کے بارے میں ہدایات بیان ہوئی ہیں۔ چنانچہ دیکھیے، آیت کا آغاز ہی ان الفاظ سے ہوا ہے: 'يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ'[1]۔ لہٰذا یہی وجہ ہے کہ تمام فقہا کا اس بات پر اتفاق بھی ہے کہ اموال سے متعلق معاملات میں ایک مرد کے ساتھ، اگر دو عورتیں گواہ ہیں، تو ان کی گواہی قابلِ قبول ہو گی۔

۲۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں: "اگر سورۂ بقرہ کی آیت ۲۸۲ (البقرہ ۲: ۲۸۲) کا وہ مفہوم ہوتا جو جناب عمر صاحب نے بیان فرمایا ہے تو کسی ایک صحابی، تابعی یا فقیہ کا ذہن اس طرف ضرور گیا ہوتا۔" ہم نے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں اپنے پہلے مراسلے میں آیت کے مفہوم سے متعلق دو ہی باتیں

---

[1] اے ایمان والو، جب تم کسی معین مدت کے لیے ادھار کا لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔

عرض کی تھیں، ایک یہ کہ آیۂ زیر بحث کا تعلق دستاویزی شہادت (یعنی قرض کے لین دین اور اس نوع کے معاملات) ہی سے ہے، اور دوسری یہ کہ پوری آیت کا کوئی تعلق قانون و عدالت سے نہیں، بلکہ یہ مسلمانوں کو دی گئی ایک معاشرتی ہدایت ہے۔ ان میں سے پہلی بات سے تو، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کسی نے کوئی اختلاف نہیں کیا ہے، یہاں تک کہ ڈاکٹر صاحب کے اپنے الفاظ بھی اسی کے حق میں ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: "آیت مبارکہ میں قرض اور لین دین کے بارے میں بہت سی ہدایات بیان کی ہیں"۔ اس وجہ سے ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کا ارشاد: "اگر سورہ بقرۃ کی آیت مداینہ (البقرہ ۲۸۲) کا وہ مفہوم ہوتا جو جناب معز صاحب نے بیان فرمایا ہے تو کسی ایک صحابی، تابعی، یا فقیہ کا ذہن اس طرف ضرور گیا ہوتا"، ہماری اس دوسری بات ہی سے متعلق ہے کہ اس آیت کا کوئی تعلق قانون و عدالت سے نہیں ہے، بلکہ یہ مسلمانوں کو دی گئی ایک معاشرتی ہدایت ہے۔

اس معاملے میں سب سے پہلے تو ہم یہ عرض کرنے کی جسارت کریں گے کہ ہم نے سورۂ بقرہ کی مذکورہ آیت کے بارے میں، جو یہ عرض کیا تھا کہ "اس کا کوئی تعلق قانون و عدالت سے نہیں، بلکہ یہ مسلمانوں کو دی گئی ایک معاشرتی ہدایت ہے"، تو یہ کوئی ہمارا دعویٰ نہیں ہے، بلکہ یہ ہماری رائے ہے، جس کے حق میں ہم نے دلائل بھی دیے تھے۔

اگر ڈاکٹر صاحب کو ہماری اس رائے سے اختلاف تھا، تو یہ بہتر ہوتا کہ وہ ہمارے ان دلائل کی غلطی ہم پر واضح کر دیتے، تاکہ ہم بھی ان کی بات سمجھ سکتے۔ مگر افسوس کہ ایسا کرنے کے بجائے وہ یہ فرماتے ہیں کہ اگر سورۂ بقرہ کی مذکورہ آیت کا مفہوم وہ ہوتا، جو ہم نے عرض کیا ہے، تو کسی ایک صحابی، تابعی یا فقیہ کا ذہن اس طرف ضرور گیا ہوتا۔ اس بات کے جواب میں اس کے سوا کیا عرض کیا جائے کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۸۲، جس طرح صحابۂ کرام، تابعین، علمائے امت یا فقہا کے سامنے موجود تھی، بعینہٖ اسی طرح ہمارے اور آپ کے سامنے بھی موجود ہے، اور اگر ہم نے اس کے معنی طے کرنے میں غلطی کی ہے، تو آپ ان الفاظ کے صحیح معنی کی طرف رہنمائی فرما دیجیے، بات سمجھ میں آگئی تو، ان شاء اللہ، سرِ تسلیم خم ہو گا۔ البتہ، ڈاکٹر صاحب سے معذرت کے ساتھ ہم یہ عرض کریں گے کہ علم و تحقیق کی دنیا میں اس اعتراض کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ پہلے کسی نے یہ بات نہیں کہی۔

اب اس بات کو بھی ملاحظہ فرما لیجیے کہ ہم سے پہلے یہ بات کسی نے کہی ہے یا نہیں؟

۱۔ ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

هذا ارشاد منه تعالىٰ لعباده   "یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو ہدایت

المومنين اذا تعاملو بمعاملات مؤجلة ان يكتبوها ليكون ذلك احفظ لمقدارها وميقاتها و اضبط للشاهد فيها۔	کی ہے کہ جب وہ آپس میں ایک معین مدت تک کے لیے کوئی مالی معاملہ کریں، تو اسے لکھ لیا کریں، تاکہ مال کی مقدار اور لوٹانے کے وقت کی حفاظت ہو سکے اور اس معاملے کی گواہی صحیح رہے۔"

۲۔ ابن قیم الجوزیہ رحمہ اللہ نے اس آیت کے متعلق "اعلام الموقعین" میں لکھا ہے :

فهذا فی التحمل والوثيقة التی يحفظ بها صاحب المال حقه، لا فی طريق الحکم وما يحکم به الحاکم، فان هذا شئ وهذا شئ۔ (ج ۱، ص ۹۱)	"یہ گواہی کا بار اٹھانے اور اس میں منضبوطی کے متعلق ہے، جس کے ذریعے سے کوئی صاحب مال اپنے حق کی حفاظت کرتا ہے۔ عدالت کے فیصلے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، چنانچہ، یہ اور چیز ہے، اور وہ اور۔"

۳۔ ڈاکٹر صاحب مزید فرماتے ہیں : "جہاں تک سنتِ رسول کا تعلق ہے تو، بخاری، مسلم اور دوسری متعدد کتبِ حدیث میں بیان کردہ وہ روایت بڑی بنیادی حیثیت رکھتی ہے، جس کو کئی صحابہ نے روایت کیا ہے اور جو میری ناچیز رائے میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے، یعنی وہ روایت، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کے اجتماع سے گفتگو فرماتے ہوئے ان کو یہ بات یاد دلائی کہ ان میں سے دو کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے۔ اگر اس آیتِ کریمہ کا وہ مفہوم ہوتا جو جناب معز امجد نے بیان فرمایا ہے، تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بھی اس عمومی انداز میں دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کے برابر نہ قرار دیتے، اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ آیتِ مداینہ سے وہ مفہوم نکل سکتا ہے، جو فاضل تبصرہ نگار نے بیان فرمایا ہے، تو بھی مذکورہ بالا حدیث کی موجودگی میں اس مفہوم کو اختیار کرنے کی کوئی گنجایش نہیں .... اگر حدیثِ صحیح قرآن کی شارح اور مفسر ہے اور یقیناً ہے تو آخر کس بنیاد پر آیتِ مداینہ کی تعبیر و تشریح میں اس حدیثِ قطعی کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔"

اس سے پہلے کہ ہم اس معاملے میں اپنی رائے بیان کریں، ذرا اس روایت ہی کو دیکھ لیجیے، جسے حضرت ابو سعید خدری، حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت عبد اللہ بن مسعود اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے

۱۔ صحیح بخاری اور کچھ دوسری کتابوں میں یہ روایت اس طرح ہے :

حدثنا سعيد بن ابي مريم قال اخبرنا محمد بن جعفر قال اخبرني زيد هو ابن اسلم عن عياض بن عبدالله عن ابي سعيد الخدري قال: خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم في اضحى او في فطر الى المصلى فمر على النساء فقال: يا معشر النساء تصدقن فاني رايتكن اكثر اهل النار، فقلن وبم يا رسول الله؟ قال تكثرن اللعن وتكفرن العشير، ما رايت من ناقصات عقل ودين اذهب للب الرجل الحازم من احداكن. قلن: وما نقصان ديننا وعقلنا يا رسول الله؟ قال اليس شهادة المراة مثل نصف شهادة الرجل؟ قلن: بلى. قال: فذلك من نقصان عقلها. اليس اذا حاضت لم تصل ولم تصم؟ قلن: بلى. قال: فذلك من نقصان دينها.

(كتاب الحيض)

"ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عید الاضحیٰ یا عید الفطر میں سے کسی موقع پر نماز کے لیے نکلے پھر عورتوں سے آپ نے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا: بی بیو، صدقہ کیا کرو، میں نے جہنم میں زیادہ عورتوں ہی کو دیکھا ہے۔ انھوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ، اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے فرمایا: تم لعن طعن بہت کرتی ہو۔ میں نے تمھارے جیسی کوئی اور مخلوق نہیں دیکھی، جس پر عقلی اور دینی معاملات کی ذمہ داری کم ہو اور اس کے باوجود، وہ ایک اچھے خاصے عقل مند آدمی کی مت مار دے۔ انھوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ، دینی اور عقلی معاملات میں ہماری ذمہ داری میں کیا کمی ہے؟ آپ نے فرمایا: کیا ایک عورت کی گواہی مرد کے مقابل میں آدھی نہیں ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں، یہ تو ہے۔ آپ نے فرمایا: یہی عقلی معاملات میں ذمہ داری کی کمی ہے۔ اور کیا ایسا نہیں ہے کہ جب اسے حیض ہوتا ہے تو نہ وہ نماز پڑھتی اور نہ روزے رکھتی ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ آپ نے فرمایا: یہی دینی معاملات میں ذمہ داری کی کمی ہے۔"

مسند احمد بن حنبل میں یہ روایت اس طرح بھی آئی ہے:

حدثنا عبدالله حدثني ابي حدثنا سليمان انبانا اسمعيل اخبرني عمرو يعني ابن ابي عمرو عن سعيد المقبري عن ابي هريرة ان النبي صلى الله

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم صبح کے وقت نکلے، عورتوں کی طرف آئے اور وہاں کھڑے ہو کر فرمایا: اے بی بیو، میں نے عقل و دین میں کمی والی

علیه وسلم انصرف من صبح یوما
فاتی النساء فوقف علیهن فقال یا
معشر النساء مارایت من نواقص
عقول و دین اذهب لقلوب ذوی
الالباب منکن فانی قد رایتکن اکثر
اهل النار یوم القیامة فتقربن
الی الله ما استطعتن. وکان فی
النساء امراة عبد الله بن مسعود فاتت
الی عبد الله بن مسعود فاخبرته بما
سمعت من رسول الله صلی الله علیه
وسلم واخذت حلیا لها فقال ابن
مسعود فاین تذهبین بهذا الحلی
فقالت اتقرب به الی الله عز و
جل ورسوله لعل الله ان لا یجعلنی
من اهل النار فقال ویلک هلمی
فتصدقی به علی و علی ولدی
فانا له موضع فقالت لا والله
حتی اذهب به الی النبی صلی
الله علیه وسلم فذهبت تستاذن
علی النبی صلی الله علیه وسلم فقالوا
للنبی صلی الله علیه وسلم هذه زینب
تستاذن یا رسول الله فقال ای الزیانب
هی فقالوا امراة عبد الله بن مسعود فقال
ائذنوا لها فدخلت علی النبی صلی الله
علیه وسلم فقالت یا رسول الله انی

تمھارے جیسی کوئی اور مخلوق نہیں دیکھی، جو اچھے
خاصے عقل مند مردوں کے دلوں پر قابض ہو جائے۔
قیامت کے روز میں نے اہلِ جہنم میں زیادہ تم ہی
کو دیکھا ہے۔ چنانچہ، جتنا ہو سکے، اللہ کا قرب
حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ عورتوں کے اس
مجمع میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اہلیہ بھی
موجود تھیں۔ وہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے
پاس آئیں، اور انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی بات سنائی۔ اس کے بعد وہ اپنے زیورات
جمع کرنے لگیں۔ اس پر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ
عنہ نے ان سے پوچھا: یہ سب لے کر کہاں چلیں؟
انھوں نے کہا: میں اسے صدقہ کروں گی، اور
اس کے ذریعے سے اللہ اور اس کے رسول کا
قرب حاصل کروں، شاید اللہ مجھے قیامت کے
روز جہنم سے بچا لے۔ ابن مسعود نے کہا: ارے
ادھر آؤ، اسے مجھ پر اور میرے بچوں پر صدقہ کر
دو، ہم اس کے مستحق ہیں۔ انھوں نے کہا: نہیں،
خدا کی قسم، میں ایسا نہ کروں گی، جب تک میں
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر اس
کے بارے میں نہ پوچھ لوں۔ چنانچہ، وہ نبی صلی
اللہ علیہ وسلم کے پاس گئیں اور عرض کی: یا رسول اللہ،
میں نے آج آپ کی بات سنی، پھر واپس جا کر
اپنے شوہر کو بھی بتائی، اور اللہ اور اس کے رسول
کے تقرب کے لیے اپنے زیورات اکٹھے کیے کہ
میں انھیں صدقہ کر دوں۔ مجھے یہ امید تھی کہ

سمعت منك مقالة فرجعت الى ابن مسعود
فحدثته واخذت حليا اتقرب به الى
الله واليك رجاء ان لا يجعلني الله من
اهل النار فقال لي ابن مسعود تصدقي
به علي وعلى ولدي فانا له موضع
فقلت حتى استاذن النبي صلى الله عليه
وسلم فقال النبي صلى الله عليه وسلم
تصدقي به عليه وعلى بنيه فانهم له
موضع ثم قالت يا رسول الله ارايت ما
سمعت منك حين وقفت علينا ما
رايت من نواقص عقول قط ولا دين
اذهب بقلوب ذوي الالباب منكن
قالت يا رسول الله فما نقصان ديننا
وعقولنا فقال ما ذكرت من نقصان
دينكن فالحيضة التي تصيبكن تمكث
احداكن ماشاء الله ان تمكث
لا تصلي ولا تصوم فذلك من نقصان
دينكن و اما ما ذكرت
من نقصان عقولكن
فشهادتكن انما شهادة
المراة نصف شهادة۔

(ج ۲، ص ۳۷۳)

اللہ مجھے جہنم کی آگ سے بچائے گا۔ یہ دیکھ کر
ابن مسعود نے مجھے کہا کہ میں ان زیورات کو
اس پر اور اس کے بچوں پر صدقہ کر دوں کیونکہ
وہ اس کے پوری طرح مستحق ہیں۔ میں نے کہا میں
اس وقت تک ایسا نہ کروں گی، جب تک
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اس کی اجازت
نہ دے دیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم
یہ زیورات انھیں صدقے میں دے دو، وہ اس
کے مستحق ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے آپ کی
خدمت میں عرض کیا: یارسول اللہ، آپ نے آج
جو یہ فرمایا کہ میں نے عقل و دین میں کمی والی،
تمھارے جیسی کوئی اور مخلوق نہیں دیکھی، جو
اچھے خاصے عقل مند مردوں کے دلوں پر قابض
ہو جائے، تو یہ وضاحت فرما دیجیے کہ ہماری عقل
اور ہمارے دین میں کیا کمی ہے۔ آپ نے فرمایا:
میں نے دین میں کمی کی جو بات کی تھی، تو اس
سے مراد حیض ہے، جو عورتوں کو آتا ہے اور اس
وقت تک رہتا ہے، جب تک اللہ چاہے اور
اس دوران میں وہ نہ نماز پڑھتی اور نہ روزے رکھتی
ہیں۔ عقل میں کمی کا ذکر جو میں نے کیا، تو اس کی
بنیاد عورت کی گواہی ہے۔ دیکھو، عورت کی
گواہی آدھی ہے۔"

۳۔ دارمی کی روایت کے مطابق یہ واقعہ کچھ اس طرح ہوا:

اخبرنا ابو زيد سعيد بن ربيع
ثنا شعبة عن الحكم قال

"عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت
ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے

سمعت ذرا عن وائل بن مهانة عن عبد الله عن النبي صلی الله علیه وسلم قال للنساء تصدقن فانكن اكثر اهل النار فقالت امراة ليست من اشراف النساء لم او بم او فيم؟ قال انكن تكثرن اللعنة و تكفرن العشير قال وقال عبد الله ما من ناقصي الدين والعقل اغلب للرجال ذوی الامر علی امرهم من النساء. قال رجل لعبد الله ما نقصان عقلها؟ قال جعلت شهادة امراتين بشهادة رجل قال سئل ما نقصان دينها؟ قال: تمكث كذا وكذا من يوم و ليلة لا تصلی لله صلوة۔ (کتاب الطہارۃ)

فرمایا: صدقہ کیا کرو، کیونکہ اہلِ جہنم میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہے۔ یہ سن کر ایک عورت، جو بڑے گھرانوں کی عورتوں میں سے نہ تھی، بولی: اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے فرمایا: اس کی وجہ یہ ہے کہ تم بہت لعن طعن کرتی ہو، اور اپنے شوہروں کی نافرمانی کرتی ہو۔ راوی کہتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعود نے کہا: عورتوں جیسی عقل و دین میں کمی والی کوئی مخلوق نہیں، جو معاملہ فہم مردوں پر غالب آجائے۔ اس پر کسی نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا: عورت کی عقل میں کیا کمی ہے؟ انھوں نے کہا کہ دیکھو، دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے۔ اس کے بعد ان سے پوچھا گیا کہ عورتوں کے دین میں کیا کمی ہے؟ انھوں نے جواب میں کہا: وہ حیض کی وجہ سے، کچھ دن اور راتیں ایسی گزارتی ہیں، جن میں وہ اللہ کی عبادت نہیں کر سکتیں۔"

ان روایتوں کی سند میں، اگرچہ، کوئی کمزوری نہیں ہے، مگر دیکھیے، ان تینوں میں مذکورہ واقعہ مختلف طریقوں سے بیان ہوا ہے۔ پہلی روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری بات عورتوں کے ایک مجمع میں فرمائی، جبکہ احمد بن حنبل کی روایت کے مطابق، عورت کی گواہی والا حصہ آپ نے مجمع میں نہیں فرمایا، بلکہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زوجہ کے استفسار پر ان کو الگ سے سمجھایا۔ ان دونوں روایتوں کے برعکس، دارمی کی روایت کے مطابق "ناقصات عقل و دین" کا پورا حصہ ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا، بلکہ یہ حضرت عبداللہ بن مسعود کی بات ہے۔ ہمارے نزدیک، اگر سند کے اعتبار سے مختلف روایات صحیح ہیں، تو صرف یہ بات کسی روایت کو ترجیح دینے کے لیے کافی نہیں ہے کہ اسے امام بخاری یا امام مسلم رحمہما اللہ نے نقل کر دیا ہے۔ چنانچہ غور کیجیے، تو

اس کا امکان موجود ہے کہ "ناقصات عقل والدین" والا حصہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہی نہ ہو، بلکہ یہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ ہی کا قول ہو جس کو بیان کرنے میں راویوں سے غلطی ہو گئی ہو۔ ہمیں، اگرچہ، اس بات پر اصرار نہیں ہے کہ واقعہ اسی طرح ہوا ہوگا، جس طرح ہم نے عرض کیا، مگر اب اس کے بارے میں کوئی حتمی بات تو، بہرحال، نہیں کی جا سکتی کہ اصل واقعہ کس طرح ہوا۔ اب آپ ہی فرمائیے کیا ہم قرآنِ مجید کی ایک واضح آیت کو صرف اس لیے چھوڑ دیں گے کہ یہ امکان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ایک خاص طریقے پر شرح فرما دی ہے؟

لیکن اس سب کچھ کے باوجود، اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا قول ہے، تو اس سے بھی ہمارے نقطۂ نظر پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمارے نزدیک، اس حدیث کا وہ مفہوم ہی نہیں ہے، جو ہمارے فاضل بزرگ ڈاکٹر صاحب نے بیان فرمایا ہے۔ مگر اس بات کی وضاحت سے پہلے ہم یہ چاہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی اس بات پر بھی اچھی طرح غور کر لیا جائے کہ "اگر حدیثِ صحیح قرآن کی شارح اور مفسر ہے اور یقیناً ہے، تو آخر کس بنیاد پر آیتِ مداینہ کی تعبیر و تشریح میں اس حدیثِ قطعی کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟"

اس میں تو کوئی شبہ نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت دین کا ایک مستقل ماخذ ہونے کے ساتھ ساتھ، قرآنِ مجید کی شارح بھی ہے۔ سنت کو یہ حیثیت کسی عالم، فقیہ یا مجتہد نے نہیں دی، بلکہ اس عالم کے پروردگار ہی نے دی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ"۔[1] چنانچہ جو شخص جب تک صاف صاف قرآن کا انکار نہ کر دے، اس کے لیے سنت کی اس حیثیت کو چیلنج کرنا ممکن نہیں ہے۔ مگر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لفظِ 'تبیین' کے کیا معنی ہیں؟ قرآنِ مجید اور کلامِ عرب سے واضح ہوتا ہے کہ 'تبیین' کا لفظ کسی معاملے کی حقیقت کو کھول دینے، کسی کلام کے مدعا کو واضح کر دینے اور کسی چیز کے خفا کو دور کر کے اسے منصۂ شہود پر لانے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ گویا تبیین کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جسے باہر سے لا کر کسی بات، کسی معاملے یا کسی کلام کے سر پر لاد دیا جائے۔ وہ کسی بات کی وہ کنہ ہے جو ابتدا ہی سے اس میں موجود ہوتی ہے، اور آپ اسے کھول دیتے ہیں۔ وہ کسی کلام کا وہ مدعا ہے، جو اس کلام کی ابتدا ہی کے وقت سے اس کے ساتھ ہوتا ہے، اور آپ اسے واضح کر دیتے ہیں۔ وہ کسی چیز کا وہ لازم ہے جو شروع

[1] النحل ۱۶: ۴۴۔ "اور ہم نے تم پر بھی یہ ذکر اتارا ہے، تاکہ تم لوگوں پر اس چیز کو واضح کر دو، جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے۔"

ہی سے اس کے وجود کی حقیقت میں پوشیدہ ہوتا ہے' اور آپ اس کو منصۂ شہود پر لے آتے ہیں۔ چنانچہ' ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "تبیین کسی کلام کے متکلم کے اس مدعا کا اظہار ہے، جسے دوسروں تک پہنچانے کے لیے' وہ اس کلام کو ابتداءً وجود میں لایا تھا۔" اسی مفہوم کے لیے ہم اپنی زبان میں لفظِ 'شرح' بولتے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اس لفظ کا اطلاق کسی ایسی ہی بات پر کیا جاسکتا ہے' جس کے بارے میں آپ یہ ثابت کرسکیں کہ وہ، فی الواقع، اس کلام کے متکلم کا منشا ہے' جس کی طرف آپ وہ بات منسوب کر رہے ہیں۔ آپ کسی کلام سے متعلق کچھ فرماتے ہیں اور پھر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ کا یہ ارشاد اس کلام کی شرح ہے، تو اسے محض آپ کے اس ارشاد کی بنا پر تسلیم نہیں کر لیا جائے گا۔ ہر عاقل آپ سے یہ مطالبہ کرے گا کہ اپنے اس قول کی دلیل بیان فرمایے۔

چنانچہ امام بزدوی اپنی 'اصول' میں فرماتے ہیں :

حد البیان ما یظھر به ابتداء وجوده فاما التغییر بعد الوجود فنسخ و لیس ببیان ۔ (باب بیان التغییر)	"بیان کا اطلاق اس شے پر کیا جاتا ہے' جس کے ذریعے سے اس شے کا ابتدا ہی سے کلام میں موجود ہونا ظاہر ہو جاتا ہے۔ رہا، وہ تغیر جو کلام کے وجود میں آنے کے بعد کیا جائے' تو وہ 'نسخ' ہے' اسے بیان قرار نہیں دیا جاسکتا۔"

ہمیں، اگر طولِ کلام کا اندیشہ نہ ہوتا، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے قرآنِ مجید کی شرح و تبیین کی مثالیں دے کر اپنی بات واضح کرتے، مگر ہمیں امید ہے کہ فی الحال' اس کی ضرورت نہ ہوگی۔

'شرح' و 'تبیین' کے الفاظ کی اس وضاحت کے بعد، اب اگر محترم ڈاکٹر صاحب یہ فرمائیں کہ: "اگر حدیثِ صحیح قرآن کی شارح اور مفسر ہے اور یقیناً ہے' تو آخر کس بنیاد پر آیتِ مداینہ کی تعبیر و تشریح میں اس حدیثِ قطعی کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے"، تو ہم یہ عرض کریں گے کہ آپ اگر اس حدیثِ قطعی کو واقعی آیتِ مداینہ' کی تشریح سمجھتے ہیں، تو پھر آپ کی یہ ذمہ داری ہے کہ قرآنِ مجید کے الفاظ سے بھی وہ تشریح و تبیین کر کے دکھایے' جو اس حدیثِ صحیح میں بیان ہوئی ہے۔ آپ خود جس آیت کو 'آیتِ مداینہ' فرما رہے ہیں، اور جس کے بارے میں آپ ہی کے الفاظ یہ ہیں کہ "آیتِ مبارکہ میں قرض اور لین دین کے بارے میں بہت سی ہدایات بیان کی ہیں"، اسی کے الفاظ سے یہ بات بھی نکال کر دکھا دیجیے کہ یہاں چوری، قتل اور دوسرے جرائم کے بارے میں نصابِ شہادت بیان ہوا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اگر قتل کا کوئی مقدمہ تمھارے سامنے پیش ہو' تو اس میں کم از کم دو مردوں یا چار عورتوں کی گواہی لو۔ اور اگر ایسا کرنا ممکن نہیں' تو پھر قرآنِ مجید کی اس واضح

آیت کی روشنی میں اس حدیث پر غور فرمایے۔ یہی وہ طریقہ ہے جسے اپنانے سے قرآنِ مجید کو واقعی حق و باطل کی میزان اور فرقان کی حیثیت حاصل ہوگی۔

فنِ اصول کی شہرۂ آفاق کتاب "الموافقات" کے مصنف امام شاطبی رحمہ اللہ نے قرآن و سنت کے باہمی تعلق پر یہی بات اس طرح کہی ہے:

ان السنة اما بيان للكتاب او زيادة على ذلك، فان كان بيانا فهو ثان على المبين فى الاعتبار.... وان لم يكن بيانا فلا يعتبر الا بعد ان لا يوجد فى الكتاب. (ج ۴، ص ۵)	"سنت، یا تو قرآن کا 'بیان' ہوگی، یا اس پر 'اضافہ'۔ پس اگر وہ 'بیان' ہے تو اس کا مرتبہ اس چیز کے مقابلے میں ثانوی ہے، جس کا وہ 'بیان' ہے.... اور اگر وہ 'بیان' نہیں ہے، تو اس کا اعتبار صرف اسی صورت میں ہوگا، جب کہ وہ چیز جو اس میں مذکور ہے، قرآنِ مجید میں نہ پائی جائے۔"

اگر صحیح بخاری والی روایت ہی کو مذکورہ واقعے کی صحیح ترجمان کی حیثیت سے مان لیا جائے، تو اس پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ جس طرح، اس روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ منشا نہیں ہے کہ خواتین کو یہ بتایا جائے کہ انھیں ایامِ حیض میں نماز اور روزہ نہیں رکھنا ہوتا، بالکل اسی طرح یہاں آپ کا یہ منشا بھی نہیں ہے کہ آپ قرآنِ مجید کی آیتِ مداینہ کی تشریح فرمائیں۔ روایت کے الفاظ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان خواتین کو پہلے ہی سے ان دو باتوں کا پوری طرح علم تھا۔ روایت کے الفاظ "کیا ایک عورت کی شہادت مرد کے مقابلے میں آدھی نہیں رکھی گئی؟ انھوں نے عرض کیا کہ بے شک، ایسا ہی ہے"، اسی بات پر دلالت کر رہے ہیں کہ مخاطب خواتین 'سورۂ بقرہ کی آیتِ مداینہ سے پوری طرح واقف ہیں'، اور اسی آیت کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس خطاب میں اشارہ فرمایا ہے۔ اب، بجائے یہ کہنے کے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خطاب کی روشنی میں قرآنِ مجید کی آیتِ مداینہ کو سمجھنا چاہیے، ہم آخر یوں کیوں نہ کہیں کہ قرآنِ مجید کی آیتِ مداینہ کی روشنی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خطاب کو سمجھنا چاہیے؟ ہمارے نزدیک، یہ بات بالکل واضح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کے وہی معنی ہیں، جو آیتِ مداینہ سے نکل رہے ہیں۔

۴۔ ڈاکٹر صاحب مزید فرماتے ہیں: "میرے نزدیک، اس معاملے میں نصِ قطعی کے ہونے یا نہ ہونے کی بحث میں جانے سے پہلے، جو بات سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے، وہ یہ ہے کہ دورِ صحابہ

سے لے کر آج تک یہ مسئلہ کبھی بھی مختلف فیہ نہیں رہا ہے کہ دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کی گواہی کے برابر قرار دیا جائے۔ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں صحابہ اور تابعین کے جو اقوال اور فتاوی دستیاب ہیں، ان میں کوئی ایک رائے بھی ایسی نہیں ملی جس میں ہر معاملے میں عورتوں کی گواہی کو، مطلقاً، مردوں کے برابر قرار دیا گیا ہو۔"

اس معاملے میں، ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں ہمیں صحابہ رضی اللہ عنہم کا ایسا کوئی قول نہیں ملا، جس سے حتمی طور پر، یہ معلوم ہوتا ہو کہ وہ، بلا امتیاز، ہر معاملے میں، عورت کی آدھی گواہی کے قائل تھے، نہ ہمیں کوئی ایسا مقدمہ ہی ملا ہے، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عورت کی گواہی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہو، یا اسے آدھی گواہی تصور کیا ہو۔ اس کے برعکس، سنن ابی داؤد، اور مسند احمد بن حنبل کی ایک روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک عورت کی گواہی پر، ایک شخص کو سزا دینے کا حکم جاری فرما دیا تھا۔

باقی رہ گئی یہ بات کہ یہ مسئلہ آج تک مختلف فیہ نہیں رہا ہے، تو ہم یہ تسلیم کیے لیتے ہیں کہ فقہا اس معاملے میں متفق ہیں کہ ہر معاملے میں عورت کی گواہی مرد کے مقابلے میں آدھی ہو گی۔ مگر اس کی وجہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل نہیں ہے، بلکہ قرآنِ مجید کی آیتِ مداینہ ہی ہے، اور اسی کے بارے میں ہم نے اپنی یہ رائے پیش کرنے کی جسارت کی تھی کہ ہمارے نزدیک، اس سے یہ استنباط کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس وجہ سے، ڈاکٹر صاحب کو، اس معاملے میں، نصِ قطعی کے ہونے یا نہ ہونے ہی کی بحث میں جانا پڑے گا۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ صحیح باتوں کے لیے دلوں میں جگہ پیدا کرے، اور غلط باتوں کے شر سے ہم سب کو محفوظ رکھے۔

اللهم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه[1]

والسلام

معز امجد

قسم دراسات الفقہ الاسلامی المورد

---

[1] اے اللہ، ہمیں توفیق دے کہ ہم صحیح بات ہی کو صحیح سمجھیں، اور اسی کی پیروی کریں، اور غلط بات کی غلطی جان لیں اور اس سے بچ سکیں۔

صد عن سبیل اللہ

قرآن میں جن مجرمانہ افعال کا ذکر ہے ان میں سے ایک نہایت سنگین جرم وہ ہے جس کے لیے صد عن سبیل اللہ کے الفاظ آئے ہیں یعنی اللہ کے راستے سے روکنا۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ یہ بہت بڑا کام ہے (التوبہ ۹:۹) اس سے اعمال حبط ہو جاتے ہیں (محمد ۴۷:۳۲) ایسے لوگوں کی مغفرت نہیں ہوگی (محمد ۴۷:۳۴) بلکہ انھیں عام گمراہوں سے زیادہ سخت عذاب دیا جائے گا (النحل ۱۶:۸۸)۔ صد عن سبیل اللہ کیا ہے، اس کو سمجھنے کے لیے حسب ذیل آیت کا مطالعہ کیجیے:

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أُولَٰئِكَ يُعْرَضُونَ عَلَىٰ رَبِّهِمْ وَيَقُولُ الْأَشْهَادُ هَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ (ہود ۱۱: ۱۸-۱۹)

"اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ گھڑے۔ ایسے لوگ اپنے رب کے سامنے پیش ہوں گے اور گواہی دینے والے کہیں گے کہ یہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب پر جھوٹ گھڑا۔ سنو، اللہ کی لعنت ہے ظالموں کے اوپر۔ ان لوگوں کے اوپر جو اللہ کے راستے سے لوگوں کو روکتے ہیں اور اس میں کجی ڈھونڈتے ہیں اور وہ آخرت کے منکر ہیں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ صد عن سبیل اللہ یہ ہے کہ دعوت حق میں ٹیڑھے مطلب نکالے جائیں اور اس طرح داعی اور دعوت کی سچائی کو لوگوں کی نظر میں مشتبہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ کام ہمیشہ وقت کے خواص کرتے ہیں۔ وہ داعی کی شخصیت اور داعی کے پیغام میں اپنی ذہانت سے ایسے الٹے پہلو نکالتے ہیں جن کا تجزیہ عوام نہ کر سکیں اور داعی اور اس کی دعوت کی طرف سے شبہ میں پڑ جائیں۔

جو لوگ ایسا کریں وہ گویا خدا کے اوپر جسارت کر رہے ہیں۔ وہ قیامت کے دن خدا کی عدالت میں حاضر کیے جائیں گے۔ اس وقت وہی داعی جن کو انھوں نے دنیا میں حقیر کیا اور ان کے پیغام کو نفرت انگیز انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کیا، وہی ان کے اوپر گواہ بن کر کھڑے ہوں گے اور بتائیں گے کہ کس طرح انھوں نے اپنی جھوٹی باتوں سے خلق خدا کو حق سے پھیرنے کی کوشش کی تھی۔

وحید الدین خاں

"پھر یہ سزا صرف مجرم ہی کو نہیں، اس کے سب اہل تعلق کو بھی ملتی ہے۔ سب سے زیادہ دردانگیز صورت حال اس میں بیوی کے لیے پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا شوہر اگر نو دس سال کے لیے قید میں ڈال دیا گیا ہے تو اس عرصے کے دوران میں اسے جن نفسیاتی، معاشرتی، معاشی اور اخلاقی مسائل کے عذاب سے گزرنا پڑتا ہے، اور محض ایک مجرم کی بیوی ہونے کے جرم میں گزرنا پڑتا ہے، اس کا اندازہ صرف وہ باوفا خواتین ہی کر سکتی ہیں جو کبھی اس مصیبت سے دوچار ہوئی ہوں۔"

جاوید احمد غامدی

حدود و تعزیرات

(۴)

باقی جرائم

اسلامی شریعت کے ان جرائم کی ادنیٰ صورتوں، اور ان کے علاوہ باقی سب جرائم کا معاملہ، اسلامی ریاست کے اربابِ حل و عقد سے متعلق ہے۔ حدود و تعزیرات کے باب میں شریعت بس اتنی ہی ہے، جتنی ہم نے بیان کر دی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی چیز بھی شریعت نہیں ہے۔ لہٰذا یہ اربابِ حل و عقد کا حق اور اُن کی ذمہ داری ہے کہ وہ قرآنِ مجید کے حکم 'امرھم شوریٰ بینھم' کی پیروی میں ان سب جرائم کے لیے مالی تاوان، جسمانی تادیب، جلاوطنی، مجرم کے گھر میں اس کی نظربندی اور اس طرح کی دوسری سزاؤں کی صورت میں، جو سزا چاہیں، باہمی مشورے سے تجویز کریں، اور مسلمانوں کی مصلحت کے پیشِ نظر اس میں جب چاہیں، اسی طریقے سے کوئی تبدیلی کر دیں۔ شریعت ان کے اس حق میں، کسی پہلو سے، کوئی مداخلت نہیں کرتی۔ یہ شریعت ہی کا حکم ہے کہ اللہ و رسول کے بعد، انھیں بھی مرجعِ اطاعت مانا جائے، اور اُن کے احکام کی پابندی کی جائے۔ ارشاد فرمایا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ. (النساء ۴: ۵۹)	"اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، اور ان لوگوں کی جو تم میں صاحبِ امر ہوں۔"

لیکن اس معاملے میں رائج تصورات کی رو سے یہ چار سوالات، البتہ پیدا ہو سکتے ہیں:

ایک یہ کہ شراب نوشی کی سزا: اسّی کوڑے، کیا شریعت کی رو سے مقرر نہیں ہے؟

دوسرا یہ کہ ارتداد کی سزا بھی شریعت میں، کیا قتل بیان نہیں ہوئی؟
تیسرا یہ کہ ان باقی جرائم میں، ارباب حل وعقد کیا موت کی سزا بھی کسی مجرم کو دے سکتے ہیں؟
چوتھا یہ کہ قید کی سزا بھی، ان جرائم میں، کیا کسی شخص کو دی جاسکتی ہے؟
حدود و تعزیرات سے متعلق، ہم اپنی یہ بحث انھی سوالوں کے جواب پر ختم کرتے ہیں۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ شراب نوشی کی یہ سزا سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے، اپنے دورِ خلافت میں مسلمانوں کے حکمران کی حیثیت سے، ان کے ارباب حل وعقد کے ساتھ مشورے سے مقرر کی ہے۔ اس کی تاریخ یہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں، جو شخص اس جرم میں گرفتار ہو کر آتا، اسے بالعموم جوتے، لات، مکے، بل دی ہوئی چادروں کے سونٹے اور کھجور کے سنٹے مارے جاتے تھے۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کے لیے باقاعدہ چالیس کوڑے کی سزا مقرر کی اور سیدنا عمر نے، اپنے دورِ خلافت میں، جب یہ دیکھا کہ لوگ اس جرم سے باز نہیں آتے، تو اسے اسی کوڑے میں بدل دیا۔ ابن رشد لکھتے ہیں:

فعمدة الجمهور تشاور عمر والصحابة لما كثر في زمانه شرب الخمر، واشارة علی علیه بان یجعل الحد ثمانین قیاساً علی حد الفریة، فانه کما قیل عنه رضی الله عنه اذا شرب سکر، واذا سکر هذی، واذا هذی افتری۔	"جمہور کا مذہب، اس معاملے میں صحابۂ کرام کے ساتھ سیدنا فاروق کی مشاورت پر مبنی ہے، جو اس وقت ہوئی، جب اُن کے زمانے میں، لوگ کچھ زیادہ شراب پینے لگے، اور سیدنا علی نے مشورہ دیا کہ حدِ قذف پر قیاس کرتے ہوئے، اس کی سزا بھی، اسی کوڑے مقرر کر دی جائے۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے استدلال میں انھوں نے فرمایا: یہ جب پیے گا، تو مدہوش ہوگا، اور مدہوش ہوگا، تو بکواس کرے گا اور بکواس کرے گا تو دوسروں پر جھوٹی تہمتیں بھی لگائے گا۔"
(بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۳۳۲)	

اس سے واضح ہے کہ یہ شریعت ہرگز نہیں ہوسکتی۔ اس زمین پر اب قیامت تک کے

لیے، یہ حق صرف محمد رسول اللہ کو حاصل ہے کہ وہ کسی چیز کو شریعت قرار دیں، اور جب اُن کی طرف سے کوئی چیز شریعت قرار پا جائے، تو پھر صدیق و فاروق بھی، لاریب، اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کر سکتے۔ لہٰذا یہ بالکل قطعی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر، شراب نوشی کے مجرموں کو پٹوایا، تو شارع کی حیثیت سے نہیں، بلکہ مسلمانوں کے حکمران ہی کی حیثیت سے پٹوایا، اور آپ کے بعد، آپ کے خلفا نے بھی، ان کے لیے، چالیس کوڑے اور اسّی کوڑے کی یہ سزائیں اسی حیثیت سے مقرر کی ہیں۔ چنانچہ ہم پورے اطمینان کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ یہ کوئی حد نہیں، بلکہ محض تعزیر ہے، جسے مسلمانوں کا نظمِ اجتماعی، اگر چاہے، تو برقرار رکھ سکتا، اور چاہے تو اپنے حالات کے لحاظ سے اس میں تغیر و تبدل کر سکتا ہے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ ارتداد کی سزا کا یہ مسئلہ محض ایک حدیث کا مدعا نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ ابنِ عباس کی روایت سے، یہ حدیث، بخاری میں اس طرح نقل ہوئی ہے:

من بدل دينه فاقتلوه۔ "جو شخص اپنا دین تبدیل کرے، اسے
(کتاب استتابۃ المرتدین) قتل کر دو۔"

ہمارے فقہا اسے، بالعموم، ایک حکمِ عام قرار دیتے ہیں جس کا اطلاق، اُن کے نزدیک اُن سب لوگوں پر ہوتا ہے جو زمانۂ رسالت سے لے کر قیامت تک اس زمین پر کہیں بھی اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کریں گے۔ ان کی رائے کے مطابق ہر وہ مسلمان جو اپنی آزادانہ مرضی سے کفر اختیار کرے گا، اسے اس حدیث کی رو سے، لازماً، قتل کر دیا جائے گا۔ اس معاملے میں ان کے درمیان اگر کوئی اختلاف ہے تو بس یہ کہ قتل سے پہلے اسے توبہ کی مہلت دی جائے گی یا نہیں، اور اگر دی جائے گی تو اس کی مدت کیا ہونی چاہیے۔ فقہائے احناف، البتہ، عورت کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں۔ ان کے علاوہ باقی تمام فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ ہر مرتد کی سزا، خواہ وہ عورت ہو یا مرد، اسلامی شریعت میں، بہرحال، قتل ہی ہے۔

لیکن فقہا کی یہ رائے کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم تو، بے شک، ثابت ہے، مگر ہمارے نزدیک، یہ کوئی حکمِ عام نہ تھا، بلکہ صرف انھی لوگوں کے ساتھ خاص تھا، جن میں آپ کی بعثت ہوئی، اور جن کے لیے قرآن مجید میں، 'امیین' یا 'مشرکین' کی اصطلاح استعمال کی گئی

ہے۔

ذیل میں ہم اپنے اس نقطۂ نظر کی تفصیل بیان کیے دیتے ہیں:

اس زمین پر ہر شخص اس حقیقت سے واقف ہے کہ دنیا میں انسان کو رہنے بسنے کا جو موقع حاصل ہوا ہے، وہ کسی حق کی بنا پر نہیں، بلکہ محض آزمایش کے لیے ہے۔ عالم کا پروردگار جب چاہتا ہے، کسی کو یہ موقع دیتا، اور جب اس کے علم کے مطابق آزمایش کی یہ مدت پوری ہو جاتی ہے تو موت کا فرشتہ آسمان سے اترتا اور اسے یہاں سے لے جا کر اس کے پروردگار کے حضور پیش کر دیتا ہے۔

عام انسانوں کے لیے یہ مدت اللہ تعالیٰ اپنے علم و حکمت کے مطابق جتنی چاہیں، مقرر کرتے ہیں، لیکن وہ لوگ جن میں رسول کی بعثت ہوتی اور جنھیں اس کے ذریعے سے براہِ راست دعوت پہنچائی جاتی ہے، ان پر چونکہ آخری حد تک اتمامِ حجت ہو جاتا ہے، اس وجہ سے اس اتمامِ حجت کے بعد بھی، وہ اگر ایمان نہ لائیں تو ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ قانون قرآنِ مجید میں پوری صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ وہ پھر اس کی زمین پر زندہ رہنے کا موقع کھو دیتے ہیں۔ زمین پر وہ آزمایش ہی کے لیے رکھے گئے تھے اور رسول کے اتمامِ حجت کے بعد یہ آزمایش چونکہ آخری حد تک پوری ہو جاتی ہے، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کا قانون یہی ہے کہ اس کے بعد زندہ رہنے کا یہ موقع ان سے چھین لیا جائے اور ان پر موت کی سزا نافذ کر دی جائے۔

اس قانون کے مطابق رسول کے براہِ راست مخاطبین پر موت کی یہ سزا اس طرح نافذ کی جاتی ہے کہ رسول اور اس کے ساتھیوں کو اتمامِ حجت کے بعد اگر کسی دارالہجرت میں سیاسی اقتدار حاصل نہ ہو سکے تو اللہ تعالیٰ کا عذاب ابر و باد کی ہلاکت خیزیوں کے ساتھ نمودار ہوتا اور رسول کی قوم کو موت کی نیند سلا دیتا ہے۔ قرآنِ مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ عاد و ثمود، قومِ نوح، قومِ لوط اور دوسری بہت سی قومیں اسی طرح زمین سے مٹا دی گئیں۔ لیکن اس کے برعکس اگر رسول کو کسی سرزمین میں سیاسی اقتدار حاصل ہو جائے تو قوم کے مغلوب ہو جانے کے بعد اس کے ہر فرد کے لیے موت کی سزا مقرر کر دی جاتی ہے جو رسول اور اس کے ساتھی اس پر نافذ کرتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چونکہ یہی دوسری صورت پیش آئی، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ 'امیین' یعنی آپ کی قوم میں سے جو لوگ ۹ ہجری، حج اکبر کے دن تک بھی ایمان نہ لائیں، ان کے لیے اسی تاریخ کو میدانِ عرفات میں اعلان کر دیا جائے کہ ۹ ذوالحجہ سے محرم کے آخری دن تک ان کے لیے مہلت ہے۔ اس کے بعد بھی وہ اگر اپنے کفر پہ قائم رہے تو موت کی سزا کا یہ

قانون اُن پر نافذ کر دیا جائے گا۔ چنانچہ فرمایا ہے:

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ، فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ۔ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (التوبہ ۹: ۵)

"پھر جب حرام مہینے گزر جائیں تو ان مشرکین کو جہاں پاؤ، قتل کر دو اور اس کے لیے ان کو پکڑو، اور ان کو گھیرو، اور ہر گھات میں ان کے لیے تاک لگاؤ۔ لیکن وہ اگر کفر و شرک سے توبہ کر لیں اور نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کرنے لگیں تو انھیں چھوڑ دو۔ بے شک اللہ مغفرت کرنے والا، رحم فرمانے والا ہے۔"

یہی قانون ہے جس کی وضاحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمائی:

امرت ان اقاتل الناس حتی یشهدوا ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله و یقیموا الصلوٰة ویؤتوا الزکوٰة، فاذا فعلوا ذلك عصموا منی دماءهم الا بحق الإسلام وحسابهم علی الله۔ (مسلم، کتاب الایمان)

"مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ان لوگوں سے جنگ کروں، یہاں تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دیں، نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ وہ یہ شرائط تسلیم کر لیں تو ان کی جانیں محفوظ ہو جائیں گی، الا یہ کہ وہ اسلام کے کسی حق کے تحت اس حفاظت سے محروم کر دیے جائیں۔ رہا باطن کا حساب تو وہ اللہ کے ذمہ ہے۔"

یہ قانون، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، صرف امیوں یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم ہی کے ساتھ خاص تھا۔ ان کے علاوہ اب قیامت تک کسی دوسری قوم یا فرد کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، یہاں تک کہ وہ اہل کتاب جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھے، قرآن مجید نے انھیں بھی اس سے بالصراحت مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ چنانچہ سورۂ توبہ میں جہاں امیوں کے لیے قتل کی یہ سزا بیان ہوئی ہے، وہیں اہل کتاب کے بارے میں صاف فرمایا ہے کہ وہ اگر جزیہ دے کر اسلامی ریاست میں ایک شہری کی حیثیت سے رہنا چاہیں تو ان سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ ارشاد خداوندی ہے:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ

"لڑو ان اہل کتاب سے جو نہ اللہ اور نہ

وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ	آخرت پر ایمان لاتے ، نہ اللہ اور اس کے رسول
مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا	نے جو کچھ حرام ٹھہرایا ہے ، اسے حرام ٹھہراتے
يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ	اور نہ دینِ حق کی پیروی کرتے ہیں ۔ ان سے
اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ	لڑو ، یہاں تک کہ وہ مغلوب ہو کر جزیہ ادا کریں
عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۔	اور زیردست بن کر رہیں ۔"

(۹ : ۲۹)

ہماری اس بحث سے اللہ تعالیٰ کا یہ قانون اگر پوری طرح واضح ہو جاتا ہے ، تو اس کا یہ لازمی تقاضا بھی بالبداہت واضح ہے کہ ان امیوں میں سے کوئی شخص اگر ایمان لانے کے بعد پھر کفر اختیار کرتا تو اسے بھی لامحالہ ، اسی سزا کا مستحق قرار پانا چاہیے تھا ۔ وہ لوگ جن کے لیے کفر کی سزا موت مقرر کی گئی ، وہ اگر ایمان لا کر پھر اپنی پہلی حالت کی طرف لوٹتے ، تو لازم تھا کہ موت کی یہ سزا ان پر بھی بغیر کسی تردد کے نافذ کر دی جائے ۔ چنانچہ یہی وہ ارتداد ہے ، جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : من بدل دینه فاقتلوه ۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم میں 'من' ، اسی طرح امیوں کے لیے خاص ہے ، جس طرح اوپر "امرت ان اقاتل الناس' میں 'الناس' ، اُن کے لیے خاص ہے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی اصل جب قرآنِ مجید میں اس خصوص کے ساتھ موجود ہے ، تو اس کی اس فرع میں بھی یہ خصوص ، لامحالہ ، برقرار رہنا چاہیے ۔ ہمارے فقہا کی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے 'الناس' کی طرح اسے قرآن میں اس کی اصل سے متعلق کرنے اور قرآن و سنت کے باہمی ربط سے اس حدیث کا مدعا سمجھنے کے بجائے ، اسے عام ٹھہرا کر ہر مرتد کی سزا موت قرار دی اور اس طرح اسلام کے حدود و تعزیرات میں ایک ایسی سزا کا اضافہ کر دیا ، جس کا وجود ہی اسلامی شریعت میں ثابت نہیں ہے ۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ صرف زمانۂ رسالت کے امی تھے ، خواہ وہ ام المومنین حضرت خدیجہ کے ابن عم ورقہ بن نوفل کی طرح یہود و نصاریٰ کے دین پر تھے یا بتوں کے پوجنے والے ، جن کے ارتداد کی سزا اسلام میں موت مقرر کی گئی ۔ چنانچہ یہ بالکل واضح ہے کہ اب اگر کوئی شخص اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کرے اور اس کے ساتھ کسی فساد کا مرتکب نہ ہو ، تو قرآن و سنت کی رو سے مجرد اس ارتداد پر اسے کوئی سزا نہیں دی جا سکتی ۔

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ موت کی سزا، قرآنِ مجید کی رو سے، قتلِ نفس اور فساد فی الارض کے سوا کسی جرم میں بھی، کسی شخص کو نہیں دی جا سکتی۔ ارشادِ خداوندی ہے:

اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا۔ (المائدہ ۵: ۳۲)

"جس نے کسی کو قتل کیا، اس کے بغیر کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں کوئی فساد برپا کیا ہو، تو اس نے گویا سب انسانوں کو قتل کیا۔"

یہ قرآن کا صریح ارشاد ہے۔ لہٰذا ان دو جرائم کے سوا، فرد ہو یا حکومت، یہ حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی شخص کی جان کے درپے ہو اور اسے قتل کر ڈالے۔

چوتھے سوال کا جواب یہ ہے کہ قید کی سزا محض سزا نہیں، بلکہ ایک بدترین جرم ہے جس کا ارتکاب خود انسان نے اپنے خلاف کیا ہے۔ اس لیے کسی اسلامی حکومت سے ہم یہ توقع نہیں رکھتے کہ وہ اپنے ضابطۂ حدود و تعزیرات میں اس سزا کو کبھی شامل کرے گی۔

اس میں شبہ نہیں کہ کال کوٹھریاں، قلعہ کے برج اور تیرہ و تار تہ خانے اس دنیا میں انسان کی معلوم تاریخ کے ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ مسیحِ ناصری سے انیس صدی پہلے کے ایک پیغمبر یوسف علیہ السلام کی داستانِ زنداں بائبل اور قرآن، دونوں میں بیان ہوئی ہے۔ آٹھویں صدی کے عظیم فقیہ ابوحنیفہ اور پھر تیرھویں صدی کے ایک جلیل القدر عالم اور محقق ابنِ تیمیہ جس طرح قید ہی میں دنیا سے رخصت ہوئے، اس کی روداد بھی تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے، تاہم اٹھارھویں صدی سے پہلے یہ بندی خانے بالعموم حوالات ہی کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ مجرم ان میں زیادہ تر مقدمے کی تحقیقات یا موت، تازیانہ اور اس طرح کی دوسری سزاؤں کے نفاذ کے انتظار میں رکھے جاتے تھے۔ یہ تصور کہ جرم کی پاداش میں کسی شخص کو دو سال، چار سال یا دس پندرہ سال کے لیے قید کر دیا جائے، ان پچھلی تین صدیوں ہی میں اس قدر عام ہوا ہے کہ اب زیادہ تر جرائم کی سزا اسی صورت میں دی جاتی ہے۔

یورپ میں اگرچہ زنداں سے ملتے جلتے بعض ادارے، جیسے مثلاً: فلورنس کا دل ستن چودھویں صدی کی ابتدا میں موجود تھے۔ اسی طرح ۱۵۵۷ء میں لندن، ۱۵۹۶ء میں ایمسٹرڈم،

۱۷۰۴ء میں روم اور ۱۷۷۳ء میں بلجیم کے قدیم شہر غنت میں جو اصلاح خانے قائم ہوئے ان میں بھی کم و بیش یہی تصور کارفرما تھا، لیکن عام خیال یہی ہے کہ پہلا جدید قید خانہ وال نٹ سٹریٹ جیل کے نام سے ۱۷۹۰ء میں فلاڈلفیا میں قائم ہوا، اور پھر مغربی تہذیب کے غلبہ کے ساتھ دنیا میں ہر جگہ وہ زنداں وجود میں آگئے، جن میں اب آدم کے بیٹے برسوں اپنے وجود کی تکمیل کے لیے ترستے اور جرم و سزا کے تصور سے ناآشنا بچے اپنے باپ کو آہنی سلاخوں کے پیچھے دیکھتے شباب کی عمر کو پہنچتے ہیں۔

تازیانہ چند لمحوں کے لیے پیٹھ پر برستا، ہاتھ بس ایک دفعہ کاٹ دیا جاتا، صلیب پورے جسم کو اذیت دے کر اس کا رشتہ روح سے منقطع کرتی اور قتل کی مختلف صورتیں اس دنیا کا ہر معاملہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتی ہیں، لیکن یہ وہ سزا ہے جس کے ذریعے سے انسان کے اندر چھپی ہوئی اس کی اصل شخصیت کو برسوں عذاب میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، سونا جاگنا، یہاں تک کہ رفع حاجت کے لیے جانا بھی دوسروں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ وہ پانی کے ایک گلاس، روٹی کے ایک لقمے، پان کی ایک بیڑی اور سگریٹ کے ایک کش کے لیے دوسروں کا منہ دیکھتا اور بارہا ان چیزوں کے لیے اپنی عزتِ نفس کھو دیتا ہے۔ وہ جیتے جی ماں کی محبت، باپ کی شفقت، بچوں کے پیار اور بیوی کی الفت کے لیے ترستا اور اپنے وجود کے اُن تقاضوں کو بھی دبانے پر مجبور کیا جاتا ہے، جن پر عالم کے پروردگار نے رمضان کے ماہِ تربیت میں بھی اس طرح کی کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ اس کی زندگی فی الواقع 'لا یموت فیھا ولا یحیی' کی تصویر بن جاتی ہے۔

پھر یہ سزا صرف مجرم ہی کو نہیں، اس کے سب اہلِ تعلق کو بھی ملتی ہے۔ سب سے زیادہ دردانگیز صورتِ حال اس میں بیوی کے لیے پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا شوہر اگر نو دس سال کے لیے قید میں ڈال دیا گیا ہے تو اس عرصے کے دوران میں اسے جن نفسیاتی، معاشرتی، معاشی اور اخلاقی مسائل کے عذاب سے گزرنا پڑتا ہے، اور محض ایک مجرم کی بیوی ہونے کے جرم میں گزرنا پڑتا ہے، اس کا اندازہ صرف وہ باوفا خواتین ہی کر سکتی ہیں جو کبھی اس مصیبت سے دوچار ہوتی ہوں۔ یہی معاملہ ننھے بچوں کا بھی ہے۔ اپنے باپ کو مسلسل کئی سال تک آہنی سلاخوں کے پیچھے دیکھتے

رہنے سے اُن کی جو نفسیات وجود میں آتی ہے، اس کا اندازہ ہر صاحب عقل بہت آسانی کے ساتھ کر سکتا ہے۔ تازیانہ کی سزا، قطع ید، صلیب اور پھانسی، ایک واقعہ ہے، جو ایک ہی مجرم کے لیے ہر روز نہیں ہوتا، لیکن اس سزا کے نتیجے میں سنگین دیواروں کے پیچھے مقید باپ سے ساتھ ہر ملاقات کے موقع پر جو غیر معمولی جذبات ان بچوں کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، ان کے ساتھ، ان کی شخصیت میں توازن کی توقع آخر کس طرح کی جا سکتی ہے؟ وہ اگر معاشرے سے یہ پوچھیں تو یقیناً، حق بجانب ہوں گے کہ باپ کے ہوتے ہوئے باپ سے محرومی کی جو سزا انھیں ملی، اس کے لیے آخر کیا جواز ہے جو اخلاقیاتِ قانون کی کتابوں سے ان کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے؟

پھر یہ بھی دیکھیے کہ تادیب و تنبیہ کے بعد ہر معاشرہ یہی چاہتا ہے کہ مجرم کی اصلاح ہو جائے۔ اس کے لیے بالبداہت واضح ہے کہ سب سے زیادہ مؤثر چیز اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ تاثیرِ صحبت ہے۔ لیکن طرفہ تماشا ہے کہ اس سزا کے ذریعے سے مجرم کو معاشرے، خاندان اور خود اس کے اہلِ خانہ میں اصلاح کی ہر دعوت اور خیر کی ہر تحریک سے الگ کر کے، برسوں مجرموں ہی کی صحبت میں رکھنے کا اس طرح اہتمام کیا جاتا ہے کہ اس میں اگر سدھرنے کی کوئی خواہش ہو بھی تو وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ وہ اس سارے عرصے میں جرم کی دنیا میں جیتا، جرم کی باتیں سنتا، جرم ہی کے نقطۂ نظر سے ہر چیز کو دیکھتا اور جرم ہی کے محرکات کو شب و روز عمل اور اقدام کے لیے ایک زندہ محرک کی حیثیت سے اپنے سامنے پاتا ہے۔ اس کے بعد ہمیں نہیں معلوم کہ اسے رہا کر دینے کے بعد معاشرہ اس سے کیا توقع کر سکتا ہے؟

پھر اس بات پر بھی غور فرمائیے کہ تازیانہ، قطعِ ید اور اس طرح کے دوسرے طریقوں سے تادیب و تنبیہ کے بعد ہم نہیں کہہ سکتے کہ کوئی مجرم کب اپنے لیے خیر کا راستہ منتخب کر لے۔ یہ واقعہ اس کی زندگی میں کسی وقت بھی ہو سکتا ہے۔ عقل کا تقاضا، لامحالہ، یہی ہے کہ یہ توفیق اگر اسے حاصل ہو جائے تو اس کے لیے فوراً اپنے آپ کو تبدیل کر لینے اور سوسائٹی کے ایک ذمہ دار فرد کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کے مواقع ہر وقت کھلے رہنے چاہییں۔ لیکن قیدکی سزاؤں میں یہی وہ سزا ہے جس میں اس کا وقت قانون مقرر کرتا ہے، درآں حالیکہ اس کی تعیین کا کوئی ذریعہ اس کے

پاس موجود نہیں ہے۔

اس سزا کے بھی وہ مستحق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کی شریعت میں مجرم کو اس کے گھر ہی میں نظر بند کر دینے یا علاقہ بدر کر دینے کی سزا تو دی گئی ہے جہاں وہ اپنے اہل وعیال کو بھی اگر چاہے تو اپنے ساتھ لے جا سکتا ہے، لیکن اس کو برسوں کے لیے زنداں میں ڈال دینے کا کوئی تصور اس شریعت کے ضابطۂ حدود و تعزیرات میں موجود نہیں ہے۔

صحتِ فکر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا حدیث میں ان الفاظ میں آئی ہے:

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ وارنا الاشیاء کما ھی۔	"اے اللہ حق کو ہمیں حق کی صورت میں دکھا اور ہمیں اس کی پیروی کی توفیق دے۔ اور باطل کو ہمیں باطل کی صورت میں دکھا اور ہمیں اس سے بچنے کی توفیق دے۔ اور چیزوں کو ہمیں ویسا ہی دکھا جیسا کہ وہ ہیں۔"

یہ گویا صحت فکر کی دعا ہے۔ یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اس لیے یہاں ہر چیز پر التباس کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ کوئی بات جب آدمی کے سامنے آتی ہے تو ہمیشہ اس کا خطرہ رہتا ہے کہ وہ اس کو غلط رخ سے لے لے۔ اور پھر اس غلط تاویل کے لیے اس کو خوبصورت الفاظ بھی مل جائیں۔ اس فتنہ سے بچنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ آدمی رائے قائم کرنے میں بے حد محتاط ہو۔ نیز اس معاملہ میں وہ مذکورہ دعا سے برابر مدد لیتا رہے۔

مثلاً آپ توحیدِ خالص کا نظریہ پیش کریں گے اور سننے والا فوراً انسانی بادشاہوں کی مثال دے کر کہنے لگے گا کہ ٹھیک ہے اللہ سب سے بڑا ہے مگر بادشاہوں تک پہنچنے کے لیے درمیانی وسائل ہوتے ہیں۔ اسی طرح خدا تک پہنچنے کے بھی درمیانی وسائل ہیں۔ آپ ایک شخص کے سامنے قرآن کی آیت پیش کر کے کہیں گے کہ دشمن سے اچھے اخلاق کے ساتھ پیش آؤ، اس کے بعد تم دیکھو گے کہ دشمن بھی تمہارا گہرا دوست بن گیا ہے۔ وہ شخص کہے گا کہ یہ تو تم بے غیرتی کی بات کر رہے ہو، ہمیں تو دشمن کو سبق سکھانا ہے، اس کے بغیر وہ اپنی مخالفانہ کارروائی سے باز نہیں آسکتا۔ آپ قرآن و حدیث کا حوالہ دے کر کہیں گے کہ اس دنیا میں کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کیا جائے، اور آپ کا مخاطب اس کی تردید میں یہ الفاظ پالے گا کہ یہ تو بزدلی کی تعلیم ہے۔ اسلام کا طریقہ اقدام کا طریقہ ہے، اسلام کا طریقہ پسپائی کا طریقہ نہیں۔

چیزوں کو صحیح رخ سے دیکھنا اور معاملات میں صحیح رائے قائم کرنا، خدا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ اس نعمت کے مالک وہی لوگ بنتے ہیں جو غلط تاویلات کے فتنہ سے اپنے آپ کو بچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

وحید الدین خاں

قدیر شہزاد

اشاریہ ماہنامہ "اشراق"

(جلد ٦، ١٩٩٤ء)

البیان

شذرات

قرآنیات

حدیث و سنت

فقہیات

میزان

فکر و نظر

مکاتیب

تبصرۂ کتب

اصلاح و دعوت

متفرقات

تعارف

نقطۂ نظر

OUR THANKS TO

SNOW WHITE DRY CLEANING INDUSTRIES
SH. WILAYAT AHMAD & SONS
CONTINENTAL ART
FEROZE TEXTILE INDUSTRIES
IMAGE COMMUNICATIONS
TIP TOP DRY CLEANERS
F.RABBI & CO. (PVT) LTD
K.B. SARKAR & CO
PARAMOUNT DISTRIBUTORS (PVT) LTD

دین و دانش

(آڈیو' وڈیو کیسٹ)

مقرر: جاوید احمد غامدی

سلسلہ محاضرات

۱۔ قرآن مجید کیا ہے' اسے کیسا سمجھا جائے؟
۲۔ اسلامی شریعت کیا ہے' کیسے سمجھی جائے؟
۳۔ حدیث و سنت کا مقام اور اجماع کی حیثیت
۴۔ حقیقت دین (۱) ذات باری پر ایمان اور اس کے تقاضے
۵۔ حقیقت دین (۲) رسالت پر ایمان اور اس کے تقاضے
۶۔ حقیقت دین (۳) آخرت پر ایمان اور اس کے تقاضے
۷۔ دعوت دین
۸۔ دین کے بنیادی مطالبات
۹۔ اسلامی انقلاب کی جدوجہد
۱۰۔ انقلاب کی حکمت عملی
۱۱۔ عالمگیر اسلامی انقلاب
۱۲۔ منشور انقلاب (۱) سیاست
۱۳۔ منشور انقلاب (۲) معیشت
۱۴۔ منشور انقلاب (۳) معاشرت
۱۵۔ منشور انقلاب (۴) تعلیم
۱۶۔ منشور انقلاب (۵) حدود و تعزیرات
۱۷۔ اسلام اور پارلیمنٹ
۱۸۔ نظام خلافت
۱۹۔ اسلام اور تصوف
۲۰۔ تزکیہ نفس (۱) حیوانی وجود کا تزکیہ
۲۱۔ تزکیہ نفس (۲) عقلی وجود کا تزکیہ
۲۲۔ تزکیہ نفس (۳) روحانی وجود کا تزکیہ
۲۳۔ تزکیہ نفس (۴) اخلاقی وجود کا تزکیہ (الف)
۲۴۔ تزکیہ نفس (۵) اخلاقی وجود کا تزکیہ (ب)
۲۵۔ اسلام کا قانون سیاست
۲۶۔ اسلامی معیشت (۱) مسئلہ سود اور ایک نیا نظام معیشت
۲۷۔ اسلامی معیشت (۲) زکوۃ یا ٹیکس
۲۸۔ اسلامی معاشرت، فنون لطیفہ اور ذرائع ابلاغ
۲۹۔ حدود و تعزیرات، کیا اسلامی سزائیں ظلم ہیں؟
۳۰۔ پردے کا قانون
۳۱۔ مسلمان خاتون
۳۲۔ ہماری تعلیم
۳۳۔ اسلامی جہاد
۳۴۔ تاریخ امت چند درخشاں پہلو
۳۵۔ انتخابی نتائج (۱۹۹۳) اور اسلامی انقلاب کی جدوجہد
۳۶۔ آپ کے سوالات
۳۷۔ سوال و جواب کی نشست (۱)
۳۸۔ سوال و جواب کی نشست (۲)

درس قرآن وحدیث

سورہ	کیسٹ نمبر	کتاب حدیث	کیسٹ نمبر
الانعام	۱-۲۹	الصلوٰۃ (صحیح بخاری)	۱-۳۳
الاعراف	۳۰-۶۶	الزکوٰۃ (صحیح مسلم)	۳۴-۱۵۵
الانفال	۶۷-۸۲	الصوم (صحیح مسلم)	۱۵۶-۱۷۲
التوبہ	۸۳-۱۱۰	فضائل قرآن (مشکوٰۃ المصابیح)	۱۷۳-۱۹۱
یونس	۱۱۱-۱۲۷		
ہود	۱۲۸-۱۳۶		
یوسف	۱۳۷-۱۵۹		
الرعد	۱۶۰-۱۶۵		
ابراہیم	۱۶۶-۱۷۱		
الحجر	۱۷۲-۱۷۶		
النحل	۱۷۷-۱۹۲		

نوٹ:

○ درس قرآن وحدیث صرف آڈیو کیسٹ پر دستیاب ہیں۔

○ درج ذیل نمبروں والی کیسٹیں معیاری ریکارڈنگ نہ ہونے کے باعث فی الحال دستیاب نہیں ہیں۔ ۶۱، ۹۸، ۱۰۷، ۱۵۴، ۱۷۷

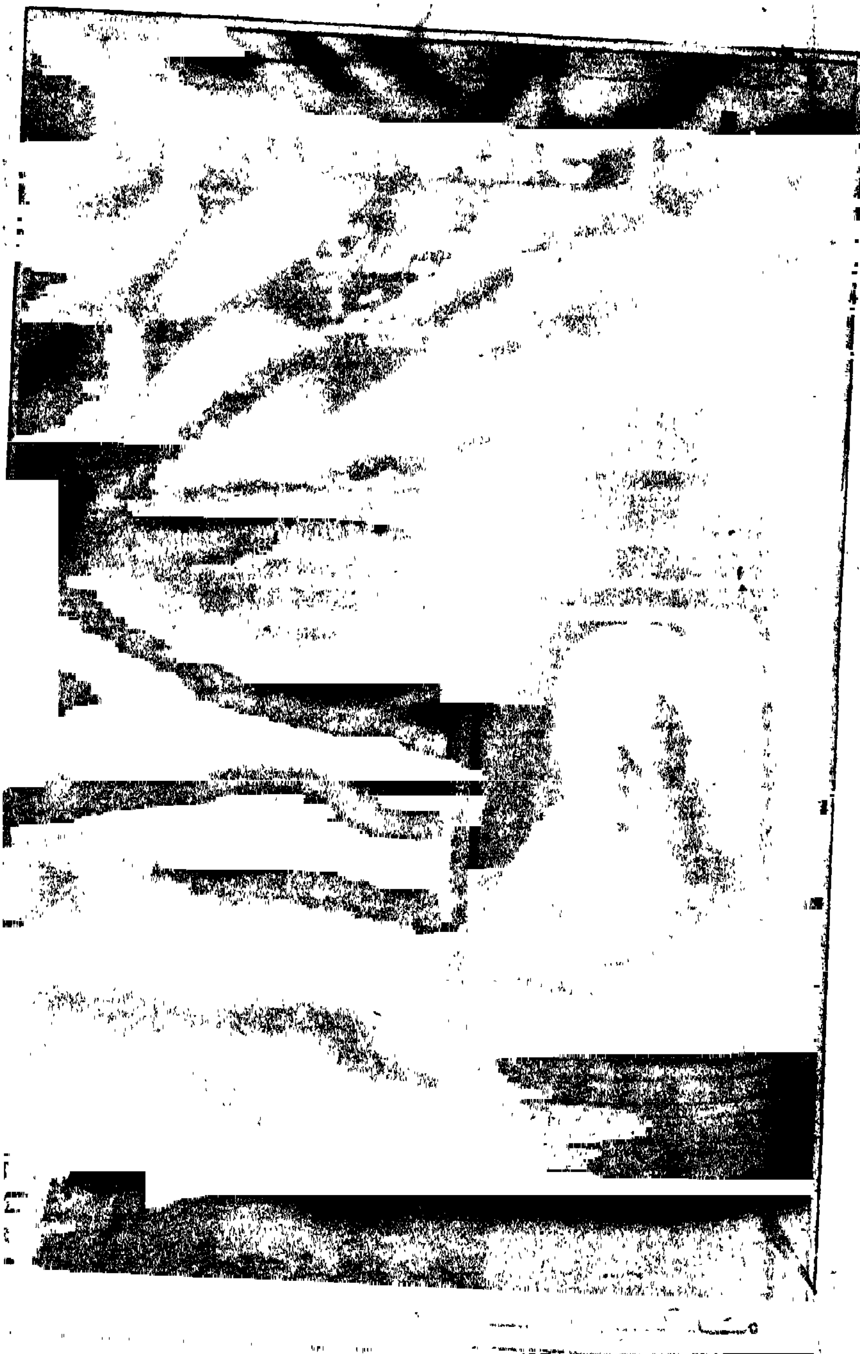
○ سلسلہ محاضرات کے کیسٹ نمبر ۱۱، ۱۳ اور ۲۷، ۳۰ وڈیو کیسٹ پر دستیاب نہیں ہیں۔

قیمت: آڈیو کیسٹ ۲۵ روپے، وڈیو کیسٹ ۱۲۰ روپے

المورد، شعبہ اصلاح ودعوت

۹۸(۲) ای، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون: ۸۵۶۳۱۸-۸۵۷۰۳۰ فیکس: ۸۵۷۰۵۳



Regd No 8319 December 1994 Vol 6 No 12

ISHRAQ

66 Ahmad Block Garden Town Lahore. 54600 Pakistan.